یووال نوحا ہریری

آدمی

بنی نوع انسان کی مختصر تاریخ

اردو ترجمہ

عمر بنگش

خردمند آدمی

بنی نوع انسان کی مختصر تاریخ

Sapiens: A Brief History of Humankind

یووال نوحا ہریری

اردو ترجمہ

عمر بنگش

www.omerbangash.com

9781716994982

فہرست

تاریخ کا شجرہ

وقت	واقعہ
ساڑھے تیرہ ارب سال پہلے	توانائی اور مادے کی پیدائش ، طبعیات کا آغاز ، ایٹم اور سالمے بنتے ہیں ، کیمیاء کا آغاز ہوتا ہے ۔
ساڑھے چار ارب سال پہلے	کرہ ارض پیدا ہوتی ہے ۔
پونے چار ارب سال پہلے	نامیات کا ظہور ہوتا ہے ۔ حیاتیات کا آغاز ہوتا ہے ۔
ساٹھ لاکھ سال پہلے	انسانوں اور بن مانسوں کی مشترکہ پر دادی کا ظہور ہوتا ہے ۔
پچیس لاکھ سال پہلے	افریقہ میں انسانی جنس کی ارتقاء ہوتی ہے ۔ پتھر کے اوزار ایجاد ہوتے ہیں ۔
بیس لاکھ سال پہلے	انسان افریقہ سے یوریشیاء تک پھیل جاتا ہے ۔ انسان کی مختلف انواع کی ارتقاء ہوتی ہے ۔
پانچ لاکھ سال پہلے	یورپ اور مشرق وسطیٰ میں نینڈرتھل انسانوں کی ارتقاء ہوتی ہے ۔
تین لاکھ سال پہلے	آگ کا روزمرہ استعمال شروع ہوتا ہے ۔
دو لاکھ سال پہلے	مشرقی افریقہ میں انسانی نوع ، 'خردمند آدمی' کی ارتقاء ہوتی ہے ۔
ستر ہزار سال پہلے	شعور اور آگاہی کا انقلاب برپا ہوتا ہے ۔ افسانوی اور فرضی زبان کا ظہور ہوتا ہے ۔ تاریخ کا آغاز ہوتا ہے ۔ آدمی افریقہ سے نکل کر پھیلنا شروع ہوتا ہے ۔
پینتالیس ہزار سال پہلے	آدمی آسٹریلیاء پہنچ جاتا ہے ۔ آسٹریلیاء کے دیوہیکل حیوانات معدوم ہو جاتے ہیں ۔
تیس ہزار سال پہلے	نینڈرتھل انسان معدوم ہو جاتے ہیں ۔
سولہ ہزار سال پہلے	آدمی امریکہ پہنچ جاتا ہے ۔ امریکی دیوہیکل حیوانات معدوم ہو جاتے ہیں ۔
تیرہ ہزار سال پہلے	فلورینسس انسان بھی معدوم ہو گئے ۔ اب نوع انسان میں صرف 'خردمند آدمی' باقی ہے ۔
بارہ ہزار سال پہلے	زرعی انقلاب برپا ہوتا ہے ۔ نباتات اور حیوانات کو گھریلو بنایا جاتا ہے ۔ بستیاں آباد ہوتی ہیں ۔
پانچ ہزار سال پہلے	پہلی بادشاہت ، رسم الخط اور زر یا پیسہ ایجاد ہوتا ہے ۔ مشرکانہ مذاہب کا ظہور ہوتا ہے ۔
چار ہزار دو سو سال پہلے	پہلی سلطنت سارگون کی اکادی سلطنت کی داغ بیل ڈالی جاتی ہے ۔ سکے کی ایجاد ہوتی ہے ۔
پچیس سو سال پہلے	فارسی سلطنت کی داغ بیل ڈالی جاتی ہے ۔ انسانوں کے فلاح اور مفاد کے نظریے پر مبنی آفاقی سیاسی نظام ہندوستان میں بدھ مت کا ظہور ہوتا ہے ۔ جس میں آفاقی سچائی انسانوں کو دکھ ، کرب سے نجات پر مبنی ہے
دو ہزار سال پہلے	چین میں ہان سلطنت ، بحیرہ روم کے مضافات میں رومی سلطنت ۔ عیسائیت کا ظہور
چودہ سو سال پہلے	اسلام کا ظہور
پانچ سو سال پہلے	سائنسی انقلاب کا آغاز ۔ انسان اپنی بے علمی اور جہالت کو تسلیم کرتا ہے اور بے نظیر طاقت حاصل کرتا ہے ۔ یورپیوں نے امریکہ اور سمندروں کو فتح کرنا شروع کر دیا ۔ کرہ ارض کی تاریخ یکجا ہوتی ہے ۔ سرمایہ داری کی اٹھان ہوتی ہے
دو سو سال پہلے	صنعتی انقلاب برپا ہوتا ہے ۔ ریاست اور منڈی ، خاندان اور برادری کی جگہ لے لیتی ہے ۔ نباتات اور حیوانات کی انواع و اقسام کا بڑے پیمانے پر خاتمہ ہو جاتا ہے
حالیہ دور	انسان کرہ ارض کی سرحدوں کو پھلانگ رہا ہے ۔ بنی نوع انسان کو ایٹمی ہتھیاروں سے معدومی کے خطرے کا سامنا ہے ۔ نامیات تیزی سے فطری انتخاب کی بجائے ہوشمند طراحی کے ہاتھوں تشکیل پا رہے ہیں
مستقبل	ہوشمند طراحی حیاتیات کا بنیادی اصول بن جائے گا ؟ ملکوتی انسان ۔ ۔ ۔ خردمند آدمی کی جگہ لے لیں گے ؟

حصہ اول: شعور اور آگاہی کا انقلاب

1-: جنوبی فرانس کے ایک غار سے دریافت ہونے والا انسانی ہاتھ کا نقش جو تیس ہزار سال پرانا ہے۔ غالباً کسی نے اپنی موجودگی کو امر کرنے کی کوشش کی تھی۔

ایک حقیر جانور

ساڑھے تیرہ ارب سال پہلے کا واقعہ ہے۔ مادہ، توانائی، وقت اور خلا وجود میں آئے۔ ہم اس واقعہ کو 'بگ بینگ' اور کائنات کے انھی بنیادی اجزاء کی کہانی کو 'فزکس' یا 'طبیعات' کہتے ہیں۔

کائنات کی پیدائش کے تین لاکھ سال بعد توانائی اور مادہ یکجا ہوئے تو 'ایٹم' نامی ذرات پیدا ہوئے۔ یہ ایٹمی ذرے آپس میں ملے تو 'سالمہ' یا 'مالیکیول' نامی شے وجود میں آئی۔ ایٹمی ذرات اور سالموں کی اس میل کہانی کو 'کیمسٹری' یا 'کیمیاء' کہتے ہیں۔

پونے چار ارب سال پہلے 'کرہ ارض' نامی سیارے پر ایٹمی سالموں میں کچھ ایسا کیمیائی ملاپ ہوا کہ انتہائی پیچیدہ بافتوں کی ساخت وجود میں آئی۔ یہ ساخت دراصل نامیاتی اجسام تھے۔ ان کی کہانی کو 'بیالوجی' یا 'حیاتیات' کہا جاتا ہے۔

ستر ہزار سال پہلے، لاکھوں نامیاتی اجسام کی سینکڑوں اقسام میں سے ایک۔۔۔ یعنی انسان نے باقی کے انسانوں کے ساتھ مل کر یکتا بناوٹ ایجاد کی۔ انسانوں کے رہن سہن کی اس مفصل اور پیچیدہ ساخت کو 'تہذیب' یا 'ثقافت' کہا جاتا ہے۔ وقت کے دھارے میں انسانی تہذیب کے ارتقاء کی کہانی کو 'تاریخ' کہتے ہیں۔

اس تاریخ کی کہانی میں کئی دور آئے۔ ارتقاء کی نظر سے دیکھیں تو تین ادوار انقلابی ثابت ہوئے۔ پہلا دور ستر ہزار سال پہلے آیا۔ یہ 'شعور اور آگاہی کا انقلاب' تھا۔ عام طور پر تاریخ انسانی کی ابتداء یہیں سے ہوتی ہے۔ بعد اس کے، بارہ ہزار سال پہلے دوسرا دور آیا جسے 'زرعی انقلاب' کہا جاتا ہے۔ تیسرا دور 'سائنسی انقلاب' کے ساتھ شروع ہوا جو صرف پانچ سو سال پہلے کا قصہ ہے۔ آج یوں لگتا ہے کہ سائنسی انقلاب کے نتیجے میں انسانی تاریخ کا خاتمہ ہو جائے گا اور بالکل مختلف صورتحال پیدا ہو جائے گی۔ یہ کتاب، انہی تین انتہائی اہم انقلابی ادوار کا احاطہ کرتی ہے۔ یہ کتاب ان تین ادوار کی انسانی تاریخ اور دوسرے حیوانی و نباتاتی نامیات پر بے پناہ اثرات کا جائزہ لیتی ہے۔

ہم جس دور کو انسانی تاریخ کہتے ہیں، اس کے متعلق حقیقت تو یہ ہے کہ اس سے قبل بھی انسان وجود رکھتا ہی تھا۔ تاریخ انسانی، انسان کی پیدائش سے شروع نہیں کی جاتی۔ جیسے دنیا کے باقی حیوانات ہیں، ان کی طرح انسان بھی پچیس لاکھ سال پہلے ہی پیدا ہو چکا تھا۔ لیکن، انسان لاتعداد نسلوں تک دوسرے جانوروں سے ممتاز نہیں ہو پایا۔ وہ دیوہیکل جانوروں کی بستی میں بس ایک ادنیٰ اور حقیر جانور ہی رہا۔

یہ تو بیس لاکھ سال پہلے کا واقعہ ہے کہ انسان میں انسانی خصلتیں ظاہر ہونا شروع ہوئیں۔ یہ وہ موقع تھا کہ پہلی بار انسانی ماؤں نے بچوں کو بے چینی میں لپک کر خود سے چمٹا، لاڈ پیار کرنا شروع کیا۔ بچے بے فکری سے کیچڑ میں کھیلتے نظر آئے۔ پہلی بار خود سر نوجوان اپنے ارد گرد

سے نالاں اور بڑے بوڑھے ناک بھنویں چڑھاتے نظر آنے لگے۔ خوبرو، کڑیل جوان۔۔۔ حسیناؤں کے دل جیتنے کی کوشش کرنے لگے اور اسی دور میں ایسی عورتیں بھی تھیں جو کافی پہلے ہی نین مٹکا کر چکتی تھیں۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ قدیم انسان محبت کرنا جانتے تھے۔ وہ کھیل بھی کھیلتے تھے۔ وہ گہری دوستیاں بناتے تھے اور وہ بھی طاقت، رتبے اور شہرت کے بھوکے ہوا کرتے تھے۔ تاہم انس و محبت، کھیل تماشا اور طاقت و رتبہ وغیرہ۔۔ یہ صرف انسانی فطرت نہیں ہے۔ دوسرے کئی جانور جیسے بن مانس، لنگور اور ہاتھی بھی ایسا ہی کرتے ہیں۔ یہ انسان کے متعلق خاص اور نہ ہی کوئی بہت بڑی بات ہے۔ اس زمانے میں کسی بھی ذی روح، بلکہ خود انسان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ایک دن اس کی اولاد چاند پر چہل قدمی کرے گی۔ انسان ایٹمی ذرات کو پھاڑ دیں گے۔ اس کی نسل جینیات کی گتھیاں سلجھائے گی اور تاریخ کی کتابیں لکھا کرے گی۔ اس زمانے کے قدیم انسان کے متعلق سب سے اہم بات یہ ہے کہ وہ ہرگز اہم نہیں تھا۔ اس دور کے انسان سے متعلق صرف یہ جان لینا کافی ہے کہ وہ اپنے ارد گرد ماحول کے لیے اتنا ہی اہم تھا جتنا خشکی پر کوئی گوریلا، ایک ٹمٹماتا جگنو یا کسی وسیع سمندر میں ایک جیلی فش ہو سکتی ہے۔

یہ جو حیاتیات دان ہوتے ہیں، وہ ساری نامیات یعنی جانداروں کو 'طبقات'، 'انواع' یا 'اجناس' میں تقسیم کرتے ہیں۔ ان کا کلیہ یہ ہے کہ وہ جانور جو ایک دوسرے کے ساتھ جنسی ملاپ کر کے تولید کے قابل بار آور اور زرخیز بچے پیدا کر سکتے ہیں، وہ ایک ہی نوع سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن، گدھوں اور گھوڑوں کے آباء بھی تو ایک ہی تھے۔ اسی لیے ان کی ہیئت میں خاصی مماثلت پائی جاتی ہے مگر گھوڑے اور گدھے ایک دوسرے کے ساتھ جنسی ملاپ میں کوئی خاص دلچسپی ظاہر نہیں کرتے۔ وہ صرف اور صرف تبھی ملاپ کرتے ہیں جب انھیں اس عمل پر مجبور کیا جاتا ہے۔ اگر جنسی ملاپ کر بھی لیں تو ان کی اولاد، جنھیں ٹٹو اور خچر کہا جاتا ہے۔۔۔ بانجھ ہی پیدا ہوتے ہیں۔ ان کے ساتھ معاملہ یہ ہوا ہے کہ گدھے کے ڈی این اے یا جینیاتی مادے میں پیدا ہونے والے تغیر کا نتیجہ ہے کہ وہ گھوڑے کے جینیاتی مادے یا ڈی این اے پر حاوی نہیں ہو سکتا اور یہ حقیقت گدھے اور گھوڑے دونوں پر صادق ہے۔ اسی لیے جانوروں کی اقسام کو مختلف 'انواع' ہی نہیں بلکہ 'اجناس' میں بھی تقسیم کیا جاتا ہے کیونکہ ہر جانور، اپنے تئیں ارتقاء کے مختلف راستوں پر چلتا آیا ہے۔ اب آگے چلیں تو یہاں ایک دوسری مثال بھی تو ہے۔ ایک 'بل ڈاگ' یعنی جبڑے چوڑ کتا اور 'ہسپانوی نسل' کا ریشمی بالوں کا حامل کتا دیکھنے میں ایک دوسرے سے بہت ہی مختلف ہوتے ہیں لیکن پتہ کیا؟ یہ دونوں ایک ہی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان دونوں کا جینیاتی مادہ یا ڈی این اے ایک ہی طرح کا ہے۔ کتوں کی یہ دو انواع، بخوشی ایک دوسرے کے ساتھ جنسی ملاپ بھی کرتی ہیں اور ان کے کتومڑے بھی زرخیز۔۔۔ بڑے ہو کر باقی کتوں کے ساتھ ملاپ کرتے اور بچے پیدا کرتے رہتے ہیں۔ یعنی، ان کی تو جنس بھی ایک ہی ہے۔

جانوروں کی وہ اجناس، جن کے آباء ایک ہی تھے۔۔۔ انھیں ایک ہی نوع یا طبقے میں شمار کیا جاتا ہے۔ شیر، چیتے، تیندوے، جغور وغیرہ اگرچہ مختلف اجناس ہیں لیکن یہ سارے ایک ہی نوع سے تعلق رکھتے ہیں۔ حیاتیات کے ماہرین ہر جنس کو نام دیتے ہیں تو اس کے دو

حصے ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر شیر کو 'Panthera Leo' کہا جاتا ہے۔ اس نام میں Leo جنس اور Panthera نوع ہے۔ غالباً، یہ کتاب پڑھنے والا ہر شخص اصل میں Homo Sapien ہے۔ Sapien جنس اور Homo نوع ہے۔ Sapien کا مطلب 'خردمند' اور Homo کا مطلب 'آدمی' ہے۔ یعنی، ہم انسان یا آدمیوں کی جنس میں خردمند آدمی نامی نوع ہیں۔ ہم بنی نوع انسان۔۔۔ یعنی خردمند آدمی ہیں۔

مختلف انواع جمع ہو کر ایک خاندان تشکیل دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر بلیوں کی سبھی انواع مل کر اپنا خاندان بناتی ہیں جس میں شیر، چیتے، پالتو بلیاں وغیرہ سبھی شامل ہیں۔ کتوں کے خاندان میں بھیڑیے، لومڑ، گیدڑ اور پالتو کتوں کی انواع شامل ہیں۔ ہاتھیوں کا اپنا خاندان ہے جس میں خود ہاتھی اور ہاتھیوں کے معدوم آباء مدندے، فیل اور میمتھ ہاتھی شامل ہیں۔ ایک خاندان میں شامل تمام انواع اور اجناس، اپنا حسب و نسب اپنے جد امجد کے ساتھ چاہے وہ شاہ مادر ہو یا شاہ پدر۔۔۔ تلاش کر کے جوڑ سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر، یہ جو بلیاں ہوتی ہیں۔۔۔ ایک پالتو بلی کے معصوم بچے سے لے کر غضب ناک شیر، سبھی بلیوں کے آباء ایک ہی تھے جو پچیس لاکھ سال پہلے اس دھرتی کی خشکی پر دندنایا کرتے تھے۔

جیسے باقی، ویسے ہی خردمند آدمی بھی ایک خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ اب کہنے کو تو یہ ایک فرسودہ اور معمولی سی حیاتیاتی حقیقت ہے لیکن۔۔۔ حیاتیات سے نکل کر جب ہم انسانی تاریخ میں پہنچتے ہیں تو یہ تاریخ کا سب سے چھپا کر رکھا گیا راز بن جاتا ہے۔ وہ اس لیے کہ انسان نے ہمیشہ ہی خود کو دوسرے جانوروں سے الگ سمجھنے کو ترجیح دی ہے۔ ایسے، جیسے باقی مادی اور یہ غیر مادی ہو۔ گویا، اس کے بھائی بہن، کوئی ہمزاد نہیں تھے۔ سب سے اہم، تاریخ بھر میں ایسا مانا گیا ہے جیسے انسان کے آباء و اجداد کوئی نہیں ہیں۔ ایک تو یتیم ہوتا ہے لیکن انسان تو گویا، ایسا یتیم مشہور کیا گیا ہے جس کے والدین سرے سے کبھی رہے ہی نہیں ہیں۔ آپ اس حقیقت سے بھلے منہ موڑ لیں، آپ کو یہ سچ راس آئے یا نہیں۔۔۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہم سب انسان ایک بہت ہی بڑے اور نہایت ہنگامہ خیز، شور و غل مچانے والے بے دم افریقی بن مانس کے بڑے بوزنوں کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہمارے اس خاندان میں سب سے قریبی رشتہ دار افریقی بندر، گوریلے اور نس ناس وغیرہ، آج بھی دنیا میں پائے جاتے ہیں۔ ان میں افریقی بندر تو ہمارے سب سے قریبی ہیں۔ وہ یوں کہ آج سے صرف ساٹھ لاکھ سال پہلے ایک مفرد بوزنی کے یہاں دو بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ ان میں سے ایک تمام بندروں کی اماں تھی اور دوسری کے یہاں پیدا ہونے والی بیٹی کی اولاد سارے انسان ہیں۔

کوٹھڑی میں ڈھانچہ

یہ تو صرف ایک راز ہے۔ انسانوں نے تاریخ کی بند کوٹھڑی میں اس سے بھی بڑا اور ایک نہایت بھیانک راز بھی چھپا رکھا ہے۔ اصل راز صرف یہ نہیں ہے کہ ہمارے کئی غیر مہذب اور وحشی عمزاد پائے جاتے ہیں۔ ایک وقت ایسا بھی تھا جب ہمارے کئی سگے بہن بھائی بھی ہوا کرتے تھے۔ آج آدمی یہ سوچ کر خوش رہتا ہے کہ غالباً صرف وہ اور صرف وہی انسان ہے۔ اس سوچ کی ایک معقول وجہ بھی ہے کیونکہ پچھلے دس ہزار سال سے اس کرہ ارض پر ہماری نوع، یعنی خردمند آدمی انسانوں کی باقی رہ جانے والی واحد نوع ہے۔ یہ معاملہ پیچیدہ ہے تو دھیان ضروری ہے۔ تو سنیے۔۔۔ یہ جو لفظ ہے بشر یا انسان، اس کا اصل مطلب کیا ہے؟ اس کا لفظ بہ لفظ مطلب ہے: 'ایک ایسی مخلوق یا جانور جو 'Homo' نامی جنس سے تعلق رکھتی ہے'۔ اس جنس میں آج کے جدید انسان کے علاوہ بھی کئی دوسری انواع کے انسان پائے جاتے تھے۔ اس کتاب کے آخری باب میں ہم دیکھیں گے کہ جلد یا بدیر، مستقبل میں ایسا ممکن ہے کہ اس دنیا میں ہم جس نوع انسانی سے تعلق رکھتے ہیں۔۔۔ غالباً، وہ بھی باقی نہ بچ پائے گی۔ انسان، یعنی ہم خردمند آدمیوں کا مخصوص نام بھی باقی نہ رہے بلکہ نوع انسانی کی بالکل ایک نئی جنس سامنے آسکتی ہے۔ اسی نکتے کی وضاحت کے لیے اس کتاب میں جب 'آدمی' کا لفظ استعمال میں آئے تو اس سے مراد Homo Sapiens یا ہم جدید انسان ہیں۔ جبکہ 'انسان' کا عمومی لفظ 'نوع انسانی' کی تمام اجناس اور نسلوں بشمول 'خردمند آدمی' کے لیے مختص کیا گیا ہے۔

تو، انسان نے آج سے پچیس لاکھ سال پہلے مشرقی افریقہ میں افریقی بندر کی نوع 'جنوبی بندر' سے بتدریج ارتقاء حاصل کی۔ بیس لاکھ سال پہلے قدیم انسانوں نے اپنا اصل گھر چھوڑا اور مشرقی افریقہ کے باقی حصوں کے ساتھ ساتھ یورپ اور ایشیاء میں بھی آن کر بس گیا۔ اب شمالی یورپ کے برفیلے اور سرد جنگلوں میں بقاء کے لیے ایک طرح جبکہ انڈونیشیاء کے گرم اور مرطوب جنگلوں میں دوسری طرح کی خاصیتوں کی ضرورت تھی۔ چنانچہ، یہاں سے انسان ارتقاء کے مختلف راستوں پر گامزن ہو گئے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انسانوں کی کئی انواع وجود میں آگئیں۔ سائنسدانوں نے ان میں سے ہر نوع کی شناخت کے لیے مختلف لاطینی نام دے دیا ہے۔
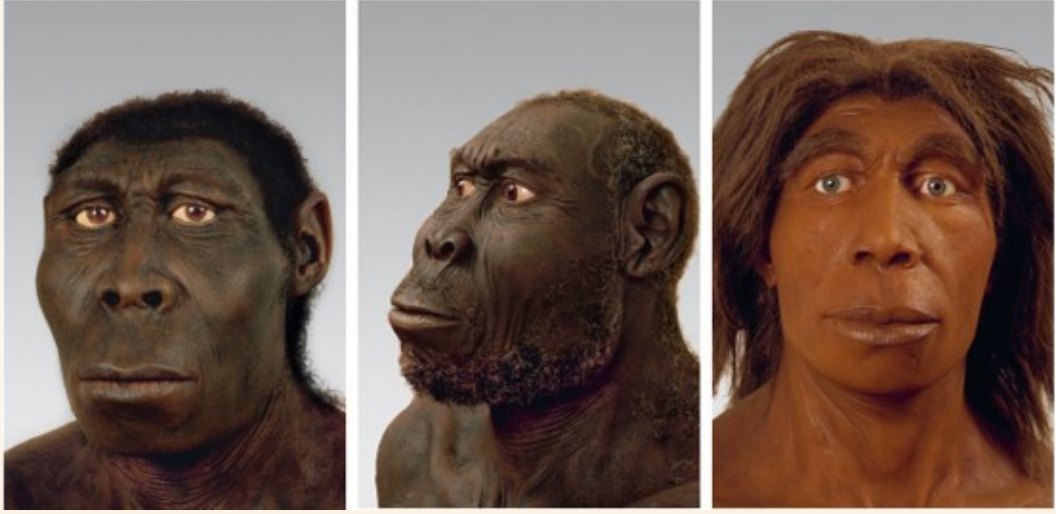
2: ہمارے عمزاد انسانوں کی تصوراتی شبیہ (دائیں سے بائیں) نینڈر تھل (یورپ اور مغربی ایشیاء)، کھڑا آدمی (مشرقی ایشیاء) اور روڈولف (مشرقی افریقہ)۔ یہ سب انسان تھے۔

یورپ اور مغربی ایشیاء میں بسر کرنے والے انسانوں کو Homo Neanderthalensis یا 'نینڈر تھل انسان' کہا جاتا ہے۔ اس کا مطلب، نینڈر تھل کی وادی میں بسر کرنے والا انسان ہے۔ نینڈر تھل انسان، ہم یعنی خرد مند آدمیوں سے زیادہ بھاری بھر کم اور مضبوط ہوا کرتے تھے جو یورپ کی یخ بستہ سردی سے نبٹنے کی خوب صلاحیت رکھتے تھے۔ ایشیاء کے مشرقی حصوں میں Homo Erectus یا 'کھڑا آدمی' آباد تھا۔ کھڑا آدمی، قریباً بیس لاکھ سال تک باقی رہا۔ جس کی وجہ سے اسے انسانوں کی سب سے پائیدار نوع یا قسم قرار دیا جاتا ہے۔ کھڑے آدمی کا یہ ریکارڈ شاید ہم خرد مند آدمی یعنی جدید انسان بھی توڑنے میں ناکام ہی رہیں گے۔ آج تو یہ حالات ہیں کہ ہم اگلے ایک ہزار سال تک بھی اپنی بقا کی گارنٹی نہیں دے سکتے، بیس لاکھ سال تک باقی رہنا تو بہت ہی دور کی بات ہے۔

انڈونیشیا میں جاوا کے جزیرے پر، Homo Soloensis یا 'سولو انسان' کی بسر تھی۔ اس سے مراد، سولو کی وادی میں بسنے والا انسان ہے۔ انسان کی یہ نسل خط جدی اور سرطان کے بیچ خط استوائی گرم مرطوب موسم میں بسر کرنے کی اہل تھی۔ انڈونیشیا کے ہی ایک دوسرے جزیرے جسے فلوریز کہا جاتا ہے۔۔۔ وہاں قدیم آدمیوں کی ایک قسم بونے پن کے عمل سے گزری۔ فلوریز کے جزیرے پر انسان کی پہنچ اس وقت ہوئی جب یہاں سمندر کی سطح انتہائی کم ہو گئی تھی۔ اس دور میں فلوریز جزیرے پر پہنچنا خاصا آسان ہو گیا تھا۔۔۔ لیکن جب سمندر کی سطح دوبارہ بڑھی تو انسانوں کی ایک کثیر تعداد اس جزیرے پر ہی مقید ہو کر رہ گئی۔ اب یہاں وسائل کی کمی تھی۔ بھاری بھر کم انسان، جنھیں خوراک کی زیادہ ضرورت تھی، سب سے پہلے مرے۔ چھوٹے قد اور جسم والے بقا کے معاملے میں بہتر رہے۔ نسل در نسل، فلوریز کے انسانوں کے قد کم سے کم تر ہوتا گیا اور اس جزیرے پر بونے ہی بونے باقی رہ گئے۔ انسانوں کی اس انوکھی اور نادر قسم کو

سائنسدانوں نے Homo Floresiensis کا نام دے رکھا ہے۔ انسان کی اس قسم کا قد زیادہ سے زیادہ سوا تین فٹ ہوا کرتا تھا اور وزن پچیس کلو گرام سے زیادہ نہیں تھا۔ اس کے باوجود، ان بونے انسانوں نے نہ صرف پتھر سے بنے ہتھیار ایجاد کیے بلکہ اس جزیرے پر بسر رکھنے والے ہاتھیوں کا شکار بھی سیکھ لیا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس جزیرے پر ملنے والی باقیات سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں ہاتھی بھی بونے ہی ہوا کرتے تھے۔

2010ء میں انسانوں کی ایک اور نوع کا بھی پتہ چلا ہے۔ سائنسدان سائبیریا کے غاروں میں کھدائی کر رہے تھے اور انھیں انگلی کی ایک ہڈی ملی۔ اس ہڈی کے جینیاتی جائزے سے پتہ چلا کہ یہ انگلی انسان کی اس نسل سے تعلق رکھتی ہے جس کا اس سے قبل ہمیں علم نہیں تھا۔ سائنسدانوں نے انسان کی اس قسم کو Homo Denisova کا نام دیا ہے۔ اس سے مراد، ڈینی سوا کا وہ غار ہے جہاں سے یہ ہڈی دریافت ہوئی تھی۔ کون جانتا ہے کہ ہمارے ان کے علاوہ اور کتنے انسانی رشتہ دار ہوا کرتے تھے؟ کون کون سی انواع، اجناس اور نسلیں ہوا کرتی تھیں؟ ہمیں ابھی تک پتہ ہی نہ ہو گا لیکن کسی غار، دور دراز جزیرے یا کسی دوسرے دیار میں ان کی باقیات دریافت ہونے کے لیے ابھی بھی مدفن پڑی ہوں گی؟

جیسے یورپ اور ایشیاء میں انسانوں کی مندرجہ بالا انواع ارتقاء کے عمل سے گزر رہی تھیں بالکل ویسے ہی انسان کے آبائی مشرقی افریقہ میں بھی یہ ارتقاء کا عمل ویسے کا ویسا ہی جاری رہا۔ یہاں انسان کی کئی مزید انواع نے جنم لیا۔ ان میں 'Homo Rudolfensis' یا 'جھیل روڈولف کے باسی انسان'، Homo Ergaster یا 'کام دار انسان' اور خود ہماری یعنی جدید انسان کی نوع 'Homo Sapiens' یا 'خردمند آدمی' بہت ہی مشہور ہیں۔

انسانوں کی ان اقسام میں بعض تو بھاری بھر کم، کچھ مناسب اور باقی بونے ہوا کرتے تھے۔ ان میں خونخوار اور غضب ناک شکاری بھی پائے جاتے تھے اور کچھ تو بیچارے، مریل اور جڑی بوٹیاں جمع کر کے گزارہ کرتے تھے۔ ان میں سے کچھ ایک ہی جزیرے پر بسر رکھتے رہے جبکہ بڑی تعداد ایک سے دوسرے، اور پھر تیسرے براعظم میں ہجرت کرتے رہے۔ یہ سب انسان تھے۔ یہ سارے ہی بشر تھے۔۔۔ انسانوں میں ہم آدمی، بلکہ کہیے جیسا کہ ہمارا پورا نام ہے، "خردمند آدمی' ضرور ہیں لیکن انسانوں میں انسان صرف ہم ہی نہیں ہیں۔

ہمیں ایک عام مغالطہ یہ بھی ہے کہ شاید نوعِ انسانی کا سلسلہ نسب ایک سیدھی لکیر کی مانند ہے۔ سیدھی لکیر سے مراد یہ کہ گویا، کام دار انسان سے کھڑا آدمی پیدا ہوا۔ کھڑے آدمی نے نینڈر تھل کو جنم دیا ہو اور نینڈر تھل ارتقاء کے عمل سے گزر کر ہم، یعنی خردمند آدمی بن گئے ہوں۔ ایسا کچھ نہیں ہے۔ اس سیدھی لکیر جیسے سلسلہ نسب سے تو یوں لگتا ہے کہ جیسے ایک وقت میں، اس دنیا میں نوعِ انسانی کی صرف ایک ہی جنس، ایک ہی نسل بسر رکھتی تھی اور پچھلی ساری انواع کے ارتقاء کا نتیجہ، آج کا جدید انسان یا ہم خرد آدمی کی شکل میں موجود ہیں۔ ایسا کچھ نہیں ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ پچھلے بیس لاکھ سال سے لے کے دس ہزار سال پہلے تک یہ دنیا ایک ہی وقت میں کئی کئی

انواع اور کئی دوسری طرح کے انسانوں کا گھر ہوا کرتی تھی۔ ایسا ہو رہنا، کوئی اچنبھے کی بات بھی نہیں ہے۔ آج ہم اپنے ارد گرد دیکھتے ہیں کہ مثلاً، لومڑوں کی کئی انواع و اقسام پائی جاتی ہیں۔ ریچھ طرح طرح کے ہیں اور بندر کی تو بہت ساری اقسام ہیں۔ آج سے دس ہزار سال پہلے کی دنیا میں کم از کم چھ مختلف طرح کے انسان پائے جاتے تھے۔ یہ تو آج، ہمارا اختصاص اور امتیاز ہے کہ ہم انسانوں کی کسی دوسری قسم کے بارے سنتے ہیں تو عجیب محسوس کرتے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ شاید ہم اس دنیا میں بطور آدمی۔۔۔ انسان کی یکتا شکل ہیں۔ ایسی بھول رکھنا، ہماری غلط فہمی ہے اور اس کی تردید کرنے والے کو باقاعدہ مجرم سمجھا جاتا ہے۔ ہم آگے چل کر یہ بھی دیکھیں گے کہ ایسا کیوں ہے۔ ہم آدمیوں کے پاس اس غلط فہمی کو پالنے، اس حقیقت کو آشکار کرنے والوں کو باقاعدہ مجرم سمجھنے اور یکتائی کا ڈھنڈورا پیٹنے کی خاصی معقول وجہ ہے۔

سوچ کی قیمت

انسانی جنس میں اس قدر تفریق کے باوجود ہماری سبھی انواع میں کئی ایسی خصوصیات ہیں جو سب کے لیے مشترک رہی ہیں۔ ان میں سب سے اہم خاصیت دماغ سے متعلق ہے۔ وہ یوں کہ انسانوں کا دماغ دوسرے جانوروں کی نسبت غیر معمولی حد تک بڑا ہوتا ہے۔ وہ ممالیہ جانور جن کا وزن تقریباً ساٹھ کلو گرام تک ہے، ان کے دماغ کا اوسط سائز دو سو کیوبک سینٹی میٹر تک ہو سکتا ہے۔ پچیس لاکھ سال پہلے، قدیم مرد اور عورتوں کا دماغ تقریباً چھ سو کیوبک سینٹی میٹر ہوا کرتا تھا۔ آج جدید انسان کا دماغ اوسطاً بارہ سو سے چودہ سو کیوبک سینٹی میٹر ہوا کرتا ہے۔ نینڈرتھل کا دماغ تو اس سے بھی کہیں بڑا ہوا کرتا تھا۔

ارتقاء کی نظر سے دیکھا جائے تو دماغ کا سائز کوئی اتنی اہم خاصیت نہیں ہے۔ یہ تو صرف ہم ہیں کہ اپنی ذہانت کے سخت شیدا ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اگر صرف دماغی صلاحیت کی بات آئے تو پھر ہم سب سے برتر ہیں۔ لیکن اگر ایسی ہی کوئی بات ہوتی تو پھر بلیوں کے خاندان میں ایسی ایسی بلیاں پیدا ہوا کرتیں جو اور کچھ نہ سہی، کم از کم اپنے دماغی سائز کی نسبت سے ریاضی کے پیچیدہ مسائل کا حل تو نکال ہی لاتیں؟ لیکن اہم سوال یہ ہے کہ جانوروں کی مملکت میں واحد انسان کی ہی انواع سوچنے کی اتنی بڑی مشین کی مالک کیوں ہیں؟

سائنسی حقیقت یہ ہے کہ دماغ جتنا بڑا ہو گا، اس پر جسم کی توانائی بھی اتنی ہی زیادہ خرچ ہو گی۔ یہی نہیں بلکہ سر کے اوپر اتنا بڑا اعضو تھام کر گھومنا پھرنا بھی آسان نہیں ہے۔ بالخصوص، جب دماغ کو ایک انتہائی سخت اور وزنی خول یعنی کھوپڑی سمیت سنبھالنا پڑتا ہے۔ یوں دماغ کے لیے درکار توانائی کی ضرورت پوری کرنا انتہائی مشکل کام ہے۔ انسانوں کے یہاں دماغ کا وزن باقی جسم کے تناسب سے تقریباً دو یا تین فیصد ہوتا ہے لیکن یہ جسم کی پچیس فیصد توانائی خرچ کر دیتا ہے۔ یاد رہے، یہ پچیس فیصد بھی اس وقت ہے جب جسم آرام اور سکون کی حالت میں ہوتا ہے۔ انسانوں کے مقابلے میں دوسرے افریقی بندروں کے دماغ کو سکون اور آرام کی حالت میں

صرف آٹھ فیصد توانائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ قدیم انسان نے اپنے بڑے دماغوں کی قیمت دو طرح سے ادا کی ہے۔ پہلی تو یہ کہ انھیں خوراک کی تلاش دوگنی چوگنی کرنی پڑتی تھی اور دوم یہ کہ ان کے پٹھے وقت کے ساتھ گل کر سکڑتے چلے گئے۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے حکومتیں دفاع کی مد میں بجٹ کٹوتی کر کے تعلیم پر خرچ کیا کرتی ہیں۔ انسانی جسم نے بھی توانائی کو مضبوط پٹھوں سے ہٹا کر دماغی صلاحیتوں اور اعصاب پر صرف کرنا شروع کر دیا۔ آج یہ عیاں ہے کہ تب انسانی جسم کی یہ ارتقائی حکمت عملی کسی وسیع و عریض جنگل میں بقا کے لیے نہایت خوب رہی ہے۔ ایک بن مانس، انسان کے ساتھ بحث میں ہر گز نہیں جیت سکتا لیکن وہ ایک آدمی کو کسی بونے کی طرح منٹوں کے اندر چیر پھاڑ کر ضرور رکھ سکتا ہے۔

یہ لاکھوں سال پہلے کی اسی ارتقائی حکمت عملی کا نتیجہ ہے کہ انسان آج خوب موج میں ہے۔ اس دور کی قربانی نے تب سے آج تک آدمی کو خوب نوازا ہے۔ آج ہم اسی دماغ کو استعمال میں لا کر گاڑیاں اور بندوقیں ایجاد کرتے ہیں۔ ہم گاڑیوں پر سوار ہو کر بن مانسوں سے زیادہ تیز بھاگ سکتے ہیں اور بندوق چلا کر دوبدو لڑائی لڑنے کی بجائے محفوظ فاصلے پر رہ کر کسی بھی غصیلے بن مانس کو سیکنڈوں میں ہلاک کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ لیکن، یہ گاڑیاں اور بندوقیں تو آج کی باتیں ہیں۔ بیس لاکھ سال تک انسانی اعصاب اور دماغ نے سوائے بڑھنے کے اور کچھ حاصل نہیں کیا۔ اس دور میں انسانی دماغ نے سوائے چقماق (تہہ دار پتھر کی ایک قسم) کے کھنڈے چاقوؤں اور تیز دھار سوئیوں کے سوا کچھ بھی ایجاد نہیں کیا۔ اس دور میں انسان کی حالت کچھ ایسی دیکھنے لائق بھی نہیں تھی۔ تب انسان ایک حقیر جانور ہوا کرتا تھا۔ پھر، یہاں ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ اس سارے عرصے کے دوران انسانی دماغ کی اس غیر معمولی بڑھوتری کی وجہ کیا تھی؟ سچی بات یہ ہے کہ ہم اس سوال کا قطعی جواب دینے سے ابھی تک قاصر ہیں۔

ایک دوسری خصلت جو سارے انسانوں میں یکساں ہے، وہ دونوں ٹانگوں پر سیدھا کھڑے ہو کر چل پھرنے کی صلاحیت ہے۔ سیدھا کھڑنے ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جنگلوں اور میدانوں میں دور تک نظر دوڑانے، دشمن اور شکار دونوں پر نظر رکھنے میں سہولت ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس قابلیت سے دونوں ہاتھ حرکت کرنے کے لیے لازمی نہیں رہتے اور آدمی دوسرے کاموں، جیسے پتھر پھینکنے اور اشارے کرنے میں آزاد ہو جاتا ہے۔ یہ ہاتھ جس قدر ہنر مند ہوں، حامل انسان اتنا ہی زیادہ کامیاب ہو سکتا تھا۔ چنانچہ، اسی وجہ سے ارتقائی عمل نے بھی ساتھ دیا اور آج ہم دیکھتے ہیں کہ انسان کی ہتھیلیوں اور انگلیوں میں عصبی نسوں کی تعداد باقی جسم کے مقابلے میں بڑھ کر ہے اور پٹھے انتہائی خوبی سے ہم آہنگ ہوتے ہیں۔ انسانی ہاتھ اور انگلیاں، ہر طرح سے حرکت کر سکتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انسان ہاتھوں سے انتہائی پیچیدہ اور پیچ در پیچ الجھے ہوئے کام سرانجام دینے کے قابل ہے۔ بالخصوص، انسان ان ہاتھوں کو استعمال میں لا کر نہایت ثقیف اور نفیس آلات اور ہتھیار ایجاد کر سکتا ہے اور انھیں نہایت خوبی کے ساتھ ہنر مندی سے استعمال میں بھی لا سکتا ہے۔ اوزاروں اور

ہتھیاروں کی ایجاد اور استعمال پچیس لاکھ سال سے جاری ہے۔ آثار قدیمہ کے ماہرین نے قدیم انسانوں کی پہچان بھی انھی اوزاروں اور ہتھیاروں کی کاری گری اور استعمال کے ساتھ جوڑ رکھی ہے۔

تاہم، دونوں ٹانگوں پر سیدھا کھڑے ہو کر چلنے پھرنے کے کئی نقصانات بھی ہیں۔ ہمارے آباء کا جو ڈھانچہ تھا، وہ لاکھوں برس کے ارتقاء کے بعد چاروں ٹانگوں پر چلنے پھرنے کے لیے اور ایک چھوٹے سے دماغ کی مالک مخلوق کا ہی تھا۔ یوں، سیدھا ہو کر دو ٹانگوں پر کھڑا ہو پانا، بالخصوص سر پر بھاری بھرکم کھوپڑی بھی اٹھانی پڑتی تھی۔ نوع انسانی اپنی تیز طرار نظر، بصیرت اور کاری گر ہاتھوں کی قیمت آج بھی کمر کے درد اور اکڑی ہوئی گردن کی شکل میں ادا کر رہا ہے۔

خواتین کو تو اس ضمن میں کہیں بڑھ کر قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ اوپر کی طرف، سیدھا ہو کر دو ٹانگوں پر چلنے پھرنے کے لیے تنگ اور چھوٹے کولہوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن اس تنگی کے نتیجے میں، بچہ دانی کا راستہ بھی خاصا تنگ ہو جاتا ہے۔ ایک طرف تو یہ اور دوسری جانب انسانی بچوں کے دماغ روز بروز بڑے ہی ہوتے جا رہے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ زچگی کے دوران عورتوں کی اموات سب سے بڑا خطرہ بن کر سامنے آ گیا۔ وہ عورتیں جو وقت سے پہلے، جب بچے کا سر اور دماغ چھوٹا ہوا کرتا تھا۔۔۔ بچہ جن دیتیں تو ان کے بچنے کی امید بھی زیادہ ہوتی تھی اور وہ زیادہ سے زیادہ بچے بھی پیدا کرتی تھیں۔ چنانچہ، قدرت نے بھی اسی سمت میں انسانوں کے یہاں قبل از وقت بچے جننے کے عمل میں ساتھ دیا۔ دوسرے جانوروں کی نسبت انسانوں میں بچے، اسی لیے غیر پختہ اور نورسیدہ پیدا ہوتے ہیں جبکہ ابھی ان کے اہم اور لازمی اعضاء بھی نمو کے عمل سے پوری طرح گزرے نہیں ہوتے۔ گھوڑے کا بچہ، پیدائش کے فوراً بعد۔۔۔ چند گھنٹوں کے اندر اندر اٹھ کر اپنی ٹانگوں پر دوڑ لگا سکتا ہے۔ بلی کا بچہ چند ہفتوں کے اندر ہی اپنی ماں کے پلو سے دور ہو جاتا ہے لیکن انسان کے یہاں بچے لاچار ہوتے ہیں اور کئی کئی برسوں تک ماں کے پلو سے چمٹے رہتے ہیں۔ انھیں سالہا سال تک غذا، حفاظت اور تربیت کی ضرورت ہوتی ہے۔

انسانوں کے یہاں پائی جانے والی بے مثال سماجی خاصیتوں کا اصل راز بھی یہی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ امر انسانی دنیا میں لاتعداد سماجی مسائل کی جڑ بھی یہی ہے۔ اس زمانے میں اکیلی مائیں نوزائیدہ بچوں کی کفالت اور خوراک جمع کرنے کا کام اکٹھا نہیں کر سکتی تھیں۔ چھوٹے چھوٹے بچے، ہر وقت پلو کے ساتھ لپٹے ہوں تو کار زندگی خاصے مشکل ہو جاتے ہیں۔ اسی لیے انھیں بچے پال کر بڑا کرنے کے لیے خاندان کے دوسرے افراد اور پڑوسیوں کی مستقل مدد کی ضرورت رہتی تھی۔ ایک انسان کو پال پوس کر بڑا کرنے کے لیے پورے قبیلے کی ضرورت ہوتی ہے۔ چنانچہ، ارتقاء نے ایک دفعہ پھر جادو کی چھڑی گھمائی اور انسانوں میں ان انسانوں کی بقاء کو ترجیح دی جو مضبوط سماجی بندھن اور رشتے بنانے کے اہل تھے۔ علاوہ ازیں، انسان چونکہ لاچار اور کم آشکار پیدا ہوتا ہے تو اس کو دوسرے جانوروں کی نسبت تعلیم دینا، سماجی اطوار سکھانا اور قبیلے کا حصہ بنانا زیادہ آسان اور امکان کہیں بڑھ کر ہو سکتا ہے۔ تقریباً سبھی ممالیہ جانوروں میں بچے

ماں کی کوکھ سے ایسے پیدا ہوتے ہیں جیسے بھٹی میں پک کر نکلے ہوئے مٹی کے برتن ہوتے ہیں۔ ایسے برتنوں کو دوبارہ ڈھالنے کا نتیجہ ٹوٹ پھوٹ اور کھرچنوں کے سوا کچھ نہیں نکل سکتا۔ لیکن انسان اپنی ماں کی کوکھ میں سے ایسے نکلتا ہے جیسے کسی بھٹی میں سے گداختہ، گرمی سے پگھلا ہوا شیشہ ہوتا ہے۔ اس گداختہ شیشے کو آپ کسی بھی شکل میں ڈھال سکتے ہیں، اسے ایک حد تک کھینچا بھی جاسکتا ہے۔ اسے گھمایا اور کسی بھی فرمے میں ڈال کر فٹ بھی کیا جاسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہم اپنے بچوں کو ہر طرح کی تعلیم، اپنی مرضی کی تربیت دے سکتے ہیں۔ آدمی جب اپنے بچوں کو تعلیم دیتا ہے تو وہ عیسائی اور بدھ۔۔۔ ہندو اور مسلمان بن کر جوان ہوتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک ہی جگہ پر کچھ لوگ سرمایہ دار اور دوسرے اشتراکیت پر یقین رکھتے ہیں۔ کسی کا بیٹا جنگجو اور دوسرے کا امن پسند ہوا کرتا ہے۔

ہم یہ فرض کر لیتے ہیں کہ ایک بڑا دماغ، اوزاروں اور ہتھیاروں کے استعمال، سیکھنے کی بے پناہ صلاحیت اور پیچیدہ سماجی ساخت کے بڑے فائدے ہیں۔ یہ صاف ظاہر ہے کہ انہی صلاحیتوں کی بدولت انسان کرہ ارض پر سب سے طاقتور جانور بن کر ابھرا ہے۔ لیکن، یہ بھی یاد رہے کہ انسان کو یہ خاصیتیں پچھلے بیس لاکھ برس سے حاصل رہی ہیں۔ تاہم، اس سارے عرصے کے دوران انسان تمام مخلوقات کے بیچ انتہائی کمتر، حقیر اور کمزور ہی رہا ہے۔ وہ انسان جو آج سے دس لاکھ سال پہلے تک اس دنیا میں بسر رکھتا تھا۔۔ اگرچہ اس کا دماغ بڑا اور اس کے ہاتھ میں پتھر سے بنے ہتھیار اور اوزار بھی ضرور تھے لیکن وہ ہر وقت شکاری جانوروں سے سہم کر بسر کیا کرتا تھا۔ اس میں خود سے بڑے جانوروں کے شکار کی ہمت نہیں تھی، اسی لیے نباتات جیسے جھاڑ پھونس جمع کر کے گزارہ کیا کرتا تھا۔ وہ کیڑے مکوڑے کھود کر نکالتا تھا اور پیٹ بھرتا تھا۔ اس کا بس چھوٹے جانوروں پر ہی چلتا تھا۔ اس زمانے میں یہ سب سے زیادہ۔۔۔ مضبوط اور بڑے گوشت خور جانوروں کے شکار کی سڑی اور مردار لوتھوں کی باقیات کا شیدا ہوا کرتا تھا۔

انسان نے پہلے پہل، پتھر سے جو ہتھیار ایجاد کیے۔۔۔ ان میں سب سے معروف وہ تھے جو ہڈیوں کو توڑ کر مغز نکالنے کے کام آتے تھے۔ محققین کا خیال تو یہ بھی ہے کہ یہی ہماری اصلیت اور رتبہ ہے۔ جس طرح ہدہد درختوں کی چھال میں سے کیڑے نکال کر کھانے کا ماہر ہوتا ہے، قدیم انسان مرداروں کی ہڈیاں توڑ کر مغز نکالنے کا ماہر تھا۔ لیکن، آخر مغز ہی کیوں؟ یہ سمجھنے کے لیے فرض کریں کہ شیروں کا ایک جتھا کسی زرافے کا شکار کر رہا ہے۔ وہ زرافے کو گراتے ہیں اور فوراً ہی چیر پھاڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ آپ دور بیٹھے شیروں کو زرافے کی چمڑی، گوشت اور خون سے پیٹ بھرتے دیکھ رہے ہیں۔ شیر سیر ہو کر نکل لیتے ہیں لیکن آپ ابھی بھی اس زرافے کی باقیات کی جانب بڑھنے کی جرات نہیں کرتے، کیونکہ اب لگڑ بگڑوں اور گیدڑوں کی باری ہے۔ لگڑ بگڑ اور گیدڑ زرافے کی باقیات کو بھنبھوڑ کر باقی ماندہ گوشت، چمڑی اور خون چٹ کر جاتے ہیں۔ اب، آپ اس مردار کی نعش پر جا کر پہنچتے ہیں تو سوائے ڈھانچے کے کچھ

نہیں پاتے۔ آپ اپنے ارد گرد تسلی کر کے، ڈرتے اور سہم کر اس ڈھانچے کی ہڈیوں کو توڑ توڑ کر جو باقی کھانے لائق بچتا ہے، وہ جمع کر لیتے ہیں۔

یہ مثال ہماری، یعنی نوع انسانی کی تاریخ اور نفسیات کو سمجھنے کے لیے انتہائی ضروری ہے۔ اس دور میں نوع انسانی خوراک کی زنجیر میں اگر بہت نیچے نہ سہی۔۔۔ بہت اوپر بھی نہیں تھی۔ بلکہ کہیے اب سے کچھ عرصہ پہلے تک ہمارا مقام اس زنجیر کے وسط میں رہا کرتا تھا۔ لاکھوں سال تک انسانوں نے چھوٹی مخلوقات کا شکار کیا اور وہ جمع کرتا رہا جو اس کے بس کی بات تھی۔ دوسرے جانور، بالخصوص گوشت خور جانور نہایت آرام سے انسان کا شکار کر لیتے تھے۔ یہ تو صرف چار لاکھ سال پہلے کی بات ہے کہ انسانوں میں بعض نے باقاعدہ بڑے جانوروں کا شکار شروع کیا۔ یہی نہیں بلکہ صرف ایک لاکھ سال پہلے، جب نوع انسانی نے واقعی ابھر کر ترقی شروع کی تو وہ اچھل کر خوراک کی زنجیر پر سب سے اوپر براجمان ہو گیا۔

خوراک کی زنجیر کے وسط سے اٹھ کر سیدھا، سب سے اوپر چڑھ جانے کے غیر معمولی اور دیوسا نتائج بر آمد ہوئے۔ شیر اور شارک مچھلیوں جیسے جاندار لاکھوں سال پر محیط ارتقاء کے بعد خوراک کے اہرام کی چوٹی پر پہنچے تھے۔ یعنی، ان کی ترقی کی رفتار انتہائی سست تھی۔ اس سست روی کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ ماحول کے قدرتی نظام کو خوراک کی زنجیر کو متوازن رکھنے اور اس کی پڑتال کرنے کا موقع مل جاتا تھا۔ مراد یہ ہے کہ شیر اور شارک مچھلیاں بھلے کچھ بھی کر لیں، وہ اپنی استعداد سے بڑھ کر اور بڑے پیمانے پر تباہی یا گڑبڑ پیدا نہیں کر سکتے تھے۔ ارتقاء یہ ہے کہ جیسے جیسے شیر پہلے سے بڑھ کر خونخوار ہوئے، ہرنوں نے بھی تیز دوڑنا سیکھ لیا۔ لگڑ بگڑ بھی اب پہلے سے کہیں بڑھ کر شیروں کے ساتھ تعاون کرنے لگے تھے۔ بھاری بھر کم گینڈے اب پہلے سے کہیں زیادہ غصہ ناک ہو چکے تھے۔ اس کے برعکس، نوع انسانی نے جتنی تیزی سے ارتقائی عمل میں جست لگا کر خوراک کی زنجیر میں سب سے اوپر نشست سنبھالی تھی، ماحول کے قدرتی نظام کو اس کے ساتھ پاؤں سے پاؤں ملانے، ڈھلنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ یہی نہیں بلکہ خود انسان بھی اس ترقی کے ساتھ ہم آہنگ ہونے میں ناکام رہا۔ کرہ ارض پر پائے جانے والے سب سے بڑے شکاری، دبدبے اور جبروت کے حامل ہوا کرتے ہیں۔ لاکھوں سال کے اس جلال اور شان نے انھیں خود اعتمادی اور نڈری عطا کی تھی۔ انسان، ان کے مقابلے میں گویا کسی گھسی پٹی، معمولی ریاست کا گھٹیا آمر ثابت ہوا۔ لاکھوں سال پر محیط عرصے تک جنگل میں دبی ہوئی، گری پڑی مخلوق ہونے کے ناطے ہم انسان خوف سے بھرے ہوئے ہیں۔ ہمیں اپنے مقام، رتبے اور درجے کو لے کر ہر وقت پریشانی کا سامنا رہتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہم پہلے سے کہیں بڑھ کر سفاک اور خطرناک ثابت ہوتے ہیں۔ تاریخ میں کئی بڑے حادثات، آفات، جنگیں اور ماحولیاتی تباہیاں انسان کی خوراک کی زنجیر میں اسی جست اور نفسیاتی طور پر خوفزدہ ہونے کا نتیجہ ہے۔

باورچیوں کی نسل

انسان نے خوراک کی زنجیر میں سب سے اوپر براجمان ہونے میں ایک نہایت اہم سنگ میل، آگ پر قابو پا کر پار کیا تھا۔ نوع انسانی میں بعض انسانی نسلیں ایسی بھی ہیں جنھوں نے قریباً آٹھ لاکھ سال پہلے ہی آگ کا استعمال سیکھ لیا تھا۔ تین لاکھ سال پہلے کھڑا آدمی، نینڈر تھل اور ہم، یعنی خردمند آدمیوں کے آباء تقریباًہر روز ہی اس کا استعمال کیا کرتے تھے۔ اب انسان کے ہاتھ روشنی اور گرمائش کا انتہائی موثر ذریعہ آ گیا تھا۔ جہاں یہ، وہیں آگ کی صورت ایک انتہائی خطرناک ہتھیار بھی مل گیا تھا جو خونخوار شیروں اور باقی درندوں کو دور رکھ سکتا تھا۔ کچھ ہی عرصے میں انسانوں نے اپنے ارد گرد علاقوں کو جان بوجھ کر صاف کرنے کی غرض سے آگ کی افادیت کو بھی جان لیا۔ آگ جیسی موزی شے کو حد میں رکھتے ہوئے، ایک گھنے جنگل کی صفائی کے لیے نہایت آسانی سے استعمال میں لایا جا سکتا تھا۔ جب یہ آگ بجھ کر پیچھے راکھ چھوڑ جاتی تو پتھر کے زمانے کے باسی انسان، ان میدانوں میں سے نہایت آسانی کے ساتھ دھوئیں اور آگ میں بھنے ہوئے جانور، گریاں، کھمبیاں اور آلو پیاز وغیرہ کی گنٹھیاں نکال لاتے تھے۔ پھر، اس میدان کی راکھ اور مٹی میں کچھ ہی ہفتوں اور مہینوں کے اندر اونچی اور ہری گھاس اگ آتی تھی۔ اس گھاس کو چرنے دور دور سے گھاس خور جانوروں کے ریوڑ جمع ہوتے تھے۔ انسان، ان جانوروں کا بھی سہولت کے ساتھ شکار کر لیتے تھے۔

انسان کو آگ کا سب سے بڑا فائدہ بہر حال یہ ہوا کہ یہ پکانے کا کام کرتی تھی۔ وہ خوراکیں جو انسان اپنے نظامِ انہظام کی قدرتی معذوری کے سبب ہضم کرنے کے قابل نہیں تھا، اب پکنے کی بدولت ہضم کرنا نہایت آسان ہو گیا۔ ان میں سب سے عام مثال گندم، چاول اور آلوؤں کی ہے۔ یہ آگ میں پکانے کا ہی کرشمہ ہے کہ یہ خام اناج، آج ہماری خوراک کا لازمی جز ہیں۔ آگ نے نہ صرف خوراک کی کیمیائی ہیئیت بدلی، اس نے حیاتیات پر بھی خوب اثر چھوڑا۔ خوراک کو آگ میں پکانے سے جراثیم اور طفیلی کیڑے مر جاتے تھے۔ انسان کو اب اس پکی ہوئی خوراک کو چبانے اور ہضم کرنے میں نہایت آسانی بھی ہو گئی۔ اب خوراک کی نت نئی قسموں کے حصول کی راہیں کھل گئیں۔ پھل، گریاں، سخت خول والے کیڑے مکوڑے اور مردار لاشوں کے ڈھانچوں اور ہڈیوں کو پکانا اور ہضم کرنا ممکن ہو گیا۔ دوسری جانب افریقی بندر تھے، جو دن میں پانچ گھنٹے تو صرف خام خوراک کو چبانے میں صرف کرتے تھے۔ ان کے مقابلے میں انسان، ایک گھنٹے کے اندر ہی خوراک پکا، چبا اور کھا کر ہضم بھی کر لیتا تھا۔

خوراک کو آگ پر پکانے کا عمل ایسا مشہور ہوا کہ اب انسان کو کئی دوسری اقسام کی خوراک بھی میسر آ گئی تھیں۔ اب وہ کھانا جمع کرنے، اسے پکانے اور ہضم کرنے میں نہایت قلیل وقت صرف کرتا تھا۔ نظامِ انہظام بھی اب خوب پھل پھول رہا تھا اور جلد ہی انسان کو بڑے نوکیلے دانتوں کی حاجت باقی نہیں رہی۔ رفتہ رفتہ اس کی آنتیں اور معدے بھی سکڑ کر برابر ہو گئے۔ بعض محققین کا ماننا ہے کہ آگ

کی دریافت اور اس پر کھانا پکا کر کھانے کی صلاحیت کاانسانی آنتوں کی سکوڑ اور انسانی دماغ کی بے پناہ بڑھوتری کے بیچ براہ راست تعلق ہے۔ اب چونکہ آنتیں اور دماغ، دونوں ہی سب سے زیادہ توانائی خرچ کرنے والے عضو ہیں تو ان دونوں کو ایک ساتھ پالنا نہایت مشکل تھا۔ کھانے کو پکانے کا فائدہ یہ ہوا کہ معدے اور آنتوں کو توانائی کی حاجت پہلے کی طرح باقی نہیں رہی تو یوں نینڈرتھل اور ہم آدمیوں کو اپنے دماغ کے سائز بڑھانے میں مدد کی صورت یہ ساری توانائی بیٹھے بٹھائے میسر آگئی تھی۔

آگ نے انسان اور دوسرے جانوروں کے بیچ پہلی متاثر کن خلیج کو بھی جنم دیا۔ باقی جانوروں کی تمام تر صلاحیتوں اور طاقت کا دارومدار ان کے اپنے جسم پر ہوا کرتا ہے۔ ان کے پٹھوں کی مضبوطی، دانتوں کا سائز، نوکیلا پن اور پروں کا پھیلاؤ ہی کسی جانور کی طاقت کا پیمانہ طے کرتا ہے۔ اگرچہ یہ جانور ان جسمانی خاصیتوں کی مدد سے قدرتی وسائل جیسے ہواؤں اور پانی کی لہروں کو استعمال میں لاسکتے ہیں لیکن وہ ہمیشہ ہی اپنے جسمانی ہیئت کے سبب محدود رہتے ہیں۔ اب عقاب کی مثال لیں۔ عقاب زمین سے اوپر اٹھتی ہوئی گرم ہواؤں کے حراری خانوں کو پہچان سکتا ہے۔ وہ انھیں گرم ہواؤں پر اپنے بڑے اور مضبوط پر پھیلا کر اونچی اڑان اڑتا ہے۔ لیکن، عقاب ان گرم ہواؤں کے تھپیڑوں کے مقامات اور جگہوں کو کنٹرول نہیں کرسکتا۔ وہ صرف اور صرف اپنے پروں کو، جہاں یہ گرم ہوائیں چلتی ہوں، استعمال میں لاسکتا ہے۔

دوسری طرف انسان ہے۔ جب اس نے آگ جیسی مضر شے کو زیر کرلیا تو وہ اس لامحدود قدرتی طاقت کو ہر طرح سے استعمال میں لاسکتا تھا۔ عقابوں کے برعکس انسان جب اور جہاں چاہتا، آگ کا شعلہ بھڑکا سکتا تھا۔ اسی طرح اگرچہ عقاب گرم ہواؤں کو صرف اڑنے کے لیے استعمال کرسکتا تھا، انسان آگ کو ایک سے زیادہ، کئی کئی مقاصد کے لیے کارآمد بنا سکتا تھا۔ سب سے اہم تو یہ تھا کہ آگ کی طاقت کو استعمال میں لانے کے لیے انسان کو اپنی شکل، ہیئت، ڈھانچے اور جسمانی طاقت وغیرہ کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں تھی۔ ایک تن تنہا، لاغر اور کمزور عورت بھی دو پتھروں کو رگڑ کر پورے جنگل کو چند گھنٹوں کے اندر جلا کر بھسم کرسکتی تھی۔ آگ کو زیر کرنے کا مطلب تھا، اب نت نئی چیزیں سامنے آئیں گی۔

ہمارے بھائی، نگہبان

آگ کے بے شمار فوائد ہونے کے باوجود، ڈیڑھ لاکھ سال قبل تک انسان پھر بھی کنارہ کش مخلوق ہی تھا۔ اب انسان شیروں کو بھگا سکتا تھا۔ وہ یخ جمی ہوئی راتوں میں خود کو گرم رکھ سکتا تھا اور کبھی کبھار، یہاں اور وہاں پورے کا پورا جنگل جلا دیتا تھا۔ یہ وہ دور تھا کہ انڈونیشائی بحرالجزائر سے لے کر آئبیریائی جزیروں تک۔۔۔ نوع انسانی سے تعلق رکھنے والی ساری نسلوں کی کل تعداد چند لاکھ سے زیادہ نہیں تھی۔ گویا، یہ قدرت کے ماحولیاتی نظام پر ایک غیر اہم نقطے کی مانند تھا۔

ہم جدید انسان، یعنی جو خردمند آدمی ہیں وہ دنیا کے سٹیج پر اس وقت بھی موجود تھے لیکن ہم ابھی تک افریقہ کے ایک کونے میں اپنے کام سے کام رکھے ہوئے تھے۔ ہم قطعی طور پر یہ تو نہیں جانتے کہ ارتقائی عمل میں آدمی غالباً اس جانور نے باقاعدہ آدمی کی اوائل شکل کب اختیار کی لیکن زیادہ تر سائنسدان متفق ہیں کہ ڈیڑھ لاکھ سال پہلے مشرقی افریقہ میں بسر کرنے والے آدمی، بالکل ہماری ہی طرح ہوا کرتے تھے۔ اگر تاریخ کے اس مردہ خانے سے اس زمانے کا کوئی آدمی اٹھ کر کھڑا ہو جائے تو سائنسدان اس قدیم آدمی اور ہم جدید آدمی میں کوئی غیر معمولی فرق دیکھ نہیں پائیں گے۔ یہ آگ کا ہی کرشمہ تھا کہ اس اوائل دور کے آدمیوں کے جبڑے اور دانت اپنے آباء سے چھوٹے تھے۔ ان کے دماغ بھی بڑے تھے بلکہ اتنے ہی بڑے تھے جتنے کہ آج ہمارے ہیں۔

سائنسدان اس پر بھی متفق ہیں کہ ستر ہزار سال قبل ہمارے آباء یعنی خردمند آدمی نے مشرقی افریقہ سے نکل کر پہلے پہل جزیرہ نما عرب میں سکونت اختیار کی اور پھر وہیں سے انتہائی تیزی کے ساتھ یورپ اور ایشیاء کے تقریباً حصوں میں پھیل گئے۔

جب آدمی نے جزیرہ نما عرب میں قدم رکھا تو یورپ اور ایشیاء کے تقریباً حصے پر انسان کی دوسری نسلیں اور انواع پہلے سے ہی بسر کیے ہوئے تھیں۔ ان کے ساتھ کیا ہوا؟ اس بارے، دو مختلف اور متضاد نظریے پائے جاتے ہیں۔ ان میں پہلا، 'خالص نسل کشی کا نظریہ' ہے۔ اس نظریے میں کشش، لبھاؤ، جنسی جاذبیت اور مخلوط کی کہانی ہے۔ افریقی آدمی تارکِ وطن ہو کر دنیا میں پھیلے تو انھوں نے دوسری انسانی آبادیوں کے ساتھ ملاپ کیا۔ آج کا آدمی، اسی نسل کشی اور ملاپ کا نتیجہ ہے۔

مثال کے طور پر ہمارے آباء، یعنی خردمند آدمی جب مشرقِ وسطیٰ اور یورپ پہنچے تو ان کا سامنا نینڈرتھل نامی انسانوں سے ہوا۔ نینڈرتھل ہم آدمیوں کے مقابلے میں زیادہ مضبوط تھے۔ ان کے دماغ ہم سے کہیں زیادہ بڑے تھے اور وہ سرد موسم میں بسر رکھنے کی بھرپور صلاحیت رکھتے تھے۔ وہ مناسب انداز میں اوزاروں، ہتھیاروں اور آگ کو ہم سے کہیں بہتر طریقے سے استعمال میں لاتے تھے۔ نینڈرتھل بہترین شکاری تھے اور غالباً اپنے یہاں بیمار اور بوڑھے ہو جانے والے دوسرے نینڈرتھلوں کی کفالت اور پورا خیال بھی رکھتے تھے۔ (سائنسدانوں کو نینڈرتھل انسانوں کے ایسے ڈھانچے بھی ملے ہیں جو کئی کئی برس تک جسمانی معذوری کے ساتھ جیتے رہے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کے رشتہ دار بیماری میں ان کا بھرپور خیال رکھتے تھے)۔ نینڈرتھل انسانوں کی اکثر ہی انتہائی مضحکہ خیز اور تمسخر آمیز تصویر پیش کی جاتی ہے۔ ان کے اولین نمونوں کو یوں پیش کیا جاتا ہے کہ جیسے وہ بیوقوف، اجڈ اور جاہل غاروں میں بسر رکھنے والے غیر مہذب انسان رہے ہوں گے لیکن حالیہ برسوں میں ہونے والی تحقیق نے ان کی بالکل نئی شبیہ پیش کی ہے۔

'خالص نسل کشی کے نظریے' کے مطابق جب خردمند آدمی نے نینڈرتھل انسانوں کے علاقوں میں آن کر بسر کی تو انھوں نے نینڈرتھل انسانوں کے ساتھ انس بڑھایا اور پھر جنسی ملاپ عام ہوا۔ یوں، دونوں آبادیاں ضم ہو کر متحد ہو گئیں۔ اگر ایسا ہے تو پھر یورپ اور ایشیاء کے تقریباً حصوں میں بسر رکھنے والے انسان، اصل میں خالص خردمند آدمی نہیں ہیں۔ یہ جدید خردمند آدمیوں اور نینڈرتھل انسانوں

کی مخلوط النسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ اسی طرح، جب خرد مند آدمی نے مشرقی ایشیاء کا رخ کیا تو انھوں نے یہاں کھڑے آدمیوں کی آبادی کے ساتھ ملاپ کیا۔ اس لحاظ سے چینی اور کوریائی باشندے خرد مند آدمیوں اور کھڑے آدمیوں کی دو قوما اور مرکب ہیں۔

اس نظریے کے متضاد، ایک دوسرا نظریہ بھی پایا جاتا ہے۔ اسے 'بدل کاری کا نظریہ' کہا جاتا ہے۔ اس نظریے کے تحت کہانی بالکل مختلف ہے۔ اس کہانی میں تضاد، نفرت، حقارت اور غالباً نسل کی بنیاد پر قتل عام بھی مل جاتا ہے۔ اس نظریے کے مطابق خرد آدمیوں کی جسمانی ساخت دوسرے انسانوں سے مختلف تھی۔ عین ممکن ہے کہ ان کی جنسی عادات اور جسمانی بو بھی مختلف رہی ہو گی۔ انھیں دوسرے انسانوں کے ساتھ جنسی اور تولیدی ملاپ میں کوئی دلچسپی نہیں رہی ہو گی۔ بھلے، ایک نینڈرتھل رومیو، کسی خرد مند جولیئٹ کی محبت میں گرفتار ہو بھی جاتا۔۔۔ یہ زرخیز اور تولید کے قابل بچے پیدا کرنے کے قابل نہیں تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ نوع انسانی کی یہ مختلف انواع جینیاتی طور پر ایک دوسرے سے اتنی دور تھے کہ اس خلیج پر تولید کی مدد سے جینیاتی پل باندھنا ممکن ہی نہیں تھا۔ نوع انسانی کی یہ مختلف آبادیاں ایک دوسرے سے آخر تک ممتاز ہی رہیں۔ پھر جب نینڈرتھل مر کھپ گئے یا کہیے مار دیے گئے تو ان کی جینیاتی خصوصیات بھی ان کے ساتھ ہی نیست و نابود ہو گئیں۔ اس نظریے کے مطابق خرد مند آدمیوں نے نوع انسانی کی باقی تمام نسلوں کو ان کے ساتھ ملاپ کے بغیر ہی ہٹا کر خود سے بدل دیا۔ وہ ان کے ساتھ گڈمڈ نہیں ہوئے۔ اگر ایسا ہے تو پھر آج، اس دور کے ہر انسان کی نسل کو ستر ہزار سال قبل کے مشرقی افریقہ کے ساتھ جوڑا جا سکتا ہے۔ ہم سب نوع انسانی سے تعلق رکھنے والے خالص خرد مند آدمی۔۔۔ واقعی آدمی ہیں!
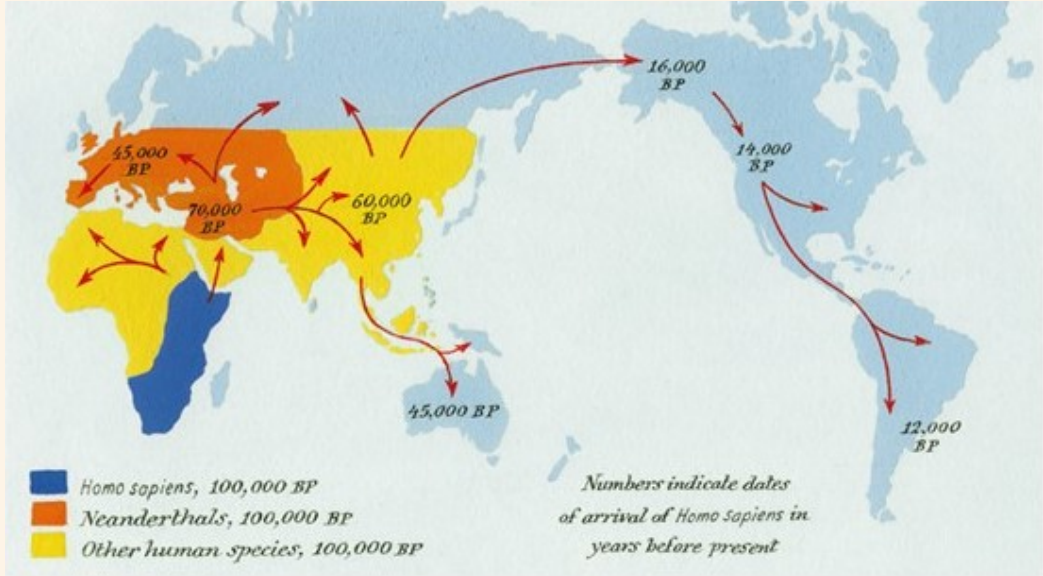
دنیا میں خرد مند آدمی کی فتح کا سفر (نمبرات سے مراد دنیا میں آدمی کی حالیہ دور سے قبل تاریخ میں آمد ہے)۔

لیکن،اس ساری بحث میں کئی قلابے بھی ہیں۔ ارتقائی لحاظ سے دیکھا جائے تو ستر ہزار سال نہایت قلیل عرصہ ہے۔ اگر بدل کاری کا نظریہ درست ہے تو آج کے انسان، یعنی ہم سارے آدمیوں کا جینیاتی مادہ ایک ہی ہے اور ان کے بیچ یہ نسلی امتیاز انتہائی معمولی سی بات ہے۔ لیکن اگر 'خالص نسل کشی' کا نظریہ درست ہے تو پھر اس لحاظ سے افریقی، یورپی اور ایشیائی باشندوں کی جینیاتی خصوصیات میں نمایاں فرق ہونا چاہیے۔ یہ فرق ہزاروں سال دور تک پیچھے تک دور جانا چاہیے۔ مجھ سے پوچھیے تو یہ نظریات گویا سیاسی ڈائنامائٹ کی طرح ہیں اور یہ نسلی امتیاز سے متعلق یہ بحث گویا بارود کا ڈھیر ہے۔

حالیہ دہائیوں میں سائنسی محققین کا جھکاؤ بدل کاری کے نظریے کی جانب بڑھتا چلا گیا ہے۔ اس نظریے کی تائید میں آثار قدیمہ کی دریافتیں بھی سامنے آچکی ہیں اور یہ نظریہ سیاسی طور پر بھی آج کے انسان کے لیے قابل قبول بھی ہے۔ (حقیقت یہ ہے کہ سائنسدانوں کو بھی نسلی بنیادوں پر جدید نوع انسانی کے بیچ تنوع بارے پینڈورا باکس کھولنے کی کوئی خواہش نہیں رہی)۔ لیکن، یہ صورتحال 2010ء میں اس وقت بدل گئی جب چار سال پر محیط سائنسی کاوش کے نتیجے میں پہلی بار نینڈر تھلوں کے جینیاتی مادے، یعنی ڈی این اے کا نقشہ مکمل کر لیا گیا۔ جینیاتی ماہرین نے یہ ڈی این اے، نینڈر تھل باقیات میں سے نکالا تھا اور بالکل سالم حالت میں دستیاب ہے۔ نینڈر تھل ڈی این اے کا خردمند آدمی، یعنی آج کے جدید انسان کے ڈی این اے کے ساتھ تقابلی جائزہ لیا گیا۔ اس سائنسی تقابلے کے نتائج سائنسدانوں کو ششدر کر دینے کے لیے کافی تھے۔

اس چار سالہ تحقیق سے پتہ یہ چلا کہ مشرق وسطیٰ اور یورپ میں بسر رکھنے والے آج کے جدید انسان اور نینڈر تھلوں کے ڈی این اے میں تقریباً ایک سے چار فیصد تک مماثلت پائی گئی ہے۔ یہ مماثلت اگرچہ سطحی طور پر دیکھنے میں بہت زیادہ نہیں ہے لیکن جینیاتی لحاظ سے نہایت اہم اور کافی ہے۔ چند ماہ بعد، ایک دوسرا دھچکا اس وقت لگا جب ڈینی سووا انسانوں کی ملنے والی انگلی کی باقیات سے نکالے گئے ڈی این اے کا بھی نقشہ تیار کر لیا گیا۔ اس کے نتائج سے پتہ چلا کہ ڈینی سووا نامی انسانی ڈی این اے اور ملائشیاء و آسٹریلیا میں بسر رکھنے والے جدید انسان کے ڈی این اے میں تقریباً چھ فیصد تک مماثلت ہے۔

یاد رہے کہ یہ تحقیق اب بھی جاری ہے اور اس کے مزید انکشافات ان نتائج کو بدل سکتے ہیں۔ لیکن، اگر یہ نتائج درست ہیں تو پھر 'خالص نسل کشی کے نظریے' کے حامیوں کی بات میں کسی نہ کسی صورت کافی وزن پیدا ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کا ہرگز مطلب یہ نہیں ہے کہ 'بدل کاری کا نظریہ' مکمل طور پر رفق ہو چکا ہے۔ نینڈر تھل اور ڈینی سووا ڈی این اے کی آج کے جدید انسان کے جینیاتی مواد میں موجودگی اور مماثلت اس لحاظ سے قلیل ہی تصور کیا جائے گا کہ اسے نوع انسانی کی مختلف اقسام کے بیچ ادغام یا وحدت قرار دیا جا سکے، یعنی فرق کافی ہے۔ لیکن دوسری جانب یہ فرق اتنا بڑا ابھی نہیں ہے کہ جس کی بنیاد پر تولیدی عمل اور زرخیزی کو رد کر دیا جائے۔ یہ نتائج اصل میں یہ بھی ثابت کرتے ہیں کہ اس طرح کے جنسی اور تولیدی ملاپ خاصے نادر رہے ہوں گے۔

تو پھر آخر ہم حیاتیاتی بنیادوں پر خردمند آدمی، نینڈرتھل اور ڈینی سوا اؤں کے بیچ تعلق کو کیسے سمجھ سکتے ہیں؟ یہ تو ظاہر ہی ہے کہ نوع انسانی کی ان تینوں اجناس کے بیچ اتنا فرق تو نہیں تھا جتنا ایک گدھے اور گھوڑے کے بیچ ہوتا ہے۔ لیکن دوسری جانب، یہ ایک ہی نوع سے تعلق رکھنے والی مختلف آبادیاں بھی نہیں تھیں جیسے بل ڈاگ اور ریشمی بالوں والے ہسپانوی کتے ہوتے ہیں۔ حیاتیاتی حقیقت سیاہ اور سفید نہیں ہوتی۔ ان حقائق میں یہاں اور وہاں، کہیں نہ کہیں کوئی گتھی ان سلجھی رہتی ہی ہے جو نہایت اہم ہوتی ہے۔ وہ اجناس، مثال کے طور پر گھوڑے اور گدھے۔۔۔ یہ ایک ہی آباء کے یہاں سے ارتقاء کے عمل میں شامل ہوئے، وہ بھی ایک زمانے میں ایک ہی جنس یا نوع کی دو مختلف آبادیاں تھیں جیسے آج بل ڈاگ اور ہسپانوی نسل کے کتے ہوتے ہیں۔ ارتقاء کے اس عمل میں ایک نقطہ ایسا آیا ہو گا جب یہ دونوں آبادیاں ایک دوسرے سے انتہائی مختلف ہو گئی تھیں۔ یہ آج جنسی ملاپ کے نتیجے میں زرخیز اولاد تو پیدا نہیں کر سکتے لیکن پہلے پہل شاذ و نادر ایسا ضرور رہا ہو گا کہ ان کے جنسی ملاپ کے نتیجے میں کبھی کبھار، غیر معمولی طور پر کوئی زرخیز اولاد پیدا ہو ہی جائے۔ یہ جینیاتی کھیل ہے۔ پھر کوئی جینیاتی تغیر پیدا ہوا اور اس جینیاتی لڑی کا آخری تعلق بھی ٹوٹ گیا اور یہ دونوں ارتقاء کی راہ پر اپنے اپنے، الگ راستوں پر چل پڑے۔

جدید تحقیق کا جائزہ لیں تو پتہ چلتا ہے کہ غالباً آج سے پچاس ہزار سال قبل خردمند آدمی، نینڈرتھل اور ڈینی سوا جینیاتی اور ارتقائی لحاظ سے ایسے ہی کسی سرحدی نقطے پر پہنچ چکے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب یہ مکمل طور پر یا کیسے قطعی طور پر نوع انسانی کی مختلف اجناس نہیں رہی ہوں گی۔ لیکن ہم اگلے ابواب میں یہ بھی دیکھیں گے کہ خردمند آدمی، نینڈرتھل اور ڈینی سوا انسانوں کے مقابلے میں بالکل ہی مختلف نوع ثابت ہوا۔ یہ فرق صرف جینیاتی کوڈ اور جسمانی خصوصیات کا ہی نہیں تھا بلکہ ان کے مقابلے میں خردمند آدمی ذہنی اور سماجی صلاحیتوں کے معاملے میں یکسر مختلف تھا۔ اس کے باوجود، یہ عین ممکن ہے کہ کبھی کبھار اور نادر موقعوں پر نینڈرتھل یا ڈینی سوا انسانوں نے خردمند انسانوں کے ساتھ جنسی ملاپ کیا اور زرخیز اولاد کو جنم بھی دے دیا ہو۔ یوں، یہ آبادیاں آپس میں خلط ملط تو نہیں ہوئیں لیکن نینڈرتھلوں اور ڈینی سوا انسانوں کا کچھ، خوش قسمت ڈی این اے خردمند آدمیوں کی جینیات کا حصہ بننے میں کامیاب ہو ہی گیا۔ یہ آج خود کو یکتا سمجھنے والے انسان، یعنی ہم خردمند آدمیوں کے لیے ایک لحاظ سے نہایت پریشان کن اور بوکھلا دینے والی حقیقت ہے۔ لیکن،

وہیں یہ خاصی ہیجان خیز بات بھی ہے۔ ذرا سوچیے، ہم جدید انسانوں کے آباء نے کسی زمانے میں ایک دوسری نوع کے جانور کے ساتھ جنسی تعلق قائم کیا تھا اور ان کے یہاں بچے بھی پیدا ہوئے تھے۔ یہ کیسی لرزا دینے والی، پریشان کن لیکن سخت ہیجان خیز بات ہے!

یہاں ایک نیا قضیہ جنم لیتا ہے۔ چلو، مان لیا کہ نینڈر تھل، ڈینی سووا اور باقی کئی طرح کے انسان واقعی خرد مند آدمی کی نسل کے ساتھ خلط ملط نہیں ہوئے تو پھر آخر وہ کہاں غائب ہو گئے؟ اس حوالے سے ایک امکان تو یہ ہے کہ خرد مند آدمی نے انھیں نیست و نابود کر دیا۔ ذرا سوچیے، ہم آدمیوں کا ایک گروہ بلقان کی وادی میں آن پہنچتا ہے۔ یہاں اس وادی میں نینڈر تھل سینکڑوں ہزار سال سے بسر کرتے آئے ہیں۔ نووارد آدمیوں کا گروہ اس علاقے میں ہرن کا شکار کھیلتا ہے اور وہ گریاں اور بیریاں خود کے لیے جمع کر لیتا ہے جو نینڈر تھل انسانوں کی روایتی اور روزمرہ کی خوراک ہیں۔ یہ نووارد آدمی ان نینڈر تھل انسانوں کے مقابلے میں نہایت مستعد اور پختہ شکاری اور خوراک جمع کرنے کے ماہر ہیں کیونکہ ان کے پاس بہتر تکنیک اور برتر سماجی بندھن میں مہارت حاصل ہے۔ یوں وہ تعداد میں بڑھتے جاتے ہیں اور اس کے ساتھ پورے علاقے میں پھیل جاتے ہیں۔ اب نینڈر تھل، بیچارے وسائل سے محروم ہو رہے ہیں اور ان کے لیے خوراک کی ضروریات پوری کرنا دن بدن مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ ان کی آبادیاں گھٹنے لگتی ہیں اور ایک وقت ایسا آتا ہے کہ وہ سارے مر کھپ جاتے ہیں۔ ان میں سے چند ایک ایسے ہیں جو کسی بھلے وقت میں اپنے نئے پڑوسیوں، یعنی خرد مند آدمیوں کے ساتھ جا ملتے ہیں اور وہیں بسر کر لیتے ہیں۔

ایک نینڈر تھل بچے کی تصوراتی شبیہ۔ جینیاتی تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ چند ایک نینڈر تھل گوری رنگت اور سنہرے بالوں کے حامل تھے

اس حوالے سے دوسرا امکان یہ ہے کہ وسائل کی جنگ اتنی بڑھ جاتی ہے کہ بالآخر تشدد پر منتج ہوتی ہے۔ اس تشدد کا نتیجہ نسلی بنیادوں پر قتلِ عام کی صورت برآمد ہوتا ہے۔ جدید انسان، یعنی خرد مند آدمی کی خصلت میں برداشت بہت ہی کم ہے۔ یہ اس قدر کم ہے کہ آج جدید دور میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا بھر میں جلد کی رنگت، لہجے اور مذہب یا مسلک کے معمولی فرق کی بنیاد پر بھی آدمیوں نے دوسرے آدمیوں کی نسل در نسل کا قتلِ عام کیا ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے، قدیم زمانے میں آدمی ہم سے زیادہ برداشت کا حامل تھا؟ وہ بھی کسی ایک نسل نہیں بلکہ انسانوں کی ایک بالکل مختلف نوع سے متعلق اس کی برداشت کتنی رہی ہو

گی؟ تو یہ عین ممکن ہے کہ جب آدمیوں نے نینڈر تھلوں کا سامنا کیا تو اس کا نتیجہ نوع انسانی کی تاریخ میں پہلے اور سب سے اہم نسلی بنیادوں پر صفائی کی صورت ہی بر آمد ہوا ہو گا۔

اس وقت جو بھی صورتحال رہی ہو۔۔۔نینڈر تھل (اور دوسری انسانی انواع) آج بھی تاریخ کا ایک بہت بڑا اگر اور مگر بنا ہوا ہے۔ ذرا سوچیے، اگر نینڈر تھل اور ڈینی سیوا انسان بھی ہم خردمند آدمیوں کے ساتھ بقا کی منزلیں پار کر لیتے تو یہ دنیا، کیسی دنیا ہوتی؟ ایسی دنیا جہاں انسان کی کئی انواع اکٹھی بسر رکھتیں تو کس طرح کی تہذیب، ثقافت، سیاست اور سماجی ڈھانچے پائے جاتے؟ مثال کے طور پر، مذاہب اور عقیدے کیا طور اختیار کرتے؟ کیا تورات کا پہلا باب نینڈر تھلوں کو بھی آدم اور حوا کی اولاد قرار دیتا؟ کیا عیسیٰ آدم زادوں کے ساتھ ساتھ ڈینی سیوا انسانوں کے گناہوں کے لیے بھی سولی چڑھ جاتے؟ کیا قران میں جنت کے حوالے سے آدم کی اولاد آدمیوں ہی نہیں بلکہ دوسری انواع کے نیک اور متقی انسانوں کے لیے بھی بشارت دی جاتی؟ کیا نینڈر تھل جنگجوؤں کو رومی افواج کے لشکروں میں جگہ مل پاتی؟ کیا ڈینی سیوا انسان، باقی خردمند آدمیوں کی طرح چینی سلطنت اور درباروں میں جگہ بنا پاتے؟ کیا امریکہ کے اعلان آزادی کی دستاویز میں صرف آدمی ہی نہیں بلکہ انسان کی ہر نسل اور نوع کے حقوق کے تحفظ، برابر قرار دینے کا وعدہ کیا جاتا؟ کارل مارکس کا کیا ہوتا؟ کیا وہ بنی نوع انسان سے تعلق رکھنے والے ہر مزدور چاہے اس کی رنگ، نسل اور ذات کے علاوہ جنس اور نوع بھی، بھلے جو رہی ہو۔۔۔اکٹھا ہونے کا پیغام دے پاتے؟

بات یہ ہے کہ پچھلے دس ہزار برسوں میں خردمند آدمی اپنی یکتائی کی حقیقت سے اس قدر مانوس ہو چکا ہے کہ اس کے لیے کسی دوسری صورت بارے سوچ پانا تقریباً ناممکن ہو چکا ہے۔ بنی نوع انسان سے تعلق رکھنے والی دوسری انواع، ہمارے بہن اور بھائیوں کی عدم وجودگی کا نتیجہ ہے کہ ہم انتہائی آسانی کے ساتھ تخلیق کے تصور پر ایمان لا سکتے ہیں۔ آج یہ ایسا کرشمہ نظر آتا ہے کہ جس میں ہم 'انسان' یعنی خردمند آدمی باقی کے جانوروں سے ممتاز ہیں۔ ہم ایسے یکتا تصور کیے جا سکتے ہیں کہ گویا ہم ان سے بالکل الگ ہیں۔ ہمارے اور ان کے بیچ ایک درز ہے۔ ایک ایسا شگاف ہے جو ہمیں باقی کے جانوروں سے ممتاز کرتا ہے۔ جب ڈارون نے اسی حقیقت کی جانب توجہ دلائی، یعنی کہا کہ آدمی بھی دراصل جانوروں کی ہی ایک قسم ہے تو گویا طوفان آ گیا۔ آدمیوں کی اکثریت غصے سے پاگل ہو گئی۔ آج بھی، کئی لوگ ہیں جو اس نظریے سے سخت اختلاف رکھتے ہیں۔ اگر نینڈر تھل آج باقی ہوتے تو کیا ہم پھر بھی خود کو ان سے مختلف مخلوق ماننے پر مصر رہتے؟ شاید یہی وجہ تھی کہ ہمارے یعنی خردمند آدمیوں کے آباء نے نینڈر تھل انسانوں کا صفایا کر دیا تھا۔ ان میں اور ہم میں اتنی قدریں مشترک تھیں کہ انھیں نظر انداز کرنا ممکن نہیں تھا۔ وہیں، وہ ہم سے اس قدر مختلف تھے کہ انھیں برداشت کرنا ہمارے لیے ممکن نہ تھا۔

اس ضمن میں خردمند آدمی کو قصوروار ٹھہرائیں یا نہیں لیکن تاریخ گواہ ہے کہ جب بھی آدمی نے کسی نئی جگہ پر بسیرا کیا ہے۔۔۔ وہاں کی آبائی آبادیاں رفتہ رفتہ ناپید ہو کر نیست و نابود ہو گئیں۔ انسانوں کی 'سولو' نامی نوع کی ملنے والی باقیات پچاس ہزار سال پرانی ہیں۔ ڈینی سیوا انسان اس کے کچھ ہی عرصے بعد معدوم ہو گئے۔ نینڈر تھل تیس ہزار سال پہلے ختم ہوئے۔ کرہ ارض پر پائے جانے والے آخری بونے انسان، فلوریز جزیرے پر بسر رکھتے تھے۔ ان کی قسم کا دیا، بارہ ہزار سال پہلے بجھ گیا۔ ان کی باقیات صرف ہڈیوں، پتھر کے اوزاروں، ہتھیاروں، ہمارے جینیاتی مادے میں ڈی این اے کی چند لڑیوں اور کئی اہم سوالات کی شکل میں رہ گئی ہیں۔ اس دور کے انسانوں کی باقیات میں ہم بھی تو شامل ہیں۔ ہم جو خود کو 'خردمند آدمی' کہلواتے ہیں۔۔۔ بنی نوع انسان کی آخری جنس، باقی بچ رہی نوع ہیں۔ ہم کون ہیں؟ ہم انسان ہیں۔ ہم آدمی ہیں۔۔۔ اب دنیا میں انسانوں کی صرف ایک ہی قسم، خردمند آدمی باقی ہے۔

آخر آدمی کی کامیابی کا راز کیا تھا؟ ہم آدمیوں نے آخر اتنی تیزی کے ساتھ دنیا کے دور دراز کونوں اور ماحولیاتی لحاظ سے انتہائی مختلف مسکنوں میں طبع منا کر کیونکر بسر اختیار کر لی؟ ہم نے بنی نوع انسان کی باقی قسموں اور اجناس کو آخر گم نامی میں کیسے دھکیل دیا؟ دوسرے انسان، بالخصوص نینڈر تھل جو کہیں بڑھ کر مضبوط اور بڑے دماغوں جو سخت موسم میں گزارہ بھی کر لیتے تھے۔۔۔ آدمی کی یورش کا سامنا کیوں نہ کر سکے؟ یہ سوالات نہایت اہم ہیں اور جوں جوں سوچتے جائیں، یہ بحث غضب اور شدت اختیار کرتی جاتی ہے۔ ان سارے سوالوں کا غالباً ایک ہی جواب ہے۔ یہ وہ شے ہے جو اس بحث کو جاری رکھنے، بلکہ شروع کرنے کا باعث بھی ہے۔ وہ جواب یہ ہے کہ آدمی نے دنیا اس لیے فتح کی کیونکہ وہ 'بولی' ایجاد کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

علم کا درخت

جیسا کہ اب ہم جان چکے ہیں کہ آدمی کی آبادیاں مشرقی افریقہ میں تو ڈیڑھ لاکھ سال پہلے ہی پھیل چکی تھیں لیکن آج سے تقریباً ستر ہزار سال پہلے اس نے باقی انواع انسانی کو معدومیت کے دہانے پر پہنچا کر پورے کرہ ارض پر چڑھائی کر لی تھی۔ اس عرصے کے بیچ، اگرچہ ہزاروں سال قدیم آدمی کی خصلت جدید آدمی کے جیسی ہی تھی لیکن اسے دوسری انواع انسانی پر کسی بھی طرح سے فوقیت نہیں ملی۔ قدیم آدمی نے اس دوران کوئی نفیس اوزار، کسی بھی قسم کا کاری ہتھیار اور نامی گرامی کارنامے سرانجام نہیں دیے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ خردمند آدمی اور دوسرے انسانوں کی پہلی مڈبھیڑ میں نینڈر تھل کو فتح حاصل ہوئی تھی۔ ایک لاکھ سال پہلے آدمیوں کے چند گروہوں نے شمال کی جانب ہجرت کی۔ یہ آج کی دنیا میں ملک شام کا علاقہ تھا جو نینڈر تھل انسانوں کا مسکن ہوا کرتا تھا۔ آدمی کو یہاں پیر جمانے میں سخت ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ یہاں کے مقامی نینڈر تھل نہایت بدمزاج واقع ہوئے تھے یا شاید درشت اور سخت موسم آڑے رہا ہو گا۔ ہمیں پوری طرح علم نہیں ہے لیکن کیا خبر آدمی نینڈر تھل انسانوں کی بجائے یہاں

پائے جانے والے جراثیموں اور طفیلی کیڑوں کے ہاتھوں شکست کھا گیا ہو؟ اس شکست کی وجہ جو بھی رہی ہو، یہ طے ہے کہ آدمی کو پسپائی اختیار کرنی پڑی تھی اور مشرق وسطیٰ کو نینڈرتھل انسانوں کے لیے کھل کھیلنے کے لیے چھوڑنا پڑا تھا۔

اس دور میں آدمی کی اس طور غیر معیاری کارکردگی نے محققین کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ شاید قدیم آدمی کے دماغ، آج کے جدید آدمی سے قدرے مختلف رہے ہوں گے۔ وہ بھلے جسمانی طور پر ہمارے ہی جیسے نظر آتے ہوں لیکن ان کی دماغی صلاحیتیں جیسے سیکھنا، یاد رکھنا اور اطلاع بینی وغیرہ انتہائی محدود رہی ہوں گی۔ اس دور کے قدیم آدمی کو انگریزی زبان سکھانا، اسے آج کے مذہبی عقائد پر قائل کرنا یا اسے نظریہ ارتقاء سمجھا پانا گویا بھینس کے آگے بین بجانے کے مترادف ہوتا۔ ایسی کسی بھی کوشش کا نتیجہ سوائے مایوسی کے کچھ نہ نکلتا۔ جیسے یہ، ویسے ہی آج کے جدید دور کے آدمی کے لیے بھی قدیم دور کے اس آدمی کی بولیاں سیکھنا، سمجھنا اور سوچنے کے انداز کو سمجھ پانا تقریباً ناممکن ہوتا۔

لیکن، پھر تقریباً ستر ہزار سال پہلے ایسا ہوا کہ آدمی نے پہلی دفعہ غیر معمولی اور مثالی حرکات شروع کیں۔ اب کی بار آدمی نے افریقہ سے دوسری دفعہ ہجرت اختیار کی۔ اب کی بار، آدمی کے گروہوں نے نینڈرتھل کو ہی نہیں بلکہ انسانوں کی باقی تمام انواع کو بھی صرف مشرق وسطیٰ ہی نہیں بلکہ دنیا کے اکھاڑے سے نکال باہر کر کے معدومیت کی گہری پاتال میں دھکیل دیا۔ یہ انسانی تاریخ میں کسی بھی نوع انسانی کے لیے انتہائی مختصر عرصے میں اس قدر ترقی کا حیران کن مظاہرہ تھا۔ آدمی مشرق وسطیٰ سے نکل کر یورپ اور مشرقی ایشیاء تک پہنچ چکا تھا۔ پھر پینتالیس ہزار سال پہلے کسی نہ کسی طرح کھلے سمندر کو بھی پار کر لیا اور آسٹریلیا جا پہنچا۔ یہ وہ براعظم تھا جہاں اس سے قبل کبھی کسی انسان نے قدم نہیں رکھا تھا۔ ستر ہزار سال سے لے کر تیس ہزار سال کے عرصے میں کشتی، تیل سے جلنے والے چراغ، تیر، کمانیں اور سوئیاں (گرم کپڑے سینے اور پرونے کے لیے لازم) ایجاد ہوئیں۔ اس دور میں، جسے واقعی ایک 'آرٹ' کہا جا سکتا ہے وہ ہاتھی دانت سے بنائی گئی 'شیر نما آدمی (مرد یا عورت)' کی مورت ہے جو جرمنی کے ایک غار سے دریافت ہوئی تھی۔ یہ 'آرٹ' اور کاریگری، اس دور میں مذہبی عقائد، کامرس اور سماجی طبقہ بندی کی طرف پہلا واضح اشارہ بھی ہے۔

محققین کی اکثریت یہ اتفاق رکھتی ہے کہ آدمی کی ان بے مثال کامیابیوں کی اصل وجہ اس کی دماغی صلاحیتوں میں انقلاب تھا۔ یہ ماننا ہے کہ وہ آدمی جنھوں نے نینڈرتھل انسانوں کو معدوم کیا، اسی نے آسٹریلیا میں پہلی انسانی آبادی قائم کی اور 'شیر نما آدمی' جیسی کاریگری دکھائی۔۔۔ وہ آج کے جدید آدمی جتنے ہی ذہین، تخلیقی صلاحیتوں کے مالک اور حساس ہوا کرتے تھے۔ اگر آج ہم اس 'شیر نما آدمی' کی مورت کے خالق سے ملاقات کا موقع مل جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس کی بولی سیکھ لیتے اور اسے اپنی بولی بھی سمجھا دیتے۔ ہم اس دور کے آدمی کو ہر وہ شے سمجھا سکتے تھے جو آج ہم جانتے ہیں۔ انھیں 'ایلس ان ونڈرلینڈ' کے قصے سنا سکتے تھے اور کوانٹم فزکس کی

پیچیدگیاں بھی دکھلا سکتے۔ یہی نہیں بلکہ اس قدیم دور کا آدمی اپنے خیالات اور دنیا سے متعلق اپنے نظریات ہیں نہایت آسانی سے سمجھا سکتا تھا۔

سوچ کے یہ نیا انداز اور اطلاع بینی کے 'جدید' طریق آج سے تقریبا ستر ہزار اور پچھلے تیس ہزار سال کے درمیانی عرصے میں ظاہر ہوا۔ اس دور کو 'شعور یا آگاہی کا انقلاب' قرار دیا جاتا ہے۔ اس شعور اور آگاہی کا سبب کیا تھا؟ ہم یقینی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتے۔ اس ضمن میں سب سے عام اور قابل فہم نظریہ یہ ہے کہ حادثاتی طور پر جینیاتی تبدیلیاں رونما ہوئی تھیں۔ ایسی تبدیلیاں جنھوں نے خردمند آدمی کے دماغ کی اندرونی تاروں کو کچھ ایسے چھیڑا کہ وہ غیر معمولی طور پر سوچنے کے قابل ہو گیا اور ایک نئے انداز، جدید بولی اور زبان کی شکل میں ایک دوسرے سے رابطہ کرنے، اطلاع بینی اور رسائی کے قابل ہو گیا۔ ہم اس کو علم و آگاہی کے درخت کی جینیاتی تبدیلی قرار دیتے ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہ جینیاتی تبدیلی خردمند آدمی کے دماغ میں ہی کیوں پیدا ہوئی، یہ انقلاب نینڈرتھل کے یہاں کیوں نہ آیا؟ اب یہ بھاگیہ اور قسمت، نصیب اور تقدیر جیسی بات ہے۔ آپ اس کو عقلی طور پر ایک اتفاق بھی قرار دے سکتے ہیں۔ ہم اس بارے آج کی تاریخ میں یہی کہہ سکتے ہیں۔ اس معاملے میں، بہر حال اس آگہی کے انقلاب کی وجوہات سے زیادہ نتائج اہم ہیں۔ یہاں ایک نہایت دلچسپ اور اہم ترین سوال تو یہ ہے کہ آدمی کی ایجاد کردہ اس نئی بولی یا زبان[1] میں ایسی کیا خاص بات تھی کہ وہ دنیا کو فتح کرنے کے قابل ہو گیا؟

یہ زبان، اس دنیا کی پہلی زبان نہیں تھی۔ ہر جانور اپنے تئیں کسی نہ کسی زبان کا استعمال کرتا آیا ہی ہے۔ یہاں تک کہ کیڑے اور مکوڑے جیسے چیونٹیاں اور شہد کی مکھیاں بھی نہایت نفیس طریقے سے ایک دوسرے کے ساتھ رابطہ کاری، اطلاع اور رسائی کا نظام، بولی رکھتی ہیں۔ وہ نہایت غیر معمولی انداز میں ایک دوسرے کو خوراک اور پھل پھولوں بارے اطلاع فراہم کرتی ہیں۔ کئی جانور، بشمول افریقی بندر، بن مانس اور بندروں کی باقی تمام اقسام کے یہاں واضع صوتی بولیاں پائی جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر ہرے بندر اطلاعات کی ترسیل کے لیے کئی طرح کی آوازوں پر مشتمل پکار کا سہارا لیتے ہیں۔ ماہر حیوانات نے ایسی ہی ایک چیخ نما پکار کا تفصیلی جائزہ لیا تو اس کا مطلب کچھ یوں ہے، 'محتاط رہو۔۔۔ عقاب ہے!' اسی طرز لیکن تھوڑی سی مختلف آواز کا مطلب ہے، 'محتاط رہو۔۔ شیر ہے!'۔ سائنسدانوں نے جب یہی ریکارڈ شدہ عقاب سے متعلق آوازیں ہرے بندروں کے ایک جتھے کے سامنے ریکارڈر پر چلائیں تو تمام بندر یکدم ہی ساری مصروفیات ترک کر کے خوفزدہ ہو گئے اور اوپر آسمان میں جھانکنے لگے۔ جب اسی گروہ کو دوسری طرز کی شیر سے متعلق آوازیں سنائیں تو

---

[1] یہاں اور اگلے صفحات میں آدمی کی زبان یا بولی سے مراد بنیادی بول چال کی صلاحیت ہے۔ اس سے ہرگز مراد کوئی خاص لہجہ یا زبانوں کی مختلف اقسام جیسے انگریزی، ہندی، چینی وغیرہ نہیں ہے۔ ایسا گمان ہے کہ شعور اور آگاہی کے آغاز پر بھی آدمیوں کے مختلف گروہوں میں مختلف زبانیں اور لہجے پائے جاتے تھے۔

یکدم جیسے بھگدڑ مچ گئی اور سارے بندر اچھلتے کودتے، خوف کے مارے درختوں پر چڑھ گئے۔ آدمی کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہرے بندروں کے مقابلے میں کہیں زیادہ اور کئی کئی طرح کی آوازیں نکال سکتا ہے لیکن یہ ایسی خاصیت ہے جو ہاتھیوں اور وہیل مچھلیوں میں بھی پائی جاتی ہے۔ ایک طوطا، وہ ساری چیزیں دہرا سکتا ہے جو البرٹ آئن سٹائن نے کہی ہوں گی۔ یہی نہیں بلکہ طوطے توفون کے بجنے کی آواز، دروازے کی چرچراہٹ اور سائرن کی نقل بھی اتار لیتے ہیں۔ ہمیں یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ آئن سٹائن کو کسی طوطے پر جو فوقیت حاصل تھی، وہ ہر گز بولی بولنے کی صلاحیت نہیں تھی۔ تو پھر، آخر ہماری بول چال اور زبان میں ایسی کیا خاص بات ہے؟

اس سوال کا سب سے عام جواب یہی ہے کہ ہماری زبانیں اور بولیاں نہایت لچکیلی اور نرم طبع ہیں۔ ہم آوازوں اور اشاروں کی محدود تعداد کو لاتعداد جملوں میں استعمال کر سکتے ہیں۔ وہ بھی ایسے کہ ہر جملے کا یکتا مطلب ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اپنے ارد گرد کی دنیا کے بارے میں غیر معمولی مقدار میں معلومات کو اچھی طرح سمجھ کر، دماغ میں اتار، اسے جمع کر کے پھر دوسروں کو بھی فراہم کر سکتے ہیں۔ ایک ہرا بندر اپنے ساتھیوں کو صرف متنبہ کر کے کہہ سکتا ہے کہ، 'محتاط رہو۔۔۔ شیر ہے!' لیکن اس کے برعکس آدمی اپنے دوستوں کو پوری کہانی سنا سکتا ہے۔ جیسے۔۔۔ 'آج صبح کا واقعہ ہے۔ دریا کے کنارے، میں نے ایک شیر کو دیکھا جو تنومند جنگلی بھینسوں کے ریوڑ کا پیچھا کر رہا تھا'۔ پھر وہ مزید تفصیلات جیسے اس شیر کی موجودگی کا صحیح صحیح محل وقوع اور اس جگہ پر جانے والے تمام رستوں کی معلومات وغیرہ بتا سکتا ہے۔ اس طرح کی تفصیلات سے آگاہی کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اس آدمی کے قبیلے کے لوگ یا اس کے باقی ساتھی مل بیٹھ کر اس بارے غور وخوض کر سکتے ہیں۔ وہ دریا کا رخ کر کے شیر کو بھگانے کا فیصلہ کر سکتے تھے۔ وہاں جنگلی بھینسوں کا ایک پورا ریوڑ بھی ہے تو شکار کی منصوبہ بندی بھی کی جا سکتی تھی۔

اس متعلق ایک دوسرا نظریہ یہ بھی کہتا ہے کہ دراصل ہماری بے مثل اور منفرد زبان ارتقائی عمل سے گزر کر دنیا سے متعلق معلومات کی رسائی کا ذریعہ بن گئی تھی۔ لیکن اس زمانے میں ترسیل کی جانے والی سب سے اہم معلومات شیروں اور جنگلی بھینسوں کے محل وقوع سے متعلق نہیں تھی بلکہ یہ دوسرے آدمیوں کے بارے، ان کے مشغولات، روزمرہ جانکاری اور ذاتی باتیں ہوا کرتی تھیں۔ ہماری بھانت بھانت بولیوں کا اصل رنگ اور ارتقائی خاصیت دراصل گپ شپ اور ادھر ادھر کی لاگ گزافی میں مہارت ہے۔ اس نظریے کے تحت ہی خردمند آدمی صحیح معنوں میں ایک 'سماجی جانور' بن کر ابھرا ہے۔ آدمی کے لیے سماجی تعلق داری، تعاون اور اشتراک بقاء اور افزائش نسل کی کنجی بن گیا۔ ایک فرد، چاہے وہ مرد ہو یا عورت اس کے لیے شیروں اور جنگلی بھینسوں کے ریوڑ بارے معلومات کافی نہیں ہوتیں۔ اس کے لیے زیادہ اہم یہ ہے کہ وہ یہ جان لے کہ اس کے گروہ میں کون کس سے نفرت کرتا ہے؟ کون کس کے بستر کی زینت بن چکا ہے؟ کون ایماندار رہے اور کون بے ایمان؟

اس معاملے کو کچھ یوں سمجھیے۔ چند درجن آدمیوں (مردوں اور عورتوں) کے کسی گروہ میں افراد سے متعلق جتنی معلومات جمع کر کے ترسیل کی جا سکتی ہے، اس کی مقدار ہوش اڑا دینے کے لیے کافی ہے۔ مثال کے طور پر تحقیق سے ثابت ہے کہ پچاس افراد پر مشتمل کسی معمولی گروہ میں افراد کے بیچ تعلق، واسطوں، رشتوں اور ناطوں کی تعداد کم از کم بارہ سو پچیس ہو سکتی ہے۔ سماجی لحاظ سے مزید گہرے اور پیچیدہ میل اور امتزاج تو لاتعداد ہوتے ہیں۔ بن مانس اور افریقی بندروں کی تقریباً اقسام اس طرح کی سماجی معلومات کے حصول میں بے حد دلچسپی رکھتے ہیں لیکن وہ اس بارے موثر انداز میں گپ شپ اور لاف گزانی میں شدید مشکل کا سامنا کرتے ہیں۔ نینڈرتھل اور قدیم آدمیوں کو بھی ایک دوسرے کی پشت پر غیبت اور چغل خوری میں شدید مشکلات رہی ہوں گی۔ یہ کہنے کو تو ایک مہلک اور مضرت رساں، یعنی بدنیتی پر مشتمل عادات ہیں لیکن بہر حال بڑی تعداد میں افراد کے بیچ تعاون اور اشتراک کے لیے انتہائی لازم جز ہیں۔ ستر

3 جرمنی کے غار سے دریافت ہونے والی 32000 سال پرانی ہاتھی دانت سے بنی 'شیر نما آدمی' یا 'شیر نما عورت' کی مورت جو تاریخ کا پہلا فن پارہ کہلاتی ہے

ہزار سال پہلے آدمی نے جب بول چال اور لاف گزانی کی صلاحیت حاصل کرلی تو پھر اس کے لیے منہ بند رکھنا مشکل ہو گیا۔ اس دور کے آدمی بھی گھنٹوں کسی موضوع پر بے تکان گفتگو جاری رکھ سکتے تھے۔ کئی کئی لوگوں کے بارے مستند معلومات حاصل ہو جائیں تو کئی افراد کے چھوٹے چھوٹے گروہوں کو ایک دوسرے میں ضم کرکے بڑا گروہ تشکیل دیا جاسکتا تھا۔ مستند معلومات سے مراد، لوگوں کو ایک دوسرے کی سچائی پتہ چلتی، بھروسے کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ اس صلاحیت کے بل بوتے پر آدمی ایک دوسرے کے ساتھ زیادہ گہرے تعلقات بنا سکتا تھا، نئے رشتے جوڑ سکتا تھا اور کسی بھی فرد اور گروہ کے بارے سمجھ بوجھ میں اضافہ کرکے بہتر طریقے سے سماجی طور پر اشتراک اور تعاون کر سکتا تھا۔

یہ عین ممکن ہے کہ گپ شپ اور لاف گزافی سے متعلق یہ نظریہ سننے میں مضحکہ خیز لگتا ہو لیکن سنجیدہ تحقیق اس نظریے کی خوب حمایت کرتی ہے۔ آج بھی، انسانی پیغام رسانی اور معلومات کی ترسیل کا ایک بڑا ذریعہ گپ شپ اور لاف گزانی ہی ہے۔ بھلے، اس مقصد کے لیے کوئی بھی طریقہ جیسے زبانی گپ شپ، ای میل، فون کالوں یا اخباری کالموں اور فیچروں کا استعمال کیا جاتا ہو، اس سے فرق نہیں پڑتا۔ توجہ سے دیکھا جائے تو ایسا لگتا ہے کہ جیسے ہماری زبان اور بول چال کی صلاحیت، اسی مقصد کے لیے وجود میں آئی تھی۔ آپ کا کیا خیال ہے، تاریخ کے شعبے میں زندگی بھر تحقیق میں صرف کرنے والے پروفیسر حضرات جب دوپہر کو کھانے کی میز پر جمع ہوتے ہیں تو وہ پہلی جنگ عظیم کی وجوہات پر بحث کرتے رہتے ہیں؟ یا سائنسی کانفرنسوں میں شرکت کرنے والے دنیا بھر سے جمع ہونے والے نیوکلیئر سائنس کے طبیعیات دان چائے کے وقفے میں کوانٹم فزکس کے پیچیدہ موضوعات پر گفتگو کرتے رہتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ بعض اوقات تو ایسا ہی ہوتا ہو گا لیکن ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا۔ بلکہ ہمیشہ تو یہ ہوتا ہے کہ یہ حضرات جب فارغ وقت ملے تو وہ اس پروفیسر کے بارے افواہوں پر بات کرتے نظر آتے ہیں جس کی بیوی نے اسے اپنی داشتہ کے ساتھ رنگے ہاتھوں پکڑ لیا تھا۔ ویسے، زیادہ تر پروفیسر حضرات کھانے کی میز پر ڈیپارٹمنٹ کے چیئرمین کی بدخوئیاں کرتے پائے جاتے ہیں۔ اکثر تو تازہ ترین ریسرچ کے لیے ملنے والی گرانٹ کی رقم بارے بڑ مارتے رہتے ہیں یا دوسروں کو ملنے والی گرانٹ کے فضول استعمال پر سیخ پا نظر آتے ہیں۔ گپ شپ اور ادھر ادھر کی باتیں عام طور پر ایک دوسرے کی خطاؤں اور برائیوں سے متعلق ہوا کرتی ہیں۔ افواہیں پھیلانے والے صحیح معنوں میں چوتھے منصب یعنی صحافت سے جڑے ہوتے ہیں۔ صحافیوں کا تو کام ہی سماج اور معاشرے کو بدعنوانوں اور مفت خور عناصر کے بارے متنبہ کرنا اور ان سے متعلق معلومات فراہم کرنا ہوتا ہے۔

یہ نظریے، یعنی گپ شپ کا نظریہ یا دریا کے کنارے شیر کی کہانی کا نظریہ۔۔۔ دونوں ہی درست ہو سکتے ہیں۔ ہمارے لیے یہاں یہ سمجھنا زیادہ اہم ہے کہ ہماری زبان اور بول چال کی صلاحیت کی بے مثل خصوصیت یہ نہیں ہے کہ ہم دوسرے آدمیوں، شیروں اور جنگلی بھینسوں کے ریوڑ سے متعلق وسیع مقدار میں معلومات جمع کرکے اس کی آگے ترسیل کر سکتے ہیں۔ ہماری زبان اور بول چال کی

صلاحیت کی اصل خوبی تو یہ ہے کہ ہم ان چیزوں کے بارے معلومات جمع کر کے آگے ترسیل کر سکتے ہیں جو سرے سے وجود ہی نہیں رکھتیں۔ جہاں تک ہمیں علم ہے۔۔۔ آدمی انسانوں میں واحد نوع ہے جو ایسی ایسی مخلوقات، ذاتوں، ہستیوں اور موجودات کے بارے بات کر سکتا ہے جسے اس نے خود کبھی دیکھا، سنا، چھوا اور سونگھا بھی نہیں ہوتا۔

قصے، حکایات، الف لیلوی داستانیں، کہانیاں، اساطیر، خداؤں کے بارے روایات اور مذاہب کا تصور پہلی بار شعور اور آگاہی کے اسی انقلاب کے ساتھ سامنے آیا تھا۔ دوسرے جانوروں کی کئی اقسام اور انسان کی تقریباً سبھی انواع پہل پہل صرف یہی کہا کرتی تھیں کہ، 'محتاط رہو۔۔۔ شیر ہے!' لیکن یہ شعور اور آگاہی کی دین ہے کہ خردمند آدمی کو یہ صلاحیت حاصل ہوگئی کہ وہ یہ کہنے کے قابل ہو گیا کہ، 'خبردار، آگے شیر ہے۔ لیکن سنو، یہ جو شیر ہیں۔۔۔ اصل میں ہمارے قبیلے کی حفاظت پر مامور پاک روح ہوتے ہیں!' تصوراتی اور خیالی مفروضے گڑھنے کی صلاحیت ہی ہم آدمیوں کی زبان اور بول چال کی بے نظیر اور بے مثل خوبی ہے۔

اس امر پر متفق ہونا قدرے آسان ہے کہ یہ صرف آدمی ہی ہے کہ جو ان چیزوں کے بارے بات چیت کر سکتا ہے جو اصل میں وجود ہی نہیں رکھتیں۔۔۔ یہ آدمی ہی ہے جو ہر صبح ناشتے سے قبل ہی چھ آٹھ مختلف ایسی چیزوں پر یقین کامل کر کے تیار بیٹھا ہوتا ہے۔ آپ ایک بندر کو کسی بھی صورت اپنی خوراک یعنی کیلا، مرنے کے بعد بندروں کی جنت میں لاتعداد کیلوں کے وعدے پر آپ کے حوالے کرنے پر قائل نہیں کر سکتے۔ لیکن آخر ایسا کرنا کیوں اہم ہے؟ فکشن خطرناک حد تک گمراہ کن یا پریشان کن حد تک خیالات کو منتشر کرنے کا سبب بن سکتا ہے۔ وہ لوگ جو جنگلوں میں پریوں اور جن بھوتوں کی تلاش میں نکلتے ہیں۔۔۔ بجا طور پر ان لوگوں کے مقابلے میں ہلاکت کا زیادہ شکار ہو سکتے ہیں جو جنگلوں میں کھو جائیں تو اپنی توجہ کھمبیاں اور دوسری خوراک جمع کر کے واپسی کے امکانات پر مرکوز کر دیں۔ اسی طرح ہم جب گھنٹوں پاک ارواح اور سرپرست محافظ ہستیوں کی عبادت میں گزار کر کیا اپنا قیمتی وقت ضائع نہیں کر رہے ہوتے؟ یہی وقت ہم اپنی حالت کی بہتری، خوراک پیدا کرنے، لڑ کر فتح حاصل کرنے اور حرام کاری اور افزائش نسل کے لیے بھی تو استعمال کر سکتے ہیں۔

فکشن کا اصل کمال یہ نہیں ہے کہ آج ہم لاتعداد غیر مرئی چیزوں پر یقین رکھتے ہیں۔ فکشن کا اصل کمال یہ ہے کہ ہم اجتماعی طور پر، سب کے ساتھ مل کر غیر مرئی چیزوں پر یقین پال سکتے ہیں۔ ہم دوسرے لوگوں کے ساتھ مل کر قصوں، داستانوں اور دیومالائی اساطیر جیسے تورات و انجیل کی تخلیق سے متعلق حکایات، قدیم آسٹریلوی داستانوں اور جدید ریاستوں کی قوم پرست مفروضات کو ترتیب دے سکتے ہیں۔ اس طرح کی ساری حکایات اور اساطیر، قصے اور کہانیاں آدمی کو بڑی تعداد میں مل کر غیر معمولی انداز میں، نہایت احسن طریقے سے ایک دوسرے کے ساتھ لچک اور لوچ دار انداز میں تعاون اور اشتراک کی صلاحیت عطا کرتی ہیں۔ چیونٹیاں اور شہد کی مکھیاں بھی بڑی تعداد میں مل جل کر کام کرتی ہیں۔۔۔ ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرتی ہیں لیکن وہ ایسا صرف انتہائی سخت گیر طریقے اور صرف

قریبی خاندان کی چیونٹیوں اور شہد کی مکھیوں کے ساتھ ہی مل جل کر کرتی ہیں۔ بھیڑیے اور بن مانسوں میں چیونٹیوں اور شہد کی مکھیوں کی نسبت تعاون اور اشتراک خاصا لچک دار ہوتا ہے لیکن وہ ایسا صرف اور صرف چھوٹے جتھوں میں ہی رہ کر سکتے ہیں۔ بھیڑیے اور بن مانس، صرف انھی بن مانسوں اور بھیڑیوں کے ساتھ مل کر جتھے بناتے ہیں جن سے وہ اچھی طرح مانوس ہوں۔ دوسری طرف آدمی کی خوبی یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر بے پناہ حد تک لچک دار انداز میں کام کر سکتے ہیں۔ ایک آدمی، لاتعداد اجنبیوں کے ساتھ مل کر ہر طرح کا کام سرانجام دے سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آدمی اس دنیا پر حکومت کرتا ہے جبکہ چیونٹیاں آدمی کی چھوڑی ہوئی خوراک استعمال کرتی ہیں اور بن مانس آج چڑیا گھروں اور آدمی کی بنائی لیبارٹریوں میں قید ہیں۔

پڑو کی کہانی

یہ جو بن مانس ہوتے ہیں۔ ان کے رہن سہن کا طریقہ یہ ہے کہ درجنوں کی تعداد میں مل جل کر، چھوٹے چھوٹے جتھوں کی شکل میں بسر رکھتے ہیں۔ ہر جتھے میں بن مانس انفرادی سطح پر پکی دوستیاں بھی بناتے ہیں۔ یہ مل کر شکار کرتے ہیں اور دشمن بن مانسوں، چیتوں اور لنگوروں کے خلاف کندھے سے کندھا ملا کر لڑائی بھی لڑتے ہیں۔ بن مانسوں کے یہاں پائے جانے والے سماجی ڈھانچے میں درجے ہوتے ہیں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ ہر جتھے کا ایک سردار ہوتا ہے جس کی خوب چلتی ہے۔ یہ سردار کوئی نر بن مانس ہی ہوتا ہے۔ اسے 'ایلفا-نر' کہتے ہیں یا کہیے، یہ جتھے کا سب سے تگڑا نر ہوتا ہے۔ جتھے کے دوسرے نر اور مادہ بن مانس اس تگڑے نر کے سامنے ہر وقت غصے سے غراتے رہتے ہیں۔ اس طرح بڑبڑا کر اور ناراضی کا اظہار کر کے وہ اس کی حاکمیت کو تسلیم کرتے ہیں۔ بن مانس انسانوں کی طرح نہیں ہوتے جو اپنے 'بادشاہ' یا 'مرشد' کے سامنے نہایت ادب اور خاموشی کے ساتھ، جھک کر اور گھٹنے، ماتھے ٹیک کر تعظیم بجالاتے ہوں اور 'بادشاہ' یا 'مرشد' کو اس کی حاکمیت جتاتے ہوں۔ بن مانسوں میں اس حاکم نر کا اصل کام یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے جتھے کے اندر سماجی مطابقت، اتحاد اور ہم آہنگی قائم کر کے رکھے۔ اگر جتھے کے دو بن مانس آپس میں لڑ پڑیں تو یہ نر بیچ میں پڑ کر تشدد کو روکتا ہے۔ بعض موقعوں پر فیاضی کا مظاہرہ کر کے کسی بن مانس کو زیادہ خوراک دلا کر مرعوب کرنے کی کوشش بھی کرتا ہے تاکہ جتھے کا مقصد پورا ہو اور ہمیشہ ہی چھوٹے، کم ظرف یا کمزور بن مانسوں کو مادہ بن مانسوں کے ساتھ جنسی تعلق قائم سے روک کر بھی رکھتا ہے۔

بن مانس کے کسی جتھے میں، جب نر حاکمیت کے لیے لڑائی لڑتے ہیں تو وہ ایسا اکیلے، تن تنہا یا صرف اپنی جسمانی طاقت کے بل بوتے پر نہیں کرتے۔ وہ جتھے کے اندر ساتھی تلاش کرتے ہیں، نر اور مادہ دونوں طرح کے ساتھی۔۔۔ جس طرح بھی ممکن ہو اور جتنی زیادہ تعداد میں حامی مل جائیں، اتنا ہی بہتر ہے۔ جتھے کے اندر کسی بھی نر بن مانس کے لیے حمایت حاصل کرنا آسان نہیں ہوتا۔ اسے محنت کے بل بوتے پر ہر روز دوسرے بن مانسوں کی خیر خبر لینی پڑتی ہے۔ ان کے ساتھ تعلق بنائے رکھنے کے لیے گہرا اور جگری ناطہ جوڑنا پڑتا

ہے۔ بے تکلفی کا سہارا بھی لیا جاسکتا ہے۔ اپنے دوستوں کو ہر روز گلے لگا، چھو کر، چوم اور پچکار کر اور کسی نہ کسی طرح بخشش، عنایات اور خیر خواہی کا اظہار کر کے تعلق کو باور کرانا پڑتا ہے۔ وہ نر بن مانس جو جتھے کی حاکمیت کے خواہاں ہوں ان کی مثال انسانوں میں سیاستدانوں کی طرح ہوتی ہے جو انتخابی مہم کے دوران حلقے میں جگہ جگہ جا کر لوگوں سے ملاقاتیں کرتے ہیں، ووٹروں کے ساتھ ہاتھ ملاتے، ان کے بچوں کو لاڈ کرتے پھرتے ہیں۔ بن مانسوں کے یہاں جتھے کی سرداری حاصل کرنے کے خواہاں نروں کا زیادہ تر وقت دوسرے بن مانسوں کے بچوں کو چومتے، چمکارتے اور ان کی پیٹھ سہلاتے ہی گزرتا ہے۔ ایک نر بن مانس، جتھے کا سردار اس لیے نہیں بنتا کہ وہ جسمانی طور پر مضبوط ہوتا ہے بلکہ اس کی اصل طاقت تو جتھے کی رہنمائی کرنے، تعلق استوار کرنے اور بن مانسوں کے بیچ اتحاد قائم رکھنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ بن مانسوں کے یہاں یہ اتحاد اور گٹھ جوڑ ہی ہوتے ہیں جو نہ صرف سرداری کا تعین بلکہ روز مرہ معاملات کو چلانے میں بھی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ایسے کسی بھی متحد جتھے کے رکن بن مانس اپنا زیادہ تر وقت اکٹھا گزارتے ہیں، کھانا بانٹ کر کھاتے ہیں اور مشکل وقت میں ایک دوسرے کی مدد بھی کرتے ہیں۔

بن مانسوں کے جتھے کو برقرار رکھنے اور احسن طریقے سے چلانے کے لیے ضروری ہے کہ عددی لحاظ سے حد مقرر رہے۔ کسی بھی جتھے کی کامیابی کا راز یہ ہے کہ اس میں شامل بن مانسوں کے بیچ اتحاد اور اتفاق قائم رہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ جتھے میں شامل سارے بن مانس ایک دوسرے کو بہت ہی اچھی طرح جانتے ہوں اور ان کے بیچ گہرا تعلق شرط ہے۔ مثال کے طور پر دو بن مانس، جن کے بیچ کبھی ملاقات نہیں ہوئی، لڑائی اور تو تکرار یا ذاتی سطح پر قریبی دوستی اور جذباتی لگاؤ نہیں دیکھا تو ان دونوں کے لیے یہ جاننا ممکن ہو گا کہ آیا وہ ایک دوسرے پر اعتبار کر سکتے ہیں یا نہیں؟ کیا ایک دوسرے کی مدد کرنا ان کے لیے کار آمد ہو سکتا ہے یا نہیں؟ اور سب سے اہم بات یہ کہ، تعلق واسطے کے بغیر انھیں پتہ ہی نہیں چلتا کہ ان میں سے برتر کون ہے؟ عام طور، یعنی قدرتی طور پر بن مانسوں کے ایک مثالی جتھے میں زیادہ سے زیادہ بیس سے لے کر پچاس بن مانس ہی ہوتے ہیں۔ جتھوں میں جیسے جیسے بن مانسوں کی تعداد بڑھتی جاتی ہے، سماجی طور پر گروہی کمزور پڑتی جاتی ہے۔ ایک وقت ایسا آتا ہے کہ یہ جتھا برقرار نہیں رہ پاتا اور اگلے جتھے میں سے بن مانسوں کا ایک نیا جتھا نکل آتا ہے۔ ایسا کم کم ہی ہوتا ہے کہ کوئی جتھا اتنا بڑا ہو جائے کہ اس میں شامل بن مانسوں کی تعداد سو تک پہنچ پائے۔ ایک جتھے میں شامل بن مانسوں کے بیچ تو اتفاق قائم ہو سکتا ہے لیکن ایسا ہونا تقریباً ناممکن ہے کہ دو الگ جتھوں کے بیچ گٹھ جوڑ ہو پائے۔ بن مانسوں کے جتھے آپس میں کبھی اتحاد نہیں بناتے اور ان کے بیچ ہمیشہ ہی خوراک اور علاقے کے لیے لڑائی جاری رہتی ہے۔ سائنسدانوں نے بن مانسوں کے جتھوں کے بیچ طویل لڑائیوں اور چپقلشوں کا پورا پورا ریکارڈ جمع کر رکھا ہے۔ یہ لڑائیاں اور چپقلشیں برسوں چلتی رہتی ہیں بلکہ ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ بن مانسوں نے عداوت اور دشمنی میں دوسرے جتھوں کا انتہائی مہارت اور پورے نظم و ضبط کے ساتھ ایک ایک کر کے، پورے کے پورے جتھے کا صفایا بھی کیا ہے۔ پتہ یہ چلا ہے کہ بن مانسوں کے یہاں بھی نسلی صفایے کا تصور پایا جاتا ہے۔

اوائل دور کے انسان، بشمول قدیم آدمی کی سماجی زندگی میں بھی غالباً ایسے ہی نقوش حاوی رہے ہوں گے۔ جیسے بن مانس، ویسے ہی انسانوں کے یہاں بھی سماجی جبلت پائی جاتی ہے جس کی وجہ سے ہمارے آباء نے دوسرے انسانوں کے ساتھ تعلق اور دوستی پالی، پیشوائی کا نظام قائم کیا اور ایک دوسرے کے ساتھ مل کر شکار کیا اور لڑائیاں لڑیں۔ تاہم، اس دور میں انسان بھی بن مانسوں کی ہی طرح چھوٹے چھوٹے گروہوں میں بٹ کر ایسا کر پاتا تھا۔ اوائل دور کے قدیم انسانوں کے یہاں بھی جب کوئی گروہ حد سے زیادہ بڑا ہو جاتا تو سماجی ترتیب اور نظام غیر مستحکم ہو جاتا اور نتیجہ گروہ کے ٹوٹنے پر منتج ہوتا۔ بھلے کوئی وادی کتنی ہی زرخیز کیوں نہ ہو، اس میں دستیاب وسائل زیادہ سے زیادہ پانچ سو قدیم آدمیوں کا پیٹ بھرنے کے لیے ہی کافی ہوتے تھے۔ ایسے حالات میں، یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ بہت سے اجنبی لوگ مل جل کر اکٹھے بسر کر پاتے۔ ان کے بیچ یہ کیسے طے ہوتا تھا کہ رہنما کون ہو گا؟ کون کہاں اور کس حد تک شکار کر سکتا ہے؟ اور کون کس کے ساتھ ازدواج استوار کرے گا؟

یہ شعور اور آگاہی کی دین ہے کہ فضول گوئی اور گفتگو کا فن آیا، جس کے نتیجے میں آدمی کے لیے سماجی طور پر بڑے سے بڑا گروہ تشکیل دینا ممکن ہو گیا۔ لیکن گفت و شنید اور لاف گزافی کی بھی تو حد ہوتی ہے۔ عمرانیات کی تحقیق سے پتہ چلتا ہے گپ شپ، باہمی تعلق اور لاگ گزافی پر مبنی گروہ میں 'قدرتی' طور پر زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ سو افراد ہی شامل ہو سکتے ہیں۔ اس سے زیادہ کسی آدمی کے لیے بھی ممکن نہیں ہے کہ وہ قریبی بلکہ کہیے کہ ذاتی سطح پر دوسرے لوگوں کو اچھی طرح جان پہچان سکے، ان کے ساتھ لگاؤ، انس پال سکے۔ کوئی بھی آدمی، ڈیڑھ سو لوگوں سے زیادہ کے بارے سچی اور جھوٹی۔۔۔ الغرض ہر طرح کی افواہیں جمع کر سکتا ہے اور نہ ہی آگے پھیلا سکتا ہے۔ آپ خود سوچیے، ایک آدمی آخر کسی کے بارے کب تک چغل خوری کرے گا؟ کس کس کی غیبت کرے گا؟ کتنوں کے بیچ لگائی بجھائی کر سکتا ہے؟

آج بھی ہم دیکھتے ہیں کہ ایک عام آدمی کے سماجی تعلقات، نفسیات اور تنظیمی عضویت اسی جادوئی ہندسے، یعنی ڈیڑھ سو کے ارد گرد ہی گھومتی ہے۔ آپ اپنے ارد گرد، بلکہ خود پر ہی غور کریں تو پتہ چلے گا کہ ڈیڑھ سو آدمیوں سے کم جہاں بھی ہو گا وہاں محلے داروں، دیہاتیوں۔۔۔ کام کاروباریوں، سماجی حلقوں اور فوجی یونٹوں کی آپس میں خوب بنتی ہے۔ ان کی آپس میں اتنی زیادہ بنتی ہے کہ لوگ خوب شیر شکر ہو کر رہتے ہیں۔ ان کے یہاں گہرے تعلق بن جاتے ہیں اور خوب غیبتیں ہوتی ہیں۔ چغل خوری میں مزہ آتا ہے۔ ایسی صورتحال میں کسی کو رسمی منصب کی کوئی حاجت محسوس نہیں ہوتی، لقب اور القاب، خطاب کوئی معنی نہیں رکھتے اور عام طور پر معمولی رسوم و رواجوں کے سوا کسی دوسرے قانون،، دستور کی موٹی موٹی کتابوں کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ لوگ آپس میں ہی، مل بیٹھ کر معاملات طے کر سکتے ہیں۔ ایک فوجی پلاٹون کی مثال لے لیں جس میں تیس پینتیس فوجی ہوتے ہیں۔۔۔ بھلے آپ ایک فوجی کمپنی کو دیکھ لیں جس میں زیادہ سے زیادہ سو فوجی ہوتے ہیں۔ ایک فوجی پلاٹون یا کمپنی میں فوجی کیسے ایک دوسرے کے ساتھ جڑ جاتے ہیں۔ ان کے بیچ

گہرے تعلق قائم ہو جاتے ہیں، اتنی بے تکلفی ہو جاتی ہے کہ ایک معزز سارجنٹ بھی اپنی کمپنی کا 'شاہ' بن سکتا ہے۔ اس کی اتنی عزت ہوتی ہے کہ کمیشنڈ افسران بھی اس کا لحاظ کرتے ہیں، اس کی بات سنتے ہیں۔ اسی طرح کوئی چھوٹا خاندانی کاروبار ہو تو اس کو چلانے کے لیے بورڈ آف ڈائریکٹرز کی ضرورت نہیں ہوتی۔ کیا آپ نے کبھی دیکھا کہ کسی چھوٹے سے کاروبار کا چیف ایگزیکٹو افسر ہو؟ یا اکاؤنٹنگ کا پورا ڈیپارٹمنٹ قائم کیا گیا ہو؟ سب سے عام، کسی چھوٹے سے محلے یا گلی کی مثال لے لیں۔ بیس پچیس گھروں میں، پچاس سو لوگ مل جل کر رہتے ہیں۔ اس گلی میں دو چار بڑے بھی ہوتے ہیں، جن کی سبھی عزت کرتے ہیں۔ گلی محلے میں کوئی لڑائی جھگڑا ہو جائے تو وہیں مل بیٹھ کر حل نکال لیا جاتا ہے، کوئی عدالت نہیں لگتی۔ ایک دوسرے کی چغلیاں ہوتی ہیں، غیبت کی جاتی ہے اور مزے مزے کے حلوے بٹتے ہیں۔

لیکن جب بھی ڈیڑھ سو کا ہندسہ پار ہوتا ہے تو وہ کیا خوب کہا جاتا ہے، 'اب وہ بات نہیں رہتی!'۔ معاملات، ایسے نہیں چل سکتے جیسے کسی فوجی پلاٹون، چھوٹے کاروبار یا گلی محلے میں چلا کرتے ہیں۔ آپ فوج میں ایک ڈویژن جس میں ہزاروں فوجی ہوتے ہیں۔۔۔ ایک پلاٹون کی طرح نہیں چلا سکتے۔ چھوٹے خاندانی کاروباروں کو اس وقت شدید مشکلات اور گھمبیر صورتحال کا سامنا کرنا پڑتا ہے جب کاروبار اس قدر پھیل جائے کہ باہر سے لوگوں کو بھاڑے پر رکھنے کی ضرورت پڑتی ہو۔ ایسے کاروبار، اگر خود کو دوبارہ سے ایجاد نہ کریں، اختراع پیدا نہ ہو تو ختم ہو جاتے ہیں۔

تو پھر آخر آدمی نے اس مشکل کا حل کیسے نکالا۔ اس دہلیز کو پار کیسے کیا؟ آدمی نے گلی، محلے تو چھوڑ ہزاروں اور لاکھوں نفوس پر مشتمل شہر بھی بسا لیے۔ ایسی ایسی سلطنتیں قائم کیں جن میں لاکھوں نہیں بلکہ کروڑوں لوگ آباد ہیں۔ آج کی ایسی جدید ریاستیں ہیں جن میں پچاس کروڑ بلکہ دو ایک میں تو ارب، ڈیڑھ ارب تک شہری ہیں۔ اس کا راز بھی غالباً فکشن کے ظہور کے ساتھ جڑا ہے۔ لوگوں کی بڑی تعداد ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر اسی وقت کام کر سکتی ہے جب وہ مشترکہ طور پر ایک طرح کی ہی اسطوری داستانوں، قصوں اور مفروضوں اور تصورات پر یقین کر لیتی ہے۔

آپ بڑے پیمانے پر انسانی اشتراک اور باہمی تعاون کی کوئی بھی مثال لے لیں۔ ایک جدید ریاست، قرون وسطیٰ کا چرچ، بہت ہی پرانا شہر یا کوئی قدیم قبیلہ۔۔۔ ان سب کی جڑوں میں ایسی داستانوں، مفروضوں اور تصورات پر یقین ملے گا جو ان لوگوں کی اجتماعی سوچ اور خیال میں گویا گندھی ہوئی تھیں۔ چرچ کی جڑوں میں لوگوں کے باہمی مذہبی عقائد اور حکایات جمع ہیں۔ دو ایسے کیتھولک عیسائی جن کے بیچ آج تک کبھی ملاقات بھی نہیں ہوئی ہو، وہ ایک دوسرے کو جاننا تو چھوڑو۔۔۔ انہوں نے اس سے قبل ایک دوسرے کا نام بھی نہ سنا ہو، وہ بھی آن کی آن میں کسی صلیبی جنگ میں شانہ بشانہ لڑ کر مرنے کے لیے تیار ہو جائیں گے۔۔۔ اگر جنگ نہ لڑ سکیں تو آنکھیں بند کر کے چندہ دے دیں گے، جس سے ہسپتال یا ایک نیا چرچ کھڑا کیا جا سکتا ہے۔ آخر کیوں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ دونوں عیسائی اس

تصور پر یقین رکھتے ہیں کہ کسی زمانے میں خدا انسانی جسم، پتلے میں مجسم ہو گیا تھا اور اس نے ہمارے گناہوں کے لیے خود کو سولی پر چڑھالیا تھا۔ اب یہ ہمارا 'فرض' ہے کہ ہم اس کی اس قربانی کا اپنی جان، مال اور وقت کے ذریعے لحاظ رکھیں۔ اسی طرح، ریاستوں کی جڑوں میں قوم پرستی کی خیالی باتیں گھلی ہوتی ہیں۔ دو سرب باشندے، جو سربیا کے دو مختلف کونوں میں بستے ہیں اور ایک دوسرے کو سرے سے جانتے تک نہیں۔۔۔ وہ دنیا میں کہیں بھی ایک دوسرے کی مدد کرنے، ان کی لڑائی لڑنے پہنچ جائیں گے کیونکہ یہ دونوں دل و جان سے یقین رکھتے ہیں کہ سرب ایک قوم ہیں، سربیا ان دونوں کا مشترکہ وطن ہے اور سرب جھنڈا اس دنیا کا سب سے برتر جھنڈا ہے۔ انصاف کے نظام کی جڑ میں قانون سے متعلق روایت کا ڈیرہ ہے۔ دو وکیل، جو خود بھی ایک دوسرے سے اجنبی ہیں۔۔۔ لیکن وہ دونوں مل کر ایک ایسے تیسرے اجنبی کے دفاع کے لیے کود پڑتے ہیں۔ کیوں؟ کیونکہ یہ دونوں قانون، انصاف اور انسانی حقوق کی بالادستی میں یقین رکھتے ہیں۔ زیادہ تر، انھیں اس کام کے پیسے بھی مل جاتے ہیں۔

غور کیجیے، یہ سارے معاملات ان کہانیوں، قصوں، حکایات، تصورات اور مفروضوں سے باہر کچھ معنی نہیں رکھتے جو آدمی نے ایجاد کر کے ایک دوسرے کو سکھا، پڑھا اور ازبر کرا رکھے ہیں۔ لوگوں کی عام فہم کے تصورات سے باہر خداؤں، دیوتا، پیسے، انسانی حقوق، قوانین اور انصاف کا کوئی وجود نہیں ہے۔

آج کا جدید انسان یہ بات تو نہایت آسانی سے سمجھ جاتا ہے کہ قدیم اور اوائل دور کا انسان اپنے سماجی نظم و ضبط کو برقرار رکھنے کے لیے بھوت پریت اور ارواح میں یقین رکھتا تھا۔ وہ پورے چاند کی رات، کھلے میدان میں آگ جلا، جانور قربان کر کے، خصوصی طور پر مل بیٹھا کرتا تھا۔ آج کا جدید انسان، اس قدیم دور کی سماجی ترتیب کو تو نہایت خوب طریقے سے سمجھ لیتا ہے لیکن یہ نیمانا یہ نہیں مانتا کہ آج جدید دور کے جدید اداروں، دستور اور رواج کی بنیاد بھی ویسی کی ویسی ہی ہے۔ اس نکتے کو سمجھنے کے لیے کاروباری دنیا کی کارپوریشنوں کی مثال لے لیں۔ آج کے جدید دور کے کاروباری، سرمایہ دار اور وکلاء اصل میں انتہائی طاقتور مداری ہیں۔ ان کاروباری حضرات، شاطر وکیلوں، سرمایہ داروں اور قدیم قبائلی شامن پادریوں کے بیچ فرق صرف یہ ہے کہ آج کے وکیل ان کے مقابلے میں زیادہ لمبی لمبی چھوڑتے ہیں اور بہت ہی بڑھ چڑھ کر عجیب و غریب قصے سناتے ہیں۔ اس ضمن میں آپ جدید دور کی 'پژو کی کہانی' سنیے، جو کہ بہترین اور مثالی ہے۔

آپ کو جرمنی کے غار سے ملنے والا انتہائی قدیم اور نادر نمونہ 'شیر نما آدمی' تو یاد ہی ہو گا؟ جیسے تب، ویسے ہی آج بھی شیر کی شبیہ جوں کی توں استعمال ہوتی ہے۔ آج کل یہ شبیہ پیرس سے لے کر سڈنی تک لاکھوں موٹر کاروں، ٹرکوں اور موٹر سائیکلوں پر ایک نشان کی شکل میں نظر آتی ہے۔ شیر کا یہ نشان پژو کمپنی کی بنائی ہوئی ہر گاڑی کے فرنٹ، بونٹ پر انتہائی نفیس انداز میں سجا بجا کر شان سے لگایا جاتا ہے۔ پژو، یورپ میں گاڑیاں بنانے والی ایک بہت پرانی اور آج سب سے بڑی کمپنی ہے۔ پژو کمپنی کی ابتداء مشرقی فرانس کے ایک چھوٹے

سے قصبے میں ایک چھوٹے خاندانی کاروبار کی صورت میں ہوئی تھی۔ یہ قصبہ اس غار سے صرف تین سو کلومیٹر دور واقع ہے جہاں سے 'شیر نما آدمی' کو مورتی دریافت ہوئی ہے۔ آج دنیا بھر میں پژو کمپنی کے ملازمین کی تعداد تقریباً دو لاکھ ہے، جن میں سے اکثریت ایک دوسرے کے لیے بالکل اجنبی ہے۔ ان دو لاکھ اجنبی افراد کا ایک دوسرے کے ساتھ تعاون اتنا مثالی ہے کہ صرف 2008ء کے ایک برس میں پژو کمپنی نے قریباً پندرہ لاکھ گاڑیاں بنا کر بیچیں اور اس سے کمپنی کو حاصل ہونے والی آمدن کا تخمینہ پچپن ارب یورو (ساٹھ ارب امریکی ڈالر) ہے۔

اب آپ سوچیے، پژو جیسی اتنی بڑی، بلا۔۔۔اس کمپنی کا اپنا وجود کیا ہے؟ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ پژو کمپنی کی گاڑیاں سڑکوں پر دوڑتی پھرتی نظر آتی ہیں لیکن وہ تو ظاہر ہے گاڑیاں ہیں، کمپنی تو نہیں ہیں۔ پژو کمپنی کی بنائی ہوئی ان ساری گاڑیوں کو دنیا بھر سے جمع کر کے کوڑیوں کے دام بیچ کر کسی کباڑی کی دکان پر ختم کر بھی دیں تو پھر بھی پژو کمپنی تو ختم نہیں ہو گی۔ پژو کمپنی بدستور نئی گاڑیاں بناتی رہے گی اور سالانہ رپورٹ جاری کرتی رہے گی۔ اس کمپنی میں کئی فیکٹریاں، مشینری، شوروم ہیں۔ اس کمپنی کے ہزاروں کی تعداد میں انجنیئر، مکینک، اکاؤنٹنٹ، سیکرٹری اور نہ جانے کیا کیا لوگ بھی ہیں لیکن یہ ساری چیزیں مل کر بھی پژو کمپنی تو نہیں کہلائی جا سکتیں۔ پژو کمپنی کی ایک فیکٹری، صرف فیکٹری ہی رہے گی۔۔۔پژو کمپنی نہیں کہلائے گی۔ فرض کریں، کسی آفت یا حادثے کے نتیجے میں پژو کمپنی کے سارے ملازمین مر کھپ جاتے ہیں، فیکٹریاں جل کر راکھ ہو جاتی ہیں اور ایگزیکٹو دفاتر، شوروم اور سروس ایریاز زمین بوس ہو جاتے ہیں۔ پھر بھی، پژو کمپنی کے لیے نہایت آسان ہے کہ وہ ادھار پیسہ لے کر، نئے ملازمین بھرتی کر، نئی فیکٹریاں کھڑی کر کے، نئی مشینری کے ساتھ دوبارہ گاڑیاں بنانا شروع کر دے۔ پژو کمپنی کے منیجر اور سرمایہ لگانے والے بھی ہیں، لیکن عجیب بات یہ ہے کہ یہ بھی پژو کمپنی کی ساخت نہیں ہیں۔ یہ سارے منیجر نہایت آسانی کے ساتھ معطل کیے جا سکتے ہیں اور اس کمپنی کے سارے شیئرز اور حصص خریدے اور بیچے بھی جا سکتے ہیں۔ کوئی بھی سرمایہ دار اس کمپنی میں حصص خرید بھی سکتا ہے اور جب چاہے، بیچ بھی سکتا ہے۔ تو پھر یہ سوچنا بالکل جائز ہے کہ آخر یہ پژو کمپنی شے کیا ہے؟

4 پژو کمپنی کا شیر نما مارکہ

اس ساری کہانی کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ پژو کمپنی نا قابل تسخیر اور کوئی غیر فانی شے ہے۔ اگر آج کوئی جج اس کمپنی کو تحلیل کرنے کا فیصلہ سنادے تو فیکٹریاں تو چلتی رہیں گی۔۔۔ مزدور، اکاؤنٹنٹ، منیجر اور شئیر ہولڈر اپنا کام کرتے رہیں گے لیکن پژو کمپنی آن کی آن میں غائب ہو جائے گی۔ سادہ الفاظ میں کہیے تو پژو کمپنی کا اس مادی دنیا کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہ پژو کمپنی کیا واقعی حقیقت میں وجود رکھتی ہے؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ پژو کمپنی ہمارے اجتماعی تخیل کا صرف ایک واہمہ ہے۔ وکلاء حضرات اس واہمے کو 'قانونی مفروضہ' کہتے ہیں۔ یہ ایسی شے ہے جس کی نشاندہی نہیں کی جاسکتی۔ یہ کوئی مادی چیز یا شے نہیں ہے لیکن قانون کی رو سے بہر حال ایک 'وجود' ہے۔۔۔ میری اور آپ کی طرح، پژو کمپنی بھی ایک 'جیتا جاگتا لیکن تصوراتی وجود' ہے۔ اس پر بھی ہماری ہی طرح ان ملکوں کے قوانین لاگو ہوتے ہیں جہاں جہاں یہ کمپنی وجود رکھتی ہے۔ پژو کمپنی کے نام پر بینک اکاؤنٹ بھی کھل سکتا ہے اور یہ کمپنی کسی بھی آدمی کی طرح جائیداد کی مالک بھی بن سکتی ہے۔ پژو کمپنی ٹیکس بھی ادا کرتی ہے اور اس پر مقدمہ بھی قائم کیا جاسکتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ پژو کمپنی ایسا وجود ہے جس کو سزا بھی دی جاسکتی ہے۔ اس کمپنی کے حصص رکھنے والے مالکان اور ملازمین کو نہیں بلکہ بذات خود، پژو کمپنی کو سزا بھی دی جاسکتی ہے۔

پژو کمپنی کی حقیقت قانونی ہیر پھیر کی ایک اختراع، 'لمیٹڈ کمپنی' سے متعلق ہے۔ یہ جو لمیٹڈ کمپنی کی اختراع ہے، اس کے پیچھے نوع انسانی کی ہوشیاری اور ذہانت کی معراج چھپی ہوئی ہے۔ آدمی، ہزاروں سال۔۔۔ ان گنت برسوں تک ایسی اختراعات کے بغیر ہی جیتا چلا آیا ہے۔ ریکارڈ شدہ انسانی تاریخ کے تقریباً حصے میں یہی نظر آتا ہے کہ جائیداد کا مالک ہونے کے لیے گوشت پوست سے بنے، ہوش و

حو اس کے مالک آدمی کا وجود لازم ہے۔ اگر تیرہویں صدی میں کوئی شخص ہتھ ریڑیوں کی ورکشاپ بنا کر ریڑھیاں بیچنے کی دکان لگاتا تو وہ شخص ہی یہ کاروبار سمجھا جاتا۔ مثال کے طور پر، اگر کوئی ہتھ ریڑھی بکنے کے ایک ہفتے بعد ہی ٹوٹ جاتی تو غصے میں لال پیلا گاہک، ناک بھنویں چڑھا کر سیدھا اس شخص کے گریبان کو ہاتھ ڈال دیتا۔ اگر اس شخص نے ایک ہزار سونے کے سکے ادھار لے کر یہ کاروبار شروع کیا تھا، فرض کریں یہ کاروبار ناکام ہو جاتا ہے تو اس شخص کو یہ ادھار اپنی ذاتی جائیداد جیسے گھر، گائے اور زمین بیچ کر ادا کرنا پڑتا تھا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے کہ شاید اس شخص کو اس ناکامی کا خمیازہ اپنے بچوں کو بھی غلامی میں بیچ کر ادا کرنا پڑ جاتا تھا۔ اگر اس کے باوجود بھی وہ یہ ادھار چکانے میں ناکام رہتا تو لازم ہے، اس کے قرض خواہ اس کو پکڑ کر مقامی قاضی کی عدالت میں لے جاتے، جہاں اس شخص کو قید کی سزا سنادی جاتی۔ یہ شخص اس کاروبار سے متعلق ہر شے کا ذمہ دار قرار پاتا اور اس کی کوئی حد نہیں تھی۔ اس حقیقت میں کوئی دو رائے نہ ہوتیں۔

اگر آپ اس زمانے میں جی رہے ہوتے تو کوئی بھی کاروبار شروع کرنے سے پہلے سو سو چھوڑ، ہزار بار سوچتے۔۔۔ یہ ایسی صورتحال تھی کہ کاروبار کی حوصلہ شکنی ہوتی تھی۔ لوگ نیا کاروبار شروع کرنے اور معاشی خطرات مول لینے سے ڈرتے تھے۔ ظاہر ہے، کون ایسا جھنجھٹ پالے جس کا نتیجہ کنگالی اور مفلسی پر منتج ہو سکتا تھا؟

یہی وجہ تھی کہ لوگوں نے اجتماعی طور پر 'لمیٹڈ کمپنیوں' کے تصور بارے سوچنا شروع کیا۔ یہ خود مختار کمپنیوں کا تصور تھا۔ مراد، ایسا تصور جو قانونی طور پر کسی بھی شخص کو ان کمپنیوں کو تشکیل دینے، سرمایہ کاری کرنے اور چلانے والے لوگوں سے آزادی فراہم کرتا تھا۔ پچھلی چند صدیوں میں لمیٹڈ کمپنیاں دنیا بھر کے معاشی میدان کا سب سے بڑا کردار بن کر ابھری ہیں۔ آج ہم ان لمیٹڈ کمپنیوں سے اس قدر مانوس ہو چکے ہیں کہ سرے سے بھول چکے ہیں کہ یہ صرف ہمارے خیال اور تصور کا شاخسانہ ہیں اور اس کے سوا کچھ بھی نہیں ہیں۔ امریکہ میں لمیٹڈ کمپنی کو 'کارپوریشن' کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ کارپوریشن کی اصطلاح نہایت عجیب رمز ہے۔ وہ یوں کہ کارپوریشن لاطینی زبان کے لفظ 'کارپس' سے نکلا ہے۔ کارپس کے معنی 'جسم' کے ہوتے ہیں اور کارپوریشن کے تصور میں واحد مادی 'جسم' ہی ایسی شے ہے جو سرے سے وجود ہی نہیں رکھتی۔ اگرچہ کارپوریشن کوئی گوشت پوست سے بنا جسم تو نہیں ہوتی لیکن امریکہ کا قانونی نظام کارپوریشنوں کے ساتھ قانونی طور پر آدمیوں کی طرح ہی برتاؤ کرتا ہے۔ ایسے، جیسے گوشت پوست سے بنا، جیتا جاگتا انسان ہو۔

1896ء میں بھی فرانس کا قانونی نظام 'کمپنی' نامی ایسے ہی وجود پر یقین رکھتا تھا۔ تب، ایک شخص تھا۔ اس کا نام آرمنڈ پژو تھا۔ اسے اپنے والدین کی جانب سے دھات اور فلز کاری کی ایک چھوٹی سی ورکشاپ ترکے میں ملی تھی۔ اس ورکشاپ میں چھوٹے پیمانے پر سپرنگ، آریاں اور سائیکل بنائی جاتی تھیں۔ پژو نے 1896ء میں اپنے کاروبار کو وسیع دیتے ہوئے موٹر گاڑیاں بنانے کا فیصلہ کیا اور باقاعدہ ایک لمیٹڈ کمپنی رجسٹر کروائی۔ اس نے کمپنی کا نام، اپنے ہی خاندانی نام پر۔۔۔ پژو رجسٹر کرایا۔ یہ کمپنی قانونی طور پر پژو اور

اس کے خاندان سے الگ، ایک خود مختار وجود تھی۔ اگر کوئی موٹر گاڑی چلتے چلتے مکینیکل وجوہات کی بناء پر رک جاتی تو خریدار آرمنڈ پژو نہیں بلکہ پژو کمپنی پر ہرجانے کا دعوی کرسکتا تھا۔ پژو کمپنی نے ورکشاپ میں توسیع اور شوروم بنانے کے لیے لاکھوں فرانسیسی فرانک کا قرض لیا۔۔ لیکن اگر یہ کمپنی دیوالیہ ہو جاتی تو آرمنڈ پژو قرض خواہوں کو ایک پائی بھی واپس ادا کرنے کا حقدار نہیں تھا کیونکہ قرضہ آرمنڈ پژو نامی شخص نے نہیں بلکہ پژو نامی کمپنی نے اٹھایا تھا۔ آرمنڈ پژو 1915ء میں بیمار پڑ کر انتقال کر گیا لیکن پژو کمپنی آج بھی زندہ ہے اور کلیشے، تندرست اور اچھی صحت کی حامل ہے۔ یعنی خوب منافع کما رہی ہے۔

آرمنڈ پژو نے پژو کمپنی کی تخلیق کیسے کی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ آرمنڈ پژو نے پژو کمپنی کو ایسے ہی پیدا کیا جیسے نوع انسانی کی تاریخ میں پادریوں نے خدا اور جادو گروں نے بھوت پریت اور بدروحوں کے تصور کو پیش کیا تھا۔ اس قدیم تصور کے تحت آج بھی ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں فرانسیسی عیسائی اتوار کے روز بلاناغہ چرچ میں جمع ہوتے ہیں اور یسوع مسیح کے صلیب پر چڑھے ہوئے جسم کی شبیہ بناتے ہیں۔ کروڑوں لوگ آج بھی بھوت پریت اور آسیب پر یقین رکھتے ہوئے ہر روز، کبھی دن اور کبھی رات میں ٹوٹکے کرتے ہیں۔ ان تصورات کے آج بھی قائم رہنے میں اصل ہاتھ ان قصوں، داستانوں اور حکایات کا ہے جو لوگ ایک دوسرے کو بار بار سناتے ہیں اور ان پر یقین رکھتے ہیں۔ عیسائیوں کے یہاں کئی مسالک اور فرقے بھی ہیں۔ ہر فرقہ، مثال کے طور پر فرانس کے 'کیورے' عیسائی فرقے کے 'پارش' چرچ کے لیے یسوع مسیح کی زندگی سے متعلق وہ حکایت سب سے اہم اور قطعی تصور کی جاتی ہے جو کیتھولک چرچ نے سنا رکھی ہے۔ اس حکایت کی رو سے اگر کوئی کیتھولک پادری غسل کرکے، پاک صاف ہو کر، مقدس پوشاک پہن کر، سچے دل اور پوری لگن کے ساتھ صحیح وقت اور صحیح جگہ پر بالکل ٹھیک ٹھیک لہجے، تلفظ اور مخصوص انداز کے ساتھ درست الفاظ ادا کرے تو دنیا کی معمولی مادی چیزیں جیسے ڈبل روٹی اور شراب خدا کے اوتار کی صورت، گوشت اور پوست میں ڈھل جاتی ہیں۔ پادری با آواز بلند لاطینی زبان میں وہ الفاظ ادا کرتا ہے جس کے معنی ہیں، 'یہ میرا جسم ہے!' اور نٹ سے سامنے پڑی ڈبل روٹی اور شراب یسوع مسیح کے گوشت میں ڈھل جاتی ہے۔ اس پادری کو جب اس فرقے کے لاکھوں عیسائی دیکھتے ہیں کہ اس نے پاک صاف ہو، باقاعدہ تیار ہو کر، نہایت تن دہی اور انہماک سے اس کاروائی پر عمل کیا ہے تو وہ ایسا پیش آتے ہیں کہ جیسے خدا سچ مچ، حقیقت میں زمین پر اتر آیا ہے اور وہ اب اس مقدس ڈبل روٹی اور شراب میں سمو گیا ہے۔

پژو کمپنی کے معاملے میں اہم حکایت یا مفروضہ وہ تھا جو فرانس کے نظام قانون نے وضع کر رکھا تھا۔ یہ قانون فرانس کی پارلیمان نے طے کیا تھا اور ہم سب 'جانتے' ہیں کہ پارلیمان 'مقدس' ہوا کرتی ہے۔ فرانسیسی قوانین کے تحت اگر کوئی رجسٹرڈ وکیل تمام تر اصولوں اور قانونی پرتوں کا استعمال کرتے ہوئے، باقاعدہ انداز میں، مسلمہ طریقے سے، رائج فیس ادا کرکے اور جیسے کہ رواج ہے کہ نہایت ادب کے ساتھ کالا کوٹ اور وگ سر پر ٹکائے، عدالت کی رسمی کاروائی پر پورا اترتے ہوئے تمام تر حلف اور اقرار نامے خوش خط اور

کاغذ کی اعلی قسم یعنی ریاست کے جاری کردہ تصدیق شدہ سٹامپ پیپر پر حرف بہ حرف لکھ اور کئی کئی بار پڑھ اور پڑتال کر کے لائے مندرجات کے آخر میں جب اپنے موکل، خود اپنے اور مجسٹریٹ کے دستخط ثبت کر کے پیش کرتا ہے تو۔۔۔جج کا ہتھوڑا میز پر گرتے ہی کھٹ سے ایک نئی کمپنی تشکیل پاجاتی ہے۔یعنی، کمپنی کے وجود میں جان پڑجاتی ہے۔

1896ء میں جب آرمنڈ پژو نے ایک نئی کمپنی بنانے کا ارادہ کیا تو اس نے اس سارے عمل کو پورا کرنے کے لیے ایک وکیل کی خدمات بھاڑے پر حاصل کیں، جس نے مندرجہ بالا ساری رسوم پوری تندہی سے ادا کیں۔ جب وکیل نے صحیح صحیح طریقے سے سارے شعائر پورے کر لیے تو فرانس کے لاکھوں شہری یکدم ہی ایسا برتاؤ کرنے لگے جیسے پژو کمپنی سچ مچ ایک زندہ اور جیتا جاگتا جی ہے۔ گویا یہ حقیقی وجود کی مالک کوئی ہستی ہے۔

لیکن افسانوی قصوں اور حکایات کو موثر طریقے، کچھ ایسے بنا کر سنانا کہ لوگ یقین کریں۔۔۔ یہ اتنا آسان کام بھی نہیں ہے۔اصل مسئلہ کہانی سنانے کا نہیں ہے بلکہ لوگوں کو اس پر یقین کرنے پر آمادہ کرنے سے تعلق رکھتا ہے۔ تاریخ کا تقریباً حصہ ایک ہی سوال کے گرد گھومتا ہے اور وہ یہ کہ، 'آخر لاکھوں اور کروڑوں لوگوں کو خداؤں، قوموں یا لمیٹڈ کمپنیوں پر یقین لانے کے لیے کیسے قائل کیا جائے؟' لیکن جب لوگ یقین لے آتے ہیں تو اس سے آدمی کو بے پناہ طاقت اور دسترس مل جاتی ہے کیونکہ لاکھوں اور کروڑوں اجنبی مل کر مشترکہ منزل کا نشان ڈھونڈ سکتے ہیں۔ آپ خود سوچیں، صرف حقیقت میں پائی جانے والے چیزوں جیسے پہاڑوں، دریاؤں، درختوں اور شیروں کے بل بوتے پر ریاستیں تشکیل دینا، چرچ کے تصورات کھڑے کرنا یا قانونی نظام وضع کرنا کس قدر مشکل ہوتا؟ بلکہ کیسے۔۔۔ یہ ناممکن تھا۔

سالہاسال سے، آدمی نے کہانیاں اور قصے گھڑنے، تصورات پالنے میں خوب ترقی کی ہے۔اب ہم غیر معمولی طور پر انتہائی پیچیدہ اور جال در جال کہانی بُن سکتے ہیں۔ کہانیوں اور حکایتوں کے تہہ در تہہ اس جال میں پژو کا قصہ نہ صرف یہ کہ وجود رکھتا ہے بلکہ انتہائی طاقتور بھی ہے۔لوگ ان قصوں، داستانوں، مفروضوں اور حکایات کی مدد سے جو کہانیوں کے جال بنتے ہیں، علمی حلقوں میں اسے 'فکشن'، 'سماجی ترتیب' یا سب سے بہتر نام، 'تصوراتی حقیقت' سے پکارا جاتا ہے۔ کوئی بھی تصوراتی حقیقت، جھوٹ نہیں ہوتی۔ جھوٹ تو یہ ہے کہ میں قصہ کچھ ایسے گھڑلوں کہ میں نے آج صبح دریا کے کنارے ایک شیر دیکھا تھا۔۔۔ جبکہ اصل میں سچ یہ ہے کہ میں جان بوجھ کر غلط بیانی کر رہا ہوں ورنہ دریا کے کنارے کوئی شیر وغیرہ نہیں تھا۔ جھوٹ بولنا کوئی اتنی اہم شے بھی نہیں ہے۔ہرے بندر اور بن مانس بھی جھوٹ بول سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہرے بندروں کو تحقیق کے دوران جھوٹ بولتے دیکھا جاچکا ہے۔ سائنسدانوں نے مشاہدے کے دوران دیکھا کہ ایک ہرا بندر چیخا، 'محتاط رہو۔۔۔ شیر ہے!'۔ حالانکہ اس وقت ارد گرد کوئی شیر نہیں تھا۔ لیکن جھوٹے بندر کی اس غلط بیانی اور

جھوٹ موٹ چھیننے کا اسے فائدہ یہ ہوا کہ وہ بندر جن کے ہاتھ کچھ کیلے آ گئے تھے، فوراً ہی ڈر کر درختوں پر چڑھ گئے اور دروغ گو بندر کو کیلوں کی وافر مقدار میں سے چند اپنے لیے ہتھیانے کا نہایت آسان موقع مل گیا۔

جھوٹ کے برعکس، تصوراتی حقیقت ایسی شے ہے جس میں کسی تصور، خیال یا سوچ پر سب کے سب افراد اجتماعی طور پر یقین رکھتے ہیں۔ جب تک سب لوگ اس پر یقین دھرے رہتے ہیں، تصوراتی حقیقت دنیا میں اپنی اصل طاقت دکھاتی رہتی ہے۔ 'شیر نما آدمی' کا مجسمہ ساز بھی دل و جان سے ایک شیر نما آدمی کی روح پر یقین رکھتا ہو گا۔ بعض فسوں گروں اور نیم حکیموں کو چھوڑ کر، باقی سبھی خداؤں اور بھوت پریت، جن چڑیلوں میں پورا یقین رکھتے ہیں۔ سبھی لکھ اور کروڑ پتی افراد پیسے اور لمیٹڈ کمپنیوں میں یقین رکھتے ہیں۔ انسانی حقوق کے تحفظ پر تحریک پر کام کرنے والا ہر شخص دل کی اتھاہ گہرائیوں سے انسانی حقوق کی وجودگی پر یقین رکھتا ہے۔ آپ خود بتائیں، 2011ء میں جب اقوام متحدہ نے لیبیا کی حکومت سے اپنے شہریوں کے انسانی حقوق کے تحفظ کا مطالبہ کیا تو اس میں جھوٹ کہاں تھا؟ حالانکہ، اقوام متحدہ، لیبیا اور انسانی حقوق۔۔۔ یہ تینوں ہمارے تخیل کی ایجاد ہیں۔ یہ ہماری تصوراتی حقیقت کا حصہ ہیں۔

جب سے شعور اور آگاہی پیدا ہوئی ہے، تب سے آج تک۔۔۔ آدمی اسی دوہری حقیقت میں بسر کرتا چلا آ رہا ہے۔ ایک طرف تو واقعی اور معروضی حقیقت ہے جس میں دریاؤں، درختوں، پہاڑوں اور شیروں کا وجود ہے اور دوسری جانب تصوراتی حقیقت پھیلی ہوئی ہے جس میں خداؤں، دیوتاؤں، ریاستوں اور کارپوریشنوں کا بسیرا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جوں جوں وقت گزرتا گیا ہے۔۔ تصوراتی حقیقت، معروضی حقیقت سے کہیں زیادہ طاقتور ہوتی چلی گئی ہے۔ آج تو صورتحال یہ ہے کہ خود واقعی حقیقتوں جیسے دریاؤں، درختوں اور شیروں کی بقاء تصوراتی حقیقتوں جیسے خداؤں، ریاستوں اور کارپوریشنوں کی محتاج ہے۔

جینیات کو چکما

جب آدمی نے تصوراتی حقیقت کو رنگ برنگے لفظوں سے نکال لانے کی صلاحیت حاصل کر لی تو اس کا فائدہ یہ ہوا کہ بڑی تعداد میں اجنبی مل کر موثر انداز میں اشتراک اور تعاون کے قابل تو ہو گئے لیکن اس سے بڑھ کر ایک اور صورت بھی نکل آئی۔ چونکہ، بڑے پیمانے پر انسانوں کے تعاون اور اشتراک کی بنیاد قصے اور مفروضے تھے، آدمی نے یہ بھی جان لیا کہ لوگوں کو کسی نئی طرز اور مقصد کے لیے تعاون پر قائل کرنے کے لیے ہر روز، کسی بھی جگہ پر نت نئی اور انتہائی مختلف کہانیاں اور مفروضے بھی تو گھڑے جا سکتے ہیں۔ اس کی کوئی حد تو نہیں ہے۔ اگر حالات معقول اور ماحول ساز گار ہو تو پہلے سے موجود حکایات کا رخ بھی بدلا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر 1789ء میں فرانسیسی عوام نے راتوں رات بادشاہوں کے قدرتی اور ایزدی حق حکمرانی کے تصورات میں یقین کرنے کی بجائے جمہور کی خود مختاری اور خود ارادیت کے مفروضوں پر ایمان لانے کا فیصلہ کر لیا۔ جب سے آگاہی اور شعور کا انقلاب برپا ہوا ہے۔۔۔ اگر ایک طرف آدمی

نے قصے اور مفروضے گھڑے ہیں تو دوسری جانب اپنے رویوں اور طرزِ عمل کو بھی ضرورت اور حالات کے عین مطابق آن کی آن میں بدلنے کی صلاحیت حاصل کی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ آدمی جینیات پر مبنی ارتقاء کی سست رفتار ریڑھی کو چکما دے کر سیدھا معاشرتی اور تہذیبی ارتقاء کی تیز ترین ٹرین پر سوار ہو گیا۔ آدمی اس تیز ترین ٹرین پر سوار کیا ہوا، گویا اپنے دوسرے ہم عصر انسانوں کی انواع اور دوسرے جانوروں کو اشتراک اور تعاون میں کہیں پیچھے چھوڑ دیا۔

دوسرے جانوروں، بالخصوص سماجی جانوروں کے رویے اور طرزِ عمل کا تعین بڑے پیمانے پر ان کو مورثے یعنی نسب طے کرتا ہے۔ یعنی ان کو فطرت، وراثت میں ملتی ہے۔ فطرت، نسب میں لکھی ہوتی ہے۔ لیکن ڈی این اے یا جینیاتی مادہ جابر اور مطلق العنان نہیں ہوتا۔ جانوروں کے رویے اور طرزِ عمل پر ماحولیاتی عوامل اور ہر جانور کے اپنی رمز بھی کسی نہ کسی حد تک اثر انداز ہوتی ہی ہے۔ تاہم، کسی بھی طرح کے ماحول میں ایک ہی نوع سے تعلق رکھنے والے جانوروں کا رویہ کم و بیش، ایک ہی جیسا ہوتا ہے۔ سماجی رویوں اور طرزِ عمل میں عام طور پر جینیاتی تغیر کے بغیر غیر معمولی تبدیلیوں کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ مثال کے طور پر بن مانس کے جتھوں میں درجوں اور رتبے کے تحت الفا نر یا سردار کے زیرِ دست گزر بسر دراصل ان کی جینیات، فطرت میں لکھی ہوتی ہے۔ جبکہ بن مانس کی ایک دوسری نوع، جو بن مانسوں کی عمزاد اور اسے بونوبو کہتے ہیں، ان کے جتھے کی جینیات میں برابری اور مساوات کے تحت رہنا اور مادہ بونوبوؤں کی حاکمیت لکھی ہوتی ہے۔ بن مانسوں کے جتھوں کی مادین، کبھی بھی اپنے عمزادوں، یعنی بونوبو جتھوں کی مادین سے سبق نہیں سیکھیں گی۔ ایسا کبھی نہیں ہو گا کہ بن مانسوں کے جتھوں میں حقوقِ نسواں کا انقلاب برپا ہو۔ اسی طرح نر بن مانس کبھی بھی کسی آئین ساز اسمبلی میں جمع ہو کر سردار بن مانس کا عہدہ ختم نہیں کر سکتے اور یہ اعلان کرنے کے اہل نہیں ہیں کہ آج کے بعد سارے بن مانس برابر ہیں۔ بن مانسوں کے رویوں اور طرزِ عمل میں بدلاؤ اسی وقت آسکتا ہے جب ان کے ڈی این اے میں غیر معمولی تبدیلی آئے۔

قدیم آدمی نے بھی طویل عرصے تک، اسی وجہ سے کسی بھی طرح۔۔۔ اپنے یہاں کبھی بھی انقلاب برپا نہیں کیا۔ اس ضمن میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ آدمی کے سماجی نقوش میں بدلاؤ، نئی ٹیکنالوجی کی دریافتیں اور اجنبی دیار میں جا کر بسر رکھنے کی صلاحیت فطرت اور جینیات میں بدلاؤ اور ماحولیاتی عوامل کے دباؤ کا نتیجہ ہے۔ اس میں معاشرتی اور تمدنی عوامل کا بہت ہی کم ہاتھ ہے۔ یہی تو وجہ ہے کہ آدمی کو یہ قدم اٹھانے میں لاکھوں برس لگ گئے۔ بیس لاکھ سال پہلے جینیاتی تبدیلیوں کے نتیجے میں نوعِ انسانی میں کھڑے آدمی کا ظہور ہوا تھا۔ یہ اس جینیاتی تبدیلی کا ہی ثمر تھا کہ کھڑے آدمی نے پہلی بار پتھر کے اوزار اور ہتھیار بنانے کی تکنیک سیکھ لی تھی۔ آج، پتھر کے اوزار اور ہتھیار ہی انسان کی اس نوع کے نمایاں خصوصیت شمار ہوتی ہے۔ جب تک کھڑے آدمی کی جینیات میں مزید تبدیلیوں کا ظہور نہیں ہوا، پتھر سے بنائے اوزار اور ہتھیار قریباً بیس لاکھ سال تک ویسے کے ویسے ہی رہے۔

اس کے برعکس، خردمند آدمی کے یہاں شعور اور آگاہی کا ادراک ہوتے ہی رویوں اور طرزِ عمل میں تبدیلی کی صلاحیت میں تیزی آگئی۔ آدمی کی ایک نسل سے دوسری اور مستقبل کی تمام نسلوں میں بدلتے رویے، طرزِ عمل اور کردار بڑھ چڑھ کر منتقل ہوتے رہے ہیں اور اس مقصد کے لیے جینیات میں تبدیلی اور ماحولیاتی عوامل اور ان کی ضرورت بے معنی ہوگئی۔ رویوں اور طرزِ عمل کی نسل در نسل منتقلی کی سب سے عمدہ مثال آدمی کی نسلوں میں پائی جانے والی لاولد اشرافیہ ہے۔ لاولد اشرافیہ میں چیدہ مثالیں کیتھولک چرچ کے پادری اور پاپائے، بدھ سادھوؤں کے راہب خاندان اور چینی سلطنتوں میں دفترشاہی سنبھالنے والا مخنث طبقہ شامل ہے۔ اس طرح کی لاولد اشرافیہ کا وجود ڈارون کے نظریے یعنی فطری انتخاب کے سب سے بنیادی اصول کے عین خلاف ہے کیونکہ سماج کے یہ غالب اور مقتدر حلقے اپنی مرضی سے افزائشِ نسل اور تولید کو ترک کر دیتے ہیں۔ دوسری جانب بن مانس جتھوں میں سردار یا الفانر اپنی حاکمیت اور جتھے پر غلبے کی طاقت کو جتنی زیادہ مادہ بن مانسوں کے ساتھ ممکن ہو، جنسی ملاپ کے لیے استعمال کرتے ہیں اور جتھے میں زیادہ سے زیادہ تعداد میں بچے پیدا کرکے اس خاندانی جتھے کو مضبوط سے مضبوط بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ دوسری جانب، آدمی کے یہاں کیتھولک 'الفانر' جنسی ملاپ اور بچے پالنے کے عمل کو مکمل طور پر چھوڑ دیتا ہے۔ اس کا یہ طرزِ عمل، یہ رویہ ماحولیاتی عوامل کی دین نہیں ہے۔ اسے نہ تو خوراک کی کمی اور نہ ہی جنسی ملاپ کے لیے ساتھی حاصل کرنے میں کوئی دقت کا سامنا ہوتا ہے۔ یہ رویہ کسی جینیاتی تبدیلی کا نتیجہ بھی نہیں ہے۔ اس کے باوجود کیتھولک چرچ صدیوں سے چلا آرہا ہے۔ کیتھولک چرچ کی بقا ایک پاپائے روم سے دوسرے میں 'تجردی یا کنوارپن کے مورثے' کی منتقلی کا ثمر نہیں ہے بلکہ اس کی اصل وجہ وہ کہانیاں، مفروضے اور حکایات ہیں جو کیتھولک فرقے کے کلیسائی قانون اور انجیل مقدس کے عہد نامے نے طے کر رکھی ہیں اور یہ تصورات نسل در نسل منتقل ہوتے رہتے ہیں۔

دوسرے الفاظ میں یہ بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ جہاں ایک طرف قدیم انسان کے رویے اور عمل ایک ہی طرز پر لاکھوں سال تک جامد رہے، وہیں دوسری طرف خردمند آدمی اپنے سماجی ڈھانچوں، باہمی تعلقات، معاشی سرگرمیوں اور ایسے کئی دوسرے رویوں اور طرزِ عمل کی کایا بیس برسوں کے اندر اندر پلٹ سکتا ہے۔ آپ برلن کی کسی ایسی عورت کا تصور ذہن میں لائیں جس کی پیدائش 1900ء کے آس پاس ہوئی تھی اور اس نے سو برس کی عمر پائی ہو۔ اب ذرا سوچیے، اس عورت کا بچپن ہوہنزولرن سلطنت میں گزرا ہو گا۔ اس نے جوانی کی بہاریں جمہوریہ وائمر، نازی جرمنی اور کمیونسٹ مشرقی جرمنی میں گزاری ہوں گی۔ وہ مرتے وقت متحد وفاقی جمہوریہ جرمنی کی شہری تھی۔ اپنی سو سالہ زندگی میں اس عورت نے پانچ انتہائی مختلف سماجی اور سیاسی نظاموں کا حصہ بن کر رہنے کا غیر معمولی کارنامہ سرانجام دیا ہے لیکن اس مقصد کے لیے اس کے ڈی این اے میں سرے سے کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ یہ حیران کن بات نہیں ہے؟

آدمی کی کامیابی کی اصل کنجی بھی یہی ہے۔ یہ درست ہے کہ نینڈرتھل انسان دوبدو کشتی میں تو غالباً خردمند آدمی پر حاوی ہو جاتا ہو گا لیکن سینکڑوں کی اجتماعی لڑائی میں نینڈرتھل گروہوں کے جتنے بھی گروہ کیوں نہ ہوں۔۔۔ پٹ جاتے ہوں گے۔ نینڈرتھل صرف

شیروں کے ٹھور ٹھکانوں اور اتے پتے کی معلومات کی ترسیل کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے لیکن قبائلی روایات اور انسان پر ارواح کے برکت کے سائے بارے حکایات بنانے، سنانے اور دہرانے کی صلاحیت سے یکسر محروم تھے۔ فکشن تخلیق کرنے کی صلاحیت کے بغیر نینڈر تھل گروہوں کے لیے کثیر تعداد اور موثر انداز میں ایک دوسرے سے تعاون کرنا ممکن ہی نہیں تھا۔ یہی نہیں بلکہ وہ تیزی کے ساتھ سماجی رویوں کو بدل بھی نہیں پاتے تھے بلکہ اس حوالے سے انہیں سخت مشکل درپیش تھی۔

ظاہر ہے، ہم ایک نینڈر تھل انسان کے دماغ میں اتر کر اس کی سوچ کے انداز کا مشاہدہ تو نہیں کر سکتے لیکن ہمارے پاس ان کی دماغی صلاحیتوں بارے کچھ ضمنی اور بالواسطہ ثبوت ضرور موجود ہیں جن کو ہم خردمند آدمی کی صلاحیتوں کے ساتھ تقابل کر سکتے ہیں۔ آثار قدیمہ کے ماہرین کو تیس ہزار سال پرانے، خردمند آدمی کے یورپ کے وسط میں پائے جانے والے آثار کی کھدائی کے دوران گاہے بگاہے سمندری سیپیوں اور صدفیوں کے خول ملتے رہتے ہیں۔ یہ خول بحیرہ روم اور بحر اوقیانوس کے ساحلوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان سیپیوں اور صدفیوں کی باقیات کا سمندر سے اتنی دور، براعظموں کے اندرون علاقوں میں ملنے کا ایک ہی مطلب اور امکان ہے کہ اس زمانے میں بھی خردمند آدمیوں کے گروہوں کے بیچ، اتنی دور دور تک تعلق، رابطہ اور پیغام رسانی کے ساتھ ساتھ تجارت پائی جاتی تھی۔ دوسری جانب دوسری انواع انسانی جیسے نینڈر تھل اور ڈینی سیوا انسانوں کی بستیوں کے آثار میں ایسے کوئی ثبوت، تجارت سے متعلق تو ہرگز سامنے نہیں آئے۔ نینڈر تھل اپنے اوزار اور ہتھیار، مقامی سطح پر ہی مقامی خام مال سے خود ہی بنایا کرتے تھے۔

اسی طرح کی ایک دوسری مثال جنوبی بحر الکاہل کے علاقے میں بھی پائی جاتی ہے۔ خردمند آدمی کے وہ گروہ جو نیوگنی کے شمال میں نیو آئرلینڈ جزائر پر بسر رکھتے تھے، وہ آتش فشاں کے برکانی شیشے کو زیادہ موثر، مضبوط اور تیز دھار اوزار اور ہتھیار بنانے کے لیے استعمال کیا کرتے تھے۔ برکانی شیشہ، اصل میں مائل چکنی آتش فشانی چٹان ہوتی ہے جو لاوا جم جانے سے بنتی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ نیو آئرلینڈ میں برکانی شیشے کے ذخائر قدرتی طور پر نہیں پائے جاتے۔ لیبارٹری میں ٹیسٹ سے پتہ چلتا ہے کہ اس زمانے میں آدمی جو برکانی شیشہ استعمال میں لاتا تھا وہ پاپوا نیوگنی کے علاقے نیوبرٹن نامی جزیرے پر پایا جاتا ہے۔ پاپوا نیوگنی کا یہ جزیرہ نیو آئرلینڈ کے علاقے سے تقریباً چار سو کلومیٹر دور واقع ہے۔ ان جزائر کے باسیوں میں سے کچھ، یقیناً پیشہ ور ملاح رہے ہوں گے جو ایک جزیرے سے دوسرے اور تیسرے پر طویل فاصلے تک تجارت کیا کرتے تھے۔

5 کیتھو لک 'الفانر' جنسی تعلقات اور بچوں کی دیکھ بھال ترک کر دیتا ہے، حالانکہ اسے جینیاتی اور ماحولیاتی طور پر ایسا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی

تجارت کے بارے یہ ہے کہ سطحی طور پر دیکھیے تو یہ انتہائی محل اور عملی سرگرمی نظر آتی ہے۔ ایک ایسا فعل، جس کے لیے فرضی اور تصوراتی بنیاد کی حاجت سرے سے محسوس ہی نہیں ہوتی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ خردمند آدمی کے سوا کوئی دوسرا جانور ایسا نہیں ہے جو تجارت جیسی سرگرمی میں مشغول رہا ہو۔ یہی نہیں بلکہ آدمی کے تخلیق کردہ وہ سارے تجارتی نیٹ ورک جن کے تفصیلی ثبوت موجود ہیں۔۔۔ان کی بنیاد بھی اساطیری اور حکایات پر مبنی تھی۔ تجارت، بھروسے کے بغیر ممکن نہیں ہے اور اجنبیوں پر اعتبار کرنا انتہائی مشکل ہوتا ہے۔ آج کے جدید دور میں بھی دنیا بھر کا تجارتی نظام کی بنیاد مفروضی موجودات اور ادخال جیسے ڈالر، وفاقی اور ریاستی بینک اور کارپوریشنوں کے ٹوٹمی ٹریڈ مارک وغیرہ پر اعتبار اور بھروسے پر قائم ہے۔ کسی قبائلی سماج میں جب دو اجنبی آپس میں تجارتی سرگرمی کرنا چاہتے ہیں تو وہ کاروبار سے پہلے ایک دوسرے کے بیچ اعتبار اور بھروسے کا رشتہ قائم کرتے ہیں۔ یہ بھروسا عام طور پر خدا کا واسطہ دے کر، ایک باہمی لیکن افسانوی جد امجد کا حوالہ ایجاد کر کے یا کسی ٹوٹمی جانور، چرند، پرند یا پودے کا ناطہ جوڑ کر قائم کیا جاتا ہے۔

اگر قدیم دور کے خردمند آدمی ان اساطیری حقیقتوں کا حوالہ پال کر سیپیوں، صدفیوں اور بر کانی شیشے کی تجارت کر سکتے تھے تو ایسی کوئی وجہ نہیں ہے کہ وہ انھی باہمی بھروسے اور اعتبار کے حوالوں کو استعمال میں لا کر یقیناً معلومات اور اطلاعات وغیرہ کی تجارت بھی کرتے ہی ہوں گے۔ اس سے اطلاعات، نشریات اور علم کے تبادلے کا نہایت ٹھوس اور گنجان نیٹ ورک قائم ہو جاتا ہے جو نینڈر تحل گروہوں اور دوسرے قدیم انسانی انواع کے ذرائع اطلاعات سے لازمی طور پر کہیں برتر تھا۔

انسانوں کی مختلف انواع کی سمجھ بوجھ اور شعور میں واضح فرق، شکار کرنے کے طریقوں اور تکنیک کا مشاہدہ کرنے سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔ نینڈر تحل عام طور پر چھوٹے چھوٹے گروہوں یا تن تنہا ہی شکار کیا کرتے تھے۔ لیکن، دوسری جانب خردمند آدمی نے نت نئی جو بھی شکار کی تکنیک ایجاد کی، اس میں درجنوں آدمیوں کے بیچ رابطہ اور اور تعاون کا عنصر لازمی پایا جاتا تھا۔ ان تکنیکوں میں کئی کئی آدمی، حتیٰ کے آدمیوں کے کئی کئی گروہ ایک دوسرے کے ساتھ تعاون اور اطلاعات کا تبادلہ کیا کرتے تھے۔ ان میں سے ایک بہترین تکنیک یہ تھی کہ آدمیوں کے کئی گروہ مل کر جانوروں کے پورے ریوڑ، جیسے جنگلی گھوڑوں کا محاصرہ کر لیتے تھے۔ وہ اس ریوڑ کو

بھگاتے اور پیچھا کرتے ہوئے، نہایت منظم انداز میں کسی بند گھاٹی تک لے جاتے اور مل جل کر ہی نہایت آسانی کے ساتھ پورے کے پورے ریوڑ کو ذبح کر لیتے۔ جب یہ پلان کامیاب ہو جاتا تو آدمی کے سبھی گروہوں کے حصے میں صرف ایک دن کی محنت اور اجتماعی کوشش کے نتیجے میں بھاری مقدار، ٹنوں کے حساب سے گوشت، چربی اور سینکڑوں کھالیں آجاتیں۔ وہ خوراک کے اس وسیع زخیرے کو استعمال میں لانے کے لیے سماجی اجتماع، میلے اور تہواروں کا بندوبست کرتے تھے۔۔۔ خشک کر کے یاد ہواں دے کر یا برفانی علاقوں میں برف میں جما کر بعد کے استعمال کے لیے جمع کر لیتے تھے۔ آثار قدیمہ کے ماہرین کو اس زمانے کی باقیات میں سے ٹھوس شواہد ملے ہیں جہاں ریوڑوں کے ریوڑ سالانہ بنیادوں پر ان طریقوں سے ذبح کیے جاتے تھے۔ ایسی بھی جگہیں ملی ہیں جہاں باڑ لگا کر یار کاوٹیں کھڑی کر کے مصنوعی جال اور چھل لگائے جاتے تھے۔ جانوروں کو بڑی تعداد میں ذبح کرنے کی سہولت کے لیے میدان اور سہولیات تو ان آثار میں بہت ہی عام مل جاتے ہیں۔

ہم یہ اخذ کر سکتے ہیں کہ نینڈر تھل یقیناً اپنی روایتی شکار گاہوں کو یوں خردمند آدمی کے ذبیح خانے بنتا دیکھ کر پیچ پار ہتے ہوں گے۔ تاہم، اس ضمن میں اگر انسانوں کی ان دونوں انواع کے بیچ تشدد پھوٹ بھی پڑتا تو نینڈر تھل کسی بھی صورت خردمند آدمیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ آدمیوں کے سامنے ان کی مثال بھی جنگلی گھوڑوں کی طرح ہی تھی۔ پچاس نینڈر تھل، گروہ کی شکل میں روایتی اور بلانمو، جامد طریقے سے کسی بھی طور پانچ سو ہمہ گیر اور اختراعی آدمیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ اگر کسی نہ کسی موقع پر آدمیوں کو نینڈر تھل انسانوں کے ہاتھ شکست ہو بھی جاتی تو وہ فوراً ہی اگلی بار پلٹ کر کسی نئی تکنیک اور لائحہ عمل کی مدد سے گھات لگا کر یقیناً نینڈر تھل گروہوں کو دھول چٹوا دیتے ہوں گے۔

شعور اور آگاہی کے انقلابی دور میں کیا ہوا؟	
نئی قابلیت اور صلاحیت	وسیع تر نتائج
خردمند آدمیوں کی دور دراز آبادیوں کے بیچ اطلاعات اور معلومات کی وسیع پیمانوں پر ترسیل کی قابلیت	منصوبہ بندی اور پیچیدہ سرگرمیاں جیسے جنگلی جانوروں سے بچاؤ اور جنگلی بھینسوں کے ریوڑوں کا مشترکہ شکار
خردمند آدمیوں کے سماجی تعلقات اور نسبت بارے معلومات کی وسیع پیمانے اور مقدار میں ترسیل کی قابلیت	آدمیوں کے بڑے، کلاں اور دیرپا گروہوں کی تشکیل جن میں آدمیوں کی تعداد زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ سو کے لگ بھگ رہا کرتی تھی

ان چیزوں کے بارے معلومات کی ترسیلی صلاحیت جو حقیقت میں وجود نہیں رکھتیں۔ مثال کے طور پر قبائلی ارواح، اقوام، ریاست، لمیٹڈ کمپنیاں اور انسانی حقوق وغیرہ	الف۔ اجنبیوں کی ایک بڑی تعداد کے بیچ تعاون اور اشتراک ب۔ سماجی رویوں اور طرز عمل میں تیزی کے ساتھ اختراع اور جدت

تاریخ اور حیاتیات

آدمی نے جو تصوراتی حقائق تخلیق کیے، وہ لاتعداد اور غیر معمولی طور پر متنوع ہیں۔ ان رنگا رنگ حقیقتوں کے نتائج بھی رویوں اور طرز عمل پر گونا گوں مرتب ہوئے۔ ہر جگہ پر جداگانہ رنگ دیکھنے میں آیا۔ یہ نئے نئے رنگ کے رویے اور طرز عمل ہی دراصل 'تہذیبوں' اور 'تمدن' کے سب سے اہم ترکیبی جز ہیں۔ جب تہذیب اور تمدن کا ظہور ہوا تو یہ بعد اس کے آج تک ترقی ہی کرتے چلے گئے۔ ان ثقافتوں میں بے پناہ تبدیلیاں آتی چلی گئیں اور یہ زمانے کی پشت پر سوار کبھی نہ رکنے والے تغیرات ہی ہیں، جنھیں آج ہم 'تاریخ' کا نام دیتے ہیں۔

شعور اور آگاہی کا ادراک ہی دراصل وہ نقطہ ہے جب تاریخ نے اپنے آپ کو حیاتیات سے الگ کر دیا تھا۔ شعور و آگاہی سے قبل تک نوع انسانی کے تمام تر معاملات حیاتیات کی مرہون منت تھے۔ حیاتیات کے اس دور کو ہم اپنی سہولت کے لیے 'قبل از تاریخ' بھی قرار دے سکتے ہیں (ذاتی طور پر میں قبل از تاریخ نامی اصطلاح کے سخت خلاف ہوں کیونکہ شعور اور آگاہی کے ادراک سے قبل بھی انسان اپنا ایک الگ زمرہ رکھتا تھا)۔ بہر حال، شعور اور آگاہی کا ادراک ہونے کے بعد، آدمی کی کار گزاری اور ترقی کو سمجھنا مقصود ہو تو بڑے پیمانے پر حیاتیاتی نظریات کو چھوڑ کر تاریخی بیانیے پر نظر رکھنی لازم ہے۔ یہ لازم اس لیے ہے کہ عیسائیت یا فرانسیسی انقلاب جیسے معاملات کو سمجھنے کے لیے حیاتیاتی اجزاء جیسے مورثے، نسلیے، ہارمون اور عضویوں کا علم کافی نہیں ہے۔ آدمی کے ان معاملات کو سمجھنے کے لیے تصورات، خیالات، واہموں اور روایات کو بھی زیر غور لانا، بلکہ زیادہ تر انھی پر تکیہ کرنا ضروری ہے۔

لیکن اس کا ہر گز یہ مطلب نہیں ہے کہ انسانی تہذیب اور آدمی حیاتیات کے قدرتی اصولوں اور قوانین سے مبرا ہو چکے ہیں۔ ہم آج بھی جانور ہی ہیں اور ہماری جسمانی، جذباتی اور دماغی صلاحیتیں ابھی بھی جینیات کی محتاج ہیں۔ ڈی این اے، آج بھی ہماری خصوصیات اور قابلیتوں کو طے کرنے پر حاکم ہے۔ ہمارے سماج کی بنیاد بننے والے عناصر وہی ہیں جو نینڈر تھل انسانوں کے ہوا کرتے تھے یا آج بھی بن مانسوں کے ہیں۔ ہم جب اپنے معاشرے کے بنیادی عناصر جیسے احساس، جذبات اور خاندانی رشتے ناطوں کا گہرائی میں مشاہدہ کرتے جاتے ہیں۔۔۔ خود ہمارے اور بن مانسوں، افریقی بندروں اور باقی کی قدیم انسانی انواع میں فرق مٹتا جاتا ہے۔

تاہم، اس فرق کو انفرادی یا خاندانی سطح پر دیکھنے کی کوشش کرنا، سخت غلطی ہوگی۔ فرد بہ فرد بلکہ دس اور بیس کی تعداد میں بھی فرق تلاش کرنا بے کار ہے کیونکہ اس سطح پر تو آدمی اور بن مانس میں حیران کن طور پر مماثلت پائی جاتی ہے۔ ہم ایک فرد کی صورت بن مانس سے اتنی زیادہ مطابقت رکھتے ہیں کہ آدمی کو پریشانی لاحق ہو جاتی ہے۔ فرق تو اصل میں اس وقت شروع ہوتا ہے جب آدمی کے گروہ کی تعداد ڈیڑھ سو افراد سے بڑھ کر ایک یا دو ہزار تک پہنچ جاتی ہے۔ گروہ کی اس سطح پر تفاوت اور امتیاز حیرت انگیز اور غیر معمولی ہے۔ آپ ہزاروں کی تعداد میں بن مانسوں کو وال سٹریٹ، ویٹی کن سٹی یا اقوام متحدہ کے ہیڈ کوارٹر میں جمع کر کے تماشہ تو دیکھیں۔ اندھیر نگری، نراج اور وہ طوفان بد تمیزی برپا ہو گا کہ بیان سے باہر ہے۔ اس کے برعکس، آدمیوں کی کثیر بلکہ بعض اوقات لاکھوں کی تعداد ہر روز اور سال میں بالخصوص کئی بار ان مقامات پر جمع ہوتی ہے۔ آدمی جب اکٹھے ہوتے ہیں تو وہ باقاعدہ اور باترتیب مثال پیدا کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر تجارتی نیٹ ورک، تہواروں کے اجتماع اور سیاسی جلسے اور ادارے۔۔۔ یہ سارے معاملات علیحدگی اور تفرید میں کسی طور ممکن نہیں ہیں۔ آدمی اور بن مانس میں اصل فرق تو وہ افسانوی اور حکایاتی گوند ہے جو ہم آدمیوں کی کثیر تعداد کو خاندانوں، گروہوں اور قوموں کی شکل میں باندھ کر رکھتی ہے۔ اسی سریش نے ہمیں تخلیق کا آقا۔۔۔ تخلیق کا ناخدا بنا دیا ہے۔

ظاہر ہے، اس کے علاوہ بھی ہمیں فنون میں مہارت جیسے اوزاروں اور ہتھیار بنانے اور استعمال کرنے کے فن کی بھی ضرورت تھی۔ لیکن اوزار اور ہتھیار بنانے کی صلاحیت اور اس کے نتائج انفرادی سطح پر کوئی معنی نہیں رکھتے۔ ہاں، اگر دوسروں کے ساتھ تعاون اور اشتراک ضروری ہو تو پھر یہ انتہائی اہم ہے۔ مثلاً، ایسا کیسے ہوا کہ آج آدمی کے پاس ایک براعظم سے دوسرے تک، حتیٰ کہ خلا میں مار کرنے والے میزائیل اور نیوکلئیر ہتھیار ہیں جبکہ تیس ہزار سال قبل تک ہم صرف ترچھی سوئیوں اور نیزے کی انی کے ساتھ گزارہ کرتے تھے؟ اگر جسمانی اور عضویاتی لحاظ سے دیکھا جائے تو پچھلے تیس ہزار برسوں میں ہمارے اعضاء جیسے ہاتھ اور پیروں کی ہئیت میں کوئی غیر معمولی تبدیلی نہیں آئی۔ اوزار اور ہتھیار بنانے کی جسمانی صلاحیت تو ویسی کی ویسی ہی ہے۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ البرٹ آئن سٹائن، کسی قدیم شکاری آدمی کے مقابلے میں دستی کام میں بالکل کورا رہا ہو گا۔۔۔ قدیم دور کا آدمی یقیناً آئن سٹائن سے کئی درجے بڑھ کر سبک دست تھا۔ اصل میں ہوا یہ ہے کہ وقت کے ساتھ آدمی کی بڑی تعداد میں دوسرے آدمیوں کے ساتھ اشتراک اور تعاون میں کام کرنے کی سکت اور صلاحیت بڑھ گئی ہے۔ قدیم زمانے میں اور آج بھی، کوئی بھی شخص ایک نیزہ یا نوکیلی سوئی منٹوں کے اندر بنا سکتا ہے۔۔۔ اس ضمن میں اسے زیادہ سے زیادہ اپنے کسی قریبی دوست، ساتھی کے مشورے یا بہت ہی معمولی اصلاح کی ضرورت ہو گی۔ لیکن ایک جدید نیوکلئیر ہتھیاروں کا حامل بین براعظمی میزائل بنانے کے لیے دنیا بھر سے، لاکھوں کی تعداد میں ایک دوسرے سے یکسر اجنبی آدمیوں کا تعاون لازم ہے۔ ایک میزائل بنانے کے لیے درکار افرادی قوت کی اس طویل فہرست میں مزدوروں (جو کانیں کھود کر یورینیم

کی آمیزش نکالتے ہی) سے لے کر طبیعات دان (جو حساب کے طویل اور پیچیدہ فارمولے لکھتے ہیں اور ایٹمی ذرات کی خوبیاں بیان کرتے ہیں) تک کئی کئی طرح کے ہنر مند ماہر افراد الغرض ہر طرح کے ہزاروں اور لاکھوں لوگ شامل ہیں۔

ہم شعور اور آگاہی کا انقلاب برپا ہونے کے بعد حیاتیات اور تاریخ کے بیچ تعلق کا خلاصہ کچھ یوں بیان کر سکتے ہیں:

1۔ حیاتیات آدمی کے رویوں اور طرز عمل کے بنیادی وتر اور خصلتوں کو طے کرتی ہے۔ تاریخ حیاتیات کی انھی حدوں کے اندر واقع میدان میں رہتے ہوئے وقوع پذیر ہوتی ہے۔

2۔ تاہم، تاریخ کو حاصل حیاتیات کی حدوں میں رہتے ہوئے بھی یہ میدان بہت بڑا ہے۔ یہ اس قدر وسیع ہے کہ آدمی کے لیے ہر طرح کے کھیل، کھل کر کھیلنے کی گنجائش ہے۔ فکشن ایجاد کرنے اور اسے استعمال میں لانے کی صلاحیت کے نتیجے میں آدمی، ہر گزرتے دن کے ساتھ پہلے سے کہیں زیادہ اور پیچیدہ کھیل ایجاد کر سکتا ہے۔ جبکہ نسل در نسل یہ کھیل نہ صرف پھیلتا جاتا ہے بلکہ اس میں پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ کر تنوع اور صراحت بھی آتی جاتی ہے۔

3۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کی خصلت، رویوں اور طرز عمل کو سمجھنے کے لیے تاریخی ارتقاء کو آدمی کے ہی اعمال، افعال اور کرتوتوں کی نظر سے دیکھنا انتہائی لازم ہے۔ اس ضمن میں آدمی کی صرف اور صرف حیاتیاتی مجبوریوں اور روک پر نظر رکھنے کی مثال ریڈیو کے اس کمنٹیٹر جیسی ہی ہے، جو فٹ بال کے ورلڈ کپ کے کسی لائیو میچ پر کمنٹری کرے اور اس دوران وہ سامعین کو صرف اور صرف کھیل کے میدان کی ہئیت اور بناوٹ بارے تو مفصل باتیں بتائے لیکن کھلاڑیوں کی حرکات وسکنات اور اصل کھیل سے نظریں چرالے۔

تاریخ کے اس میدان میں ہمارے پتھر کے زمانے کے آباؤ اجداد کس طرح کے کھیل کھیلتے آئے ہیں؟ جہاں تک ہمیں معلوم ہے، وہ لوگ جنھوں نے تیس ہزار سال قبل 'شیر نما آدمی' کی مورتی بنائی تھی۔۔۔ ان کی جسمانی، جذباتی اور عقلی صلاحیتیں ویسی ہی تھیں جیسی کہ آج ہماری ہیں۔ صبح سویرے جاگ کر وہ پہلا کام کیا کرتے تھے؟ وہ ناشتے میں کیا کھاتے تھے اور دوپہر کا کھانا کیسا ہوتا تھا؟ اس زمانے میں سماج اور معاشرہ کیسا تھا؟ کیا وہ بھی یک زوجگی کا پرچار کرتے تھے یا ان کے یہاں بھی مربوط اور مشترکہ گھرانوں کا تصور تھا؟ ان کے یہاں تقریبات کیسی ہوتی تھیں؟ کون کون سی اخلاقی قدریں اور کیا کیا تھیں؟ وہ کونسے کھیل کھیلتے تھے؟ اور مذہبی تہوار کیسے ہوتے تھے؟ وہ عبادت کیسے اور کس کی کرتے تھے؟ کیا وہ بھی جنگیں لڑتے تھے؟

اگلا باب، تاریخ کے جھروکوں میں۔۔۔ ہم مختلف ادوار کے پردوں کے پیچھے جھانکنے کی کوشش کریں گے۔ ہم یہ جاننے کی کوشش کریں گے کہ وہ ہزاری سال جو شعور و آگاہی کے انقلاب کو زرعی انقلاب سے جدا کرتا ہے۔۔۔ اس تمام عرصے کے دوران زندگی کس رنگ کی تھی؟

آدم اور حوا کی زندگی کا ایک دن

اگر ہم اپنی فطرت، تاریخ اور نفسیات کو سمجھنا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنے شکار مار اور ماہی گیر آباؤ اجداد کے دماغ میں اترنا ہو گا۔ تاریخ انسانی کے تقریباً سارے حصے میں خردمند آدمی کی انسانی نوع کھانے کی اشیاء تاخت کر کے، یعنی جمع کر کے زندگی گزارتا رہا ہے۔ یہ تو صرف پچھلے دو سو برسوں کا قصہ ہے کہ ان آدمیوں کی تعداد بہت بڑھ گئی ہے جنھیں دفتروں میں کام کرنے اور دیہاڑی پر مزدوری کے عوض میز پر کھانا تیار مل جاتا ہے۔ اس سے قبل دس ہزار سال وہ تھے جب آدمی کھیتی باڑی کر کے اور مویشی پال کر گزارہ کرتا آیا ہے۔ یہ دس بارہ ہزار سال، اس عرصے کے مقابلے میں آنکھ کی ایک جھپک کے برابر ہیں جب ہزاروں سال تک آدمی کے آباء و اجداد شکار کر، خوراک ڈھونڈ اور کھود کر جمع کر کے استعمال کیا کرتے تھے۔

ارتقائی نفسیات کے پنپتے ہوئے علمی میدان کا ماننا ہے کہ آج ہماری تمام تر سماجی اور نفسیاتی خصوصیات اور خصلتیں زراعت سے بھی پہلے کے دور کی مرہون منت ہیں۔ اس میدان کے محققین متفق ہیں کہ آج بھی ہمارے دماغ اور ذہن شکار اور جمع کرنے کے عادی ہیں۔ ہمارے کھانے کی عادات، تنازعات اور شہوانیت کے طور۔۔۔بعینہ ویسے کے ویسے ہیں۔ آج بعد از صنعت و حرفت ماحول، بڑے شہروں، جہازوں، ٹیلی فون اور کمپیوٹر کے جدید دور میں بھی، ہمارے آباء کی شکاری اور جمع کرنے والی سوچ حاوی ہے۔ اس آسودہ ماحول نے ہمیں مادی طور پر وسائل کی بہتات اور طویل عمری فراہم کی ہے۔۔۔ جو اس سے قبل، پہلے آدمی کی کسی نسل کو دستیاب نہیں رہی۔ لیکن یہ آسودگی اور طویل عمری اکثر ہمیں بیگانگی، ڈپریشن اور دباؤ کی طرف دھکیل دیتی ہے۔ ارتقائی نفسیات کے ماہرین کہتے ہیں کہ اس بیگانگی، ہمہ وقت اداسی اور دباؤ کی اصل وجہ جاننے کے لیے ضروری ہے کہ ہم ان شکاری اور خوراک جمع کرنے والے آدمی کی دنیا میں غوطہ لگائیں جنھوں نے ہمیں ایسا بنایا ہے۔ وہ متروک اور معدوم دنیا، جس میں ہم آج بھی نیم شعوری کی حالت میں بسیرا رکھے ہوئے ہیں۔

مثال کے طور پر آج لوگ حراروں اور توانائی سے بھرپور خوراک پر کیوں ٹوٹ پڑتے ہیں؟ حالانکہ یہ جسمانی طور پر نقصان دہ ہو سکتی ہے۔ آج کی خوشحال اور تونگر دنیا میں موٹاپا کرب اور شدید مصیبت کا رخ اختیار کر چکا ہے جبکہ ترقی پذیر مما لک میں یہ طاعون کی طرح تیزی سے پھیل رہا ہے۔ جب تک ہم اپنے شکار مار اور خوراک تاخت و جمع کر کے کھانے والے اجداد کے کھانے کی عادات کا جائزہ نہیں لیں گے تب تک یہ معاہی رہے گا کہ آخر ہم سب سے میٹھی اور چکنی خوراک پر ہی سب سے پہلے ہاتھ کیوں صاف کرتے ہیں؟ جن جنگلوں اور میدانوں میں ہمارے اجداد کی بسر رہا کرتی تھی، وہاں توانائی سے بھرپور اور میٹھی چیزیں انتہائی نایاب تھیں اور تقریباً ہمیشہ ہی خوراک کی کمی کا سامنا رہا کرتا تھا۔ تیس ہزار سال پہلے کے ایک عام آدمی کے لیے میٹھی چیزوں کا صرف ایک ہی ذریعہ، یعنی پکے ہوئے میٹھے پھل تھے۔ اس ضمن میں یہ مثال دیکھیں۔ پتھر کے زمانے کی کوئی عورت، جب انجیر کے کسی درخت کو لدا دیکھتی تو عقل کا تقاضا یہی

تھا کہ وہ موقع پر بیٹھ کر جتنا ہو سکتا۔۔اس سے قبل کہ بندروں اور لنگوروں کے جتھے اس پر دھاوا بولتے، وہ وہیں میٹھی، پکی ہوئی انجیروں پر ہاتھ صاف کر لیتی۔ چنانچہ، اس طرح توانائی سے بھرپور، میٹھی چیزوں پر ٹوٹ پڑنے اور اسے جمع کرنے کی جبلت ہماری فطرت میں بیٹھ گئی۔ آج ہم بھلے اونچی عمارتوں میں، میٹھی چیزوں سے ریفریجریٹر بھر کر بسر کرتے ہوں لیکن ہمارا ڈی این اے یا جینیاتی مادہ یہی سمجھتا ہے کہ ہم ابھی تک جنگلوں اور میدانوں میں بسر رکھتے ہیں۔

بسیار خور مورثہ کا مندرجہ بالا نظریہ وسیع پیمانے پر مسلمہ ہے ورنہ دوسرے نظریات پر خاصی لے دے اور توں تکرار ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر چند ارتقائی نفسیات دانوں کا ماننا ہے کہ قدیم آدمی کے گروہوں میں مربوط گھرانوں اور یک زوجگی کا تصور نہیں تھا۔ بجائے، قدیم آدمی سماج یا برادری کی شکل میں ایسے رہتا تھا کہ جہاں یک زوجگی، ذاتی جائیداد اور یہاں تک کہ ولدیت سے بھی محروم تھا۔ ایسے گروہوں میں کوئی بھی عورت، ایک ہی وقت میں کئی کئی مردوں (اور عورتوں!) کے ساتھ جنسی تعلق اور آشنائی کا قریبی تعلق بنا سکتی تھی۔ ان برادری نما گروہوں کے سبھی بالغ اور جوان افراد بچے پالنے میں مدد کرتے تھے۔ چونکہ کسی مرد کو قطعی طور پر علم نہیں ہو پاتا تھا کہ اس کا اپنا خون، اپنا بچہ کون سا ہے تو وہ برادری کے سبھی بچوں کے لیے یکساں لگاؤ اور سروکار رکھتے تھے۔

اوپر بیان کردہ سماجی ڈھانچے کا تصور خیالی ہرگز نہیں ہے۔ اس طرح کی سماجی ترکیب باقی کے جانوروں، بالخصوص انسان کی سب سے قریبی اقسام افریقی اور بونوبو بن مانسوں میں عام پائی جاتی ہے۔ آج کی جدید دنیا میں خردمند آدمی کے کلچر میں کئی ایسی جگہیں ہیں جہاں ولدیت کا تصور اجتماعی ہے۔ ان میں سب سے چیدہ مثال 'باری انڈینز' کی ہے۔ باری انڈینز اور ان جیسے کئی دوسرے معاشروں میں یہ مانا جاتا ہے کہ بچے کی پیدائش کسی ایک مرد کے نطفے سے نہیں بلکہ عورت کی بچہ دانی میں کئی نطفوں کے جمع ہونے سے ہی ممکن ہوتی ہے۔ ان کے یہاں ایک اچھی ماں کا تصور یہ ہے کہ وہ کئی مردوں کے ساتھ جنسی تعلق قائم کرتی ہے، بالخصوص جب وہ حمل سے ہو۔ اس طرح پیدا ہونے والا بچے کو فوقیت (بشمول پدرانہ شفقت) اور خوبیاں ملتی ہیں۔۔۔مثال کے طور پر مانا یہ جاتا ہے کہ ایسا بچہ نہ صرف بہترین شکاری بلکہ اعلیٰ قصہ گو، مضبوط جنگجو، بامروت اور سب سے بڑھ کر محبت کرنے کے خوب قابل ہوتا ہے۔ اگر آپ کو یہ سب بے وقوفی اور سادہ لوحی محسوس ہوتی ہے تو یاد رکھیں، میڈیکل سائنس میں جدید جینیات کی تحقیق سے قبل آدمی کے پاس قطعی طور پر ثبوت اور نہ ہی علم تھا کہ بچے، ایک ہی باپ کے نطفے سے پیدا ہوتے ہیں اور بہت سے مردوں کا اس میں کوئی کردار نہیں ہے۔

اس 'قدیم تعلقہ اور برادری' پر مبنی نظریے کے حامیوں کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ آج جدید دور میں شادی کا تصور اور اس میں زوجین کے درمیان بے وفائیاں اور تشکیک، طلاق کی بلند شرح اور اس کے نتیجے میں بچوں اور والدین کے لیے شدید کوفت اور نفسیاتی مسائل کی جڑ اصل میں یہ ہے کہ آج لوگوں کو مربوط گھرانوں اور یک زوجگی میں رہنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ مربوط گھرانوں اور یک زوجگی کا تصور کسی بھی طرح سے ہماری حیاتیاتی فطرت سے میل نہیں کھاتا۔

کئی محققین اس نظریے کو شدت اور تندی کے ساتھ رد کرتے ہیں۔ وہ اس دلیل پر مصر ہیں کہ دراصل یک زوجگی اور مربوط گھرانے کی خصوصیت انسانی رویے اور طرزِ عمل کا مرکزی حصہ ہیں۔ یہ درست ہے کہ قدیم شکاری اور خوراک جمع کرنے والی آدمی کا معاشرہ آج کے جدید دور کے مقابلے میں اجتماعیت، برادری اور تعلقہ کی بنیاد اور مساوات و برابری کے تصور پر ضرور قائم رہا ہو گا لیکن تحقیق یہ بتاتی ہے کہ اس معاشرے میں بھی بہرحال اکائیاں وجود رکھتی تھیں۔ اس معاشرے میں بھی حسد کے مارے جوڑے پائے جاتے تھے اور بچوں پر اختیار اور حق جتایا جاتا تھا۔ یہی وہ قدیم رویے ہیں جن کی بنیاد پر آج دنیا بھر کے زیادہ تر معاشروں میں یک زوجگی اور مربوط گھرانوں کا تصور عام ہے بلکہ ایک مستند معیار ہے۔ یہ رویوں اور طرزِ عمل کا وہ معیار ہے جس میں آج کہا جاتا ہے کہ فطرتاً مرد اور عورتیں اپنے دل پسند ساتھیوں، زوجگی اور بچوں کے بارے سخت جذباتی لگاؤ، حتیٰ کہ ملکیت اور قبضے کی حد تک دعویٰ کرتے ہیں۔ یہ اسی معیار کی دین ہے کہ پوری کی پوری ریاستیں جیسے شمالی کوریا، شام اور سعودی عرب جیسے ممالک میں سیاسی طاقت نسل در نسل باپ سے بیٹوں میں منتقل ہوتی ہے۔

اس اختلافی بحث کو حل کرنے، اپنی جنسیت، سماج اور سیاست کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے اجداد کے رہن سہن اور گزران کے بارے سیکھنے کی کوشش کریں۔ ہمیں یہ جاننے کی ضرورت ہے کہ آدمی شعور و آگاہی کے انقلاب (یعنی ستر ہزار سال پہلے) اور زرعی انقلاب (یعنی بارہ ہزار سال پہلے) کے شروع ہونے تک کے عرصے میں کیسے زندگی بسر کرتا رہا ہے، اس کے افعال کیا تھے اور وہ کیسی زندگانی رکھتا تھا؟

بدقسمتی سے ہمارے تاحتی، یعنی کھانے کی اشیاء جمع کرنے والے اجداد کے بارے حتمی طور پر دستیاب ثبوتوں کی تعداد کم اور نوعیت بہت ہی دھندلی ہے۔ یہ جو 'قدیم برادریوں یا تعلقہ' اور 'ابدی یک زوجگی' کے نظریات کے بیچ جو بحث اور تنازعہ ہے، یہ سراسر اسی کھوکھلی اور حد سے زیادہ کمزور ثبوتوں پر مبنی ہے۔ ہمارے پاس اس دور کے، ظاہر ہے کوئی تحریری ریکارڈ موجود نہیں ہیں۔ قدیم دور کی دستیاب باقیات میں فوسیل شدہ، سنگواری ہڈیوں اور پتھر سے بنے اوزاروں اور ہتھیاروں کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اس دور میں استعمال ہونے والی مصنوعات کچھ ہی عرصے میں بوسیدہ ہونے والے خام مال جیسے لکڑی، بانس یا چمڑے وغیرہ سے بنائی جاتی تھیں۔ یہ مصنوعات صرف اور صرف مخصوص اور غیر معمولی حالات میں ہی باقی رہ سکتی ہیں۔ زراعت کی ایجاد سے قبل، انسان کی پتھر کے زمانے کے بارے میں ایک بہت ہی عام غلط فہمی پائی جاتی ہے، جو اس دور کے آثار قدیمہ اور ملنے والی باقیات کی بنا پر پیدا ہوئی ہے۔ 'پتھر کے زمانے' کو اس ضمن میں حقیقتاً 'لکڑی کا زمانہ' سمجھا جانا چاہیے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس دور کے آدمی کے زیرِ استعمال رہنے والی اشیاء بشمول ہتھیار اور اوزار زیادہ تر لکڑی سے بنائے جاتے تھے۔

قدیم دور کے آدمی کی زندگی کو صرف اور صرف باقی بچ رہنے والی اشیاء اور دستیاب آثار قدیمہ کی بنیاد پر دوبارہ کھڑا کرنے میں سخت شکوک اور ابہام پیدا ہو جاتے ہیں۔ قدیم دور کے قدیم تاختی اور بیچ میں زرعی اور تقریباً آج تک کے صنعتی و حرفتی دور کے آدمیوں کی زندگیوں بارے سمجھ بوجھ میں سب سے بڑا فرق ہی یہ ہے کہ ہر دور کے آدمی نے ایک دوسرے سے انتہائی مختلف طرح کی مصنوعات استعمال میں لائی ہیں۔ آج اپنی زندگی کے تمام عرصے کے دوران ایک جدید اور آسودہ معاشرے کا شہری آدمی کئی کئی، یہاں تک کہ لاکھوں کی تعداد میں مصنوعات کو استعمال میں لاتا ہے۔ اس میں موٹر گاڑیوں سے لے کر گھر اور ڈسپوزیبل نیپکن اور دودھ کے ڈبوں تک کیا کیا شامل نہیں ہے؟ آج کے جدید آدمی کی شاید ہی کوئی سرگرمی، جذبہ اور یہاں تک کہ ایمان اور عقیدہ ہو گا جو مصنوعات کے استعمال کے بغیر پورا ہو تا ہو۔ مثال کے طور پر صرف ہمارے کھانے پینے کی عادات اور اطوار عقل کو چکرا دینے کی حد تک مصنوعات اور اشیاء پر انحصار کرتی ہیں۔ چمچے، کانٹے، نیپکن، میزیں، کرسیاں، دستر خوان، برتن وغیرہ تو انتہائی بنیادی اشیاء ہیں۔۔۔ ہمارے کھانے پینے کی عادات، اس سے کہیں بڑھ کر لیبارٹریوں، کیمیکلز، ہوٹلوں، ریستوانوں سے نکل کر بڑی بڑی کشتیوں اور جہازوں تک میں مختلف مصنوعات اور اشیاء کے ساتھ جڑ جاتی ہیں۔ مصنوعات سے متعلق چھوٹی سی نہایت عام مثال ہے کہ ہم گھروں میں سٹیل کے چھری کانٹے استعمال کرنے کے عادی ہیں جبکہ جہازوں میں پلاسٹک کی کٹلری استعمال کرنی پڑے تو ہمارے کھانے پینے کی عادت میں رخنہ پڑ جاتا ہے۔ کھیل کود کے حوالے سے دیکھیں تو آج کھلونوں کی افراط ہے۔۔۔ ہمارے کھیلوں میں ہر طرح کی مصنوعات استعمال میں لائی جاتی ہیں۔ جیسے تاش کھیلنے کے لیے پلاسٹک سے بنے پتے، ان ڈور اور بورڈ گیمز کے لیے طرح طرح کی اشیاء اور میدانوں میں کھیلوں کے لیے وردیاں، بلے، گیندیں، فٹ بال وغیرہ اور پھر ان کھیلوں کو دیکھنے لیے ایک ایک لاکھ افراد کی گنجائش والے سٹیڈیم جیسی مصنوعات شامل ہیں۔ ہم اپنے رومانوی جذبات اور جنسی تعلقات کے پر لطف اظہار کے لیے انگوٹھیوں، جیولری، جہازی بستروں، مہنگے کپڑوں، شہوت انگیز زیر جاموں، کنڈوم، فیشن ایبل ریستوانوں، ہوٹل کے مخصوص کمروں، ائیر پورٹ کے لاؤنج میں مختلف کلاسوں، شادی ہالوں اور کیٹرنگ کمپنیوں کی مختلف مصنوعات کا استعمال کرتے ہیں۔ مذاہب ہماری زندگیوں میں تقدیس لاتا ہے۔ اس تقدیس کے حصول کے لیے ہم شاندار کیتھو لک چرچوں، اونچے میناروں والی مساجد، بڑے بڑے دیو ہیکل ہندو مندروں، آشرموں، نہایت ہی بہترین اور قیمتی کاغذ پر اجلی روشنائی سے چھپی ہوئی الہامی کتب، تبت کے گنگ اور آواز گروں، موٹی اور نرم گداز قالین نما جائے عبادتوں، مرغولوں، بدھ مت کے پہیوں، موم بتیوں، اگربتیوں، کرتوں، جبوں، پوشاکوں، لوبان کی خوشبوؤں، کرسمس کے درختوں، فطیری روٹی، ناریل، کتبوں اور ٹوٹمی نشانات جیسی الغرض ہر طرح کی لاتعداد مصنوعات کا بے تحاشہ استعمال کرتے ہیں۔

ہمیں اپنی زیر استعمال مصنوعات اور اشیاء کی اصل موجودگی اور نوعیت کا صحیح اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب ہم کسی نئے گھر میں منتقل ہوتے ہیں۔ قدیم دور کا تاخت آدمی ہر مہینے، ہر ہفتے اور بعض اوقات ہر روز اپنا پورا گھر پشت پر لاد کر منتقل کر لیتا تھا۔ اس زمانے میں

کوئی سامان ڈھونے والی کمپنیاں،ٹرک وغیرہ بلکہ یہاں تک کہ زرعی دور سے قبل جانور بھی بوجھ ڈھونے کے لیے دستیاب نہیں تھے۔اسی لیے انھیں کم سے کم دھن اور تصرف پر گزارہ کرنا پڑتا تھا۔لہذا اس ضمن میں یہ فرض کرنا عین مناسب ہے کہ قدیم آدمی کو اپنی ذہنی، مذہبی اور جذباتی زندگی کے بڑے حصے کو گزارنے میں مصنوعات کے بغیر ہی کام چلانا پڑتا تھا۔ جبکہ، مثال کے طور پر آج سے ایک لاکھ سال بعد دنیا کا کوئی بھی آثار قدیم کا ماہر باقی رہنے جانے والی چیزوں کی مدد سے مسلمانوں کے عقیدے اور اس سے متعلق شعائر کا کسی چھوٹی سی مسجد کی باقیات سے بھی درست پتہ لگا سکتا ہے۔اسے اس پہیلی کو سلجھانے کے لیے مسجد کے مٹتے ہوئے لیکن واضح آثار اور اس میں موجود بڑی تعداد میں کئی چیزیں دستیاب ہوں گی۔ لیکن آج ہم اس تقریباً ایک لاکھ سال پہلے کے قدیم آدمی کی زندگی،اس کے عقائد اور شعائر بارے صرف اندازے ہی لگا سکتے ہیں جو انتہائی مشکل ہے اور بڑے پیمانے پر ہمارے لیے یہ صرف اندازے ہی ہیں۔ہیں ایسا المیہ در پیش ہے کہ جو مستقبل کے ان تاریخ دانوں کو پیش آسکتا ہے مثال، اگر وہ اکیسویں صدی کے نوخیز نوجوانوں کی سماجی دنیا کو صرف اور صرف ان کے کسی متروک خط و کتابت کے طریقوں جیسے نوے کی دہائی کی مشہور چیٹ باکسز کے غیر موثر اور معلومات سے خالی سافٹ وئیر کو استعمال میں لائے۔اسے ان بے معنی برقیاتی پتوں کے سوا دوسری کوئی بھی شے جیسے ٹیلی فون پر کی گئی گفتگو، واقعی زیر استعمال رہنے والی ای میلز، بلاگ اور ٹیکسٹ پیغامات وغیرہ دستیاب نہ ہوں۔ مستقبل کے تاریخ دان،اسی طرح ٹامک ٹوئیاں مارتے پھریں گے، جیسے آج ہم قدیم آدمی کی سماجی زندگی بارے چند باقیات سے اندازے لگا رہے ہیں۔

چنانچہ، یہ یاد رہے کہ مصنوعات پر تکیہ کر کے قدیم آدمی، یعنی تاختی یا خوراک جمع کرنے والے اور شکار پر گزارہ کرنے والے آدمی کی زندگی کی تصویر کھینچنے کا عمل میں جھکاؤ ایک یا دوسری طرف لڑھکتا رہے گا۔ ایک تدبیر یہ ہو سکتی ہے کہ اس ضمن میں جدید دور کے تاختی معاشروں پر نظر دوڑائی جائے۔ان کا مشاہدہ کیا جائے، یہ سیدھی اور براہ راست تحقیق تو ضرور ہو لیکن ساتھ ہی ساتھ اس کام کے لیے تاریخ انسانی کے مشاہداتی عدسے کو بھی کام میں لایا جائے۔ لیکن جدید تاختی باشندوں کو اس کام کے لیے استعمال کرنے میں بے حد احتیاط کی ضرورت ہو گی۔چونکہ یہ نامعلوم کے بارے قیاس کا معاملہ ہے تو دگنی نہیں بلکہ چوگنی احتیاط لازم ہو گی۔ اس کی کئی وجوہات ہیں۔ سب سے پہلی تو یہ کہ آج جدید دور میں پائے جانے والے سبھی تاختی معاشروں پر ایک یا دوسری صورت ان کے ہمسائے زرعی اور صنعت و حرفتی معاشروں کا بے پناہ اثر و رسوخ رہا ہے۔جس کی وجہ سے ان کے بارے دسیوں ہزار سال پہلے کے حوالے سے اندازہ لگانے میں چوک ہو سکتی ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ آج جدید دور میں باقی بچ جانے والے تاختی معاشرے عام طور پر ان خطوں اور علاقوں میں باقی رہنے میں کامیاب ہوئے ہیں جہاں موسمی حالات، آب و ہوا مشکل اور زمین دشوار گزار رہی ہے۔یہ ان تاختیوں کے وہ آبائی علاقے ہیں جو عام طور زراعت کے لیے مناسب نہیں تھے۔تاختی آدمیوں کے ایسے معاشرے جنھوں نے دشوار گزار خطے اور بے انتہا سخت حالات (مثلاً

جنوبی افریقہ میں کالاہاری صحرا) کے ساتھ مطابقت پیدا کر کے، ڈھل کر جینا سیکھ لیا ہو تو عین ممکن ہے کہ ان کے حوالے سے قائم کردہ اندازے قدیم دور کے انتہائی زرخیز علاقوں اور نہایت آسان حالات (مثلاً چین کی یانگ تسی وادی) کے قدیم معاشروں کے بارے اندازوں میں گمراہ کن عنصر پیدا کر سکتے ہیں۔ بالخصوص، ہمیں یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ کالاہاری صحرا جیسے دشوار گزار علاقوں میں تب بھی تاختیوں کی آبادی کا گنجان پن، قدیم یانگ تسی وادی کے مقابلے میں انتہائی کم رہا تھا۔ یہ نکتہ اس لیے اہم ہے کیونکہ اس کے مضمرات انتہائی دوررس ہیں، کیونکہ یہاں قدیم آدمی کی زندگی کا احاطہ کرنے میں گروہوں اور برادریوں میں افراد کی تعداد اور اس کے نتیجے میں قائم ہونے والی سماجی بناوٹ سب سے اہم ہے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ تاختی معاشروں کی سب سے منفرد خصوصیت یہ ہے کہ وہ دوسرے معاشروں سے کیونکر مختلف ہیں؟ یہ تاختی نہ صرف دنیا میں واقع کسی بھی معاشرے بلکہ آبائی خطے کے باقی کے معاشروں سے بھی مختلف ہوا کرتے ہیں۔ اس کی سب سے عمدہ مثال آسٹریلیا کا قدیم اور تاختی معاشرہ براجین ہے۔ یورپی نو آباد کار جب یہاں پہنچے تو ان کا سامنا براجین کے تین سے سات لاکھ قدیمی باشندوں سے ہوا جو یہاں پہلے سے بسر رکھتے تھے۔ براجین کی یہ تعداد قریباً دو سو سے لے کر چھ سو قبائل میں بٹی ہوئی تھی اور ہر قبیلے میں کئی کئی کنبے اور گھرانے تھے۔ ہر قبیلے کی زبان، مذہب، رسوم اور رواج دوسرے سے مختلف تھیں۔ جنوبی آسٹریلیا کے وہ علاقے جہاں آج کل ایڈیلیڈ واقع ہے یہاں باپ کے نسلی سلسلے پر وراثت پانے والے کئی براجین قبیلے آباد تھے۔ کنبے اور برادریاں ایک دوسرے کے ساتھ قبائل کی شکل میں صرف اور صرف علاقائی بنیادوں پر جڑے ہوئے تھے۔ جب کہ شمالی آسٹریلیا میں بسنے والے براجین قبائل ماں کی طرف سے چلنے والے نسلی سلسلے کو اہمیت دیتے تھے اور ہر آدمی کی قبائلی شناخت اس کے علاقے کی بنیاد پر نہیں بلکہ ٹوٹمی علامتوں پر مبنی تھی۔

اسی لیے، یہ بحث اور دلیل انتہائی اہم ہے کہ قدیم زمانے کے تاختی اور شکار کر کے بسر کرنے والے آدمی کی نسلی اور ثقافتی گونا گونی انتہائی غیر معمولی رہی ہے۔ زرعی انقلاب برپا ہونے سے عین پہلے جب دنیا میں پچاس سے اسی لاکھ کے درمیان آدمی کی آبادیاں ہزاروں جدا قبائل اور ہزاروں ہی زبانوں اور ثقافتوں میں بٹے ہوئے تھے۔ آخر، شعور اور آگاہی کا یہی لازوال اور بے نظیر ثمر تھا۔۔۔ یہ اس انقلاب کا وہ ترکہ ہے، جو آدمی کی شناخت پر منتج ہوتا ہے۔ یہ فکشن کے ظہور کا کرشمہ ہی تو ہے کہ ایک ہی جینیاتی خصوصیات رکھنے والا آدمی اس قابل ہو گیا کہ وہ لاکھوں کی تعداد میں ہوتے ہوئے بھی رنگارنگ، طرح طرح کی تصوراتی حقیقتیں تخلیق کرنے لگا۔ یہ تصوراتی حقیقتیں بالآخر طرح طرح کی ثقافتوں، نظریوں، عقائد، شعائر، رسوم اور اقدار کی شکل میں ظاہر ہوئیں۔

مثال کے طور پر اس دلیل کو ماننے کی ہر طرح سے بھرپور وجہ موجود ہے کہ آج سے تیس ہزار سال قبل تاختیوں کا وہ گروہ جو اس مقام پر بسر رکھتا تھا جہاں آج آکسفورڈ یونیورسٹی کھڑی ہے، یقیناً اس گروہ سے بالکل الگ زبان اور ثقافت کا حامل تھا جو کیمبرج

یونیورسٹی کے مقام پر بسر رکھتا ہو گا۔ یہ بھی عین ممکن ہے کہ ان میں سے ایک گروہ مکمل طور پر امن پسند اور دوسرا سخت جھگڑالو رہا ہو۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ کیمبرج میں بسر رکھنے والا گروہ 'برادری' اور آکسفورڈ کا گروہ 'مربوط گھرانے' کے تصور پر یقین رکھتا ہو؟ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ کیمبرج والے لکڑی کی مورتیاں بنا کر جبکہ آکسفورڈ کے باشندے آگ کے گرد رقص کر کے عبادت کرتے ہوں؟ ایک گروہ دوعقیدہ تناسخ یا دوسرے جنم پر یقین رکھتا ہو اور دوسرا گروہ یہ سمجھتا ہو کہ ایسا ماننا لغو اور بے معنی بات ہے؟ ایک معاشرے میں ہم جنس پرستی کو کھلے دل سے قبول کیا جاتا ہو اور دوسرا معاشرہ اس کو نجس سمجھ کر سختی سے ممانعت کرتا ہو؟

دوسرے الفاظ میں یوں کہیے کہ جدید دور میں بسنے والے تاختی آدمی اور ان کے معاشرے کا مشاہدہ ہمیں قدیم دور کے تاختی اور شکاری آدمی کی زندگی میں جھانکنے کا موقع ضرور دیتا ہے لیکن قدیم زمانے میں ممکنات کا کینوس آج کے تاختی تصور کے مقابلے میں بہت بڑا تھا۔ اس کینوس کا زیادہ تر حصہ ہماری نگاہوں سے بہر حال، اوجھل ہے۔ خردمند آدمی کے 'قدرتی طرز زندگی' بارے زور و شور اور گرم مباحثے یہ نکتہ بھول جاتے ہیں۔ جب سے شعور اور آگاہی کا ادراک ہوا ہے، ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ آدمی کے لیے کوئی بھی ایک مخصوص 'طرز زندگی'، 'قدرتی طرز زندگی' نہیں رہا۔ بعد اس ادراک کے جو رہا ہے وہ سراسر آدمی کی اپنی مرضی اور انتخاب ہے۔ اس ممکنات کے حیران کن حد تک وسیع کینوس پر آدمی کے لیے تہذیبی اور ثقافتی ممکنات کا بھرپور انتخاب رہا ہے۔ وہ جو چاہے، اس پر سو کرے۔۔۔ جیسا چاہے، رنگ بھر دے۔

اولین خوشحال معاشرہ

ہم یہ جانتے ہیں کہ قدیم دور کے معاشروں سے متعلق بڑا حصہ ہماری نظروں سے اوجھل ہے لیکن باوجود اس کے، یہ سوال ہمارا منہ چڑاتا ہی ہے کہ آخر زرعی دور سے قبل آدمی کی زندگی بارے کسی نہ کسی طرح کا عام تصور تو قائم کیا ہی جا سکتا ہے؟ اس ضمن میں ہم محتاط اندازے اور بڑی حد تک وثوق سے یہ ضرور کہہ سکتے ہیں قدیم لوگوں کی اکثریت درجنوں کی یا زیادہ سے زیادہ سو کی تعداد میں چھوٹے گروہوں اور کنبوں کی شکل میں بسر رکھتے تھے۔ یہ بھی طے ہے کہ یہ سارے افراد صرف انسان تھے۔ یہ آخری نکتے کو سمجھنا انتہائی اہم ہے کیونکہ یہ آج کی ظاہریت سے کوسوں دور بات ہے۔ زرعی اور صنعتی دور میں معاشروں کا ایک بڑا حصہ پالتو اور سدھائے ہوئے جانوروں پر مشتمل رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ پالتو، گھریلو یا سدھائے ہوئے جانور اپنے مالکان کے برابر تو نہیں ہیں لیکن بہر حال آج یہ انسانی معاشرے کا حصہ ضرور ہیں۔ مثال کے طور پر آج نیوزی لینڈ کا انسانی معاشرہ پینتالیس لاکھ انسانوں (خردمند آدمی) اور پانچ کروڑ بھیڑوں پر مشتمل ہے۔

اس ضمن میں صرف ایک جانور کو عام قاعدے سے استثناء حاصل ہے۔ یہ جانور کتا ہے۔ کتا پہلا جانور ہے جسے آدمی نے زرعی انقلاب برپا ہونے سے پہلے سدھا کر پالتو بنایا۔ ماہرین اس بارے حتمی تاریخ بتانے سے قاصر ہیں، بلکہ کیسے اس بارے اختلاف پائے جاتے ہیں لیکن ناقابل تردید حد تک آدمی کے یہاں سدھائے ہوئے پالتو کتے کے ثبوت ضرور موجود ہیں۔ آدمی کے گروہوں میں، بہرحال کتا اس سے بھی ہزاروں سال پہلے ہی شامل ہو چکا تھا لیکن سدھایا بعد میں گیا تھا۔

آدمی کتوں کو شکار، لڑائی اور جنگلی درندوں اور دشمن آدمیوں سے ہوشیار کرنے کے لیے استعمال کرتا رہا ہے۔ نسل در نسل کے بعد، یہ دونوں انواع ایک ساتھ ہی ارتقاء کی منازل طے کرتے ہوئے اس قابل ہو گئے کہ ایک دوسرے کی حرکات و سکنات، اشارے بھی خوب سمجھنے لگے۔ آدمی کے گروہوں میں شامل وہ کتے جو اپنے ساتھی آدمیوں کے جذبات اور ضروریات کو اچھی طرح سمجھتے تھے، ان کا خوب خیال رکھا جاتا اور بہتر خوراک دی جاتی۔ اس طرح کے کتوں کی بقاء کے امکانات زیادہ ہوتے تھے۔ چنانچہ، یوں ہی نسل در نسل کتوں نے بھی اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے آدمیوں کے ساتھ چترائی اور ہوشیاری سے کام لینا شروع کر دیا۔ کم از کم پندرہ ہزار سال پر مبنی یہ تعلق آدمی اور کتوں کے بیچ سمجھ اور انس کا ایسا رشتہ ہے جو آدمی اور کسی دوسرے جانور کے بیچ نہیں پایا جاتا۔ بعض جگہوں پر آثار میں کتوں کی ایسی باقیات بھی ملی ہیں جنھیں مرنے کے بعد پورے چاؤ اور رسمی طریقے، دستور کے مطابق دفنایا گیا تھا، جیسے آدمی کو مرنے کے بعد دفن کیا جاتا ہے۔

ایک گروہ یا کنبے کے افراد ایک دوسرے کو قریبی سطح پر جانتے اور ان کے بیچ تعلق رہا کرتا تھا اور ہر وقت، زندگی بھر ان کے گرد دوست اور رشتہ دار موجود رہتے تھے۔ اس زمانے میں تنہائی اور خلوت نایاب رہا کرتی تھی۔ دوسرے، اسی علاقے میں بسر رکھنے والے پڑوسی گروہ ایک دوسرے کے ساتھ جہاں وسائل کی خاطر لڑتے جھگڑتے تھے، وہیں ان کے بیچ دوستانہ مراسم بھی رہا کرتے تھے۔ وہ آپس میں آدمیوں کا تبادلہ بھی کرتے تھے، اکٹھا شکار بھی کھیلتے تھے، قیمتی اشیاء کی تجارت بھی کرتے تھے، سیاسی اتحاد اور گٹھ جوڑ بھی ہوتی تھی اور مذہبی تہوار بھی مل کر منایا کرتے تھے۔ اس طرح کا اشتراک اور تعاون آدمی کا مارکہ رہا ہے اور یہی واحد شے ہے جو آدمی کو باقی کے انسانی انواع سے ممتاز کرتا ہے۔ بعض اوقات دوسرے کنبوں اور گروہوں کے ساتھ یہ تعلق اور نسبت اتنی گہری ہو جاتی تھی کہ وہ مل کر ایک ہی قبیلہ تشکیل دے دیتے تھے۔ اس قبیلے کی زبان، مفروضے، قصے، رسوم، رواج اور اقدار ایک ہی ہوتی تھیں۔

لیکن اس طرح کے بیرونی تعلقات کی اہمیت بارے زیادہ خوش فہمی پالنا یا بڑھ چڑھ کر تخمینہ لگانا درست نہیں ہو گا۔ اگرچہ مشکل وقت میں پڑوسی کنبے اور گروہ ایک دوسرے کے زیادہ قریب آجاتے تھے اور یہ بھی درست ہے کہ کبھی کبھار وہ اکٹھے شکار اور دعوتوں کا اہتمام بھی کر لیتے تھے لیکن اس کے باوجود ان کا زیادہ تر وقت مکمل طور پر علیحدگی اور خود مختاری میں گزرتا تھا۔ تجارت بھی قیمتی اشیاء جیسے سیپیوں، عنبری رکاز اور رنگین صبغے وغیرہ تک محدود تھی۔ خوراک جیسے پھلوں اور گوشت وغیرہ کی تجارت کے کوئی ثبوت نہیں

ملے بلکہ کہیے کہ ایک گروہ یا قبیلے کا کسی دوسرے قبیلے اور کنبے سے خام مال کی درآمد یا تجارت کا کوئی تصور نہیں تھا۔ اس ضمن میں سماجی اور سیاسی تعلقات بھی خال خال ہی پائے جاتے تھے۔ ایک قبیلہ کسی بھی صورت مستقل اور پائیدار سیاسی ساخت کی نشانی نہیں تھا۔ اسی طرح جغرافیائی لحاظ سے بھی دیکھا جائے تو کنبوں، گروہوں اور قبائل کی مخصوص موسموں میں وقتی طور پر بسیرا ضرور رہا کرتا تھا لیکن دنیا میں کسی بھی جگہ پر مستقل بستیوں اور اداروں کا کوئی تصور نہیں تھا۔ ایک اوسط آدمی کو، مہینوں تک اپنے گروہ کے سوا کسی دوسرے کی شخص سے ملاقات کا موقع، مل بیٹھنے کا سبب نہیں ملتا تھا۔ اسی طرح کوئی بھی شخص کا اپنی پوری زندگی میں چند سو لوگوں سے زیادہ تعلق اور سامنا نہیں ہوتا تھا۔ آدمی کی آبادیاں وسیع علاقوں میں پھیلی ہوئی تھیں اور گنجانی کا تصور بھی نہیں تھا۔ زرعی انقلاب برپا ہونے سے پہلے پوری دنیا کی انسانی آبادی آج کے مصری شہر قاہرہ کی آبادی سے بھی کہیں کم تھی۔

آدمی کے تقریباً کنبے اور گروہ خانہ بدوشی کی زندگی گزارتے تھے۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ خوراک کی تلاش میں پھرتے تھے۔ ان کی نقل و حرکت پر موسموں کے تغیرات، جانوروں کے سالانہ نقل مکانی اور جنگلی نامیات اور پودوں کی نمو و موسمی بالیدگی کا بھرپور اثر و رسوخ رہتا تھا۔ آدمیوں کے گروہ اپنے آبائی وطن میں آگے اور پیچھے، اوپر اور نیچے حرکت کرتے رہتے تھے۔ یہ چند درجن مربع کلومیٹر کے علاقے سے لے کر زیادہ سے زیادہ کئی سو مربع کلومیٹر کے علاقے میں نقل و حرکت کرتے رہتے۔
کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا تھا کہ آدمی کے کنبے اور گروہ اپنا آبائی علاقہ چھوڑ کر نئی سرزمینوں کی تلاش میں بھی نکل جاتے تھے۔ اس کی وجوہات کئی ہوتی تھیں۔ اکثر تو موسمی بندشوں اور سخت حالات کی وجہ سے ہجرت کرنی پڑتی تھی۔ بعض اوقات پرتشدد لڑائیاں شروع

6 پہلا پالتو جانور؟ شمالی اسرائیل میں بارہ ہزار سال پہلے کے ایک مقبرے سے دریافت ہونے والی باون سالہ عورت اور ایک کتوم ڑے کی باقیات (بائیں جانب)۔ عورت کا ہاتھ کتوم ڑے پر ٹکا ہوا ہے جس سے جذباتی تعلق واضح ہوتا ہے یا پھر یہ بھی ممکن ہے کہ کتوم ڑا، اگلی دنیا کے دربان کے لیے تحفہ رہا ہو گا؟

ہوتیں تو جانا ٹھہر جاتا۔ اسی طرح ایک مخصوص علاقے میں آبادی کا بڑھ جانا بھی وجہ رہتی اور بہت ہی کم لیکن ایسا بھی ہوتا کہ کسی کنبے اور گروہ میں کوئی کرشماتی لیڈر نکل آتا جو اپنے کنبے کو بہتر زندگی کے خواب دکھا کر کسی نئے، بھلے دیس کا رخ کر لیتا۔ آدمی کی اسی خانہ بدوش طرز زندگی کا نتیجہ ہے کہ پوری دنیا میں پھیل گیا۔ لیکن اگر قدیم دور کے کسی تاختی گروہ اور کنبے کی تعداد اتنی بڑھ جاتی یا وہ مجبوراً یا کسی اور وجہ سے ہر چالیس برس میں ٹوٹ جاتا اور آدمی کا نیا گروہ مشرق کی جانب زیادہ سے زیادہ سو کلومیٹر جا کر بس جاتا تو اس رفتار سے آدمی کی آبادی مشرقی افریقہ سے لے کر چین تک پھیل جانے میں قریباً دس ہزار سال لگ گئے ہوں گے۔

بعض غیر معمولی موقعوں پر ایسا بھی ہوا کہ ایسی جگہیں جہاں پر خوراک کی بہتات تھی، وہاں آدمی کے گروہوں نے موسمی اور یہاں تک کہ مستقل سکونت بھی اختیار کی۔ اسی طرح کے علاقوں میں پہلی بار خوراک کو خشک کر کے، دھواں لگا کر یا منجمد کر کے ہر صورت لمبے عرصے تک جمع کر کے رکھنے کی تکنیک بھی ایجاد ہوئی۔ اس ضمن میں سب سے اہم دریاؤں اور سمندروں کے وہ کنارے رہے ہیں جہاں خوردنی سمندری خوراک اور مرغ آبی اور جل ککڑوں کا شکار بہت عام دستیاب ہو جاتا تھا۔ آدمی نے ایسی جگہوں پر پہلی بار ماہی گیروں کی بستیاں آباد کیں۔ یہ تاریخ میں کسی بھی نوع انسانی کی پہلی مستقل بستیاں تھیں۔ ماہی گیروں کی یہ بستیاں، زراعت سے بھی قبل کی بات ہے۔ انسان زرعی انقلاب برپا ہونے سے خاصا پہلے ہی دوامی سے مستقل سکونت پر آمادہ ہو چکا تھا۔ ماہی گیروں کی یہ بستیاں سب سے پہلے انڈونیشیا کے جزائر میں آباد ہونا شروع ہوئیں اور یہ قریباً پینتالیس ہزار سال پہلے کی بات ہے۔ یہ بستیاں آدمی کی وہ بنیاد اور تہذیب کا ایسا پیندہ ثابت ہوئیں جہاں سے پہلی بار سمندر سے گزر گاہیں بنانے کی مہمات کا آغاز ہوا۔ آدمی نے آسٹریلیا پہنچنے کی کوششیں شروع کر دیں۔

زیادہ تر قدرتی مسکنوں اور آبائی علاقوں میں آدمی کے گروہ موقع پرستی اور نہایت بھلے اور لوچ دار انداز میں پیٹ بھرنے کا انتظام کرتے تھے۔ وہ حشرات تلاش کرتے، بیری اور ڈوڈے جمع کرتے، جڑیں کھودتے، خرگوشوں کا پیچھا کر اور کبھی کبھار جنگلی بھینسوں اور میمتھ ہاتھیوں کا شکار کرتے تھے۔ ہرچند کہ قدیم آدمی کے بارے 'پھرتیلے اور سریع شکاری' کی شبیہ مشہور ہے لیکن آدمی کی مشغولیت مندرجہ بالا کام ہی تھے جو اس کی جسمانی توانائی کا بڑا ذریعہ تھا۔ اس کے علاوہ آدمی کا باقی وقت چقماق کو تیز کرتے اور لکڑی، بانس وغیرہ سے نوکیلے نیزے بناتے گزرتا تھا۔

آدمی صرف خوراک ہی جمع نہیں کرتا تھا بلکہ علم کے پیچھے بھی مارا مارا پھرتا تھا۔ اس کی اپنی بقا کے لیے لازم تھا کہ وہ اپنے ارد گرد علاقے کا نقشہ اپنے ذہن میں نقش کر لے۔ خوراک جمع کرنے کے روزمرہ مشغولات کو زیادہ بہتر انداز میں سرانجام دینے کے لیے اسے معلومات کی ضرورت تھی۔ مثلاً یہ جاننا لازم تھا کہ پودوں کی مختلف اقسام کس طرح پیدا ہوتی ہیں، کب اور کہاں کہاں پائی جاتی ہیں؟ مختلف جانوروں کی عادات، رویے اور مسکن کہاں اور کیسے ہوتے ہیں؟ یہ پتہ ہونا ضروری تھا کہ آخر کون کون سی خوراک زیادہ سے زیادہ

غذائیت سے بھرپور ہے؟ایسی کونسی خوردنی اشیاء ہیں جو بیماری کا سبب بنتی ہیں؟اور کون سی بوٹیاں اور خوراکیں ہیں جو علاج کا ذریعہ بھی بن سکتی تھیں؟ موسموں کے بڑھنے اور گھٹنے کا علم ضروری تھا اور موسمی حالات جیسے طوفانوں اور قحط سالی کا پہلے سے اندازہ لگانے کی صلاحیت درکار رہتی تھی۔ وہ ہر دریا اور چشمے کی معلومات جمع کر کے رکھتے تھے، اخروٹ کے درختوں کے محل وقوع کا علم رکھا جاتا، ریچھوں کے غار اور چقماق وغیرہ کے ذخائر کہاں کہاں پوشیدہ تھے؟ ہر فرد کے لیے لازم تھا کہ وہ اپنے لیے پتھر سے چاقو بنانے کا گر سیکھے، پوشاک کی مرمت کر سکے، خرگوش پکڑنے کے لیے کڑکی ڈال سکے، برفشاروں اور تودوں کا سامنا کیسے کرنا ہے، سانپ کانٹ لے تو زہر کیونکر سینچا جائے اور اگر شیر سے سامنا ہو جائے تو پلٹا کیسے کھانا ہے؟ ان سارے اور ایسے کئی دوسرے فنون اور ہنروں میں مہارت حاصل کرنے کے لیے سالہا سال کی محنت، شاگردی اور مشق درکار ہوتی تھی۔ قدیم دور کا تاختی آدمی چقماق کے معمولی پتھر کو منٹوں کے اندر نوکیلی برچھی میں ڈھال سکتا تھا لیکن آج ہم میں سے کوئی بھی شخص ایسی کوشش کرے تو بری طرح ناکام رہے گا۔ ہم میں اکثریت نے کبھی چقماق دیکھا بھی نہیں ہو گا، چقماق کی پرت داری بارے علم اور اس سے نفیس اوزار اور ہتھیار بنانے کی اہلیت اور فن تو بہت دور کی بات ہے۔

دوسرے الفاظ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ قدیم دور کے تاختی آدمی کو اپنے ارد گرد ماحول سے متعلق آج کے جدید آدمی سے کہیں بڑھ کر وسیع، گہرا اور زیادہ متنوع علم اور سمجھ رہا کرتی تھی۔ آج کے صنعتی و حرفتی معاشرے کے آدمیوں کو بقا کے لیے قدرتی دنیا بارے زیادہ جاننے کی حاجت ہی باقی نہیں رہی۔ آج کے آدمی کو کمپیوٹر انجنیئر، انشورنس ایجنٹ، تاریخ کے استاد یا فیکٹری فورمین بننے کے لیے کس طرح کے علم کی ضرورت ہوتی ہے؟ اس مقصد کے لیے اپنی کسی ایک مخصوص اور محدود فنی میدان میں مہارت کی ضرورت ہوتی ہے ورنہ زندگی کی باقی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ان میدانوں میں ہر طرح کے ماہرین اور کام کرنے والے موجود ہیں۔ ان میدانوں میں مہارت رکھنے والوں کا علم، ہمارے فن میں محدود ہوتا ہے اور وہ ہم پر انحصار کرتے ہیں۔ اجتماعی طور پر انسان آج اس دنیا کے بارے اتنا وسیع علم رکھتا ہے جتنا قدیم دور کے آدمی کے وہم و گمان میں کبھی بھی نہیں رہا ہو گا۔ لیکن، انفرادی سطح پر دیکھا جائے تو قدیم دور کے تاختی آدمی تاریخ کے سب سے بہتر عالم اور فنون میں ماہر رہے ہیں۔

تحقیق سے یہ بھی پتہ چلا ہے کہ آج ایک اوسط آدمی کے دماغ کا سائز تاختی دور کے آدمی کے مقابلے میں دراصل کم ہوا ہے۔ اس دور میں بقا کے لیے ہر ایک شخص کے لیے شاندار اور کمال درجے کی دماغی صلاحیتوں کا حامل ہونا ضروری تھا۔ جب زراعت اور صنعت و حرفت کا دور دورہ ہوا تو لوگ بقا کے لیے دوسرے لوگوں کی صلاحیتوں پر انحصار کر سکتے تھے اور یوں کاہلی، سستی اور ضعیف العقلی کا در کھل گیا۔ آدمی کے لیے نہ صرف اس کاہلی اور ضعیف العقلی کے ساتھ زندہ بچ رہنا ممکن ہو گیا بلکہ اپنے معمولی اور نہایت احمق نسبے، ساری زندگی ماشک اور پیداواری سلسلے میں معمولی کام سرانجام دیتے ہوئے بھی اگلی نسل میں منتقل کرنے میں کوئی مسئلہ باقی نہیں رہا۔

قدیم دور کے تاختی آدمی نے جہاں اپنے ارد گرد کی دنیامیں جانوروں، پودوں، بوٹیوں اور قدرتی عوامل کے متعلق سمجھ بوجھ بڑھائی، وہیں اپنے اجسام اور حس کے اندر کی دنیا کو بھی کھنگالا۔ وہ گھاس میں معمولی کھٹ پٹ اور خفیف آواز کو بھی سن کر، کسی سانپ کی رینگ کو بھانپ لیتے تھے۔ کسی درخت میں بیل بوٹوں اور پتوں کی کثرت سے پھل کی مٹھاس اور مقدار کے ساتھ ساتھ اس درخت میں پرندوں کے گھونسلوں اور شہد کی مکھیوں کے چھتوں کا بھی پتہ لگالیتے تھے۔ وہ اس قابل تھے کہ معمولی کسرت سے اور آواز پیدا کیے بغیر نہایت خموشی کے ساتھ حرکت کرنے کے اہل تھے۔ وہ نہایت مہارت کے ساتھ چوکڑوں بیٹھنا، ناہموار سطح پر چلنا اور نہایت سرعت کے ساتھ دوڑ لگانا اچھی طرح جانتے تھے۔ اس دور کا ہر شخص ایسے رہا کرتا تھا جیسے آج دنیا کے بہترین دوڑ لگانے والے چند گنے چنے ایتھلیٹ ہوتے ہیں۔ تاختی آدمی اس قدر مشاق اور پھرت رہا کرتا تھا کہ آج کے دور میں لوگوں کے لیے برسوں کی محنت اور مشقت، یوگا اور تائی چی کی سخت مشق کے باوجود بھی اس کا حصول ممکن نہیں رہا۔

شکاری اور تاختی طرز زندگی ہر خطے میں دوسروں سے غیر معمولی طور پر مختلف رہی ہے۔ یہی نہیں بلکہ ایک موسم اور دوسرے میں یہ طرز جداگانہ رنگ رکھتی تھی۔ زندگی میں اس قدر تغیر اور تفاوت کے باوجود تاختی باشندے اپنے خلف جیسے دہقانوں، چرواہوں، مزدوروں اور دفتروں میں کام کرنے والے کلرکوں سے کہیں زیادہ اطمینان بخش اور فائدہ مند زندگی گزارتے تھے۔

آج کے آسودہ معاشروں میں لوگ اوسطاً ہر ہفتے چالیس سے پینتالیس گھنٹے کام کرتے ہیں۔۔۔ ترقی پذیر ممالک میں یہ شرح ساٹھ اور بعض جگہوں پر اسی گھنٹوں تک پہنچ جاتی ہے۔ ہمارے مقابلے میں آج بھی جہاں جہاں تاختی اور شکاری معاشرے باقی ہیں۔۔۔ دنیا کے مشکل ترین جگہوں جیسے کلہاری صحرا کے سخت ترین حالات میں بھی، ان تاختیوں کو ہر ہفتے اوسطاً پینتیس اور زیادہ سے زیادہ پینتالیس گھنٹے کام کرنا پڑتا ہے۔ وہ تین میں سے صرف ایک دن ہی شکار کھیلتے ہیں اور ہر روز خوراک جمع کرنے میں تین سے چھ گھنٹے صرف کرتے ہیں۔ عام حالات میں، اتنا کام ایک کنبے کا پیٹ بھرنے کے لیے کافی ہوتا ہے۔ یہ ثابت شدہ ہے کہ قدیم زمانے میں وہ جگہیں جہاں کلہاری صحرا سے کہیں آسان تر حالات اور خوب زرخیزی پائی جاتی تھی۔۔۔ وہاں بسر رکھنے والے تاختی اور شکاری آدمیوں کے کنبوں اور قبیلوں کو خوراک اور خام اشیاء جمع کرنے کے لیے اس سے بھی کہیں کم محنت اور وقت درکار ہوتا ہوگا۔ تاختیوں اور شکاری آدمیوں کو سب سے زیادہ فائدہ یہ تھا کہ انھیں گھر کے چھوٹے چھوٹے کام کاج وغیرہ سے بھی تقریباً چھٹکارا حاصل تھا۔ انھیں برتن دھونے کی حاجت نہیں تھی، قالینوں میں سے دھول نکالنے کی کوفت اور فرش چمکانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ وہ بچوں کی نیپی اور پوتڑے باربار بدلنے اور ہر کچھ دنوں کے بعد سہولیات کے بل ادا کرنے کی مشکل سے آزاد تھے۔

تاختی معاشروں میں پائی جانے والی معیشت لوگوں کو زرعی اور صنعتی وحرفتی دور کے مقابلے میں کہیں بڑھ کر دلچسپ زندگی گزارنے کا موقع فراہم کرتی تھی۔ آج، ایک چینی فیکٹری میں کام کرنے والا آدمی صبح سات بجے گھر سے نکلتا ہے، وہ دھول اور آلودگی سے اٹی

ہوئی گلیوں میں سے گزر کر فیکٹری پہنچتا ہے۔ یہاں اس کا کام پورا دن، تقریباً آٹھ سے بارہ گھنٹے تک ہر روز ایک ہی طرح کی مشین چلاتے رہنا ہے جس سے دماغ ماؤف ہو کر رہ جاتا ہے۔ وہ شام سات بجے تک واپس گھر پہنچتا ہے اور اب اسے کھانے پینے کی فکر بھی ہوتی ہے اور ہر روز برتن بھی دھونے پڑتے ہیں۔ یہی نہیں، ہر دوسرے دن کپڑے بھی دھو، سکھا کر استری کرنے پڑتے ہیں اور اس کے علاوہ کئی ایسے کام۔۔۔ ہر روز بلاناغہ دہرانے پڑتے ہیں۔ تیس ہزار سال قبل، ایک چینی تاختی کی زندگی کے معمولات یکسر الگ تھے۔ وہ اپنے کنبے کے لوگوں اور دوسرے ساتھیوں کے ہمراہ۔۔۔ کہو، آٹھ بجے گھر سے نکلتا تھا۔ وہ جنگلوں اور چراہ گاہوں میں مٹر گشت کرتے ہوئے ساتھ ہی ساتھ مشروم جمع کرتا۔ کہیں کوئی جڑ اکھاڑ کر پاس رکھ لیتا، کہیں سے پھل نکال لاتا اور بعض اوقات شیر اور جنگلی جانوروں کا سامنا ہو جاتا تو زیادہ تر دوڑ لگا دیتا۔ بہرحال، دوپہر سے پہلے وہ اپنے تمبو میں واپس آجاتا اور جمع شدہ خوراک اپنے کنبے کے باقی افراد کے ساتھ مل کر کھاتا۔ اس کے بعد اس کے پاس گپ شپ لگانے، قیلولہ، بچوں کے ساتھ کھیلنے اور قصے کہانی سنانے کے لیے وقت ہی وقت تھا۔ ظاہر ہے، کبھی کبھار اس کو راستے میں چیتا بھی آن کر جھپٹ پڑتا تھا اور بسا اوقات سانپ وغیرہ بھی کاٹ لیتا تھا لیکن دوسری جانب یہ بھی تو دیکھیے کہ تاختیوں اور شکاریوں کو ہر روز موٹر گاڑیوں کے ایکسیڈنٹ اور صنعتی آلودگی کا سامنا بھی تو نہیں کرنا پڑتا تھا۔

زیادہ تر جگہوں پر، زیادہ تر تاختیوں کو کہیں بہتر غذائیت دستیاب رہتی تھی۔ یہ اچنبھے کی بات ہرگز نہیں ہے بلکہ دسیوں ہزار اور لاکھوں سال تک انسان کی خوراک یہی رہی ہے اور انسانی جسم اس خوراک کو ہضم کرنے اور اس سے سے افزائی حاصل کرنے کے لیے ڈھل چکا ہے۔ فوسل شدہ انسانی ڈھانچوں سے ملنے والے ثبوتوں سے پتہ چلتا ہے کہ قدیم دور کے تاختی اور شکاری آدمیوں میں فاقوں اور غذائیت کی کمی کا شکار ہونے کے امکان بہت ہی کم تھے۔ وہ دہقان معاشروں کے آدمی سے قد میں اونچے اور خاصے صحت مند ہوا کرتے تھے۔ یہ ضرور ہے کہ اس دور میں اوسطاً آدمی کے لیے عمر کی طوالت صرف تیس سے چالیس برس ہی ہو گی لیکن اس شماریاتی اندازے میں بڑا حصہ شیرخوار بچوں میں شرح اموات کی زیادتی ہے۔ وہ شیرخوار بچے جو اپنی زندگی کے اولین پر خطر سال نکالنے میں کامیاب ہو جاتے۔۔۔ وہ نہایت آسانی کے ساتھ صحت مند زندگی گزار کر کم از کم بھی ساٹھ سال کی عمر کو پہنچ جاتے تھے۔ اس دور میں بھی ایسے لوگ پائے جاتے تھے جو اسی، نوے اور سو سو برس تک جیا کرتے تھے۔ آج کے جدید دور میں بچ رہنے والے تاختی معاشروں میں پینتالیس سال کی عورت نہایت آسانی کے ساتھ بیس مزید برس تک جینے کی توقع رکھ سکتی ہے اور تقریباً آٹھ فیصد تاختی، آج بھی ساٹھ سال سے زیادہ کی عمر پاتے ہیں۔

تاختی اور شکاری آدمیوں کی فاقہ کشی اور عدم غذائیت کے خلاف کامیابی کا راز ان کی متنوع غذا تھی۔ آج بھی ہم دیکھتے ہیں کہ کسان اور دہقان گھرانوں میں کھانے کی مقدار عام طور بہت کم استعمال کی جاتی ہے اور یہ نہایت غیر متوازن بھی ہوتی ہے۔ بالخصوص اس جدید

زمانے سے قبل تو زراعت پر انحصار کرنے والی آبادیوں کی توانائی کی ضرورت صرف اور صرف ایک فصل جیسے گندم، آلو یا چاول سے پوری ہوتی تھی۔ روزمرہ خوراک میں حیاتین،معدنیات اور انسانی جسم کے دوسرے ضروری غذائی اجزاء کی شدید کمی رہا کرتی تھی۔ زرعی دور میں چین کا ایک روایتی کسان ناشتے،دوپہر اور رات۔۔۔ تینوں اوقات میں صرف چاول ہی کھاتا تھا۔ اگر اس کی قسمت اچھی ہوتی تو اگلے روز اور اس سے اگلے روز،الغرض ہر روز یہی چاول ہی کھانے کو مل جاتا تھا۔ اس کے برعکس قدیم دور کے چین سے تعلق رکھنے والے تاختی نہایت آسانی کے ساتھ ہفتے بھر میں درجنوں طرح طرح کی خوراک کھاتے تھے۔ انھیں ناشتے میں مشروم اور بیر۔۔۔ دوپہر کے کھانے میں پھل، گھونگے اور سبز کچھوا جبکہ رات کے کھانے میں بھنا ہوا خرگوش اور جنگلی پیاز دستیاب ہو ہی جاتا تھا۔ اس سے اگلے روز کا مینو،یقیناً آج سے مختلف ہوتا اور اس سے اگلے روز۔۔۔ کیا خبر،بالکل ہی مختلف ہو گا؟روزمرہ خوراک میں اس تنوع کا نتیجہ یہ نکلتا تھا کہ تاختی اور شکاری آدمیوں کو ضروری غذائی اجزاء نہایت آسانی کے ساتھ دستیاب ہو جاتے تھے۔

مزید یہ کہ خوراک کی کسی ایک ہی قسم پر تکیہ نہ کرنے کا فائدہ یہ تھا کہ اگر اس قسم کی خوراک نایاب ہو جاتی تو بھوک اور تکلیف سہنے کے پھر بھی کم ہی امکان تھے کیونکہ دوسری اقسام اور بسا اوقات نت نئی اقسام بھی نکل آتی تھیں۔ زراعت پر انحصار کرنے والے معاشرے قحط سالی، سیلاب، آگ اور دوسری ایسی ہی آفتوں کے نتیجے میں باربار بھوک،افلاس اور کال کا شکار ہوتے ہی ہیں کیونکہ ان کی واحد خوراک گندم،چاول یا آلو کی فصل تباہ ہو جاتی ہے۔ تاختی معاشرے بھی قدرتی آفتوں سے بچے ہوئے نہیں تھے اور ہر کچھ عرصے بعد ان آفتوں کے نتیجے میں محتاجی اور بھوک کا شکار ہو ہی جاتے تھے لیکن وہ زرعی معاشروں کی نسبت ان مشکلات اور تباہیوں سے با آسانی نبٹ لیتے تھے۔ اگر ان کی خوراک کا بڑا حصہ ضائع بھی ہو جاتا تو وہ فٹ دوبارہ سے خوراک جمع کرنا،نت نئے جانوروں کا شکار اور نہایت آسانی کے ساتھ کسی دوسرے،محفوظ علاقے میں نکل جاتے تھے۔

قدیم دور کے تاختی آدمی متعدی بیماریوں سے بھی نسبتاً کہیں کم متاثر ہوتے تھے۔ تاریخ گواہ ہے کہ تقریباً متعدی بیماریوں نے ہمیشہ زرعی اور صنعتی معاشروں کو ہی متاثر کیا ہے۔ ان میں چیچک، خسرہ،ٹی بی اور ایسی کئی دوسری چیدہ بیماریوں کے نام آتے ہیں۔ یہ ساری وہ بیماریاں ہیں جو گھریلو سطح پر سدھائے ہوئے پالتو جانوروں سے انسانوں میں منتقل ہوئی تھیں۔ جانوروں کو سدھا کر پالتو بنانے کا سہرا بھی زرعی انقلاب کے سر جاتا ہے۔ وہ قدیم آدمی جس نے صرف اور صرف کتے کو سدھایا تھا،وہ اس طرح کی قباحتوں سے آزاد تھے۔ علاوہ ازیں،زرعی اور صنعتی معاشروں میں لوگ گنجان آبادیوں میں مستقل طور پر مل جل کر رہتے ہیں جہاں صفائی اور ستھرائی کا امکان کم سے کم تر ہوتا ہے۔ ایسی جگہیں متعدی امراض کا گڑھ ہوتی ہیں۔ قدیم آدمی،چونکہ چھوٹے گرہوں اور کنبوں میں بٹ کر اور خانہ بدوشی کی زندگی گزارتا تھا،اسی لیے اس کے یہاں وبائی اور متعدی امراض پنپ ہی نہیں سکتے تھے۔

متوازن، متنوع اور مکمل غذا، روزمرہ مشقت اور معمولات کے نسبتاً مختصر دورانیے اور متعدی امراض کی ندرت جیسے عوامل ہی ہیں جن کی بناء پر محققین زراعت سے قبل کے تاختی اور شکاری آدمی کے دور کو 'اولین اور واقعی آسودہ معاشرہ' گردانتے ہیں۔ تاہم، قدیم آدمی کے اس طرز زندگی کو مثالی سمجھ لینا سراسر غلطی ہو گی۔ اگرچہ وہ زرعی اور صنعتی دور کے آدمی کی نسبت بہتر زندگی گزارتے تھے لیکن یہ زندگی یقیناً سخت اور انتہائی مشکل ثابت ہو سکتی تھی۔ مثلاً محتاجی اور سختی بہت زیادہ تھی، بچوں میں شرح اموات ناقابل یقین حد تک بڑھ کر اور وہ حادثات جو آج کی دنیا میں نہایت معمولی اور غیر اہم سمجھے جاتے ہوں۔۔۔ جیسے معمولی خراشیں، فریکچر اور زخم وغیرہ اس دور میں گویا موت کا پروانہ ثابت ہوتے تھے۔ زندگی میں زیادہ تر تاختی آدمیوں کو اپنے کنبے کی انسیت اور قربت تو ملتی رہتی تھی لیکن ان میں بد نصیب جو اپنے کنبے کے باقی افراد کے مذاق اور بداندیشی کا شکار ہو جاتے تو ان کا کوئی پرسان حال نہ ہو تا تھا۔ وہ اگر اپنے کنبے سے کٹ جاتے تو پھر ان کا بچ کر رہ پانا ناممکن ہو تا تھا۔ وہ سخت مصیبت میں مبتلا ہو جاتے تھے۔ آج کے جدید دور میں بھی تاختی معاشروں میں بوڑھے، کمزور اور معذور لوگوں کو جو کنبے میں حصہ نہیں ڈال سکتے۔۔۔ انھیں ترک کر دینے، حتیٰ کہ جان سے مار دینے کی روایت موجود ہے۔ اس دور میں غیر مطلوب اور ناپسندیدہ بچوں کو پیدا ہوتے ہی موت کے منہ میں دھکیل دیا جاتا ہو گا اور ایسے ثبوت بھی ہیں کہ عقیدے اور شعائر کی ادائیگی کے لیے انسانی قربانی کا تصور بھی پایا جاتا تھا۔

پیراگوئے کے جنگلوں میں 1960ء تک باقی کی دنیا سے کٹ کر چند تاختی قبائل بسر رکھتے تھے۔ انہیں آچی قبائل کہا جاتا ہے۔ ان کے طرز زندگی پر نظر دوڑائیں تو تاختی طرز زندگی کی سیاہی ابھر کر سامنے آتی ہے۔ آچی قبائل میں اگر کسی کنبے کا اہم فرد مر جاتا تو روایت یہ تھی کہ وہ ایک نوعمر لڑکی کو بھی قتل کر کے دونوں کو اکٹھا دفناتے تھے۔ وہ محققین جنہوں نے آچی لوگوں کا انتہائی قریب سے مشاہدہ اور ان سے بات چیت بھی کی، ایک ایسے موقع کا ذکر کیا ہے جب کسی آچی کنبے نے درمیانی عمر کے ایک مرد کے ساتھ قطع تعلق کر کے اسے کنبے سے نکال دیا تھا۔ وہ شخص بیمار تھا اور کنبے کے ساتھ چلنے سے قاصر تھا۔ اس شخص کے کنبے نے اسے ایک درخت کے نیچے بے یار و مددگار چھوڑ دیا اور گدھ اس کے گرد منڈلانے لگے۔ لیکن وہ شخص سنبھل گیا اور پوری جان لگا کر کھڑا ہو گیا اور نہایت پھرتی سے چلتے ہوئے ایک دفعہ پھر کنبے میں شامل ہو گیا۔ چونکہ اس کا پورا جسم گدھ کے فضلے سے اٹا ہوا تھا، تو اسے اسی بناء پر 'گدھ کے فضلے' کا لقب بھی دے دیا گیا۔

اسی طرح جب ایک بوڑھی آچی عورت باقی کے کنبے پر بوجھ بن گئی تو ایک جوان مرد آچی نے گھات لگا کر اسے سر میں کلہاڑی کا وار کر کے قتل کر دیا۔

ایک دوسرے آچی مرد نے متجسس تاریخ دانوں کو جنگل میں اپنی جوانی کے قصے تفصیل سے کچھ یوں سنائے، "میں رواج کے مطابق بوڑھی عورتوں کو قتل کیا کرتا تھا۔ میں نے اپنی کئی پھوپھیوں، چاچیوں اور ممانیوں کا قتل کر رکھا ہے، اسی لیے عورتیں مجھ سے بے انتہا

خوف کھاتی تھیں۔ لیکن اب میں خود بوڑھا ہو گیا ہوں۔۔۔میرے بالوں میں سفیدی اتر آئی ہے۔'وہ بچے جو بالوں کے بغیر پیدا ہوتے تھے،انھیں کمزور اور کم آشکار سمجھ کر پیدائش کے فوراًبعد قتل کر دیا جاتا تھا۔ایک عورت نے اپنی اس بیٹی کے بارے میں بتایا،جسے اس کے باپ نے پیدا ہوتے ہی قتل کر دیا تھا۔اس کنبے کے مرد، کنبے میں ایک اور لڑکی کو شامل کرنے کے حامی نہیں تھے۔ایک دوسرے موقع پر کسی مرد نے ایک چھوٹے سے لڑکے کو اس لیے قتل کر دیا کیونکہ،'اس کو لڑکے کے خواہ مخواہ رونے پر بیزاری کا سامنا تھا۔۔اسے چڑ ہو رہی تھی!'۔ایک بچے کو اس لیے زندہ گاڑ دیا گیا کیونکہ،'اس کی شکل مضحکہ خیز تھی اور باقی بچے اس پر ہنستے تھے!'۔

لیکن یہاں بھی،محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ ہمیں آچی قبائل بارے کسی بھی طرح کا فیصلہ صادر کرنے میں جلدی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔وہ محققین جنھوں نے آچی قبائل کے ساتھ برسوں گزارے ہیں،وہ یہ بھی بتاتے ہیں کہ بالغ اور جوان آچیوں میں شاذ و نادر ہی کوئی تنازعہ اور جھگڑا کھڑا ہوتا تھا۔مرد اور عورتیں،دونوں ہی اپنا ساتھی چننے اور بدلنے میں آزاد تھے۔ان کے یہاں سبھی خوش باش رہتے تھے،کسی بھی قسم کا سرداری نظام نہیں تھا اور عام طور پر یہ ایک دوسروں پر حاکمیت جمانے اور جابرانہ طرز سے اجتناب برتتے تھے۔ان کے پاس جتنی بھی، تھوڑی یا بہت دولت اور مال و متاع تھا۔۔۔وہ اسے بانٹنے میں کوئی احتراز نہیں کرتے تھے اور طبیعتاً نہایت فیاض تھے۔انھیں دولت جمع کرنے اور کامیابیاں سمیٹنے سے بھی کوئی غرض نہیں تھی۔زندگی میں ان کی سب سے اہم اقدار سماجی تعلق اور گہری دوستی تھی۔بچوں کو زندہ گاڑھ دینا،بیماروں کو بے یار و مددگار مرنے کے لیے چھوڑ دینا اور بوڑھوں کو اپنے ہاتھ سے قتل کر دینا وغیرہ بارے ان کا ماننا ایسا ہی تھا جیسا کہ آج ہم اسقاط حمل اور سہل مرگی اور لاعلاج امراض کی صورت میں بے ایذا موت بارے نظریات رکھتے ہیں۔یہاں یہ بھی یاد رکھنا ضروری ہے کہ آچی قبائل سے تعلق رکھنے والے آدمیوں کو پیرا گوئے کے دہقان نہایت نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔انہوں نے بے شمار آچیوں کا نہایت بے رحمی سے شکار کر کے قتل عام کیا تھا۔ ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ غالباًپیرا گوئے کے دہقانوں کے اسی جبر کی وجہ سے آچی قبائل اپنے کنبوں اور قبائل میں کمزور افراد کی طرف ترش اور انتہائی بے رحم رویہ پالنے پر مجبور ہو گئے تھے کیونکہ وہ دشمن (پیرا گوئے کے دہقان) کا سامنا کرنے سے قاصر تھے اور بوجھ ہوا کرتے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ آچی معاشرہ، کسی بھی دوسرے انسانی معاشرے کی طرح انتہائی پیچیدہ تھا۔ ہمیں سطحی طور پر دیکھ کر اور صرف ان سے میل جول کے معمولی مشاہدات کی بناء پر ان کے بارے مثبت اور نہ ہی منفی رائے قائم کرنے،ان سے عفریت پالنے یا انھیں مثالی سمجھنے کی ضرورت اور نہ ہی حق حاصل ہے۔آچی قبائل فرشتے اور نہ ہی شیطان تھے۔۔۔وہ انسان تھے۔جیسے آچی، ویسے ہی قدیم دور کے تاختی اور شکاری بھی انسان تھے۔

بولتی روحیں

ہم قدیم زمانے کے آدمی کی روحانی اور نفسیاتی زندگی کے بارے کیا کہہ سکتے ہیں؟ آدمی کے تاختی اور شکار مار معاشرے کی معیشت اور طرز زندگی کو ہم کسی نہ کسی طور معیار اور مقدار کی بنیاد پر مقاصد کا تعین کرکے ناپ سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہم اس دور میں زندہ رہنے کے لیے ایک جوان آدمی کی روزمرہ توانائی کی ضرورت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ ایک کلو اخروٹ میں پائے جانے والے غذائی اجزاء اور یہ کہ اوسطاً ایک مربع کلومیٹر کے جنگل میں سے کتنے اخروٹ جمع کیے جا سکتے تھے وغیرہ وغیرہ۔ ان سارے اعداد و شمار کی بنیاد پر ہم قدیم آدمی کی روزمرہ خوراک میں اخروٹوں کی اہمیت کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔

لیکن کیا قدیم آدمی اخروٹ کو لطافت اور زکاوت کی نظر سے دیکھتا تھا؟ یا اس کے لیے یہ صرف معمولی اور بے لطف روزمرہ خام خوراک تھی؟ کیا اس دور کا آدمی اخروٹ کے درختوں میں روحوں کے بسیرے، اسے بھوت اور پریت کے مسکن ہونے کے تصور پر بھی یقین رکھتا تھا؟ کیا قدیم آدمی کے نزدیک اخروٹ کے پتے دلکشی اور حسن کا مظہر تھے؟ اگر کوئی تاختی لڑکا، کسی تاختی لڑکی سے اظہارِ محبت کرنا چاہتا تو کیا اخروٹ کے درخت تلے، گھنی چھاؤں باقی درختوں کی نسبت بہتر اور جذبات کے اظہار کے لیے سب سے موزوں مقام ہوا کرتی تھی؟ تو کہنے کا مقصد یہ ہے کہ تخیل، تصور، عقائد اور احساسات و جذبات کی دنیا کو سمجھنا، اس کی رمز کشائی کرنا انتہائی مشکل ہوتا ہے۔

زیادہ تر محققین متفق ہیں کہ قدیم آدمیوں کے یہاں مظاہر پرستی پائی جاتی تھی۔ مظاہر پرستی کو روحیت بھی کہا جاتا ہے۔ یہ ایسا عقیدہ ہے جس کے تحت ہر جگہ، ہر جانور، ہر پودا اور ہر طرح کا قدرتی مظہر آگاہی اور احساسات کا حامل ہوتا ہے۔ سادہ الفاظ میں ہر شے میں روح کا مسکن ہے جو انسانوں کے ساتھ براہ راست ربط رکھتا ہے۔ اس لحاظ سے مظاہر پرست یہ یقین رکھ سکتے ہیں کہ پہاڑ کی چوٹی پر واقع بڑی چٹان کی بھی خواہشات اور ضروریات ہیں۔ یہ چٹان، آدمیوں کے کسی برے فعل کو دیکھ کر غصے کا شکار بھی ہو سکتی ہے اور کسی اچھے فعل پر خوش بھی ہو جاتی ہے۔ یہ چٹان، انسانوں سے بخشش کی توقع بھی رکھتی ہے اور یہ چٹان انسانوں کو ملامت بھی کر سکتی ہے۔ انسانوں کے لیے ضروری یہ ہے کہ وہ اس چٹان کو باقاعدگی کے ساتھ مخاطب کیا کریں تاکہ اسے سکون پہنچے یا اس کو للکار کر دھمکا بھی سکتے ہیں۔ اب صرف یہ واحد چٹان ہی نہیں بلکہ بلوط کا وہ بڑا درخت جو پہاڑی کے قدموں میں واقع ہے، اس میں بھی تو روح کا مسکن ہے۔ بلوط کا درخت ہی نہیں بلکہ وہ ندی جو پہاڑی سے نکلتی ہے، وہ بھی زندہ جاوید ہے۔ فلاں چشمہ، وہ جنگل، بوٹیوں کا وسیع میدان، پگڈنڈیاں، کھیتی میں سوراخ نکالنے والی چوہیا، بھیڑیے اور کوے بھی روحوں کے مالک ہیں۔ مظاہر پرستوں کی دنیا میں صرف اشیاء اور جاندار ہی روحوں

کے حامل جی دار نہیں ہوتے۔ غیر مادی وجود بھی روحوں کا مسکن ہوسکتے ہیں۔ مثلاء، مر جانے والے آدمیوں اور جانوروں کی روحیں، غیر مرئی دوست اور بد خواہ مخلوقات، بھوت، پریت، پریاں اور معصوم فرشتے وغیرہ بھی وجود رکھتے ہیں۔۔۔

مظاہر پرستوں کا ماننا ہے کہ انسان اور دوسری مخلوقات کے بیچ کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ انسان ان روحانی مخلوقات کے ساتھ بات چیت کر، گانے گا، رقص میں جھوم اور رسومات ادا کر کے براہ راست رابطہ قائم کر سکتے ہیں۔ مثلاً ایک شکاری، ہرنوں کے گلے کو زیر لب یا با آواز بلند مخاطب کر کے، ان میں سے کسی ایک ہرن کی روح کو انسانی خوراک کے لیے قربان ہونے کی درخواست کر سکتا ہے۔ اگر شکار کامیاب رہا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ شکار ہو جانے والے ہرن کی روح نے آدمی کی بات سن کر خود کو قربان کرنے کی سعی کر لی تھی۔ اب شکاری کے لیے بھی لازم ہے کہ وہ اس مردہ ہرن کی روح سے اول معافی مانگے اور پھر اس کا شکر گزار رہے۔ جب کوئی شخص بیمار پڑ جاتا تو ایک شمن یا عطائی روحوں کو بلا بھیج سکتا تھا اور بیماری کے خلاف مدد کی درخواست کر سکتا تھا تا کہ بیماری کو ڈرا دھمکا کر بھگایا جا سکے۔ اگر ضرورت پڑتی تو یہ عطائی دوسری اور طرح طرح کی روحوں کی مدد بھی طلب کر سکتا تھا۔

مظاہر پرستی کے تحت رابطے کے اس سارے طرز میں سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ جن مرئی اور غیر مرئی مخلوقات کو بلاوا بھیجا جاتا، وہ مقامی اور مخصوص موقع سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان میں سے کوئی بھی روح، مخلوق یا وجود آفاقی خدا نہیں ہوتی۔۔۔ بلکہ کوئی مخصوص ہرن، درخت، چشمہ، ندی، پہاڑ یا بھوت اور پریت اور اس کی روح مراد ہے۔

مظاہر پرستی میں جس طرح انسانوں اور ان مخلوقات کے بیچ کسی قسم کی رکاوٹ حائل نہیں ہوتی تو لازمی طور پر کوئی مخصوص درجہ بندی بھی نہیں ہوتی۔ اس سے مراد یہ ہے کہ غیر انسانی وجود اور مخلوقات صرف اس لیے وجود نہیں رکھتے کہ وہ انسانی ضروریات اور خواہشات کو پورا کرتے رہیں۔ لیکن یہ وجودات، یہ مخلوقات طاقتور خدا بھی نہیں ہیں جو اپنی مرضی، منشاء اور خواہش کے مطابق دنیا کا کاروبار چلانے پر قدرت رکھتے ہوں۔ روحیت کا تصورات میں یہ بھی شامل ہے کہ یہ دنیا، انسانوں اور نہ ہی ان دوسری طرح کی باقی سبھی مخلوقات اور وجودات کے گرد گھومتی ہے۔

مظاہر پرستی یا روحیت کوئی مخصوص مذہب نہیں ہے بلکہ یہ سرے سے مذہب ہی نہیں ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ مظاہر پرستی سب مذاہب کی بنیاد میں گندھا ہوا ایک اساسی انسانی فلسفہ ہے۔ یہ تاریخ بھر میں پائے جانے والے مذاہب، فرقوں اور عقائد کا عمومی نام قرار دیا جا سکتا ہے۔ ان سارے مذاہب، عقائد، دھرموں اور طریق کو یوں بھی مظاہر پرستی یا روحیت کے فلسفے میں مجتمع کیا جا سکتا ہے کیونکہ یہ تصور یا فلسفہ دنیا اور مافیہا سے عمومی طور پر انتہائی قریب اور اس دنیا میں انسان کے مقام کا تعین کرتا ہے۔ قدیم تاختی آدمیوں کے بارے یہ کہنا کہ وہ غالباً مظاہر پرست ہوا کرتے تھے، ایسا ہی جیسے ہم جدید دور سے قبل کے زراعت پیشہ دہقانوں کے بارے کہہ سکتے ہیں کہ وہ زیادہ تر 'خدا پرست' تھے۔ خدا پرستی کا تصور یہ ہے کہ دنیا۔۔۔ بلکہ کائنات میں غیر مرئی ایک ایسا نظام موجود ہے جو درجہ بندی پر قائم

ہے۔ اس نظام میں کئی غیر مرئی لیکن سماوی وجودات کا ایک چھوٹا سا گروہ پایا جاتا ہے جس کا انسان کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ ان وجودات یا ذاتوں کو خداؤں کا نام دیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے یہ کہنا بالکل درست ہے کہ جدید دور سے قبل کے زرعی معاشرے بجا طور پر 'خدا پرستی' کے قائل تھے لیکن یہ اصطلاح کسی بھی طور مخصوص عقائد کا کچھ پتہ نہیں دیتی بلکہ یہ ایک عمومی تصور ہی گردانا جائے گا۔

مثال کے طور پر 'خدا پرستی' کے عام تصور کے قائل تو اٹھارہویں صدی پولینڈ میں بسر رکھنے والی یہودی اور سترھویں صدی میں چڑیلوں کو جلانے کے قائل میساچوسٹس کے تطہیری بھی ہیں۔ پندرھویں صدی کے آزٹک قبائل، بارہویں صدی ایران کے صوفی درویش، دسویں صدی کے وائکنگ جنگجو، دوسری صدی کے رومی لشکر اور پہلی صدی کے چینی بیورو کریٹ۔۔۔ یہ سبھی خدا پرست تھے۔ ان میں سے ہر فرقہ اور گروہ دوسروں کے عقائد اور تصورات کو فضول، جھاڑ منتر اور بدعت ہی سمجھتا تھا۔ قدیم دور کے مظاہر پرستی پر مبنی تصورات بھی 'خدا پرستوں' کی ہی طرح گونا گوں رہا کرتے تھے اور ان کے بیچ تفرقات اور تفاوت بھی اتنی ہی بڑی ہوا کرتی تھی۔ ان کے مذہبی تجربات یقینی طور پر اسی طرح پر آشوب اور ہنگامہ خیز رہا کرتے ہوں گے جیسے کہ آج بھی ہم دیکھتے ہیں۔ اس دور میں بھی جی بھر کر اختلافات، نزاع، اصلاحات کا چرچا اور انقلابوں کا دور دورہ رہتا ہو گا۔

لیکن یاد رہے کہ اس ضمن میں ہم انہی محتاط اندازوں اور قیاس تک اپنا نکتہ نظر قائم کر سکتے ہیں۔ اس سے زیادہ اور بڑھ چڑھ کر مظاہر پرستی بارے رائے قائم کرنا یا روحیت کی تفصیلات مفروضوں اور گھڑی ہوئی باتوں سے زیادہ کچھ نہیں ہوں گے۔ اس ضمن میں اول تو کوئی ثبوت ہی موجود نہیں ہے اور قدیم آثار جیسے مصنوعات اور پتھر سے بنے اوزار و ہتھیار وغیرہ کی جو محدود تعداد دستیاب ہے، ان پر طرح طرح بلکہ لاتعداد طریقوں سے تشریحات اور توضیحات قائم کی جا سکتی ہیں۔ اس ضمن میں حتمی، بہر حال کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ مثال کے طور پر ایک نمونے۔۔۔ 'شیرنما آدمی' کی مورتی سے آپ کس کس طرح اور کیسی کیسی توضیحات ہیں جو نہیں نکال سکتے؟ چنانچہ محققین کے تمام نظریے جو قدیم تاختی آدمی کے تصورات، احساسات اور روحانیت بارے جاننے کا دعویٰ کرتے ہیں، وہ زیادہ تر ان محققین کے اپنے ذہنوں کی اختراعات ہوتی ہیں، پتھر کے زمانے میں پائے جانے والے عقائد اور تصورات کا ان سے عین ممکن ہے، دور دور تک کوئی تعلق نہ ہو۔

قدیم دور کی باقیات جو چھچھوندروں نے ادھیڑ رکھی ہیں، غاروں میں ملنے والے انسانی ہاتھوں کی رنگدار چھاپ، ہڈیوں کے ڈھانچوں وغیرہ سے نظریات اور تشریحات کا پہاڑ کھڑا کرنے سے بہتر ہے کہ ہم نہایت خندہ پیشانی سے یہ مان لیں کہ قدیم تاختی معاشروں میں پائے جانے والے مذہبی تصورات بارے ہماری جانکاری اور علم نہایت محدود ہے۔ ہم دستیاب ثبوتوں کی بنیاد پر یہ اخذ کر لیتے ہیں کہ اس زمانے میں انسان مظاہر پرست ہوا کرتے تھے لیکن صرف یہ کافی نہیں ہے۔ ہمیں یہ علم نہیں ہے کہ اس دور کا آدمی کس کس روح کی پوجا کرتا تھا؟ تہوار کونسے ہوتے تھے؟ یا پھر، ان کے یہاں کس طرح کی ممانعت پائی جاتی تھی؟ سب سے اہم یہ ہے کہ ہمیں علم نہیں کہ وہ اس

ضمن میں کس طرح کے قصوں، حکایتوں اور مفروضوں پر یقین رکھتے تھے؟ تاریخ انسانی کو صحیح معنوں میں جان لینے کے لیے یہ ہماری سمجھ اور بوجھ میں سب سے بڑا شگاف ہے۔

قدیم آدمی کے تاختی معاشروں میں پائے جانے والے سیاسی اور سماجی نظریات بارے بھی ہم تقریباً کچھ نہیں جانتے۔ جیسا کہ مندرجہ بالا سطور میں بیان کیا گیا ہے، اس ضمن میں بھی محققین تو انتہائی بنیادی معاملات پر بھی متفق نہیں ہیں۔ مثال کے طور ذاتی جائیداد رکھتے تھے یا نہیں؟ آیا اس دور میں مربوط گھرانوں کا تصور تھا یا برادریوں اور تعلقوں کا دور دورہ تھا؟ ہم حتمی طور پر کچھ نہیں جانتے۔ یہ عین ممکن ہے کہ ہر جگہ، ہر دور میں اور ہر قبیلے اور کنبے کی اپنی مختلف روایات اور انتہائی جدا گانہ سیاسی اور سماجی ڈھانچے رہے ہوں گے۔ بعض جگہوں پر بن مانسوں کی ہی طرح تند خو اور پر تشدد سرداری کا تصور پایا جاتا ہو گا اور دوسرے مقامات پر آدمی کے گروہوں میں بونوبو کی طرح امن پسندی اور اطمینان کا دور دورہ رہتا ہو گا؟

7 پندرہ سے بیس ہزار سال پرانی مصوری جو لاس کا کس غار سے دریافت ہوئی۔ اس فن پارے میں ہم کیا دیکھتے ہیں اور اس کا مطلب کیا ہے؟ بعض کا خیال ہے کہ ہمیں ایک مرد نظر آرہا ہے جس کا سر پرندے کا ہے اور عضو تناسل تنا ہوا ہے۔ اس شخص کو ایک جنگجو قتل کر رہا ہے۔ اس شخص کے نیچے ایک دوسرا پرندہ ہے جس کا مطلب شاید روح کی علامت ہو جو موت کے وقت اس کے جسم سے الگ ہو رہی ہے؟ اگر ایسا ہی ہے تو پھر یہ فن پارہ کسی شکار کے دوران حادثے کی ترجمانی نہیں کر رہا بلکہ اس دنیا سے اگلی میں ترسیل کی شبیہ ہے۔ لیکن ہمیں ان اندازوں کو سچ ثابت کرنے کے لیے کوئی بھی صورت مہیا نہیں ہے۔ وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ آیا یہ درست بھی ہے کہ نہیں؟ یہ مفروضے بھی ہم نے اس فن پارے پر تحقیق کے بعد پالے ہیں لیکن اس سے ہمیں قدیم تاختی آدمیوں کے عقائد بارے کچھ نہیں پتہ چلتا۔

1955ء میں روس کے علاقے سونگیر نامی آثار قدیمہ دریافت ہوئے تھے۔ یہ تیس ہزار سال پرانے ایسے معاشرے کی باقیات ہیں جو میمتھ ہاتھیوں کا شکار کیا کرتے تھے۔ ایک قبر میں انھیں پچپن سالہ آدمی کا ڈھانچہ ملا تھا جو ہاتھی دانت سے بنائے گئے منکوں کے ہار میں لپٹا ہوا تھا۔ اس ہار میں تین ہزار منکے جڑے ہوئے تھے۔ مردہ آدمی کے سر پر ایک تاج نما سرپوش کلاہ تھا جس کو لومڑ کے دانتوں سے سجایا گیا تھا۔ اس کی کلائیوں پر ہاتھی دانت سے بنے پچیس کڑے پہنائے گئے تھے۔ انہیں آثار میں دریافت ہونے والی باقی قبروں میں انسانی ڈھانچوں کے گرد اس سے کہیں کم چیزیں لپٹی ہوئی ملی ہیں۔ اسی بناء پر محققین نے اندازہ لگایا کہ سونگیر کا یہ معاشرہ رتبے، درجوں اور سرداری نظام پر قائم تھا۔ وہ شخص جس کی قبر میں بہت سامال اور زیبائش کا سامان بھی دریافت ہوا تھا، غالباً اپنے کنبے بلکہ کئی کنبوں پر مشتمل بڑے قبیلے کا سردار تھا۔ یہ خلاف قیاس ہے کہ اس زمانے میں چند آدمیوں کا ایک چھوٹا سا کنبہ اپنے بل بوتے پر اتنا زیادہ زیبائش اور آرائش کا سامان جمع کر پاتا جو بالآخر سردار کے ساتھ دفن ہو گیا۔

8 تاختی آدمیوں نے ہاتھوں کے یہ نقش نو ہزار سال پہلے، ارجنٹائن کے 'ہاتھوں کے غار' میں بنائے تھے۔ ان کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے جیسے اس دور کے آدمی، ہاتھ بڑھا کر اس چٹان میں سے ہم تک پہنچنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ قدیم تاختی معاشرے کی زبردست اور دلچسپ شبیہ ہے لیکن کوئی نہیں جانتا کہ آخر اس کا مطلب کیا ہے؟

آثار قدیمہ کے ماہرین کو تبھی اس سے بھی کہیں زیادہ دلچسپ مقبرہ ملا۔ اس مقبرے میں دو انسانی ڈھانچے، سر جوڑے دفن پائے گئے۔ ان میں سے ایک لڑکے کا ڈھانچہ تھا جو قریباً بارہ یا تیرہ سال کی عمر کا رہا ہو گا۔ دوسرا ڈھانچہ ایک لڑکی کا تھا جو نو یا دس سال کی تھی۔ لڑکے کے ڈھانچے پر پانچ ہزار ہاتھی دانت سے بنے منکے لپٹے ہوئے تھے۔ اس کے سر پر بھی لومڑ کے دانتوں سے سجایا گیا سرپوش کلاہ تھا اور

کمر کے ساتھ بندھے دستے پر ڈھائی سو لومڑوں کے دانت پائے گئے۔ (اتنی تعداد میں دانت جمع کرنے کے لیے کم از کم ساٹھ لومڑ در کار رہے ہوں گے)۔ لڑکی کا ڈھانچہ پانچ ہزار دو سو پچاس ہاتھی دانت سے بنے منکوں میں لپٹا ہوا تھا۔ ان دونوں بچوں کے ڈھانچوں کے ارد گرد کئی مورتیاں اور ہاتھی دانت سے بنی کئی دوسری اشیاء بھی پائی گئیں۔ ایک متعد اور قابل دستکار (مرد یا عورت!) کو محتاط اندازے میں ہاتھی دانت سے بنائے گئے ایک منکے کو تیار کرنے میں اوسط پینتالیس منٹ در کار ہوتے ہوں گے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو دس ہزار منکوں سے آراستہ اس تکفین کو ممکن بنانے کے لیے، جس میں دوسرے اشیاء شامل نہیں ہیں۔۔۔ قریباً پچھتر ہزار گھنٹوں کی نفاست اور باریکی سے کی گئی محنت در کار تھی۔ ماہر اور نہایت قابل دستکاروں کے لیے یہ کم از کم بھی تین برس پر محیط عرصے کی محنت تھی۔

یہ بھی خلاف از قیاس ہے کہ اتنی چھوٹی سی عمر میں ان دو سونگیر بچوں کا رتبہ اس میمتھ ہاتھیوں کے شکاری قبیلے کے سردار کا رہا ہو۔ اس ضمن میں صرف اور صرف ثقافتی اور عقائد پر مبنی دلائل ہی بچ رہتے ہیں جو ان دونوں بچوں کی اس قدر شاندار اور بے حد مسرف پر مبنی تدفین کا پتہ دیتے ہیں۔ ایک نظریہ تو یہ ہے کہ ان کا یہ رتبہ، اپنے والدین کی وجہ سے تھا۔ غالباًیہ دونوں بچے قبیلے کے سردار کی اولاد تھے۔ یعنی، یہ ایسی ثقافت کی نشاندہی ہے جہاں خاندانوں کا کرشماتی کردار یا نسل در نسل اقتدار کی منتقلی کے سخت اصول پائے جاتے تھے۔ دوسرے نظریے کے مطابق عین ممکن ہے کہ یہ دونوں بچے پیدائش کے ساتھ ہی کسی قدیم زمانے سے تعلق رکھنے والی اس قبیلے کی محافظ روح کی تجسیم یا کسی آتما کا اوتار قرار دے دیے گئے ہوں۔ تیسرا نظریہ یہ ہے کہ غالباًان دونوں بچوں کی اس طرح تدفین، زندگی اور معاشرے میں ان کے مقام نہیں بلکہ ان کے مرنے کے انداز کی مظہر ہو؟ عین ممکن ہے کہ انھیں اپنے قبیلے کے شعائر کے مطابق بلی چڑھادیا گیا ہو؟ کیا پتہ انھیں قربان کر دیا گیا ہو؟ غالباًیہ شعائر بھی قبیلے کے سردار کے ساتھ ساتھ اس طرح دو نابالغ بچوں (لڑکا اور لڑکی) کو دفن کرنے سے متعلق ہوں؟ سردار کے ساتھ، اس طرح دو بلی چڑھے بچوں کو حالات کے مطابق نہایت ٹھسے اور شان و شوکت سے دفنانے کا رواج پایا جاتا ہو؟

اس میں بھلے کوئی بھی نظریہ سچا ہو، یہ تو طے ہے کہ تیس ہزار سال پہلے سونگیر بچوں کے ڈھانچے اور نمودی تدفین سے اس قدیم زمانے کے آدمی کی ان خصوصیات کا پتہ چلتا ہے جو اس نے سماجی اور سیاسی طور پر تخلیق کرنے کی غرض سے حاصل کر لی تھیں۔ یہ وہ خصوصیات ہیں جو ہمارے ڈی این اے یا جینیاتی مادے نے ہیں نہیں سکھائیں بلکہ یہ تو انسانی انواع میں کسی بھی دوسرے نوع اور جانوروں میں پائے جانے والے واقعاتی رویوں اور طرز عمل سے بھی بہت ہی آگے کی بات تھی۔

جنگ یا امن؟

قدیم دور کے آدمی، یعنی تاختی معاشرے کے بارے میں ایک آخری اور سب سے کٹھن سوال اس دور میں جنگوں کے کردار سے متعلق ہے۔ بعض محققین اس ضمن میں قدیم تاختی معاشروں کو جنت کی طرح پر امن تصور کرتے ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ جنگ اور جدل زرعی انقلاب برپا ہونے کے بعد شروع ہوئے۔ تشدد نے اس لیے جنم لیا کیونکہ لوگ ذاتی جائیدادیں اور مال و دولت جمع کرنے کے عادی ہو گئے تھے۔ دوسرے محققین کا خیال ہے کہ قدیم دور کے تاختی معاشرے بے انتہا اور غیر معمولی طور پر سخت اور سفاک واقع ہوئے تھے۔ ان دونوں تصورات کے حامل دراصل ہوا میں قلعے بنا رہے ہیں۔ ان کی تحقیق کے پیچھے بھی ناکافی اور چند قدیمی آثار سے متعلق مشاہدات اور جدید دور میں بچ رہنے والے تاختی آدمیوں کے قبیلوں سے متعلق تحقیق کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔

یہ درست ہے کہ دریافت ہونے والے قدیم دور کے آثار حیرت زدہ کر دینے والے ہیں لیکن خاصے مبہم اور دقت طلب بھی ہیں۔ آج کے تاختی اور خانہ بدوش قبیلے زیادہ تر باقی دنیا سے کٹ کر دور دراز، دشوار ترین علاقوں جیسے کلہاری صحرا یا قطب شمالی میں بسر رکھتے ہیں۔ یہ ایسے علاقے ہیں جہاں انسانی آبادیاں انتہائی کم ہیں۔ مراد یہ ہے کہ انھیں دوسرے لوگوں کے ساتھ لڑائی، جنگ اور جدل کرنے کی کوئی ضرورت ہی پیش نہیں آتی۔ علاوہ ازیں یہ کہ حالیہ دہائیوں میں یہ خانہ بدوش اور تاختی معاشرے جدید ریاستوں کے حکام کے لیے سیاسی طور پر بے انتہا اہمیت کا سامان بن گئے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ان تاختی معاشروں کی حتی الامکان حفاظت کا بندوبست کیا جاتا ہے اور ان کے علاقوں میں بڑے پیمانے پر تنازعات اور جھگڑوں کے پھوٹنے سے بچانے کے لیے ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے۔
یورپی محققین کو اس سارے عرصے اور حالات میں صرف دو ہی طرح کے آزاد اور خود مختار تاختی معاشروں میں بڑے پیمانے اور بڑی بڑی آبادیوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ ان میں سے ایک انیسویں صدی میں شمالی امریکہ کے شمال مغربی حصے میں آباد ریڈ انڈینز اور دوسرے انیسویں و بیسویں صدی کے دوران شمالی آسٹریلیا میں بسنے والے براعین یا آسٹریلیائی آدی باشندے ہیں۔ ان دونوں قدیم تاختی معاشروں میں مسلح لڑائی اور تنازعات بکثرت پائے جاتے تھے۔ تاہم یہ حقیقت قابل بحث ضرور ہے کہ یہ ان معاشروں میں پہلے سے، یعنی ابدی طور پر پایا جانے والا طبعی حال تھا یا یہ یورپی نو آباد کاروں کے مدخل ہونے کا اثر تھا؟

اس ضمن میں تاریخی آثار نہایت ناکافی اور انتہائی غیر مبہم ہیں۔ ویسے بھی، دسیوں ہزار سال پہلے ہوئی جنگ کے آج بتانے لائق کیا باقیات رہ گئی ہوں گی؟ اس زمانے میں قلعہ بند دیواریں کھڑی کرنے کا تصور نہیں تھا۔ آرٹلری کے گولے تو چھوڑو۔۔۔ یہاں تک کہ تلواریں اور ڈھالیں بھی نہیں تھیں۔ قدیم زمانے میں برچھیاں ہوتی تھیں۔۔۔ کیا پتہ وہ جنگ اور لڑائی میں استعمال ہوتی ہوں لیکن وہ زیادہ تر شکار اور جڑیں کھودنے کے لیے ہی استعمال ہوتی تھیں۔ اسی طرح انسانی ہڈیوں کی باقیات سے بھی کچھ خاص پتہ نہیں چلتا۔ ٹوٹی

ہوئی ہڈیوں کی نشاندہی تو ہوتی ہے لیکن فریکچر اور توڑ پھوڑ سے یہ تو پتہ نہیں چلتا کہ آیا ایسا جنگ اور لڑائی میں ہوا تھا یا کوئی حادثہ پیش آ گیا تھا؟ اسی طرح وہ جگہیں جہاں انسانی ہڈیوں کی باقیات میں فریکچر اور توڑ پھوڑ کے ثبوت نہ ہونے کا یہ حتمی مطلب بھی نہیں ہے کہ اس شخص کا قبیلہ یا وہ خود زندگی بھر غیر متشدد معاشرے میں بسر کرتا رہا ہے؟ اور اس کی موت کسی پر تشدد کاروائی کا نتیجہ نہیں ہے؟ اس کی موت تو پٹھوں اور ضروری اعضاء میں شدید زخم، بہت زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے بھی تو واقع ہو سکتی ہے اور ہڈیوں پر ایک خراش بھی نہ آئی ہو؟ اس ضمن میں سب سے اہم بات یاد رکھنے کی یہ ہے کہ زرعی اور صنعتی ادوار میں لڑی گئی شدید جنگوں کے نتیجے میں نوے فیصد سے زیادہ اموات جنگوں اور لڑائیوں میں لڑنے کی وجہ سے نہیں بلکہ جنگ کے نتیجے میں پیدا ہونے والے حالات جیسے بھوک، افلاس، محتاجی، سرد موسم سے عدم بچاؤ اور بیماری کے سبب ہوتی رہی ہیں۔ ذرا سوچیے، آج سے تیس ہزار سال قبل ایک قبیلے نے اپنے پڑوسی قبیلے کو لڑائی میں شکست دے کر میدانوں اور جنگلوں پر خود قبضہ کر کے دوسروں کو علاقہ بدر ہونے پر مجبور کر دیا ہو۔ حتمی لڑائی میں شکست خوردہ قبیلے کے دس لوگ بھی قتل کر دیے گئے ہوں۔ اس سے اگلے برس، علاقہ بدر ہونے والے قبیلے میں موسم کی سختی، بھوک اور بیماری کے سبب کئی سو لوگوں کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ آثار قدیمہ کے ماہرین ان بھوک کے مارے ہوئے انسانی ہڈیوں کی باقیات دریافت کرتے ہیں تو نہایت آسانی سے طے کر سکتے ہیں کہ ان سینکڑوں لوگوں کی موت کا سبب ضرور کوئی نہ کوئی قدرتی آفت رہی ہو گی۔ اب کوئی یہ کیسے ثابت کر سکتا ہے کہ ان بیچاروں کی موت کا اصل سبب تو دراصل بے رحم جنگ اور لڑائی کا نتیجہ ہے۔

اب چونکہ ہم باقاعدہ طور پر محتاط ہو چکے ہیں تو بھلے قدیم دور کے آثار کو زیر بحث لا سکتے ہیں۔ پرتگال میں ایک جگہ پر کچھ باقیات دریافت ہوئیں۔ ان باقیات میں تقریباً چار سو انسانی ہڈیوں کے ڈھانچے شامل تھے، جو زرعی انقلاب کے دور سے کچھ ہی عرصہ پہلے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان چار سو انسانی ہڈیوں کے ڈھانچوں میں صرف دو ایسے ڈھانچے تھے جن پر صاف صاف تشدد کے نشانات پائے گئے۔ اسی طرح کی ایک دوسری تحقیق کے دوران، اسی دور سے تعلق رکھنے والے اسرائیلی علاقوں میں بھی لگ بھگ چار سو ہی انسانی ڈھانچے ایک ہی جگہ پر دریافت ہوئے۔ ان چار سو انسانی ڈھانچوں کی باقیات دریافت ہوئیں۔ ان چار سو ڈھانچوں میں فقط ایک ہی کھوپڑی ایسی ملی تھی جس پر تشدد کے نشانات تھے، ان نشانات کو انسانی تشدد کے زمرے سے منسوب کیا جا سکتا ہے۔ ایک تیسری جگہ پر بھی قریباً اتنی ہی تعداد میں ڈھانچے دریافت ہوئے تھے۔ یہ یورپ کی ڈینیوب وادی ہے جہاں ملنے والے لگ بھگ چار سو ڈھانچوں میں اٹھارہ کی باقیات سے پتہ چلتا ہے کہ وہ یقیناً پر تشدد کاروائی کے نتیجے میں جان سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ چار سو ڈھانچوں میں صرف اٹھارہ، سطحی طور پر بڑی تعداد نہیں لگتی لیکن اصل میں یہ اچھی خاصی شرح کو ظاہر کرتی ہے۔ مراد یہ ہے کہ اندازتاً قدیم زمانے کی ڈینیوب وادی میں ساڑھے چار فیصد اموات کا سبب انسانی تشدد رہا تھا۔ آج کے جدید دور میں، جب جنگ اور جرائم کی بہتات رہتی ہے۔۔۔ انسانی تشدد کے نتیجے میں ہونے والی اموات کی پوری دنیا میں شرح اوسطاً ڈیڑھ فیصد ہے۔ بیسویں صدی میں یہ انسانی تشدد کے نتیجے میں ہونے والی اموات کی شرح پانچ فیصد تھی۔ یاد

رہے،بیسویں صدی میں تاریخ کی سب سے بڑی اور عظیم جنگیں برپا ہوئیں اور تاریخ میں سب سے بڑے پیمانے پر نسل کشی کے واقعات دیکھے گئے۔ اگر یہ انکشاف اشاریہ مقرر ہو تو اس لحاظ سے قدیم دور کی ڈینیوب وادی،بیسویں صدی کی جدید دنیا جتنی ہی پر تشدد رہی تھی۔

ڈینیوب کی قدیم وادی کی یہ افسوسناک دریافت،اس نوعیت کی واحد دریافت نہیں ہے۔ اس طرح کی افسردہ کر دینے والی دریافتیں دوسرے علاقوں میں بھی ہوئی ہیں۔ سوڈان کے علاقے جبل صحابہ میں بارہ ہزار سال پرانے قبرستان کے آثار نکلے ہیں۔ اس قبرستان میں انسٹھ انسانی ڈھانچے دریافت ہوئے ہیں۔ ان میں سے چوبیس ڈھانچوں کے ارد گرد برچھیوں،نیزوں اور تیروں کی باقیات بھی ملی ہیں۔ یہ برچھیاں،تیر اور نیزے بعض ڈھانچوں میں پیوست تھے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو اس قبرستان میں تشدد کے نتیجے میں مر کر دفن ہونے والوں کی شرح چالیس فیصد تک بنتی ہے۔ ایک عورت کے ڈھانچے پر تو بارہ جگہوں پر ہڈی ٹوٹنے اور گہرے زخموں کے نشانات پائے گئے۔ جرمنی کے علاقے باواریا میں غاروں کے ایک جال میں آثار قدیمہ کے ماہرین اٹھتیس تاختی آدمیوں کی باقیات دریافت کیں۔ ان میں زیادہ تر ڈھانچے عورتوں اور بچوں کے تھے۔ ان باقیات کے محل و وقوع اور حالت سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالباً انھیں موت کے ان کنوؤں میں جیتے جی دفن ہونے کے لیے چھوڑ دیا گیا تھا۔ یہی نہیں بلکہ ان میں سے آدھے ڈھانچوں،جن میں بچوں اور شیر خواروں کے ڈھانچے بھی شامل تھے۔۔۔ ان پر انسانی ہتھیاروں جیسے چاقوؤں اور سونٹیوں سے ضرر پہنچانے کے صاف صاف نشانات تھے۔ ان میں سے چند ڈھانچے جو بالغ اور جوان مردوں کے تھے،ان پر سب سے زیادہ اور بہیمانہ تشدد کے نشانات واضح ہیں۔ یہاں ملنے والی باقیات سے صاف اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ایک پورے کے پورے تاختی کنبے یا گروہ کو اس غار میں چن چن کر نہایت بے رحمی کے ساتھ ہلاک کر دیا گیا تھا۔

قدیم زمانے کے تاختی آدمی کی دنیا کی اصل اور واقعی شکل کس تصویر سے ظاہر ہوتی ہے؟ کیا یہ ایسی دنیا تھی جہاں اسرائیل اور پرتگال میں سکون اور آسودگی میں مر جانے والوں کے ڈھانچے ملے ہیں یا وہ دنیا سوڈان اور جرمنی کے ذبیحہ خانوں جیسی تھی؟ اس کا جواب،ان دونوں میں سے ایک بھی نہیں ہے۔ جس طرح قدیم دور کے تاختی اور شکاری آدمیوں کے یہاں عقائد،شعائر،ثقافتوں اور سماج کی رنگا رنگی ہوا کرتی تھی۔۔۔ ویسے ہی تشدد کی شرح اور جنگ وجدل کی موجودگی کا پتہ بھی طرح طرح اور قسم قسم شکلوں میں ملتا ہے۔ بعض علاقوں میں،مختلف ادوار کے دوران اگر امن اور آسودگی کا دور دورہ تھا تو دوسری جگہوں پر شدید لڑائیاں اور تنازعات پنپتے رہتے تھے۔

خاموشی کی چادر

اگر قدیم دور کے آدمی کی زندگی کا بڑا حصہ دوبارہ سے کھڑا کر کے واقعی دیکھنا ممکن نہ بھی ہو تو پھر بھی بعض مخصوص حالات و واقعات ایسے بھی ہیں جو واقعی اور صحیح معنوں میں ناقابل تردید ہیں۔ جب خردمند آدمی کے پہلے گروہ نے نینڈرتھل کی آبائی وادی میں قدم رکھا ہو گا تو وہ کیسا منظر ہو گا؟ اس دن کے بعد اگلے سینکڑوں برسوں تک طرح طرح کے تاریخی واقعات رونما ہوتے رہے ہوں گے۔ بدقسمتی سے ان تاریخی حالات اور واقعات کی نسبت سے آج ہمیں سرے سے کچھ بھی مشاہدے کے لیے دستیاب نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ چند ہڈیاں اور مٹھی بھر پتھر سے بنے اوزار مل جاتے ہیں لیکن یہ ساری باقیات مل کر کسی بھی طور محققین کے جستجو سے بھرے، کڑے اور تشنہ سوالوں کا جواب نہیں دیتیں۔ ہم ان باقیات سے اس دور میں انسانی ڈیل ڈول، ٹیکنالوجی، خوراک اور کسی حد تک غالباً سماجی ڈھانچے کے بارے جان سکتے ہیں لیکن ان باقیات سے کسی طور بھی سیاسی اطوار اور عالم ارواح، عقائد اور شعائر کا تسلی بخش جواب نہیں ملتا۔ ہمیں ان مداریوں، جادو اور فسوں گروں کے بارے پتہ نہیں چلتا جنھوں نے مفروضوں، حکایات اور قصوں کی بنیاد پر قبائل کے سرداروں کو ہاتھی دانتوں سے منکے بنا کر ان کے ساتھ دفن ہونے پر قائل کر لیا تھا۔

خاموشی کی یہ چادر تاریخ انسانی کے دسیوں ہزار سالوں پر انتہائی سختی کے ساتھ تنی ہوئی ہے۔ ایک کے بعد دوسرے ہزاریے، ہر ہزاریے میں یقیناً جنگیں اور انقلاب برپا ہوئے ہوں گے۔ ہم نہیں جانتے لیکن عین ممکن ہے کہ مذہبی اور سیاسی تحریکیں چلی ہوں، اس دور میں بھی نہ جانے کون کون سے فلسفیانہ نظریے پائے جاتے تھے۔ کیسے کیسے شاہکار، جمالیاتی شہ پارے بنائے جاتے ہوں گے؟ اس دور کے آدمیوں کے یہاں بھی ان کا اپنا کوئی نپولین رہا کرتا ہو گا جو چھوٹی سی کسی ریاست سے نکل کر بڑی بڑی فتوحات کرنے کی دھن میں مارا مارا پھرتا ہو گا۔ ان کے یہاں بھی خداداد صلاحیتوں کے مالک کئی لڈوگ بیتھوون رہے ہوتے ہوں گے۔۔۔ جنھیں پورے پورے آرکسٹرا تو دستیاب نہیں تھے لیکن ان کی بانس سے بنی بانسریوں سے نکلنے والے سر سن کر لوگوں کی آنکھوں میں آنسو تیر جاتے ہوں گے۔ وہ دنیا کیسے کیسے گوہر اور پیغامبروں کا گھر رہی ہو گی جو آفاقی خداؤں کا پیغام تو نہ سہی لیکن شاہ بلوط میں مسکن رکھنے والی روح کا پیغام لوگوں تک ضرور پہنچاتے ہوں گے۔ وہ آخر کیسا جہاں ہوتا ہو گا؟ ہم تخیل میں اس دنیا کے بارے تو سوچ سکتے ہیں لیکن اس دنیا کے بارے ہماری ہر سوچ قیاس اور اندازے سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ تاریخ کے اس دور پر تنی ہوئی خاموشی کی یہ چادر اتنی دبیز اور موٹی ہے کہ ہم اس ضمن میں، اس چادر تلے چھپی حقیقتوں کے بارے کچھ بھی تسلی اور یقینی طور پر کہنے سے قاصر ہیں۔ ہمارا المیہ تو یہ ہے کہ ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ یہ ساری چیزیں، یہ سارے حالات اور واقعات۔۔۔ اسی طرح، ہماری سوچ کے عین مطابق برپا بھی ہوئے ہوں گے۔ ان حالات اور واقعات بارے تفصیلات بتا پانا تو بہت ہی دور کی بات ہے۔

محققین کا حال بھی یہ ہے کہ وہ صرف وہی سوال پوچھتے ہیں جن کے بارے انھیں یقین ہو کہ کچھ نہ کچھ، تسلی بخش جواب مل ہی جائے گا۔ جب تک دریافت اور تحقیق کے مزید بہتر اور جدید تر اوزار، ٹیکنالوجی اور ذرائع دستیاب نہیں ہو جاتے۔۔۔ ہم غالباً کبھی بھی نہیں جان پائیں گے کہ قدیم دور کے آدمی کس کس فلسفے اور سیاسی نظریات پر یقین رکھتے تھے؟ انھیں اپنے زمانے میں کیسے کیسے معاشرتی اور سیاسی حالات کا سامنا کرنا پڑا تھا؟ اس سب کے باوجود ہمیں وہ چیدہ سوال پوچھنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرنی چاہیے جن کے جواب ملنا ابھی تقریباً ناممکن محسوس ہوتا ہے۔ ہم صرف اس وجہ سے کہ ہمیں جواب نہیں مل پائے گا۔۔۔ ستر ہزار سالہ انسانی تاریخ میں سے ساٹھ ہزار سال کو یوں ہی، اپنی معذوری کے سبب رد نہیں کر سکتے۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ، اچھا وہ قدیم دور کا آدمی؟ ارے چھوڑو۔۔۔ اس دور میں کچھ بھی خاص نہیں ہوا۔

حقیقت یہ ہے کہ اس دور کے آدمی نے بہت سے اہم کام کیے، انتہائی اہمیت کے حامل کارنامے سرانجام دیے۔ بالخصوص، اس دور کے قدیم آدمی نے اس دنیا کو وہ شکل دی ہے جس کا زیادہ تر لوگ تصور ہی نہیں کر پاتے ہیں۔ آج سائبیریا کے بے شجر میدانوں، وسطی آسٹریلیا کے صحراؤں اور ایمازون کے جنگلوں میں پیدل سفر اور مہم جوئی کر کے لوگ سمجھتے ہیں کہ شاید وہ ان بے پناہ قدیم اور براجین علاقوں میں داخل ہونے والے پہلے انسان ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ شاید یہ علاقے اس سے قبل آدمی کی آنکھوں سے اوجھل رہے ہیں۔ یہ فریب نظر ہے اور کچھ نہیں ہے۔ ہم سے پہلے، تاختی اور شکاری آدمی اپنے پورے پورے کنبوں کے ساتھ یہاں سے گزر کر، بسر کر چکے ہیں۔ انھوں نے اپنے دور میں محدود وسائل کے باوجود ان گھنے جنگلوں، بے پایاں صحراؤں، برفیلے پہاڑوں اور وسیع میدانوں پر وہ اثرات چھوڑے ہیں جن کے نتیجے میں آنے والی تبدیلیاں بیان سے باہر ہیں۔ اگلے باب میں ہم انھی تبدیلیوں اور اثرات کا جائزہ لینے کی کوشش کریں گے۔ ہم یہ جانیں گے کہ قدیم دور کے تاختی اور شکاری آدمیوں ہماری اس کرہ ارض کی ماحولیات پر پہلی زرعی بستی بسنے سے بھی بہت پہلے کس کس طرح اثرانداز ہوا تھا کہ دنیا بالکل بدل کر رہ گئی تھی۔ اس قدیم دور کا وہ آدمی۔۔۔ وہ تاختی، وہ شکاری، وہ کہانیاں، قصے اور حکایات گھڑنے والا آدمی، وہ مفروضے پالنے والا، ارواح میں یقین رکھنے والا آدمی۔۔۔ وہ خردمند آدمی ایسا ظالم جانور ہے، جو جانوروں کی تاریخ میں اس سے قبل کبھی پیدا نہیں ہوا۔

عظیم سیلاب

شعور اور آگاہی کا انقلاب برپا ہونے سے قبل تک، انسانوں کی ساری انواع افریقہ اور ایشیائی براعظموں میں بسر رکھتے تھے۔ یہ درست ہے کہ ان میں سے کچھ نے چند جزائر کو نچلے درجے کے پانیوں میں تیر کر یا چھوٹے بیڑوں پر چڑھ کر پار کر لیا تھا۔ فلوریز کے جزائر پر انسان

نے قریباً ساڑھے آٹھ لاکھ سال قبل قدم رکھ دیے تھے۔ لیکن اس کے باجود وہ کھلے سمندر میں اترنے سے قاصر رہے۔ اسی لیے کوئی بھی امریکہ، آسٹریلیا اور دور کے جزائر جیسے مداگاسکر، نیوزی لینڈ اور ہوائی تک نہیں پہنچ پایا۔

کھلے سمندر کی اس رکاوٹ نے صرف انسانوں کو ہی نہیں بلکہ دوسرے کئی افریشیائی جانوروں اور پودوں کی اقسام کو 'باہر کی دنیا' تک پہنچنے سے روکے رکھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دور دراز کے علاقوں، جیسے براعظم آسٹریلیا اور مداگاسکر میں جانور اور پودے لاکھوں سال تک کچھ اس طرح جداگانہ اور علیحدہ رنگ میں ارتقاء کے عمل سے گزرے کہ ان کی ہئیت اور فطرت افریشیائی براعظموں میں پائے جانے والے جانوروں سے یکسر مختلف تھی۔ کرہ ارض پر کئی اور ممیز ماحولیاتی نظام پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے ہر ماحولیاتی نظام کے اپنے رنگ، جانوروں اور پودوں کی جداگانہ اقسام پائی جاتی ہیں۔ خردمند آدمی، اس حیاتیاتی رنگوں، قدرت کی افرات اور ارتقاء کے کرشموں کو ختم کرنے والا تھا۔

شعور اور آگاہی کا ادراک ہوتے ہی آدمی نے نت نئی تکنیک سیکھنی شروع کی، تنظیمی قابلیت پیدا کی اور غالباً پہلی دفعہ افریشیائی براعظموں سے نکل کر باہر کی ساری دنیا میں پھیل جانے کا خواب بھی دیکھا۔ اس ضمن میں اسے سب سے اولین کامیابی پینتالیس ہزار سال پہلے ملی جب آدمی آسٹریلیا میں قدم رکھنے میں کامیاب ہو گیا۔ آج تک محققین اس کرشمے پر حیران پریشان ہیں۔ ان کے پاس اس دور کے آدمی کی اس کامیابی کو سمجھنے کی کوئی صورت نہیں ہے۔ آسٹریلیا پہنچنے کے لیے انسانوں کو سمندروں کے کئی آبی راستوں کو پار کرنا پڑا ہو گا۔ انھیں سینکڑوں کلومیٹر کی وسعت پر پھیلے ہوئے سمندر کے پار اترنا تھا اور آسٹریلیا پہنچ کر فوراً، راتوں رات ایک یکسر مختلف اور بالکل نئے ماحولیاتی نظام کے ساتھ نباہ کر کے، خود کو ڈھالنا بھی پڑا ہو گا۔

اس ضمن میں سب سے مستند نظریہ یہ ہے کہ پینتالیس ہزار سال قبل آدمیوں کے وہ گروہ جو انڈونیشیاء کے جزائر پر کافی عرصے سے موجود تھے، تاریخ میں پہلی بار ماہی گیر بستیاں اور معاشرے آباد کرنے میں کامیاب ہوئے۔ انھوں نے یہاں رہ کر سمندر میں تیرنے والی کشتیاں بنانے کا ہنر سیکھا اور طویل فاصلے تک ماہی گیری، تجارت اور کھوج کی صلاحیت حاصل کی۔ ان صلاحیتوں کے حصول سے انسانی صلاحیتوں اور طرز زندگی میں غیر معمولی حد تک تنائج دیکھنے میں آیا ہو گا۔ ایک طرح سے کہیے تو انسان کے رہن سہن اور طریق کی کایا پلٹ گئی ہو گی۔ ہر وہ ممالیہ جانور، مثال کے طور پر سگ ماہی، سمندری مانس اور ڈالفن وغیرہ نے سمندر کا رخ کیا تو انھیں ایک ارتقاء کے عمل سے گزرنے میں ایک زمانہ درکار رہا ہو گا۔ ان کے جسموں میں خصوصی اعضاء تخلیق پائے اور پانی میں زندہ رہنے کے لیے مافواحر کی اجسام میں ڈھلنا پڑا تھا۔ افریقہ کے ہرے میدانوں سے نکل کر افریقی بوزنوں کی خلف، خردمند آدمی انڈونیشیا کے جزائر پر ماہی گیر بستیاں بنا کر آباد ہوئی تو بعد اس کے وہ اپنے جسموں پر تیرنے کے لیے پیراکے اگنے اور ناک کو حیاتیاتی طور پر وہیل مچھلی کی طرح سر کے اوپر چڑھنے

کا انتظار کیے بغیر ہی ملاح بن گیا۔ ان آدمیوں نے بجائے کشتیاں ایجاد کیں اور انھیں پانی پر تیرنے کے قابل بنایا۔ یہی وہ گر اور گن تھا جس کو استعمال میں لاتے ہوئے آدمی آسٹریلیا کے ساحلوں پر جا اترا۔

یہ درست ہے کہ آثار قدیمہ کے ماہرین کو ابھی تک پینتالیس ہزار پرانی کشتیوں اور بحری بیڑوں کے آثار نہیں ملے، وہ چپو اور ماہی گیروں کی قدیم بستیاں بھی دریافت نہیں ہوئیں۔ ان اشیاء اور بستیوں کی دریافت نسبتاً مشکل بھی ہے کیونکہ اتنے طویل عرصے کے دوران سمندر کی سطح کافی اونچی ہو گئی ہے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق انڈونیشیاء کے ساحلوں پر قدیم خط ساحل اب تک کم از کم بھی ایک سو میٹر گہرے سمندر میں ڈوب چکا ہے۔

تاہم، اس کے باوجود مفصل اور ایسی واقعاتی شہادتیں موجود ہیں جو اس نظریے کی بھرپور حمایت کرتی ہیں۔ بالخصوص، یہ حقیقت تو بالکل واضح ہے کہ آسٹریلیا میں آ کر بس رہنے کے ہزاروں سال بعد آدمی نے اس براعظم کے شمال میں واقع کئی الگ تھلگ اور باقی دنیا سے کٹے ہوئے جزائر کو بھرپور طریقے سے آباد کر لیا تھا۔ ان میں سے بعض، مثال کے طور پر بوکا اور مے نس کے جزائر اور ان کے قریب ترین خشکی کے بیچ دو سو کلومیٹر وسیع و عریض، گہرا سمندر حائل ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ کوئی مے نس اور بوکا کے جزائر پر انتہائی نفیس اور سریع کشتیوں کے بغیر پہنچ پاتا۔ کشتی رانی کے فن میں مشاق ہونے کے سوا ایسا کر پانا بھی ہرگز ممکن نہیں ہے۔ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، ان اور ایسے کئی دوسرے جزائر کے بیچ میں اسی دور کی باقیات سے صاف پتہ چلتا ہے کہ آدمیوں کے بیچ سمندری راستوں کے ذریعے تجارت بھی کی جاتی تھی۔ مثال کے طور پر نیو آئرلینڈ اور نیو برٹن کے جزائر کے بیچ بر کانی شیشے کی اچھی خاصی تجارت اور نقل و حمل کی جاتی تھی۔

قدیم دور میں انسان کا آسٹریلیا کی جانب سفر اور اس میں کامیابی تاریخ کا ایک انتہائی اہم واقعہ ہے۔ یہ کولمبس کا امریکہ کی جانب سفر اور اپولو دوئم کے چاند پر اترنے جتنا اہم واقعہ ہے۔ یہ پہلی دفعہ تھی کہ کسی انسان نے افریقیائی ماحول اور اس کے نظام کو پیچھے چھوڑ کر آگے نکلنے کی جست بھری تھی۔ یہ یقیناً پہلا موقعہ تھا کہ جب خشکی پر بسر رکھنے والے کسی اتنے بڑے ممالیہ جانور نے افریقیائی براعظم سے آسٹریلیا کا کٹھن اور انتہائی دشوار گزار سفر پورا کر لیا تھا۔ سب سے اہم یہ ہے کہ انسان کے اجداد نے یہ کارنامہ جدید دنیا کی بنیاد کے طور پر سرانجام دیا تھا۔ جب تاخت اور شکار پر بسر رکھنے والے آدمی نے پہلی بار آسٹریلیا کے ساحلوں پر قدم رکھا تو یہ تاریخ میں پہلا موقع تھا کہ آدمی اچھل کر ایک مخصوص براعظم میں خوراک کی زنجیر پر سب سے اوپر براجمان ہو گیا تھا۔ اس کے بعد تاریخ گواہ ہے کہ وہ کرہ ارض پر سب سے خطرناک، تباہ کن اور مہلک نوع ثابت ہوا۔

اس وقت تک انسان نے خود کو ماحول کے مطابق ڈھالنے کی غرض سے نت نئی توافق پذیری کے اسباب اور رویوں کا مظاہرہ تو کیا تھا لیکن ارد گرد ماحول پر اس نوع کا اثر خال خال اور یونہی سا برائے نام ہی تھا۔ اب تک انسان نے نئی جگہوں، ماحول اور طبعی مسکنوں

میں بے پناہ کامیابی سمیٹی تھی لیکن وہ یہ سب ماحول اور مسکن میں تبدیلی اور بربادی کے بغیر کرتا آیا تھا۔ آسٹریلیا میں بسنے والے، بلکہ کہیے اس براعظم کے فاتحین نے یہاں پہنچ کر صرف ماحول کے ساتھ خود کو ڈھالنے کی کوشش نہیں کی بلکہ آسٹریلیا کے ماحولیاتی نظام کو یوں تاخت وراج کیا کہ اس کی ہئیت ہی بدل گئی۔ اسی وجہ سے چارا، خوراک جمع کر، کھود کر اور شکار مار کے پلنے والے انسانوں کی اس نوع، یعنی اس دور کے آدمی کو تاختی بھی کہا جاتا ہے۔

آسٹریلیا کے ریتلے ساحلوں پر انسان نے پہلا قدم رکھا تو یقیناً اگلے ہی لمحے اس قدم کے نشانات سمندر کی لہروں میں بجھ گئے ہوں گے۔ لیکن جوں جوں آدمی آگے بڑھ کر آسٹریلیا کے اندرون تک پہنچتا گیا، اس نے اپنے قدموں کے ایسے نشانات چھوڑے جو کسی بھی طرح سے بجھائے اور محو نہیں کیے جاسکتے۔ جیسے جیسے انسان نے آگے قدم بڑھائے، اس کا سامنا عجیب و غریب مخلوقات سے ہوا ہو گا۔ دو سو کلو گرام وزنی اور ساڑھے چھ فٹ اونچے کنگرو، کیسے دار شیر جو آج کے چیتوں جتنے بڑے ہوتے تھے اور اس وقت براعظم آسٹریلیا کے سب سے بڑے شکاری بھی تھے۔ کوالہ اتنے بڑے تھے کہ ان کو دیکھ کر پیار کی بجائے خوف آتا تھا اور درختوں میں سرسراتے پھرتے تھے۔ شترمرغوں کے سائز سے دو گنا بڑے، اڑنے سے معذور پرندے میدانوں میں دوڑتے پھرتے تھے۔ چھپکلیاں، ڈریگن کے سائز کی، سمور ریچھ جیسا جانور جو دو دو ٹن تک وزنی ہوتا تھا جنگلوں میں دندناتا پھرتا ہو گا۔ پرندوں اور مگرمچھوں جیسے خزندہ جانوروں کے سوا سبھی جانور کیسہ دار تھے، یعنی ان کے جسم پر تھیلیاں ہوا کرتی تھیں۔ ایسی ہی تھیلیاں جو آجکل کنگرو میں ہوتی ہیں۔ یہ سارے ممالیہ جانور چھوٹے، لاچار اور شکم مادر میں بچے کی طرح بچوں کو پیدا کرتے تھے اور پھر عرصے تک بطن کے ساتھ ان قدرتی کیسوں اور تھیلیوں میں رکھ کر انھیں دودھ پلایا کرتے تھے۔ کیسے دار ممالیہ جانور افریقہ اور ایشاء میں خال خال ہی ہوتے ہیں لیکن آسٹریلیا میں تو ان کی بہتات، بلکہ انہی کی بادشاہی تھی۔

چند ہزار برسوں کے اندر ہی، یہ سارے دیوہیکل جانور آسٹریلیا میں ناپید ہو گئے۔ اس زمانے میں آسٹریلیا میں پائے جانے والی ایسی چوبیس انواع کے جانور جن کا وزن پچاس کلو گرام سے زیادہ رہا کرتا تھا، تئیس معدوم ہو گئے۔ اسی طرح چھوٹی انواع کی کثیر تعداد بھی ختم ہو گئی۔ آسٹریلیا کے ماحولیاتی نظام میں پائی جانے والی خوراک کی زنجیر مکمل طور پر تاخت وراج ہو گئی اور ایک نئے سرے سے۔۔۔ خوراک کی زنجیر کو نئے حالات کے مطابق ڈھلنا پڑا۔ یہ لاکھوں سال کے عرصے میں آسٹریلیا کے ماحولیاتی نظام میں ڈھلنے کی سب سے اہم صورت تھی جو نظر آئی۔ اب یہ سوال پوچھنا تو بنتا ہی ہے کہ کیا یہ آدمی کی کارستانی تو نہیں تھی؟

ثابت شدہ مجرم

بعض محققین ہماری نوع کو اس الزام سے صاف صاف بری قرار دیتے ہیں بلکہ وہ اس ساری کارستانی کا موجب موسم کی خودسری کو قرار دیتے ہیں۔ عام طور پر ایسے معاملات میں موسم ہی قربانی کا بہترین بکرا ثابت ہوتا ہے۔ لیکن یہ ماننا انتہائی مشکل ہے کہ آدمی بالکل معصوم اور بے قصور ہے۔ اس ضمن میں تین ایسے شواہد ہیں جن کی بناء پر موسمی حالات کا عذر کمزور پڑ جاتا ہے۔ یہ اتنے مضبوط شواہد ہیں کہ آسٹریلیا کے قدیم دیوہیکل جانور اپنی معدومی کے جرم کی پاداش میں ہمارے اجداد کو کٹہرے میں لا کر کھڑا کر دیتے ہیں۔
سب سے پہلا ثبوت تو یہ ہے کہ اگرچہ پینتالیس ہزار سال پہلے آسٹریلیا کے موسی حالات میں کچھ نہ کچھ تبدیلی ضرور آئی ہو گی لیکن یہ اتنی بڑی نہیں تھی کہ پورے ماحولیاتی نظام کو اتھل پتھل کر کے رکھ دے۔ یہ سمجھ سے بالکل باہر ہے کہ صرف اور صرف نئے موسمی حالات اتنے بڑے پیمانے پر معدومی کا باعث بن سکتی ہو۔ آج، پینتالیس ہزار سال بعد کے دور میں یہ نہایت آسان ہے کہ کسی بھی چیز اور ہر شے کو موسمیاتی تبدیلیوں کے ساتھ جوڑ دیا جاتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ کرہ ارض کی آب وہوا اور موسم کبھی بھی پر سکون نہیں رہتے۔ یہ ہمیشہ ہی سیلان اور شدید گداز ندگی کی حالت میں رہتے ہیں۔ تاریخ میں وقوع پذیر ہونے والے سبھی اہم واقعات کے پس منظر میں ایک یا دوسری صورت موسمیاتی تبدیلیوں کا ہاتھ رہا ہی ہے۔
اس ضمن میں بالخصوص یہ جاننا لازم ہے کہ ہماری کرہ ارض تاریخ میں کئی بار سرد اور گرم ہونے کے چکر میں چلتی آئی ہے۔ پچھلے دس لاکھ سالوں کے دوران ہر لاکھ سال کے بعد برفانی دور لوٹ کر آتا ہی رہا ہے۔ اس طرح کا آخری برفانی دور آج سے پندرہ ہزار سال پہلے اور پچھتر ہزار سال کے درمیان آیا تھا۔ کسی بھی برفانی دور کے حوالے سے یہ غیر معمولی حقیقت تو نہیں ہے لیکن ہمارے لیے یہ جاننا لازم ہے کہ شدت کے لحاظ سے اس کی دو انتہائیں ہوتی ہیں۔ آخری برفانی دور کی پہلی انتہا ستر ہزار سال پہلے اور دوسری قریباً بیس ہزار سال پہلے وقوع پذیر ہوئی تھی۔ ڈیپروٹوڈون نامی دو ابھرے ہوئے دانتوں والے دیوہیکل جانور آسٹریلیا کے ماحولیاتی نظام میں پندرہ لاکھ سال قبل پیدا ہوئے اور یہ پچھلے پندرہ لاکھ برسوں میں کم از کم دس برفانی ادوار کا سامنا نہایت آسانی سے کرتے ہوئے، آخری برفانی دور تک باقی رہے۔ یہ جانور اس آخری برفانی دور کی پہلی انتہاء، یعنی ستر ہزار سال پہلے بھی درست طریقے سے بقا کی منزل پار کر گئے۔ تو پھر، آخر پینتالیس ہزار سال پہلے یہ آسٹریلیا کے ماحولیاتی نظام میں سے اچانک غائب کیسے ہو گئے؟ ظاہر ہے، اب اگر یہ دیوہیکل جانوروں کی اقسام میں اس عرصے کے دوران غائب ہونے والی واحد نوع ہوتی تو اسے قسمت کا کھیل اور اتفاق قرار دیا جا سکتا ہے۔ لیکن اسی مخصوص وقت، یعنی پینتالیس ہزار سال پہلے کے زمانے میں یکدم ہی چند ہزار سالوں کے اندر اندر ڈیپروٹوڈون کے ساتھ ساتھ باقی کے نوے فیصد دیوہیکل جانور بھی یکدم ہی غائب ہو گئے۔ اس ضمن میں مفصل شواہد موجود ہیں لیکن یہ ماننا انتہائی مشکل ہے یہ سب جانور عین اس زمانے

میں غائب ہوئے جب آدمی نے، اتفاق سے اسی ہزار یے میں آسٹریلیامیں قدم رنجہ فرمایا تھا۔ یہ نظرانداز کردینے والی حقیقت نہیں ہے کہ آدمی کے قدم رکھتے ہی، چند سو برسوں کے اندر ہی اندر ان سارے دیوہیکل جانوروں کی اقسام ایک کے بعد ایک کرکے برفیلی موت کا شکار ہو کر معدوم ہوتی چلی گئیں؟

دوسرا ثبوت یہ کہ جب موسمیاتی تبدیلیوں کے سبب بڑے پیمانے پر انواع کی معدومیت ہو تو سمندری مخلوقات بھی عام طور پر اسی طرح متاثر ہوتی ہیں جیسی کہ خشکی پر پائے جانے والے جانور ہوسکتے ہیں۔ لیکن پینتالیس ہزار سال پہلے سمندر میں پائے جانے والی کسی بھی نوع کا غیر معمولی انداز میں معدوم ہوجانے کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ اس ضمن میں خشکی پر رہنے والے جانوروں کی بڑے پیمانے پر معدومیت اور قریبی سمندروں میں مخلوقات کا بچ نکلنا۔۔۔ صاف صاف انسان کے کردار کی جانب اشارہ کرتا ہے۔ اگرچہ آدمی بہت تیزی سے پھل پھول رہا تھا اور کشتی رانی میں بھی کافی ترقی کرچکا تھا لیکن اس کے باوجود ابھی تک یہ صرف خشکی پر ہی غالب، آفت بنا ہوا تھا۔

تیسرا ثبوت یہ ہے کہ بڑے پیمانے پر حیوانات کی معدومیت جو آسٹریلیا کے ماحولیاتی نظام سے جوڑی جاتی ہے، اس بارے یہ ہے کہ اس طرح کی نابودگی تو اس کے بعد، ہر ہزاری سال میں دیکھی گئی ہے۔ تاریخ دنیا میں اس طرح کی معدومیت کے ساتھ آدمی کا تعلق ایک یا دوسری صورت نکل ہی آتا ہے اور اس حوالے سے ناقابل تردید شواہد یا حوالے موجود ہوتے ہیں۔ مثلاً پینتالیس ہزار سال پہلے آسٹریلیاء میں بڑے پیمانے پر وقوع پذیر ہونے والی جانوروں کی معدومیت کو تو چلو، موسمی تبدیلیوں کے ساتھ جوڑ دیا جاتا ہے لیکن اسی عرصے کے دوران نیوزی لینڈ میں پائے جانے والے دیوہیکل جانوروں کی اقسام کو ان 'موسمیاتی تبدیلیوں' کی وجہ سے خراش تک کیوں نہیں آئی؟ لیکن جب آدمی نے ان جزائر پر قدم رکھا تو چند سو سال کے اندر ہی اندر یہ دیوہیکل جاندار، نیوزی لینڈ سے بھی ناپید ہو گئے۔ اس ضمن میں ماوری جزائر کی مثال لیں۔ آدمی نے ان جزائر پر آج سے صرف آٹھ سو سال پہلے قدم رکھا تھا۔ یہاں دیوہیکل جانوروں کی کئی اقسام آٹھ سو سال پہلے تک دسیوں ہزار سال سے خوب پھل پھول رہی تھیں لیکن آدمی کے وارد ہوتے ہی، صرف دو سو برس کے عرصے میں یہ سارے جانور ناپید ہوگئے۔ یہی نہیں بلکہ ماوری جزائر پر پائے جانے والے پرندوں کی بھی ساٹھ فیصد آبادی ختم ہو کر رہ گئی۔

میمتھ ہاتھی بھی اسی طرح کی بدقسمتی سے دوچار ہوئے۔ قطب شمالی میں واقع بحر منجمد (سائبریا کے ساحل سے شمال کی جانب تقریباً دو سو کلومیٹر دور)، میمتھ ہاتھی لاکھوں سال تک قطب شمالی کے خطے میں خوب پھلتے پھولتے رہے لیکن جوں ہی آدمی کی آبادیاں پھیلیں، سب سے پہلے یوریشیائی اور پھر شمالی امریکہ کے علاقوں میں میمتھ پیچھے ہٹتے چلے گئے۔ دس ہزار سال پہلے تک حالت یہ ہوگئی تھی دنیا میں ایک بھی میمتھ ہاتھی نہیں بچا تھا۔ لیکن ہوا یہ کہ اس زمانے میں کئی میمتھ ہاتھی قطب شمالی کے دور دراز، انتہائی دشوار گزار جزائر میں بچ

رہنے میں کامیاب ہو ہی گئے۔ ان میں اکثریت رینگل نامی جزیروں کے مجموعے میں پائے گئے تھے۔ یہ بچ رہنے والے میمتھ ہاتھی مزید چند ہزار سال تک باقی رہے اور پھر چار ہزار سال پہلے جب یہ دور دراز جزائر بھی آدمی کی پہنچ میں آ گئے تو چند دہائیوں کے اندر باقی بچ رہنے والے میمتھ ہاتھی بھی نیست و نابود ہو گئے۔

اگر آسٹریلیا میں بڑے پیمانے پر جانوروں کی یکدم معدومیت اپنی نوعیت کا صرف ایک ہی واقعہ ہوتا تو ہم انسانوں کو شک کا فائدہ دے سکتے تھے۔ لیکن تاریخ کا ریکارڈ گواہ ہے کہ آدمی کے ہاتھ قدرت کے خون سے رنگے ہوئے ہیں۔ آدمی کی مثال ایسی ہی ہے کہ گویا یہ ماحولیاتی نظام کو یکے بعد دیگرے قتل کرنے والا عادی مجرم ہے۔

یہاں ایک سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ آسٹریلیا میں جا کر بسر کرنے والے آدمیوں کے پاس پتھر کے زمانے سے تعلق رکھنے والی 'ٹیکنالوجی' تھی۔ آخر وہ ان برچھیوں اور نیزوں کی مدد سے اتنے بڑے پیمانے پر ماحولیاتی نظام میں تباہی کیسے لا سکتے ہیں؟ اس پیچیدہ گتھی کو سلجھانے کے لیے تین طرح کی وضاحتیں دی جاتی ہیں اور یہ خاصی مربوط ہیں۔

آسٹریلیا کی مشہور زمانہ اس بڑے پیمانے پر معدومیت میں سب سے زیادہ متاثر ہونے والے دیوہیکل جانور تھے۔ یہ دیوہیکل جانور انتہائی سست رفتاری کے ساتھ پرورش کرتے تھے اور ان کی نسل بڑھنے کی رفتار بہت ہی آہستہ تھی۔ ایسے جانوروں میں حمل طویل ہوتا ہے، ہر حمل سے صرف ایک آدھ بچہ جنتا ہے اور حمل کے بیچ وقفہ بھی زیادہ ہوتا ہے۔ اس کا نتیجہ کچھ اس طرح نکل سکتا ہے کہ اگر انسان ہر چند ماہ کے بعد صرف ایک ڈیپروٹوڈون نامی جانور بھی ہلاک کرتے رہے ہوں تو جلد ہی ان جانوروں کی آبادی میں، افزائش نسل کے مقابلے میں شرح اموات بڑھ گئی ہوں گی۔ چند ہزار سالوں کے اندر، آخری ڈیپروٹوڈون بھی جان کی بازی ہار گیا ہو گا۔

حقیقت یہ ہے کہ ڈیپروٹوڈون اور اس طرح کے دوسرے سارے دیوہیکل جانور اپنے وزن کی وجہ سے مات کھا جاتے ہوں گے۔ اتنے بھاری بھر کم جانور کو، جو حرکت میں نہایت کورا رہا ہو گا۔۔ اس کا شکار دو پیروں پر پھرتی سے بھاگنے اور پلٹ کر وار کرنے والے آدمی کے لیے چنداں مشکل نہیں تھا۔ انسانوں کی کئی انواع بیس لاکھ سال تک افریشیائی براعظموں میں نمو اور ارتقاء پاتی رہی تھیں۔ انھوں نے وقت کے ساتھ، رفتہ رفتہ شکار کرنے کی صلاحیت کو سیکھ کر خوب نکھار لیا تھا اور تقریباً چار لاکھ سال پہلے یہ بڑے بڑے جانوروں کا شکار کرنے کے اہل ہو چکے تھے۔ افریقہ اور ایشیاء کے بڑے بڑے دیوہیکل جانوروں نے اسی سبب انسان سے بچ کر رہنے، دور بھاگنے کی صلاحیت بھی پیدا کر لی تھی۔ چنانچہ، جب یہ مشاق شکاری افریشیائی براعظموں میں دو پیروں پر چل نکلا تو وہاں پائے جانے والے سبھی بڑے جانوروں کو پہلے سے پتہ تھا کہ اس طرح کی دوپائی مخلوق سے بچ کر رہنا ہے، اسی لیے ہاتھی اور گینڈے آج بھی باقی ہیں۔ اس کے برعکس آسٹریلیا میں پائے جانے والے دیوہیکل جانوروں کو دوڑ لگانے کی فرصت اور اس امر کو جان لینے کا موقع ہی نہیں ملا۔ انسان کو ویسے دیکھ کر عام طور اس سے کسی بھی طرح کے خطرے کا احساس نہیں ہوتا۔ مراد یہ ہے کہ ان کے لمبے اور

نوکیلے دانت ہیں اور نہ ہی ان کے پٹھے اتنے مضبوط اور جسم لچکیلے ہیں کہ پھرتی دکھاسکیں۔ تو جب کرہ ارض پر سب سے بڑے اور دیوہیکل ڈیپروٹوڈون کی نظر اس لاغر اور مریل نظر آنے والی مخلوق پر پڑتی ہو گی تو وہ ایک نظر دوڑا کر اپنی گھاس چرنے میں مشغول ہو جاتا ہو گا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان جانوروں کو اپنی بقا کے لیے نوع انسانی کا ڈر پیدا کرنے کی ضرورت تھی لیکن اس سے قبل کہ وہ ایسا کرتے۔۔۔ان کا تختہ الٹ چکا تھا۔

اس ضمن میں دوسری وضاحت یہ ہے کہ آدمی نے آسٹریلیا پہنچنے سے قبل ہی آگ کی مدد سے زراعت کا فن سیکھ لیا تھا۔ آگ کی مدد سے زراعت کا تصور آگ کے استعمال سے تعلق رکھتا ہے۔ جب اس کا سامنا کسی اجنبی اور خطرے سے بھرپور ماحول سے ہوتا، آدمی جان بوجھ کر وسیع علاقوں پر مشتمل گھنے جنگلوں کو آگ لگا دیتا۔ جنگل جل کر خاکستر ہو جاتے، یعنی کھلے میدان نکل آتے اور مٹی راکھ کی بدولت مزید زرخیز ہو جاتی۔ ان زرخیز میدانوں میں دیکھتے ہی دیکھتے اونچی اور ہری گھاس نکل آتی اور یہ جنگل۔۔۔ چراہ گاہوں میں بدل جاتے۔ ان چراہ گاہوں میں دور دور سے جانوروں کے ریوڑ چرنے آتے تھے۔ ان جانوروں کا کھلے میدانوں میں شکار نہایت آسان ہو جاتا۔ اس طرح آدمی نے آگ کی مدد سے زراعت کے تصور کو پروان چڑھایا اور دیکھتے ہی دیکھتے چند ہزار سالوں کے اندر آسٹریلیا کے ماحولیاتی نظام کی کایا ہی پلٹ گئی۔

اس وضاحت کو سہارا دینے کے لیے کئی سائنسی مشاہدات بھی دستیاب ہیں۔ ان میں سب سے اہم اس زمانے کے فوصل شدہ درختوں کا ریکارڈ ہے۔ یوکلپٹس یا گوند نامی درخت پینتالیس ہزار سال پہلے تک آسٹریلیا میں بہت کم پایا جاتا تھا۔ آدمی کے وارد ہونے سے درخت کی اس قسم کے لیے گویا سنہری دور شروع ہو گیا۔ اب چونکہ یوکلپٹس آگ کے خلاف خصوصی طور پر مزاحمت رکھتا ہے، تو یہ درخت دور دور تک آگ سے بچ بچا کر پھلتا پھولتا رہا جبکہ باقی کے پودوں اور درختوں کی اقسام نابود ہو گئیں۔

نباتات میں اس طور کی تبدیلیوں کا سب سے زیادہ اثر ان جانوروں کی آبادی پر ہوا جو گھاس خور تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہمہ خور جانور اور وہ گوشت خور جانور بھی بڑھے جنھوں نے صرف نبات یا سبزخوری بھی شروع کر دی۔ مثال کے طور پر کوالا ریچھ یوکلپٹس کے پتوں پر خوب پلا بڑھا اور نت نئے علاقوں میں جا کر پھیلنے لگا۔ جبکہ دوسرے جانوروں کی اقسام اس سارے عرصے کے دوران خوب مصیبت میں پڑ گئے تھے۔ آسٹریلیا میں پائی جانے والی خوراک کی زنجیر منہدم ہو چکی تھی اور یوں معدومیت ان کمزور کڑیوں کو چاٹ جانے میں کامیاب ہو گئی۔

اس ضمن میں تیسری وضاحت شکار اور آگ کی مدد سے زراعت جیسے عوامل کو تو تسلیم کرتی ہے لیکن اس امر پر بھی زور دیتی ہے کہ ہم موسمیاتی رد و بدل کے کردار کو کسی بھی طور مکمل طور پر نظر انداز نہیں کر سکتے۔ آسٹریلیا میں پینتالیس ہزار سال قبل وہ موسمیاتی تبدیلیاں جو آسٹریلیا میں آفتوں کی شکل میں رونما ہوئیں، پورا ماحولیاتی نظام ہل کر رہ گیا تھا اور یہ خطہ بالخصوص غیر محفوظ ہو چکا تھا۔ عام حالات میں تو کوئی

بھی ماحولیاتی نظام دوبارہ سے اپنے پیروں پر کھڑا ہو جاتا ہے جو اس سے قبل ماضی میں کئی بار ہو چکا تھا۔ تاہم، انسان اتفاقی طور پر عین اس موقع پر آسٹریلیا میں وارد ہوا جب یہاں کا ماحولیاتی نظام پہلے سے ہی لڑکھڑا رہا تھا۔ چنانچہ موسمیاتی تبدیلیوں اور انسانی وارداتوں نے مل کر دیوہیکل جانوروں کی تباہی پھیلا دی۔ جانوروں کی یہ انواع ہر طرف سے اس طرح پے در پے وار کا بھار سہہ ہی نہیں سکے۔ اس طرح کے حالات میں جبکہ طرح طرح کے خطرات درپیش ہوں، کسی بھی نوع کے لیے بچ کر نکل پانا تقریباً ناممکن ہے۔

مزید شواہد اور ثبوتوں کے بغیر مندرجہ بالا تینوں منظر ناموں میں سے مستند اور واقعی وضاحت کو الگ کر پانا مشکل ہے۔ لیکن ہر صورت میں، یہ طے ہے کہ اگر آدمی آسٹریلیا پر لنگر انداز نہ ہوتا تو یہ براعظم آج بھی کیسوی شیروں، ڈیپروٹوڈون اور دیوہیکل کنگروؤں کا گھر ہوتا۔

تنبل کا خاتمہ

آسٹریلیا کے جانوروں، بالخصوص دیوہیکل جانوروں کی معدومیت وہ آدمی کا وہ پہلا غیر معمولی اور واقعی نشان تھا جو اس نے کرہ ارض پر جم کر چھوڑا۔ اس کے بعد، اس سے کہیں بڑی ماحولیاتی تباہی مچائی۔ اب کی بار امریکہ نشانہ بنا۔ آدمی، انسانوں کی پہلی اور واحد نوع ہے جو کرہ ارض کے مغربی براعظموں میں قدم رکھنے میں کامیاب ہوا۔ یہ آج سے سولہ ہزار سال پہلے کا واقعہ ہے۔ آدمی پیدل چل کر شمالی مشرقی سائبیریا سے شمال مغربی الاسکا میں داخل ہوا۔ اس وقت پیدل پار اترنا اس لیے ممکن تھا کیونکہ سطح سمندر کافی نیچے تھی اور نتیجتاً سائبیریا اور الاسکا ایک زمینی پل کی شکل میں ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تھے۔ یہ ضرور ہے کہ اس زمینی پل کو عبور کرنا ممکن تھا لیکن یہ قطعی آسان نہیں تھا۔ انتہائی سخت اور کڑا سفر تھا۔۔ غالباً یہ سمندر پار کر کے آسٹریلیا پہنچنے سے بھی زیادہ کٹھن تھا۔ اس زمینی پل کو عبور کرنے کے لیے آدمی کو سب سے پہلے تو قطب شمالی میں واقع سائبیریا کے شمالی حصے میں انتہائی سخت اور یخ موسم سے نبٹنے کی تدبیر کرنی پڑی ہوگی۔ یہ وہ علاقہ ہے جہاں سردیوں کے موسم میں سورج سرے سے نکلتا ہی نہیں اور درجہ حرارت منفی پچاس ڈگری سینٹی گریڈ تک گر سکتا ہے۔

ماضی میں کوئی بھی انسانی نوع ایسی نہیں تھی جو شمالی سائبریا میں داخل ہونے کی اہلیت رکھتی ہو۔ یہاں تک کہ سخت سرد موسم کے خود کو ڈھالنے میں کامیاب ہونے والے نینڈرتھل بھی خود کو جنوب کی جانب نسبتاً گرم علاقوں تک محدود رکھتے تھے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ افریقہ کے گرم میدانوں سے مانوس خردمند آدمی آخر اس پل کو عبور کرنے میں کامیاب کیسے ہو گیا؟

ہوا یوں کہ جب تاختی اور شکاری آدمیوں کے خانہ بدوش گروہ ہجرت کر کے شمال کی جانب سرد علاقوں کی طرف بڑھتے گئے تو ماحول کی ضرورت کے عین مطابق اپنے طور اطوار اور لباس کو بھی ڈھالتے گئے۔ یہ کوئی جینیاتی تبدیلی نہیں تھی بلکہ اس معاملے میں تدبیر کا عمل دخل تھا۔ آدمی نے برفانی علاقوں کی نسبت سے چرمی موزے اور جوتے بنائے۔ جسم کو گرم رکھنے کے لیے جانوروں کی فر اور چمڑی کا

استعمال کر کے موزوں لباس، سوئی اور لحمیاتی دھاگے کی مدد سے، جسم کے ساتھ چست اور تنی ہوئی صورت میں سینے کا گر سیکھ لیا۔ علاوہ ازیں، جیسے جیسے آگے بڑھتے۔۔۔ اس کے ساتھ برفانی علاقوں کی نسبت سے نئے اوزار، ہتھیار اور شکار کی بہتر سے بہتر تکنیک بھی ایجاد کی۔ آدمی کو اس کا فائدہ یہ ہوا کہ وہ اب میمتھ ہاتھیوں کا پیچھا کرتے ہوئے شمال کے دور دراز علاقوں میں بھی شکار کے قابل ہو گیا۔ جیسے جیسے ان کی تکنیک اور جسم کو گرم رکھنے والے لباس کی صورت بہتر ہوتی چلی گئی، ساتھ ہی ساتھ وہ شمال کے منجمد علاقوں میں آگے ہی آگے، دور دور تک مہم جوئی کے قابل ہو گئے۔ جوں جوں وہ شمال میں بڑھتے گئے، ان کا لباس، شکار کا لائحہ عمل اور بقا کی صورتیں بھی نہایت بہتر ہو گئیں۔

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر آدمی کو کیا پڑی تھی؟ وہ اسے اپنی مرضی سے خود کو سائبریا جیسے سرد جہنم میں دھکیلنے کی کیا ضرورت تھی؟ شاید، اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ آدمیوں کے گروہوں کو وقتاً فوقتاً لڑائی اور جنگ کے سبب، آبادیاتی دباؤ یا قدرتی آفات کے نتیجے میں بقا کی غرض سے بچ بچا کر شمال کی جانب ہجرت کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا ہو گا۔ اس ضمن میں مثبت وجوہات بھی رہی ہوں گی۔۔۔ جیسے اس کو جانوروں سے حاصل ہونے والی خوراک کی بہتات شمال میں ہی مل سکتی تھی۔ قطب شمالی کے علاقے میں بڑے بڑے دیوہیکل جانوروں کی آبادیوں کی کثرت تھی۔ ان جانوروں میں سب سے عام قطبی ہرن اور میمتھ ہاتھی تھے۔ ہر میمتھ ہاتھی گوشت کا ایک بہت بڑا ذخیرہ تھا جسے منجمد کر کے بعد کے استعمال کے لیے جمع بھی کیا جا سکتا تھا۔ میمتھ ہاتھیوں میں گوشت ہی نہیں بلکہ چربی کی بھی بہتات تھی اور اس کی فر اور چمڑی تو قیمتی تھی ہی، اس سے بھی گراں اس کے ہاتھی دانت ہوا کرتے تھے۔ جیسا کہ سائبریا کے علاقے سونگیر میں بسنے والے قدیم آدمی کی باقیات سے پتہ چلتا ہے، میمتھ کے شکاری آدمیوں کی آبادیوں کے لیے شمال میں صرف بقا ہی نہیں بلکہ ترقی اور فروغ کا بھی خوب سامان دستیاب تھا۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، آدمی کے گروہ میمتھ ہاتھیوں، مدندوں، گینڈوں اور قطبی ہرنوں کا پیچھا کرتے کرتے وسیع تر شمالی علاقوں میں پھیلتے چلے گئے۔ تقریباً سولہ ہزار سال پہلے یہی مہم جوئی ان میں سے چند گروہوں کو شمال مشرقی سائبیریا سے الاسکا تک لے گئی۔ اب ظاہر ہے کہ انھیں قطعی علم نہیں تھا کہ وہ اس کھیل ہی کھیل، مہم جوئی میں ایک نئی دنیا دریافت کر رہے ہیں۔ اس زمانے میں آدمی اور میمتھ ہاتھیوں، دونوں کے لیے ہی الاسکا، شمالی سائبریا کا توسیعی علاقہ تھا۔

پہلے پہل تو الاسکا سے باقی کے امریکہ کی جانب راستہ برفانی تودوں کی وجہ سے بند تھا۔ اس وقت آدمی کے صرف چند ہی ایسے گروہ رہے ہوں گے جو ان برفانی تودوں کو کسی نہ کسی طرح پار کر کے امریکہ میں جنوب کی جانب نکلنے میں کامیاب ہو پائے ہوں گے۔ تاہم چودہ ہزار سال پہلے، یعنی بارہ ہزار قبل مسیح میں گلوبل وارمنگ یا زمین کے درجہ حرارت میں اضافہ کی وجہ سے برفانی تودے پگھلنے لگے اور یوں امریکہ میں جنوب کی جانب نسبتاً آسان راستے کھل گئے۔ پھر کیا تھا، آدمیوں کے گروہ در گروہ، جوق در جوق اس نئی راہداری کا استعمال کر کے جنوب کا رخ کرنے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے پورے امریکی براعظم پر پھیل گئے۔ جیسے وہ پہلے قطب شمالی کے منجمد برفانی موسم کے لحاظ سے

تدبیر اختیار کر کے شکار کی غرض سے ڈھل گئے تھے، اب انھیں امریکہ میں نت نئے، کئی کئی طرح کے حیرت انگیز موسم اور ماحولیاتی نظام مل گئے تھے۔ سائبیریائی آدمی کی اس نسل نے اب متحدہ امریکہ کے مشرقی جنگلوں، مسی سپی دریا کے میدانوں اور ڈیلٹا، میکسیکو کے صحراؤں اور پسینے میں شرابور کر دینے والے وسطیٰ امریکہ کے جنگلوں میں بسیرا کر لیا۔ کچھ ایسے بھی تھے جو امریکہ کے مزید جنوبی علاقوں جیسے ایمازون کے دریائی پیندے میں بس گئے، کچھ کوہ اینڈیز کے پہاڑوں اور ارجنٹینا کے گیاہ زاروں کے ہو کر رہ گئے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ آدمی کی یہ ساری نو آبادیاں، یہ پھیلاؤ صرف اور صرف ایک یا دو ہزار سال کے اندر اندر ہو گیا۔ دس ہزار سال قبل مسیح تک انسان امریکہ کے انتہائی جنوبی علاقوں میں بھی پہنچ کر آباد ہو چکا تھا۔ جنوبی امریکا کے سب سے جنوبی سرے پر واقع فیو گو کے جزیرے پر بھی اسی دور کے آدمی کی باقیات دریافت ہوئی ہیں۔ انسان کی شمالی اور جنوبی امریکہ بھر میں اس برق رفتار پھیلاؤ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آدمی کیسا غیر معمولی ہنر مند اور غیر مسابقانہ انداز میں حالات کے ساتھ ڈھل جانے کی صلاحیت سے مالا مال ہے۔ جانوروں میں ایسی دوسری کوئی نوع نہیں ہے جو اس قدر سرعت اور قابلیت کے ساتھ کئی کئی مسکنوں اور ماحولیاتی نظاموں کے ساتھ اسا سی انداز میں ڈھل جانے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ اسے ایسا کرنے کے لیے اپنی فطرت بدلنے کی ضرورت ہی نہیں، یعنی جینیات ویسی کی ویسی ہی رہیں۔

آدمی نے امریکہ تو فتح کر لیا لیکن قدرت کے خون سے ہاتھ رنگ دیے۔ اس فتح کے بھینٹ چڑھنے والوں کی فہرست بہت لمبی ہے۔ چودہ ہزار سال پہلے امریکہ میں پائے جانے والے جانوروں کی انواع، آج کے مقابلے میں کہیں زیادہ تھیں۔ جب آدمی نے الاسکا سے امریکہ میں داخل ہو کر کینیڈا کے میدانوں اور مغربی متحدہ امریکہ کے علاقوں کا رخ کیا تو اس کا سامنا طرح طرح کے جانوروں سے ہوا۔ میمتھ ہاتھی، ممدوندے، ریچھ جتنے جوندے، جنگلی گھوڑوں اور اونٹوں کے ریوڑ، بھاری بھر کم شیر اور درجنوں دوسری ایسی انواع جو آج سرے سے ناپید ہو چکی ہیں۔ ان میں شمشیر دان درندے بھی شامل تھے جو نہایت چست اور ڈراؤنے رہے تھے۔ ان جانوروں میں سب سے زیادہ تعداد تنبل کی ہوا کرتی تھی۔ یہ تنبل اتنے دیو ہیکل ہوا کرتے کہ ایک ایک تنبل کا وزن آٹھ ٹن اور قد چھ میٹر (20فٹ) تک ہوتا تھا۔ جنوبی امریکہ تو وحشی جانوروں کا گھر تھا۔ ان میں بڑی جسامت کے ممالیہ، رینگنے والے خزندے اور پرندے شامل تھے۔ امریکہ کی خاصیت یہ تھی کہ یہ علاقہ لاکھوں سال تک، گویا ارتقاء کی لیبارٹری رہا تھا۔ کرہ ارض کے اس حصے میں ایسے ایسے جانور اور نباتات پائے جاتے تھے جو افریقہ اور ایشیاء میں نہیں تھے بلکہ یہ افریشیائی علاقوں کی نسبت کہیں گھنے اور کہیں متنوع تھے۔

لیکن امریکہ کا یہ حال تادیر باقی نہیں رہا۔ آدمی نے امریکہ میں وارد ہونے کے بعد صرف دو ہزار سال کے عرصے میں قدرت کی لاکھوں سال کی محنت لپیٹ دی۔ ان انواع و اقسام جانوروں اور نباتات کی تقریباً اقسام ختم ہو گئیں۔ حالیہ دور میں جدید پیمانوں پر لگائے گئے اندازوں کے مطابق اس مختصر عرصے کے دوران شمالی امریکہ میں بڑی جسامت کے دیو ہیکل ممالیہ جانوروں کی کل سینتالیس انواع میں سے

چونتیس ختم ہوگئیں۔ جنوبی امریکہ کی ساٹھ اقسام میں سے پچاس معدوم ہوئیں۔ شمشیر دان درندے تین کروڑ سال تک باقی رہنے کے بعد صرف چند سو برسوں میں ایسے غائب ہوئے کہ ان کا نام بھی باقی نہیں رہا۔ یہی حال تنبل کا ہوا، بھاری بھر کم شیر، امریکہ کے آبائی گھوڑے، اونٹ، خزندے اور میمتھ ہاتھی۔۔۔ یہ سارے کے سارے جانور آدمی کے ہاتھوں زیر ہوگئے۔ اسی طرح چھوٹی جسامت کے ممالیہ جانور، خزندے، پرندے۔۔۔ یہاں تک کہ کیڑے اور مکوڑوں کی بھی ہزاروں اقسام باقی نہیں رہیں۔ مثال کے طور پر جب میمتھ ہاتھی ختم ہوئے تو اس کے جسم پر پلنے والے پسوؤں اور طفیلی کیڑوں کی ساری اقسام بھی مر کھپ گئیں۔

پچھلی کئی دہائیوں سے معدوم حیوانات و نباتات اور متحجر ڈھانچوں پر تحقیق کرنے والے پیلونٹولوجسٹ اور جانوروں کی باقیات کا مطالعہ کرنے والے زوآرکیالوجسٹ، شمالی اور جنوبی امریکہ کے چپے چپے کو چھانتے پھر رہے ہیں۔ انھیں قدیم دور کے معدوم جانوروں کی فوصل شدہ ہڈیاں اور تنبل کے پتھر بنے فضلے کو ڈھونڈ رہے ہیں۔ جب بھی انھیں کچھ ایسا ملتا ہے تو وہ اس خزانے کو نہایت احتیاط کے ساتھ پیک کر کے لیبارٹریوں کو بھجوا دیتے ہیں جہاں ہر ہڈی اور ہر پتھر بنے فضلے کی باقیات کو نہایت باریک بینی سے مشاہدے میں لایا جاتا ہے۔ اس کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ اس کی تاریخ دریافت کی جاتی ہے۔ اس طرح کی مشاہداتی اور مطالعاتی تحقیق ہر روز چھپتی ہے اور ہر روز ایک ہی نتیجہ سامنے آتا ہے۔ ان باقیات کے تانے بانے عین اس وقت سے جا کر ملتے ہیں جب انسان نے امریکہ پر الاسکا کے راستے یلغار کی تھی۔ آج تک دریافت ہونے والی تقریباً باقیات کی تاریخ بارہ ہزار سے نو ہزار قبل مسیح کے عرصے میں پائی گئی ہے۔ شمالی اور جنوبی امریکہ میں صرف ایک جگہ ایسی ہے جہاں سے ملنے والی باقیات کی تاریخ تقریباً پانچ ہزار سال قبل مسیح میں پائی گئی ہے۔ یہ عرب الہند کے جزائر، بالخصوص کیوبا اور اور ہسپانولیہ کے جزائر میں تحقیق دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے اور نہایت دلچسپ حقائق کی حامل ہے۔ ان باقیات اور تاریخ عین وہی وقت ہے جب پہلی بار انسان نے ساڑھے پانچ ہزار سال پہلے ان جزائر پر قدم رکھا تھا اور یہاں بسیرا کیا تھا۔

لیکن اس سب کے باوجود بھی کئی محققین ایسے ہیں جو آدمی کو صاف بے قصور قرار دے کر بری کر دیتے ہیں اور سارا الزام موسمیاتی تبدیلیوں پر دھرتے ہیں۔ لیکن، اس ضمن میں ان حقائق سے نظریں بھی چرا لیتے ہیں کہ غرب الہند کے جزائر میں ملنے والے ثبوت یہ بھی بتاتے ہیں کہ یہاں اس زمانے میں سات ہزار سال تک مسلسل موسموں میں کسی بھی قسم کی غیر معمولی تبدیلی نہیں دیکھی گئی۔ یہاں موسموں کا چکر یکساں رہا تھا جب زمین کے مغربی کرہ میں گلوبل وارمنگ چل رہی تھی۔ چلو، مان لیا کہ جانوروں اور نباتات کی اتنے بڑے پیمانے پر یکدم معدومیت میں موسمیاتی تبدیلیوں کا ہاتھ ہے لیکن امریکی براعظموں سے ملنے والے پتھر ہو چکے حجری فضلے کی تاریخ کو تو کوئی بھی نہیں جھٹلا سکتا۔ ہمیں یہ ماننا ہی پڑے گا کہ دراصل ہم ہی اصل مجرم ہیں۔ اس سچ کے علاوہ، کوئی دوسری حقیقت نہیں ہے۔ بھلے موسمیاتی تبدیلیاں بہت ہی بڑھ کر رہی ہوں لیکن اس معدومیت میں آدمی کا کردار کاری اور فیصلہ کن تھا۔

نوح کی کشتی

اگر ہم آسٹریلیا اور امریکہ میں ہونے والی معدومیت کو جمع کرلیں اور اس میں چھوٹے پیمانے پر جاری ہمہ گیر افریشیائی معدومیت کو بھی شامل کرلیں (بشمول باقی انسانی انواع اور کیوبا وغیرہ میں جانوروں اور نباتات کا خاتمہ) تو ناقابل تردید نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ آدمی کا اولین نو آبادیاتی منصوبہ تاریخ میں جانوروں پر سب سے بڑی اور سریع ماحولیاتی تباہی تھی۔ ان میں سب سے زیادہ متاثر ہونے والی جانوروں کی وہ انواع تھیں جو دیوہیکل اور بھاری بھر کم ہوتی تھیں۔ وہ قدیم دور جب شعور اور آگاہی نے پہلا قدم اٹھایا تھا، اس وقت کرہ ارض پر خشکی پر دیوہیکل اور بھاری بھر کم پچاس کلو گرام سے زائد وزن کے حامل ممالیہ جانوروں کے تقریباً دو سو طبقات پائے جاتے تھے جس میں بے شمار انواع اور اقسام شامل تھیں۔ زرعی انقلاب برپا ہونے تک ان میں سے صرف سو طبقات باقی تھے اور آدھی سے زیادہ انواع معدوم ہو چکی تھیں۔ 'خردمند آدمی' نے کرہ ارض کی دیوہیکل جانوروں کی تقریباً آدھی آبادی کا خاتمہ کر دیا تھا۔ یہ وہ دور ہے جب کہ ابھی پہیہ بھی ایجاد نہیں ہوا تھا۔ اب تو وہ دور بھی آئے گا جب لکھنے کی صلاحیت اور لوہے سے بنے اوزار بھی ایجاد ہوں گے۔ پتھر کے زمانے کے آدمی نے جانوروں کی شکل میں قدرت کے آدھے کرشمات کو معدوم کرکے پتھر ہونے کے لیے چھوڑ دیا تھا۔

یہ ماحولیاتی تباہی زرعی انقلاب برپا ہونے کے بعد چھوٹے پیمانے پر بے شمار بار دہرائی گئی۔ ایک کے بعد دوسرے، ہر جزیرے کا تاریخی ریکارڈ یہی افسوسناک کہانی سناتا ہے۔ ایسے ہر المیے کا آغاز ایک ایسے سین سے ہوتا ہے جہاں جانوروں اور نباتات کی انواع و اقسام سے بھری آبادیاں ہیں۔ ان آبادیوں میں بڑے بھاری بھر کم جانور، ہزاروں سال پرانی نباتات کی اقسام اور کیا کیا کچھ نہیں ہے۔ اس سین میں آدمی کا کوئی وجود نہیں ہے۔ لیکن دوسرے ہی سین میں آدمی کی آمد ہوتی ہے۔ ہمیں اس آدمی کی موجودگی کا پتہ کسی انسانی ہڈی، کسی نیزے اور بعض اوقات بچ رہی کسی سرامک شے سے پتہ چلتا ہے۔ تیسرے سین میں آدمی جوق در جوق گروہوں کی شکل میں سٹیج بھر دیتا ہے اور پہلے سین کے سارے کردار، ایک کے بعد دوسرا۔۔۔ سب سے پہلے بڑے اور پھر چھوٹے چھوٹے سارے جانور اور نباتات غائب ہو جاتے ہیں۔

مداگاسکر ایک بڑا جزیرہ ہے۔ یہ افریقی براعظم کے مشرق میں چار سو کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ جزیرہ اوپر بیان کردہ المیے کی عمدہ مثال ہے جو لاکھوں سال تک علیحدگی میں اور باقی دنیا سے کٹ کر رہا۔ اسی وجہ سے اس جزیرے پر جانوروں اور نباتات کی یکتا اور بے مثل اقسام پروان چڑھیں۔ ان میں سب سے ممتاز فیل مرغ تھے۔ فیل مرغ ایسا پرندہ تھا جو اڑنے کے قابل نہیں تھا، اس کا قد تین میٹر (دس فٹ) اور وزن آدھا ٹن ہوا کرتا تھا۔ یہ دنیا کا سب سے بڑا پرندہ تھا۔ اسی طرح مداگاسکر میں لمبی تھوتھنی والا ایک بندرنما ممالیہ جانور بھی پایا جاتا تھا جسے قدیمی لیمور کہا جاتا ہے۔ اس کے بارے کہا جاتا ہے کہ یہ کرہ ارض کا سب سے بڑا اور دیوہیکل قدیم جانور تھا۔ فیل

مرغ، قدیمی لیمور اور مداگاسکر کی تقریباً سبھی بڑے بڑے جانور آج سے تقریباً پندرہ سو برس پہلے اچانک غائب ہو گئے۔ یہ عین وہ وقت تھا جب انسان نے اس جزیرے پر قدم رکھا تھا۔

9 خشکی پر بسر رکھنے والے دو دیو ہیکل تنبلوں کا خاکہ جن کے پیچھے دوسرے دیو ہیکل جانور جیسے آرماڈیلو بھی نظر آ رہے ہیں۔ یہ جانور اب معدوم ہو چکے ہیں۔ آرماڈیلو کے متعلق پتہ چلا ہے کہ وہ تین میٹر تک لمبے ہوتے تھے اور ان کا وزن دو ٹن تک ہوتا تھا۔ تنبل کا قد چھ میٹر تک ہوتا تھا اور وزن آٹھ ٹن تک ہوتا تھا۔

بحرالکاہل میں معدومیت کی یہ لہر پہلی بار پندرہ سو قبل مسیح میں شروع ہوئی۔ پولی نیشیائی دہقان ہجرت کر کے جزائر سلیمان، فجی اور نیو کیلیڈونیا میں آ کر آباد ہوئے۔ ان دہقانوں نے یہاں پرندوں، کیڑوں، گھونگوں اور دوسرے مقامی جانوروں کی سینکڑوں انواع کو تاخت و راج کر کے چھوڑ دیا۔ یہاں سے شروع ہونے والی معدومیت کی یہ لہر مشرق، جنوب اور شمال کی جانب پھیل کر بحرالکاہل کے وسط تک پہنچ گئی۔ یہ لہر کچھ ایسے چلی کہ ساموا اور ٹانگا میں بارہ سو قبل مسیح، مارکس جزائر میں پہلی عیسوی، ایسٹر جزائر، کک جزائر اور ہوائی میں پانچ سو عیسوی اور نیوزی لینڈ میں بارہ سو عیسوی تک جانوروں اور نباتات کی سینکڑوں انواع تباہ کر دی گئیں۔

اسی طرح کی ماحولیاتی تباہی بحر اوقیانوس، بحر ہند، قطب شمالی کے بحر منجمد اور بحیرہ روم میں واقع ہزاروں جزائر میں سے تقریباً ہر جزیرے پر وقوع پذیر ہوئی ہے۔ آثار قدیمہ کے ماہرین کو چھوٹے سے چھوٹے جزیرے پر بھی ان پرندوں، کیڑوں، مکوڑوں اور گھونگوں کی باقیات ملی ہیں جو لاتعداد نسلوں تک پھلتے پھولتے رہے لیکن جیسے ہی دہقانوں نے یہاں قدم رکھا، یہ نٹ سے غائب ہو گئے۔ بعض ایسے

بے حد دور دراز جگہوں پر واقع جزائر بھی ہیں جو تاریخ میں آدمی کی پہنچ سے دور رہے اور یوں وہاں جانوروں اور نباتات کی بے نظیر انواع بچ رہنے میں کامیاب رہیں۔ ایسی ہی ایک بے حد مشہور مثال ایکواڈور کے علاقے میں واقع گیلاپاگوس جزائر کی ہے۔ یہ جزائر انیسویں صدی عیسوی تک انسانی پہنچ سے دور رہے جس کے نتیجے میں یہاں جانور بہتات میں ہیں۔ یہاں آج بھی بڑے بڑے، بھاری بھر کم کچھوے بھی پائے جاتے ہیں جو قدیم ڈیپر وٹوڈون کی طرح انسانوں سے بالکل بھی خوف نہیں کھاتے۔

معدومیت کی پہلی لہر، جس کے ہمراہ تاختی اور شکار پر گزربسر کرنے والے آدمی کا پھیلاؤ ہوا۔۔ اس کے بعد معدومیت کی دوسری لہر چلی۔ اس دوسری لہر کے ہمراہ دہقانوں کا پھیلاؤ ہوا اور یہ ہمیں معدومیت کی تیسری لہر کا تناظر پیش کرتی ہے جو آج کے صنعتی دور کی دین ہے۔ ماحولیاتی تحفظ پر کام کرنے والے ان بیوقوفوں پر ہرگز یقین نہ کریں جو کہتے پھرتے ہیں کہ ہمارے اجداد قدرت کے ساتھ ہم آہنگی اور مطابقت بنا کر بسر رکھتے تھے۔ صنعتی انقلاب سے کہیں پہلے، آدمی کا تمام انواع میں ریکارڈ ہے کہ اس نے کرہ ارض پر جانوروں اور نباتات کی تقریباً اقسام کو معدومیت میں دھکیل دیا تھا۔ اس امر میں کوئی شک نہیں ہے کہ ہم حیاتیاتی ریکارڈ اور دنیا کی تاریخ میں سب سے زہریلی اور تباہ کن نوع ثابت ہوئے ہیں۔ یہ ایک دفعہ نہیں بلکہ بار بار رونما ہونے والا واقعہ ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ اگر زیادہ سے زیادہ لوگ معدومیت کی پہلی اور دوسری لہر کی نوعیت اور شدت سے آگاہ ہوتے تو وہ آج جاری معدومیت کی تیسری لہر بارے غیر جذباتی انداز اختیار کیا کرتے۔۔۔ بلکہ یہ کہیے کہ اگر ہم یہ جان لیں کہ تاریخ میں انسان نے جتنی انواع کو خاتمے کی پاتال میں دھکیلا ہے تو بلاشبہ ہم ان انواع کو بچانے کی سر توڑ کوشش کریں گے جو ہمارے قہر سے اب تک بچی ہوئی ہیں۔ اس ادراک کا سمندر میں بسنے والی بڑی دیوہیکل مچھلیوں اور ممالیہ جانوروں کی بقا سے گہرا تعلق ہے۔ خشکی پر بسنے والے بھاری بھر کم جانوروں کی نسبت سمندری مخلوقات شعور و آگاہی اور زرعی انقلاب سے زیادہ متاثر نہیں ہوئیں۔ لیکن آج صنعتی آلودگی اور انسان کے ہاتھوں سمندری وسائل کے بے پناہ استعمال کے نتیجے میں یہ بھی فنا کے دہانے پر پہنچ چکی ہیں۔ اگر معاملات اسی رفتار سے چلتے رہے تو عین ممکن ہے کہ وہیل مچھلیاں، شارک مچھلی، ٹونا مچھلیاں اور ڈالفن بھی جلد ہی ڈیپر وٹوڈوں، تنبل اور میمتھ ہاتھیوں کی طرح مٹ کر، ناپید ہو جائیں گی۔ انسانی ترقی کے اس تباہ کن سیلاب میں ایسا دن بھی آنے کا قوی امکان ہے کہ آخر میں سوائے آدمی کے کوئی دوسرا بھاری بھر کم جانور نہیں بچے گا۔ اس بے پایاں اور غرق کر دینے والے سیلاب میں تیرتی ہوئی نوح کی بڑے چپوؤں والی کشتی میں صرف 'خردمند' آدمی اور وہ پالتو اور سدھائے ہوئے جانور ہی سوار ہوں گے جو اس کشتی کے چپوؤں کو چلانے کے لیے غلام بن کر زندہ رہنے پر مجبور ہوں گے۔

حصہ دوم: زرعی انقلاب

10 مصر میں ایک مقبرے پر پائی گئی 3500 سال پرانی ایک مصوری کا فن پارہ جس میں روایتی روزمرہ زرعی امور کی عکاسی کی گئی ہے

تاریخ کا سب سے بڑا فراڈ

پچیس لاکھ سال انسان نے نباتات جمع اور جانوروں کا شکار کر کے پیٹ پالا تھا۔ خوراک کے یہ ذریعے انسانی دخل اندازی اور وسیلے کے بغیر ہی، قدرتی ماحول میں پیدا ہو جاتے تھے۔ آدمی کے علاوہ باقی انسانی انواع بالخصوص کھڑا آدمی اور نینڈر تھل وغیرہ جنگلی انجیر جمع کرتے اور بکروں کا شکار کر کے کھاتے تھے لیکن انھوں نے کبھی یہ فیصلہ نہیں کیا کہ انجیر کا درخت کہاں اُگے گا یا بکروں کا ریوڑ کس چراہ گاہ میں گھاس چرے گا؟ انھیں اس امر سے کوئی مطلب نہیں تھا کہ ایک مخصوص نسل کا بکرا، کسی دوسری نسل کی فلاں بکری کے ساتھ جماع کر کے بالکل نئی نسل پیدا کرے گا۔ خردمند آدمی مشرقی افریقہ سے نکل کر مشرق وسطیٰ، وہاں سے یورپ اور باقی ایشیاء اور بالآخر آسٹریلیا اور امریکہ بھی جا پہنچا لیکن اس سارے عرصے کے دوران وہ بھی انسان کی باقی انواع کی طرح جنگلی نباتات اور جانوروں کا شکار کر کے ہی گزارہ کرتا رہا۔ ایسا ہونے کی ایک وجہ تھی۔ وہ وجہ یہ کہ آدمی کو اپنے رہن سہن اور پیٹ بھرنے کے لیے وافر خوراک مل جایا کرتی تھی اور اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے سماج، عقائد اور سیاسی حرکیات بھی موجود تھیں۔ اسے اس عرصے کے دوران زندگی میں کسی اور شے کی کوئی ضرورت سرے سے محسوس ہی نہیں ہوئی۔

لیکن دس ہزار سال پہلے یہ سب کچھ بدل گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب آدمی کی ساری توجہ، وقت اور توانائی چند جانوروں اور گنی چنی نباتات پر مرکوز ہو گئی۔ وہ خوراک کے لیے صرف انھی چند اقسام پر تکیہ کرنے لگا۔ اب رفتہ رفتہ آدمی کا یہ حال ہوا کہ وہ صبح تڑکے سے لے کر شام گئے تک بیج بونے، وتر لگانے، زمین سے غیر ضروری جڑی بوٹیاں نکالنے اور بھیڑ بکریوں کے ریوڑوں کو چراہ گاہوں میں ہانکنے میں مصروف رہنے لگا۔ ہم آدمیوں کا خیال تھا کہ یہ ساری مشقت ان کے لیے زیادہ سے زیادہ پھل، غلہ اور گوشت پیدا کرنے میں مدد دے گی۔ یہ انسانی طرز زندگی میں غیر معمولی تبدیلی تھی۔ یہ انسانی رہن سہن میں انقلاب تھا۔ اس انقلاب کو زرعی انقلاب کہا جاتا ہے۔

انسان کا زراعت کی جانب یہ سفر تقریباً 9500 قبل مسیح میں، جنوب مشرقی ترکی کے ایک پہاڑی سلسلے، مغربی ایران اور مشرقی بحیرہ روم اور آٹر کے ساحل سے ملحق خطے کے بیچ عراقی تمدن میں شروع ہوا۔ اس تبدیلی کا آغاز نہایت سست تھا اور پہلے پہل صرف اسی مخصوص جغرافیائی علاقے تک محدود تھا۔ گندم اگانے اور بکریاں پالنے کا رواج تقریباً 9000 قبل مسیح میں شروع ہوا۔ مٹر اور دالیں 8000 قبل مسیح اور زیتون کے باغ 5000 قبل مسیح میں پہلی بار اگائے گئے۔ گھوڑے کو 4000 قبل مسیح میں سدھایا گیا اور انگوروں کی بیل 3500 قبل مسیح میں فصل کے طور پر پیدا کی گئی۔ بعض جانور اور نباتات جیسے اونٹ اور کاجو وغیرہ تو بہت بعد میں زراعت کا حصہ بنے لیکن 3500 قبل مسیح تک جانوروں کو سدھانے اور نباتات کو فصل بنا کر اگانے کی بڑی لہر تقریباً مکمل ہو چکی تھی۔ آج بھی، ہمارے پاس اگرچہ جدید ترین ٹیکنالوجی ہے لیکن اس کے باوجود دنیا بھر میں انسانوں کا پیٹ بھرنے کے لیے خوراک

صرف چند گنی چنی، پودوں کی ان فصلوں سے حاصل ہوتی ہے جنھیں ہمارے اجداد نے 9500 قبل مسیح اور 3500 قبل مسیح کے دوران سدھا کر اگانا شروع کیا تھا۔ ان فصلوں میں گندم، چاول، مکئی، آلو، باجرہ اور جو شامل ہیں۔ پچھلے دو ہزار سال کے عرصے میں جانوروں کی کوئی نئی یا قابل ذکر قسم نہیں سدھائی گئی۔ اگرچہ ہمارے دماغ اور فطرت قدیم تاختی اور شکاری آدمیوں جیسی ہے لیکن ہمارے کھانے پینے کا سلیقہ اور طرز طباخی قدیم دہقانوں جیسا ہے۔ ہمارے 'وجود' اور 'موجود' میں پایا جانے والا یہ سب سے بڑا تضاد ہے۔

کسی زمانے میں محققین کا خیال یہ تھا کہ زراعت کے تصور نے مشرق وسطیٰ کے کسی ایک حصے میں جنم لیا اور پھر وہ یہیں سے دنیا کے چاروں کونوں میں پھیل گیا۔ لیکن جدید تحقیق سے ثابت ہے کہ دراصل زراعت صرف مشرق وسطیٰ میں ہی نہیں بلکہ دنیا کے دوسرے کونوں میں بھی اپنے بل بوتے پر اجاگر ہوئی۔ مشرق وسطیٰ میں تو صرف اس کی ابتداء ہوئی تھی، یا آثار یہی بتاتے ہیں۔ یہ صرف مشرق وسطیٰ کے دہقانوں کا کمال نہیں تھا کہ انھوں نے باقی دنیا میں یہ انقلاب پھیلایا ہو گا بلکہ دنیا کے باقی حصے اپنے تئیں، اپنی سمجھ اور رفتار کے مطابق زراعت سے روشناس ہوئے۔ مثال کے طور پر وسطی امریکہ کے لوگوں نے مکئی اور پھلی خود ہی اگائی اور اس وقت انھیں مشرق وسطیٰ میں گندم اور مٹر کی کاشت بارے چنداں خبر نہیں تھی۔ وہ گندم اور مٹر نامی فصلوں بارے سرے سے جانتے ہی نہیں تھے۔ اسی طرح جنوبی امریکہ کے باشندوں نے آلو اور آلاما کا پھل کاشت کرنے کا گر سیکھا تو انھیں میکسیکو اور بحیرہ روم کے آس پاس علاقے میں جاری زرعی پیداوار کے بارے کچھ خبر نہ تھی۔ چین میں چاول اور باجرے کی کاشت کے ساتھ سور کو بھی پالتو بنایا گیا۔ شمالی امریکہ میں پہلے باغبان پیدا ہوئے جنھوں نے کدو کاشت کرنا سیکھا کیونکہ وہ جنگلی تونبی اور گھیا کدو کی گھٹتی ہوئی دستیابی سے تنگ آ چکے تھے۔ نیوگنی میں گنے اور کیلے کی پیداوار کو دسترس میں لایا گیا جبکہ افریقی دہقانوں نے افریقی باجرے، افریقی چاول، سرسوں اور گیہوں کے دانے سے ضرورت اور ذائقے کے عین مطابق رغبت پیدا کر لی۔ ان ابتدائی مراحل سے گزرنے کے بعد زراعت دنیا بھر کے ہر مقام تک پھیل گئی۔ پہلی صدی عیسوی تک دنیا بھر کی تقریباً تمام انسانی آبادیاں زراعت سے منسلک ہو چکی تھیں۔

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر زرعی انقلاب مشرق وسطی، چین اور وسطی امریکہ میں ہی کیوں برپا ہوا جبکہ آسٹریلیا، الاسکا اور جنوبی افریقہ میں یہ بہت بعد کا قصہ ہے؟ اس کی وجہ سادہ ہے۔ ان علاقوں میں پائے جانے والے جانوروں کو سدھانا اور نباتات کو فصلوں کی شکل میں اگانا ناممکن تھا۔ علاوہ ازیں، آدمی ابھی تک ان علاقوں میں لذیذ کھمبیاں کھود کر نکال سکتا تھا اور بھرپور فر اور گوشت کے حامل میمتھ ہاتھیوں کا وافر شکار کر سکتا تھا لیکن ان ساری انواع کو پالتو بنانا خلاف از قیاس تھا۔ کھمبیوں کے چھتے انتہائی دغاباز اور دیوہیکل جانور حد سے باہر وحشی تھے۔ نباتات اور جانوروں کی وہ ہزاروں اقسام جن کا ہمارے اجداد شکار کرتے اور جمع کرتے چلے آئے تھے۔۔۔

ان میں سے صرف چند ہی ایسی انواع تھیں جن کی کھیتی باڑی کی جا سکتی تھی یا انھیں ریوڑوں کی شکل میں پالا جا سکتا تھا۔ یہ مخصوص انواع، مخصوص علاقوں میں پائی جاتی تھیں اور یہ وہی مخصوص علاقے تھے جہاں زرعی انقلاب برپا ہونا شروع ہوا۔

ایک وقت ایسا بھی تھا جب محققین کا خیال تھا کہ غالباً زرعی انقلاب انسانیت کی ترقی میں ایک خاصی بڑی جست تھی۔ وہ ترقی کی ایسی داستان سناتے ہیں جس کے تحت انسانی دماغ نے کام کر دکھایا اور یوں زراعت معرض وجود میں آئی۔ ارتقاء کے ڈھنڈورے پیٹے جاتے کہ اس کی بدولت آدمی کی عقل بڑھتی چلی گئی۔ آخر کار، آدمی اتنا ذہین ہو گیا کہ وہ فطرت کے راز جاننے لگا اور اس نے بھیڑ بکریوں کو سدھا کر پالتو بنا لیا اور گندم کی کاشت کے قابل ہو گیا۔ جوں ہی ایسا ہوا، آدمی نے ہنسی خوشی شکار کا خطرناک اور بوٹیاں وغیرہ کھودنے کا محنت طلب کام ترک کر دیا۔ اس نے حتمی طور پر مستقل سکونت اختیار کر کے دہقانی کی خوشحال اور آسودہ زندگی بسر کرنے کا فیصلہ کر لیا۔
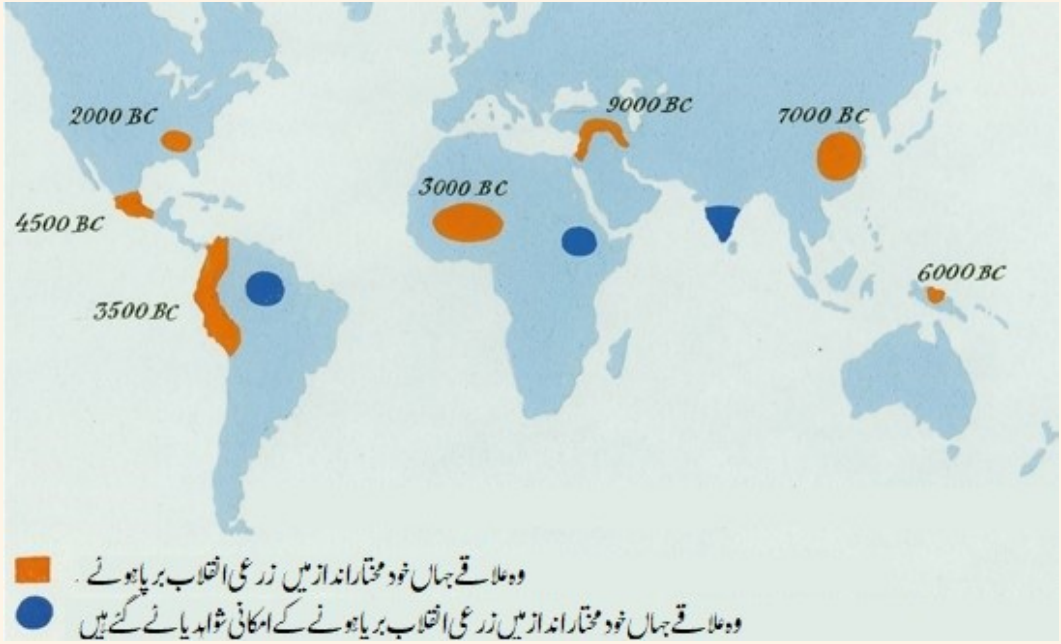
زرعی انقلاب کے مقامات اور تاریخ۔ یہ معلومات متنازع ہیں اور آئے دن نت نئی دریافتوں کے بعد اس نقشے میں ترامیم ہوتی رہتی ہیں

یہ بیانیہ واہمے اور ایک سراب خیال کے سوا کچھ نہیں ہے بلکہ کہیے، یہ بس فضول گوئی ہے۔ اس امر کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ وقت کے ساتھ آدمی کی ذہانت میں کچھ اضافہ ہوا ہے۔ زمین کھود کر خوراک جمع کرنے والا تاختی آدمی، زرعی انقلاب برپا ہونے سے بہت پہلے ہی فطرت کے رازوں سے اچھی طرح آشنا ہو چکا تھا۔ تاختی آدمی کی بقا ہی اس امر میں پوشیدہ تھی کہ وہ شکار کے قابل جانوروں اور طرح طرح

کی نباتات کے بارے علم حاصل کر کے رکھے۔ بجائے یہ کہ زرعی انقلاب کی بدولت جس آسودہ زندگی کا ڈھنڈورا پیٹا جاتا ہے اس نے تو دہقانوں کا وہ حال کر کے چھوڑ دیا ہے کہ تاختی اور شکاری آدمی کی زندگی اس سے کہیں آسان اور اطمینان بخش معلوم ہوتی ہے۔ تاختی اور شکاری اپنا زیادہ تر وقت متحرک رہ کر، طرح طرح کی متعدد سرگرمیوں میں مشغول گزارتے تھے۔ انھیں بھوک اور فاقہ کشی کے ساتھ ساتھ بیماریوں کے خطرات بھی کم در پیش تھے۔ یہ درست ہے کہ زرعی انقلاب کے نتیجے میں انسان کے لیے خوراک کی بڑی مقدار کا بندوبست ہو گیا لیکن اضافی خوراک کے ذخیرے کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ انسان کو بہتر، متوازن اور پر تکلف خوراک میسر آ گئی ہے۔ بجائے یہ خوراک کے اسی وسیع ذخیرے کی کرامات ہیں کہ آدمی کی آبادیوں پر بندھا ہوا بند ٹوٹ گیا۔ خوراک کے انہی بیش بہا وسائل کی دستیابی کے سبب انسانوں میں اشرافیہ کے طبقے نے جنم لیا۔ اشرافیہ ایسی بلا تھی جس کی عادات بگڑی ہوئیں اور حرص کسی طور پوری ہی نہیں ہوتی تھی۔ ایک اوسط دہقان کو کسی اوسط تاختی یا شکاری کے مقابلے میں کئی گنا بڑھ کر محنت کرنی پڑتی ہے اور اس مشقت کے نتیجے میں ملنے والی خوراک بھی متوازن نہیں ہوتی۔ زرعی انقلاب، تاریخ انسانی کا سب سے بڑا فراڈ تھا۔

اس فراڈ کا ذمہ دار کون ہے؟ اس کے ذمہ دار بادشاہ، پادری اور نہ ہی تاجر ہیں۔ اس فراڈ کے اصل ذمہ دار تو پودوں اور نباتات کی چند اقسام جیسے گندم، چاول اور آلو ہیں۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ شاید ہم نے ان نباتاتی انواع و اقسام کو پالتو بنا کر زیر کاشت لایا ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ان نباتات نے آدمی کو سدھا کر پالتو بنا لیا تھا۔

ایک لمحے کے لیے زرعی انقلاب کو آدمی کے نکتہ نظر سے نہیں بلکہ گندم یا گیہوں کے دانے کی نظر سے دیکھنے کی کوشش کریں۔ دس ہزار سال پہلے گندم ایک معمولی جنگلی گھاس کے سوا کچھ بھی نہیں تھی بلکہ کئی جنگلی گھاس پھونس کی لاتعداد اقسام میں سے ایک معمولی قسم یہ بھی تھی۔ یہ مشرق وسطیٰ کے ایک مخصوص علاقے میں پائی جاتی تھی۔ اچانک، چند ہزار سالوں میں یہ معمولی گھاس اور اس کا دانہ دنیا کے کونے کونے میں پایا جانے لگا۔ ارتقاء کے بنیادی اصولوں، یعنی بقا اور افزائش کے تحت تو گندم اس کرہ ارض کی تاریخ میں سب سے کامیاب پودا ثابت ہوئی ہے۔ شمالی امریکہ کے ان میدانوں میں جہاں دس ہزار سال پہلے تک گندم کا ایک خوشہ تک نہیں اگتا تھا، آج ہزاروں میل گاڑی دوڑتی رہے تو دونوں اطراف میں تاحد نگاہ گندم کے سوا کوئی دوسرا پودا دیکھنے کو بھی نہیں ملتا۔ دنیا بھر میں گندم اس کرہ ارض کی سطح پر تقریباً بائیس لاکھ پچیس ہزار کلومیٹر پر بچھی ہوئی ہے۔ یہ برطانیہ کے کل رقبے سے تقریباً دس گنا اور پورے پاکستان سے تقریباً تین گنا بڑا علاقہ بنتا ہے۔ آخر یہ حقیر اور ادنی گھاس اتنی اہم کیسے ہو گئی کہ آج ہر جگہ پائی جاتی ہے؟

گندم نے اس ضمن میں کمال کی گٹھ جوڑ کی اور آدمی کو ہنر مندی سے قابو کر کے اپنے فائدے کے لیے استعمال کیا۔ یہ چالاک مانس دس ہزار سال سے پہلے تک نہایت آرام و سکون سے شکار کھیل کر اور طرح طرح کی خوراک جمع کر کے قدرے اطمینان بخش زندگی

گزارتاچلا آیا تھا لیکن پھر اس نے گندم کی کاشت میں زیادہ سے زیادہ وقت اور توانائی خرچ کرنا شروع کر دیں۔ دو ہزار سال کے اندر اندر دنیا بھر میں انسان کے روزمرہ معمولات صرف یہی رہ گئے کہ وہ صبح تڑکے سے شام گئے تک گندم کے پودوں کی رکھوالی اور دیکھ بھال کرتا رہتا تھا۔ یہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔ گندم کے تقاضے بہت زیادہ اور کافی سارے تھے۔ گندم کو کنکریاں اور چٹانی پتھر ہرگز پسند نہیں تھے، چنانچہ آدمی نے میدانوں میں سے پتھر اور چٹانیں صاف کرنا شروع کر دیں۔ گندم کو کسی دوسری گھاس اور نباتات کے ساتھ جگہ، پانی اور زمین سے ملنے والی غذائیت بانٹنے سے سخت نفرت تھی، چانچہ آدمیوں۔۔۔ مردوں اور عورتوں نے مل جل کر صبح سے شام تک اپنی زندگی کا ہر تپتا ہوا دن غیر ضروری جڑی بوٹیاں کھودنے میں جھونک دیا۔ ادھر گندم بیمار پڑ جاتی تو یہاں آدمی کو غش آنے لگتے۔۔۔ وہ اپنی محنت چوگنی کر دیتا اور کیڑوں، مکوڑوں اور پھپھوندی کو اس سے دور رکھنے کی پوری سعی کرتا۔ گندم چونکہ لاچار تھی اسی لیے کئی دوسری نامیات جیسے خرگوشوں سے لے کر ٹڈی تک اس کو چٹ کرتے رہتے تھے۔۔۔ آدمی نے دن اور رات ایک کر کے گندم کی حفاظت کے لیے پہرہ بھی دینا شروع کر دیا۔ گندم کو پیاس لگتی تو آدمی چشموں اور ندیوں دریاؤں سے پانی باندھ کر اور پیٹھ پر لاد کر لاتا اور اسے پلاتا رہتا۔ گندم کی بھوک آدمی سے برداشت نہ ہوتی تو وہ یہاں تک اتر آیا کہ دور دور سے جانوروں کا گوبر اور فضلہ جمع کر کے لاتا اور اس زمین میں ڈالتا جاتا جہاں گندم اگائی جاتی تھی۔

آدمی کا جسم اس طرح کے کاموں کے لیے ہرگز موزوں نہیں تھا۔ قدرت نے تو اسے سیب کے درختوں پر چڑھنے اور ہرنوں کا پیچھا کرنے کے لیے ڈھال رکھا تھا۔ یہ ہرگز چٹانیں توڑنے، پتھر ہٹانے اور پانی کی بالٹیاں اٹھا کر کبا ہو کر، چلنے کے لیے نہیں تھا۔ آدمی کی ریڑھ کی ہڈی، گھٹنے، گردن اور پشت کے خم نے اس کی بھاری قیمت ادا کی۔ قدیم زمانے کے دریافت شدہ ڈھانچوں کے مشاہدے سے پتہ چلتا ہے کہ زراعت سے منسلک ہونے کے نتیجے میں جسمانی بیماریوں میں شدت آئی۔ ان طرح طرح کے امراض میں ہڈیوں کی پھسلن، جوڑوں کا درد اور ہرنیا بہت عام ہو گئے۔ علاوہ ازیں، ان نت نئے اور مشقت سے بھرپور، روزمرہ معمولات پر مبنی کاموں کا تقاضا تھا کہ آدمی گندم کی کھیتیوں اور کھلیانوں کے قریب ہی مستقل سکونت اختیار کر لے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آدمی کے طرزِ زندگی کی کایا ہی مکمل طور پر پلٹ کر رہ گئی۔ ہم نے گندم کو پالتو نہیں بنایا بلکہ اس نے ہمیں سدھا کر پالتو بنا لیا تھا۔ یہ جو لفظ ہے، پالتو اور گھریلو۔۔۔ جسے انگریزی میں 'domestication' کہتے ہیں، یہ لاطینی زبان کے لفظ Domus سے نکلا ہے۔ Domus کا مطب 'گھر' ہے۔ آپ خود دیکھ لیں، آج گھروں میں کون بسر رکھتا ہے؟ یہ گندم تو نہیں ہے۔۔۔ گندم تو آج بھی باہر میدانوں، کھیتوں اور کھلیانوں میں اگتی ہے۔ آدمی، گھر کا ہو کر رہ گیا۔

گندم نے آخر ایسی کیا سازباز کی کہ آدمی ہنسی خوشی ہی آزاد منش زندگی چھوڑ کر، بلکہ نسبتاً بہتر زندگی چھوڑ کر اس مصیبت اور خستہ حالی میں پڑ گیا؟ گندم نے آدمی کو اس کے بدلے میں ایسا کیا دیا کہ یہ نیمانا خود بخود اس قید پر راضی ہو گیا؟ یہ تو طے ہے کہ گندم نے ہرگز بہتر غذا

فراہم نہیں کی۔ یاد رکھیے، آدمی ہمہ خور جانور ہے جو خوراک کی طرح طرح اقسام پر گزارہ کرتا ہے۔ زرعی انقلاب سے پہلے تو غلہ جیسے گندم وغیرہ تو انسانی خوراک کا معمولی حصہ رہا کرتا تھا۔ اناج اور غلے میں معدنیات اور حیاتین یا وٹامن کی بھی شدید کمی ہوتی ہے۔ یہ ہضم کرنا بھی مشکل ہوتا ہے اور دانتوں، جبڑوں وغیرہ کے لیے تو جیسے زہر ہے۔

گندم نے انسان کو معاشی تحفظ بھی نہیں دیا۔ ایک ہاری، دہقان یا کسان کی زندگی کسی تاختی یا شکاری کے مقابلے میں کئی درجے کمتر اور معاشی لحاظ سے غیر محفوظ ہوتی ہے۔ تاختی تو نباتات کی کئی کئی اقسام اور انواع پر تکیہ کرتے تھے اور موسم کی بدحالی کے سال ان کی خوراک کی ضروریات پر کسی طور اثرانداز نہیں ہوتی تھیں۔ اگر کوئی برس ایسا آتا کہ جب کسی ایک قسم کی خوراک ناپید ہو جاتی تو تو نہایت آرام سے درجنوں دوسری خوراکوں پر گزارہ کر سکتا تھا، طرح طرح کے جانوروں کا شکار کر سکتا تھا۔ دہقانی معاشروں میں آج سے کچھ ہی عرصہ پہلے تک خوراک اور توانائی کی ضروریات پوری کرنے کے لیے سارا دارومدار ایک یا زیادہ سے زیادہ دو فصلوں پر رہا کرتا تھا۔ بعض علاقوں میں تو صرف ایک ہی فصل جیسے گندم، چاول یا آلو دستیاب ہوتا تھا۔ اگر بارشیں نہ ہوتیں یا ٹڈی دل حملہ کر دیتے۔۔۔ یا کوئی پھپھوندی فصل کو آن گھیرتی تو دہقانوں کی ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں قحط سالی سے اموات ہو جاتی تھیں۔

گندم نے تو انسان کو انسانی تشدد کے حوالے سے بھی تحفظ نہیں فراہم کیا۔ اولین دور کے دہقان اگر زیادہ نہ سہی لیکن کم از کم اتنے ہی تشدد پسند ضرور تھے جتنے ان کے آباء تاختی اور شکاری ہوا کرتے تھے۔ اب دہقانوں کے پاس جائیدادیں اور ہاتھ میں دھن کا دخل آ گیا تھا اور انھیں فصلیں کاشت کرنے کے لیے زمین درکار تھی۔ چراہگاہوں اور جنگلوں کو زرعی املاک اور کھیتوں میں ڈھالنے کی روش میں وہی فرق ہے جو بقا سے بھرپور زندگی اور فاقہ کشی میں ہو سکتا ہے۔ اب آدمی کے لیے سمجھوتے اور مصالحت کی گنجائش بہت کم رہ گئی تھی۔ اگر کسی تاختی یا شکاری قبیلے کا سامنا کسی زور آور قبیلے سے ہو جاتا تو وہ نہایت آسانی سے اپنا بوریا بستر لپیٹ کر ہجرت کر سکتا تھا۔ یہ مشکل اور قدرے خطرناک کام تھا لیکن ناممکن نہیں تھا۔ اگر کوئی ہٹ دھرم دشمن کسی دیہات کو دھمکانے پہنچ آتا تو اب کوئی گنجائش نہیں تھی۔ تصفیے اور پیچھے ہٹنے کا مطلب یہ تھا کہ کھیت کھلیانوں، گھروں اور اناج سے بھری کوٹھیوں سے ہاتھ دھونا پڑتا۔ تاریخ، ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے جہاں جلاوطن، پناہ گزینوں اور مہاجرین فاقوں کا شکار ہو کر نیست و نابود ہو گئے۔ دہقانوں کے لیے اسی واسطے ضروری ہو گیا کہ وہ بجائے پیچھے ہٹنے کے، اٹھ کھڑے ہوں اور لڑ بھڑ کر مر جائیں لیکن 'اپنی جگہ، جائیداد'، 'آبائی وطن' اور 'دیس' کو کبھی نہ چھوڑیں۔ اس کے دفاع سے ہرگز غافل نہ ہوں۔ آبائی علاقے، وطن اور دیس کے تصور نے یہیں سے جنم لیا تھا۔

11 نیوگنی میں زراعت پیشہ قبائل کے بیچ تنازع کے دوران لڑائی کا منظر (1960ء)۔ اس طرح کے مناظر زرعی انقلاب برپا ہونے کے بعد ہزاروں سال تک بہت عام رہے ہوں گے

بشریات اور آثار قدیمہ کی تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ وہ زرعی معاشرے جہاں گاؤں اور قبیلے سے بڑا کوئی سیاسی ڈھانچہ وجود نہیں رکھتا، وہاں انسانی تشدد اور تنازعات کی بناء پر ہونے والی ہلاکتوں کی شرح اوسطاً پندرہ فیصد کے لگ بھگ رہتی ہے۔ ان ہلاکتوں میں پچیس فیصد سے زیادہ مردوں کی اموات ہوتی ہیں۔ آج کے جدید دور میں بھی نیوگنی میں پائے جانے والے ایک زرعی معاش پر بسر کرنے والے قبیلے 'دانی' میں تشدد اور تنازعات کی وجہ سے تیس فیصد مرد اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ ایک دوسرے قبیلے 'اینگا' میں پینتیس فیصد مردوں کی ہلاکت دیکھی گئی۔ ایکواڈور میں 'واورانی' قبیلے کی آپسی جھڑپوں میں پچاس فیصد مرد پر تشدد ہلاکت کا شکار ہوئے۔ وقت کے ساتھ ساتھ زرعی معاشروں میں انسانی تشدد کو بڑے سیاسی ڈھانچوں کی مدد سے قابو میں لایا گیا۔ یہ سیاسی ڈھانچے شہر، بادشاہتیں اور ریاستیں کہلاتے ہیں۔ لیکن اتنے بڑے اور موثر سیاسی ڈھانچے تشکیل دینے میں انسان کو سینکڑوں اور ہزاروں سال لگ گئے۔

دیہاتوں میں سکونت اختیار کر کے بسر رکھنے سے دہقانوں کو یقیناً جنگلی درندوں، بارشوں اور سرد موسم سے بچاؤ کے فوری فائدے بھی حاصل ہوئے لیکن ایک اوسط آدمی کے لیے انفرادی سطح پر فوائد کی نسبت نقصان زیادہ تھا۔ یہ ایسی حقیقت ہے جو آج کے آسودہ حال معاشروں میں بسر رکھنے والے لوگوں کے لیے سمجھنا کافی مشکل ہے۔ آج چونکہ ہم آسودگی اور تحفظ میں بسر رکھتے ہیں اور چونکہ اس آسودگی اور تحفظ کی بنیاد زرعی انقلاب ہی ہے تو ہم یہ سمجھتے ہیں کہ شاید زرعی انقلاب انسانی تاریخ میں ایک عمدہ ترقی اور تہذیبی لحاظ سے بڑا اسد ہار تھا۔ ویسے بھی ہزاروں سال کی تاریخ کو صرف آج کے تناظر میں تولنا مناسب بھی نہیں ہے۔ اس ضمن میں نمونے کے طور پر اس تین سالہ لڑکی کا نکتہ نظر زیادہ موثر ہوگا جو پہلی صدی عیسوی میں چین کے کسی دیہات میں غذائی کمی کا شکار ہو کر اس لیے موت کے منہ میں چلی

گئی تھی کیونکہ اس برس، اس کے باپ کی اگائی فصل ناکام ہو گئی تھی اور کافی غلہ حاصل نہیں ہو پایا تھا۔ کیا وہ یہ کہے گی کہ، 'چلو۔۔۔ میں تو غذائی قلت کا شکار ہو کر مر رہی ہوں لیکن آج سے دو ہزار سال بعد لوگوں کے پاس کھانے کو وافر مقدار میں خوراک اور رہنے کو بڑے بڑے گھر ہوں گے جن میں ایئر کنڈیشنر بھی لگے ہوں گے۔ مجھ پر طاری یہ اذیت اور مصیبت یقیناً بنی نوع انسان کے لیے سودمند قربانی ثابت ہو گی!'۔

وہ لڑکی اور اس کا باپ۔۔۔ اس کا پورا خاندان اور اس زمانے کا معاشرہ ہرگز ایسا نہیں سوچتا ہو گا۔ تو پھر گندم نے دہقانوں کو ایسا کیا دیا؟ بھوک اور غذائی قلت سے مر جانے والی اس تین سالہ لڑکی اور اس جیسی لاتعداد دوسرے بچوں کو کیا ملا؟ گندم نے لوگوں کو انفرادی سطح پر کچھ نہیں دیا، کچھ بھی نہیں۔۔۔ بلکہ انفرادی سطح پر تو آدمی کو سراسر نقصان، یہاں تک کہ جان کے لالے بھی پڑ گئے۔ تاہم، اجتماعی سطح پر آدمی کو بحیثیت خرد آدمی کی انسانی نوع۔۔۔ سب کچھ مل گیا۔ گندم کاشت کرنے سے کسی بھی مخصوص علاقے کی اکائی میں خوراک کی فراوانی ہو گئی جس کی مدد سے آدمی کو افزائش نسل کا بھرپور موقع مل گیا۔ تقریباً 13000 قبل مسیح میں جب لوگ جنگلی پودے جمع کر اور جانوروں کا شکار کر کے پیٹ بھرا کرتے تھے۔۔۔ اس وقت مثال کے طور پر فلسطین کے نخلستانی علاقے اریحا میں دستیاب وسائل زیادہ سے زیادہ سو کے قریب لوگوں، ایک چھوٹے سے قبیلے یا کنبے کی خوراک اور غذائیت کی ضروریات پوری کرنے کے لیے کافی تھے۔ لیکن 8500 قبل مسیح تک جب نخلستان سے جنگلی پودوں اور جانوروں کی جگہ گندم کے کھیتوں نے لے لی تو یہی نخلستانی زمین کا ٹکڑا تقریباً ایک ہزار دہقانوں کی بستی پر مشتمل تھا۔ یہ اور بات ہے کہ یہ ایک ہزار دہقان، پچھلے زمانے کے سو کے لگ بھگ تاختی اور شکاریوں کے مقابلے میں کمزور، کم خوراکی کا شکار اور بیماریوں کے مارے ہوئے تھے۔

یاد رکھیں، ارتقاء کی قدر و قیمت بھوک اور درد و الم سے نہیں ناپی جاتی بلکہ اس کی اصل وقعت تو ڈی این اے کے مرغولوں کی نقلیں، کسی بھی نوع کے موروثوں کی تعداد ہوا کرتی ہے۔ جس طرح ایک کمپنی کی معاشی کامیابی کا تعین اس میں کام کرنے والے ملازمین کی خوشی اور اطمینان سے نہیں بلکہ پیسے کی شکل میں منافع کی مقدار سے لگایا جاتا ہے، اسی طرح کسی بھی نوع کی ارتقائی کامیابی کا اندازہ اس نوع کی جینیاتی مادے ڈی این اے کے مرغولوں، یعنی عددی شکل میں لگایا جاتا ہے۔ اگر کسی نوع کا ڈی این اے یعنی جینیاتی مادہ فنا ہو جائے تو وہ نوع بالآخر معدوم ہو جائے گی۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے کہ جیسے اگر کوئی کمپنی پیسے کی شکل میں منافع نہیں کماتی تو وہ بالآخر دیوالیہ ہو جائے گی۔ اگر کوئی نوع بڑی تعداد میں افزائش نسل کر کے نسل در نسل جینیاتی مادے کو پھیلاتی رہتی ہے تو یہی اس کی ارتقائی کامیابی ہے۔ ڈی این اے کے مرغولوں کی کثیر تعداد سے مجموعی طور پر وہ نوع پھلتی پھولتی رہے گی۔ تو اس ارتقائی تناظر میں ڈی این اے کی ایک ہزار نقلیں، سو نقلوں سے یقیناً بہتر ہیں۔ زرعی انقلاب کی اساس یہی حقیقت ہے کہ بھلے حالات کتنے ہی بدتر کیوں نہ ہو جائیں، لوگوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد اس دھرتی پر موجود رہنی چاہیے۔

تو پھر آخر ایک فرد، انفرادی سطح پر اس ارتقائی گھن چکر کی پرواہ کیوں کرے؟ کوئی بھی ذی شعور آدمی (مرد یا عورت!) اپنے معیارِ زندگی کو صرف اس وجہ سے اتنا گرانے پر کیونکر آمادہ ہو سکتا ہے کہ خردمند آدمی کی نوع انسانی مجموعی طور پر پھلتی پھولتی رہے؟ تاریخ گواہ ہے کہ انفرادی سطح پر آدمی نے کبھی بھی اس بیوپار کو قبول نہیں کیا، وہ اس سودے پر راضی نہیں ہوا۔ لیکن آدمی نے آج تک یہ بھی نہیں مانا کہ دراصل زرعی انقلاب ایک گڑھا تھا۔ ایک ایسا چھل تھا، جس کے جال میں وہ چوہے کی طرح پھنس کر رہ گیا تھا۔ یہ ایک پھندا تھا۔ یہ عیش و عشرت کا پھندا تھا!

عیش و عشرت کا پھندا

کھیتی باڑی اور زرعی اطوار راتوں رات مقبول نہیں ہوئیں بلکہ یہ سینکڑوں اور ہزاروں سال میں بتدریج پھیلنے کا قصہ ہے۔ آدمیوں کے خانہ بدوش گروہوں اور چھوٹے قبیلوں نے یکدم ہی مشروم، گریاں اور پھل جمع کرنا یا ہرنوں اور خرگوشوں کا شکار چھوڑ نہیں دیا۔ وہ راتوں رات ہی کسی مستقل دیہات میں آن کر بسر نہیں ہوئے کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کھیتی باڑی میں مشغول ہو کر گندم بونے اور آب پاشی پر جت گئے۔ ایسا ہرگز نہیں ہوا بلکہ یہ تو بتدریج اور مرحلہ وار تبدیلی تھی اور ہر مرحلے پر روزمرہ زندگی میں چھوٹے بدلاؤ اور تغیر پیدا دیکھا گیا۔

خردمند آدمی تقریباً ستر ہزار سال پہلے مشرقِ وسطیٰ میں وارد ہوا۔ یہاں آمد کے بعد تقریباً پچاس ہزار سال تک ہمارے اجداد زراعت کے بغیر ہی پھلتے اور پھولتے رہے۔ یہاں پائے جانے والے قدرتی وسائل انسانی آبادی کو سہارا دینے کے لیے کافی تھے۔ جن برسوں میں قدرتی وسائل کی کثرت رہا کرتی تو آدمی کے یہاں بچے بھی نسبتاً زیادہ پیدا ہوتے اور جس دور میں وسائل کی کمی ہوتی تو بچوں کی تعداد بھی کم ہو جاتی۔ باقی ممالیہ جانوروں کی طرح انسانوں کے جسم میں بھی ایسے ہارمونی اور جینیاتی میکانیے پائے جاتے ہیں جو تولید اور افزائشِ نسل کو کنٹرول کرتے ہیں۔ وہ یوں کہ جب حالات اور واقعات موزوں ہوں تو مادین جلد ہی بلوغت کو پہنچ جاتی ہیں اور یوں حمل ٹھہرنے کا امکان بھی بڑھ جاتا ہے۔ اس کے برعکس جب حالات اور واقعات ناموافق ہوں تو قدرتی طور پر بلوغت بھی ٹھہر جاتی ہے اور زرخیزی بھی کم ہو جاتی ہے۔

ان قدرتی عوامل کے ساتھ ساتھ انسانی آبادیوں کو کنٹرول میں رکھنے کے لیے سماجی اور معاشرتی میکانیے بھی تھے۔ شیر خوار اور چھوٹے بچے چونکہ محتاج ہوتے ہیں، وہ چلنے پھرنے میں بھی کورے ہوتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ انھیں اچھی خاصی توجہ بھی درکار ہوتی ہے تو یوں وہ خانہ بدوش تاختیوں اور شکاریوں پر بوجھ بن کر رہ جاتے تھے۔ اسی وجہ سے قدیم آدمی بچوں میں کم از کم تین سے چار سال کا وقفہ لازمی رکھتا تھا۔ اس عرصے کے دوران عورتیں دن کے چوبیس گھنٹوں بچوں پر توجہ مرکوز رکھتیں اور ان کی دیکھ بھال کیا کرتی تھیں۔ بچوں

کو ماؤں کا دودھ پلانے کا رواج کہیں زیادہ اور طویل عرصے تک جاری رکھنے کا ہوا کرتا تھا۔ یہ سائنسی حقیقت ہے کہ بچوں کو ماں کا دودھ پلانے سے حمل ٹھہرنے کا امکان بڑی حد تک کم ہوجاتا ہے۔ اس کے علاوہ اس زمانے میں دوسرے کئی طریقے جیسے جنسی ملاپ سے عارضی یا مستقل بنیادوں پر پرہیز (معاشرتی بندش یا عقیدے کی بنیاد پر ممانعت!)، اسقاط حمل اور گاہے بگاہے چھوٹے یا بڑے پیمانے پر طفل کشی (بچوں بالخصوص لڑکیوں کو زندہ دفن کرنے وغیرہ) کا رواج بھی اسی زمانے میں شروع ہوا تھا۔

ہزاروں سال کے اس عرصے میں لوگ کبھی کبھار گندم کا استعمال کرتے تھے لیکن یہ ان کی روزمرہ خوراک کا معمولی حصہ بلکہ نہ ہونے کے برابر حصہ ہوا کرتی تھی۔ اٹھارہ ہزار سال پہلے آخری برفانی دور ختم ہوا تو گلوبل وارمنگ کا راستہ صاف ہو گیا۔ جوں جوں درجہ حرارت بڑھتا گیا، بارشیں بھی زیادہ ہوتی گئیں۔ یہ نئے ماحولیاتی حالات مشرق وسطیٰ میں گندم اور دوسرے اناج کی فصلوں کے لیے نہایت موزوں ہو گئے۔ اسی طرح کی سبھی گھاس پھونس خوب پھلنے پھولنے لگی۔ اس طرح لوگ زیادہ سے زیادہ گندم استعمال کرنے لگے اور بدلے میں لاشعوری طور پر نادانستگی میں اس کا بیج بھی دور دراز علاقوں تک پھیلانے لگے۔ لاشعوری طور پر یوں کہ جنگلی گندم اور ایسے ہی دوسرے اناج کو پچھوڑ کر چھانٹنے، پیسنے اور پکانے کے بغیر خوراک کے لیے استعمال کرنا ممکن نہیں تھا۔۔ لوگ جنگلی گندم جمع کر کے عارضی خیمہ گاہوں میں لے جاتے اور اہتمام کے ساتھ کھانے کے قابل بناتے۔ اب چونکہ گندم کا دانہ چھوٹا ہوتا ہے اور اس کی تعداد ہزاروں میں ہوتی تھی تو ان میں سے چند دانے ایک یا دوسری صورت راستوں، پگڈنڈیوں اور خیمہ گاہوں کے ارد گرد لاپرواہی کی وجہ سے گرہی جاتے تھے اور گم ہو جاتے۔ رفتہ رفتہ ایسا ہوا کہ اب انسان کے ان روزمرہ راستوں، پگڈنڈیوں اور عارضی خیمہ گاہوں کی جگہوں کے ارد گرد، زیادہ سے زیادہ گندم پائی جانے لگی۔

آدمی بہت پہلے سے جنگلوں اور گنجان جھنڈوں کو آگ سے جلا کر خوراک کے حصول کے لیے استعمال میں لاتا آیا تھا۔ اس انسانی فعل کا فائدہ بھی گندم کو ہی ہوا۔ آگ درختوں اور جھاڑیوں کے جھنڈ صاف کر دیتی تھی اور یوں گندم اور دوسری گھاس پھونس کو سورج کی روشنی، پانی اور غذائی اجزاء کی بہتات مل جاتی تھی۔ اب جہاں جہاں گندم کی بہتات ہوتی گئی، وہیں گھاس پر چرنے والے جانور بھی شکار بھی بڑی تعداد میں جمع ہو جاتے تھے۔ آدمی کے گروہوں کے لیے بتدریج آسانی بڑھتی گئی اور یوں رفتہ رفتہ وہ خانہ بدوشی کی زندگی ترک کر کے زیادہ تر موسمی اور بعض جگہوں پر مستقل بنیادوں پر بسر کرنے لگے۔

پہلے پہل ایسا رہا ہو گا کہ آدمی کے گروہ گندم کی پیداوار جمع کرنے کے لیے چار ہفتوں تک ایک ہی موسم میں کسی مخصوص جگہ پر عارضی پڑاؤ ڈالتے رہے ہوں گے۔ پھر اگلی نسل میں، جب گندم کی نسبتاً بہتات رہی ہو گی تو انھیں یہ پیداوار جمع کرنے کے لیے پانچ ہفتوں کا پڑاؤ ڈالنا پڑا ہو گا اور پھر اگلی نسل میں چھ اور یوں رفتہ رفتہ بڑھتے بڑھتے وہ مستقل طور پر یہیں کے ہو کر، مستقل بستی کی شکل میں بسر کر لی ہو گی۔ مشرق وسطیٰ کے طول و عرض میں اسی طرح بستیاں آباد ہونے کے کئی تاریخی آثار اور شواہد موجود ہیں۔ بالخصوص بحیرہ روم

سے متصل مشرقی علاقوں میں تو یہ شواہد ناقابل تردید اور بہت ہی واضح ہیں جہاں نطوفی تہذیب 12500 قبل مسیح سے 9500 قبل مسیح کے دوران اسی طرح، خوب پھلی اور پھیلی تھی۔ نطوفی پہلے پہل تاختی اور شکاری ہوا کرتے تھے جو جانوروں اور نباتات کی درجنوں اقسام کے شکار اور جمع کرنے پر گزر بسر کیا کرتے تھے لیکن پھر وہ رفتہ رفتہ مستقل دیہاتوں اور بستیوں میں آباد ہو گئے۔ اب کا زیادہ تر وقت جنگلی اناج اور غلہ جمع کر کے اسے پچھوڑ کر چھانٹنے، پیسنے اور پکانے میں صرف ہوتا تھا۔ انھوں نے اس مقصد کے لیے پتھر کے گھر اور اناج کی کوٹھیاں اور کھلیان بھی تعمیر کیا جہاں وہ ضرورت کے لیے غلہ جمع کرتے تھے۔ اسی زمانے میں انھوں نے جنگلی اناج جمع کرنے اور اسے استعمال کے قابل بنانے کے لیے مختلف اوزار جیسے فصل کاٹنے کے لیے پتھر سے بنی لاونی یا درانتی اور اسے پیسنے کے لیے پتھر کی ہی سونٹیاں، موصل اور اوکھلی کھرلیاں بھی ایجاد کیں۔

9500 قبل مسیح کے بعد یوں ہوا کہ نطوفیوں کی نئی نسلیں بدستور اناج جمع کرتی رہیں لیکن اب یہ ہوا کہ وہ اس اناج کو کاشت بھی کرنے لگے۔ جب وہ جنگلی اناج جمع کرتے تو وہ پیداوار کا کچھ حصہ اگلا موسم چڑھنے سے پہلے بونے کے لیے الگ کر لیتے تھے۔ اس عمل کے دوران انھوں نے دریافت کیا کہ اگر وہ اناج کے بیج کو بجائے زمین پر یوں ہی بے ترتیبی سے چھڑکنے کی بجائے زمین کھود کر گہرا اور قاعدے کے ساتھ بوئیں تو بہتر نتائج مل سکتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے بیلچے، کھرپے اور ہل ایجاد کیے۔

پھر، وقت کے ساتھ انھوں نے کھیتوں میں سے غیر ضروری جڑی بوٹیاں نکالنے کی اہمیت کو بھی جان لیا۔ انھیں یہ بھی پتہ چلا کہ طفیلیوں سے بچانے سے بھی پیداوار بڑھ جاتی ہے اور اگر وہ کھیتوں میں پانی ڈالیں اور زرخیزی کو بڑھائیں تو پیداوار کہیں زیادہ بڑھ جاتی ہے۔

اب چونکہ اناج کی کاشت اور کٹائی، پیداوار جمع کرنے کے لیے اچھا خاصا وقت درکار ہوتا تھا تو یوں جنگلی جانوروں کے شکار اور جنگلی نباتات کو جمع کرنے کی طرف سے دھیان ہٹ گیا۔ تاختی اور شکاری۔۔۔ دہقان بن گئے۔

یہ جست، واقعی جست نہیں تھی۔ یہ ایسا نہیں ہے کہ ایک قدم میں آدمی جنگلی گندم جمع کر رہا تھا اور اگلے ہی قدم میں اس نے گندم کی گھریلو اقسام کاشت کرنا شروع کر دیں۔ آپ ان دونوں آدمیوں میں یونہی تفریق نہیں کر سکتے بلکہ یہ نسل در نسل وقوع پذیر ہونے والا عمل ہے۔ اسی لیے یہ بتانا انتہائی مشکل ہے کہ آخر قطعی طور پر تاختی اور شکاری آدمی، دہقان کب بنا؟ زراعت کب 'ایجاد' ہوئی۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ 8500 قبل مسیح تک مشرق وسطیٰ کے طول و عرض میں مستقل انسانی بستیاں اور دیہات خوب پنپ رہے تھے۔ ان میں سے ایک اریحا کا نخلستان بھی تھا جس کے باشندے اپنا زیادہ تر وقت گندم اور دوسری اجناس کی چند گنی چنی اقسام کاشت کرنے میں صرف کرتے تھے۔

اب چونکہ آدمی مستقل بستیوں اور دیہاتوں میں سکونت اختیار کر چکا تھا اور اناج کی شکل میں خوراک کی بھی بہتات تھی تو انسانی آبادی تیزی سے بڑھنے لگی۔ خانہ بدوشی کی زندگی ترک کرنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ اب عورتیں ہر سال بچہ پیدا کر سکتی تھیں۔ شیر خواروں کو وقت سے

پہلے ہی ماں کے دودھ سے الگ کیا جاسکتا تھا اور بجائے انھیں دلیا اور حریرہ کھلایا جاسکتا تھا۔ ویسے بھی، کھیتوں اور کھلیانوں میں کام کرنے کے لیے وقت کے ساتھ زیادہ سے زیادہ انسانی وسائل درکار ہی رہتے تھے۔ جوں جوں انسانی آبادی بڑھی، خوراک کی ضروریات بھی بڑھنے لگیں۔ اب مزید کھیت اور کھلیان آباد کرنے کی حاجت محسوس ہونے لگی۔ اب چونکہ آدمی کی مستقل سکونت بیماریوں کی گڑھ بستیوں اور دیہاتوں میں رہتی تھی اور بچوں کو ماں کے دودھ کی بجائے زیادہ سے زیادہ اناج سے بنے دلیے اور خوراکیں کھلائی جاتی تھیں۔۔۔یہی نہیں بلکہ بچوں کی کثرت کی وجہ سے بچوں میں خوراک کا مقابلہ بھی رہتا تھا تو یوں بچوں میں شرح اموات بڑھنے لگیں۔ تاریخ کے آثار اور شواہد صاف بتاتے ہیں کہ تقریباً اس زمانے کے سبھی زرعی معاشروں میں کم از کم ہر تین میں سے ایک بچہ بیس سال کی عمر تک پہنچنے سے پہلے ہی مر جاتا تھا۔ اس کے باوجود افزائش نسل اتنی تیز رہی ہے کہ شرح پیدائش، شرح اموات سے کہیں زیادہ تھی۔ انسان کے یہاں، وقت کے ساتھ ساتھ ہر گھر اور خاندان میں بچوں کی تعداد بڑھتی ہی چلی گئی۔

وقت کے ساتھ 'گندم کے ساتھ یہ سودا' نہایت مہنگا پڑنے لگا۔ بچے بڑی تعداد میں مرنے لگے اور بالغان خون پسینہ ایک کرتے تو انھیں بس گزارہ لائق روٹی ملتی تھی۔ اریحا کے نخلستان میں 8500 قبل مسیح کے زمانے کا باشندہ، 9500 قبل مسیح یا 13000 قبل مسیح کے زمانے سے تعلق رکھنے والے آدمی کے مقابلے میں کہیں زیادہ سخت اور مشکل زندگی بسر کر رہا تھا۔ روز بروز سختیاں بڑھتی جا رہی تھیں لیکن کسی کو بھی یہ خیال نہیں آیا کہ آخر ایسا کیوں ہے؟ اس کی وجہ یہ تھی کہ نسل در نسل لوگ پچھلی نسل کی طرح زندگی بسر کرتے رہے اور تھوڑی بہت اور ضرورت کے مطابق ہلکے پھلکے انداز میں ڈھل جاتے تھے اور کوئی بڑی اساسی تبدیلی کے خواہاں نہیں رہے تھے۔ ضرورت کے مطابق 'ڈھلنے' کا قول و محال میں یہ ایسا تضاد تھا کہ ہر نسل کی کوشش پہلے سے کہیں زیادہ تن آسانی اور زندگی میں آسانی کے ساتھ تعبیر کی جانے لگی۔ اس تضاد کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہر نسل کے ساتھ ان دہقانوں کی گردنوں پر تن آسانی اور سہولت کا طوق وزنی ہوتا چلا گیا۔ ہر نئی نسل کی گردن پر یہ طوق ایک نئی چکی کے باٹ کی شکل میں فٹ ہوتا گیا۔

آخر آدمی اتنی بڑی غلطی، ایسی بیوقوفی کیسے کر سکتا ہے؟ اس کا جواب وہی ہے جو تاریخ بھر میں دیکھا گیا ہے۔۔۔ آدمی ہمیشہ سے ہی ایسی غلطیاں بلکہ بیوقوفی کرتا آیا ہے۔ آدمی کی ہر نئی نسل اسے تقدیر کا لکھا سمجھتی ہے لیکن حقیقت میں یہ آدمی کی ایسی کوتاہی۔۔۔ بلکہ حماقت ہے کہ جس کی بناء پر وہ اپنے فیصلوں اور افعال کے نتائج کی سنگینی کو سمجھنے سے ہمیشہ ہی قاصر رہا ہے۔ یہ آدمی کی فطرت ہے۔ یہ لوگوں کی خصلت ہے۔ جب بھی کبھی، لوگ کچھ زیادہ کام کرنے پر مائل ہوتے۔۔۔ جیسے بیج کو زمین پر چھڑکنے کی بجائے کھود کر کاشت کرنے کا فیصلہ کیا تو انھوں نے سوچا ہوگا 'ہاں۔۔۔ چلو، یہ مشکل کام ہے اور ہمیں مزید محنت کرنی پڑے گی۔ لیکن یہ بھی تو دیکھو۔۔۔ پیداوار کتنی بڑھ جائے گی؟' اس سوچ کا مطلب یہ تھا کہ ہمیں اب اس محنت کے عوض قحط سالی کے طویل برسوں سے تحفظ مل جائے گا۔ ہمارے

بچے بھوکے تو نہیں سوئیں گے۔ یہ سوچ، قابل فہم بھی تھی۔ اگر آپ زیادہ محنت اور خون پسینہ بہا کر جفاکشی کریں گے تو یقیناً بہتر زندگی حاصل ہو گی۔ یہ سادہ اور قابل عمل تدبیر تھی۔

اس تدبیر کا پہلا حصہ تو نہایت آسان تھا اور بہترین انداز میں سرانجام بھی دے دیا گیا۔ لوگوں نے بے شک خوب محنت اور مشقت کی لیکن وہ یہ جاننے میں کوتاہی برت گئے کہ اس عمل کے نتیجے میں بچوں کی تعداد بھی بڑھے گی اور یوں ان کی اضافی خوراک کی پیداوار ان بچوں میں بٹ جائے گی۔ اولین دور کے دہقان یہ سمجھنے سے بھی قاصر تھے کہ بچوں کو ماں کے دودھ کی بجائے زیادہ سے زیادہ دلیہ اور حریرہ کھلانے سے ان کا مدافعتی نظام کمزور پڑ سکتا ہے، یہی نہیں بلکہ مستقل اور گنجان بستیوں میں بسر کرنے سے متعددی امراض بھی بڑھ جاتے ہیں۔ وہ یہ پیش بینی کرنے سے بھی قاصر تھے کہ خوراک کے صرف ایک ذریعے پر توکل کر لینے سے وہ خود کو قحط اور بھوک کے خطرے کی طرف دھکیل رہے ہیں۔ وہ یہ بھی نہیں بھانپ سکے کہ اچھی فصل اور پیداوار کا مطلب یہ بھی ہوتا ہے کہ ان کی اناج کوٹھیوں، گوداموں اور کھلیانوں پر چوروں اور دشمنوں کی بھی نظر پڑ سکتی ہے جو انھیں دیواریں کھڑی کرنے اور چوکیداری جیسے نت نئے مشقتی قضیوں میں ڈال سکتے ہیں۔

تو پھر آخر، جب یہ پلان ناکام ہو رہا تھا تو انسان نے زراعت ترک کیوں نہ کر لی؟ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ آدمی کو یہاں تک پہنچنے۔۔۔ سماج کو اس شکل میں ڈھالتے ہوئے کئی کئی نسلیں لگ گئی تھیں اور اب اتنا وقت گزر چکا تھا کہ لوگ بھول چکے تھے کہ وہ کبھی مختلف، دہقانی طرز سے یکسر مختلف زندگی گزارا کرتے تھے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ انسانی آبادی میں بے پناہ اضافے نے اس کی واپسی کی ساری کشتیاں جلادی تھیں۔ اگر ہل چلانے کی صلاحیت کو ترک کر دیا جاتا تو انسانوں کی بستیوں میں خوراک کی کمی پیدا ہو جاتی اور کون آدمی چاہتا ہے کہ اس کے بیوی بچے، بہن بھائی اور ماں باپ بھوک کا شکار ہو کر مر جائیں اور وہ واپس پرانی خوش کن زندگی میں لوٹ جائے؟ اس کے لیے یہ ممکن ہی نہیں تھا۔ واپسی کا راستہ بند ہو چکا تھا۔ مثال کچھ ایسی کہ چوہا، ایسے دام میں پھنس گیا تھا کہ جس کی کڑکی کا دروازہ ہمیشہ کے لیے تڑاخ کر کے مقفل ہو چکا تھا۔

تن آسانی کی زندگی حاصل کرنے کی خواہش آدمی کو بے پناہ مصیبت اور مشقت میں دھکیل چکی تھی۔ اس کے بعد تو یہ ہر روز، ہر نسل اور ہر زمانے میں ہوتا چلا آیا ہے۔ یہ آج ہمارے ساتھ بھی ہو رہا ہے، یہ دام آج بھی پھیلا ہوا ہے۔ آپ کے ارد گرد کتنے لڑکے ہیں جو کالج میں سختی اور مشقت کا سامنا کر کے، وقت صرف کر کے اس امید پر تعلیم اور حالات کی سختی برداشت کرتے ہیں کہ انھیں کسی دن بڑی، ملٹی نیشنل کمپنی میں بھاری تنخواہ پر نوکری مل جائے گی؟ اور پھر وہ اس نوکری میں جی جان، سر اور دھڑ کی بازی لگا کر محنت کریں گے اور پینتیس سال کی عمر میں اتنی دولت جمع کر لیں گے کہ تسلی کے ساتھ ریٹائر ہو کر اپنی مرضی کی زندگی گزاریں؟ لیکن جب وہ پینتیس سال کی عمر کو پہنچتے ہیں تو سر پر بھاری قرضے ہوتے ہیں، ان کے بچے سکولوں میں پڑھ رہے ہوتے ہیں اور گھر کے خرچے بڑھتے چلے جاتے

ہیں۔ پھر انھیں خیال آتا ہے کہ یہ زندگی رہنے کے قابل ہی نہیں ہے اور اس سوچ کو شکست دینے کے لیے انھیں چھٹیوں پر چلے جانے، اچھی شراب اور موج مستی کا خیال آتا ہے جس پر الگ خرچہ اٹھتا ہے۔ وہ اس گھن چکر، اس دلدل میں گہرے ہی گہرے دھنستے چلے جاتے ہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے، یہ لڑکے کیا کریں؟ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر جنگلوں کی طرف نکل جائیں جہاں وہ جڑیں اور کھمبیاں کھود کر، خرگوشوں کا شکار کر کے گزارہ کریں گے؟ ہر گز نہیں۔۔۔ ان کے پاس صرف یہی راستہ ہے کہ وہ مزید محنت کریں، مشقت کو دگنا کریں اور غلامی کا یہ طوق بھلے جتنا بھی بھاری ہوتا جائے۔۔۔ پہنے رکھیں۔ غلامی کی یہ زندگی گزارتے چلے جائیں۔

تاریخ کا آہنی قانون یہ ہے کہ تعیشات اور تکلفات بالآخر ضرورت بن جاتے ہیں اور نت نئی پابندیوں اور تقاضوں کو جنم دیتے ہیں۔ جب لوگ کسی مخصوص تعیش یا تکلف کے عادی ہو جائیں تو وہ اس کی قدر نہیں کرتے، بجائے وہ اسی پر تکیہ کر لیتے ہیں۔ پھر ایک وقت ایسا آتا ہے کہ وہ اس کے بغیر گزارا نہیں کر سکتے۔ اس ضمن میں ہم اپنے اسی جدید زمانے سے ایک مثال لیتے ہیں۔ پچھلی چند دہائیوں میں ہم نے وقت بچانے کی غرض سے کئی ایجادات کی ہیں۔ ان ایجادات کا مقصد ہماری زندگیوں میں آسانی پیدا کرنا تھا، جیسے واشنگ مشین، ویکیوم کلینر، ڈش واشر، ٹیلی فون، موبائل فون، کمپیوٹر اور ای میل وغیرہ۔۔۔ فہرست بہت طویل ہے۔ پہلے پہل ہمیں خط لکھنے میں خاصی محنت کرنی پڑتی تھی، پھر اس کو لفافے میں بند کر کے پتہ لکھا جاتا اور ڈاک ٹکٹ چسپاں کر کے بکسے میں ڈال دیتے تھے۔ اس خط کا جواب آنے میں کئی دن، ہفتے اور یہاں تک کہ کئی کئی مہینے لگ جاتے تھے۔ آج، میں اپنے کمپیوٹر پر ایک صفحہ کھول کر منٹوں کے اندر ای میل لکھ کر دنیا کے دوسرے کونے میں بھیج دیتا ہوں اور چند منٹوں کے اندر ہی دنیا کے دوسرے کونے پر میرے برقی پتے پر فٹ سے جواب بھی آجاتا ہے۔ اس عمل سے میں نے اپنا وقت اور محنت تو بچا لی لیکن کیا اب میں زیادہ پرسکون زندگی گزار رہا ہوں؟

افسوسناک پہلو یہ ہے کہ ہماری زندگی پرسکون نہیں ہوئی۔ پہلے پہل لوگ صرف اسی وقت خط لکھتے تھے جب انھیں کسی انتہائی اہم کام سے متعلق ضرورت ہوتی تھی۔ پھر وہ کچھ بھی لکھنے سے قبل تسلی سے بیٹھ کر سوچتے تھے کہ انھیں کیا چاہیے ہے اور انھیں کیا کہنا ہے اور کیسے کہنا ہے؟ انھیں توقع ہوتی تھی کہ اس خط کے جواب میں انھیں بھی بالحاظ، بامروت اور دانشمند جواب ملے گا۔ زیادہ تر لوگ پورے مہینے میں چند خطوط سے زیادہ نہیں لکھتے تھے اور نہ ہی انھیں چند خطوں سے زیادہ جواب ملتا تھا۔ انھیں فی الفور، جلد از جلد جواب دینے کی کوئی دھن نہیں تھی۔ آج ہمیں ہر روز درجنوں کے حساب سے برقی خطوط یعنی ای میلز موصول ہوتی ہیں اور ان سب بھیجنے والوں کو توقع رہتی ہے کہ ہم جلد از جلد جواب بھی ارسال کریں۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ شاید ہم ایسا کر کے وقت بچا رہے ہیں لیکن آج صورتحال یہ ہے کہ ہم اسی چکر میں اتنی تیز رفتار زندگی کے پہیے تلے پس رہے ہیں کہ آج ہمارے شب و روز پہلے سے کہیں زیادہ مضطرب اور ہیجان سے پُر ہو چکے ہیں۔

کبھی کبھار ایسا ضرور ہوتا ہے کہ یہاں اور وہاں کوئی نہ کوئی احتجاجاً ایسا آدمی بھی نکل آتا ہے جو آج جدید دور میں بھی اپنا ذاتی ای میل اکاؤنٹ نہیں کھولتا۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے ہزاروں سال پہلے آدمیوں کے چند کنبے اور قبیلے ایسے بھی تھے جنھوں نے زراعت کا پیشہ اختیار کرنے سے انکار، کنی کنارہ کر لیا تھا اور یوں تن آسانی، تعیش اور عشرت کے دام میں پھنسنے سے بچ گئے تھے۔ لیکن زرعی انقلاب کے لیے یہ کبھی ضروری نہیں رہا کہ ہر آدمی اور خطہ اس کا حامی ہو۔ زرعی انقلاب کو اپنی بنیاد کھڑی کرنے کے لیے کسی ایک آدمی، ایک کنبے یا ایک قبیلے کی ضرورت تھی۔ جب آدمیوں کا ایک کنبہ یا قبیلہ مشرق وسطیٰ یا وسطی امریکہ میں مستقل بستی میں ٹک گیا تو پھر اس کے بعد زراعت سے چھٹکارا حاصل کرنا ممکن نہ تھا۔ اس کی دلکشی اور ترغیب سے بچ کر نکلنا انتہائی مشکل تھا۔ چونکہ زراعت ایسا ذریعہ معاش تھا کہ جس کی بناء پر انسانی آبادیاں انتہائی تیزی سے پھل پھول سکتی تھیں۔۔۔ اسی وجہ سے جلد ہی دہقانوں کی تعداد تاختیوں اور شکاریوں کے مقابلے میں بہت بڑھ گئی۔ دہقانوں کو عددی برتری حاصل ہو گئی جس کا سامنا کرنا تاختی اور نہ ہی شکاریوں کے بس کی بات تھی۔ اب تاختی اور شکاری پیچھے ہٹتے گئے اور اپنے جنگل، چراہ اور شکار گاہیں کھیتوں اور کھلیانوں کے لیے خالی کرتے گئے۔ جہاں زیادہ مسئلہ ہوتا تو وہ اپنی زندگی تو خانہ بدوشی کی ہی گزارتے رہتے لیکن دہقانوں سے فصل میں اپنا حصہ وصول کرنے لگے۔ ہر دو صورت، یہ صاف ظاہر تھا کہ قدیم طرز زندگی اپنے انجام کو پہنچ چکی تھی۔

تعیش و عشرت کے پھندے، تن آسانی کے اس دام کی کہانی میں ایک انتہائی اہم سبق چھپا ہے۔ انسانوں نے تن آسان زندگی اور تعیش و عشرت کے لیے بدلاؤ کی ایسی بے پناہ قوتوں کا دہانہ کھول دیا ہے جس کی کسی کو کبھی نہ خواہش رہی ہے اور نہ ہی ان کے بارے علم تھا۔ تاریخ گواہ ہے کہ کسی نے انسان پر زراعت کو مسلط نہیں کیا اور نہ ہی انسان کے لیے غلہ اور اناج پیدا کرنے کی زور زبردستی تھی۔ انسان نے اپنی تاریخ میں، ہمیشہ کی طرح اپنا پیٹ بھرنے اور زندگی میں تھوڑا سا تحفظ حاصل کرنے کے لیے انتہائی معمولی اور ادنیٰ فیصلے ایسے اٹھائے کہ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آزادمنش تاختی، شکاری اور خانہ بدوش آدمی اپنی تمام تر زندگی، دن بھر تپتے ہوئے سورج کے نیچے غلامی کا طوق پہنے پانی ڈھوتے، جڑی بوٹیاں کھودتے اور فصلیں کوٹنے میں صرف کر دیتا ہے۔

خداوندی شفاعت

یہ خاکہ ظاہر دار ہے کہ دراصل زرعی انقلاب ایک حماقت تھی۔ آدمی کا حساب غلط ہو گیا۔ تاریخ میں آدمی کی اس سے کہیں بڑھ کر بیوقوفیاں بھری پڑی ہیں لیکن اس ضمن میں ایک امکان اور بھی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ آدمی کی اس کایا پلٹ کی وجہ صرف تن آسان زندگی کی تلاش نہ رہی ہو۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ آدمی کی دوسری تمنائیں بھی رہی ہوں۔ وہ جان بوجھ کر، سوچتے سمجھتے ہوئے اس راہ پر چل پڑا ہو اور اپنی من مرضی سے ان تمناؤں کو پورا کرنے کے لیے زندگی کو مشکل سے مشکل تر بناتا چلا آیا ہو؟

سائنسدانوں کا معاملہ یہ ہے کہ وہ تاریخ میں برپا ہوئے واقعات کو معیشت اور شماریات کے سرد عوامل کے ساتھ جوڑنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ یہ قدرتی امر ہے کیونکہ یہ طریق عقل اور ریاضی کے اصولوں، ان ذی شعور عوامل کے ساتھ فٹ بیٹھتا ہے۔ لیکن جدید تاریخ کے معاملے میں یہی محققین کسی طور بھی غیر مادی عوامل جیسے نظریات اور تہذیبی اجزاء کو نظرانداز نہیں کرتے۔ وہ تاریخ جو لکھی جا چکی ہے، اس میں موجود ثبوت ان کا ہاتھ روک دیتے ہیں۔ آج ہمارے پاس لاتعداد ایسے شواہدی دستاویز خطوط، مضامین اور یادداشتوں کی صورت موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ جنگ عظیم دوئم صرف خوراک کی کمی اور آبادیاتی دباؤ کا نتیجہ نہیں تھی۔ جہاں یہ، وہیں ہمارے پاس ایسے کوئی تحریری شواہد موجود نہیں ہیں جو ہمیں نطوفی تہذیب کے بارے کچھ بتا سکیں۔ چنانچہ جب ہم قدیم زمانوں کی بات کرتے ہیں تو مادہ پرست اور عقلی بنیاد پرستوں کی سوچ غالب آجاتی ہے۔ یہ ثابت کرنا انتہائی مشکل ہو جاتا ہے کہ لکھائی کی ایجاد سے قبل زمانے کے لوگ بھی معاشی ضروریات کی بجائے، اپنے عقائد اور نظریات کے ہاتھوں مجبور رہا کرتے تھے۔

لیکن اس کے باوجود، چند ایک انتہائی نایاب موقعوں پر ہمیں یا وہ گوئی سے بھرپور کچھ نہ کچھ سراغ اور کھوج مل ہی جاتا ہے۔ 1995ء میں آثار قدیم کے ماہرین نے ترکی کے جنوب مشرقی علاقے میں گوبیکلی تپہ نامی مقام پر کھدائی شروع کی۔ اس زمین کی پرت در پرت نکال لی گئی لیکن کسی انسانی بستی، گھروں اور روزمرہ معمولات سے متعلق کسی شے کا سراغ نہیں ملا۔ بجائے، وہ ایک یادگار کو کھود نکالنے میں کامیاب ہو گئے۔ یہاں انھیں ایسی عمارات کے ڈھانچے ملے جس کے کئی کئی ستون تھے اور ان ستونوں پر نہایت شاندار کندہ کاری کی گئی تھی۔ پتھر سے بنے یہ ستون تعداد میں کئی تھے اور ہر ستون کا وزن سات ٹن تک رہا ہوگا اور اونچائی پانچ میٹر (ساڑھے سولہ فٹ) تک تھی۔ اسی مقام کے نزدیک ایک دوسری کھدان میں انھیں چھینی سے ترشا ہوا ایک آدھا مکمل ستون ایسا بھی ملا جس کا وزن پچاس ٹن تک تھا۔ اس مقام پر کل ملا کر ماہرین کو دس یادگاروں کے عمارتی ڈھانچے ملے تھے۔ ان میں سب سے بڑا تقریباً تیس میٹر (سو فٹ تک) پھیلا ہوا تھا۔

12 گوبیکل تپہ کے مقام پر تقریباً پانچ میٹر اونچا نقش ونگار سے مزین ستون

آثار قدیمہ کے ماہرین دنیابھر میں اس طرح کی عمارتی باقیات سے اچھی طرح واقف ہیں۔ لیکن اس کے باوجود، وہ گوبیکلی تپہ کے تاریخی مقامات کا مشاہدہ کرتے گئے تو ان پر دلچسپ اور انتہائی نایاب حقائق واضح ہوتے گئے۔ برطانیہ میں پایاجانے والا مشہور سنگی گھیرا 2500 قبل مسیح کے دور سے تعلق رکھتا ہے اور یہ ایک زرعی معاشرے کے دہقانوں کی تخلیق تھی۔ گوبیکلی تپہ میں ملنے والے آثار 9500 قبل مسیح کے دور سے تعلق رکھتے ہیں اور دستیاب شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ یہ یادگاری عمارات قدیم تاختی اور شکاری معاشروں نے تخلیق کیے تھے۔ دنیابھر میں آثار قدیمہ کا مطالعہ کرنے والے سائنسدان اس نئی دریافت پر دم بخود تھے۔ وہ ان نئے مشاہدات پر بھروسا کرنے سے ہچکچانے لگے۔۔۔ بلکہ کہیے، انھیں اعتبار ہی نہ آتا تھا۔ لیکن لیبارٹریوں میں ایک کے بعد ایک تجزیے اور تجربات نے اول تو ان یادگاروں کی درست تاریخ ثابت کی اور اس کے ساتھ ساتھ زرعی معاشروں سے قبل زمانے کے معماروں بارے بھی پتہ دیا۔ قدیم دور کے تاختی آدمیوں کی صلاحیتیں اور ان کی تہذیب اور تمدن کی پیچیدگیاں ہمارے اندازوں سے کہیں آگے، کہیں بڑھ کر تھیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر ایک تاختی معاشرے کو ایسی یادگاریں تعمیر کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ اس ضمن میں کوئی افادیت بھی نظر نہیں آتی۔ یہ مقامات میمتھ ہاتھیوں کے لیے ذبیح خانے بھی نہیں تھے اور نہ ہی یہاں بارش سے بچاؤ ممکن تھا اور یہ جنگلی درندوں سے چھپ کر رہنے کی جا بھی نہیں تھی۔ ان یادگاروں کی تعمیر کی صرف ایک ہی وجہ ہے جو اس علاقے کی ثقافت اور تہذیب سے جڑتی ہے۔ آثار قدیمہ کے ماہرین اس کو حل کرنے اور سمجھنے سے اب تک قاصر ہیں لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان تعمیرات کا تعلق عقائد سے جڑا ہے۔ یہ عمارات جس شے سے بھی تعلق رکھتی ہوں لیکن یہ طے ہے کہ تاختی لوگوں کو ان کی تعمیر میں بے پناہ محنت، توانائی اور وقت صرف کرنا پڑا ہوگا۔ گوبیکلی تپہ کی عمارات تعمیر کرنے کی صرف ایک ہی صورت رہی ہوگی کہ ہزاروں قدیم آدمی (یعنی تاختی اور شکاری) جو کئی کئی کنبوں اور مختلف قبائل سے تعلق رکھتے ہوں۔۔۔ مل جل کر طویل عرصے تک تعاون اور اشتراک قائم کرکے یہ کام کیا کریں۔ اس ساری مشقت اور تعاون کی صورت صرف اور صرف کسی بے انتہا ثقیف مذہبی یا نظریاتی عقیدے کی پیروکاری میں ہی نظر آسکتی ہے۔

گوبیکلی تپہ کے مقام پر ایک اور راز بھی چھپا ہوا تھا۔ کئی برسوں تک جینیات کے ماہرین آج گھریلو سطح پر استعمال ہونے والی گندم کی حسب نسب تلاش کرتے رہے ہیں۔ اب پتہ چلا ہے کہ گندم کی ایک عام قسم جسے 'تک دانہ' کہا جاتا ہے۔۔۔اس کا اصل گھر قرجہ داغ کی پہاڑیوں میں رہا ہے۔ قرجہ داغ کی پہاڑیاں گوبیکلی تپہ سے صرف تیس کلومیٹر دور واقع ہے۔

13 گوبیکلی تپہ کے مقام پر دریافت ہونے والے آثار قدیمہ

یہ اتفاق نہیں ہے۔ یہ عین ممکن ہے کہ گوبیکلی تپہ کے مقام پر واقع تہذیب کا مرکز کسی نہ کسی طور گندم کو سدھا کر گھریلو بنانے کی شروعات سے جڑا ہوا ہے یا کہیے، گندم کے ہاتھوں نوع انسانی کو سدھانے سے جڑا ہے۔ وہ تمام لوگ جنھوں نے ان یادگاری عمارات کی تعمیر میں حصہ لیا تھا، یقیناً ان کے لیے بالخصوص خوراک کے وسیع ذخائر درکار رہے ہوں گے۔ یہ تاریخی شواہد بتاتے ہیں کہ عین ممکن ہے کہ تاختی آدمی جنگلی گندم جمع کرنے کی بجائے اس کی کاشت کر طرف اس لیے مائل ہوا ہو کیونکہ خوراک کی عمومی ضروریات تو بخوبی پوری ہو رہی تھیں لیکن ایک 'مندر' تعمیر کرنے اور اسے کامیابی سے چلانے کے لیے بہر حال اضافی خوراک چاہیے تھی۔ انسانی اطوار کی ایک روایتی شبیہ میں یہ دیکھا جاسکتا ہے کہ اولین آدمی نے پہلے پہل ایک بستی آباد کی۔ جب یہ بستی پھلنے پھولنے لگی تو انھوں نے عین وسط میں ایک 'مندر' تعمیر کیا۔ لیکن گوبیکلی تپہ میں یہ معاملہ الٹ ہے۔ آثار یہ بتاتے ہیں کہ غالباً 'مندر' پہلے تعمیر کیا گیا تھا اور پھر ارد گرد بستیاں آباد ہونا شروع ہوئی تھیں۔

انقلاب کی بھینٹ

انسان اور اناج کے بیچ روح تک کو بیچ دینے جیسا سودا، تاریخ میں اس طرز کا واحد بیوپار نہیں ہے۔ اس انقلاب کے نتیجے میں ایسا ہی ایک دوسرا کاروبار جانوروں جیسے بھیڑ، بکری، سور اور مرغی وغیرہ کے مقدر میں بھی ابد تک بربادی لکھ گیا۔ آدمیوں کے وہ خانہ بدوش گروہ جو جنگلی بھیڑوں کا پیچھا کر کے شکار کیا کرتے تھے۔۔۔ انھوں نے بتدریج ان ریوڑوں کی بنیادی ساخت میں تبدیلی لانی شروع کر دی۔ غالباً اس عمل کا آغاز شکار میں انتخابی رجحان سے شروع ہوا ہو گا۔ آدمیوں نے سیکھا ہو گا کہ جنگلی بھیڑوں کے ریوڑ میں زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کا گر یہ ہے کہ سب سے پہلے جوان مینڈھوں، بڈھی بھیڑوں اور بیمار جانوروں کا شکار کیا جائے۔ وہ زرخیز بھیڑوں اور چھوٹے میمنوں کو چھوڑ دیا کرتے ہوں گے تا کہ اس مقامی ریوڑ کی طویل عرصے تک پیداواری صلاحیت کو برقرار رکھا جائے۔ اس عمل میں دوسرا قدم یہ رہا ہو گا کہ انھوں نے اس ریوڑ کی جنگلی درندوں جیسے شیر اور بھیڑیوں اور دوسرے شکاریوں جیسے آدمی کے دوسرے گروہوں سے حفاظت کا انتظام کرنے کا آغاز بھی کیا ہو گا۔ پھر اگلے قدم میں اپنی آسانی کے لیے ان ریوڑوں کو مخصوص علاقے جیسے گھاٹیوں وغیرہ کے آس پاس محدود رکھتے ہوں گے تا کہ سہولت کے ساتھ کنٹرول اور حفاظت کر سکیں۔ بالآخر، لوگ بھیڑوں میں محتاط طریقے سے مزید بہتر چناؤ بھی کرنے لگے ہوں۔ مراد یہ کہ اس مرحلے تک پہنچ کر صرف وہی جانور ریوڑ میں بچ رہتے تھے جو انسانی ضروریات کو پورا کرنے کی زیادہ سے زیادہ صلاحیت رکھتے تھے۔ وہ منہ زور اور غصہ ناک مینڈھے جو سخت مزاحمت کرتے۔۔۔ سب سے پہلے ذبح کیے جاتے۔ اسی طرح دبلی پتلی اور متجسس بھیڑیں بھی سب سے پہلے کٹتی تھیں۔ چرواہے، ریوڑ میں ان جانوروں کو ہر گز پسند نہیں کرتے جن کا تجسس اور عادت انھیں اور خود اپنے آپ کو باقی ریوڑ سے دور لے جائیں۔ چنانچہ ہر نئی نسل کے ساتھ ریوڑ میں بھیڑیں موٹی اور تازی، بے انتہا صلح جو، سخت اطاعت شعار اور کم سے کم متجسس ہوتی گئیں۔ جہاں پہلے آدمی جنگلی بھیڑوں کے پیچھے مارا مارا پھرتا تھا، اب بھیڑوں کے ایسے ریوڑ اور ایسی قسم 'وجود میں آ گئی کہ بعد اس کے، جہاں آدمی جاتا تھا۔۔۔ یہ بھیڑیں اس کے پیچھے ماری ماری پھرتی تھیں۔

اس ضمن میں ایک دوسرا طریقہ یہ رہا ہو تا ہو گا کہ شکاری بجائے مارنے کے، میمنوں کو پکڑ لیا کرتے تھے۔ انھیں خوب کھلاتے پلاتے اور پھر جب تنگی کا وقت آتا تو ان موٹی تازی، فربہ جوان بھیڑوں اور مینڈھوں کو ذبح کر لیا کرتے ہوں گے۔ ایک وقت ایسا آیا ہو گا کہ وہ ایسی پھانسے گئے میمنوں کی تعداد بڑھاتے چلے گئے ہوں گے، جن میں سے اکثر بلوغت تک پہنچ کر بچے پیدا کرنے لگے ہوں گے۔ جیسے مینڈھے، ویسے ہی میمنے۔۔۔ وہ جو سب سے زیادہ غصہ ناک اور سرکش ہوتے، سب سے پہلے ذبح ہوتے۔ ان میں سب سے زیادہ

فرمانبردار اور پر کشش میمنوں کو رہنے دیا جاتا اور وہ بڑے ہو کر افزایش نسل کرتے۔ اس کا نتیجہ بھی گھریلو سطح پر پالتو اور نہایت اطاعت شعار بھیڑوں کے ریوڑ کی صورت نکلتا۔

یوں، یہ سارے سدھائے ہوئے پالتو جانور جیسے بھیڑیں، مرغیاں، گدھے اور دوسری کئی اقسام اب خوراک جیسے گوشت، دودھ اور انڈوں کے لیے پالے جانے لگے۔ خوراک کے علاوہ ان سے خام مال جیسے چمڑی اور اون وغیرہ بھی مل جاتی تھی اور اسے زور آور کاموں کے لیے بھی استعمال کیا جاسکتا تھا۔ باربرداری، نقل و حمل، ہل چلانا، پیسئے اور دوسرے کام اب کافی آسان ہو گئے ہوں گے۔ تب سے اس وقت تک جن کاموں کا انحصار انسانی پٹھوں پر رہا کرتا تھا، اب وہی مشقت جانوروں کو منتقل ہو گئی۔ تقریباً سبھی زرعی معاشروں میں لوگوں کی ساری توجہ فصلوں کی کاشت پر مرکوز رہتی تھی۔۔۔ جانور وغیرہ پالنا تو ثانوی تھا۔ لیکن بعض علاقوں میں ایسے معاشرے بھی تشکیل پائے جو صرف اور صرف جانور پالنے کا کام کرتے اور جانوروں کے ہی استحصال سے کام لے کر روزمرہ زندگی اور معاش میں استفادہ حاصل کرتے۔ انھیں گلہ بان یا گڈریے کہا جاتا ہے۔

جوں جوں دنیا میں انسان پھیلتے گئے، ان کے پالتو جانور بھی ساتھ ساتھ گئے۔ دس ہزار سال پہلے صرف افریشیائی علاقوں میں چند لاکھ بھیڑیں، گائیں، بکریاں، سور اور مرغیاں ہوا کرتی تھیں۔ آج پوری دنیا میں غالباً ایک ارب بھیڑیں، ایک ارب سور، ایک ارب سے زیادہ گائیں اور پچیس ارب سے زیادہ مرغیاں پائی جاتی ہیں۔ یہ جانور صرف افریشیائی علاقوں میں نہیں بلکہ پوری دنیا میں پائے جاتے ہیں۔ پالتو مرغی وہ پرندہ ہے جو غالباً اپنی انواع میں سب سے زیادہ پھلنے اور پھولنے والا اول ہے۔ دنیا میں آدمی کی نوع کے بعد گھریلو سطح پر پالی جانے والی گائے، سور اور بھیڑ وہ ممالیہ جانور ہیں جو اس قدر کثیر تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ اگر جینیاتی مادے یعنی ڈی این اے کی نقلوں کی تعداد کو ارتقائی کامیابی کے نکتہ نظر سے دیکھا جائے تو زرعی انقلاب پالتو مرغی، گائے، سور اور بھیڑ بکریوں کے لیے انتہا سودمند ثابت ہوا ہے۔

لیکن بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ ارتقائی نکتہ نظر کامیابی کا نامکمل پیمانہ ہے۔ یہ پیمانہ ہر جاندار کو بقا اور افزایش نسل کی نظر سے ہی پرکھتا ہے۔ یہ انفرادی سطح پر جانداروں کی خوشی، طمانیت اور دکھ والم کو ہرگز خاطر میں نہیں لاتا۔ پالتو مرغیاں اور گائیں وغیرہ ارتقائی لحاظ سے کامیابی کی معراج ضرور ہیں لیکن یہ آج تک دنیا میں پائی جانے والی سب سے بڑھ کر، بے انتہا بدنصیب اور خستہ حال مخلوقات بھی ہیں۔ جانوروں کو سدھا کر پالتو بنانے کی بنیاد سخت بیہمانہ اور سفاک مشقوں پر رکھی گئی تھی جو وقت کے ساتھ، صدیوں کی دھول میں مزید سنگدل اور وحشی ہوتی گئیں۔

جنگلی مرغوں کی طبعی عمر سات سے بارہ سال تک ہوتی ہے جبکہ ایک اوسط جنگلی گائے بیس سے پچیس برس تک جیتی ہے۔ جنگل میں زیادہ تر مرغیاں اور گائیں اگرچہ اپنی طبعی عمر سے کہیں پہلے مر کھپ جاتی ہیں لیکن جتنا عرصہ بھی زندہ رہیں، وہ قدرے معقول حالت میں

باقی رہتی ہیں۔ اس کے برعکس پالتو مرغیوں اور گائیوں کو اپنی عمر کے چند ہفتوں سے لے کر چند مہینوں کے اندر ہی ذبح کر دیا جاتا ہے کیونکہ معاشی نکتہ نظر سے آدمی کے لیے ان پالتو جانوروں کی یہی عمر منافع بخش ہوتی ہے۔ ایک مرغے کو تین سال تک کیوں کھلاتے رہیں جبکہ وہ اپنا وزن تین مہینوں میں ہی پورا کر لیتا ہے؟

انڈے دینے والی مرغیاں، دودھ دینے والی گائیں اور مال برداری کے کام آنے والے دوسرے جانوروں کو مزید چند برسوں تک زندہ رہنے دیا جاتا ہے۔ لیکن ان کی یہ جان بخشی دراصل ان کی ایسی طرز زندگی کی شکل میں برآمد ہوتی ہے جو ان کی فطرت، تقاضوں اور خواہشات کے عین خلاف ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر اس میں قطعی کوئی شک نہیں ہے کہ یقیناً بیل اپنے شب و روز 'بن مانس' کی ایک قسم کے ہاتھوں چابک کھا کر دن بھر وزنی ریڑھے کھینچنے اور کھیتوں میں ہل کی جوڑی میں جتے رہنے کی بجائے کھلے میدانوں اور چراگاہوں میں آزاد گھومتے اور دوسری گائیوں اور بیلوں کے ساتھ بتانا پسند کرے گا۔

بیلوں، گھوڑوں، گدھوں اور اونٹوں کو سدھانے کے لیے لازم ہے کہ ان کی فطری جبلت کو دبا، سماجی جوڑ کو توڑ، غصے اور جنسی جارحیت کو قابو میں لا کر گھومنے پھرنے کی آزادی کو سلب کر لیا جائے۔ دہقانوں نے ایسی ایسی تکنیک ایجاد کی جو یہ سارے مقاصد پورے کرتی تھی۔ مثلاً ان جانوروں کو باڑے اور پنجروں میں قید رکھا جاتا ہے، نتھنوں میں سوراخ کر کے لگام اور باگ، پیٹھ پر کاٹھی چڑھائی جاتی ہے، کھروں میں نعل ٹھونکی جاتی ہے، چھڑی اور سونٹیوں سے کچوکے لگا کر دق کیا جاتا ہے اور اعضاء بھی کاٹ دیے جاتے ہیں۔ سدھانے کے لیے تقریباً ہمیشہ ہی نر جانوروں کو خصی ضرور کیا جاتا ہے۔ خصی کرنے سے نر جانوروں کا غصہ اور سرکشی کم ہو جاتی ہے جبکہ آدمی نہایت آسانی کے ساتھ اپنے ریوڑ کی افزائش پر نظر رکھ سکتا ہے۔

14 ایک مصری مقبرے پر مصوری کا نمونہ جو 1200 قبل مسیح سے تعلق رکھتا ہے۔ بیلوں کی جوڑی ہل چلانے پر مامور ہے۔ جنگلی ماحول میں بیل کھلے پھرتے تھے اور اپنے تئیں پیچیدہ سماجی ساخت سے تعلق رکھتے تھے۔ (نوٹ: اس فن پارے میں دہقان کی جھکی ہوئی جسامت پر بھی نظر رکھیں۔ بیلوں کی طرح یہ بھی اپنی پوری زندگی جبر اور مشقت میں گزار دیتا ہے، جو اس کے جسم، دماغ اور سماجی تعلقات کی قیمت میں ادا ہوتی ہے)۔

نیوگنی کے کئی معاشروں میں روایتی طور پر کسی بھی شخص کی دولت کا اندازہ اس کی ملکیت میں سوروں کی تعداد سے لگایا جاتا ہے۔ شمالی نیوگنی میں دہقان سوروں کو بھاگنے سے دور رکھنے کے لیے ہر سور کی ناک کا ایک حصہ کاٹ دیتے ہیں۔ جب ناک کٹا سور سونگھنے کی کوشش کرتا ہے تو نتھنوں میں سخت درد ہوتا ہے۔ اب چونکہ سور ادھر ادھر سونگھے بغیر راستہ تلاش کر سکتا ہے اور نہ ہی خوراک حاصل کر سکتا ہے تو یہ اذیت اسے مکمل طور پر اپنے مالک کا محتاج بنا دیتی ہے۔ نیوگنی کے ہی ایک دوسرے علاقے میں زندہ سور کی آنکھیں نکال لینے کا رواج پایا جاتا ہے تا کہ وہ دیکھنے کے قابل ہی نہ رہے اور کہیں بھی بھاگ جانے کا ذرا سا بھی احتمال جاتا رہے۔

اسی طرح دودھ اور ڈیری کی انڈسٹری میں بھی جانوروں کو اپنی مرضی پر چلانے کے کئی ظالمانہ طریقے ہیں۔ گائیں، بکریاں اور بھیڑیں وغیرہ بچھڑوں اور میمنوں کو جنم دینے کے بعد ہی دودھ دینے کے قابل ہوتی ہیں اور صرف اس وقت تک دودھ دیتی ہیں جب تک بچھڑے اور میمنے دودھ پیتے ہیں۔ چنانچہ کسی بھی جانور کے دودھ کی پیداوار حاصل کے لیے ضروری ہے کہ بچھڑے اور میمنے پیدا کروائے جائیں لیکن ساتھ ہی ساتھ ان بچھڑوں اور میمنوں کو ماں کے دودھ سے دور بھی رکھا جائے۔ تاریخ بھر میں اس مقصد کے لیے سب سے عام طریقہ یہ استعمال کیا جاتا رہا ہے کہ بچھڑوں اور میمنوں کو پیدائش کے فوراً بعد ذبح کر لیا جائے اور ماں سے جتنا دودھ ہو، نکال کر اس کا دوبارہ سے حمل ٹھہرا دیا جائے۔ یہ آج بھی وسیع پیمانے پر استعمال ہونے والی تکنیک ہے۔ کئی جدید ڈیری فارموں پر ایک گائے عام طور پر پانچ سال تک زندہ رہتی ہے اور پھر اسے ذبح کر لیا جاتا ہے۔ ان پانچ سالوں میں یہ گائے تقریباً ہر وقت ہی حمل

سے رہتی ہے۔ بچھڑے کو جنم دینے کے تقریباً ساٹھ سے ایک سو بیس دنوں کے اندر اسے دوبارہ حاملہ بنادیا جاتا ہے۔ ان ساٹھ سے ایک سو بیس دنوں میں جس قدر ہو، مسلسل دودھ دوہا جاتا ہے۔ اس کے بچھڑوں کو پیدائش کے فوراً بعد ہی اس سے الگ کر دیا جاتا ہے۔ ان بچھڑوں میں بچھیوں کو دودھ دینے والی گائے کی اگلی نسل کے لیے محفوظ کر لیا جاتا ہے جبکہ بچھڑوں کو گوشت کی انڈسٹری میں کٹنے کے لیے بھجوادیا جاتا ہے۔

ایک دوسرا طریقہ یہ ہے کہ بچھڑوں اور میمنوں کو ماؤں کے قریب ہی رہنے دیا جاتا ہے لیکن فریب اور داؤ سے انھیں زیادہ دودھ پینے سے باز رکھا جاتا ہے۔ اس ضمن میں سادہ ترین تکنیک یہ ہوتی ہے کہ بچھڑا یا میمنا جیسے ہی دودھ پینے لگتا ہے تو اسے فوراً ہی، جب دودھ بہنا شروع ہو تو الگ کر دیا جاتا ہے۔ اس طریقے کے استعمال سے عام طور پر بچھڑوں، میمنوں اور ماؤں کی طرف سے سخت مزاحمت دیکھنے میں آتی ہے۔ بعض گلہ بان قبیلوں کے یہاں بچھڑوں اور میمنوں کو پیدائش کے فوراً بعد ہی ذبح کر کے گوشت استعمال کر لیا جاتا تھا لیکن چمڑی میں گھاس پھونس اور بھوسہ بھر دیا جاتا تھا۔ اس بھس بھرے بت کو دودھ دوہنے کے وقت ماں کے قریب کر دیا جاتا تا کہ وہ بچے کا دھوکہ کھا کر زیادہ سے زیادہ دودھ قدرتی طور پر تھن میں اتارے۔ سوڈان میں ایک قبیلہ ہے، جسے نویر کہا جاتا ہے۔ نویر قبیلے میں تو یہاں تک کیا جاتا ہے کہ بھس بھرے بچھڑوں کے بت پر گائے کا پیشاب بھی مل دیا جاتا ہے تا کہ ماں کو نقلی بچھڑے میں اپنی خوشبو اور انس محسوس ہوا کرے۔ نویر قبیلے میں ہی ایک دوسری تکنیک یہ استعمال کی جاتی ہے کہ بچھڑے کے منہ پر خاردار کڑا باندھ دیا جاتا ہے۔ یہ بچھڑا جب تھن سے منہ لگا کر دودھ پینے کی کوشش کرتا ہے تو اسے سخت چبھن ہوتی ہے اور یوں وہ دودھ پینا چھوڑ دیتا ہے۔ صحرائے صحارا میں اونٹ پالنے والا ایک قبیلہ ہے، جسے طوارق کہا جاتا ہے۔ طوارق قبیلے کے لوگ اونٹ کے بچھڑوں کی ناک اور اوپر لے ہونٹوں کو کڑو کر سوراخ کر لیے جاتے ہیں یا تیز نوکدار چیز سے کاٹ لگا دی جاتی ہے۔ اس سے یہ اونٹ دودھ پینے کی کوشش میں سخت تکلیف محسوس کرتے ہیں اور زیادہ دیر تک تھن سے دودھ پینے سے باز رہتے ہیں۔

زراعت سے منسلک سبھی معاشرے اپنے پالتو جانوروں کے ساتھ ایسا ظالمانہ سلوک نہیں کرتے تھے۔ کئی پالتو جانوروں کی زندگی اچھی بھلی بھی ہو سکتی ہے۔ مثال کے طور پر اون کے لیے پالی جانے والی بھیڑیں، پالتو کتے، پالتو بلیاں، جنگی اور ریس لگانے والے گھوڑے وغیرہ کافی متمول اور آسودہ زندگیاں بسر کرتے ہیں۔ رومی سلطنت کے شہنشاہ کالیگولا نے اپنے پسندیدہ گھوڑے کو باقاعدہ اپنی سفارت کے لیے عہدہ دینے کا منصوبہ بھی بنایا تھا۔ گلہ بانوں اور دہقانوں نے تاریخ بھر میں اپنے پالتو جانوروں کے لیے انس اور دیکھ بھال کا بھی خوب انتظام کیا ہے لیکن ان کا یہ انس اور رغبت اتنی ہی تھی جتنی کہ کسی مالک کی اپنے غلام کے ساتھ ہو سکتی ہے۔ اسی لیے، یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہے کہ تاریخ بھر میں بادشاہوں اور پیغامبروں نے ہمیشہ ہی خود کو چرواہوں کی مثال بنا کر پیش کیا۔ وہ ثابت کرتے کہ ان

کے خدا اور وہ خود قوم کے لوگوں کا ایسا ہی خیال اور دیکھ بھال رکھتے تھے جیسے کوئی چرواہا اپنی بھیڑوں کے ریوڑ کا دھیان، درد اور خیال رکھ سکتا ہے۔

15 گوشت کے ایک جدید زرعی فارم پر بندھا ہوا بچھڑا۔ پیدائش کے فوراً بعد ہی اس بچھڑے کو ماں سے الگ کر کے ایسے پنجرے نما ڈربے میں بند کر دیا جاتا ہے جس میں اس پورا جسم بھی فٹ نہیں آتا۔ یہ بچھڑا اسی ڈربے میں اپنی پوری زندگی گزار دیتا ہے، جو اوسطاً چار ماہ سے زیادہ نہیں ہوتی۔ یہ اس ڈربے سے باہر نہیں نکل سکتا، دوسرے بچھڑوں کے ساتھ کھیل کود بھی نہیں کر سکتا کیونکہ اس سے پٹھے سخت ہونے کا احتمال ہوتا ہے۔ نازک پٹھوں کا مطلب یہ ہے کہ اس کے گوشت سے بہترین قتلے تیار ہو سکتے ہیں۔ اس بچھڑے کو اگر حرکت کرنے، دوسرے بچھڑوں کے ساتھ میل جول کا اگر کوئی موقع ملتا بھی ہے تو وہ ذبح خانے کی طرف ترسیل کے دوران ملتا ہے۔ ارتقائی لحاظ سے دیکھا جائے تو گائے اور بیل ایک نہایت کامیاب نوع اور جنس ثابت ہوئے ہیں لیکن انفرادی سطح پر ڈھور ڈنگر کی زندگی کسی جہنم سے کم نہیں ہوتی۔

لیکن چرواہوں اور گلہ بانوں کے نقطہ نگاہ سے دیکھنے کی بجائے ریوڑ کی نظر سے دیکھا جائے تو پتہ چلے گا کہ زرعی انقلاب ان ریوڑوں اور سدھائے ہوئے جانوروں کے لیے سراسر تباہی اور مصیبت، قہر بن کر گرا ہے۔ ان جانوروں کی 'ارتقائی کامیابی' بے معنی ہے۔ کسی نایاب نسل سے تعلق رکھنے والا دنیا کا آخری گینڈا جو معدومیت کے دہانے پر کھڑا ہو۔۔ وہ بھی ان گائیوں اور بھیڑ بکریوں سے کئی درجے بہتر ہے جن کی محدود عمر ایک چھوٹے سے ڈربے میں بند ہو کر گزرتی ہے اور انھیں کھایا پلایا، موٹا اور فربہ اس لیے کیا جاتا ہے کیونکہ ذبح کر کے زیادہ سے زیادہ گوشت حاصل ہو۔ یہ مطمئن گینڈا، معدوم ہوتے ہوئے اور یہ جان بھی لے کہ وہ اپنی قسم کا آخری گینڈا

ہے۔۔۔پھر بھی آسودہ خاطر ہی رہے گا۔ اسے ارتقائی کامیابی یا ناکامی سے کوئی سروکار نہیں ہوگا۔ گائیوں، بکریوں اور بھیڑوں کی نسلوں کے لیے اپنی انواع کی بقا کی خبر کوئی اتنی خوش کن نہیں ہوگی جتنی کہ ہر گائے، بھیڑ اور بکری کے لیے انفرادی سطح پر آدمی کا ستم جھیلنے میں تکلیف رہتی ہے۔

زرعی انقلاب سے حاصل ہونے والا سب سے اہم سبق دراصل ارتقائی کامیابی اور انفرادی سطح پر پائی جانے والی اذیت میں تضاد ہے۔ یہ درست ہے کہ جب ہم گندم، مکئی اور چاول وغیرہ جیسی نباتات کا مطالعہ کرتے ہیں تو ارتقائی تناظر انتہائی معنی خیز معلوم ہوتا ہے۔ لیکن جانوروں میں یہ معاملہ یکسر مختلف ہے۔ جانوروں میں۔۔۔یعنی گائیں، بھیڑ، بکریوں اور انسانوں کی دنیا احساسات اور جذبات کی پیچیدگیوں سے پُر دنیا ہے۔ ہمیں ارتقائی کامیابیوں کے ساتھ ساتھ انفرادی سطح پر پائے جانے والا تجربہ بھی خاطر میں لانا پڑتا ہے۔ اگلے ابواب میں ہم دیکھیں گے کہ ہر زمانے میں ہماری نوع انسانی کو اجتماعی طور پر کس قدر طاقت اور نمایاں کامیابیاں حاصل ہوئی ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ انفرادی سطح پر ہر آدمی کو مصیبت اور اذیت کے کیسے کیسے پہاڑ کاٹنے پڑے ہیں۔

اہرام کی تعمیر

زرعی انقلاب تاریخ میں پیش آنے والا ایک انتہائی متنازعہ ماجرا ہے۔ اس کے حامی گردانتے ہیں کہ زرعی انقلاب کے نتیجے میں نوع انسانی ترقی اور خوشحالی کی راہ پر چل پڑی تھی جبکہ مخالفین کا ماننا ہے کہ اس قضیے نے انسان کو روحانی موت مار کر ستیاناس کر دیا۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ وہ موڑ تھا جب آدمی نے فطرت کے ساتھ ناطہ توڑ کر لالچ اور بیگانگی کی راہ اختیار کر لی۔ یہ راستہ جہاں بھی جاتا ہو، اس پر واپسی کی صورت باقی نہیں رہی۔ زراعت کے نتیجے میں انسانی آبادی اس قدر بنیاد پرستی اور تیزی سے پھیلی کہ کسی بھی زرعی معاشرے کے لیے تاختی دور میں واپس جانا ممکن نہیں رہا۔ 10000 قبل مسیح کے آس پاس، جب تاختی ابھی مکمل طور پر زراعت کی جانب راغب نہیں ہوئے تھے، اس وقت کرہ ارض پر پچاس سے اسی لاکھ تک خانہ بدوش تاختی بسر رکھتے تھے۔ پہلی صدی عیسوی میں تاختی خانہ بدوشوں کی تعداد گھٹ کر دس سے بیس لاکھ رہ گئی۔ ان میں زیادہ تر آسٹریلیا، امریکہ اور افریقہ میں بستے تھے۔ یہ اس دور کی بات ہے جب دنیا بھر میں دہقانوں کی تعداد پچیس کروڑ سے تجاوز کر چکی تھی۔

دہقانوں کی اکثریت مستقل بستیوں میں رہائش پذیر تھی باقی ان میں بعض ایسے تھے جو خانہ بدوش گلہ بان تھے۔ بستیوں میں آباد ہونے کا نتیجہ یہ نکلا کہ لوگوں کی اکثریت کے لیے میدان تنگ پڑتا گیا۔ قدیم تاختی اور شکاری آدمیوں کے کنبے اور قبیلے سینکڑوں مربع کلومیٹر کے علاقوں میں پھیل کر بسر رکھتے تھے۔ ان کے لیے 'گھر' سے مراد یہ سارا علاقہ ہوا کرتا تھا جس میں پہاڑیاں، چشمے، ندیاں، جنگل اور کھلا آسمان سب کچھ شامل تھا۔ جب کہ دوسری جانب دہقان تھے جن کا زیادہ تر وقت کھیتوں، کھلیانوں، باغات کی دیکھ بھال میں گزرتا تھا۔

ان کے لیے 'گھر' کا تصور لکڑی، پتھر یا مٹی سے بنے چند میٹر کھلے کڈھے تھے۔ ایک مثالی دہقان اس گھروندے کی عمارت کے ساتھ انتہائی مضبوط رشتہ استوار کر لیتا تھا اور اس کی ساری زندگی اسی کڈھے پر مرکوز ہو کر رہ جاتی تھی۔ یہ اپنے آپ میں ایک بہت بڑی کایا پلٹ تھی جس کے اثرات نفسیاتی اور تعمیراتی دونوں ہی طرح کے پیش آئے تھے۔ یہ اسی زمانے سے شروع ہونے والی 'اپنے گھر' سے نسبت ہے جو اس مخلوق کو اپنے پڑوسیوں سے دیواروں کی مدد سے علیحدہ کرتی ہے اور سبھی انسانوں کی نفسیات پر یہ چھاپ گہری ترین ہو چکی ہے۔

یہ نئے زرعی رقبے نہ صرف یہ کہ قدیم تاختیوں کی عملداری سے کہیں چھوٹے تھے بلکہ یہ بہت ہی زیادہ مصنوعی بھی تھے۔ آگ کے بے تحاشہ استعمال کے علاوہ تاختی باشندوں نے اپنے زیر استعمال علاقوں میں کوئی بڑی تبدیلی کبھی نہیں کی۔ دوسری جانب دہقانوں نے تو انت مچادی۔ انھوں نے انسانوں کی مصنوعی بستیاں قلعوں کی شکل میں آباد کر لیں اور اپنے ارد گرد جنگل کے فطرتی ماحول سے خود کو کاٹ کر رکھ دیا۔ انھوں نے بے پایاں انداز میں جنگلوں کو کاٹنا شروع کر دیا، نہریں کھودیں، میدانوں کو صاف کر کے کھیت بنا لیے، گھر تعمیر کیے، نالیاں بنا کر ہل چلائے اور ایک سیدھی لکیر میں پھلوں کے درخت اگانے لگے۔ اس مشقت کے نتیجے میں بننے والا مصنوعی مسکن انسانوں اور 'ان کے' جانوروں اور نباتات کے لیے مختص تھا۔ اس مسکن کے ارد گرد اکثر ہی دیواریں اور باڑ بھی کھڑی کر دی جاتی تھی۔ دہقان حتی الامکان کوشش کرتے رہتے تھے کہ کسی نہ کسی طرح غیر ضروری جڑی بوٹیوں اور جنگلی درندوں کو اپنے اس مصنوعی مسکن سے دور رکھیں۔ اگر کوئی اس مسکن میں خلل انداز ہو جاتا تو وہ جلد ہی بھگا کر نکال باہر کر دیا جاتا۔ اگر کوئی بوٹی یا جانور پھر بھی مداخلت پر مصر رہتا تو دہقان دشمنی پر اتر آتا اور طرح طرح کی تکنیک استعمال کر کے انھیں تلف کرنے کی سعی کی جاتی۔ گھروں کے ارد گرد تو بالخصوص انتہائی مضبوط دیواریں اور باڑ کھڑی کی جاتی تھی۔ زراعت کا سورج طلوع ہونے سے لے کر آج تک اربوں انسان لاٹھیوں، سونٹیوں، ہنٹروں، جوتوں، بندوقوں اور زہریلی دوائیوں سے لیس ہو کر ان چیونٹیوں، لال بیگوں، مکڑیوں، چوہوں اور بھوتروں کے خلاف سفاک جنگ میں مشغول ہے جو انسانی جائے بود و باش میں دخل دینے کی کوشش کرتے ہیں۔

تاریخ کے بڑے حصے میں آدمی اپنے ان قلعہ نما مسکنوں میں بند ہو کر بہت ہی چھوٹے سے علاقے میں محدود اپنے ارد گرد پھیلے قدرتی ماحول سے الگ ہو کر بسر کرتا آیا ہے۔ کرہ ارض کی کل سطح اکیاون کروڑ مربع کلومیٹر ہے۔ اس میں ساڑھے پندرہ کروڑ مربع کلومیٹر خشکی پر محیط ہے۔ 1400 عیسوی تک دہقانوں کی وسیع آبادیاں، اپنے نباتات اور جانوروں کی کل تعداد کے ساتھ صرف ایک کروڑ دس لاکھ مربع کلومیٹر پر سکونت اختیار کیے ہوئے تھیں۔ یہ کرہ ارض کی کل سطح کا صرف دو فیصد علاقہ ہے۔ اس دو فیصد کے علاوہ ہر جگہ بہت ٹھنڈی یا بہت گرم یا بہت خشک یا بہت تر الغرض کاشت کاری کے لیے ناموزوں رہا کرتی تھی۔ یہ کرہ ارض کی سطح پر صرف دو فیصد کا وہ علاقہ ہے جس کے سٹیج پر پوری انسانی تاریخ رقم ہوئی ہے۔

لوگوں کے لیے یہ مصنوعی مسکن چھوڑنا انتہائی مشکل ہوتا ہے۔ وہ اپنے گھر، کھیت اور کھلیان کسی واقعی نقصان کے خطرے کے علاوہ چھوڑنے پر کبھی راضی نہیں ہوتے۔ علاوہ ازیں، جیسے جیسے وقت گزرتا گیا آدمی زیادہ سے زیادہ چیزیں اور اشیاء بھی جمع کرتا رہا۔ یہ ایسی اشیاء ہیں جن کی نقل و حمل اتنی آسان نہیں ہوتی۔ یہ مادی چیزیں، انسان کو ڈبو گئیں۔ قدیم زمانے کے دہقان ہیں تو دیکھنے میں غریب، لاچار اور محتاج نظر آتے ہوں لیکن ان کے ہر گھر، انفرادی سطح پر اتنی مصنوعات پائی جاتی تھیں جتنی کہ قدیم تاختی قبیلوں کے پاس مجموعی طور پر بھی نہیں ہوا کرتی تھیں۔

مستقبل کی پیدائش

اب چونکہ زراعت کی وجہ سے وسعت تو کم ہو گئی تھی لیکن وقت پھیل گیا تھا۔ وہ یوں کہ قدیم تاختی اور شکاری آدمی اگلے ہفتے یا مہینے کے بارے سوچنے میں وقت ضائع نہیں کرتا تھا۔ ان کے برعکس دہقانوں کا تخیل مستقبل میں دور تک، اگلے کئی برسوں اور دہائیوں تک اڑنے لگا۔
تاختی مستقبل کو اس لیے نظر انداز کر دیتے تھے کیونکہ وہ محدود وسائل اور تنگ دست رہا کرتے تھے۔ وہ صرف خوراک جمع کرتے تھے اور اشیاء جمع کرنے کا کوئی رواج نہیں تھا۔ ظاہر ہے، وہ کچھ نہ کچھ تو آگے کی پلاننگ کرتے ہی تھے۔ مثال کے طور پر شووہ، لاسکو اور التامیرا کے غاروں میں دریافت ہونے والی نقاشی کئی نسلوں تک باقی رہنے کے لیے تھی۔ اسی طرح سماجی طریق، معاہدے اور سیاسی تفاوت طویل مدتی معاملات تھے۔ احسان کا بدلہ اتارنے یا بدلہ لینے میں کئی کئی برس لگ جاتے تھے۔ تاہم، اس کے باوجود تاختیوں اور شکاریوں کے بود و باش، ان کے معاش میں اس طرح کی طویل مدتی پلاننگ نہایت محدود تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ تاختیوں کو اس کی بدولت کئی طرح کی پریشانیوں سے چھٹکارا حاصل تھا۔ ان چیزوں اور معاملات بارے پریشانی کی قطعاً کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی جن پر وہ اثر انداز نہیں ہو سکتے تھے۔
زرعی انقلاب نے مستقبل کو اتنا اہم بنا دیا جتنا اس سے پہلے کبھی نہیں رہا تھا۔ دہقان ہمیشہ مستقبل کو ذہن میں رکھ کر اس کی تیاری میں مشغول رہتے ہوئے مشقت اٹھاتے ہیں۔ زرعی معیشت پیداواری چکر، وقت یعنی موسموں کے سلسلے میں چلتا ہے۔ یعنی، اول تو کاشت کے لیے زمین کی تیاری، پھر مقررہ وقت پر بوائی، پھر کچھ ہفتوں میں وتر اور جڑی بوٹیوں کو تلف کرنا۔ پھر مخصوص وقت میں جب فصل کٹائی کے لیے تیار ہو جائے تو چند ہفتوں کی سخت محنت ہوتی ہے۔ جب فصل کی کٹائی مکمل ہو کر پیداوار کھلیانوں کو کوٹھڑیوں میں جمع ہو جائے تو اس رات دہقان تہوار اور جشن مناتے ہیں۔ لیکن اس کے صرف ایک یا ڈیڑھ ہفتے بعد وہ ایک دفعہ پھر صبح تڑکے کو کھیتوں

میں ایک دفعہ پھر نئے چکر میں جت جاتے۔ اگرچہ آج کے دن، اگلے ہفتے یا اگلے مہینے کے لیے بھی کافی خوراک جمع ہے لیکن اس کے باوجود انھیں اگلی فصل، اگلے برس اور اس سے اگلے برس کی بھی فکر کرنی پڑتی ہے۔

مستقبل سے متعلق دہقانوں کی اس فکرمندی کی وجہ صرف موسمی سلسلوں سے جڑی فصل کی کاشت اور پیداوار نہیں تھی۔ زیادہ تر تو یہ زراعت کے ساتھ جڑی بنیادی غیر یقینی کا شاخسانہ تھا۔ اب چونکہ زیادہ تر دہقان صرف چند گنے چنے جانور پالتے اور اکاد کا غلے کی فصل اگاتے ہیں تو انہیں ہمیشہ ہی قحط سالی، سیلاب اور وبائی امراض کا خطرہ لاحق رہتا تھا۔ دہقانوں کے لیے ضروری تھا کہ وہ اپنی ضرورت سے زیادہ، جتنی زیادہ ممکن ہو پیداوار حاصل کرلیں تاکہ خوراک کے ذخائر جمع رکھے جا سکیں۔ اگر گوداموں میں غلہ نہ ہو، تہ خانے میں زیتون کے مرتبان بھرے ہوئے نہ ہوں، کوٹھڑیوں میں پنیر نہ جمع ہو اور شہتیروں کے ساتھ لہسن اور خشک گوشت کے پارچے نہ لٹک رہے ہوں تو آنے والے برے وقت میں وہ فاقوں کا شکار ہوسکتے تھے۔ برا وقت آتے دیر نہیں لگاتا بلکہ برا وقت تو ہمیشہ ہی جلد یا بدیر آ کر ہی رہتا ہے۔ ایک دہقان جو یہ سوچ کر بسر کرتا ہو کہ برا وقت نہیں آئے گا، وہ تادیر باقی نہیں رہ سکتا۔

اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ زراعت کی ایجاد کے ساتھ ہی مستقبل سے متعلق خدشات اور فکرمندی انسانی دماغوں میں رچ بس گئی بلکہ یہ آدمی کی پوری زندگی کا محور بن گئی۔ جہاں ایک طرف دہقان کھیتوں کو سیراب کرنے کے لیے بارشوں کا انتظار کرتے تھے، وہاں بارشوں کا موسم شروع ہوتے ہی ان کا منہ آسمان میں ٹکا رہتا تھا۔ وہ ہر روز صبح اٹھ کر سب سے پہلے آسمان میں جھانکتے، دور افق پر بادلوں کا پہرہ دیتے، ہواؤں کے رخ سے اندازے لگاتے، اس میں رچی ہوئی بو کو سونگھنے کی کوشش کرتے اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر بارش کی راہ دیکھتے رہتے۔ کیا وہ دور افق پر بادل آرہا ہے؟ کیا وقت پر بارشیں ہوں گی؟ کیا اس برس بارشیں کافی ہوں گی؟ کیا طوفان سے کھیتوں میں بویا بیج سڑ تو نہیں جائے گا؟ اگر بارشیں بہت زیادہ ہوگئیں تو فصل کا کیا ہو گا؟ یہی سوالات تھے جو ہر وقت سر پر سوار رہتے تھے۔

دوسری طرف فرات، سندھ اور زرد دریاؤں کی وادیاں تھیں۔۔۔ جہاں دہقان اسی اضطراب اور گھبراہٹ کے عالم میں دریاؤں میں پانی کی سطح پر نظر رکھتے تھے۔ دریاؤں میں پانی کی سطح چڑھنا انتہائی ضروری تھا کیونکہ اس طرح دریا اپنے ساتھ پہاڑوں سے زرخیز مٹی لاتا تھا اور یہ اونچی ہوتی ہوئی پانی کی سطح ان کے وسیع آب پاشی کے نظام کو بھر دیتی تھی۔ لیکن اگر پانی کی سطح ضرورت سے زیادہ بڑھ جاتی تو پھر سیلاب آجاتے۔ اگر غیر موزوں وقت پر سیلاب آجاتے تو دریا کا پانی ان کے کھیتوں، کھلیانوں اور برسوں کی محنت کو اسی طرح ملیا میٹ کرسکتا تھا، جیسے قحط کرتا ہے۔

دہقان مستقبل سے متعلق صرف اس لیے بے چینی اور ہیجان کا شکار نہیں رہتے تھے کہ موسمی حالات اور زرعی نظام نازک تھا۔ وہ اس لیے بھی ہر وقت اضطراب کا شکار رہتے تھے کہ زراعت سے متعلق وہ بہت کچھ کرسکتے تھے۔ یعنی، ان کا مقابلہ صرف قدرتی عناصر سے ہی نہیں بلکہ خود وقت کے ساتھ بھی تھا۔ وقت کے ساتھ ان کی دوڑ لگی رہتی تھی۔ وہ نئے کھیت، کھلیان آباد کرسکتے تھے۔ نئی نہریں

کھودی جا سکتی تھیں اور زیادہ سے زیادہ فصلیں کاشت ہو سکتی تھیں۔ ایک مضطرب دہقان کی شوریدہ سری اور محنت کی مثال اس چیونٹی کی طرح ہوتی ہے جو گرمیوں کے موسم میں ہر وقت خوراک جمع کرنے کی دوڑ میں لگی رہتی ہے، جسے وہ سردیوں کے موسم میں استعمال کر سکتی ہے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرے گی تو بھوکی مر کھپ جائے گی۔ دہقان بھی ایک طرف تو خون پسینہ ایک کر کے موزوں موسم میں ہر وقت یہی کوشش کرتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ پیداوار حاصل کرے بلکہ دوسری جانب اس کا پورا کنبہ۔۔۔ بچے، جوان، عورتیں اور بوڑھے خوراک جمع کرنے، اس کے اچار ڈالنے، پیس کر محفوظ کرنے اور تیل نکالنے میں جت جاتا ہے۔ یہ اس کے اندر پھیلا ہوا وہ ڈر ہے جو اسے اگلے موسم، اگلے برس یا اس سے اگلے برس کے لیے بھی وہ خوراک جمع کرتے رہنے پر مجبور کرتا ہے، جس خوراک کا ذائقہ اسے آج کے دن میں بھی پوری لذت کے ساتھ نصیب نہیں ہوتا۔

زراعت کی وجہ سے اس اضطراب اور دباؤ کے دوررس نتائج برآمد ہوئے ہیں۔ زرعی طرز زندگی کا یہی دباؤ ہے جس کی بنیاد پر بڑے پیمانے کے سیاسی اور سماجی نظام نے جنم لیا۔ افسوسناک امر یہ ہے کہ تاریخ بھر میں دہقان کبھی بھی مستقبل سے متعلق وہ معاشی تحفظ حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوا جس کے لیے وہ اپنا آج سخت مشقت اور محنت سے قربان کر دیتا ہے۔ دہقانوں کو معاشی تحفظ کیا ملتا، الٹا اثر یہ ہوا کہ دنیا میں ہر جگہ ان دہقانوں کو معاشی اور سماجی تحفظ کے فریب میں پھانس کر حکمرانوں اور اشرافیہ کی طرح طرح پودنے جنم لے لیا۔ یہ حکمران اور اشرافیہ دہقانوں کی سخت محنت، مشقت اور فاضل پیداوار پر عیش و عشرت میں پلتے۔ دہقانوں کو بس دو وقت کی روٹی کا سہارا اور بس گزارے لائق رزق کا وعدہ مل جاتا تھا۔

دہقانوں سے قرقی کی ہوئی خوراک کی یہ فاضل پیداوار سیاست، جنگ، آرٹ اور فلسفوں میں ایندھن کا کام دیتی تھی۔ حکمرانوں اور اشرافیہ نے اس دولت کی مدد سے محلات بنائے، قلعے کھڑے کیے، یادگاریں تعمیر کروائیں اور بڑے بڑے مندر چلائے۔ آج کے انتہائی جدید دور تک، تاریخ بھر میں نوے فیصد انسان دہقان ہوا کرتے تھے۔ یہ دہقان ہر روز، بلاناغہ صبح سویرے اٹھ کر دن بھر خون پسینہ ایک کر کے کھیت آباد کرتے رہتے تھے اور پوری زندگی یہی معمولات رہتے تھے۔ وہ جو بھی فاضل پیداوار حاصل کرتے، وہ سیدھی گنے چنے اشرافیہ جیسے بادشاہوں، ریاستی حکام، فوجیوں، پادریوں، فن کاروں اور مفکروں کی جیب میں جمع ہو جاتی۔ تاریخ بھی یہی اشرافیہ لکھتی ہے اور تاریخ اسی اشرافیہ کے قصوں، کہانیوں اور واقعات سے بھری پڑی ہے۔ آج رقم شدہ تاریخ ایسی چیز ہے جو ماضی میں صرف چند گنے چنے لوگوں کے کاروبار زندگی سے متعلق روداد بیان کرتی ہے۔ ان گنے چنے چیدہ، اشرافیہ سے تعلق رکھنے والے افراد کے علاوہ باقی سب انسان کھیتوں، کھلیانوں اور جانوروں کی کھرلیوں میں خون اور پسینہ بہاتے بہاتے مر کھپ جاتے تھے۔

ایک تصوراتی سلسلہ

دہقانوں کی شب و روز، خون پسینے کی کمائی ہوئی خوراک کی فاضل مقدار جب نقل و حمل کے نت نئے طریقوں کے ساتھ جڑی تو انسانوں کی آبادیوں کو قریب آنے کا بھرپور موقع مل گیا۔ سب سے پہلے بڑے بڑے دیہات بنے۔ یہ دیہات مزید پھیلے تو قصبے تشکیل پائے۔ یہ قصبے بڑھ بڑھ کر شہروں میں بدل گئے۔ شہروں کے شہر ملے تو سلطنتوں نے جنم لیا اور کئی کئی شہر ایک دوسرے سے تجارتی نیٹ ورک کی صورت جڑ گئے۔

لیکن ان نئے مواقع سے بھرپور فائدہ اٹھانے کے لیے خوراک کی فاضل مقدار اور بہتر سے بہتر نقل و حمل کے ذرائع کافی نہیں تھے۔ کامیابی صرف یہ نہیں تھی کہ ایک ہی قصبے میں ہزاروں لوگوں کو خوراک کی ضروریات پوری کی جا سکتی ہے بلکہ کامیابی تو یہ بھی نہیں تھی کہ ایک سلطنت میں لاکھوں لوگوں کو خوراک دستیاب تھی۔ یہ ایک طرح سے کامیابی ضرور تھی لیکن اس بات کی کوئی گارنٹی نہیں تھی کہ یہ ہزاروں اور لاکھوں لوگ دوسرے وسائل جیسے زمین اور پانی وغیرہ کی تقسیم میں بھی اسی طرح کا اتفاق قائم کر سکتے ہیں۔ تنازعات کے حل، لڑائی کی صورت میں سمجھوتہ اور قحط یا جنگ کی صورت میں طریق کار۔۔۔ یہ کہیں زیادہ پیچیدہ معاملات تھے۔ اگر اس بارے اتفاق قائم نہ ہو پاتا تو بھلے گوداموں میں خوراک بھری پڑی ہو اور نقل و حمل کے ذرائع نت سے نئے ہوتے چلے جائیں۔۔۔ انارکی پھیل کر رہتی ہے۔ تاریخ میں برپا ہونے والی جنگوں اور انقلابوں کی اصل وجہ خوراک کی کمی کبھی نہیں رہی۔ فرانسیسی انقلاب فاقوں کے شکار دہقانوں نے نہیں بلکہ اگوائے ہوئے آسودہ حال وکلاء نے شروع کیا تھا۔ رومی سلطنت 1 قبل مسیح میں اپنے بھرپور جوبن پر پہنچ چکی تھی۔ بحیرہ روم کے ساتھ متصل پورے خطے سے بحری جہازوں میں خزانہ بھر بھر کر رومیوں کے یہاں پہنچتا تھا۔ اتنی دولت جمع ہو رہی تھی جو روم کی سات سات نسلوں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ لیکن اس جوبن کے وقت، جب آسودگی کا دور دورہ تھا روم کا سیاسی منظر نامہ پے در پے برپا ہونے والی تباہ کن خانہ جنگیوں کا شکار ہو کر منہدم ہو گیا۔ 1991ء میں یوگوسلاویہ میں دستیاب وسائل اس کے شہریوں کی ضروریات سے کہیں بڑھ کر تھے لیکن یہ ریاست اس کے باوجود بھی پارہ پارہ ہو کر خون کی ندیوں میں بہہ گئی تھی۔

اس طرح کی بدبختی اور تباہی کی جڑوں میں اصل وجہ یہ ہے کہ انسان لاکھوں سال تک ارتقاء کے عمل سے گزر کر چند درجن کی تعداد میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرنے اور گروہ بندی کے قابل ہوا ہے۔ وہ چند ہزار سال جو زرعی انقلاب کو شہروں، سلطنتوں اور ریاستوں کے ظہور پذیر ہونے سے الگ کرتے ہیں۔۔۔ وہ ارتقائی لحاظ سے انتہائی کم ہیں۔ یہ انتہائی محدود وقت تھا اور انسان کو اتنے بڑے پیمانے پر تعاون اور اشتراک کی جبلت کو پوری طرح نمو حاصل کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ چنانچہ، آج بھی انسان اسی وجہ سے ریاستوں اور مملکتوں میں بھڑ جاتے ہیں اور بربادی کا موجب بنتے ہیں۔

اگرچہ انسان کے پاس بڑے پیمانے پر تعاون اور اشتراک کے لیے ضروری جبلت تو نہیں ہے لیکن تاختی دور میں سینکڑوں اجنبی کسی مشترکہ تصور کے جھنڈے تلے مل کر تعاون کر ہی لیتے تھے۔ تاہم، یہ اشتراک کافی بے قاعدہ اور محدود رہا کرتا تھا۔ اس زمانے میں آدمیوں کاہر گروہ خود مختار زندگی گزارتا تھااور صرف اپنے کنبے کی ضرورتوں پر نظر رہتی تھی۔ اگر آج سے بیس ہزار سال پہلے اس زمانے کی سمجھ بوجھ رکھنے والا کوئی ایساماہر عمرانیات، جسے زرعی دور کی بالکل بھی خبر نہ ہوتی۔۔۔ وہ بھی اپنے زمانے کی اسطور کو بے قاعدہ اور محدود ہی گردانتا۔ اجداد کی روحوں اور قبائلی ٹوٹمی نشانات کے بل بوتے پر زیادہ سے زیادہ پانچ سو لوگوں کو سیپی اور صدفیوں کی تجارت، تہوار کا جشن منانے اور نینڈرتھل انسانوں کے کسی گروہ کا صفایا کرنے پر قائل کیا جاسکتا تھا۔ تب، اس زمانے میں ماہرین عمرانیات یہی سوچا کرتے کہ یہ اسطور، حکایات اور عقائد وغیرہ کسی بھی طرح سے لاکھوں کی تعداد میں اجنبی آدمیوں کو روزانہ اشتراک اور تعاون پر قائل کرنے کے اہل نہیں ہیں۔

لیکن، وقت نے ثابت کیا کہ نہ صرف یہ فکشن اور عقائد نہ صرف اہم بلکہ انتہائی طاقتور بھی ہیں۔ یہ اسطور، قصے، حکایات، عقائد اور تصورات ہماری سوچ سے بھی زیادہ طاقتور ہیں۔ جب زرعی انقلاب کے نتیجے میں گنجان آباد بڑے بڑے شہر اور عظیم سلطنتیں قائم کرنے کی راہیں کھل گئیں تو آدمی نے اسطور اور تصورات بھی اتنے ہی بڑے گھڑ لیے۔ اب وہ عظیم تر خداؤں، دھرتی ماتا اور مشترکہ سرمایہ کمپنیوں کے تصورات اور قصے سنانے لگا تاکہ ضرورت کے عین مطابق سماجی ربط قائم کیے جاسکیں۔ انسان کی حیاتیاتی ارتقاء تو اپنی روایتی، گھونگھے کی چال چل رہی تھی لیکن انسان کا تخیل غیر معمولی اور حیران کن حد تک اشتراک اور تعاون کے بڑے بڑے نیٹ ورک قائم کر رہا تھا۔ ان تصوراتی حقیقتوں کا پیمانہ اتنا بڑا تھا کہ تاریخ انسانی میں اس سے قبل، اس عظمت کی کوئی مثال نہیں ملتی۔

8500 قبل مسیح میں دنیا کی سب سے بڑی بستیوں کی گنجان آبادی زیادہ سے زیادہ اریحا کے نخلستانی دیہات جتنی تھی جس میں صرف چند سو نفوس کا بسیرا تھا۔ 7000 قبل مسیح تک مثالی بستی اناطولیہ کے قصبے چاتالہویوک کی تھی جس میں زیادہ سے زیادہ پانچ ہزار سے دس ہزار لوگ آباد تھے۔ چاتالہویوک غالباً اپنے زمانے کی دنیا میں انسانوں کی سب سے بڑی بستی تھی۔ پانچویں اور چوتھی قبل مسیح ہزاری کے دوران 'زرخیز ہلال' یعنی قدیم لیونت، قدیم مابین النہرین اور قدیم مصر پر مشتمل خطے میں دسیوں ہزار افراد پر مشتمل کئی شہر آباد تھے اور ان شہروں کی ارد گرد کے تمام دیہات اور قصبات پر پوری حکومت تھی۔ 3100 قبل مسیح میں دریائے نیل کے سبھی نشیبی علاقوں نے متحد ہو کر پہلی مصری سلطنت کی بنیاد رکھی۔ اس سلطنت کے فرعون ہزاروں مربع کلومیٹر اور دسیوں ہزار لوگوں پر حکومت کرتے تھے۔ 2250 قبل مسیح کے آس پاس سارگن عظیم نے پہلی بار فرمانروائی پر مبنی اکد سلطنت قائم کی۔ اس سلطنت میں دس لاکھ نفوس آباد تھے اور فوج میں 5400 فوجی شامل تھے۔ 1000 قبل مسیح اور 500 قبل مسیح کے دوران مشرق وسطیٰ میں پہلی بار کئی

عظیم سلطنتیں نظر آئیں۔ ان عظیم سلطنتوں میں اشوریہ، بابل اور فارس شامل تھیں۔ ان سلطنتوں میں دسیوں لاکھ افراد آباد تھے اور ہر سلطنت کی فوج میں دسیوں ہزار سپاہی ہوتے تھے۔

221 قبل مسیح میں پورا چین، چن کے شاہی سلسلے کے جھنڈے تلے متحد ہو چکا تھا۔ اس کے کچھ ہی عرصے بعد بحیرہ روم کے آس پاس رومی بھی متحد ہو گئے۔ چین میں چن کے شاہی سلسلے کے زیر حکومت علاقوں میں چار کروڑ افراد بسر رکھتے تھے اور ٹیکس بھی ادا کرتے تھے۔ ٹیکس سے حاصل ہونے والی آمدنی لاکھوں فوجیوں پر مشتمل فوج اور دس ہزار حکام پر مشتمل بیوروکریسی کے پیچیدہ نظام کو چلانے پر خرچ ہوتی تھی۔ رومی سلطنت جوبن کے دور میں قریباً دس کروڑ لوگوں سے ٹیکس اکٹھا کرتی تھی۔ ٹیکس کی یہ آمدن ڈھائی سے پانچ لاکھ سپاہیوں پر مشتمل فوج، سڑکوں کے جال (یہ سڑکیں آج بھی استعمال ہوتی ہیں)، تھیٹروں اور کھیل کے اکھاڑوں پر خرچ ہوتی تھی۔ یہ تھیٹر اور اکھاڑے، آج بھی دعوت نظارہ دیتے ہیں۔

16 پتھر کا ستون جس پر حمورابی کا قانون کھدا ہوا ہے۔ 1776ء قبل مسیح

یہ سب نہایت غیر معمولی، دل نشین اور متاثر کن ضرور ہے لیکن ہمیں مصر کے فرعونوں اور رومی سلطنت کے بڑے پیمانے پر اشتراک اور تعاون کے فریب نظر اور سراب بارے کسی بھی قسم کی خوش فہمی نہیں پالنی چاہیے۔ یہ جو لفظ ہے، اشتراک یا تعاون۔۔۔ سننے میں انسان دوستی اور بے غرضی کا تاثر دیتا ہے لیکن تاریخ گواہ ہے کہ یہ کبھی بھی قصدی اور اختیاری نہیں رہا۔ اس میں مساوات اور برابری کا ذرہ برابر بھی عنصر نہیں ہے۔ انسانی آبادیوں کے بیچ تعاون اور اشتراک ہمیشہ ہی جبر اور استحصال کی بنیاد پر قائم کیا گیا اور یہ سخت سفاکی پر منتج ہوتا آیا ہے۔ دہقان اس تیزی سے پھلنے پھولنے والے انسانی تعاون اور اشتراک کی بھاری قیمت ادا کرتے تھے۔ انھیں سخت محنت اور مشقت سے حاصل ہونے والی قیمتی خوراک کے فاضل پیداوار حوالے کر کے اور جب ٹیکس کلیکٹریک جنبش قلم ان کی پورے سال کی محنت ہڑپ لیتا تو سخت مایوسی اور شکستگی کی صورت ادا کرنی پڑتی تھی۔ روم کے مشہور تھیٹر اور اکھاڑوں کی تعمیر میں بھی غلاموں کو جت دیا جاتا تھا۔ جب یہ اکھاڑے اور تھیٹر مکمل ہو گئے تو دولت مند، آرام طلب اور کام چور رومی بیٹھ کر غلاموں کو ہی کھیل کے نام پر ایک دوسرے کے گلے کاٹتا دیکھ کر محظوظ ہوتے تھے۔

لوگوں کو غلامی میں جھونک کر ان سے مشقت اور بیگار لے پانا کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہے بلکہ یہ انسانی اشتراک اور تعاون کی ایک صورت ہے۔ اس ضمن میں یہ بھی تو دیکھیں کہ جیل اور حراستی کیمپ بھی انسانی تعاون اور اشتراک کی ہی ایک قسم ہیں۔ ان میں بھی ہزاروں کی

تعدادمیں اجنبی ایک دوسرے سے تعاون کرتے ہیں تو کام چلتا ہے۔ان کو قید اور سیدھی راہ پر رکھنے کے لیے طاقت کا استعمال ہوتا ہے۔غلامی اور جیلوں کی قید میں فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ غلام، بے قصور ہوا کرتے تھے۔

انسانی تعاون اور اشتراک کے یہ قدیم نیٹ ورک۔۔۔قدیم بین النہرین (عراقی تمدن)، چن سلسلے اور رومی سلطنت کے عظیم والشان شہر، یہ سب 'تصوراتی سلسلے' تھے۔ان عظیم شہروں کو قائم رکھنے میں جو سماجی قاعدے اور رسوم استعمال ہوتے تھے، وہ نہ تو جبلت اور نہ ہی ذاتی تعلق داری پر مبنی تھے۔یہ سماجی قواعد اور شعائر، رسوم اور رواج۔۔۔سارے کے سارے تصوراتی تھے۔قصوں، مفروضوں اور حکایات پر یقین سے متعلق تھے۔

تو سوال یہ ہے کہ آخر اسطوری تصورات اتنی بڑی بڑی سلطنتوں کو یکجا کیسے رکھتے ہیں؟اس ضمن میں ہم پہلے ہی ایک مثال 'پژو کی کہانی' کی صورت دیکھ چکے ہیں۔اب ہم تاریخ کی دو سب سے بہترین اور نہایت مشہور اسطور پر نظر ڈالیں گے۔ان میں سے پہلی تو 1776 قبل مسیح کی 'حمورابی کا قانون' ہے۔حمورابی کا قانون بابل کی قدیم سلطنت میں دسیوں ہزار شہریوں کو یکجا رکھنے کے لیے قانونی دستاویز تھی۔اسی طرح کی دوسری مثال 1776 عیسوی میں جاری ہونے والا 'امریکہ کا اعلان آزادی' ہے۔امریکہ کا اعلان آزادی آج بھی ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں کروڑوں امریکیوں کو باندھ کر رکھنے والی دستاویز ہے۔

IN CONGRESS. JULY 4, 1776.

The unanimous Declaration of the thirteen united States of America,
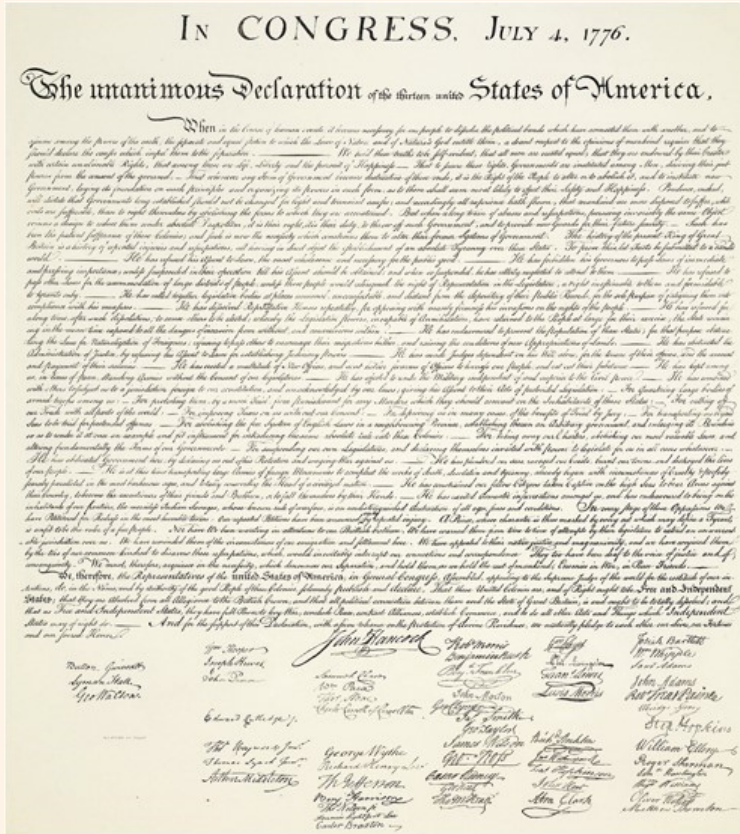
17 امریکہ کا اعلان آزادی، 1776ء

1776 قبل مسیح میں بابل اس دنیا کا سب سے بڑا شہر تھا۔ سلطنت بابل غالباً دنیا کی سب سے بڑی ریاست تھی جس میں دس لاکھ سے زیادہ شہری آباد تھے۔ اس سلطنت کی حاکمیت میں بین النہرین کا تقریباً حصہ شامل تھا۔ آج کی جدید سرحدوں کے حساب سے بین النہرین میں تقریباً سارا عراق اور شام و ایران کے کچھ حصے شامل تھے۔ یہ دجلہ اور فرات کے آس پاس کا سارا علاقہ ہے۔ اس زمانے میں بابل کا بادشاہ ہوتا تھا۔ اس بادشاہ کا نام حمورابی تھا۔ حمورابی کی شہرت اس دستاویز کی وجہ سے ہے جو اس نے جاری کی تھی۔ اس دستاویز کو 'حمورابی کا قانون' کہا جاتا ہے۔ یہ دستاویز اصل میں ان اصولوں، قوانین، قواعد اور عدالتی فیصلوں کا مجموعہ ہے جن کا مقصد حمورابی کو ایک عادل اور انصاف پسند بادشاہ ثابت کرنا تھا۔ یہی دستاویز سلطنت بابل کے طول و عرض میں ہم آہنگ عدالتی نظام کی بنیاد بھی رہی تھی اور اس کا ایک مقصد آنے والی نسلوں کے لیے انصاف اور بادشاہ کے لیے عدل کا معیار بھی مقرر کرنا مقصود تھا۔

مستقبل کی نسلوں نے اس دستاویز کو خوب استعمال کیا۔ قدیم بابل اور بین النہرین کی مفکر اور بیور کریٹ اشرافیہ نے اس دستاویز کو اپنی مشعل راہ بنا کر اسی کو پیر بنالیا۔ حمورابی کا قانون، حمورابی کے مرنے کے بعد بھی زندہ رہا۔ انشاء نگار اور منشی اس دستاویز کو جلی حروف میں لکھتے رہے اور یہ حمورابی کی سلطنت بابل ختم ہو کر آثار میں بدل جانے کے بعد بھی استعمال کی جاتی رہی۔ اس لحاظ سے 'حمورابی کا قانون' نامی دستاویز قدیم زمانے کے بین النہرین اور بابل میں پائے جانے والے مثالی سماجی سلسلے کو سمجھنے کے لیے بہترین حوالہ ہے۔

اس دستاویز کا آغاز آنو، انلیل اور مردوخ نامی خداؤں کی بڑائی سے ہوتا ہے۔ یہ خدا قدیم رومی معبد پانتون کی نامی گرامی مقدس ہستیاں تھے۔ اس دستاویز کے تحت انھی خداؤں نے حمورابی کو زمین پر انصاف قائم کرنے، برائی اور فسق کو جڑ سے اکھاڑنے اور طاقتور کو کمزور پر جبر سے روکنے کے لیے نامزد کیا ہے۔ بعد اس کے، اس دستاویز میں کل تین سو فیصلے صادر کیے گئے ہیں۔ یہ فیصلے یا احکامات ایک مخصوص انداز میں جاری ہیں۔۔۔ وہ یوں کہ، 'اگر یہ اور یہ معاملہ ہو تو حکم یا فیصلہ یہ ہے' مثال کے طور پر فیصلہ نمبر 196 سے 199 اور 209 سے 214 کچھ اس طرح تحریر ہیں:

196۔ اگر ایک بر تریا اعلیٰ 'شخص کسی دوسرے بر تریا اعلیٰ 'شخص کو آنکھ سے اندھا کردے تو وہ اس کو بھی آنکھ سے اندھا کردیں۔

197۔ اگر وہ کسی دوسرے بر تریا اعلیٰ 'شخص کی ہڈی توڑدے تو یہ اس کی بھی ہڈی توڑدیں۔

198۔ اگر وہ کسی عام شخص کو آنکھ سے اندھا کردے یا اس کی ہڈی توڑدے تو وہ چاندی کے ساٹھ بٹے تول کر ادا کرے گا۔

199۔ اگر وہ کسی بر تریا اعلیٰ 'شخص کے غلام کو آنکھ سے اندھا کردے یا کسی بر تریا اعلیٰ 'شخص کے غلام کی ہڈی توڑدے تو وہ غلام کی آدھی قیمت کے برابر چاندی کے بٹے تول کر ادا کرے گا۔

209۔ اگر کوئی بر تریا اعلیٰ 'شخص کسی بر تریا اعلیٰ 'خاندان کی عورت کے ساتھ مار پیٹ کرے اور اس کے نتیجے میں بر تریا اعلیٰ ' عورت کے پیٹ میں بچہ ضائع ہو جائے تو وہ حمل گرانے کے عوض چاندی کے دس بٹے تول کر زر تلافی ادا کرے گا۔

210۔ اگر وہ بر تریا اعلیٰ 'خاندان کی عورت خود مر جائے تو وہ اس کی بیٹی کو قتل کردیں۔

211۔ اگر وہ کسی عامی خاندان کی عورت کے ساتھ مار پیٹ کرے اور اس کے نتیجے میں عامی عورت کے پیٹ میں بچہ ضائع ہو جائے تو وہ حمل گرانے کے عوض چاندی کے پانچ بٹے تول کر ادا کرے گا۔

212۔ اگر وہ عامی عورت خود مر جائے تو وہ چاندی کے تیس بٹے تول کر ادا کرے گا۔

213۔ اگر وہ کسی بر تریا اعلیٰ 'شخص کی غلام عورت کے ساتھ مار پیٹ کرے اور اس کے نتیجے میں غلام عورت کے پیٹ میں بچہ ضائع ہو جائے تو وہ چاندی کے دو بٹے تول کر ادا کرے گا۔

214۔ اگر وہ غلام عورت خود مر جائے تو وہ چاندی کے بیس بٹے تول کر ادا کرے گا۔

اسی طرح، تین سو احکامات یا فیصلے صادر کرنے کے بعد حمورابی آخر میں ایک دفعہ پھر اعلان کرتا ہے جو کچھ یوں ہے:

'عادل، فاضل اور قابل بادشاہ حمورابی کے نزدیک یہ ٹھیک ٹھیک اور جائز احکامات ہیں۔ عادل، فاضل اور قابل بادشاہ حمورابی نے یہ احکامات لکھ دیے ہیں اور اہل زمین کو ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ سچائی اور درست طریق زندگی کو اختیار کرنے کے ساتھ ساتھ ان احکامات کی پابندی کریں۔ میں، عالی نسب بادشاہ، حمورابی ہوں۔ میں کسی بھی طرح سے انسانیت سے غافل اور نہ ہی بے پرواہ ہوں۔ مجھے یہ عزت، منزلت اور اختیار خداوند انلیل کی طرف سے ذمہ داری کے طور پر عطا کیا گیا ہے۔ ہم سب خداوند مردوخ کی پناہ میں ہیں جو میرا اور اس زمین کا گلہ بان ہے۔'

حمورابی کا قانون بابل کے سماجی نظام کی بنیاد کو 'خداؤں کے حکم کے عین مطابق انصاف کے آفاقی اور ابدی اصولوں' پر قائم رکھنے کا پورے وثوق سے دعویٰ کرتا ہے۔ اس دستاویز کے تحت سلسلوں، درجات اور رتبے کو انتہائی خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس قانون کے تحت لوگوں کو دو اصناف اور تین مختلف طبقات میں تقسیم کیا گیا ہے: برتریا اعلیٰ لوگ، عام لوگ یعنی عوام اور غلام۔ ہر صنف اور طبقہ سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی قدر اور قیمت مختلف ہے۔ مثال کے طور پر ایک عام عورت کی زندگی کی قیمت چاندی کے تیس بٹے اور ایک غلام عورت کی زندگی کی قیمت چاندی کے بیس بٹے ہے۔ جبکہ ایک عام مرد کی آنکھ کی قیمت چاندی کے ساٹھ بٹوں کے برابر ہے۔

حمورابی کا یہ قانون خاندانوں کے اندر بھی انتہائی سخت درجات اور رتبوں کی نشاندہی کرتا ہے۔ اس قانون کے تحت بچوں کو خود مختار انسان نہیں سمجھا جاتا بلکہ وہ اپنے والدین کی ملکیت ہوتے ہیں۔ چنانچہ اگر کوئی برتریا اعلیٰ شخص کسی دوسرے برتریا اعلیٰ شخص کی بیٹی کو قتل کر دے تو سزا کے طور پر قاتل کی بیٹی کو قتل کرنا جائز ہے۔ ہمیں یہ عجیب محسوس ہوتا ہوگا کہ قاتل کی جان تو محفوظ ہے لیکن اس کی بے قصور بیٹی کو باپ کے جرم کی پاداش میں قتل کیا جاسکتا ہے لیکن حمورابی اور بابل کے باشندوں کے نزدیک یہ زیادتی نہیں بلکہ عین جائز تھا۔ حمورابی کا قانون کی بنیاد اس 'مفروضے' یا 'تصور' پر قائم کی گئی تھی کہ اگر بادشاہ کی ساری رعایا، معاشرے میں اپنے مقام، رتبے اور طبقے کو قبول کر کے بادشاہ کے حکم کے عین مطابق اپنا کردار ادا کریں تو اس سلطنت کے دس لاکھ باشندے ایک دوسرے کے ساتھ احسن طریقے سے اشتراک اور تعاون کو پروان چڑھا سکتے ہیں۔ اس تعاون اور اشتراک کے نتیجے میں معاشرہ اپنے شہریوں کے لیے کافی مقدار میں خوراک پیدا کر سکتا ہے، اس خوراک کو موثر طریقے سے تقسیم کیا جاسکتا ہے، سلطنت کے دشمنوں کے خلاف دفاع کا انتظام ہو سکتا ہے اور سلطنت کی سرحدوں کو پھیلا کر دنیا کے دوسرے حصوں میں بھی زیادہ سے زیادہ دولت اور تحفظ حاصل کیا جاسکتا ہے۔

حمورابی کی موت کے پینتیس سو سال بعد شمالی امریکہ کی تیرہ کالونیوں میں بسر رکھنے والے باشندوں نے محسوس کیا کہ شاہ برطانیہ کا طریق ان کے ساتھ ناانصافی پر مبنی ہے۔ ان تیرہ کالونیوں کے نمائندہ گان 4 جولائی 1776ء کو فلاڈلفیا کے شہر میں جمع ہوئے۔ ان تیرہ کالونیوں نے مشترکہ طور پر اعلان کیا کہ ان کی کالونیوں میں بسر رکھنے والے باشندے اب شاہ برطانیہ کی وفادار رعایا نہیں ہیں۔ ان کے اس 'اعلان آزادی' کی بنیاد بھی 'انصاف کے ابدی اور آفاقی اصولوں' کے پر زور دعویٰ پر رکھی گئی تھی۔ حمورابی کے قانون کی طرح امریکہ کا یہ اعلان آزادی بھی 'مقدس الہامی طاقت' کو اپنا منبع قرار دیتی ہے۔ تاہم، 'امریکی خدا' نے سب سے اہم اصول کی جو ہدایت یا حکم جاری کیا، وہ 'بابل کے خدا' کے احکامات سے قدرے مختلف تھا۔ امریکہ کا اعلان آزادی زور دیتے ہوئے کہتا ہے کہ:

'ہم اس حقیقت کو صاف اور واضح مانتے ہیں کہ تمام انسان برابر پیدا کیے گئے ہیں، اور یہ کہ خالق کی جانب سے سب انسانوں کو بعض غیر انتقال پذیر اور ناقابل تردید حقوق عطا کیے گئے ہیں، جن میں زندگی، آزادی اور طلب خوش حالی کے حقوق شامل ہیں۔'

حمورابی کے قانون کی ہی طرح امریکہ کا اعلان آزادی بھی وعدہ کرتا ہے کہ اگر امریکہ کی تیرہ کالونیوں میں بسنے والے لاکھوں انسان اس اعلان آزادی کے 'مقدس' اصولوں کی پاسداری کریں تو وہ ایک محفوظ، پرامن اور خوشحال امریکی معاشرے میں ایک دوسرے کے ساتھ موثر انداز میں تعاون اور اشتراک قائم کر سکتے ہیں۔ جیسے حمورابی کا قانون، ویسے ہی امریکہ کا اعلان آزادی بھی صرف اسی وقت اور موقع کے لیے نہیں تھا بلکہ مستقبل کی آنے والی نسلوں نے بھی اسے قبول کیا۔ آج اس اعلان آزادی کو منظر عام پر آئے تقریباً ڈھائی سو برس پورے ہونے کو ہیں۔ تب سے آج تک سکولوں میں پڑھنے والے بچے، اس اعلان آزادی کو دل لگا کر لکھتے، پڑھتے اور پھر ساری عمر کے رٹ کر یاد کر لیتے ہیں اور پلو سے باندھ لیتے ہیں۔

یہ دونوں دستاویزات پر غور کریں تو ہمیں ایک ایک الجھاؤ اور واضح طور پر تذبذب کا شکار کرنے والی حقیقت کا سامنا ہوتا ہے۔ حمورابی کا قانون اور امریکہ کا اعلان آزادی پورے دعویٰ اور وثوق کے ساتھ انصاف کے آفاقی اور ابدی اصولوں کا خاکہ پیش کرتے ہیں لیکن امریکیوں کے خیال میں سب لوگ برابر ہیں جبکہ بابل کے باشندے قطعی طور پر لوگوں میں عدم مساوات کو جائز سمجھتے ہیں۔ امریکیوں کے خیال میں ان کا 'تصور' درست جبکہ حمورابی غلط ہے۔ دوسری طرف قدرتی طور پر حمورابی بھی خود کو درست قرار دیں گے اور امریکیوں کے تصور کو باطل سمجھیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں ہی غلط ہیں۔ حمورابی اور امریکی دستور کے خالق، دونوں ہی ایک یا دوسری صورت انصاف کی آفاقی اور اپنے تئیں غیر متغیر اصولوں، پر مبنی 'تصوراتی حقیقتوں' جیسے مساوات اور طبقاتی تقسیم وغیرہ کے ہاتھوں میں کھیل رہے ہیں۔ یہ 'آفاقی تصورات' صرف اور صرف آدمی کے تخیل کی کارستانی ہے۔ یہ مفروضے ہیں۔ حقیقت میں یہ وہ روایتی اور خیالی باتیں ہیں جن کا افسانہ بنا کر وہ ایک دوسرے کو سناتے ہیں اور ان پر یقین کرتے ہیں۔ ان اصولوں کی معروضی، یعنی کوئی واقعی معقولیت نہیں ہے۔ جہاں آج ہم نہایت آسانی سے انسانوں میں 'طبقاتی تقسیم'، جیسے اعلیٰ اور عامی وغیرہ کی تقسیم کو 'سوچ کی پستی'، 'غیر

حقیقی' اور 'واہمہ' قرار دے کر رد کر دیتے ہیں وہیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ انسانوں کے بیچ 'مساوات' اور 'برابری' کا 'تصور' بھی ایک 'خیال' ہی ہے۔ یہ بھی ایک ہمارے دماغ کی 'اختراع' ہے۔ سب انسان ایک دوسرے کے برابر کس طرح ہیں؟ کیا مساوات کے اس تصور کی انسانی خیال کے علاوہ کوئی معروضی حقیقت ہے؟ کیا سب انسان حیاتیاتی بنیادوں پر برابر ہیں؟ اچھا چلیں، ہم امریکہ کے اعلان آزادی کے انتہائی مشہور و معروف حصے کو حیاتیاتی بنیادوں پر پڑھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

'ہم اس حقیقت اور سچائی کو صاف اور واضح مانتے ہیں کہ تمام انسان برابر پیدا کیے گئے ہیں، اور یہ کہ خالق کی جانب سے سب انسانوں کو بعض غیر انتقال پذیر اور ناقابل تردید حقوق عطا کیے گئے ہیں، جن میں زندگی، آزادی اور طلب خوش حالی کے حقوق شامل ہیں۔'

حیاتیات کی رو سے، انسان کو پیدا نہیں کیا گیا۔ اس کی تخلیق نہیں ہوئی بلکہ بتدریج، ارتقائی عمل سے گزر کر یہاں تک پہنچا ہے۔ یقینی طور پر آدمی نے ارتقائی مراحل 'برابری' اور 'مساوات' ہونے کے لیے پار نہیں کیے۔ یہ 'برابری اور مساوات' کا تصور انتہائی پیچیدگی اور لاینحل طور پر 'خلق' کے تصور میں گندھا ہوا ہے۔ امریکیوں کو برابری اور مساوات کا تصور عیسائیت سے ملا تھا۔ عیسائیت کا تصور یہ کہتا ہے ہر فرد، ہر آدمی کا جسم ایک مقدس اور تخلیق شدہ روح کا گھر ہے اور خدا کے نزدیک ساری ارواح برابر ہیں۔ تاہم، مثال کے طور پر اگر ہم عیسائیت کے 'خدا'، 'تخلیق' اور 'ارواح' بارے ان تصورات کو نہیں مانتے تو پھر انسانوں میں 'مساوات اور برابری' کے تصورات کے کیا معنی رہ جاتے ہیں؟ تو یہ دونوں تصورات ایک دوسرے میں گندھے ہوئے ہیں۔ ارتقاء کی بنیاد ہی امتیازی فرق ہے۔ اس کی اساس ہرگز برابری نہیں ہے۔ ہر شخص کا جینیاتی مادہ، دوسرے سبھی انسانوں سے مختلف ہے اور پیدائش کے فوراً بعد ہی اس پر ماحولیاتی عوامل اثر انداز ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہر شخص میں جداگانہ اور طرح طرح کی خصوصیات پیدا ہو جاتی ہیں جو اسے بقاء میں مدد دیتی ہیں۔ چنانچہ یہ بیان اصل میں، 'برابر پیدا کیے گئے ہیں' نہیں بلکہ 'تفاوتی ارتقاء کے عمل سے گزرے ہیں' ہونا چاہیے۔

جس طرح حیاتیات کی رو سے انسان کبھی 'پیدا' نہیں کیے گئے، اسی طرح حیاتیات میں کسی 'خالق' کا بھی کوئی تصور نہیں ہے جو انسانوں کو کچھ نہ کچھ 'عطا' کرتا ہے۔ حیاتیات کے مطابق صرف اور صرف اندھا ارتقائی عمل ہے جو کسی مقصد سے خالی اور بے معنی ہے۔ یہ ارتقائی عمل افزائش نسل پر منتج ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے 'خالق کی جانب سے' اور 'عطا کیے گئے ہیں' جیسے تصوراتی بیانات کو اصل میں 'متولد' یا 'جنم' ہونا چاہیے۔

اسی طرح، حیاتیات کی رو سے 'حقوق' نام کی کوئی شے نہیں ہوتی۔ صرف نامیاتی اجسام، اعضاء، قابلیت اور صلاحیتیں ہوتی ہیں۔ پرندے اڑ سکتے ہیں۔ وہ اس لیے نہیں اڑ سکتے کہ انھیں اڑنے کا 'حق' حاصل ہے بلکہ وہ اس لیے اڑتے ہیں کیونکہ ان کے پر ہوتے ہیں۔ یہ بھی درست نہیں ہے کہ یہ نامیاتی اجسام، اعضاء، قابلیت اور صلاحیتیں 'غیر انتقال پذیر اور ناقابل تردید' ہوتی ہیں۔ یہ نامیاتی اجسام، اعضاء،

قابلیتیں اور صلاحیتیں کئی وجوہات کی بناء پر ہر وقت تبدل، ترمیم اور تغیر کے عمل سے گزرتی رہتی ہیں۔ یہ عین ممکن ہے کہ وقت کے ساتھ پورے پورے نامیاتی اجسام، اعضاء، قابلیت اور صلاحیت کھودیں یا ختم ہو جائیں۔ شترمرغ ایسا پرندہ ہے جس نے وقت کے ساتھ اڑنے کی صلاحیت کھودی ہے۔ چنانچہ، 'غیر انتقال پذیر اور ناقابل تردید' کا تصور، حقیقت میں 'تغیر پذیر اور ناپائدار خصوصیات' ہونا چاہیے۔

اب انسان کی ایسی کونسی خصوصیات ہیں جو اصل میں تغیر کا شکار ہوتی ہیں؟ انسان کی 'زندگی' ہمیشہ تغیرات کا شکار رہتی ہے اور یہ بالکل درست ہے۔ لیکن 'آزادی'؟ حیاتیات میں آزادی نام کی کوئی شے نہیں ہوتی۔ جس طرح برابری، حقوق اور لمیٹڈ کمپنیاں انسانوں نے تصور کی زنبیل سے نکال لائی ہیں، ویسے ہی آزادی بھی ایسی ہی شے ہے جو لوگوں کے تخیل کی اختراع ہے اور یہ تصوراتی ہے۔ حیاتیاتی نقطہ نظر سے دیکھیں تو جمہوریت میں انسانوں کی 'آزادی' اور آمریت میں 'آزادی سے محرومی' دونوں ہی بالکل بے معنی باتیں ہیں۔ پھر یہ 'خوش حالی' کیا شے ہے؟ جہاں تک حیاتیات کی تحقیق کا سوال ہے، یہ 'خوش حالی' کی تعریف اور اس کو معروضی بنیادوں پر جانچنے میں ناکام ہی رہی ہے۔ حیاتیات میں اس ضمن میں کی گئیں تقریباً ہر طرح کی تحقیق سے 'خوش حالی' نہیں بلکہ 'لذت' اور 'سرور' کے ہی ثبوت ملے ہیں۔ 'لذت' اور 'سرور' ایسی چیزیں ہیں جن کی آسانی سے تعریف بھی ممکن ہے اور اسے ماپا بھی جاسکتا ہے۔ چنانچہ، 'زندگی، آزادی اور طلب خوشحالی' جیسی اصطلاحات، اصل میں 'زندگی اور طلب لذت و سرور' ہونا چاہیے۔

تو اس لحاظ سے اگر امریکہ کے اعلان آزادی میں درج معروف دعویٰ کو حیاتیاتی معنوں میں لکھا جائے تو وہ کچھ یوں بنے گا:

'ہم اس حقیقت اور سچائی کو صاف اور واضح مانتے ہیں کہ تمام انسانوں نے تفاوتی اور امتیازی ارتقائی عمل سے گزر کر جنم لیا ہے، اور یہ کہ سبھی انسان تغیر پذیر اور ناپائدار خصوصیات کے ساتھ متولد ہوئے ہیں، جن میں زندگی اور طلب لذت اور سرور شامل ہیں۔'

انسانی حقوق اور مساوات کے پرچارک حیاتیاتی دلائل پر مبنی یہ دعویٰ پڑھتے ہی غصے سے لال پیلے ہو جائیں گے۔ ان کا فوری ردعمل یہ ہو گا کہ، 'ہم جانتے ہیں کہ انسان حیاتیات کی رو سے برابر نہیں ہیں لیکن اگر ہم برابری کے تصور پر یقین رکھیں تو ہمیں ایک مستحکم اور خوش حال معاشرہ تشکیل دینے میں مدد مل سکتی ہے'۔ ان کا اس ردعمل اور جواب کے ساتھ کسی کو اختلاف نہیں ہے۔ 'تصوراتی حقیقت' کی اہمیت بارے، کہنے کا مقصد بھی یہی تھا۔ ہم ایک مخصوص سوچ اور عقیدے پر اس لیے یقین نہیں رکھتے کہ وہ معروضی لحاظ سے سچ ہے بلکہ ہم اس پر اس لیے ایمان رکھتے ہیں کہ وہ ہم انسانوں کو مل جل کر تعاون اور اشتراک قائم کرنے کا موقع دیتا ہے اور ایک بہتر معاشرہ تشکیل دینے میں مدد مل جاتی ہے۔ کوئی بھی 'تصوراتی حقیقت' شیطانی سازش یا بے کار اور بے مصرف سراب نہیں ہوتا اور یہ جھوٹ تو ہرگز بھی نہیں ہے۔ بجائے، یہ انسانوں کی بڑی تعداد کا مل جل کر بسر رکھنے، ایک دوسرے سے موثر انداز میں بامعنی تعاون اور اشتراک قائم کرنے کا واحد ذریعہ ہے۔ اس کے علاوہ، کوئی دوسرا طریقہ نہیں ہے۔ یہ ضرور یاد رکھیں کہ حمورابی بھی اس حقیقت سے

خوب واقف تھا۔ وہ اپنی پوری زندگی اپنے شاہی سلسلے اور حکمرانی کے حق کا دفاع انسانی حقوق اور مساوات کے قائل وکیلوں جیسی ہی منطق کی بنیاد پر کرتا رہا تھا کہ، 'میں یہ اچھی طرح جانتا ہوں کہ 'اعلیٰ' یا برتر'، 'عام عوام' اور 'غلام' خلقی طور پر ایک دوسرے سے مختلف لوگ نہیں ہے۔ لیکن اگر ہم یہ یقین کر لیں کہ وہ ایک دوسرے سے مختلف ہیں تو ہم ایک مستحکم اور خوش حال معاشرہ تشکیل دینے کے قابل ہو جائیں گے'۔

سچا مومن

میں پہلے ہی متنبہ کر دوں کہ شاید آپ قارئین میں شامل ہوں جو درج ذیل پیرے پڑھ کر شاید اپنی کرسیوں میں بیٹھے بل کھانے لگیں۔ یہ ردعمل ہم میں سے تقریباً سبھی لوگوں کو دی گئی تعلیم کا نتیجہ ہے۔ آج یہ ماننا تو نہایت آسان ہے کہ حمورابی کا قانون اساطیری تھا، یعنی ایک 'تصور' تھا لیکن ہم 'انسانی حقوق' کو مفروضہ ماننے کو ہرگز تیار نہیں ہوں گے۔ اگر لوگوں کو یہ ادراک ہو جائے کہ 'انسانی حقوق' تو صرف ایک سوچ ہے، جو ہمارے تخیل میں پائی جاتی ہے تو کیا ہمارا معاشرہ دھڑام سے منہدم نہیں ہو جائے گا؟ ایک روشن خیال فرانسیسی فلسفی ہوا کرتا تھا۔ اس کا نام والٹیئر تھا۔ اس نے ایک دفعہ خدا کے بارے کہا تھا کہ، 'خدا کا کوئی وجود نہیں ہے لیکن تم یہ بات میرے نوکر کو مت بتانا۔۔۔ مبادا، وہ آج رات ہی مجھے قتل کر دے گا!'۔ حمورابی اپنے 'شاہی سلسلے اور حق حکمرانی' اور تھامس جیفرسن 'انسانی حقوق' بارے بھی یہی کہہ سکتا تھا۔ آدمی کو بھی ایک مکڑی، لکڑ بھگڑ اور بن مانس کی ہی طرح کسی بھی قسم کے قدرتی حقوق حاصل نہیں ہیں۔۔۔ لیکن یہ بات ان کمتر مکڑیوں، لکڑ بھگڑوں اور بن مانسوں کو مت بتانا۔۔۔ مبادا، وہ آج رات ہی ہمیں قتل کر دیں گے!'۔

اس طرح کا خوف بالکل جائز ہے۔ ایک قدرتی نظام نہایت مستحکم نظام ہوتا ہے۔ مثلاً، اس امر کا کوئی امکان نہیں ہے کہ اگر لوگ کشش ثقل میں یقین کرنا چھوڑ دیں تو کشش ثقل اپنا وجود کھو دے گی۔ اس کے برعکس ایک 'تصوراتی نظام' ہمیشہ ہی انہدام کے خطرے سے دوچار رہتا ہے کیونکہ یہ مفروضوں پر قائم ہوتا ہے۔ اگر لوگ ان مفروضوں اور تصورات میں یقین رکھنا چھوڑ دیں تو یہ ختم ہو جاتے ہیں۔ ایک تصوراتی نظام کی بقا کے لیے لازم ہے کہ پوری توانائی، متعدی اور تسلسل کے ساتھ جد و جہد اور کوشش واجب ہے۔ یہ جد و جہد بعض دفعہ تشدد اور جبر پر بھی منتج ہو سکتی ہے۔ افواج، پولیس کے محکمے، عدالتیں اور جیلیں دائمی طور پر متواتر زور اور زبردستی کی مدد سے لوگوں کو ایک مخصوص تصوراتی نظام کے مطابق عمل پیرا ہونے کے 'فرائض' سرانجام دیتے ہیں۔ اگر قدیم بابل کے شہر کا کوئی باشندہ اپنے پڑوسی کی آنکھ پھوڑ دیتا تو 'آنکھ کے بدلے آنکھ' کے قانون کو لاگو کرنے کے لیے لازماً کچھ نہ کچھ تشدد درکار ہی تھا، بلکہ ضرورت تھی۔ جب 1860ء میں امریکیوں کی اکثریت نے افریقی غلاموں کو بالآخر انسان سمجھنے اور انھیں آزادی کا حق دینے کا فیصلہ کر لیا تو اس 'تصور' کو عام کرنے اور جنوبی ریاستوں کو رضامند کرنے کے لیے ایک انتہائی خون خرابے کی حامل خانہ جنگی لڑنی پڑی تھی۔

تاہم، ایک تصوراتی نظام صرف اور صرف تشدد، زور اور زبردستی کی مدد سے محفوظ یا قائم نہیں رکھا جاسکتا۔ اس کے لیے 'سچے اصحاب ایمان'، یقین کرنے والوں کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک شخص تھا، شارل موریس تالیران۔۔ اس کی پوری فنی زندگی گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے گزری۔ وہ فرانس میں پہلے شہنشاہ لوئی شانزدھم کے دربار سے منسلک تھا اور پھر وہ انقلابیوں میں شامل ہو گیا اور آخر میں نپولین کے راج میں بھی خدمات سرانجام دیں۔ وہ پوری زندگی وفاداریاں بدل کر بالآخر دوبارہ سے قائم ہونے والی شہنشاہیت کا حصہ بن گیا۔ وہ اپنی کئی دہائیوں پر مشتمل سرکاری تجربے کو کچھ یوں سمیٹتا ہے کہ: 'آپ ایک خنجر سے کئی طرح کے کام لے سکتے ہیں لیکن اس خنجر کو نیچے رکھ کر اس کے اوپر بیٹھنا کسی طور بھی عقلمندی نہیں ہے۔۔۔ بلکہ یہ کافی تکلیف دہ ہو سکتا ہے'۔ ایک پادری، کئی کئی بلکہ سینکڑوں فوجیوں سے کہیں زیادہ سستے اور موثر انداز میں کام نکال سکتا ہے۔ علاوہ ازیں، خنجر بھلے کتنے ہی تیز دھار اور موثر کیوں نہ ہوں۔۔۔ کسی نہ کسی کو یہ خنجر اپنے قبضے اور اس سے بھی اہم قابو میں رکھنا ہی پڑتا ہے۔ اگر یہ فوجی، جیلر، جج اور پولیس حکام کسی ایسے تصوراتی نظام کو بھلا کیوں کیوں بحال رکھیں گے جس پر انھیں یقین ہی نہ ہو؟ انسان کی سبھی اجتماعی اور باہمی اشتراک پر مبنی سرگرمیوں میں سب سے مشکل ترین کام منظم انداز میں تشدد کا استعمال ہے۔ مثال کے طور پر اگر کسی سماجی نظام کو قائم دائم رکھنے کے لیے فوجی طاقت کے استعمال کیا جائے تو فوراً ہی سوال اٹھ کھڑے ہوتے ہیں کہ، 'ہاں ٹھیک ہے۔۔۔ اس سماجی نظام کو چلانے کے لیے فوجی طاقت کا استعمال ناگزیر ہے لیکن یہ بھی تو پتہ چلے کہ آخر فوجی نظام کو کون چلا رہا ہے؟' اب ایک فوجی نظام کو صرف اور صرف جبر اور زبردستی کی بنیاد پر تادیر برقرار رکھنا ناممکن ہے۔ اس فوج میں شامل اگر سبھی نہیں تو کم از کم کچھ ایسے کمانڈر اور سپاہی لازم ہیں جو کسی چیز میں ایمان رکھتے ہوں۔۔۔ یہ فوجی نظام کی بنیاد بننے والی کوئی بھی شے ہو سکتی ہے۔ خدا، حمیت، مادر وطن، مردانگی، اختیار یا پیسہ وغیرہ۔۔۔

اس سے بھی دلچسپ سوال ان کے بارے ہے، جو اس سماجی اہرام کی چوٹی پر براجمان ہوتے ہیں۔ آخر وہ ایک تصوراتی نظام کو جبر سے نافذ کرنے کی سعی کیوں کریں جبکہ وہ خود بھی اس میں یقین نہیں رکھتے؟ اس ضمن میں ایک بہت ہی عام دلیل یہ ہے کہ دراصل اشرافیہ بے حیائی کی حد تک کلبی لالچ کا شکار ہوتی ہے۔ لیکن وہ جو کسی شے میں یقین نہیں رکھتا۔۔۔ لالچی بھی نہیں ہو سکتا۔ بات یہ ہے کہ آدمی کی لالچ اور بھوک زیادہ سے زیادہ کیا ہو گی؟ حیاتیاتی معنوں میں آدمی کی معقول ضرورتیں اتنی زیادہ نہیں ہیں اور نہ ہی ان پر کچھ زیادہ خرچ اٹھتا ہے۔ جب وہ ضرورتیں پوری ہو جاتی ہیں تو باقی دولت کو اہرام تعمیر کرنے، دنیا کی سیر کرنے، انتخابی مہمات چلانے، اپنی پسندیدہ دہشت گرد تنظیم کو چندہ دینے اور سٹاک مارکیٹ میں سرمایہ لگا کر مزید دولت بنانے کے لیے استعمال کی جا سکتی ہے۔ اب یہ ساری سرگرمیاں ایسی ہیں جو کسی بھی سچے تارک لذات اور خشک مزاج آدمی کے لیے بے معنی ہوتی ہیں۔ ایک کلبی یونانی فلسفی ہوا کرتا تھا۔ اس کا نام دیوجانس تھا۔ یہ سخت خشک مزاج اور کلبی نظریات کا بانی تھا۔ اس کی رہائش ایک بیرل نما ڈبے میں ہوا کرتی تھی۔ ایک

دفعہ سکندر اعظم دیو جانس سے ملنے گیا۔ اس وقت دیو جانس دھوپ سیک رہا تھا۔ سکندر اعظم نے اس سے پوچھا کہ کیا وہ اس کے لیے کچھ کر سکتا ہے؟ مانگو۔۔۔ تو دیو جانس کلبی نے عظیم فاتح کو ٹھسے سے جواب دیا، 'ہاں۔۔۔ کیوں نہیں۔ تم ایسا کرو کہ تھوڑا ایک طرف ہو جاؤ، تم دھوپ کا راستہ روک رہے ہو'۔

یہی وجہ ہے کہ کلبیت کے عادی کبھی سلطنتیں کھڑی نہیں کرتے اور یہی وجہ ہے کہ ایک تصوراتی نظام صرف اسی وقت قائم رہ سکتا ہے جب آبادی کا ایک بڑا حصہ عموماً اور اشرافیہ و افواج بڑا حصہ بالخصوص کسی شے میں پوری سچائی کے ساتھ یقین نہیں کر لیتے۔ اگر پادری اور کلیسائی حکام کی اکثریت یسوع مسیح میں یقین نہ رکھتی تو آج دو ہزار سال بعد بھی عیسائیت کے باقی رہنے کی کوئی دوسری صورت نہیں تھی۔ اگر امریکی صدور اور کانگریسی ارکان کی اکثریت انسانی حقوق میں یقین رکھنے میں ناکام ہو جاتی تو آج امریکی جمہوریت کسی بھی صورت ڈھائی سو سال نہیں نکال سکتی تھی۔ اگر سرمایہ داروں اور بینکاروں کی اکثریت اس سرمایہ داری نظام میں اپنا یقین کھو دیں تو لکھ رکھیں یہ نظام ایک دن تو دور۔۔۔ چند گھنٹے بھی نہیں چل سکتا۔

جیل کی دیواریں

آپ لوگوں کو کسی بھی تصوراتی نظام جیسے عیسائیت، جمہوریت یا سرمایہ داری میں یقین لانے پر کیسے مائل کر سکتے ہیں؟ اس میں سب سے اول کام تو یہ ہے کہ آپ کبھی اور ہرگز یہ نہ مانیں کہ دراصل یہ صرف اور صرف ایک تصوراتی نظام ہے۔ ہمیشہ اسی بات پر زور دیتے رہیں کہ یہ نظام جو سماجی ترتیب کو برقرار رکھے ہوئے ہے۔۔۔ اس کی اپنی معروضی حقیقت ہے جو کسی خدا یا قدرت وغیرہ نے خود تشکیل دی ہے۔ لوگوں میں طبقات اور امتیاز پایا جاتا ہے۔۔۔ یہ حمورابی کا نہیں بلکہ انلیل اور مدروخ نامی خداؤں کا حکم ہے۔ سبھی انسان برابر ہیں۔۔۔ یہ تھامس جیفرسن کی دماغی اختراع نہیں بلکہ خدا نے انسانوں کو یوں ہی پیدا کیا ہے۔ آزادانہ تجارت، ایک بہترین معاشی نظام ہے۔۔۔ اس لیے نہیں کہ ایڈم سمتھ کا یہ کہنا ہے بلکہ اس لیے کہ یہ 'قدرت کا اٹل قانون' ہے۔

اس کے علاوہ آپ لوگوں کو ان تصورات اور اس نظام بارے پوری طرح سے تعلیم دینے کا بھی انتظام کریں۔ پیدائش کے بعد، ہوش سنبھالتے ہی بچوں کو اس تصوراتی نظام کے اصول اور خدوخال سمجھانا، بجھانا اور رٹانا شروع کر دیں۔ ان کو بار بار یاد دہانی کروائیں کہ دراصل یہ اصول ہر شے، ہر چیز اور معاملے میں لاگو ہوتے ہیں۔ یہ اصول پریوں کی کہانیوں، ڈراموں، مصوری کے فن، گانوں، آداب محفل، معاشرت، سیاسی پروپیگنڈے، تعمیرات، کھانے پینے کی تراکیب اور فیشن۔۔۔ الغرض ہر شے میں لاگو ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر آج لوگ برابری اور مساوات پر سختی سے یقین رکھتے ہیں، اسی لیے امیرزادے بھی جینز پہنتے ہیں حالانکہ جینز مزدور اور محنت کش طبقے کا لباس ہے۔ قرون وسطی کے دور میں چونکہ لوگ طبقاتی تقسیم پر یقین رکھتے تھے۔۔۔ اسی لیے کوئی عالی نسب یا امیرزادہ کسی دہقان کی پوشاک

نہیں پہنتا تھا اور دہقان کسی رئیس کی طرح لباس زیب تن کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس زمانے میں خطابات جیسے سر اور میڈم وغیرہ صرف اور صرف اشرافیہ یا امراء کے طبقے کے لیے مختص ہوا کرتے تھے لیکن آج دنیا بھر میں لوگ مہذب اور شائستہ انداز کی خط و کتابت اور خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرنے کے لیے ہر کسی کو۔۔۔ بغیر لحاظ اور رتبے کے، 'ڈیئر سر۔۔۔' اور 'ڈیئر میڈم۔۔۔' کہہ کر لکھتے اور پکارتے ہیں۔

سوشل سائنسز اور علم و ادب کی تقریباً سبھی اصناف میں ساری توانائی اسی امر پر زور دینے پر لگ جاتا ہے کہ کیسے کوئی تصوراتی نظام زندگی کی گل کاری میں گتھا ہوتا ہے۔ یہاں، ہم چونکہ موقع اور محل کی کمی کے سبب زیادہ تفصیل سے تو نہیں لیکن بہرحال سرسری سا ہی جائزہ لے سکتے ہیں۔ اس ضمن میں تین سب سے اہم عوامل کا ذکر ضروری ہے۔ یہ وہ عوامل ہیں جن کی بناء پر لوگ اپنی زندگی کے ہر حصے پر اثر انداز ہونے والے تصوراتی نظام کو حقیقت سمجھ کر یہ بھول جاتے ہیں کہ یہ صرف تخیل کی کارستانی ہے:

الف۔ ایک تصوراتی نظام، مادی اور معروضی دنیا میں جما ہوتا ہے۔ اگرچہ ایک تصوراتی حقیقت صرف ہمارے دماغ میں پایا جاتا ہے لیکن یہ ہمارے ارد گرد کی معروضی اور مادی دنیا میں بھی گوندھی جا سکتی ہے۔ مثال کے طور پر آج مغربی دنیا کی اکثریت 'انفرادیت' پر یقین رکھتی ہے۔ ان کا ایمان ہے کہ ہر انسان، اپنے آپ میں ایک فرد یعنی انفرادی خصوصیت رکھتا ہے۔ مزید یہ کہ انفرادی سطح پر کسی بھی انسان کی قدر و قیمت، عزت و منزلت دوسروں کی اس شخص بارے سوچ پر منحصر نہیں ہوتی۔ آج، مغربی دنیا کے سکولوں میں اساتذہ اور والدین اپنے بچوں کو سکھاتے ہیں کہ اگر ان کے کلاس فیلو اور دوسرے بچے ان کا مزاق اڑائیں تو وہ انھیں یکسر نظر انداز کر دیں۔ وہ سرے سے پرواہ ہی نہ کریں۔ ان کی اصل قدر، قیمت، عزت اور منزلت سوائے ان کے اپنے سوا کوئی دوسرا نہیں جان سکتا۔

یہ جو انفرادیت کا تصور ہے، اصل میں جدید فن تعمیرات میں پتھر اور گارے کی اوکھل سے جڑی ہے۔ ہم پتھر اور گارے کو اپنے اسی تخیل کا غلام بنا کر اپنی نوعیت کی ایک مخصوص طرز پر تعمیرات میں استعمال کرتے ہیں۔ آج کی جدید دنیا میں ایک مثالی گھر وہ سمجھا جاتا ہے جس میں کئی چھوٹے چھوٹے کئی کمرے ہوں تا کہ ہر بچے کو اپنی ذاتی جگہ مل سکے جس میں کوئی دخل اندازی نہ کرتا ہو۔ یہ ایسی جگہ ہو جو دوسروں کی نظروں سے اوجھل ہو اور جتنی زیادہ ممکن ہو، اختیار اور آزادی فراہم کرتی ہو۔ اب ان بچوں کے کمروں میں، مارے مجبوری۔۔۔ ایک دروازہ بہرحال ناگزیر ہے۔ کئی گھرانوں میں بچوں کو ان دروازوں کو بند رکھنے اور بعض اوقات مقفل کرنے کی بھی مکمل آزادی ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ والدین کے لیے بھی بچوں کے کمرے میں بغیر دستک دیے یا اجازت لیے بغیر داخلے کی ممانعت ہوتی ہے۔ بچے اپنی مرضی سے ان کمروں کی آرائش کرتے ہیں۔ دیواروں پر راک سٹار گلو کاروں کے پوسٹر اور فرش پر گندی جرابیں اور کپڑے بکھرے پڑے ہوں تو کوئی پرواہ نہیں ہے۔ ایسی جگہ پر پلنے والا کوئی بھی شخص اپنے آپ کو انفرادی سطح پر کچھ ایسے 'یکتا' سمجھتا ہے جس کی اصل قدر و قیمت کا سرچشمہ بیرون نہیں بلکہ اندرون ہوتا ہے۔

قرون وسطیٰ کاانسان، انفرادیت میں یقین نہیں رکھتا تھا۔ کسی بھی شخص کی قدر وقیمت سماجی ترتیب میں اس کے رتبے اور درجے کے ساتھ جڑی ہوتی تھی۔ اس کی اصل عزت یہ تھی کہ باقی کے لوگ اس کے بارے کیا سوچتے اور کہتے پھرتے ہیں۔ اگر کسی شخص پر کوئی ہنستا یا کہیے۔۔۔مذاق اڑانا سخت ناپسند کیا جاتا تھا اور توہین سمجھی جاتی تھی۔ اس زمانے میں مہذب گھرانوں کے بچوں کو ہر قیمت پر اپنی عزت اور بالخصوص والدین کے نام کا بھرم قائم رکھنے کی سختی سے تلقین کی جاتی تھی۔ جس طرح جدید زمانے کی انفرادیت، قرون وسطیٰ کے دور میں اقدار کے نظام نے بھی تخیل سے نکل کر اس دور میں پائے جانے والے قلعوں، حویلیوں اور کوٹھیوں کی شکل اختیار کر لی تھی۔ ایک قلعہ میں بچوں کے لیے ذاتی کمرے کا رواج نہ ہونے کے برابر تھا۔ قلعوں، حویلیوں اور پرانے زمانے کی کوٹھیوں میں بچے تو دور، بڑوں کے لیے بھی ذاتی کمرے دستیاب نہیں ہوتے تھے۔ قرون وسطیٰ کے کسی جاگیردار یا نواب کے نوعمر لڑکوں کے لیے قلعے یا حویلی کی دوسری منزل پر ذاتی کمرہ نہیں ہوتا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں شاہ انگلستان، رچرڈ اول یا کنگ آرتھر یا بابر بادشاہ کا پوسٹر نہیں لگاتا تھا اور نہ ہی اسے اپنی رہائشی جگہ کو بند رکھنے یا مقفل کرنے کی اجازت ہوا کرتی تھی۔ وہ تو کئی دوسرے اپنے ہم عصر لڑکوں کے ساتھ کسی کھلے ہال میں سویا کرتا تھا۔ ہر کوئی اس کو دیکھ سکتا تھا اور آتے جاتے۔۔۔اس کو نظر میں رکھتا تھا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ دوسروں کی موجودگی پر توجہ رکھے اور ان کی کہی باتوں اور مشاہدات کو خوب خاطر میں لایا کرے۔ اس طرح کی جگہ اور صورتحال میں پلنے والا کوئی بھی شخص قدرتی طور پر یہی سمجھنے لگتا تھا کہ ایک شخص کی اصل قدر اور عزت وہ ہے جو دوسروں کی نظر میں ہے۔ وہ یہی سمجھنے لگتا کہ دراصل معاشرے میں اس کا اصل مقام وہی ہے جو دوسرے اس کو عطا کرتے ہیں۔

ب۔ تصوراتی حقیقت اور نظام ہماری خواہشات کو شکل دیتا ہے۔ لوگوں کی اکثریت یہ قبول رکھنے کی سرے سے خواہش ہی نہیں رکھتے کہ ان کی زندگیوں پر راج کرنے والا نظام دراصل غیر حقیقی اور تصور پر مبنی ہے۔ یہ ایک خیال ہے اور کچھ نہیں ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہر انسان پہلے سے موجود ایک تصوراتی نظام میں پیدا ہوا ہے۔ اس کی خواہشات، پیدائش کے وقت سے ہی ان کی زندگیوں پر مسلط اسطور اور مفروضوں کی پیداوار ہوتی ہیں۔ ذاتی طور پر ہماری ذاتی خواہشات بالآخر کسی بھی تصوراتی حقیقت یا نظام کا سب سے اہم دفاع بھی بن جاتا ہے۔

مثال کے طور پر آج جدید دور کے مغربی باشندوں کی سب سے دلپسند خواہشات کو شکل دینے والے عوامل رومان، قوم پرستی، سرمایہ داری اور انسانیت کے تصورات ہیں۔ یہ وہ تصورات ہیں جو صدیوں سے موجود ہیں۔ اکثر لوگ اپنے دوستوں کو مشورہ دیتے ہیں، 'اپنے دل کی سنو!'۔ لیکن دل کا معاملہ یہ ہے کہ وہ تو دوہرا ہے۔ یعنی، وہ دل تو اس شخص کا ہے لیکن اس پر غالب آج کے عام تصورات ہیں۔ 'اپنے دل کی آواز سنیے۔۔۔' والی خرافات دراصل ہمارے دماغ میں انیسویں صدی کے رومان پسند تصورات اور بیسویں صدی کے

صارفیت تصورات کا مکسچر ہے۔ مثال کے طور پر کو کا کولا کمپنی نے اپنے ڈائیٹ کوک مشروب کو اس نعرے کے ساتھ بہت ہی خوب بیچا اور بیش بہا منافع بھی کمایا کہ، 'ڈائٹ کوک، وہ کرو۔۔۔ جو اچھا لگتا ہے!'۔

یہاں تک کہ لوگ جن خواہشات کو اپنی انتہائی ذاتی خواہشات سمجھتے اور مانتے ہیں۔۔۔ وہ بھی دراصل تصوراتی حقیقت یا نظام کی تیار کردہ ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر، ہم میں سے تقریباً سبھی لوگ دور دراز۔۔۔ کسی اجنبی ملک میں، اپنے محبوب کے ہمراہ موج مستی کی چھٹیاں گزارنے کی خواہش رکھتا ہی ہے۔ یہ خواہش۔۔۔ سخت رومانوی اور انتہا کی ذاتی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن پتہ کیا، یہ خواہش نہ تو فطری ہے اور نہ ہی یہ صاف اور عیاں ہے۔ کسی بن مانس جتھے کا سردار نر کبھی بھی اپنی طاقت، بل اور زور کو استعمال میں لا کر کسی پڑوسی بن مانس جتھے کے علاقے میں چھٹیاں منانے کی سوچ نہیں پالے گا۔ قدیم مصر کی اشرافیہ اپنی دھن دولت کو استعمال میں لا کر اہرام تعمیر کروایا کرتے تھے اور مرنے کے بعد لاشوں کی ممیاں بنواتے تھے۔ ان میں سے کسی نے کبھی بھی بابل میں شاپنگ کرنے یا فونیشیا میں اسکیٹر پہن کر دوڑنے اور پھسلنے جیسی موج مستی بارے نہیں سوچا ہو گا۔ آج لوگ بڑی مقدار میں بیرون ملک چھٹیوں پر پیسہ پانی کی طرح بہا دیتے ہیں۔۔۔ اس لیے نہیں کہ یہ ان کی بچپن سے خواہش رہی ہے بلکہ اس لیے کیونکہ وہ رومان پسند صارفیت۔۔۔ یعنی 'رومینٹک کنزیومرزم' کے سچے ماننے والے ہیں۔

رومانیت ہمیں بتاتی ہے کہ انسانی طاقت کا بھرپور استعمال کرنے کے لیے لازم ہے کہ ہم جتنے زیادہ ہوں، اتنے ہی کئی کئی تجربات حاصل کیا کریں۔ ہمیں اپنے آپ کو جذبات کی قوس قزح، مراد کئی طرح کے جذبات کے لیے کھولنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس ضمن میں ہمیں کئی کئی اور کئی اقسام کے تعلق اور ناطے بنانے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ ہمیں طرح طرح کے نت نئے کھانے چکھنے کی حاجت رہتی ہے۔ ہمیں اپنے لیے موسیقی کی مختلف طرحوں میں دلچسپی پیدا کرنا لازم ٹھہرتا ہے۔ اس کا ایک بہترین طریقہ یہ ہے کہ ہم اپنی روزمرہ مصروفیات اور روٹین سے ہٹ کر کچھ کیا کریں۔ اپنے روزمرہ کے ماحول کو چھوڑ کر کسی دوسری طرف نکل لیں۔۔۔ دور دراز علاقوں کا سفر اختیار کریں جہاں ہمیں کسی دوسری ثقافت، خوشبوؤں، ذائقوں اور طرح طرح کے دوسرے لوگوں کی زندگی کا 'تجربہ' حاصل ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ہم انہی رومان پسند تجربات سے گزرنے والے لوگوں کو رومانی تصورات کے بہکاوے میں آنے کے بعد بار بار کہتا ہوا سنتے ہی رہتے ہیں کہ جی، 'ارے۔۔۔ کیا بتاؤں، ایسا تجربہ زندگی میں پہلی دفعہ ہوا۔۔۔ میری آنکھیں کھل گئیں اور میری تو زندگی ہی بدل گئی ہے!'۔

صارفیت ہمیں بتاتی ہے کہ خوش رہنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم جتنی زیادہ ممکن ہوں۔۔۔ مصنوعات اور خدمات کا استعمال کیا کریں۔ اگر ہمیں زندگی میں کسی شے کی کمی محسوس ہوتی ہے یا کچھ اچھا محسوس نہیں ہوتا تو اس کا بہترین علاج یہ ہے کہ کوئی نئی چیز (نئی گاڑی، نئے کپڑے، مہنگے کھانے وغیرہ) خرید لیں یا مہنگی خدمت داری (نفیس گھرداری، پرتعیش تھیراپی، یوگا کی کلاسیں، بدیسی چپی

مالش وغیرہ) وغیرہ حاصل کر لیں۔ٹی وی پر چل رہا ہر کمرشل کسی نہ کسی ایسی مصنوعہ اور خدمت کی ایسی چھوٹی سی حکایت۔۔۔قصہ ہے کہ جس کا استعمال ہماری زندگی کو بہتر بنا سکتا ہے۔

رومانویت تنوع اور گونا گوئی کی حوصلہ افزائی کرتی ہے۔۔۔اسی لیے یہ صارفیت یا کنزیومرزم کے ساتھ فٹ بیٹھتی ہے۔ کسی جوڑے کی شادی ہوتی ہے تو اس کے نتیجے میں تجربات کا ایک دہانہ کھل جاتا ہے۔اسی پر سیر وسیاحت کی جدید انڈسٹری کھڑی ہے۔ سیر وسیاحت کی انڈسٹری میں ہوائی ٹکٹ،ہوٹلوں کے کمرے اور ریستوانوں کا مینو نہیں بلکہ تجربات بیچے جاتے ہیں۔ پیرس ایک شہر نہیں ہے اور بھارت کوئی ملک نہیں ہے بلکہ یہ دونوں ہی اصل میں یہاں آنے والوں کے لیے ایک تجربہ ہیں۔ ان جگہوں پر پہنچ کر قیاس ہے کہ۔۔۔ حاصل ہونے والے تجربات سے ہماری سوچ کے در کھول دیتے ہیں،ہمارے انسانی وجوب کی تکمیل ہو جاتی ہے یا پھر ہمیں خوشی حاصل ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب کسی کروڑ پتی شخص کی شادی خطرے میں پڑ جاتی ہے تو وہ اپنی بیوی کو ایک مہنگے سفر پر پیرس کی سیر کروا دیتا ہے۔یہ سیر کسی خواہش یا تمنا۔۔۔ چاہ کی عکاس نہیں ہے بلکہ رومانوی صارفیت کے تصورات میں پر جوش اور کھلے عام یقین کا مظہر ہے۔قدیم مصر میں کسی دولت مند شخص نے کبھی اپنی بیوی کو منانے کے لیے بابل میں مہنگی چھٹیاں گزارنے کا خواب نہیں دیکھا ہو گا۔بجائے،اس نے اسے خوش کرنے کے لیے شاندار اور پر تکلف مقبرہ بنانے کا وعدہ کیا ہو گا۔اس کی بیوی کو ہمیشہ سے ہی کسی گراں قیمت اور پر تکلف مقبرے میں دفن ہونے کی خواہش رہی تھی۔

18: گیزا کا عظیم اہرام مصر

قدیم مصر کی اشرافیہ کی طرح، تقریباً سبھی تہذیبوں اور ثقافتوں میں لوگوں نے اپنی پوری زندگی اہرام کی تعمیر کے لیے وقف کر دیتے ہیں۔ان اہرام کا صرف نام،شکل اور سائز بدل جاتا ہے۔مثال کے طور پر یہ کسی شہر کے مضافاتی علاقے میں ایک چار کنال کی کوٹھی کی شکل بھی ہو سکتی ہے جس میں ایک ہرا بھرا باغیچہ،کھلے کمرے،سوئمنگ پول اور آنکھوں کو ٹھنڈک دینے والا نظارہ بھی ہوتا ہے۔ان اہرام کی خواہش رکھنے کے تصورات پر سوال اٹھانے کی ہمت معدودے چند ہی ہوتے ہیں جو بہر طور۔۔۔کر گزرتے ہیں۔

ج۔ **تصوراتی حقیقت یا نظام بین موضوعی ہوتا ہے۔** اگر میں کسی بھی طرح،مثال کوئی ملکوتی طاقت استعمال کر کے اپنی ذاتی خواہشات کو تصوراتی نظام کے چنگل سے چھڑا بھی لوں تو پھر بھی۔۔۔میں ایسا کر گزرنے والا،ایک فرد واحد ہوں۔ایک تصوراتی نظام کو بدلنے کے لیے مجھے لاکھوں اجنبی لوگوں کا تعاون درکار ہو گا۔۔۔مجھے کروڑوں لوگوں کو قائل کرنا ہو گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تصوراتی نظام میرے تخیل میں پائے جانے والا میرا ذاتی،انفرادی یا فاعلی نظام نہیں ہے۔یہ تو بین موضوعی نظام ہے جو ہزاروں،لاکھوں بلکہ کروڑوں لوگوں کے تخیل میں بٹا ہوا ہوتا ہے۔

اس نکتے کو سمجھنے کے لیے ہمیں پہلے 'معروضی'، 'موضوعی' اور 'بین موضوعی' میں فرق سمجھنا ہو گا۔

معروضی چیز انسانی سوچ، شعور اور عقائد کے بغیر بھی وجود رکھتی ہے۔ مثال کے طور پر تابکاری ایک معروضی شے ہے اور کوئی مفروضہ یا تصور نہیں ہے۔ تابکاری اس وقت بھی موجود تھی جب اسے انسان نے دریافت بھی نہیں کیا تھا۔ یہ اس وقت بھی اتنی ہی خطرناک ہوا کرتی تھی جب لوگ تابکاری کے جان لیوا اثرات کو سرے سے مانتے ہی نہیں تھے۔ تابکاری کو دریافت کرنے والی میری کیوری نامی خاتون سائنسدان ۔۔۔ اپنی پوری زندگی تابکار مادے پر تحقیق کرتی رہیں لیکن انھیں ذرہ بھر احساس نہیں ہوا کہ تابکار مادہ ان کے جسم کو سخت نقصان پہنچا سکتا ہے۔ اگرچہ میری کیوری کو یہ یقین نہیں تھا کہ تابکار شعاعیں آدمی کو موت کے منہ میں دھکیل سکتی ہیں ۔۔۔ وہ پھر بھی، اس کے باوجود ہڈیوں کے گودے میں کمی کی وجہ سے خون کی کمی کا شکار ہو کر موت کے منہ میں چلی گئیں۔ یہ ایسی بیماری ہے جو زیادہ دیر تک تابکار مادے کے ساتھ پیش کشائی سے لاحق ہو جاتی ہے۔

موضوعی یا ذہنی چیز وہ ہوتی ہے جو کسی ایک فرد واحد کی سوچ، شعور یا عقیدے پر انحصار رکھتی ہے۔ اگر وہ مخصوص فرد اپنی سوچ یا عقیدہ بدل دے تو موضوعی یا ذہنی چیز بھی بدل جاتی ہے یا سرے سے ہی غائب ہو کر ختم ہو جاتی ہے۔ بچوں میں موضوعی یا ذہنی چیزیں بہت عام ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر تقریباً سبھی بچے کسی نہ کسی تصوراتی شے بارے یقین ضرور رکھتے ہیں۔ مثلاً ایک تصوراتی دوست، جو باقی کسی کو نظر بھی نہیں آتا اور وہ کسی کو سنائی بھی نہیں دیتا۔ یہ تصوراتی دوست صرف اور صرف اسی ایک بچے کے ذہن اور شعور میں پایا جاتا ہے۔ جب بچہ کچھ بڑا ہو جاتا ہے تو وہ بوجوہ اس تصوراتی دوست پر یقین چھوڑ دیتا ہے اور یوں یہ تصوراتی دوست خود بخود ہی رفتہ رفتہ غائب ہو جاتا ہے۔

بین موضوعی ایسی شے ہے جو دو یا زیادہ اشخاص سے متعلق ہے۔ یہ کئی افراد کے شعور میں ایک ساتھ، ایک ہی شے بارے پایا جانے والا، کسی غیر معروضی شے بارے رابطہ ہوتا ہے جو انھیں جوڑ کر رکھتا ہے۔ اگر کوئی ایک فرد واحد اپنی سوچ یا عقیدہ بدل دے ۔۔۔ یا وہ مر بھی جائے تو اس کی چنداں اہمیت نہیں ہے۔ تاہم، اگر اس گروہ کے بہت سے افراد اپنی سوچ یا عقیدہ بدل دیں یا مر وغیرہ جائیں تو بین موضوعی شے یا تو ہیئت بدل دے گی یا پھر رفتہ رفتہ ختم ہو جائے گی۔ بین موضوعی معاملات نہ تو بد خواہی پر مبنی فراڈ ہوتے ہیں اور نہ ہی مہمل اور غیر اہم پہیلیاں ہوا کرتی ہیں بلکہ یہ تو نہایت ہی طاقتور ہوتی ہیں۔ بین موضوعی چیزیں یا معاملات، معروضی یا مادی چیزوں یا معاملات سے مختلف ہوتے ہیں لیکن ان کا دنیا پر اثر و رسوخ پھر بھی بے انتہا اور زبردست ہوتا ہے۔ مثلاً بین موضوعی چیزیں جیسے قوانین، پیسہ، خدا اور اقوام وغیرہ تابکاری جیسی معروضی تو نہیں ہوتیں لیکن پھر بھی تاریخ کے سب سے اہم محرکات یہی بین موضوعی تصورات ہی رہے ہیں۔

مثال کے طور پر پژو کمپنی، صرف پژو کمپنی کے چیف ایگزیکٹو آفیسر کا خیالی دوست نہیں ہے۔ پژو کمپنی لاکھوں لوگوں کی اجتماعی سوچ اور تخیل میں وجود رکھتی ہے۔ چیف ایگزیکٹو آفیسر، پژو کمپنی کے وجود میں اس لیے یقین رکھتا ہے کیونکہ اس کمپنی کے بورڈ آف ڈائریکٹرز، کمپنی کے وکلاء، ہزاروں سیکرٹری، بینکار، سٹاک ایکسچینج کے بروکر اور فرانس سے لے کر آسٹریلیا تک کار ڈیلر پژو کمپنی کے وجود پر یقین رکھتے ہیں۔ اگر چیف ایگزیکٹو آفیسر انفرادی سطح پر اچانک پژو کمپنی کے وجود سے انکار کردے تو اسے فوراً ہی کسی قریبی مینٹل ہسپتال میں داخل کروا دیا جائے گا اور اس کی جگہ نیا چیف ایگزیکٹو آفیسر بھرتی کرلیا جائے گا۔ پژو کمپنی کے وجود پر چیف ایگزیکٹو آفیسر کی انفرادی سوچ کے ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

اسی طرح ڈالر، انسانی حقوق اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ وغیرہ بھی اربوں لوگوں کی اجتماعی سوچ اور تخیل میں ہی وجود رکھتے ہیں۔۔۔ کوئی ایک فرد، کوئی ایک شخص ان ساری چیزوں کے بقاء کے لیے انفرادی سطح پر کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اگر میں، انفرادی سطح پر ڈالر، انسانی حقوق یا ریاستہائے متحدہ امریکہ کے وجود سے یقین اٹھالوں تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ یہ ساری تصوراتی حقیقتیں ہیں اور یہ سارے تصوراتی نظام بین موضوعی ہیں۔ چنانچہ، اگر ہم انھیں بدلنا چاہتے ہیں تو اس کے لیے ضروری ہے کہ اربوں لوگوں کے شعور میں تبدیلی لائی جائے جو کہ ہرگز بھی آسان نہیں ہے۔ اس سطح کی تبدیلی صرف اور صرف پیچیدہ اور مولتف قسم کی تنظیم اور ترتیب۔۔۔ مثال کے طور پر کسی سیاسی جماعت کی تشکیل، کوئی نظریاتی تحریک یا مذہبی مسالک وغیرہ کار آمد ہوسکتے ہیں۔ تاہم، ایسی پیچیدہ اور مولتف ترتیب بنانے کے لیے ضروری ہے کہ کئی کئی اجنبیوں کو ایک دوسرے کے ساتھ تعاون اور اشتراک پر قائل کیا جائے۔ یہ تعاون اور اشتراک صرف اسی صورت ممکن ہے اگر یہ تمام اجنبی مل کر ایک ہی طرح کی اساطیر، تصوریا قصے پر یقین دھرلیں۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اگر آپ کسی موجودہ تصوراتی نظام کو بدلنا چاہتے ہیں تو اس کے لیے سب سے پہلے اس کے متبادل تصوراتی نظام پر یقین لانا لازم ہے۔

مثلاً، اگر آپ پژو کمپنی کو تار تار کرکے منہدم کرنا چاہتے ہیں تو ہیں کمپنی سے مضبوط تصوراتی نظام بارے سوچنا ہوگا۔ یہ فرانس کا قانونی نظام ہے۔ اگر آپ فرانس کے قانونی نظام کو تہس نہس کرنا چاہتے ہیں تو اس سے بھی کہیں برتر۔۔۔ یعنی فرانسیسی ریاست کے بارے سوچیے۔ اور اگر آپ فرانسیسی ریاست کو بھی اکھاڑ پھینکنا چاہتے ہیں تو ہیں اس سے بھی کہیں زیادہ مضبوط اور برتر قوت کا خیال آنا لازم ہے۔

مدعا یہ ہے کہ تصوراتی نظام کے اس چکر سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ جب ہم تصوراتی نظام کی اس جیل کی دیواریں توڑ کر آزادی کی طرف دوڑنا شروع کرتے ہیں تو ہم اصل میں اس سے بھی کہیں بڑی اور وسیع جیل کے اندر بھاگ دوڑ کر رہے ہوتے ہیں۔

حافظے پر بوجھ

ارتقاء نے آدمی کو فٹ بال کھیلنے کی اہلیت نہیں بخشی۔ یہ درست ہے کہ ارتقاء کے نتیجے میں لاتیں چلانے کے لیے آدمی لاتیں، روند مارنے کے لیے کہنیاں اور صلواتیں سنانے کے لیے منہ نکل آئے تھے۔ لیکن یہ سارے اعضاء استعمال کر کے پنلٹی کک مارنے کی اہلیت اور مشق ہماری اپنی ہے۔ اگر آپ کسی بھی شام میں اپنے قصبے کے کھیل کے میدان میں فٹ بال کھیلنا چاہیں تو آپ کو دس دوسرے اجنبیوں کے ساتھ مل کر ٹیم بنانی پڑے گی۔ اگر آپ اس جگہ نئے ہیں تو یقیناً آپ کی ٹیم کے باقی لوگ آپ کے لیے قطعاً اجنبی ہوں گے، جنھیں آپ نے اس سے قبل کبھی دیکھا اور نہ ہی ملاقات کی۔ جہاں یہ، وہیں مخالف ٹیم میں بھی گیارہ اجنبی وہ بھی ہیں جو فٹ بال کے اصولوں کے عین مطابق کھیلتے ہیں، جو آپ نے بھی سیکھ رکھے ہیں۔ دوسرے جانوروں میں اجنبیوں کے ساتھ اس طرح کی چھیڑ خانی پر مبنی آداب اور مراسم عام طور پر جبلت کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ دنیا بھر میں کتوں کے پلے ایک دوسرے کو چھیڑتے، کھیلتے، لتاڑتے ہیں لیکن ان کا یہ طور خالصتاً جینیاتی ہے۔ یہ ان کی فطرت میں لکھا ہے۔ لیکن انسانوں میں فٹ بال کھیلنے کے لیے کوئی کو نیہ نہیں ہے۔۔۔ اس کی فطرت میں فٹ بال کھنے کی جبلت لکھی ہوئی نہیں ہے۔ لیکن اس کے باوجود انسان کئی اجنبیوں کے ساتھ مل کر فٹ بال کھیلنے کی اہلیت رکھتا ہے کیوں کہ فٹ بال کھیلنے والے سبھی انسانوں نے اس کھیل کے یکساں اصول ازبر کر رکھے ہیں۔ فٹ بال کے سارے اصول مکمل طور پر تصوراتی ہیں لیکن اگر فٹ بال سے متعلق سبھی یہ تصورات سمجھ کر تفویض کر لیں تو ہم سب نہ صرف یہ کھیل کھیل سکتے ہیں بلکہ لاکھوں اور کروڑوں کی تعداد میں اس کھیل کو دیکھ کر محظوظ بھی ہو سکتے ہیں۔

یہ تو صرف فٹ بال کا کھیل ہے ورنہ بادشاہتوں، ریاستوں، مذاہب اور تجارتی رابطوں پر بھی ایک اہم فرق کے ساتھ یہی کلیہ لاگو ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ فٹ بال کا کھیل نسبتاً سادہ ہے، اس کے گنے چنے اصول ہیں اور یہ جامع ہے۔ سارا کھیل نوے منٹ اور بائیس کھلاڑیوں کے بیچ ہوتا ہے اور مصالحت کے لیے ایک ریفری بھی دستیاب ہوتا ہے۔ یہ بالکل ایسا ہی تعاون اور اشتراک ہے جو تاختی آدمی کے چھوٹے چھوٹے کنبی گروہوں اور کسی چھوٹے سے گاؤں، گلی یا محلے میں ہو سکتا ہے۔ ہر کھلاڑی، کھیل کے اصولوں کو با آسانی ذہن نشین کر سکتا ہے۔۔۔ یہ تھوڑی بلکہ نہ ہونے کے برابر معلومات ہیں جو دماغ میں رکھی جا سکتی ہے اور پھر بھی دوسرے معاملات۔۔۔ شاعری کے پورے پورے دیوان، گانوں، شبیہات اور ضروری اشیاء کے بارے معلومات جمع رکھنے کی گنجائش رہتی ہے۔ لیکن تعاون اور اشتراک کے بڑے بڑے نظام میں، صرف بائیس نہیں بلکہ ہزاروں، لاکھوں اور کروڑوں لوگوں کے لیے معلومات کی بیش بہا مقدار جمع رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ اتنی بڑی مقدار ہے کہ جس کی کسی ایک انسانی دماغ میں جمع رکھنے اور اسے استعمال میں لانے کی گنجائش نہیں ہوتی۔

بعض دوسرے جانوروں ۔۔۔ جیسے مکوڑوں میں بھی بڑے سماجی نظام پائے جاتے ہیں۔ چیونٹیوں اور شہد کی مکھیوں کی مثال نہایت عام ہے۔ یہ انتہائی مستحکم اور لوچدار نظام ہوتا ہے کیونکہ اسے برقرار رکھنے کے درکار معلومات چیونٹیوں اور شہد کی مکھیوں کی فطرت۔۔۔ یعنی جینیاتی لونیت میں پہلے سے درج ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر شہد کی مکھیوں میں کوئی بھی مادہ سنڈی بڑھ کر ملکہ یا مزدور بن سکتی ہے لیکن اس کا فیصلہ اس خوراک پر ہوتا ہے جو اسے کھلائی جاتی ہے۔ اس مادہ مکھی کے لونی مادے، یعنی ڈی این اے میں اس کی زندگی میں کردار اور رویوں بارے سبھی ہدایات درج ہوتی ہیں۔ شہد کی مکھیوں کا چھتہ نہایت پیچیدہ سماجی ساخت ہوتا ہے۔ اس میں کام کرنے والی مزدور، کارکن مکھیوں کی کئی اقسام پائی جاتی ہیں۔ مثلاً، دروکار، نرسیں، صفائی کرنے والی وغیرہ وغیرہ۔ لیکن آج تک سائنسدانوں کو شہد کی مکھیوں میں کوئی 'شہد کی وکیل مکھی' نظر نہیں آئی۔ شہد کی مکھیوں کو وکیل کی ضرورت نہیں ہوتی کیونکہ شہد کی مکھیوں کا چھتے کے دستور سے روگردانی کا کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔ شہد کی ملکہ مکھی کبھی بھی اپنے کارکنوں کو خوراک کی مد میں دھوکہ نہیں دیتی اور کارکن مکھیاں بھی کبھی اپنی تنخواہ بڑھوانے کے لیے 'چھتہ جام ہڑتال' نہیں کرتے۔

لیکن انسانوں کے یہاں اس طرح کی چیزیں، ہر وقت جاری رہتی ہیں۔ اب چونکہ آدمی کا سماجی نظام ہی تصوراتی ہے تو انسانوں کے لیے کسی طور بھی اس کے بارے انتہائی ضروری معلومات کو ڈی این اے پر لکھوا کر اس کی کاپیاں اگلی نسل میں منتقل کرنے کی کوئی صورت نہیں ہے۔ اسی لیے قوانین رسوم، شعائر، دستور الاعمال اور آداب کو برقرار رکھنے کی شعوری کوششیں کی جاتی ہیں۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو سماجی نظام آن کی آن میں دھڑام سے گر جائے گا۔ مثال کے طور پر شہنشاہ حمورابی نے حکم نامہ جاری کیا کہ لوگ طبقات جیسے اعلیٰ 'یا برتر، عامی اور غلاموں میں تقسیم کیے گئے ہیں۔ شہد کی مکھیوں کے چھتے کے برعکس، یہ طبقات کی قدرتی تقسیم نہیں ہے۔ انسانی کروموں اور جینیاتی لونیت میں اس کے کوئی ثبوت نہیں ہیں۔ اگر بابل کے باشندے اپنے دماغ اور شعور میں یہ 'سچ' اچھی طرح بٹھانے سے قاصر رہتے تو ان کا معاشرہ ناکام ہو جاتا۔ اسی طرح، جب حمورابی نے اپنا ڈی این اے اپنے بیٹے کو منتقل کیا تو اس میں کسی اعلیٰ 'یا برتر مرد کے ہاتھوں کسی عامی عورت کے قتل بارے یہ حکم نامہ درج نہیں تھا کہ وہ اس کے وارثین کو چاندی کے تیس بٹے تول کر ادا کرے گا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ حمورابی پورے ہوش و حواس میں اپنے بیٹوں کو سلطنت کے اس قانون بارے ہدایات جاری کرے، انھیں تعلیم دے۔ حمورابی کے بیٹوں کے لیے بھی یہی لازم تھا کہ وہ اپنے بیٹوں، پھر پوتوں اور اگلی نسلوں میں یہی طور جاری رہے۔

سلطنتوں اور بادشاہتوں میں معلومات کی وسیع مقدار پیدا ہوتی ہے۔ قوانین کے علاوہ بھی کسی سلطنت یا ریاست میں لین دین اور ٹیکس کے کھاتے، فوجی رسدات اور تجارتی بیڑوں کا فرد سامان، تہواروں کے کلینڈر اور فتوحات کا ریکارڈ رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ لاکھوں

سال تک لوگ معلومات جمع رکھنے کے لیے صرف اپنے دماغ کا استعمال کرتے رہے تھے۔ بد قسمتی سے انسانی دماغ ایک چھوٹی سی سلطنت جتنے بڑے نظام کی معلومات جمع رکھنے کا کوئی اچھا ذریعہ نہیں ہے۔ اس کی تین وجوہات ہیں:

پہلی یہ کہ انسانی دماغ کی گنجائش اور صلاحیت محدود ہے۔ یہ درست ہے کہ کئی لوگوں کی یادداشت حیرت انگیز طور پر بہت ہی تیز ہوتی ہے۔ یہ بھی درست ہے کہ قدیم زمانوں میں پیشہ ور حافظ بھی پائے جاتے تھے، جو اپنے دماغ میں بڑے بڑے صوبوں کا نقشہ اور ریاست کا پورا دستور یاد رکھتے تھے۔ تاہم، ان ماہر حافظوں کی یادداشت کی بھی ایک حد ہوتی تھی جو پار نہیں کی جاسکتی تھی۔ مثال کے طور پر کسی وکیل کو حیرت انگیز طور پر انڈین پینل کوڈ 1860ء حرف بہ حرف یاد ہو گا لیکن اسے اس پینل کوڈ کے تحت چلائی گئی ہر قانونی کاروائی کی تفصیلات کے بارے علم نہیں ہو گا، جو ریاست کے لیے انڈین پینل کوڈ 1860ء جتنی ہی اہم ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ انسان بالآخر مر جاتے ہیں اور ان کے دماغ بھی ساتھ ہی مر جاتے ہیں۔ کسی دماغ میں جمع شدہ معلومات ایک صدی کے اندر اندر ہی مٹ سکتی ہے۔ یہ درست ہے کہ یادداشتوں کو ایک دماغ سے دوسرے میں منتقل کیا جاسکتا ہے لیکن بالمثل سینہ بہ سینہ منتقل ہونے والی ترسیلات کا مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ معلومات بگڑ جاتی ہیں یا حذف ہوتی جاتی ہیں۔

تیسری اور سب سے اہم وجہ یہ ہے کہ انسانی دماغ میں صرف مخصوص قسم کی اور چند مخصوص طرح سے ہی معلومات جمع رکھی جا سکتی ہیں۔ قدیم تاختی آدمی کو اپنی بقاء کے لیے لازم تھا کہ طرح طرح کی معلومات جمع کیا کرے۔ اسے نباتات اور حیوانات کی ہزاروں کی تعداد میں اقسام بارے معلومات جیسے ان کی شکلوں، خصوصیات اور رویوں بارے علم جمع کرنا پڑتا تھا۔ مثال کے طور پر انہیں یاد رکھنا پڑتا تھا کہ خزاں کے موسم میں بارش کے بعد ایلم نامی درخت کے نیچے زرد رنگ کی جھری دار کھمبی عام طور پر زہریلی ہوتی ہے لیکن ایسی ہی زرد کھمبی جو شاہ بلوط کے درخت کے نیچے پائی جاتی ہے۔۔۔ عام طور پر معدے کے درد کی زبردست دوائی ہے۔ تاختی آدمی کے لیے اپنے کنبے اور گروہ کے کئی کئی درجن لوگوں کی رائے کو ذہن نشین کرنا لازم تھا۔ مثال کے طور پر اگر 'لُوسی' نامی کسی لڑکی کو 'جون' نامی شخص تنگ کرتا تھا تو اس کو اس عمل سے باز رکھنے کے لیے 'لُوسی' کو کنبے میں دوسرے کسی فرد کی ضرورت ہوتی۔۔۔ اس کے لیے یاد رکھنا ضروری تھا کہ ابھی پچھلے ہی ہفتے اسی موئے 'جون' نے 'میری' نامی ایک دوسری لڑکی کو بھی تو چھیڑا تھا۔ تو یوں، 'لُوسی' کے لیے 'جون' کو سبق سکھانے کے لیے 'میری' سب سے بہتر اور پر شوق حلیف ثابت ہو سکتی تھی۔ اس طرح کی ضروریات کے پیش نظر ارتقائی عمل کے دباؤ کے نتیجے میں انسانی دماغ نے بے انتہا مقدار میں نباتاتی، حیواناتی، جغرافیائی اور سماجی معلومات جمع رکھنے کی اہلیت حاصل کر لی۔

لیکن جب زرعی انقلاب کے نتیجے میں پیچیدہ معاشروں کا ظہور ہوا تو مکمل طور پر ایک نئی طرح کی معلومات کی ضرورت پڑ گئی۔ تاختی آدمی کے لیے کبھی بھی حساب کتاب سے متعلق بڑی مقدار میں معلوماتی حقائق یا ڈیٹا جمع کرنا ضروری نہیں رہا۔ مثال کے طور پر کسی تاختی کو

جنگل میں پائے جانے والے ہر درخت پر پھلوں کی تعداد جمع کرنے کی حاجت نہیں رہی۔ چنانچہ انسانی دماغ اس طرح کی عددی معلومات جمع کرنے کا اہل نہیں تھا۔ لیکن ایک بڑی سلطنت کو قائم رکھنے کے لیے حساب کتاب یا عددی حقائق جمع کرنا لازم تھے۔ اسی طرح، انسانی دماغ قوانین وضع کرنے اور خداؤں کے بارے حکایات جمع کرنے کے لیے بھی تیار نہیں تھا۔ ایک ریاست میں ٹیکس بھی جمع کرنے پڑتے ہیں۔ ہزاروں اور لاکھوں لوگوں پر ٹیکس لاگو کرنے کے لیے ضروری ہے کہ لوگوں کی آمدن اور اثاثوں کی تفصیلات جمع کی جائیں۔ ادائیگیوں کا ڈیٹا بھی ہو، ادھار کی تفصیلات بھی دستیاب ہوں، قرضوں اور جرمانوں کا بھی ریکارڈ ہو، ٹیکس کی مد میں دی گئی چھوٹ اور کٹوتیوں کا بھی باقاعدہ حساب رکھا جائے۔ یہ سب جمع ہو کر ڈیٹا یا حقائق کی مد میں لاکھوں کروڑوں پارے اور قطعے بن گئے جنھیں جمع کرنا ضروری ہو گیا۔ اس طرح کی اور اتنی بے پایاں معلومات اور ڈیٹا کو جمع کرنے کی صلاحیت میں ناکامی کا نتیجہ یہ نکل سکتا ہے کہ ریاست نہ تو دستیاب وسائل بارے جان سکتی ہے اور نہ ہی متوقع طور پر دستیاب وسائل کی تفصیلات سامنے آ سکتی ہیں۔ تو چنانچہ، اسی لیے تو جب اس طرح کی بے پناہ عددی معلومات کو یاد رکھنے، دہرانے اور جمع رکھنے کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو زیادہ تر انسانوں کا دماغ ماؤف ہو کر سو جاتا ہے۔۔۔ سادہ الفاظ میں بقول کہیے، گھاس چرنے نکل جاتا ہے۔

دماغ کی اس مجبوری کے نتیجے میں انسان کی اجتماعیت کے حجم اور پیچیدگی کو سخت رکاوٹ پیش آ جاتی ہے۔ جب کسی مخصوص معاشرے میں انسانوں اور ان کی جائیدادبحرانی حد تک بڑھ جاتی ہے تو وسیع مقدر میں حساب کتاب کا مواد رکھنا ضروری ہو جاتا ہے۔ اب چونکہ انسانی دماغ اس حجم کا احاطہ نہیں کر سکتا تو لازمی پورا نظام ہی منہدم ہو جاتا تھا۔ زرعی انقلاب برپا ہونے کے ہزاروں برس بعد بھی انسان کا سماجی سلسلہ نسبتاً محدود اور سادہ رہا تھا۔

اس مسئلے کا حل پہلی دفعہ قدیم بابل کے سمیریوں نے دریافت کیا تھا۔ دجلہ اور فرات کے کناروں پر واقع میدانوں میں جب آب پاشی کے ساتھ ساتھ سورج خوب چمکتا تو فصل کی پیداوار دیکھنے لائق ہوتی تھی۔ اس پیداوار کے بل بوتے پر ان کے یہاں نہایت خوب شہر پروان چڑھنے لگے۔ جوں جوں ان شہروں میں آبادی بڑھتی گئی، لوگوں کے بیچ معاملات چلانے کے لیے معلومات کی مقدار بھی بڑھتی گئی۔ 3500 قبل مسیح سے 3000 قبل مسیح کے بیچ، سمیریوں کے دماغ نے کام کر دکھایا اور ایک ایسا نظام وضع ہو گیا جو معلومات اور حقائق کو انسانی دماغ کے باہر بھی جمع کرنے کے قابل تھا۔ یہ ایسا نظام تھا جو پہلی بار بڑے پیمانے پر حساب کتاب کو نپٹا بھی سکتا تھا اور اس نظام کو اپنی ضروریات کے تحت ڈھالا بھی جا سکتا تھا۔ سمیریوں نے اپنے معاشرتی نظام کو انسانی دماغ کی مجبوریوں سے آزاد کر دیا اور یوں شہروں، بادشاہتوں اور بڑی سلطنتوں کا راستہ آزاد ہو گیا۔ سمیریوں نے معلومات اور حقائق کو انسانی دماغ سے باہر جمع کرنے کا جو نظام بنایا، وہ تحریر کی صلاحیت تھی۔

زیرد ستخطی، کشم!

تحریر معلومات کو علامات اور نشانات کی شکل میں جمع کرنے کا طریقہ ہے۔ سمیریوں کا تحریری نظام اس مقصد کے لیے دو مختلف اقسام کی علامات کو استعمال میں لاتا تھا۔ یہ نشانات یا علامات مٹی سے بنی لوح یا تختی پر داب دیے جاتے تھے۔ ان دو طرح کی علامات میں سے ایک تو اعداد کو ظاہر کرتی تھی۔ ان عددی علامات میں 1، 10، 60، 600، 3600 اور 36000 کی علامتیں شامل تھیں۔ سمیریوں نے 6 اور 10 کی بنیاد پر عددی نظام بنایا تھا۔ ان کی 6 کی بنیاد پر مبنی عددی نظام کی کئی اہم ترکے بھی ہیں۔ مثال کے طور پر آج ایک پورے دن کو چوبیس گھنٹوں میں تقسیم کرنے اور ایک دائرے کے 360 زاویے سمیریوں کے عددی نظام پر ہی مبنی ہیں۔ دوسری طرح کی علامات مادی اشیاء جیسے لوگ، جانور، تجارتی اجناس، علاقوں، کھجوروں ۔۔۔ الغرض ہر طرح کی مادی اشیاء کی نشاندہی کرتی ہیں۔ ان دونوں علامات یا نشانات کو ملا کر سمیری پہلی بار اتنی بڑی مقدار میں حقائق اور معلومات کو جمع کرنے کے قابل ہو گئے کہ جسے انسان کا دماغ اور نہ ہی ڈی این اے کی لڑیاں سمو سکتی تھیں۔
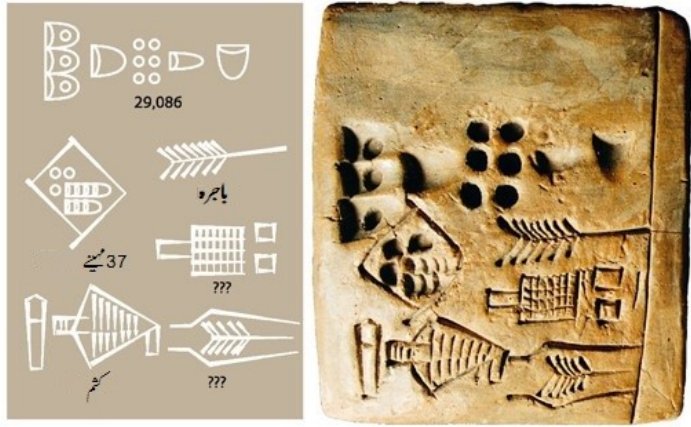
19: مٹی کی تختی جو 3000 قبل مسیح سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ باجرے کی شکل میں ٹیکس کا حساب کتاب ہے

اس اولین شکل میں، پہلے پہل تحریر صرف اور صرف حقائق اور شمار تک محدود تھی۔ سمیریوں نے اگر کوئی مشہور ناول بھی لکھے ہیں تو وہ کبھی بھی مٹی کی ان تختیوں پر داب کر تحریر نہیں کیے گئے۔ تحریر پر خاصا وقت صرف ہوتا تھا اور پڑھنے والی عوام بہت ہی کم تھی۔۔۔ تو کسی کو بھی اسے ریکارڈ سنبھالنے کے علاوہ اس کا کوئی دوسرا مصرف اور نہ ہی وجہ نظر آئی۔ اگر آپ پانچ ہزار سال پہلے ہمارے اجداد کی جانب سے تحریر کیے گئے دانش کے موتی تلاش کرنے نکلیں گے تو یقیناً مایوسی ہو گی۔ مثال کے طور پر ہمارے اجداد نے اس زمانے میں

پہلے پہل جو پیغام چھوڑ رکھے ہیں وہ کچھ یوں ہے،'29086 تول باجرا 37 مہینے کشم '۔چند لفظوں پر مشتمل اس معلومات کا معنی خیز جملہ کچھ یوں ہو سکتا ہے کہ،'37 مہینوں کے عرصے میں 29086 تول کا باجرا وصول قرار پایا۔ دستخطی، کشم '۔ حیف ہے، تاریخ کی اولین تحریر میں کوئی فلسفیانہ بصیرت، شاعری، نوشہ، قانون اور نہ ہی کوئی شاہانہ فتح یابی کا کوئی تذکرہ ہے۔ یہ معمولی اور بے لطف تجارتی دستاویز ہے، جو ٹیکس کی ادائیگی کا ریکارڈ، ادھار کی جمع اور املاک کی ملکیت بارے پتہ دیتی ہے۔

قدیم زمانے سے تحریر کی صرف ایک دوسری قسم ہی بچ پائی ہے اور یہ پہلی تحریر سے بھی زیادہ بے کیف ہے۔ یہ الفاظ کی ایک ایسی فہرست ہے جس میں چند الفاظ کو بار بار تحریری طور پر دہرایا گیا ہے۔ غالباً یہ کسی منشی کی تربیت اور مشق رہی ہو گی۔ یعنی، اس زمانے میں اگر کوئی طالب علم بوریت کا شکار ہو کر نظم لکھنا بھی چاہتا تو اس کے لیے ممکن نہ رہا ہو گا۔ اولین زمانے کی سمیری رسم تحریر کامل نہیں بلکہ جزوی رسم الخط رہا ہو گا۔ ایک کامل رسم الخط تحریر کا ایسا نظام ہوتا ہے جس میں کسی بھی زبان کے کم و بیش بول چال کے تقریباً حصے کو معنوی علامات اور نشانات کی صورت میں تحریر کیا جا سکتا ہے۔ یعنی، لوگ جو کچھ بولتے ہیں۔۔۔ وہ تحریر کیا جا سکتا ہے۔ کامل رسم الخط کی مدد سے شاعری بھی لکھی جا سکتی ہے۔ دوسری جانب جزوی رسم الخط ہوتا ہے جو تحریر کا ایسا نظام ہے جس میں کسی سرگرمی کی محدود کارگزاری، چند مخصوص معنوی نشانات اور علامات کی مدد سے لکھے جا سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر لاطینی رسم الخط، قدیم مصری تصویری تحاریر اور نابیناؤں کے زیر استعمال بریل کامل رسم الخط ہیں۔ آپ انھیں ہر طرح کے مقصد جیسے ٹیکس گوشوارے، نظمیں، تاریخی کتب، پکوانوں کی تراکیب اور تجارتی قوانین۔۔۔ الغرض ہر طرح کی شے کو تحریر کرنے کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔ اس کے برعکس اولین سمیری رسم الخط، ریاضی کے جدید نشانات، اشاروں اور موسیقی کی نوٹیشن کی طرح جزوی رسم الخط تھا۔ آپ ریاضی کے رسم الخط کو گنتی، حسابات، تخمینوں وغیرہ کے لیے تو استعمال کر سکتے ہیں لیکن ان کی مدد سے محبت بھری نظمیں نہیں لکھ سکتے۔
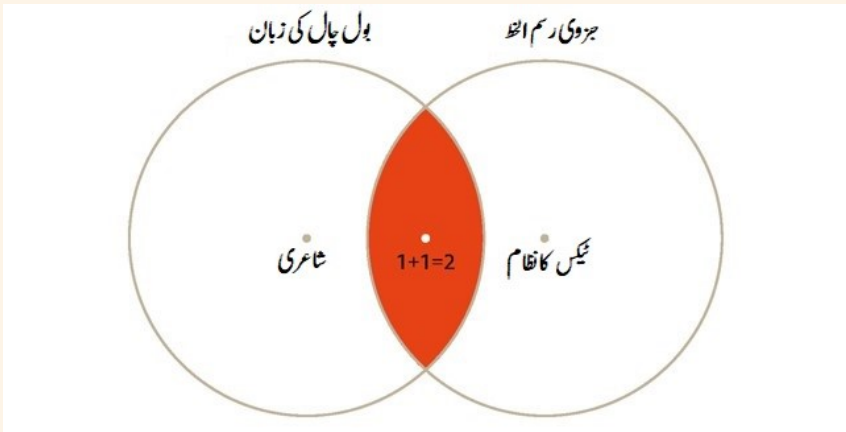
جزوی رسم الخط سے بول چال کی زبان کا پورا احاطہ نہیں ہو سکتا لیکن ان چیزوں کا پورا کام ہو سکتا ہے جو بول چال کی زبان سے ممکن نہیں ہیں۔ سمیری جیسے جزوی رسم الخط اور ریاضیاتی رسم الخطوط کو شاعری لکھنے کے لیے تو استعمال نہیں کیا جا سکتا لیکن ان کی مدد سے ٹیکس

سمیریوں کو اس امر سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ ان کا رسم الخط شاعری لکھنے کے لیے استعمال نہیں ہوسکتا۔ ان کا مقصد بول چال پر مبنی زبان کو تحریر میں لانا نہیں تھا بلکہ وہ کام سرانجام دینے تھے، جو بول چال کی مدد سے ممکن نہ تھے۔ بعض تہذیبوں، مثال کے طور پر کولمبس کی آمد سے قبل کے اندی معاشرے میں تاریخ بھر سے ہی جزوی رسم الخط استعمال ہوتا آیا تھا۔ اندی اپنے جزوی رسم الخط سے خوش تھے اور انھیں کبھی بھی کامل رسم الخط کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ لیکن یہ یاد رہے کہ اندی رسم الخط، سمیری رسم الخط سے بالکل مختلف تھا۔ یہ اس قدر مختلف تھا کہ بہت سے لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ اندی رسم الخط سرے سے کوئی رسم الخط ہی نہیں تھا۔ اندی مٹی سے بنی تختیوں اور نہ ہی کسی پارچے پر تحریر لکھتے تھے بلکہ ان کی 'تحریر' رنگ برنگے دھاگوں کو گرہیں لگا کر واضح کی جاتی تھی۔ اس کو خط گرہ کہاجاتا ہے۔ ہر خط گرہ مختلف رنگوں کی کئی ڈوریوں پر مشتمل ہوتی تھی۔ یہ ڈوریاں کپاس یا اوون سے بنی جاتی تھیں۔ ہر ڈوری پر مختلف جگہوں پر کئی گرہیں لگائی جاتی تھیں۔ ایک خط گرہ میں سینکڑوں ڈوریاں اور ہزاروں گرہیں ہوتی تھیں۔ مختلف رنگوں کی مختلف ڈوریوں پر مختلف قسم کی گرہیں لگا کر ایسا امتزاج بنایا جاتا تھا کہ اس ترتیب سے بڑی مقدار میں عددی معلومات اور حقائق۔۔۔ جیسے ٹیکس کا ریکارڈ اور جائیداد کی ملکیت وغیرہ جمع ہوسکتا تھا۔

20ایک شخص کی شبیہ، جس نے خط گرہ اٹھا رکھا ہے

سینکڑوں۔۔۔ بلکہ ہزاروں سال تک خط گرہ کئی کئی شہروں، بادشاہتوں اور سلطنتوں کے سرکاری کاروبار میں لازمی جزو رہا تھا۔ خط گرہ کا استعمال سلطنت انکا میں اپنے جوبن پر رہا تھا۔ سلطنت انکا کی آبادی سوا کروڑ نفوس پر مشتمل تھی۔ اس سلطنت میں آج کے ممالک جیسے پیرو، ایکواڈور اور بولیویا کے ساتھ چلی، ارجنٹائن اور کولمبیا کے کچھ حصے بھی شامل تھے۔ یہ خط گرہ کا ہی کمال تھا کہ انکا بڑی مقدار میں عددی معلومات اور حقائق جمع کر کے استعمال میں لاسکتے تھے۔ اس کے بغیر، غالباً ان کے لیے انتظامی مشینری چلانا ممکن ہی نہ ہوتا اور یوں سلطنت انکا کبھی وجود ہی نہ رکھتی۔

سچ تو یہ ہے کہ خط گرہ اتنا موثر اور معیاری ہوا کرتا تھا کہ جب سپین نے جنوبی امریکہ فتح کیا تو اوائل برسوں کے دوران ہسپانویوں نے اپنی نئی سلطنت کے امور چلانے کے لیے کئی خط گرہ سمجھنے والے مقامی باشندے بھرتی کیے تھے۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ ہسپانویوں کو خط گرہ استعمال کرنے کا طریقہ نہیں آتا تھا اور وہ اس ضمن میں مقامی پیشہ وروں کے محتاج ہو کر رہ گئے تھے۔ جنوبی امریکہ کے نئے حکمرانوں کو جلد ہی سمجھ آگئی کہ اس مجبوری کی وجہ سے وہ خاصی مشکل میں پڑ سکتے ہیں۔ خط گرہ کے مقامی پیشہ ور انھیں آسانی سے دھوکہ دے سکتے ہیں۔ چنانچہ، جب ایک دفعہ جنوبی امریکہ میں ہسپانویوں کے قدم جم گئے تو انھوں نے رفتہ رفتہ خط گرہ کو سلطنت کے امور سے نکال باہر کیا اور اب تمام امور کا ریکارڈ لاطینی رسم الخط اور شماری

ہندسوں کے تحت جمع ہونے لگا۔ جنوبی امریکہ پر ہسپانوی قبضے کے بعد خط گرہ کا استعمال گھٹتا چلا گیا۔ آج بھی صرف چند ہی خط گرہ کے نمونے دستیاب ہیں لیکن کوئی ان کو سمجھ نہیں پاتا کیونکہ بد قسمتی سے خط گرہ کو پڑھ پانے کا آرٹ بھی ہسپانوی یورش کے نتیجے میں ختم ہو گیا۔

بیورو کریسی کے کمالات

بالآخر ایک وقت ایسا ضرور آیا کہ عراقی تمدن میں لوگوں یک رنگے حساب کتاب کے علاوہ بھی کچھ لکھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ 3000 قبل مسیح اور 2500 قبل مسیح کے درمیانی عرصے میں سمیریوں کے رسم الخط میں زیادہ سے زیادہ علامات اور نشانات کا اضافہ ہوتا گیا اور یوں یہ ایک کامل رسم الخط بن گیا جسے آج ہم خط میخی کے نام سے جانتے ہیں۔ خط میخی کو فارسی قدیم کا رسم الخط بھی کہا جاتا ہے۔ 2500 قبل مسیح تک صورتحال یہ تھی کہ شاہی حکم نامے فارسی قدیم میں جاری ہوتے تھے۔ پادری غیبی آوازوں اور کہانت جمع کرنے کے لیے جبکہ عام عوام ذاتی خط و کتابت کے لیے خط میخی کا ہی استعمال کرتے تھے۔ کم و بیش اسی دور میں دوسری جانب مصریوں نے اپنا علیحدہ کامل رسم الخط بنالیا تھا جسے 'ہیرو گلافی' کہا جاتا تھا۔ ہیرو گلافی ایسا رسم الخط تھا جس میں بیان کو تصاویر کی صورت 'تحریر' میں لایا جاتا تھا۔ اس کو منقوشی ابجد بھی کہا جاتا ہے اور اس کی کئی کئی اقسام تھیں۔ 1200 قبل مسیح میں چین اور 1000 قبل مسیح سے 500 قبل مسیح کے درمیانی عرصے کے دوران وسطی امریکہ میں بھی کامل رسم الخط سامنے آ گئے۔

ان ابتدائی مراکز سے کامل خط دنیا بھر میں پھیل گئے اور اس کی کئی نئی شکلیں اور مقاصد بھی نکل آئے۔ لوگ اب شاعری، تاریخ کی کتابیں، رومانوی قصے، ڈرامے، الہامی گفتگو اور پکوان بنانے کی تراکیب کو بھی تحریری شکل دینے لگے۔ لیکن اس کے باوجود تحریر کا بنیادی اور سب سے اہم مقصد بہر حال حساب کتاب کی معلومات جمع کر کے ترسیل ہی رہا۔ اسی وجہ سے اس سارے عرصے کے دوران، پھر بھی جزوی رسم الخط حاوی ہی رہا۔ عبرانی انجیل، یونانی رز، ہندو مہابھارتا اور بدھ تری پٹک کی ابتداء زبانی ہی ہوئی تھی۔ کئی نسلوں تک یہ ساری اساطیر اور مقدس فرمودات زبانی ہی ترسیل ہوئے۔ ان فرمودات کو سینہ بہ سینہ، ایک نسل سے دوسری نسل منتقل کرنے کا ایسا نظام بھی وجود پا گیا تھا کہ اگر تحریر کبھی ایجاد نہ ہوتی تو پھر بھی یہ سب آج بھی جوں کی توں باقی رہتیں۔ لیکن اصل ترقی تو جزوی رسم الخط نے کی، وہ یوں کہ ٹیکس کی رجسٹریاں اور دفتر شاہی کی پیچیدگیوں نے ایک ساتھ ہی جنم لیا تھا اور دونوں کا منبع اور ماخذ جزوی رسم الخط تھا۔ یہ اس زمانے کا وہ گٹھ جوڑ ہے جو آج بھی جوں کا توں سیامی جوڑوں کی طرح یک جان ہو کر پایا جاتا ہے۔ اس ضمن میں آج جدید دور کی کمپیوٹرائزڈ ڈیٹابیسوں اور سپریڈ شیٹوں میں پر اسراریت اور بے انتہا کے مخفی فیچر اور علامات عمدہ مثال ہیں۔

اب جب زیادہ سے زیادہ چیزوں کو تحریری شکل میں لایا جانے لگا اور بالخصوص جب انتظامی ارکائیووں کا حجم بیش بہا انداز میں پھیلنے لگا تو نئے مسائل نے جنم لیا۔ انسانی دماغ میں جمع شدہ معلومات اور حقائق کو حافظے سے نکال لانا نہایت آسان ہے۔ مثال کے طور پر میرے دماغ میں اربوں بائٹس کی حامل معلومات اور حقائق جمع ہوں گے لیکن میں نہایت سرعت۔۔۔ بلکہ کہیے فٹ سے اٹلی کے دارالحکومت کا نام یاد کر سکتا ہوں۔ مجھے اس کے فوراً بعد یاد آجائے گا کہ جس وقت گیارہ ستمبر 2001ء کو نیویارک میں حملے کی خبر آئی تو میں کیا کر رہا تھا؟ اور میں ایک سیکنڈ سے بھی کم وقت میں اپنے گھر سے یروشلم میں واقع عبرانی یونیورسٹی کا راستہ یاد کر کے روانہ ہو سکتا ہوں۔ اب ہمارا دماغ یہ چمتکار کیسے کرتا ہے، یہ آج بھی ایک معمہ ہے لیکن ہم سب یہ جانتے ہی ہیں کہ اس معاملے میں ہمارے دماغ کی برق رفتاری، حیرت انگیز ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم اکثر اپنی چابیاں کہیں رکھ کر بھول جاتے ہیں اور پھر کچھ بھی کر لیں۔۔۔ یاد ہی نہیں آتا۔ یہ ایک دوسرا معمہ ہے۔

لیکن یہاں اہم سوال یہ ہے کہ آخر خط گرہ یا مٹی کی تختیوں پر کندہ معلومات اور حقائق کو ڈھونڈ کر کیسے نکالا جا سکتا ہے؟ اگر کل دس تختیاں۔۔۔ یا چند سو تختیاں بھی ہوں تو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ لیکن اگر ان تختیوں کی تعداد کئی ہزاروں میں ہو تو پھر کیا کیا جائے؟ حمورابی کے ہی ہم عصر ماری کے شہنشاہ زیمری لیم کی ریاست میں ایسی دسیوں ہزار تختیاں جمع ہو چکی تھیں۔

ذرا تصور کیجیے، یہ 1776 قبل مسیح ہے۔ دو ماری باشندے آپس میں گندم کے کھیت کی ملکیت پر جھگڑ رہے ہیں۔ جیکب کا اصرار ہے کہ اس نے یہ کھیت عیسو سے تیس سال پہلے خریدا تھا۔ لیکن عیسو ترکی بہ ترکی جواب دیتا ہے کہ دراصل اس نے یہ کھیت جیکب کو تیس سال کے عرصے کے لیے کرایے پر دیا تھا۔ اب جبکہ تیس سال پورے ہو چکے ہیں تو وہ اس کھیت کی واپس حوالگی کا تقاضا کرتا ہے۔ وہ ایک دوسرے پر چلاتے ہیں، توں تکرار ہوتی ہے اور معاملہ ہاتھا پائی تک پہنچ جاتا ہے۔ پھر انھیں خیال آتا ہے کہ بھئی، وہ اس تنازعے کو شاہی ارکائیو چل کر حل کر سکتے ہیں۔ شاہی ارکائیو میں سلطنت کی سبھی جائیدادوں کی ملکیت، انتقال اور خرید و فروخت کا ریکارڈ موجود ہے۔ وہ دونوں شاہی ارکائیو پہنچتے ہیں تو حکام انھیں کبھی ایک، کبھی دوسرے اہلکار کے پاس بھیجتے ہیں۔ وہ دن بھر یہاں اور وہاں مارے مارے پھرتے ہیں اور شام کو انھیں بتایا جاتا ہے کہ کل صبح وہ دوبارہ تشریف لائیں اور آخر ایسے کلرک کے سامنے جا کر پھنس جاتے ہیں، جس کے ذمے مٹی کی اس تختی کی تلاش حوالے کی گئی ہے جس پر ان دونوں کے سودے کی تفصیلات کندہ ہیں۔ کلرک شاہی ارکائیو کے اس حصے کا دروازہ کھولتا ہے اور انھیں ایک ایسے کمرے میں لے جاتا ہے جہاں لمبی قطاروں میں چھت سے لے کر فرش تک ہزاروں کی تعداد میں مٹی کی تختیاں جمع کی گئی ہیں۔ اس ہال نما گودام کو دیکھ کر فوراً ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ کلرک اتنا خشک مزاج کیوں ہے۔ اس کے ذمے تیس سال پرانی ایک تختی کو ڈھونڈ نکالنے کا کام لگایا ہے جو کسی معمولی کھیت سے متعلق ہے؟ اب چلو، مان لیا کہ اگر اس کو متعلقہ تختی مل بھی گئی ہے تو وہ یہ کیسے بتا سکتا ہے کہ تیس سال پرانی یہ تختی ہی اس کھیت سے متعلق سودے کی تازہ

ترین تختی ہے اور اس عرصے کے دوران، اس کھیت سے متعلق کوئی دوسری تختی بنائی نہیں گئی یا اس کھیت کے بارے اس عرصے کے دوران کوئی دوسرا سودا نہیں ہوا۔ اب اگر اس کلرک کو تیس سال پرانی وہ تختی سرے سے ملتی ہی نہیں ہے تو اس کا کیا مطلب ہے؟ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ عیسو نے کبھی یہ کھیت بیچا اور نہ ہی کرایے پر دیا؟ یا وہ تختی اس لیے ملنے میں نہیں آرہی کیونکہ پندرہ برس پہلے اس گودام میں پانی بھر گیا تھا اور ارکائیو کا سارا ریکارڈ مٹ گیا تھا؟

ظاہر ہے، کسی اہم ریکارڈ کو مٹی میں کنندہ کرنے سے تسلی، درستی اور آسانی کی گارنٹی تو نہیں مل سکتی۔ ان مقاصد کے سول کے لیے لازم ہے کہ فہرستیں تیار کی جائیں، نقول کے طریقے، فوری اور قابل بھروسا رسائی کی طرز ہونی چاہیے اور خوش اخلاق عملہ بھی ہو جو ان سبھی طریقوں کو استعمال کرنے کا طریقہ بھی جانتا ہو۔

یہ طریقے ایجاد کرنا، تحریر ایجاد کرنے سے بھی زیادہ مشکل ثابت ہوا۔ اس زمانے میں جتنے بھی تحریری نظام ایجاد ہوئے، وہ ایک دوسرے سے آزاد اور دور دراز علاقوں اور مختلف ادوار میں بنائے گئے۔ پچھلی تقریباً ہر دہائی میں آثار قدیمہ کے ماہرین ہر دفعہ کوئی نت نیا یا بھلایا ہوا کوئی نہ کوئی رسم الخط دریافت کر ہی لاتے ہیں۔ ان میں سے بعض تو ایسے بھی ہیں جو سمیریوں کے مٹی کے تختیوں سے بھی پرانے نکلے ہیں۔ لیکن تقریباً سبھی دریافت ہونے والے رسم الخطوط میں ایک شے کی تشنگی باقی رہتی ہی ہے۔ اس زمانے میں رسم الخط تو نہایت آسانی کے ساتھ ایجاد ہو جاتا تھا لیکن ان کے موجد کبھی بھی ان رسم الخطوط کی بنیاد پر جمع کی جانے والے معلومات اور حقائق کو منظم انداز میں جمع کرنے اور درکار معلومات کو نکال لانے کا طریقہ ایجاد کرنے میں ناکام ہی رہے۔ سمیریوں، فرعون کے دور میں مصر، قدیم چین اور انکا کی سلطنت کی خاص بات یہ تھی کہ ان تہذیبوں نے ارکائیو بنانے، فہرستیں نکالنے اور معلومات کو موثر انداز میں بقدر ضرورت نکال لانے کے طریقوں پر بھی سوچ و چار کی تھی۔ اس زمانے میں منشیوں، کلرکوں، لائبریرینوں، کاتبین اور محاسبوں کی تربیت کے لیے باقاعدہ مدرسے قائم کیے گئے تھے۔

قدیم عراقی تہذیب کے ایک ایسے ہی مدرسے کی باقیات سے دریافت ہونے والی تحریری مشق سے ہمیں اس دور کے طالب علموں کی زندگیوں میں جھانکنے کا موقع ملتا ہے۔ یہ باقیات، 4000 سال پرانی ہیں:

> *"میں اندر داخل ہوا اور بیٹھ گیا اور میرے استاد نے میری تختی پڑھنا شروع کی۔ اس نے کہا، 'اس میں کچھ کمی محسوس ہوتی ہے!' پھر اس نے مجھے چھڑی سے مارا۔*
>
> *ان حکام میں سے ایک نے مجھ سے کہا، 'تم نے میری اجازت کے بغیر اپنا منہ کیسے کھولا؟' پھر اس نے مجھے چھڑی سے مارا۔*
>
> *قواعد کے انچارج نے کہا، 'تم میری اجازت کے بغیر کھڑے کیوں ہوئے؟' پھر اس نے مجھے چھڑی سے مارا۔*

دربان نے کہا، 'تم میری اجازت کے بغیر باہر کیوں جا رہے ہو؟' اور اس نے مجھے چھڑی سے مارا۔
شراب کی رکھوالی پر فائز شخص نے کہا، 'تم نے میری اجازت کے بغیر شراب کیوں پی؟' اور اس نے مجھے چھڑی سے مارا۔
سمیری استاد نے کہا، 'تم نے اکدی زبان کیوں بولی؟' اور اس نے مجھے چھڑی سے مارا۔ [2]
میرے استاد نے مجھ سے کہا، 'تمھاری لکھائی بہت خراب ہے!' اور اس نے مجھے چھڑی سے مارا۔

قدیم منشیوں اور کاتبین صرف لکھنا اور پڑھنا نہیں سیکھتے تھے بلکہ وہ فہرستوں کی ترتیب، لغت کا استعمال، کیلنڈر بنانے کا گر، نمونے کی دستاویز اور جدول بنانا بھی سیکھتے تھے۔ وہ فہرستیں تشکیل دینے، معلومات کو جمع کر کے ترسیل کے قابل بنانے اور حقائق کا مطلب نکالنے کے وہ گر سیکھتے تھے جو دماغی طریقوں سے یکسر مختلف ہوتے ہیں۔ دماغ کا معاملہ یہ ہے کہ تمام تر معلومات اور حقائق ایک دوسرے سے تو آزاد لیکن بہر حال مربوط انداز میں جڑے ہوتے ہیں۔ مثلاً، میں اپنی بیوی کے ساتھ نئے گھر کی خریداری کے کاغذات پر دستخط کرنے کسی دفتر جاؤں تو میرے دماغ میں رفتہ رفتہ وہ ساری معلومات اور حقائق سامنے آنا شروع ہوں گے، جس کے نتیجے میں آج ہم اکٹھے گھر خرید رہے ہیں۔ سب سے پہلے یہ یاد آئے گا کہ ہم پچھلے کتنے عرصے سے اکٹھے رہتے ہیں پھر یہ کہ ہماری شادی کا احوال کیا تھا۔ پھر یہ کہ ہم نے ہنی مون کس پر فضا مقام پر گزارا تھا۔ پھر یہ کہ مجھے ہنی مون کے دنوں میں سیر کے دوران دیکھے وہ مگرمچھ بھی یاد آئیں گے۔ مجھے مگرمچھوں کی نسبت سے ڈریگن بھی یاد آئیں گے۔ ڈریگن کا خیال آتے ہی مجھے گیم آف تھرونز کی ساری کہانی بھی یاد آجائے گی اور اچانک۔۔۔ میں خود کو بینک کلرک کی میز پر بیٹھا ہوا گیم آف تھرونز کی موسیقی گنگنا رہا ہوں گا۔ کلرک نہایت تذبذب سے میرا منہ دیکھ رہا ہو گا۔ یہ تو میرا دماغ ہے لیکن بیورو کریسی میں ایسا نہیں ہوتا۔ بیورو کریسی میں چیزوں کو الگ الگ رکھا جاتا ہے۔ وہ سامنے الماری کے سب سے اوپر والا خانہ گھروں کی رہن اور گروی کے لیے مختص ہے۔ دوسرے خانے میں رجسٹرڈ شادیوں کا ریکارڈ ہے۔ تیسرے خانے میں ٹیکس کی رجسٹریاں بھری ہوئی ہیں اور چوتھے خانے میں اوپر کے تینوں خانوں کے ریکارڈ کے نتیجے میں درج ہونے والے مقدمات کی تفصیلات ہیں۔ اگر ایسا نہ کریں تو پھر کوئی مخصوص ریکارڈ کیسے ڈھونڈا جا سکتا ہے؟ اب اگر ایک نیا زمرہ، جیسے زمین کی ملکیت اور کرایہ داری کا ریکارڈ بھی آجاتا ہے تو پھر میں اس کو کہاں سموؤں گا؟ کیا میں اسے گھروں کی رہن والے خانے میں دھروں، یا رجسٹریوں میں ڈال دوں؟ یا اس کے لیے بالکل ایک نیا خانہ مختص کر دوں؟ یہ ریکارڈ کی عجیب سر دردی ہوتی ہے۔ اسی لیے ہم ہمیشہ یہ نت نئے خانے بناتے، انھیں مٹاتے اور دوبارہ سے بند و بست کرتے رہتے ہیں۔

---

[2] اگرچہ اکدی زبان غالب بھی آگئی تھی لیکن سمیریوں کا جزوی رسم الخط پھر بھی انتظام اور انصرام کا ذریعہ تھا۔ اسی لیے اس زمانے میں منشیوں کے لیے سمیری زبان سیکھنا اور بولنا لازم تھا۔

اس سارے عمل کو احسن طریقے سے پورا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ان خانوں کو ترتیب دینے کی صلاحیت سے مالا مال ایسے لوگوں کو بھرتی کیا جائے جو انسان کی طرح سوچنے کی بجائے کلرکوں اور منشیوں کی طرح سوچا کریں۔ قدیم ادوار سے لے کر آج تک، ہم سب ہی جانتے ہیں کہ کلرکوں، منشیوں اور بابوؤں کے سوچنے کا انداز انتہائی غیر انسانی ہوتا ہے۔ وہ فائلیں رکھنے والی الماری یا دراز کی طرح سوچتے ہیں۔ یہ ان کی غلطی نہیں ہے۔ اگر وہ اس طرح نہ سوچیں تو ان کے دراز، الماریاں اور رجسٹر ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو جائیں گے اور یوں وہ حکومتوں، کمپنیوں اور اداروں کو درکار خدمات فراہم نہیں کر سکیں گے۔ انسانی تاریخ پر تحریر اور رسم الخط کا سب سے بڑا اثر یہ ہے:

اس کی بدولت، انسان نے دنیا کو بالکل نئے رخ اور طرز پر سوچنا اور دیکھنا شروع کیا۔ آزادانہ طور پر مربوطی اور کلیت نے تقسیم اور بیوروکریسی کے لیے راستہ کھلا چھوڑا ہے۔

اعداد کی زبان

جیسے جیسے صدیاں گزرتی گئیں، معلومات اور حقائق کو ترتیب دینے کے بیوروکریسی کے انداز انسانوں کے سوچنے کے قدرتی انداز سے بے انتہا مختلف ہوگئے۔ یہی نہیں، بیوروکریسی کے انداز اہم ترین بھی ہوگئے۔ اس ضمن میں ایک فیصلہ کن موڑ نویں صدی عیسوی میں آیا جب ایک نیا جزوی رسم الخط ایجاد ہوا۔ یہ ایسا زبردست رسم الخط تھا کہ اس کی مدد سے حساب کتاب کی معلومات اور حقائق کو جمع کر کے استعمال کے طریق میں بے نظیر استعداد آگئی۔ اس جزوی رسم الخط میں صرف دس علامات یا نشانات تھے اور یہ صفر سے نو تک کے ہندسوں کو ظاہر کرتے تھے۔ یہاں پہنچ کر اس رسم الخط بارے تاریخ کچھ مبہم سی ہوجاتی ہے۔ ان دس نشانات یا علامات کو عربی ہندسے قرار دیا جاتا ہے لیکن یہ رسم الخط پہلی بار ہندوؤں نے ایجاد کیا تھا۔ یہ معاملہ اس وقت مزید پیچیدہ ہو جاتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ خود عرب، ہندسوں کی علامات کے لیے مغربی ہندسوں کی نسبت بالکل مختلف نشان استعمال کرتے ہیں۔ عربوں کو اس رسم الخط کا سہرا اس لیے پہنایا جاتا ہے کیونکہ جب انھوں نے ہندوستان فتح کیا تو انھیں یہاں یہ عددی نظام بھی ہاتھ آگیا۔ انھوں نے اس رسم الخط اور اس کے نظام کی اہمیت اور افادیت کو سمجھ لیا۔ اس کو بہتر بنایا اور اسے پورے مشرق وسطیٰ اور یورپ میں پھیلا دیا۔ 'عرب علامات عدد' میں بعد ازاں چند دوسری علامات اور نشانات جیسے منفی، جمع، تفریق اور ضرب وغیرہ بھی شامل ہوگئے تو اس کی بنیاد پر جدید ریاضی کی ترتیب اعداد وجود میں آگئی۔

$$
\begin{aligned}
\ddot{\mathbf{r}}_i = \sum_{j\neq i} \frac{\mu_j(\mathbf{r}_j-\mathbf{r}_i)}{r_{ij}^3} \Bigg\{ 1 - \frac{2(\beta-\gamma)}{c^2} \sum_{l\neq i} \frac{\mu_l}{r_{il}} - \frac{2\beta-1}{c^2} \sum_{k\neq j} \frac{\mu_k}{r_{jk}} + \gamma\left(\frac{s_i}{c}\right)^2 \\
+ (1-\gamma)\left(\frac{s_j}{c}\right)^2 - \frac{2(1+\gamma)}{c^2}\,\dot{\mathbf{r}}_i\cdot\dot{\mathbf{r}}_j - \frac{3}{2c^2}\left[\frac{(\mathbf{r}_i-\mathbf{r}_j)\cdot\dot{\mathbf{r}}_j}{r_{ij}}\right]^2 \\
+ \frac{1}{2c^2}(\mathbf{r}_j-\mathbf{r}_i)\cdot\ddot{\mathbf{r}}_j \Bigg\} \\
+ \frac{1}{c^2}\sum_{j\neq i}\frac{\mu_j}{r_{ij}^3}\{[\mathbf{r}_i-\mathbf{r}_j]\cdot[(2+2\gamma)\dot{\mathbf{r}}_i-(1+2\gamma)\dot{\mathbf{r}}_j]\}(\dot{\mathbf{r}}_i-\dot{\mathbf{r}}_j) \\
+ \frac{3+4\gamma}{2c^2}\sum_{j\neq i}\frac{\mu_j\ddot{\mathbf{r}}_j}{r_{ij}}
\end{aligned}
$$

نظریہ اضافیت کی عددی زبان میں پیش کی گئی مساوات: زیادہ تر لوگ جب ایسی مساوات دیکھتے ہیں تو ان کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگتا ہے۔ یہ ردعمل عین قدرتی ہے اور اس سے کسی طور بھی ذہانت یا تجسس کی کمی ثابت نہیں ہوتی۔ چند نادر مثالوں کے سوا، انسانی دماغ نظریہ اضافیت اور کوانٹم فزکس کے نظریات کو سمجھنے سے قاصر ہی رہتا ہے۔ طبیعیات دان، بہر حال ان نظریات کو نہایت آسانی کے ساتھ سمجھ لیتے ہیں کیونکہ وہ سمجھ بوجھ کے روایتی انسانی طریقہ کار کو ایک طرف رکھ دیتے ہیں اور بجائے بیرونی طریقہ کار کا سہارا لیتے ہیں۔ ان سائنسدانوں کی سوچ اور فکر کا بڑا حصہ ان کے دماغ میں نہیں بلکہ کمپیوٹروں اور کلاس روم کے تختہ سیاؤں پر جاری رہتا ہے۔

اگرچہ تحریر کا یہ نظام ایک جزوی رسم الخط ہے لیکن آج یہ دنیا کی سب سے اہم اور غالب زبان ہے۔ آج دنیا کی تقریباً سبھی ریاستیں، کمپنیاں، ادارے اور نظام۔۔۔ چاہے وہ کوئی بھی زبان عربی، ہندی، اردو، انگریزی یا ناروینجن الغرض کوئی بھی زبان بولتے ہوں۔۔۔ ریاضی کے رسم الخط کو حقائق ریکارڈ کرنے اور پھر ترسیل کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ معلومات کا ہر وہ ذرہ جو کہ ریاضی کے خط میں ترجمہ کیا جاسکتا ہو، وہ ذہن کو چکرا دینے کی حد تک سرعت اور استعداد کے ساتھ جمع کر کے استعمال میں لایا جاسکتا ہے۔

آج ہر وہ شخص جو حکومتوں، اداروں، کمپنیوں اور کسی بھی نظام کے فیصلوں پر اثر انداز ہونے کی خواہش رکھتا ہے۔۔۔ اسے اعداد کی زبان میں بات کرنے کا گر سیکھنا پڑے گا۔ آج دنیا بھر میں ماہرین ایڑی چوٹی کا زور لگا کر ایسے ایسے معاملات۔۔۔ مثال کے طور پر 'غربت'، 'خوشی' اور 'ایمانداری' جیسی چیزوں کو بھی اعداد کی شکل میں پیش کرنے کی بڑھ چڑھ کر کوشش کرتے ہیں۔ جیسے خط غربت، آسودگی کا پیمانہ اور قرض کی شرح بندی وغیرہ۔

علوم کے پورے پورے میدان جیسے طبعیات اور انجنیئرنگ وغیرہ میں اب انسانی بول چال کی زبانوں سے خالی ہو چکی ہیں اور یہ میدان اب صرف اور صرف ریاضی کے رسم الخط میں قائم ہیں۔

حالیہ دور میں، ریاضی کے رسم الخط کی بنیاد پر ایک انقلابی تحریری نظام وجود میں آیا ہے۔ اسے کمپیوٹر کی زبان، بائنری سکرپٹ یا دوہرا رسم الخط بھی کہا جاتا ہے۔ اس نظام میں صرف دو ہی نشانات، صفر اور ایک کے اعداد شامل ہیں۔ اس وقت میں اپنے کی بورڈ پر جو الفاظ ٹائپ کر رہا ہوں وہ میرے کمپیوٹر میں انہی دو اعداد صفر اور ایک کے مختلف امتزاج ہیں۔

تحریر نے انسانی شعور کی باندی بن کر جنم لیا تھا لیکن رفتہ رفتہ یہ انسانی شعور کا آقا بنتی جارہی ہے۔ ہمارے کمپیوٹروں کو انسانی بول چال، احساس اور خوابوں کو سمجھنے میں دقت محسوس ہوتی ہے۔ چنانچہ ہم انسانوں کو اعداد پر مبنی وہ بول چال، احساس اور خواب سکھاتے ہیں جو کمپیوٹر سمجھ سکتا ہے۔ ایک لحاظ سے کہیے تو ہماری کٹیا الٹ رہی ہے۔

یہ اس کہانی کا انت نہیں ہے۔ مصنوعی ذہانت ایک ایسی نئی شے ہے جو صرف اور صرف کمپیوٹروں کے دوہرے رسم الخط یا بائنری سکرپٹ کی بنیاد پر وجود میں آئی ہے۔ مشہور زمانہ فلموں 'دی میٹرکس' اور 'دی ٹرمینیٹر' میں اس دن کی کہانی بتائی گئی ہے جب بائنری سکرپٹ انسانی کوکھ کو چھوڑ دے گی۔ جب انسان اس بے لگام اور سرکش بائنری سکرپٹ پر دوبارہ سے غلبہ پانے کی جنگ لڑیں گے اور جواباً یہ بائنری سکرپٹ نوع انسانی کو صفحۂ ہستی سے مٹا کر رکھ دے گی۔

تاریخ میں انصاف نہیں ہے

انسانی تاریخ کو زرعی انقلاب برپا ہونے کے بعد کے ہزار سالہ مدت کے دوران سمجھنے کے لیے صرف ایک سوال کافی ہے: انسانوں نے بڑے پیمانے پر تعاون اور اشتراک کو حیاتیاتی جبلت نہ ہونے کے باوجود کیسے یقینی بنایا؟ اس کا مختصر اور جامع جواب یہ ہے کہ اس مقصد کے لیے اول انسانوں نے تصوراتی حقیقتیں اور تصوراتی نظام پیدا کیے اور دوم یہ کہ تحریر اور رسم الخط ایجاد کیے۔ ان دونوں ایجادات نے وہ خلا بخوبی پر کر لیا جو ہماری حیاتیاتی موروثیت کی سستی کی وجہ سے پیدا ہو گیا تھا۔

تاہم، اس طرز کے تعاون اور اشتراک بارے کئی لوگ سخت مشکوک رہتے ہیں۔ وہ اسے خوش قسمتی کی دھندلی قسم قرار دیتے ہیں۔ اگرچہ تصوراتی نظام انسانی تعاون اور اشتراک کو تو برقرار رکھنے کا اہل ہے لیکن یہ نہ تو غیر جانبدار ہے اور نہ ہی منصفانہ ہے۔ تصوراتی حقیقتوں اور نظاموں نے لوگوں کو دکھاوے اور نمودی گروہوں میں بانٹ دیا اور انسانوں کے بیچ تفریق، طبقات اور تقسیم کو جنم دیا ہے۔ اعلیٰ درجے پر فائز انسانوں کو خصوصی استحقاق اور طاقت ملتی ہے جب کہ نچلے درجے کے انسانوں کو امتیازی سلوک اور جبر کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مثال کے طور پر حمورابی کے قانون نے تو عالی نسبوں، عامیوں اور غلاموں کے ٹھونگے مارنے والے طبقات میں تقسیم کیا ہے۔ عالی نسب انسانوں کو زندگی کی ساری خوشیاں ملتی ہیں۔ عامیوں کو جو بچ جائے، میسر آجاتا ہے جبکہ غلاموں کو صرف شکایت پر بھی مار پڑتی ہے۔

اگرچہ امریکہ کے اعلان آزادی میں انسانی مساوات اور برابری کی منادی کی گئی ہے لیکن اس کے باوجود اس نے طبقات کو جنم دیا ہے۔ اس اعلان میں مردوں اور عورتوں کی اصناف کو باقاعدہ دو طبقات میں تقسیم کر دیا ہے۔ مردوں کو اس اعلان آزادی سے خوب فائدہ پہنچتا ہے جبکہ عورتوں کے نصیب میں بے طاقتی آئی ہے۔ اس اعلان آزادی نے سفید فام انسانوں، سیاہ فام انسانوں اور امریکی ریڈ انڈینز میں بھی تفریق پیدا کر دی ہے۔ سفید فاموں کو آزادی مل گئی تھی جبکہ سیاہ فام اور امریکی ریڈ انڈینز کو انسانوں کی نچلے درجے کی قسم قرار دیا گیا ہے جن کے حقوق، باقی کے انسانوں کے مساوی نہیں ہیں۔ امریکہ کے اعلان آزادی پر دستخط کرنے والوں میں اکثریت غلاموں کے تاجروں کی تھی۔ انھوں نے اعلان آزادی پر دستخط کرنے کے بعد غلاموں کو آزادی نہیں دی۔ انھوں نے اسے منافقت بھی نہیں سمجھا۔ ان کے نزدیک، انسانی حقوق کا سیاہ فام نیگرو کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا۔۔۔ یعنی، وہ سیاہ فاموں کو سرے سے انسان ہی نہیں سمجھتے تھے۔

امریکی نظام میں امیر اور غریب کی طبقاتی تفریق کو بھی مقدس بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ جس زمانے میں امریکہ کا اعلان آزادی پیش کیا گیا، تب امریکیوں کی تقریباً تعداد کو دولت کی تقسیم سے پیدا ہونے والی عدم مساوات سے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ مثال کے طور پر امراء کی اولاد، ترکہ میں ملنے والے پیسے اور کاروبار کی وجہ سے ہمیشہ امیر جبکہ غریب، کسی بھی طرح کے وسائل کی عدم دستیابی سے ہمیشہ غریب ہی رہتا۔ امریکیوں کے نزدیک مساوات کا سادہ مطلب یہ تھا کہ امیر اور غریب دونوں کے لیے یکساں قوانین ہیں اور کوئی بھی ان قوانین سے بالاتر نہیں ہے۔ مساوات کے تصور کا بیروزگاری کی صورت میں امداد، یکساں تعلیم اور ہیلتھ انشورنس وغیرہ جیسے سماجی فلاح و بہبود کے منصوبوں سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ اسی طرح اس زمانے میں شخصی آزادی کا تصور بھی آج سے بہت ہی مختلف تھا۔ 1776ء میں شخصی آزادی سے مراد ہرگز یہ نہیں تھی کہ بے طاقت (سیاہ فاموں اور ریڈ انڈینز کو ہرگز جبکہ خدا معاف کرے، عورتوں کو تو کسی بھی صورت نہیں!) کو بھی طاقت حاصل ہو سکتا ہے اور وہ اس اختیار کو استعمال بھی کر سکتے ہیں۔ ایسا ہرگز نہیں تھا۔ اعلان آزادی کے وقت شخصی آزادی سے مراد صرف یہ تھی کہ ریاست ماسوائے ہنگامی حالات کے، کسی بھی صورت امریکی شہریوں کی جائیداد ضبط نہیں کر سکتی تھی۔ یہی نہیں بلکہ ریاست شہریوں کو اپنی جائیداد کے استعمال بارے روک ٹوک بھی نہیں لگا سکتی تھی۔ امریکی نظام نے دولت کی بنیاد پر طبقاتی نظام پیدا کیا جو بعض لوگوں کے خیال میں خدا کی دین ہے جیسے، امیر کو امارت اور غریب کو غربت خدا کی طرف سے نازل کی گئی ہے جبکہ باقی کے لوگ جو خدا کے تصورات پر کچھ زیادہ بھروسا نہیں رکھتے، ان کے نزدیک یہ فطرت کا آفاقی اور غیر متغیر قانون ہے کہ جیسے قدرت بھی ہمیشہ زبردست اور ذہین آدمی کا ساتھ دیتی ہے۔ ان دونوں طرح کے تمام امریکی لوگوں کے نزدیک، خدا اور قدرت۔۔۔ دونوں ہی اہلیت کی بنیاد پر دولت تقسیم کرتے ہیں جبکہ کاہلی اور سستی کو سخت سزا ملتی ہے۔

اوپر بیان کردہ ہر طرح کی تفریق۔۔۔جیسے آزاد اور غلام افراد کے بیچ، سفید اور سیاہ فام کے بیچ، امیر اور غریب کے بیچ۔۔۔ یہ سارے امتیاز اصل میں اساطیری عقائد، قصوں اور فکشن میں دھرا ہے۔ (مرد اور عورت کے بیچ تفریق کو آگے چل کر تفصیل سے دیکھا جائے گا)۔ لیکن اس کے باوجود یہ تاریخ کا سخت اور آہنی اصول ہے کہ ہر تصوراتی نظام ان تفرقوں کے اساطیری ماخذ سے منکر رہتی ہے اور اس امتیاز کو قدرتی اور اٹل سمجھا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر وہ لوگ جو انسانوں میں آزاد اور غلام کی تفریق کو عین فطرتی اور درست مانتے ہیں، ان کی دلیل یہی ہوتی ہے کہ جی، غلامی کا تصور۔۔۔انسان کا پیدا کردہ نہیں ہے۔ جیسے حمورابی۔۔۔ وہ بھی یہی کہتا تھا کہ غلامی کا تصور تو خداؤں کا فرمان، اٹل حکم ہے۔ اسی طرح ارسطو کی دلیل یہ تھی کہ غلاموں کی فطرت ہی غلامی ہوتی ہے جبکہ آزاد منش، آزادی کی فطرت رکھتے ہیں۔ معاشرے میں لوگوں کا یہ رتبہ تو دراصل ان کی خلقی فطرت کا مظہر ہوتا ہے۔

آپ سفید فاموں کی بالادستی کے حامی کسی شخص سے نسلی بنیادوں پر طبقاتی تقسیم کے موضوع پر بحث کر کے دیکھ لیں۔ آپ کو کاذب اور باطل سائنس کی بنیاد پر مبنی ایک طویل لیکچر سننے کو ملے گا۔۔۔ وہ بالادست سفید فام آپ کو نسلوں کے بیچ حیاتیاتی تفریق پر طرح طرح کے ایسے ایسے دلائل نکال کر دکھائے گا جن کا معروضی حقیقتوں سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ آپ کو بتایا جائے گا کہ دراصل کاکیشائی یا قفقازی خون اور کونیوں میں ایسی خوبی ہے کہ سیاہ فام قدرتی طور پر زیادہ ذہین، مہذب اور محنتی ہوتے ہیں۔ اسی طرح آپ کسی سرمایہ داری نظام کے سخت حامی سے دولت کی طبقاتی تقسیم پر بات کر کے دیکھ لیں۔۔۔ عمومی جواب یہی ہو گا کہ بھئی، یہ تو دراصل قابلیت اور صلاحیت میں فرق کی بنیاد پر نظر آنے والا فطرتی اور لازمی نتیجہ ہے۔ ان کے خیال میں کسی بھی امیر کے پاس دولت کی بہتات اس لیے ہے کیونکہ وہ زیادہ اہل اور صلاحیتوں کا مالک، محنتی شخص ہے۔ اسی لیے، اگر امراء کو صحت کی بہتر سہولیات، بہتر تعلیم اور بہتر غذائیت دستیاب ہے تو اس قدرتی امر سے کسی کو بھی کوئی مسئلہ نہیں ہونا چاہیے۔ امیر، کسی خوبی کی وجہ سے امیر ہے اور اسے ہر طرح سے اکڑنے اور اینٹھنے کا حق حاصل ہے۔

21 جنوبی افریقہ کے ساحل پر ایک سائن بورڈ، جس میں صرف سفید فام افراد کو ہی اجازت نامہ دیا گیا تھا۔ ہلکی رنگت کے افراد، گہری رنگت کے مقابلے میں سورج کی روشنی سے زیادہ نقصان اٹھاتے ہیں لیکن اس کے باوجود جنوبی افریقہ کے ساحلوں کے استعمال پر اس طرح کے قدغن کی کوئی منطقی وجہ نہیں تھی۔ اس سائن بورڈ پر درج احکام کا حیاتیاتی حقیقت یعنی الٹرا وائلٹ شعاعوں کے جلد پر نقصانات کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا۔

ہندوؤں کے یہاں ذات پات کانظام پایاجاتاہے۔اس نظام میں یقین رکھنے والے ہندوؤں کے نزدیک ایک ذات کو کسی دوسری ذات پر برتری انسان نے نہیں بلکہ یہ تو کائنات کافیصلہ ہے۔ہندوؤں کی تخلیق سے متعلق ایک نہایت مشہور اساطیر اور عقیدے کے مطابق خداؤں نے یہ دنیا عتیق اور قبل تاریخ کے زمانے کی ہستی'پوروش' کے جسم سے پیدا کی تھی۔سورج پوروش کی آنکھ،چاند پوروش کے دماغ،براہمن پوروش کے منہ،کھتری پوروش کے بازوؤں، ویش پوروش کے جانگھوں اور شودر پوروش کے پیروں سے پیدا کیے گئے تھے۔اگر آپ ذات پات سے متعلق اس وضاحت کو قبول کرلیتے ہیں تو براہمنوں اور شودروں کے بیچ پائی جانے والی تفریق اتنی ہی قدرتی اور ابدی ہے،جتنی اور جب سے سورج اور چاند میں پائی جاتی ہے۔قدیم چینی اساطیر کے مطابق جب نیو کو آنامی دیوی نے انسان کو زمین کی مٹی سے پیدا کیا تو اس نے اشرافیہ کو تخلیق کرنے کے لیے انتہائی نفیس زرد مٹی جبکہ عامیوں کے لیے بھورے رنگ کا بھدا کیچڑ استعمال کیا تھا۔

تاہم،ہماری معروضی سمجھ کے مطابق یہ طبقاتی تقسیم انسانی تصورات کا نتیجہ ہے۔براہمنوں اور شودروں کو خداؤں نے کسی قدیم،قبل از تاریخ کی کسی ہستی کے جسمانی اعضاء سے پیدا نہیں کیا تھا۔بجائے،براہمنوں اور شودروں میں یہ تفریق 3000 سال قبل شمالی ہندوستان میں چند رسومات،شعائر اور قوانین کے نتیجے میں پیدا ہوئی تھی۔ارسطو کے خیالات کے برعکس،غلاموں اور آزاد وخود مختار لوگوں میں کسی بھی قسم کی حیاتیات پر مبنی فطری تفریق کا کوئی ثبوت نہیں ہے بلکہ یہ انسان کے بنائے قوانین اور سماجی ترتیب ہے جس کی بناء پر کچھ لوگ غلام اور باقی ان کے آقا بن بیٹھتے ہیں۔سیاہ اور سفید فام انسانوں میں کچھ حیاتیاتی فرق جیسے جلد کا رنگ اور بالوں کی قسم ضرور پایا جاتا ہے لیکن ذہانت اور اخلاقی قدروں میں کسی بھی قسم کے تفرقے کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔

لوگوں کی اکثریت یہ دعوی کرتی ہے کہ ان کی سماجی طبقاتی ترتیب عین فطری اور بالکل جائز ہے جبکہ دوسرے معاشروں میں پائی جانے والی تراتیب فاسق اور احمقانہ دلائل کی بنیاد پر کھڑی ہیں۔جدید مغربی باشندوں کو نسلی بنیادوں پر طبقاتی فرق کو رد کرنے کا سبق پڑھایا جاتا ہے۔وہ جب سیاہ فاموں کو سفید فام بستیوں میں سکونت سے ممانعت،سفید فاموں کے سکولوں میں داخلے کی ممانعت یا ہسپتالوں میں سفید فاموں کی نسبت فرق پر مبنی قوانین بارے سنتے ہیں تو ان کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ جاتی ہیں۔ لیکن دوسری جانب،امارت اور غربت کی بنیاد پر طبقاتی تقسیم جیسے امراء کا باقیوں سے الگ تھلگ پر تعیش گزربسر، امیروں کی شاہانہ بستیوں میں رہائش، اعلیٰ درجے کی تعلیم اور صحت کی سہولیات جیسے امور کو دیکھتے ہیں تو وہ بالکل بھی ٹس سے مس نہیں ہوتے۔امریکیوں اور یورپیوں کے نزدیک یہ عین جائز اور سمجھ میں آنے والی بات ہے۔ حالانکہ،یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ آج زیادہ تر امیر اس لیے امیر تر ہیں کیونکہ انھوں نے امیر گھرانوں میں جنم لیا تھا جبکہ زیادہ تر غریب ساری عمر اس لیے غربت کی چکی میں پستے رہتے ہیں کیونکہ ان کی پیدائش کسی غریب کے گھر میں ہوئی تھی۔

بد قسمتی سے، پیچیدہ انسانی معاشروں کو ایک یا دوسری صورت تصوراتی طبقاتی نظام اور ناجائز تفریق کی ضرورت ہوتی ہے۔ ظاہر ہے، سارے طبقاتی نظام اخلاقی اعتبار سے ایک جیسے نہیں ہوتے اور بعض معاشرے، دوسرے معاشروں کی نسبت زیادہ تفرقے کا شکار ہوتے ہیں لیکن اس کے باوجود آج تک کوئی بھی ایک معاشرہ ایسا نہیں ہے جو تفریق اور امتیاز کے بغیر چل سکا ہو۔ یہ وقت کے ساتھ بار بار ثابت ہو چکا ہے کہ لوگوں نے ہمیشہ ہی دوبارہ سے آبادیوں کو تصوراتی طبقات جیسے اعلیٰ نسب، عامی اور غلام؛ سفید اور سیاہ فام؛ اشرافیہ اور عوام؛ براہمن اور شودر؛ اپر، مڈل اور لوئر کلاس یا امیر اور غریب میں تقسیم کیا ہے۔ ان طبقات کے وجود کا سب سے بڑا فائدہ یہ رہا ہے کہ ان کی مدد سے بعض لوگوں کو قانونی، سیاسی اور سماجی لحاظ سے برتری دینے سے کروڑوں لوگوں کے بیچ آپسی تعلقات اور معاملات باقاعدگی کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔

کسی بھی معاشرے میں طبقات نہایت اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ یہ مکمل طور پر ایک دوسرے سے اجنبی لوگوں کو وقت اور توانائی ضائع کیے بغیر ہی ایک دوسرے کے ساتھ مخصوص سلوک روا رکھنے کا فیصلہ کرنے کا موقع فراہم کرتے ہیں اور انھیں ذاتی تعلقات اور ناطہ بڑھانے کا جھمیلا سرے سے پالنا ہی نہیں پڑتا۔ جارج برناڈشا کے ایک مشہور ڈرامے کے کردار ہینری ہیگنز کو الیزا کے ساتھ اپنے مبینہ تعلق کو سمجھنے کی غرض سے انس پر مبنی قریبی تعلق بنانے کی کوئی ضرورت پیش نہیں آتی۔ وہ الیزا کی گفتگو کے انداز سے ہی سمجھ جاتا ہے کہ وہ لوئر کلاس سے تعلق رکھتی ہے اور وہ اس کے ساتھ جس طرح چاہتا، پیش آ سکتا تھا۔ مثال کے طور پر وہ اس کو اپنی شرط جیتنے کے چکر میں پھول بیچنے والی معمولی لڑکی کو بول چال کا صحیح انداز سکھا کر فریب اور جہل سے شہزادی بنا کر پیش کر سکتا تھا۔ آج کے جدید دور میں کسی پھولوں کی دکان میں کام کرنے والی جدید الیزا کے لیے سمجھنا اور جاننا انتہائی ضروری ہے کہ دن بھر دکان میں داخل ہونے والے درجنوں لوگوں پر گلاب اور سوسن کے پھول بیچنے کے لیے کتنی محنت درکار ہوتی ہے۔ وہ ہر فرد سے اس کے ذوق بارے طویل بحث نہیں کر سکتی اور نہ وہ ہر آدمی کا بٹوا ٹٹول سکتی ہے۔ بجائے، وہ سماجی اشاروں اور کنایوں کا سہارا لے لیتی ہے۔ ہر شخص کے بول چال، انداز، لباس، عمر اور اگر وہ سیاسی روادار نہیں ہے تو جلد کی رنگت سے بھی حیثیت کا اندازہ لگا لیتی ہے۔ ان سماجی اشاروں اور کنایوں کا استعمال کر کے وہ فوراً ہی سمجھ جاتی ہے کہ آیا یہ شخص کسی معروف اکاونٹنگ فرم کا امیر کبیر ایگزیکٹو ہے، جو مہنگے اور رنگ برنگے گلابوں کا پورا گلدستہ خریدے گا یا پھر کوئی عام قاصد وغیرہ ہے جس کی حیثیت اتنی زیادہ نہیں ہے اور اس کا کام سستے گل داودی کے چند سفید یا گلابی پھولوں سے بھی چل جائے گا۔

یہ درست ہے کہ قدرتی طور پر پائی جانے والی صلاحیتیں بھی سماجی امتیاز قائم کرنے میں کردار ادا کرتی ہیں۔ لیکن کردار اور استعداد کی قدر و قیمت بھی عام طور پر پہلے سے موجود تصورات کے تحت ہی طے ہوتی ہے۔ ایسا دو اہم ترین طریقوں سے ہوتا ہے۔ پہلا اور زیادہ اہم یہ ہے کہ اس طرح کی قدرتی صلاحیتوں کی آبیاری ضروری ہوتی ہے جس کے لیے تربیت کا انتظام کیا جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص کسی

مخصوص جوہر کے ساتھ پیدا بھی ہوتا ہے تو اس کی یہ لیاقت اور گن تعلیمی پونے، دماغ کو تربیت کی ریتی سے رگڑنے اور مشق کے بغیر دبی ہوئی اور پوشیدہ ہی رہے گی۔ سب لوگوں کو اپنے گن اور صلاحیتوں کو یوں نکھارنے کا یکساں موقع نہیں ملتا۔ عام طور پر ایسے مواقع بھی سماجی طرز، تصورات اور معاشرے میں رتبے اور مقام پر منحصر ہوتے ہیں۔ اس ضمن میں ہیری پوٹر کی کہانی خوب مثال ہے جس میں ایک ایسے لڑکے کی داستان بیان کی گئی ہے جو بچپن میں اپنے غیر معمولی اور ممتاز جادوگر خاندان سے الگ کر دیا جاتا ہے اور اس کی پرورش اجڈ عامیوں کے گھر کی جاتی ہے۔ وہ آخر کار جادوگری میں بنیادی تربیت اور تجربے کے بغیر ہی فسوں گری کے سکول ہاگورٹ میں داخل ہو جاتا ہے۔ بعد اس کے، اسے سات کتابوں پر پھیلے ہوئے پلاٹ میں اپنی طاقت اور غیر معمولی پیدائشی صلاحیتوں کو نکھارنے کے لیے انتھک محنت کرنی پڑتی ہے۔ تب جا کر اسے اپنا اصل مقام ملتا ہے۔

دوم یہ ہے کہ اگر مختلف طبقات سے تعلق رکھنے والے لوگ ایک ہی طرح کی یکساں صلاحیتیں پیدا بھی کر لیں تو برابری کی سطح پر کامیابی ملنا مشکل ہے کیونکہ ہر طبقے کے لیے اصول اور قواعد مختلف ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر برطانوی سامراج میں جکڑے ہوئے ہندوستان میں اگر کوئی شودر، ایک براہمن، کیتھولک آئرش اور ایک پروٹیسٹنٹ انگریز۔۔۔ یہ سب ایک ہی طرح کی کاروباری فراست کی صلاحیت پیدا بھی کر لیتے تو ان سب کو امیر بننے کا یکساں موقع ملنا مشکل تھا۔ اس دور میں معاشی کھیل اور مواقع پر قانونی بندشیں پائی جاتی تھیں اور غیر سرکاری طور پر مختلف قومیتوں پر کئی طرح کی رسمی پابندیاں بھی ہوا کرتی تھیں۔

شیطانی چکر

سبھی معاشرے تصوراتی سلسلوں کی بنیاد پر قائم ہوتے ہیں لیکن ان سلسلوں کا ایک جیسا ہونا ضروری نہیں ہے۔ اس علت کی پھر ضرورت کیا ہے؟ ایسا کیوں ہے کہ روایتی ہندو معاشرہ لوگوں کو ذات پات میں تقسیم کرتا ہے، سلطنت عثمانیہ میں مذہب جبکہ امریکی معاشرہ نسل کی بنیاد پر منقسم ہوتا ہے؟ اس ضمن میں زیادہ تر یہ ہوتا ہے کہ معاشروں میں یہ اس طرح کی طبقاتی تقسیم تاریخی لیکن حادثاتی حالات و واقعات کا نتیجہ ہوتا ہے۔ بعد ازاں، اس تقسیم کو دوام ملتا رہتا ہے اور یوں کئی نسلوں کے بعد یہ باقاعدہ نتھر کر ایسی اٹل شکل اختیار کر لیتی ہے کہ پورے معاشرے کے مفادات اس سے وابستہ ہو جاتے ہیں۔

مثال کے طور پر ہندوؤں میں پائے جانے والے ذات پات کے طبقاتی نظام پر غور کریں۔ محققین کا کہنا ہے کہ ہندوؤں میں ذات پات کا نظام آج سے تین ہزار سال قبل اس وقت تشکیل پایا جب ہند آریائی لوگوں نے برصغیر ہندوستان پر حملہ کر کے مقامی آبادی کو محکوم بنالیا۔ ہند آریائی حملہ آوروں نے ایک طبق دار معاشرے کی بنیاد رکھی جس میں ظاہر ہے، انھوں نے اپنے لیے نمایاں اور بیش رس رتبے اور حیثیت جیسے پجاری، بروہت اور جنگجو وغیرہ منتخب کی جبکہ مقامی آبادی کو غلاموں اور خدمت گاری پر مامور کر دیا۔ حملہ آور زبردست

ضرور تھے لیکن بہر حال، وہ اقلیت میں تھے۔ جلد ہی انھیں اپنے مقدم اور مراعات یافتہ رتبے اور منفرد حیثیت خطرے میں نظر آنے لگی۔ چنانچہ، اس خطرے سے نبٹنے کے لیے انھوں نے شمالی ہندوستان کی ساری آبادی کو ذات اور پات میں تقسیم کر دیا۔ ہر ذات کے لیے اپنا مخصوص پیشہ اختیار کرنا اور معاشرے میں صرف متعین کردہ کردار ادا کرنا لازم ٹھہرا۔ ہر ذات کی اپنی قانونی حیثیت، مراعات اور فرائض تھے۔ مختلف ذاتوں کا آپس میں اختلاط جیسے سماجی ربط، شادی بیاہ اور یہاں تک کہ کھانے پینے میں بانٹ اور پھالی کی بھی سختی سے ممانعت کر دی گئی۔ یہ تفریق صرف قانونی نہیں تھی بلکہ اسے اس دور میں رائج مذہبی اساطیر، عقائد اور عبادات کا بھی حصہ بنا دیا گیا۔ حکمرانوں نے استدلال پیش کیا کہ ذات پات کا نظام حالات و واقعات کی بناء پر تشکیل پانے والی تاریخی نہیں بلکہ کائنات کی ابدی حقیقت کی عکاسی ہے۔ طہارت اور غلاظت کا تصور، ہندو مذہب کا لازمی جز ہے۔ حکمرانوں نے ہندو مذہب کے اسی ضروری جز کو کھینچ کر سماجی اہرام کھڑا کر دیا۔ مثال کے طور پر پارسا اور نیکوکار ہندوؤں کو سکھایا گیا کہ دوسری ذات کے لوگوں کے ساتھ میل ملاپ اور اختلاط سے نہ صرف وہ بلکہ پورا معاشرہ پلید ہو سکتا ہے۔ چونکہ یہ ناپاکی ہے، تو اسی لیے سخت ناپسندیدہ اور قابل نفرت ہے۔ اس طرح کے تصورات صرف ہندوؤں کے یہاں نہیں بلکہ تاریخ بھر میں تقریباً سبھی معاشروں کے یہاں پاکی اور ناپاکی کا تصور بہت عام رہا ہے۔ یہ پاکیزگی اور پلیدگی کا تصور ہی ہے جس نے ہر معاشرے میں سماجی اور سیاسی تقسیم کو بڑھاوا دینے میں کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ان تصورات کو حکمران اور اشرافیہ اپنے مفادات اور مراعات کو قائم دائم واسطے، استحصال کے لیے بھی خوب استعمال کرتی آئی ہے۔ تاہم، یہ یاد رہے کہ پاکیزگی اور پلیدگی کے خوف سے متعلق یہ تصور مکمل طور پر پنڈتوں، پادریوں اور شہزادوں کا ایجاد کردہ نہیں ہے۔ غالباً، ان تصورات کی جڑیں انسانوں کی حیاتیاتی بقاء کے طریق کار میں بھی پہنچی ہوئی ہیں۔ وہ یوں کہ انسان ان چیزوں سے جبلی طور پر کراہت کا اظہار کرتا ہے جو اسے بیماری کی طرف دھکیل سکتی ہیں۔ مثلاً، بیمار افراد، لاشیں اور غلاظت وغیرہ۔۔۔ اگر آپ کسی انسانی گروہ جیسے عورتوں، یہودیوں، رومینی، ہم جنس پرست، سیاہ فام وغیرہ کو الگ تھلگ رکھنا چاہتے ہیں تو اس کا سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ دنیا بھر میں اس مخصوص گروہ کے بارے لوگوں کو قائل کرنے کی کوشش کریں کہ دراصل یہ پلیدگی کا ماخذ ہیں۔

ہندوؤں میں ذات پات کا نظام اور اس کے ساتھ جڑے پاکیزگی کے شعائر، ہندوستانی تہذیب اور تمدن کی اساس میں سختی سے بیٹھ چکا ہے۔ ہند آریائی حملے کو طویل عرصہ بیت گیا بلکہ لوگ اس زمانے کو بھول بھال گئے لیکن ہندوستانی پھر بھی اس ذات پات کے نظام میں یقین پالتے رہے اور ذاتوں کے خلط ملط ہونے سے پیدا ہونے والی مبینہ پلیدگی کے تصور پر یقین کرتے رہے۔ خود ذاتیں بھی تبدیلی سے منہا نہیں ہوتیں۔ ہوا یہ کہ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا بڑی ذاتیں بھی مزید ذیلی اقوام اور طبقات میں تقسیم ہوتی گئیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اولین دور کی چار ذاتیں، آج تین ہزار مختلف نسلی گروہوں اور طبقات میں بٹ چکی ہیں۔ ان نسلی گروہوں اور ذیلی طبقات کو 'جاتی' کہا جاتا ہے۔ جاتی کا لفظی مطلب، 'جنم' یا 'پیدائش' ہے۔ ذات اور پات کے انقسام نے، بہر حال اس نظام کے بنیادی اصولوں کو

نہیں بدلا۔ وہ اصول جوں کے توں دھرے رہے جن کے تحت ہر شخص جو کسی مخصوص 'جاتی' یا 'ذات' میں جنم لیتا ہے تو پھر وہ اسی رتبے اور حیثیت کا اہل ہے۔ اس کا کردار بھی ویسے کا ویسا ہے۔ ان اصولوں سے روگردانی بھی شخصی اور معاشرتی طور پر آج بھی پلیدگی اور نجاست ٹھہرتی ہے۔ ہر شخص کی 'جاتی' اس کے پیشے کا تعین کرتی ہے، اس کی خوراک کا فیصلہ اسی بنیاد پر ہوتا ہے۔ اس کی رہائش بارے اجازت نامے اور شادی بیاہ کی اہلیت بھی 'جاتی' کی بنیاد پر ہی طے ہوتی ہے۔ عام طور پر کوئی شخص صرف اور صرف اپنی 'جاتی' میں بیاہ رچا سکتا ہے اور اس شادی کے نتیجے میں پیدا ہونے والے بچے، اسی جاتی سے تعلق رکھتے ہیں اور اسی جاتی کی مخصوص حیثیت اور رتبے کے اہل ہوتے ہیں۔

جب بھی کوئی نیا پیشہ ایجاد ہوا یا منظر نامے میں نت نئے لوگ آئے۔۔۔ ہندو معاشرے میں ان کے مقام کا تعین کرنے کے لیے ذات کی نشاندہی لازمی ہو گیا۔ اگر کوئی گروہ اپنی ذات اور پات کی بناء پر شناخت قائم کرنے میں ناکام ہو جاتا تو اسے واقعی معنوں میں مجہول اور ذات بدر قرار دے دیا جاتا رہا ہے۔ ایسے بن جاتی آدمیوں کا کوئی پرسان حال نہیں ہوتا اور ایک طبق دار معاشرے میں انھیں نچلی اور کمترین ذات جتنے حقوق بھی حاصل نہیں ہوتے۔ ان بن جاتی کے حامل انسانوں کو اچھوت سمجھا جاتا ہے۔ اچھوتوں کے لیے لازم ہے کہ وہ باقی لوگوں سے الگ تھلگ بسر رکھیں اور ایسی زندگی گزاریں جس میں تذلیل، فروتنی، کراہت اور گھن کے سوا کچھ بھی نہیں رکھا ہوتا۔ ان کی گزر بسر کوڑے کے ڈھیروں، غلاظت اور آلائش پر ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ نچلی جاتی کے لوگ بھی ان اچھوتوں سے بچ کر، ان سے گھل ملنے سے کراہتے ہیں۔ وہ بھی ان کے ساتھ کھانا نہیں کھاتے، انھیں چھونے سے کتراتے ہیں اور ان کے ساتھ شادی بیاہ تو ہر گز نہیں کرتے۔ آج کی جدید بھارتی ریاست میں بھی شادی اور بیاہ کے معاملات ذات اور پات کے نظام کے تحت چلائے جاتے ہیں۔ بھارت کی جمہوری حکومتوں نے اس تفریق کو ختم کرنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دی۔۔۔ ہندوؤں کو قائل کرنے کی کوشش جاری رہتی ہے کہ ذات اور پات کا پاکیزگی یا پلیدگی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے لیکن عام طور پر یہ ساری کاوشیں بے سود ہی رہتی ہیں۔

امریکہ میں پاکیزگی

ہندوؤں میں ذات پات کے نظام کی طرح جدید امریکہ میں بھی نسلی بنیادوں پر تقسیم کا نظام۔۔۔ ایک شیطانی چکر قائم ہوا۔ سولھویں سے اٹھارہویں صدی عیسوی میں یورپی فاتحین نے لاکھوں کی تعداد میں افریقی غلاموں کو امریکہ کی کانیں کھودنے اور کشت زاروں میں کھیتی باڑی کے لیے 'درآمد' کیا۔ امریکہ میں یہ غلام یورپ اور مشرقی ایشیاء کی بجائے افریقہ سے ہی منگوانے کا فیصلہ تین واقعاتی عوامل کی بنیاد پر کیا گیا تھا۔ اول یہ کہ افریقہ نسبتاً قریب تھا اور غلاموں کی نقل و حمل ویت نام کی بجائے سینیگال وغیرہ سے سستی پڑتی تھی۔

دوم یہ کہ افریقہ میں پہلے سے ہی غلاموں کی منظم اور بالیدہ تجارتی منڈیاں موجود تھیں۔ امریکہ سے قبل، افریقی منڈیاں مشرق وسطیٰ کو غلام سپلائی کرتی تھیں جبکہ یورپ میں غلامی کا تصور ناپید تھا۔ ظاہر ہے، ایک نئی تجارتی منڈی صفر سے شروع کرنے کی بجائے بہتر یہی تھا کہ پہلے سے موجود منڈیوں کا فائدہ اٹھایا جائے۔

تیسرا اور سب سے اہم عنصر یہ تھا کہ امریکی شجر کاریاں اور کاشت گاہیں عام طور پر ورجینیا، ہیٹی اور برازیل جیسی جگہوں پر پائی جاتی تھیں۔ یہ وہ علاقے تھے جہاں ملیریا اور زرد بخار کی وبا پھیلتی رہتی تھی۔ ملیریا اور زرد بخار ایسی بیماریاں ہیں جن کی ابتداء افریقہ سے ہوئی تھی۔ نسل در نسل، ان بیماریوں کا سامنا کرنے کا نتیجہ تھا کہ افریقیوں نے جزوی طور پر ان بیماریوں کے خلاف جینیاتی مدافعت پیدا کر لی تھی جبکہ یورپی باشندے اس ضمن میں لاچار تھے اور ان بیماریوں کے ہاتھوں انبوہ میں ہلاک ہوتے تھے۔

واقعاتی طور پر کسی بھی شجر کاری کے مالک کے لیے دانشمندی یہی تھی کہ وہ اپنا سرمایہ یورپی غلاموں یا باضابطہ مزدوروں پر لگانے کی بجائے افریقی غلام خرید لے۔ یہ عجب تضاد تھا کہ افریقی باشندوں کی جینیاتی برتری (قوت مدافعت کی شکل) ہی سماجی کمتری (غلامی کی شکل) میں بدل گئی۔ قوت مدافعت تو ایک پہلو ہے، ورنہ یہ بھی حقیقت ہے کہ چونکہ افریقی باشندے، یورپیوں کی نسبت گرم علاقوں کے ساتھ زیادہ موافقت رکھتے ہیں، وہ بالآخر یورپی آقاؤں کے غلام بن گئے۔ یہ وہ حالات و واقعات تھے جن کی بناء پر امریکہ میں ایک نئے طبق دار معاشرے نے جنم لیا۔ یہ معاشرہ اب سفید فام یورپی آقاؤں اور محکوم سیاہ فام افریقی غلاموں کے طبقے میں بٹا ہوا تھا۔

لیکن آپ لوگوں کو کبھی یہ کہتے ہوئے نہیں سنتے کہ کسی مخصوص نسل یا علاقے سے تعلق رکھنے والے باشندوں کو اس لیے غلامی کے لیے ترجیح دی جاتی ہے کیونکہ یہ معاشی لحاظ سے موزوں ہے۔ ہندوستان میں ہند آریائی فاتحین کی طرح امریکہ میں بھی سفید فام یورپی بھی خود کو معاشی طور پر کامیاب ہونے کے ساتھ ساتھ متقی، پرہیز گار، منصف اور معروضی بھی دیکھنا چاہتے تھے۔ چنانچہ، اس زمانے میں مذہبی عالموں نے دلیل پیش کی کہ افریقی تو دراصل نوح کے بیٹے حام کی اولاد ہیں۔ نوح نے حام کو بد دعا دی تھی کہ اس کی اولاد غلام رہے گی۔ اس زمانے کے حیاتیات کے ماہرین نے دلیل پیش کی کہ دراصل سیاہ فام، سفید فاموں کی نسبت کوڑھ مغز ہوتے ہیں اور ان کے دماغ میں اخلاقی اقدار پیدا ہونے کی زیادہ صلاحیت نہیں ہوتی۔ ڈاکٹروں نے الزام لگایا کہ سیاہ فام گندگی میں بسر رکھنے کے عادی ہوتے ہیں اور بیماریاں پھیلاتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں، یہ عام کر دیا گیا کہ سیاہ فام پلیدگی کا منبع ہیں۔

یہ گھڑے ہوئے مفروضے امریکی تہذیب سے خوب میل کھانے لگے اور مغربی معاشرے میں سیاہ فاموں سے متعلق یہ واہمے عام ہو گئے۔ یہ خیالی مفروضے اور وہمی باتیں اتنی راسخ ہو گئیں کہ غلامی کی ضرورت کو پیدا کرنے والے حالات و واقعات ختم ہونے کے بعد بھی باقی رہیں بلکہ جیسے اٹل بن گئیں۔ انیسویں صدی کے اوائل میں تاج برطانیہ نے غلامی کو غیر قانونی قرار دے دیا اور بحر اوقیانوس کے ذریعے غلاموں کی تجارت پر پابندی لگا دی گئی۔ اس کے بعد آنے والی دہائیوں میں براعظم امریکہ میں بھی رفتہ رفتہ غلامی غیر قانونی قرار دے کر ختم

کردی گئی۔ یہاں، یہ امر قابل ذکر ہے کہ تاریخ میں پہلی بار غلاموں کی ملکیتی صفت رکھنے والے معاشروں نے اپنی مرضی سے غلامی کو ختم کر دیا۔ تاہم، اگرچہ غلاموں کو آزادی مل گئی لیکن ان کے متعلق نسلی بنیادوں پر زد عام ہو چکے مفروضے، واہمے اور طرح طرح کی گھڑی ہوئیں وہ کہانیاں جو غلامی کو طول دیتی تھیں، پھر بھی باقی رہیں۔ نسلوں کے بیچ یہ تفرقہ سماجی رواج اور نسلی بنیادوں پر وضع کردہ قوانین کی شکل میں باقی رہا۔

اس کا نتیجہ علت باہمی کے ایک کبھی نہ ختم ہونے والے چکر کی صورت بر آمد ہوا۔ یعنی، یہ شیطانی چکر چلتا رہا۔ مثال کے طور پر خانہ جنگی کے فوراً بعد ریاستہائے متحدہ امریکہ کے جنوبی حصے کی مثال اٹھالیں۔ 1865ء میں امریکی آئین میں تیرہویں ترمیم کی گئی جس کے نتیجے میں غلامی کو غیر قانونی قرار دیا گیا۔ چودھویں ترمیم میں لازمی عہد کیا گیا کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں کسی بھی شخص کو نسلی بنیادوں پر شہریت اور برابری کی بنیاد پر قانونی تحفظ کے حق سے محروم نہیں کیا جاسکتا۔ تاہم، ان ترامیم سے قبل پچھلے دو سو سال تک غلامی میں مبتلا رہنے کا مطلب یہ تھا کہ سیاہ فام امریکی شہریوں کے خاندان زیادہ تر سفید فام شہریوں کے خاندانوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ غریب اور ان پڑھ رہ گئے تھے۔ 1865ء میں مثلاً الباما میں پیدا ہونے والے کسی سیاہ فام بچے کے لیے اپنی پڑوسی سفید فام بچے کی نسبت بہتر یا اسی کے برابر معیار کی تعلیم اور نتیجتاً بہتر نوکری حاصل کرنا ممکن ہی نہیں تھا۔ 1880ء اور 1890ء کی دہائیوں میں اس سیاہ فام بچے کے اپنے بچوں کے لیے بھی اپنی زندگی کی ابتداء اسی محرومی سے ہوئی۔ انہوں نے بھی اپنے باپ کی ہی طرح ایک ان پڑھ اور غریب گھرانے میں آنکھ کھولی۔

لیکن یہ صرف معاشی محرومی کی ہی بات نہیں تھی۔ الباما میں صرف سیاہ فام ہی نہیں بلکہ سفید فاموں میں بھی غربت کی بہتات تھی۔ بڑی تعداد میں ایسے سفید فام بھی تھے، جنھیں اپنے 'نسلی بھائی بند' بہتر اور خوشحال سفید فاموں کی نسبت مواقع نہیں ملتے تھے۔ پھر یہ بھی تھا کہ صنعتی دور واقعی معنوں میں سر اٹھا رہا تھا تو اس دور میں امریکہ ایک بے انتہا سریع معاشرہ بن چکا تھا اور دوسرے خطوں سے تارکین وطن لوگ جوق در جوق یہاں پر جمع ہو رہے تھے۔ یہ وہ دور تھا کہ کوئی بھی شخص بے کاری کے دوران اور معمولی کام کاج سے بھی مناسب دولت کما سکتا تھا۔ لیکن اگر دولت ہی پیمانہ ہوتی تو پھر نسلوں کے بیچ یہ تفرقہ اور انقسام دھندلا جاتا۔

لیکن ایسا نہیں ہوا۔ 1865ء تک سفید فام اور تقریباً سبھی سیاہ فاموں کے دماغ میں یہ مفروضے حقیقت بن کر بیٹھ چکے تھے کہ سیاہ فام، سفید فاموں کی نسبت کند ذہن، تشدد پسند، جنسی طور پر بدکار، سست اور صفائی کے معاملے میں سخت غلیظ ہوتے ہیں۔ یعنی، سیاہ فام تشدد، چوری چکاری، زنا بالجبر اور بیماری کا گڑھ ہوتے ہیں۔۔۔ دوسرے الفاظ میں پلید ہوتے ہیں۔ اب صورتحال یہ بن گئی کہ اگر 1895ء میں کوئی سیاہ فام شخص سر دھڑ کی بازی لگا کر، معجزانہ طور پر اچھی تعلیم حاصل کر کے کسی معقول جیسے بینک میں کیشئیر کی نوکری کے لیے درخواست جمع کرواتا تو پھر بھی اس کو کسی بھی دوسرے، اسی کی قابلیت کے حامل سفید فام شخص کے مقابلے میں یہ نوکری ملنے کا امکان

تقریباً نہ ہونے کے برابر ہوتا تھا۔ یہ کلنک کا ٹیکہ جس کے تحت سیاہ فام فطرتاً نا قابل اعتبار، سست اور کند ذہن مشہور ہو چکے تھے۔۔۔ اس کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ بن گئے۔

آپ بھی غالباً یہی سمجھتے ہوں گے کہ وقت کے ساتھ لوگ بھی بدنامی کے اس کلنک بارے سمجھ ہی لیتے ہوں گے کہ یہ مفروضوں اور گھڑی ہوئیں باتوں پر مشتمل ہیں۔ انھوں نے بالآخر سمجھ لیا ہو گا کہ سیاہ فام بھی وقت کے ساتھ اپنی قابلیت، قانون پسندی اور سفید فاموں کی طرح صفائی ستھرائی کا معیار ثابت کریں گے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اصل میں اس کے الٹ ہوا۔ یہ تعصب اور بدگمانی وقت کے ساتھ بڑھتی ہی گئی۔ اب چونکہ ساری کی ساری بہترین نوکریاں سفید فاموں کے پاس تھیں تو یہ سوچ نہایت آسان ہو گئی کہ، سیاہ فام واقعی کمتر ہوتے ہیں۔ اوسط درجے کے سفید فام شہری کہتے پھرتے، 'دیکھو۔۔۔ آج زمانہ ہو گیا۔ سیاہ فاموں کو آزاد ہوئے نسلیں گزر گئیں لیکن مجال ہے کہ کوئی سیاہ فام پروفیسر، وکیل، ڈاکٹر۔۔۔ بلکہ بینک میں کیشیئر بھی نہیں ہیں۔ کیا یہ ثبوت نہیں ہے کہ سیاہ فام کند ذہن اور سخت نالائق ہوتے ہیں؟' یہ ایسا شیطانی چکر ہے جس میں پھنس کر سیاہ فاموں کو سفید پوشی کا موقع اور دفتری ملازمتوں کے لیے سرے سے تول میں ہی نہیں لایا جاتا تھا کیونکہ سب کا خیال تھا کہ وہ کند ذہن ہوتے ہیں۔ ان کی اس کمتری کا ثبوت یہ پیش کیا جاتا کہ سفید پوش ملازمتوں میں سیاہ فاموں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی۔ یہ ایسا شیطانی چکر ہے۔

لیکن، یہ شیطانی چکر یہاں بھی ختم نہیں ہوتا۔ جیسے جیسے سیاہ فاموں پر بدنامی اور رسوائی کے دھبے گہرے ہوئے تو یہ رفتہ رفتہ 'جم کرو کے قوانین' اور اور کئی طرح کے رسم ورواج کی شکل اختیار کر گئے۔ ان رسوم، رواج اور قوانین کا مقصد نسلی نظام کا تحفظ تھا۔ سیاہ فاموں کو انتخابات میں ووٹ ڈالنے کی اجازت نہیں تھی۔ وہ سفید فاموں کے سکول میں داخلہ لینے کے اہل نہیں تھے۔ وہ سفید فاموں کی دکانوں سے خریداری نہیں کر سکتے تھے، سفید فاموں کے ساتھ ریستوانوں میں کھانا نہیں کھا سکتے تھے اور سفید فاموں کے ہوٹلوں میں ٹھہرنے کی ممانعت تھی۔ ان متعصبانہ قوانین اور رسوم کی وضاحت یہ دی جاتی تھی کہ چونکہ سیاہ فام گندے، غلیظ، بدبودار، سست اور خبیث ہوتے ہیں، اس لیے سفید فاموں کو ان سے تحفظ فراہم کرنے کی ضرورت ہے۔ سفید فام ان ہوٹلوں میں ٹھہرنا پسند نہیں کرتے تھے جہاں سیاہ فاموں کو بھی ٹھہرنے کی اجازت ہوتی تھی۔۔۔ وہ بیماری کے ڈر سے، ان ریستوانوں میں کھانا بھی نہیں کھاتے تھے جہاں سیاہ فاموں کو بیٹھنے اور کھانے کی اجازت ہوتی تھی۔ حیوانیت اور برے اثر کے ڈر سے، وہ اپنے بچوں کو ان سکولوں میں داخل نہیں کرواتے تھے جہاں سیاہ فاموں کے بچے بھی پڑھتے تھے۔ سیاہ فاموں کو انتخابات میں ووٹ ڈالنے کی اجازت اس لیے نہیں تھی کیونکہ انھیں اجڈ، جاہل اور بداخلاق سمجھا جاتا تھا۔ سیاہ فاموں سے خوف کی ان سبھی شکلوں کو ہر طرح کی 'سائنسی تحقیق' سے 'ثابت' کرنے کی کوشش بھی کی جاتی تھی۔ پتہ چلا کر بتایا جاتا کہ، 'سیاہ فام واقعی کم پڑھے لکھے ہوتے ہیں'۔ یا پھر 'فلاں فلاں بیماریاں سفید فاموں کی نسبت، سیاہ فاموں میں زیادہ عام ہیں' یا پھر، 'سیاہ فاموں کے یہاں جرائم کی شرح زیادہ ہوتی ہے' وغیرہ وغیرہ۔۔۔ لیکن یہ دلچسپ امر ہے کہ کبھی بھی یہ نہیں

بتایا جاتا تھا کہ 'سائنسی تحقیق' کا یہ اندازا انتہائی جانبدارانہ ہوتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ یہ بھی کبھی نہیں بتایا گیا کہ دراصل یہ 'حقائق' سیاہ فاموں کے خلاف تعصب اور بدگمانی کا ہی نتیجہ ہیں۔

بیسویں صدی کے وسط تک سابقہ وفاقی ریاستوں میں سیاہ فاموں سے متعلق صورتحال انیسویں صدی سے بھی کہیں زیادہ درجے بدتر ہو کر رہ گئی۔ اس ضمن میں کلینن کنگ کی مثال دلچسپ ہے جو ایک سیاہ فام طالب علم تھا اور بعد ازاں وہ پہلا سیاہ فام تھا جس نے امریکہ کے صدارتی انتخابات میں حصہ لیا۔ 1958ء میں کلینن کنگ نے میسی سپی کی یونیورسٹی میں داخلے کی درخواست جمع کروائی تو اسے زبردستی ایک پاگل خانے میں داخل کروا دیا گیا تھا۔ یہ عدالتی فیصلہ تھا اور فاضل جج نے فیصلے کے دوران مفصل تبصرہ لکھتے ہوئے کہا تھا کہ، 'اگر کوئی سیاہ فام شخص یونیورسٹی میں داخلے کی درخواست جمع کروانے کا سوچتا ہے تو یقیناً اُس کا دماغی توازن خراب ہے۔'

شیطانی چکر: تاریخ کا ایک حادثاتی واقعہ بالآخر سخت گیر سماجی ترتیب کی شکل اختیار کر لیتا ہے

جب معاملہ سیاہ فام مردوں اور سفید فام عورتوں کے بیچ جنسی تعلق اور شادی بیاہ کا آتا تو امریکہ کے جنوب باسیوں (اور کئی شمال باسیوں) میں سیاہ فاموں سے متعلق نفرت اور غدر کی سرے سے کوئی حد ہی نہیں ہوتی تھی۔ مختلف نسلوں کے بیچ جنسی تعلق گویا سخت حرام قرار پایا۔ اس عمل کی خلاف ورزی اور مشتبہ خلاف ورزی کرنے والے افراد، دونوں ہی صورتوں میں بے قاعدہ اور مجمع کے ہاتھوں موت کی سزا کے حقدار سمجھے جانے لگے۔ کوکلس کلان نامی سفید فاموں کی گروہی بالادستی کی حامی اور نفرت پر مبنی خفیہ انجمن ایسی کئی ہلاکتوں اور بہت سے افراد کی ماورائے عدالت قتل کے جرم میں ملوث رہی۔ کوکلس کلان نامی یہ تنظیم ہندو براہمنوں کو بھی پیچھے چھوڑ گئے، بلکہ انھوں نے ایک قدم آگے نکل کر باقاعدہ 'بے آلائشی اور پاکیزگی' کے غیر تحریر شدہ قوانین بھی وضع کر دیے تھے۔

وقت کے ساتھ نسل پرستی کی وبا بہت سے ثقافتی پہلوؤں کو بھی نگل گئی۔ امریکہ میں جمالیاتی ثقافت سراسر حسن کے سفید پیمانوں پر وضع ہو کر نکلی۔ اس ضمن میں سفید فاموں کے جسمانی خدوخال جیسے سفید رنگت، ہلکے رنگ کے سیدھے بال، چھوٹی اور اوپر کی طرف مڑی ناک وغیرہ ہی حسن اور خوبصورتی کا معیار بن گئے۔ سیاہ فاموں کے روایتی خدوخال جیسے سیاہ اور گہری رنگت، گہرے سیاہ اور جھاڑدار بال، چپٹی

ناک کو بدصورتی سمجھا جانے لگا۔ یہ ایسی عصبیت تھی کہ جو انسانی شعور میں انتہائی گہرائی اور اس قدر سختی سے بیٹھ گئی کہ انسانیت، مساوات اور برابری کا تصور سرے سے بگڑ کر رہ گیا۔

اس طرح کے تاریخی حالات و واقعات کی بناء پر شروع ہونے والے شیطانی چکر تصوراتی نظام کا روپ دھار کر سینکڑوں بلکہ ہزاروں سال تک چلتے رہتے ہیں۔ ناجائز طور پر کی جانے والی زیادتی اور تفریق اکثر ہی وقت کے ساتھ اکثر ہی بد سے بدتر ہوتی جاتی ہے۔ پیسے سے پیسہ بنتا ہے۔ غربت کی چکی میں مزید غریب پستے ہیں۔ تعلیم کے زیور سے آراستہ کریں تو مزید تعلیم یافتہ پیدا ہوتے ہیں۔۔۔ اسی طرح جہالت میں مزید جہالت شامل ہو تو جہالت کا ہی راج بڑھتا رہتا ہے۔ بعینہ، تاریخ میں جو ایک دفعہ زیادتی کا نشانہ بن گیا تو عام طور پر وہ دوبارہ بلکہ بار بار جبر کا نشانہ بنتا ہے۔ تاریخ میں انصاف نہیں ہوتا۔ یہیں پر تکیہ نہیں، ظلم تو یہ ہے کہ تاریخ میں ایک دفعہ جسے امتیازی حق اور استثنیٰ مل گیا تو غالب امکان یہی ہوتا ہے کہ اس کا یہ استحقاق جاری رہے گا۔

زیادہ تر سماجی اور سیاسی نظاموں کی منطقی اور حیاتیاتی بنیاد کھوکھلی ہوتی ہے۔ یہ حالات اور واقعات کی بناء پر پیدا ہونے والی صورتحال اور اس سے جڑے مفروضوں اور واہموں کی مدد سے دوام پاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں تاریخ لکھنے اور پڑھنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اگر سیاہ اور سفید فاموں یا براہمنوں اور شودروں کے بیچ انقسام کی واقعی اور کوئی معروضی حقیقت ہوتی تو انسانی معاشروں کو سمجھنے کے لیے صرف اور صرف حیاتیات ہی کافی تھی۔ مثال کے طور پر اگر حیاتیاتی تحقیق ثابت کرلیتی کہ براہمن، شودروں اور سفید فام، سیاہ فاموں کے مقابلے میں واقعی بہتر دماغ کے حامل ہوتے ہیں تو پھر کوئی مسئلہ ہی نہ رہتا۔ لیکن اب چونکہ 'خردمند آدمی' کے مختلف بلکہ ہر لحاظ سے مختلف گروہوں میں بھی حیاتیاتی لحاظ سے نہ ہونے کے برابر ہیں تو اسی لیے حیاتیات ہندوستانی معاشرے کی پیچیدگیاں اور امریکی سماج میں پائے جانے والی نسلی تفاوت کو سمجھا پانے سے قاصر ہے۔ ہم ان عوامل کو صرف اور صرف تاریخی حالات، واقعات اور طاقت کی بنیاد پر قائم انسانی تعلقات کے مطالعے سے ہی سمجھ سکتے ہیں۔ یہ وہ عوامل ہیں جنھوں نے ہمارے تخیل کے واہموں کو انتہائی سفاک، جبر پر قائم 'حقیقی 'سماجی ترتیب میں بدل کر رکھ دیا ہے۔

مذکر اور مونث، مرد اور عورت، یہ اور وہ!

دنیا بھر میں معاشرے، مختلف قسم کے تصوراتی نظام اپناتے ہیں۔ اب نسل پرستی کی ہی مثال لے لیں۔ آج جدید امریکی معاشرے میں نسل نہایت اہم ہے جبکہ قرون وسطیٰ کے دور میں مسلمانوں کے لیے نسل کی اتنی اہمیت نہیں تھی۔ قرون وسطیٰ کے دور میں ذات اور پات کا نظام، ہندوستان کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ تھا لیکن جدید یورپ میں یہ عملی طور پر سرے سے اس کا وجود ہی نہیں ہے۔ تاہم، صرف ایک ایسا تصوراتی نظام ضرور ہے جو ہر معاشرے۔۔۔ قدیم اور جدید ہر طرح کے انسانی سماج میں ہمیشہ سے اہم ترین رہا

ہے۔ یہ صنفی نظام ہے۔ لوگوں نے ہمیشہ ہی خود کو مرد اور عورتوں کے بیچ منقسم رکھا ہے اور ہمیشہ ایسا ہوتا آیا ہے کہ صنفی بنیادوں پر قائم تصوراتی نظام میں مردوں کو بہتر مواقع دستیاب رہے ہیں۔ کم از کم اگر پہلے نہیں تو زرعی انقلاب کے بعد سے تو بالضرور ہی ایک اٹل حقیقت ہے۔

چین سے ملنے والی قدیم متن اور عبارات، ہڈیوں پر لکھی ہوئی کہانتیں اور کشف ہیں۔ یہ 1200 قبل مسیح سے تعلق رکھتی ہیں اور مستقبل کے بارے پیشن گوئی پیش کرتی ہیں۔ ان میں سے ایک ہڈی پر یہ سوال درج ہے: 'کیا اس ہاؤ نامی عورت کا حمل خوش قسمتی کی علامت ہے؟' اس سوال کے جواب میں لکھا ہے: 'اگر یہ بچہ 'ڈنگ' کے دن پیدا ہوا تو خوش قسمتی ہے اور اگر 'گنگ' کے دن پیدا ہوا تو غیر معمولی طور نیک شگون ہے'۔ تاہم، ہاؤ نامی عورت نے 'جی آن' کے دن بچے کو جنم دینے والی تھی۔ یہ کہانت روکھے پن سے مزید بتاتی ہے، 'آج، تین ہفتے اور ایک دن بعد، جی آن کے دن بچہ پیدا ہو گیا ہے۔ یہ ہرگز بھی خوش بختی نہیں ہے۔ یہ بچہ، ایک لڑکی ہے'۔ اس کہانتی ہڈی کے تحریر کیے جانے کے تین ہزار سال بعد، کمیونسٹ چین میں 'صرف ایک بچہ' کی پالیسی نافذ کی۔ کئی چینی خاندان آج بھی لڑکی کی پیدائش کو بد شگونی سمجھتے ہیں۔ ایک بچہ پالیسی کے نافذ العمل رہنے کے عرصے کے دوران لاتعداد بچیوں کو پیدائش کے بعد اس امید پر ترک یا قتل کر دیا گیا کہ والدین کو ایک ہی بچے، لیکن لڑکے کی خواہش تھی۔

کئی معاشروں میں عورتوں کو مردوں کی ملکیتی جائیداد اور املاک کی صورت سمجھا جاتا رہا ہے۔ عام طور پر وہ اپنے باپ، شوہر یا بھائی کی ملکیت ہوتی ہیں۔ ان معاشروں کے قانونی نظام میں زنا بالجبر کو صرف اور صرف املاک کو نقصان جیسی خلاف ورزی سے زیادہ کچھ نہیں سمجھا جاتا۔ دوسرے الفاظ میں زنا بالجبر کے نتیجے میں متاثرہ شخص، زیادتی کا نشانہ بننے والی عورت نہیں بلکہ وہ مرد ہوتا ہے جو اس عورت کا مالک ہے۔ اس لحاظ سے، قانونی طور پر تلافی کی شکل یہ ہوتی ہے کہ ملکیت کا تبادلہ کر دیا جائے۔ یعنی، عورت کی عصمت دری کرنے والے پر لازم ہوتا ہے کہ وہ زیادتی بننے والی عورت کے مالک (باپ، بھائی یا شوہر وغیرہ) کو دلہن کی قیمت ادا کرے اور یوں یہ عورت اب عصمت دری کرنے والے کی ملکیت بن جاتی ہے۔ اس ضمن میں تورات کی کتاب استثنٰی فرمان کچھ یوں ہے کہ: '28۔ ہو سکتا ہے کوئی آدمی کسی لڑکی کی عصمت دری کرے جس کی منگنی نہیں ہوئی ہے 29۔ اگر انہیں پکڑا جائے تو وہ لڑکی کے باپ کو چاندی کے 50 سکے دے۔ لازم ہے کہ وہ اسی لڑکی سے شادی کرے، کیونکہ اُس نے اُس کی عصمت دری کی ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ وہ عمر بھر اُسے طلاق نہیں دے سکتا'۔ قدیم زمانے کے عبرانی، اس طرح کے تصفیہ کو عین جائز سمجھتے تھے۔

ایسی عورت کی عصمت دری، جو کسی کی ملکیت نہیں تھی۔۔۔ اسے سرے سے کوئی جرم ہی نہیں سمجھا جاتا تھا۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے سڑک پر پڑے کسی سکے کو کوئی اٹھالے تو اسے چوری نہیں سمجھا جاتا۔ اگر کوئی شوہر اپنی بیوی کی عصمت دری، زبردستی کرتا تو اسے بھی جرم نہیں سمجھا جاتا تھا بلکہ شوہر کے ہاتھوں بیوی کی عصمت دری کا تصور ہی صنعت تضاد، احمقانہ اور متضادبات سمجھی جاتی تھی۔ ایک شوہر

کی اصل خصوصیت ہی یہ قرار پاتی تھی کہ وہ اپنی بیوی کی جنسیت پر پوری طرح مسلط ہو۔ کسی شوہر کے بارے اپنی بیوی کی 'عصمت دری' اتنی ہی غیر منطقی بات سمجھی جاتی تھی جتنی کہ کوئی کہے، 'فلاں شخص نے اپنا ہی بٹوا چوری کر لیا!'۔ یہ سوچ صرف قدیم دور کے مشرق وسطیٰ کے ساتھ جڑی ہوئی نہیں ہے۔ 2006ء تک بھی، دنیا بھر میں ترپیسٹھ ممالک ایسے تھے جہاں شوہر کو اپنی بیوی کی عصمت دری اور زنا بالجبر کے الزامات میں مقدمے کا سامنا نہیں کرنا پڑتا تھا۔ بلکہ جرمنی کے قوانین میں بھی یہ ترمیم 1997ء میں ہوئی جس کے تحت 'ازدواجی عصمت دری اور زیادتی' کو علیحدہ قانونی زمرے کے طور پر متعارف کروایا گیا۔

کیا مردوں اور عورتوں کے بیچ یہ صنفی امتیاز اور تفریق بھی ہندوستان میں ذات اور پات کے نظام یا امریکہ میں نسلی بنیادوں پر قائم نظام کی طرح ہمارے تخیل اور تصور کا شاخسانہ ہے؟ یا یہ ایک قدرتی تقسیم ہے جس کی گہری جڑیں حیاتیات میں پائی جاتی ہیں؟ اگر یہ واقعی ایک قدرتی تقسیم ہے تو پھر کیا اس کی حیاتیاتی، یعنی سائنسی وضاحت بھی ہے کہ آیا، مرد کو عورت پر برتری کیوں دی جاتی ہے؟

معاشرتی، قانونی اور سیاسی عدم مساوات کی بعض صورتوں میں مرد اور عورتوں کی جنس کا حیاتیاتی پہلو بالکل واضح ہے۔ مثال کے طور پر حمل اور زچگی حیاتیاتی طور پر عورتوں کے لیے مخصوص ہے کیونکہ مردوں میں بچہ دانی نہیں ہوتی۔ اس آفاقی اساس کے ارد گرد ہر معاشرے نے تہہ در تہہ تصورات اور رسوم، رواج کی اتنی چادریں چڑھالی ہیں جن کا حیاتیات سے دور دور کا واسطہ بھی نہیں ہے۔ اس ضمن میں سبھی معاشرے مردانگی اور نسوانیت، یعنی تذکیر اور تانیث کے ایسے ایسے اوصاف نکال کر لاتے ہیں کہ جن کی بنیاد میں سائنسی معروضیت خال خال ہی ہوتی ہے۔

مثال کے طور پر پانچویں صدی قبل مسیح میں جمہوری ایتھنز میں، بچہ دانی کے حامل کسی بھی 'فرد' کو قانونی طور پر خود مختاری حاصل نہیں تھی۔ اس کے لیے مقبول عام اسمبلی میں شرکت اور جج بننے کی ممانعت تھی۔ ان 'افراد' میں سے کچھ کو چھوڑ کر باقی سب کو اچھی تعلیم، کاروبار میں شراکت اور فلسفیانہ مباحثوں میں حصہ لینے کی اجازت بھی نہیں تھی۔ اس زمانے کے ایتھنز میں کسی بھی سیاسی رہنما، عظیم فلسفی، مقرر، فن کار اور تاجر کی بچہ دانی نہیں تھی۔ کیا بچہ دانی کا حامل ہونے کا مطلب حیاتیاتی طور پر ان میں سے کسی بھی پیشے کے لیے غیر موزوں ہونا ہے؟ قدیم زمانے کے ایتھنز میں ایسا ہی سمجھا جاتا تھا لیکن آج جدید ایتھنز میں اس کی سخت مخالفت کی جاتی ہے۔ آج کے ایتھنز میں عورتیں ووٹ ڈال سکتی ہیں، کسی بھی سیاسی عہدے پر منتخب ہو سکتی ہیں، تقاریر کر سکتی ہیں، جیولری سے لے کر عمارات اور کمپیوٹر سافٹ وئیر بھی تخلیق کر سکتی ہیں اور یونیورسٹی کی تعلیم بھی حاصل کرتی ہیں۔ ان کی بچہ دانیاں، ایسے کسی بھی کام میں رکاوٹ نہیں بنتیں جو انھیں مردوں کے برابر، اسی پائے کی کامیابی عطا کر سکتا ہے۔ یہ درست ہے کہ سیاست اور معاشی سرگرمیوں میں اب بھی عورتوں کی نمائندگی نسبتاً کم ہے۔۔۔ مثال کے طور پر یونان کی پارلیمان میں صرف بارہ فیصد اراکین عورتیں ہیں لیکن قانونی طور پر سیاست میں حصہ لینے

کے لیے عورتوں پر کوئی بندش نہیں ہے۔ آج جدید یونان کے تقریباً سبھی لوگوں کے لیے عورتوں کا عوامی اور سیاسی عہدہ سنبھالنا بالکل عام بات ہے۔

جہاں یہ، وہیں آج جدید یونانیوں کی اکثریت یہ بھی سمجھتی ہے کہ مردانگی کی اساس یہ ہے کہ ایک مرد جنسی طور پر صرف اور صرف عورتوں کے لیے کشش کا حامل ہو اور جنسی تعلق امتیازی طور پر صرف اور صرف جنس مخالف کے لیے مخصوص خاص ہے۔ وہ اس کو سماجی رجحان نہیں بلکہ حیاتیاتی حقیقت سمجھتے ہیں۔۔۔یعنی یہ کہ مخالف جنس سے تعلق رکھنے والے دو لوگوں کے بیچ تعلق عین فطری ہے جبکہ دو ہم جنس لوگوں کے بیچ یہ تعلق غیر فطری ہے۔ تاہم، حقیقت میں فطرت کو ایک مرد کا دوسرے مرد کی جانب جنسی کشش سے کوئی لینا دینا، تعلق اور واسطہ ہی نہیں ہے۔ یہ ہماری فطرت ماتا کا نہیں بلکہ بعض معاشروں میں انسانی ماؤں کا مسئلہ ہے۔ وہ جب اپنے بیٹے کو کسی دوسرے لڑکے کے ساتھ جنسی طور پر نین مٹکا کرتے دیکھتی ہے تو آپے سے باہر ہو جاتی ہے۔ ایسی صورتحال میں کسی بھی ماں کا قہر اور غضب، کسی بھی طور حیاتیاتی امر کی نشاندہی نہیں ہوتا۔ تاریخ میں انسانی معاشروں کی ایک وسیع تعداد ایسی گزری ہے جہاں ہم جنسی تعلقات عین جائز ہی نہیں بلکہ معاشرے کے لیے تعمیری بھی سمجھے جاتے تھے۔ اس میں سب سے چیدہ مثال قدیم یونانی معاشرہ ہے۔ ایلیڈ یا الیاد نامی قدیم یونانی رزمیہ نظم میں کہیں پر بھی یہ ذکر موجود نہیں ہے کہ تھیس کو اپنے بیٹے آخیل یا اکلیز اور اس کے انتہائی عزیز ساتھی پٹروکولس کے بیچ تعلقات پر کوئی اعتراض رہا تھا۔ مقدونیہ کی ملکہ اولمپاس، قدیم دنیا کی ایک انتہائی متلون مزاج اور مضبوط عورت ہوا کرتی تھی جس کے سر پر اپنے شوہر بادشاہ فلپ کے قتل کی سازش کا الزام بھی تھا۔ اس نے بھی اپنے بیٹے سکندر اعظم اور اس کے عاشق ہفاسٹیون کے بیچ انتہائی قریبی اور رازداری پر مبنی تعلق پر کبھی ناک بھوں نہیں چڑھائی حالانکہ اولمپاس اپنے بیٹے سکندر کے حوالے سے جذباتی طور پر خاصی دخیل واقع ہوئی تھی۔

تو پھر حیاتیات کی بیان کردہ معروضی حقیقتوں کو لوگوں کی حیاتیات سے منسوب مفروضوں سے الگ کیسے کیا جائے؟ اس ضمن میں ایک نہایت سادہ اور بہترین اصول یہ ہے کہ سوچیے، 'حیاتیات تو اختیار دیتی ہے لیکن سماج رکاوٹ ڈالتا ہے'۔ یہ بھی یاد رکھیں کہ حیاتیات ایسا سائنسی شعبہ ہے جو امکانات کا ایسا گھر ہے جس میں بہت ہی زیادہ وسعت ہے۔ یہ سماج ہے جو لوگوں کو بعض امکانات پر عمل کرنے پر مجبور، جبکہ دوسروں سے روک لگا دیتا ہے۔ مثال کے طور پر حیاتیات عورتوں کو بچہ پیدا کرنے کا پورا موقع فراہم کرتی ہے تو بہت سے معاشرے عورتوں کو اس حیاتیاتی امکان کو حقیقت میں ڈھالنے کے لیے پورا پورا لیکن مشروط ساتھ دیتے ہیں۔ اسی طرح حیاتیات مردوں کو ایک دوسرے کے ساتھ جنسی تعلق قائم کرنے کا پورا موقع فراہم کرتی ہے لیکن کئی معاشرے انھیں اس امکان کو حقیقت میں ڈھالنے پر سختی سے بندش لگا دیتے ہیں۔

اس ضمن میں سماج اور معاشروں کی جوابی دلیل یہ ہوتی ہے کہ وہ صرف اس چیز کی ممانعت کرتے ہیں جو غیر فطری ہوتی ہے۔ لیکن حیاتیاتی تناظر میں کوئی بھی چیز غیر فطری نہیں ہوتی۔ اس لحاظ سے جو کچھ، جس طرح بھی ممکن ہو، فطری ہی کہلائے گا۔ یاد رکھیں، ایک واقعی غیر فطری چیز وہ ہوتی ہے، جو قدرت کے اصولوں کے خلاف ہو۔ ایسی چیز جو قدرت کے قوانین کے خلاف ہو، وہ تو وجود ہی نہیں رکھ سکتی اور ایسی چیز کو کسی ممانعت یا روک کی سرے سے ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ مثلاً، آج تک کسی معاشرے نے مردوں کو ضیائی تالیف (پودوں کے لیے مخصوص عمل جس سے سبز پودے شمسی توانائی کو کیمیائی توانائی یا غذائی توانائی میں بدلتے ہیں) سے روکا ہے؟ عورتوں کو روشنی کی رفتار سے تیز دوڑنے پر پابندی لگائی ہے؟ یا دو منفی چارج والے الیکٹرونز کی ایک دوسرے کے لیے کشش کو ممنوع کیا ہے؟

سچ تو یہ ہے کہ ہماری 'فطری اور غیر فطری' نامی طرز فکر حیاتیات سے نہیں بلکہ عیسائی عقائد سے مستعار لی گئی ہے۔ مذہبی عقائد کی رو سے 'فطری' وہ شے ہے، جو 'اس خدا کی منشاء کے عین مطابق ہے جس نے فطرت یا قدرت کو پیدا کیا ہے'، اب عیسائی عالم دین یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ خدا نے انسانی جسم کو پیدا کیا ہے۔ اس جسم میں ہر عضو کا مخصوص کردار وضع کر دیا گیا ہے۔ اگر ہم اپنی ٹانگوں اور دوسرے اعضاء کو خدا کی منشا کے مطابق استعمال کریں گے تو یہ عین فطری ہے۔ لیکن اگر ہم ان اعضاء کو خدا کی منشا کے علاوہ استعمال میں لائیں گے تو یہ غیر فطری بات ہے۔ اب، مزے کی بات یہ ہے کہ ارتقاء کا کوئی مقصد اور نہ ہی کوئی منشا ہوتی ہے۔ اعضاء کسی مقصد یا منشا کے تحت ارتقاء کے عمل سے گزر کر جامد نہیں ہو جاتے بلکہ یہ تو ہر وقت حرکت پیہم، یعنی استعمال کے تناظر میں سیلانی کیفیت میں رہتے ہیں۔ انسانی جسم میں ایک بھی ایسا عضو نہیں ہے، جو آج وہی کردار ادا کر رہا ہو جو وہ لاکھوں سال پہلے پہلی دفعہ ارتقائی عمل سے گزر کر پیدا ہوا تھا۔ اعضاء ارتقائی عمل سے گزرتے ہیں تا کہ وہ مخصوص کردار ادا کر سکیں لیکن جب وہ ایک دفعہ کوئی مقصد پورا کر لیتے ہیں تو وہ دوسرے مقاصد کے لیے بھی استعمال ہو سکتے ہیں۔ یہی دوسرے مقاصد کا امکان، ارتقائی عمل کو جاری رہنے پر مجبور کرتا ہے۔ مثال کے طور پر انسانی منہ کی مثال لیں۔ منہ لاکھوں سال پہلے اس وقت ظاہر ہوا تھا جب کثیر خلیاتی نامیوں کو اپنے جسم میں غذائی اجزاء پہنچانے کے لیے کسی طریقے کی ضرورت تھی۔ ہم آج بھی اپنے منہ کو اس مقصد کے لیے استعمال کرتے ہیں لیکن ہم اپنے منہ کو کئی دوسرے مقاصد جیسے چوم چاٹ، بول چال اور اگر ہم ریمبو ہیں تو پھر ہینڈ گرنیڈ کی تار دانتوں سے کھینچ کر اسے پھاڑنے کے لیے بھی استعمال کرتے ہیں۔ کیا منہ سے کھانا کھانے کے علاوہ یہ سارے استعمال غیر فطری ہیں کیونکہ آج سے ساٹھ کروڑ سال پہلے ہمارے کیڑے نما کثیر خلیاتی اجداد منہ کو ان باقی مقاصد کے لیے استعمال نہیں کرتے تھے؟

اسی طرح، یہ جو پر ہوتے ہیں۔۔۔ یہ یکدم ہی اپنی ہوائی حرکیات کی شان و شوکت کے ساتھ اچانک وجود میں نہیں آئے تھے۔ یہ ان اعضاء سے ارتقاء حاصل کر کے ظاہر ہوئے تھے جو دوسرے مقاصد کے لیے ہوا کرتے تھے۔ ایک نظریے کے مطابق اڑنے والے کیڑوں مکوڑوں کے پر لاکھوں سال پہلے اڑنے کی سکت سے محروم مکوڑوں کے جسم پر باہر کو ابھرے ہوئے گومڑوں سے ارتقاء

حاصل کر کے ظاہر ہوئے تھے۔ وہ کیڑے جن کے جسم پر گومڑ ہوا کرتے تھے، بغیر گومڑ والے کیڑوں کی نسبت جسم پر خالی سطح بڑھ کر ہوتی تھی۔ اس اضافی جسمانی سطح کا فائدہ یہ ہوا کہ ایسے کیڑے مکوڑے زیادہ سے زیادہ سورج کی روشنی جذب کر سکتے تھے اور جسم کو زیادہ گرم رکھتے تھے۔ اب چونکہ یہ کار آمد خد و خال تھے تو نتیجتاً انتہائی سست ارتقائی عمل شروع ہوا اور ان کیڑوں کے جسم پر سطح مزید پھیلتی گئی اور یہ شمسی ہیٹر بھی بڑے ہوتے گئے۔ وہ گومڑ جو کبھی زیادہ سے زیادہ سورج کی روشنی جذب کرنے کے لیے استعمال ہوتے تھے، اب پھیلتے گئے اور وزن میں بھی کم ہو گئے۔ اتفاق سے، یہ پھیلے ہوئے چپٹے گومڑ ان کیڑوں مکوڑوں کو پھدکنے اور کسی حد تک اچھلنے میں بھی مدد دینے لگے۔ وہ کیڑے مکوڑے جن کے یہ 'گومڑ' بڑے تھے، وہ زیادہ پھدکتے اور دور تک اچھل سکتے تھے۔ بعض کیڑوں نے ان چیزوں کو استعمال میں لا کر ڈھلوانوں سے کھسک کر گلائیڈ بھی کرنے لگے۔ بعد اس کے، پروں کو اپنی موجودہ شکل اختیار کرنے میں ایک آخری قدم در کار تھا۔ اب یہ کیڑے مکوڑے، اتنے زبردست پروں کے حامل ہیں کہ وہ ہوا کو چیر کر نہایت خوبی سے اڑ سکتے ہیں۔ اگلی دفعہ، جب کوئی مچھر آپ کے کان میں بھنبھنائے تو آپ بے شک اسے اس 'غیر فطری' عمل اور رویے پر صلواتیں سنا دیں۔ اگر مچھر مہذب اور خدائی منشا کے مطابق اپنے گومڑ سے راضی رہتا تو آج بھی اسے شمسی پینل کے طور پر استعمال کر رہا ہوتا۔

جسم کے دوسرے اعضاء کی طرح ہمارے جنسی اعضاء اور رویے بھی بیک وقت کئی طرح کے کام کرنے کے اہل ہیں۔ جنسی تولید کا عمل پہلی دفعہ افزائش نسل اور نسل بڑھانے کی غرض سے ارتقائی عمل کے نتیجے میں ظاہر ہوا تھا۔ اسی طرح معاشقے، مراسم اور مختلف طور طریقے وغیرہ بہتر سے بہتر ساتھی حاصل کرنے کے امکانات کو بڑھانے کے لیے تخلیق پاتے رہے ہیں۔ لیکن اب بہت سے جانور ان دونوں یعنی جنسی اعضاء اور مراسم و طور طریقوں کو دوسرے سماجی مقاصد کے لیے بھی استعمال کرتے ہیں۔ ان دونوں خصوصیات کا مقصد اب صرف افزائش نسل نہیں رہا۔ مثال کے طور پر بن مانس جنسی تعلقات کو صرف افزائش نسل ہی نہیں بلکہ جتھے میں اتحاد پختہ کرنے، دوسرے بن مانسوں کے بیچ انس اور رغبت پیدا کرنے اور تناؤ میں کمی کے لیے بھی استعمال کرتے ہیں۔ اب آپ کیا کہیے گا، بن مانسوں کا یہ طریق 'غیر فطری' ہے؟

جنس اور صنف

اس تناظر سے دیکھیں تو یہ کہنا کہ عورتوں کا قدرتی کام صرف بچوں کو جنم دینا ہے یا یہ کہ ہم جنس پرستی غیر فطری ہے۔۔۔ یہ بے معنی بات ہے۔ تقریباً سبھی قوانین، دستور، رسوم، رواج، حقوق اور فرائض جو مردانگی اور نسوانیت کو تشکیل دیتے ہیں، حیاتیاتی نہیں بلکہ تخلیاتی پہلوں کو ظاہر کرتے ہیں۔

حیاتیات کی رو سے انسان نر اور مادہ ہوتے ہیں۔ مزید یہ کہ 'خردمند آدمی' نامی نوع انسانی میں نر وہ ہوتا ہے جس جینیاتی مادے میں ایک 'ایکس' اور دوسرا 'وائے' کروموسوم یا لونیہ ہوتا ہے۔ دوسری جانب مادہ وہ ہوتی ہے جس کے جینیاتی مادے میں دونوں ہی 'وائے' کروموسوم یا لونیے ہوتے ہیں۔ یہ 'مرد' اور 'عورت' حیاتیاتی نہیں بلکہ سماج کے دیے ہوئے نام اور زمرے ہیں۔ انسانی معاشروں کی اکثریتی تعداد میں مرد سے مراد نر اور عورت سے مراد مادہ ہی لی جاتی ہے لیکن بات یہ ہے کہ سماجی نام شعائر کی رو سے انتہائی بوجھل اور مفروضوں سے پر ہوتے ہیں۔ سماجی اور حیاتیاتی، غالباً لغوی معنی ایک ہوں لیکن عملی طور پر ان کے بیچ واسطہ انتہائی کم اور بالکل مہین ہوتا ہے۔ خردمند آدمی کی نوع میں ایک 'مرد' صرف مخصوص حیاتیاتی خصوصیات جیسے 'ایکس' اور 'وائے' کروموسوم یا لونیوں، خصیوں کے اعضاء اور بھاری مقدار میں مردانہ ہارمون ٹیسٹوسٹیرون کا حامل ہی نہیں ہوتا۔ بجائے، ایک 'مرد' کے لیے انسانی سماج کے تصوراتی نظام میں ایک مخصوص خلا بھی پر کرنا لازم ہوتا ہے۔ اس کے متعلقہ معاشرے میں مفروضوں اور رائج دستور اور رسوم کے تحت چند مخصوص 'مردانہ' کردار (جیسے سیاست میں حصہ لینا)، حقوق (جیسے ووٹ ڈالنے کا حق) اور فرائض (جیسے فوج میں بھرتی اور جنگ) وغیرہ بھی حوالے ہوتے ہیں۔ اسی طرح خردمند آدمی کی نوع میں ایک 'عورت' صرف حیاتیاتی خصوصیات جیسے دو 'ایکس' کروموسوم یا لونیوں، اندام نہانی، پستانوں بچہ دانی اور بھاری مقدار میں ایسٹروجن نامی زنانہ ہارمون کی حامل نہیں ہوتی۔ بجائے وہ ایک 'عورت' ہونے کے ناطے انسانی سماج کے تصوراتی نظام میں دوسرے عوامل کی بھی ذمہ دار ہوتی ہے۔ اس کا متعلقہ معاشرہ مفروضوں اور رائج دستور اور رسوم و رواج کے تحت چند مخصوص 'نسوانہ' کردار (جیسے بچوں کی دیکھ بھال)، حقوق (جیسے تشدد سے بچاؤ) اور فرائض (جیسے شوہر کی اطاعت گزاری) وغیرہ بھی عطا ہوتے ہیں۔ اب یہ حیاتیات نہیں بلکہ تصورات اور واہمے ہی ہیں جن کی بناء پر مرد اور عورتوں کے کردار، حقوق اور فرائض کا تعین کیا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے ہر معاشرے میں 'مردانگی' اور 'نسوانیت' کے معنی، ایک دوسرے سے کئی کئی لحاظ سے مختلف ہوتے ہیں۔

مادہ = حیاتیاتی زمرہ		عورت = سماجی زمرہ	
قدیم ایتھنز	جدید ایتھنز	قدیم ایتھنز	جدید ایتھنز
دو 'ایکس' کروموسوم	دو 'ایکس' کروموسوم	ووٹ نہیں ڈال سکتی	ووٹ ڈال سکتی ہے
بچہ دانی	بچہ دانی	جج نہیں بن سکتی	جج بن سکتی ہے
بیضے اور بیضے دانی	بیضے اور بیضے دانی	عوامی عہدے پر فائز نہیں ہو سکتی	عوامی عہدے پر فائز ہو سکتی ہے

کم مقدار میں ٹیسٹوسٹیرون	کم مقدار میں ٹیسٹوسٹیرون	اپنی شادی کا فیصلہ خود نہیں کر سکتی	اپنی شادی کا فیصلہ خود کر سکتی ہے
بھاری مقدار میں ایسٹروجن	بھاری مقدار میں ایسٹروجن	عام طور پر ان پڑھ	عام طور پر تعلیم یافتہ
دودھ پیدا کر سکتی ہے	دودھ پیدا کر سکتی ہے	قانونی طور پر باپ یا شوہر کی ملکیت	قانونی طور پر آزاد اور خود مختار
دونوں ایک جیسی ہیں		دونوں انتہائی مختلف ہیں	

22 اٹھارہویں صدی کی مردانگی: فرانس کے شہنشاہ لوئس کا سرکاری پورٹریٹ۔ وگ، جرابیں، اونچی ہیل کے جوتے، رقاصوں سا انداز اور لمبی تلوار پر نظر رکھیے۔ آج کے عصر حاضر میں یورپیوں کے یہاں تلوار کے سوا یہ سب کچھ نسائیت کے زمرے میں شمار کیا جائے گا۔ لیکن شہنشاہ لوئس

23 اکیسویں صدی میں مردانگی: باراک اوبامہ کا سرکاری پورٹریٹ۔ تاریخ بھر میں کبھی بھی مرد اتنے تجھے ہوئے اور سرد نظر نہیں آئے جیسے آج ہیں۔ وہ ہمیشہ ہی بن سنور کر، آرائش جیسے ریڈ انڈین سرداروں کی طرح رنگین پر سر پر سجایا کرتے تھے۔ ہندو مہاراجے ہیرے جواہرات پہن

اسی لیے معاملات کو پیچیدگی سے بچانے کے لیے محققین نے 'جنس' اور 'صنف' کی اصطلاحیں متعارف کروا رکھی ہیں۔ جنس سے مراد حیاتیاتی زمرہ ہے جبکہ صنف سے مراد سماجی یا معاشرتی زمرہ ہے۔ جنس کو نر اور مادہ میں تقسیم کیا گیا ہے۔ یہ تقسیم ان خصوصیات کی بناء پر کی گئی ہے جو معروضی ہیں اور یہ تاریخ بھر میں متواتر اور مستقل رہی ہیں۔ دوسری جانب 'صنف' کے تحت مرد اور عورتوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ (بعض معاشروں میں مرد اور عورت کے علاوہ بھی دوسرے زمرے تسلیم کیے جاتے ہیں)۔ اس لحاظ سے 'مردانہ' اور

'نسوانی' یا 'تذکیر' و 'تانیث' سے مراد وہ بین موضوعی خصوصیات لی جاتی ہیں جو ہر وقت بدلاؤ اور تغیر کی حالت میں رہتی ہیں۔ مثال کے طور پر دور رس تفرقات جیسے قدیم اور جدید دور کے ایتھنز میں عورتوں کے رویوں، خواہشات، لباس اور یہاں تک کہ جسمانی آسن، ڈھب اور انداز بارے عمومی توقعات کو ہم 'نسوانیت' یا بین موضوعی خصوصیات کہتے ہیں۔

جنس تو بچوں کا کھیل ہے لیکن صنف ایک انتہائی سنجیدہ اور گراں معاملہ ہے۔ نر جنس سے تعلق رکھنا دنیا کا آسان ترین کام ہے۔ آپ کو صرف ایک 'ایکس' اور دوسرے 'وائے' کروموسوم یا لونیے کے ساتھ پیدا ہونا پڑتا ہے۔ ایک مادہ ہونے کے لیے دو 'ایکس' کروموسوم چاہیے ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس، ایک مرد یا عورت بننا کافی پیچیدہ اور محنت طلب کام ہے۔ اب چونکہ تقریباً سبھی مردانہ اور نسوانی خصوصیات حیاتیاتی نہیں بلکہ سماجی ہوتی ہیں تو کوئی بھی معاشرہ بس یونہی بیٹھے بٹھائے کسی نر کو مرد اور کسی مادہ کو عورت کا تاج نہیں پہناتا۔ علاوہ ازیں، ایسا بھی نہیں ہے کہ ایک دفعہ یہ 'خطاب' مل جائے تو وہ بات ختم ہو جاتی ہے بلکہ ذمہ داری دگنی اور چوگنی ہو جاتی ہے۔ نر کو اپنی مردانگی پوری زندگی۔۔۔ ماں کی گود سے لے کر گور تک ریت اور رسم کے تحت کارکردگی کی صورت ثابت کرنی پڑتی ہے۔ دوسری جانب عورتوں کے لیے مشقت اور بیگار ختم ہونے میں نہیں آتی۔ ایک مادہ کو مرتے دم تک خود کو عورت ثابت کرنے کے لیے نسوانیت کا ڈھول پیٹنا ہی پڑتا ہے۔

اس ضمن میں کامیابی کی کوئی ضمانت بھی نہیں ہے۔ بالخصوص 'نر' کے لیے تو ہمیشہ ہی مردانگی خطرے میں گھری رہتی ہے۔۔۔ اور اسے اسی خوف اور اندیشے میں بسر رکھنی پڑتی ہے۔ تاریخ بھر میں یہ ثابت ہے کہ 'نر' اپنی زندگی کو خطرے میں ڈال کر بلکہ۔۔۔ اکثر نے تو اپنی زندگی کی قربانی تک دے دی۔ ان کی زندگی بھر کی اس مشقت، قربانی اور خطرات سے کھیلنے کا صرف ایک مقصد تھا کہ لوگ اس کے بارے کہا کریں، 'یہ نر۔۔۔ اصل مرد کا بچہ ہے!'۔

مردوں میں کیا خاص بات ہے؟

کم از کم زرعی انقلاب برپا ہونے کے بعد سے آج تک، انسانی معاشروں میں ہمیشہ پدرشاہی ہی دیکھی گئی ہے۔ پچھلے دس، بارہ ہزار سال سے مردوں کو عورتوں پر فوقیت حاصل رہی ہے۔ اس امر سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ کوئی بھی معاشرہ کسی 'مرد' اور 'عورت' کے بیچ کس طرح کی حد قائم کرتا ہے لیکن مرد ہونا، بہتر ہی سمجھا گیا ہے۔ پدرشاہی معاشروں میں مردوں کو 'مردانگی' جبکہ عورتوں کو 'نسوانیت' کی تعلیم دی جاتی ہے اور ہر وہ شخص، مرد یا عورت۔۔۔ اگر اس حد کو توڑنے کی کوشش کرے، اسے سخت سزا ملتی ہے۔

اس کے باوجود، پدرشاہی معاشرے انھیں بھی نہیں بخشتے جو ان معاشروں کی اقدار، رسوم اور دستور کی تعمیل کرتے ہیں۔ وہ بھی بچ کر نہیں رہتے۔ وہ خصوصیات جو 'مردانہ' ہیں، بہرحال پھر بھی 'نسوانی' خصوصیات سے برتر ہی سمجھی جاتی ہیں۔ معاشرے کے وہ افراد جو

'نسوانی' خصوصیات کو مثالی سمجھیں یا ان پر عمل پیرا ہوں۔۔۔ انھیں مردانہ خصوصیات کی مثال بننے والوں سے کم ہی درجہ ملتا ہے۔ اس تفریق کا سب سے پہلے، عورتیں ہی شکار بنتی ہیں۔ مثال کے طور پر پدرشاہی معاشروں میں عورتوں کی تعلیم اور صحت پر کم وسائل خرچ کیے جاتے ہیں۔ عورتوں کے لیے معاشی مواقع مردوں کی نسبت کم ہوتے ہیں، سیاسی طاقت میں روک لگتی ہے اور نقل وحرکت محدود رہتی ہے۔ صنف ایک ایسی دوڑ ہے جس میں بعض، بلکہ کہیے دوڑ میں حصہ لینے والے آدھے کھلاڑی۔۔۔ کانسی کے تمغے کے لیے ہی دوڑتے ہیں۔ وہ سونے کے تمغے کے لیے اہل ہی نہیں سمجھے جاتے۔

یہ درست ہے کہ تاریخ میں کئی عورتوں نے بھی برتر مقام پایا ہے۔ ان میں مصر کی قلوپطرہ، چین کی ملکہ زتیان اور انگلینڈ کی ملکہ الزبتھ اول وغیرہ شامل ہیں۔ یہ سب مثالیں، بہر طور پدرشاہی معاشرے کے اصولوں میں استثنائی قرار دی جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر ملکہ الزبتھ اول کے دور میں پارلیمان کے سبھی اراکین، پادری، انتظامیہ کے حکام، فوجی جرنیل، سپاہی، جج، وکلاء، مذہبی علوم کے ماہرین، ڈاکٹر، سرجن، طلباء، پروفیسر۔۔۔ سبھی مرد تھے۔ ملکہ الزبتھ اول کے دور میں تقریباً سبھی ادیب، شاعر، عمار، فلسفی، مصور، موسیقار اور سائنسدان بھی مرد تھے۔

پدرشاہی، تقریباً سبھی زرعی اور صنعتی معاشروں کا عام دستور رہا ہے۔ پدرشاہی ایسا راسخ تصور ہے کہ جس نے تاریخ میں ہر طرح کے سیاسی انقلاب، سماجی اتھل پتھل اور معاشی کایا پلٹ کے دوران بھی اپنے قدم انتہائی سختی کے ساتھ، مستحکم رہ کر جمائے رکھے ہیں۔ مصر کی ہی مثال لے لیں۔ آشوری، فارسی، مقدونی، رومی، عرب، مملوک، ترک اور پھر انگریزوں نے اس دھرتی کو فتح کیا۔۔۔ اس دیس نے کس کس طرح کے تصورات اور نظریات کا منہ دیکھا لیکن اس کے باوجود مصری معاشرہ ہمیشہ ہی پدرشاہی معاشرہ رہا۔ مصر میں فرعونی، یونانی، اسلامی، عثمانی اور انگریزی دستور اور قوانین رائج رہے۔۔۔ یہ سبھی دستور اور قوانین کے مجموعے، انتہائی مضبوط ہونے کے باوجود 'مردانگی' کا کچھ نہیں بگاڑ سکے۔ یہ سبھی قوانین ان کے لیے امتیازی نظر رکھنے پر مجبور رہے، جو 'اصل مرد' نہیں تھے۔

اب چونکہ پدرشاہی ایسی 'آفاقی' شے ہے تو یہ جان لینا چاہیے کہ یہ کسی شیطانی چکر کا نتیجہ نہیں ہے۔ مراد یہ ہے کہ پدرشاہی تاریخی حالات اور واقعات کا نتیجہ یا کوئی حادثاتی معاملہ نہیں ہے۔ اس ضمن میں بالخصوص یاد رکھا جانا چاہیے کہ پدرشاہی 1492ء سے پہلے بھی وجود رکھتی تھی۔ اس وقت بھی امریکہ اور افریشیائی خطے میں تقریباً سبھی معاشرے پدرشاہی ہی تھے حالانکہ یہ دونوں خطوں کو انسان کی معاشرتی صورتوں میں الگ ہوئے دسیوں ہزار سال بیت چکے تھے۔ اگر افریشیائی خطے میں پدرشاہی کسی تاریخی حادثے یا حالات واقعات کا نتیجہ ہے تو پھر امریکہ کے قدیم ازٹیک اور انکا معاشرے کیوں پدرشاہی تھے؟ یہ عین ممکن ہے کہ معاشروں میں 'مرد' اور 'عورت' کی تعریف میں کچھ نہ کچھ فرق ہوتا ہی ہے لیکن بہر حال اس ضمن میں کوئی نہ کوئی آفاقی اور حیاتیاتی وجہ تو ضرور ہی ہے کہ سبھی انسانی معاشرے 'مردانگی' کو 'نسوانیت' پر ترجیح دیتے ہیں۔ اس کی وجہ ہمیں معلوم نہیں ہے۔ اس بارے کئی نظریات پائے جاتے ہیں لیکن ان میں سے کوئی بھی نظریہ تسلی بخش اور مسلم نہیں ہے۔

زور بازو

اس بارے سب سے عام نظریے میں اس امر کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے کہ مرد، عورتوں سے زیادہ مضبوط ہوتے ہیں اور یہ کہ مردوں نے اپنی بھرپور جسمانی طاقت کی مدد سے عورتوں کو اطاعت اور فرمانبرداری پر مجبور کر دیا ہے۔ یہی دلیل، انتہائی تدبیر سے کچھ یوں پیش کی جاتی ہے کہ مردوں نے اپنے زور بازو، جسمانی طاقت کی بناء پر ایسے امور کو سنبھال لیا ہے جس کے لیے طاقت اور زور کی ضرورت ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر ہل چلانا اور فصل کی کٹائی وغیرہ جیسے کام ہوتے ہیں۔ ان امور کو سنبھالنے کا نتیجہ یہ ہے کہ مرد کو خوراک کی پیداوار پر کنٹرول مل گیا جو اس کے لیے آگے چل کر اس کی سیاسی طاقت کا اہم عنصر بن گیا۔
اب، زور بازو کے اس نظریے کے ساتھ دو مسئلے ہیں۔ پہلا مسئلہ تو یہ ہے کہ اگر ہم مان لیں کہ مرد، عورتوں کی نسبت مضبوط ہوتے ہیں۔۔۔ تو یہ ایک انتہائی سطحی بات ہے اور یہ مضبوطی بھی بس کچھ ہی طرح سے ہے۔ عموماً جسمانی لحاظ سے عورتوں میں مردوں کے مقابلے بھوک، بیماری اور تھکن کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت زیادہ ہوتی ہے۔ کئی ایسی عورتیں بھی ہیں جو مردوں کے مقابلے میں تیز تر دوڑ سکتی ہیں اور بھاری وزن بھی اٹھا سکتی ہیں۔ مزید براں، اس نظریے کے ساتھ سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ تاریخ بھر میں عورتوں کو ان امور اور فرائض منصبی سے بھی دور رکھا گیا ہے کہ جن کاموں کے لیے جسمانی زور اور طاقت کی بہت ہی کم، بلکہ نہ ہونے کے برابر ضرورت ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر تاریخ بھر میں عورتیں پادری، وکیل یا سیاستدان نہیں بن سکتی تھیں۔ بجائے، عورتوں کو سخت مشقت اور مزدوری کے کاموں جیسے کھیتی باڑی، دستکاری اور گھریلو کام کاج میں پیش پیش رکھا گیا ہے۔ اگر سماجی طاقت کا جسمانی طاقت یا سکت اور زور بازو سے کوئی راست تعلق ہوتا تو یقیناً آج عورتیں، مردوں سے کہیں آگے۔۔۔ بلکہ بہت آگے ہوتیں۔
اس سے بھی زیادہ اہم یہ ہے کہ جسمانی طاقت اور صنفی تو چھوڑو، انسانوں کے بیچ کوئی براہ راست تعلق نہیں ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ساٹھ سال کے کمزور بزرگ افراد، بیس سال کے کڑیل جوانوں پر اپنی سماجی قوت کا بھرپور استعمال کرتے ہیں۔ اسی طرح مثلاً انیسویں صدی کے وسط میں، الباما کی ریاست میں کسی شجر کاری کا مالک جسمانی طور پر اتنا طاقتور نہیں رہا ہو گا کہ وہ اپنے کپاس کے کھیتوں میں دن بھر مشقت کرنے والے مضبوط جسم کے مالک افریقی غلاموں میں سے کسی کے ساتھ کشتی لڑتا اور وہ اسے سیکنڈوں کے اندر چت نہ کر دیتا۔ تاریخ میں کبھی بھی مصر کے فرعونوں اور کلیساؤں کے پادریوں کے لیے باکسنگ کے مقابلے منعقد نہیں ہوئے۔ قدیم تاختی معاشروں میں بھی کسی بھی شخص کی سیاسی برتری کا انحصار اس کی جسمانی طاقت اور زور بازو پر نہیں بلکہ سماجی استعداد اور تعلقات پر ہوا کرتا تھا۔ منظم جرائم کی دنیا میں بھی عام طور پر مافیا کا سرغنہ ضروری طور پر کوئی مضبوط جوان شخص نہیں ہوتا۔ عام طور پر یہ ادھیڑ عمر کا کوئی کمزور شخص ہی ہوتا ہے، جو خود مکے نہیں چلاتا بلکہ جوان، کڑیل اور مضبوط کارندوں سے مار دھاڑ کا کام لیتا ہے۔ اگر اس مافیا کے سربراہ کا کوئی مشٹنڈہ یہ سمجھتا

ہے کہ وہ ڈان کو مار پیٹ کر، راستے سے ہٹا کر خود مافیا سنبھال لے گا۔۔۔ اسے اپنی غلطی سدھارنے کے لیے جینے کا دوسرا موقع نہیں ملتا۔ انسان تو چھوڑ، بن مانسوں میں بھی جتھے کا سربراہ نر اپنی یہ حیثیت جسمانی طاقت نہیں بلکہ دوسرے نر اور مادہ بن مانسوں کے ساتھ تعلق داری کے زریعے حاصل کرتا ہے۔ اس میں غیر ضروری اور احمقانہ تشدد کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔

حقیقت تو یہ ہے کہ انسانی تاریخ جسمانی مضبوطی اور سماجی طاقت کے بیچ الٹی اور معکوس تعلق کا پتہ دیتی ہے۔ تقریباً سبھی معاشروں میں ہمیشہ سے ہی نچلے درجے کے طبقات ہی مشقت کے کام میں جھونکے گئے ہیں۔ اس امر سے آدمی کی خوراکی زنجیر میں اصل حیثیت کا بھی پتہ چلتا ہے۔ اگر صرف جسمانی مضبوطی اور صلاحیتوں پر ہی منحصر ہوتا تو آدمی ہمیشہ ہی خوراک کی زنجیر میں کہیں وسط میں پڑا رہتا۔ لیکن یہ آدمی کی دماغی اور سماجی صلاحیتیں ہی تھیں، جس نے اسے اس زنجیر میں سب سے اوپر لا کر بٹھا دیا۔ اس لحاظ سے یہ عین قدرتی اور معروضی، ثابت شدہ حقیقت ہے کہ صرف آدمی ہی نہیں بلکہ ہر طرح کے جانداروں کی انواع کے لیے طاقت کی سیڑھی پر چڑھنے کے لیے جسمانی سے زیادہ دماغی اور سماجی اہلیت اہم ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے یہ ماننا بھی مشکل ہے کہ تاریخ انسانی میں آدمی کے یہاں، مردوں نے عورتوں پر صرف جسمانی قوت اور اہلیت کی بنیاد پر جبر سے برتری حاصل کر رکھی ہے۔

سماج کا کچرا

اس ضمن میں دوسرا نظریہ یہ ہے کہ مردوں کا یہ غلبہ جسمانی طاقت نہیں بلکہ جارحیت کا نتیجہ ہے۔ لاکھوں سال کے ارتقائی عمل نے مردوں کو عورتوں کے مقابلے میں زیادہ تندی اور جارحیت کے قابل بنا دیا ہے۔ عورتیں نفرت، لالچ اور دشنام میں مردوں جتنی ہی اہل ہیں لیکن جب دھکم پیل اور کسی معاملے کو سر کانے کا معاملہ آتا ہے تو اس نظریے کے مطابق، مرد عورتوں کے مقابلے میں جسمانی تشدد اور تندی پر زیادہ مائل ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ بھر میں جنگجوئی اور لڑائی جھگڑا، معاملات کو آگے بڑھانے میں مردانگی کو زیادہ استحقاق اور اختیار حاصل رہا ہے۔

اب چونکہ جنگ و جدل میں فوجوں کی کمان اور صلاحیت مردوں کے ہاتھ رہی ہے، اسی وجہ سے وہ انسانی معاشرے میں برتر بھی ثبت ہوئے۔ انھوں نے انسانی معاشرے پر اس کنٹرول کو نت نئی جنگیں لڑنے کے لیے استعمال کیا اور جوں جوں جنگیں بڑھتی گئیں۔۔۔ معاشروں پر مردوں کا غلبہ بھی پختہ ہوتا گیا۔ چنانچہ، ایک چکر چل پڑا۔ یہ ایسا چکر ہے جو آج ہر طرف جنگوں اور تقریباً ہر معاشرے میں پدرشاہی کے تسلط کی وضاحت بھی کرتی ہے۔

حالیہ برسوں میں کی گئی تحقیق بھی مردوں اور عورتوں بارے اس تصور کو شہ دیتی ہے کہ مرد، عورتوں کی نسبت زیادہ تند اور شدت کا رجحان رکھتے ہیں۔ اسی لیے، اوسطاً فوج میں بہتر سپاہی کے طور پر خدمات سرانجام دے سکتے ہیں۔ ہم چونکہ یہ جانتے ہیں کہ عموماً افواج میں

لڑائی لڑنے والے سبھی سپاہی مرد ہوتے ہیں۔ چلو، درست ہے اور ایسا مان بھی لیتے ہیں۔ لیکن کیا اس نظریے کے لحاظ سے یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ وہ جو جنگیں لڑاتے ہیں اور اس کے نتیجے میں ملنے والے نفع سے فائدہ اٹھانے والے بھی لازماً مرد ہی ہوں گے؟ یہ احمقانہ منطق ہے۔ یہ ایسے ہی ہے کہ جیسے مثال کے طور پر کہا جائے کہ چونکہ شجر کاریوں میں کپاس کی فصل اگانے کی مشقت پر مامور سبھی غلام افریقی سیاہ فام تھے تو یہ لازم ہے کہ شجر کاریوں کے مالکان بھی سیاہ فام افریقی ہی ہوں گے۔ جیسے، شجر کاریوں میں سیاہ فام افریقی غلاموں کی افرادی قوت کو سیاہ فام مالکان کے بند وبست میں چلایا جا سکتا ہے تو پھر مردوں پر مشتمل افواج کی کمان عورت، یا عورتوں کی نمائندہ یا عورتوں کی کابینہ پر مشتمل حکومت کیوں نہیں سنبھال سکتی؟ حقیقت تو یہ ہے کہ تاریخ میں بہت ہی زیادہ معاشرے ایسے گزرے ہیں جن میں افواج کی کمان پر مامور بڑے عہدوں پر پہنچنے والے حکام فوجی جوان یا سپاہی سے ترقی کر کے نہیں پہنچے۔ اشرافیہ، امراء اور تعلیم یافتہ افراد کے لیے شروع سے ہی علیحدہ افسرانہ رینک طے ہوتی ہے، ان کی بھرتی بھی اس علیحدہ نظام میں ہوتی ہے۔ وہ صحیح معنوں میں ایک دن بھی عام سپاہیوں کی رینک میں نہیں گزارتے۔

نپولین کو شکست دینے والا 'ڈیوک آف ویلنگٹن'، جب اٹھارہ برس کی عمر میں برطانوی فوج میں بھرتی ہوا تو اس کی تشکیل شروع دن سے ہی آفیسر رینک میں ہوئی تھی۔ وہ کمشن کے ذریعے افسر بن گیا تھا۔ وہ اپنی کمان میں عام فوجیوں کے بارے کچھ اچھی رائے نہیں رکھتا تھا۔ وہ اپنے ایک دوسرے امیر کبیر دوست کو فرانس کے خلاف جنگوں کے دوران لکھے ایک خط میں تحریر کرتا ہے، 'ہماری سروس میں پورے سماج کا کچرا۔۔۔عام سپاہیوں کی صورت میں جمع ہے'۔ برطانوی افواج میں عام سپاہیوں کی بھرتیاں غریب ترین طبقات اور نسلی طور پر اقلیتوں (مثلاً آئرش کیتھولک) سے کی جاتی تھیں۔ ان عام سپاہیوں کا فوج کی افسر رینکوں تک ترقی پانے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ افسروں کی رینک صرف شہزادوں، بادشاہوں، جاگیرداروں اور رئیسوں کے لیے مختص تھیں۔ یہ تفریق تو اپنی جگہ ہے اور اس نظریے کے تحت سمجھ بھی آتا ہے۔۔۔لیکن اصل سوال یہ ہے کہ یہ افسرانہ رینک شہزادیوں اور جاگیردار عورتوں کے لیے کیوں نہیں تھیں؟

چین میں افواج کی کمان سول بیوروکریسی کے ہاتھ میں رہنے کی طویل تاریخی روایت چلی آ رہی ہے۔ ماندرین بولنے والی وہ چینی منتری اور اشرافیہ جنگیں لڑاتی چلی آ رہی ہے جنھوں نے زندگی میں کبھی تلوار اور بندوق کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ ایک بہت پرانی چینی ضرب المثل ہے کہ، 'آپ قیمتی لوہے کو کیلیں بنانے کے لیے ضائع نہیں کر سکتے۔۔۔'اس کا اصل مطلب یہ ہے کہ اہل لوگ سول بیوروکریسی میں جگہ بناتے ہیں، فوج میں بھرتی نہیں ہوتے۔ لیکن یہاں بھی سوال وہی ہے کہ سول بیوروکریسی میں صرف ماندرین بولنے والے مرد ہی کیوں جگہ بناتے تھے۔۔۔ماندرین بولنے والی عورتیں کہاں تھیں؟

اس ضمن میں یہ دلیل تو ہر گز کار گر نہیں ہے کہ چونکہ عورتیں جسمانی طور پر کمزور یا ٹیسٹوسٹیرون نامی ہارمون کی کمی کی وجہ سے فوجی جرنیل، ماندرین بیوروکریٹ اور سیاستدان بننے کی اہل نہیں تھیں۔ یہ درست ہے کہ جنگ لڑانے کے لیے آپ کو سکت اور اعصابی مضبوطی کی ضرورت ہوتی ہے لیکن کسی بھی طرح سے جسمانی طاقت اور تندی کی قطعاً کوئی حاجت نہیں ہوتی۔ جنگیں، ٹھیلوں اور بازاروں کا جھگڑا نہیں ہوتا۔ یہ انتہائی پیچیدہ کام ہے جس کے لیے غیر معمولی تنظیم، تعاون، اشتراک اور اطمینان کی ضرورت ہوتی ہے۔ اندرون ملک امن قائم رکھنے کے لیے بیرون ملک اتحادیوں کے ساتھ جوڑ توڑ کرنی پڑتی ہے، دوسرے لوگوں بالخصوص دشمن کا ذہن پڑھنا پڑتا ہے۔۔۔ تبھی جا کر فتح ملتی ہے۔ اسی لیے ایک تند و تیز، طیش سے بھرے شخص کے ہاتھ جنگ کی کمان دینا بیوقوفی ہی ہوتی ہے۔ اس معاملے میں سب سے بہتر شخص وہ ہے، جو پر سکون رہنا جانتا ہو، تعاون اور اشتراک پر یقین رکھتا ہو اور معاملات کو ایک مختلف لیکن موثر انداز میں دیکھنے اور ان پر عمل در آمد۔۔۔ اثر انداز ہونے کی اہلیت رکھتا ہو۔ فوجی مشق میں کورے، شہنشاہ آگسٹس کی کھڑی کی ہوئی عالیشان سلطنت سیزر اور سکندر اعظم دونوں کو کھا گئی۔ کیوں؟ سیزر اور سکندر اعظم۔۔۔ صرف بہترین جرنیل تھے اور کچھ نہیں تھے۔ آگسٹس کے ہم عصر اور آج جدید تاریخ دان بھی اس کی کامیابیوں کا سہرا اس کی معافی، در گزر، مفاہمت اور نرمی جیسی جوہر صفات کو قرار دیتے ہیں۔

عورتوں کے بارے یہ تصور عام ہے کہ وہ مردوں کے مقابلے میں زیادہ طمانیت اور اثر انداز ہونے کی اہلیت سے مالا مال ہوتی ہیں۔ عورتوں کا نکتہ نظر اور معاملات کو مختلف انداز میں دیکھنے کی اہلیت بھی کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے۔ اگر عورتوں کے بارے ان تصورات میں رتی بھر بھی سچائی ہے تو پھر عورتیں کہیں بہتر سیاستدان اور سلاطین ثابت ہو سکتی ہیں۔ وہ خود یہ منصب سنبھال لیں اور سارا مشقت اور جفا کشی کا کام ٹیسٹوسٹیرون کے ہاتھوں تند خو لیکن سادہ دماغ اور جسمانی طور پر مضبوط مردوں کے حوالے کر دیا جائے۔ اس ضمن میں مشہور اساطیر تو بہت مل جاتی ہیں لیکن حقیقی دنیا میں ایسا کبھی نہیں ہوا۔ ہم یہ نہیں جانتے کہ آخر ایسا کیوں نہیں ہوا؟

کیا پدرشاہی موروثی ہے؟

اس ضمن میں تیسری حیاتیاتی وضاحت کا نظریہ جسمانی طاقت اور نہ ہی تندی و طیش کو خاطر میں لاتا ہے۔ بلکہ یہ نظریہ بتاتا ہے کہ دراصل مردوں اور عورتوں نے برابر ہی جنم لیا تھا لیکن پھر لاکھوں سال کے ارتقائی عمل میں مرد اپنے اور عورتیں اپنے راستے پر چل پڑیں۔ یہ مختلف راستے چننے کی اصل وجہ مردوں اور عورتوں کے بیچ بقا اور افزائش نسل کی جداگانہ ضروریات رہی ہیں۔ ہوتا یوں تھا کہ مرد حضرات کسی زرخیز عورت کے سر پر، اس کا حمل ٹھہرانے کے لیے ایک دوسرے کا بھرپور مقابلہ کرتے تھے۔ ہر شخص کی افزائش نسل کا سارا دارومدار دوسرے مردوں کو نیچا دکھا کر عورتوں کی خوشنودی حاصل کرنے میں رہا کرتا تھا۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، اگلی نسلوں میں صرف اور صرف مردانگی سے پر، خوب حوصلہ مند، تند خو اور مقابلے کے اہل موروثے یا نسب ہی آگے آئے۔

دوسری جانب کسی عورت کے لیے جنسی تعلق قائم کرنے اور حمل ٹھہرانے کے لیے مرد کی تلاش یا خوشنودی کبھی کوئی مسئلہ نہیں رہی۔ تاہم، اس افزائش نسل کے عمل میں عورت کے لیے اصل مشقت تو اس وقت شروع ہوتی تھی جب اسے بچے کو نو ماہ تک اپنے پیٹ میں پالنا پڑتا تھا اور پھر جب بچہ جنم لے لیتا تو اگلے کئی برسوں تک اس کی پرورش اور دیکھ بھال کرنی پڑتی تھی۔ اس سارے عرصے کے دوران عورت کی نقل و حرکت اور بچوں کی ذمہ داری کے سبب محدود ہو کر رہ جاتی تھی۔ اسے کے لیے خوراک حاصل کرنے کے مواقع بہت کم ہو جاتے تھے، اسی لیے اسے مدد کی ضرورت پڑتی تھی۔ اسے مرد کی ضرورت ہوتی تھی۔ چنانچہ اپنی اور بچوں کی بقا کی غرض سے، عورتوں کو بہ امر مجبوری ان حالات کے ساتھ گزارا کرنا پڑتا تھا جو مرد اس کے لیے پیدا کرتے تھے۔۔۔ اسے سمجھوتا کرنا ہی پڑتا تھا تا کہ مرد اس کے ساتھ بسر کرتا رہے اور اس کا بوجھ اٹھانے میں اس کی مدد ہوتی رہے۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، عورتوں میں 'نسوانیت' کے موروثے غالب آتے گئے اور اب وہ اطاعت شعار، تسلیم خو اور نگہبان بن کر رہ گئیں۔ وہ عورتیں جو کبھی مردوں کے شانہ بشانہ، برابری کی سطح پر طاقت اور اختیار کی لڑائی لڑنے کی اہل تھیں۔۔۔ ان کے موروثے، اگلی نسلوں میں منتقل ہی نہیں ہوئے۔

یہ نظریہ مزید بتاتا ہے کہ بقا کی انھی مختلف حکمت عملیوں کا نتیجہ ہے کہ مرد رفتہ رفتہ اولعزم اور ہم سر ہو گئے۔۔۔ اسی لیے سیاست اور کاروبار میں خوب چمکے جبکہ عورتیں چونکہ اطاعت شعاری، تسلیم خوئی پر اتر آئی تھیں تو ان کے حصے میں گھرداری اور بچوں کی دیکھ بھال، پرورش کے گھریلو کام آئے۔ وہ اس میں خوب مشاق ہو گئیں۔

لیکن سوچنے کی اس طرز، اس نظریے کے ساتھ بھی مسئلہ یہ ہے کہ عملی طور پر اس کا تاثر بناوٹی معلوم ہوتا ہے۔ بالخصوص یہ تصور تو بے حد ہی کھوٹا ہے کہ عورتوں کا انحصار دوسروں کی مدد پر رہا کرتا تھا اور کیا یہ مدد عورتوں کو صرف مردوں سے ہی مل سکتی تھی؟ عورتیں، دوسری عورتوں پر بھی تو انحصار کر سکتی تھیں بلکہ آج بھی کرتی ہی ہیں۔۔۔ اور یہ کہ مردوں کے یہاں مقابلے کا رجحان انھیں سماجی طور پر غالب بنا دیتا ہے؟ یہ خاصی کوری سوچ ہے۔ دوسرے جانوروں میں کئی انواع، جیسے ہاتھیوں اور بونوبو بن مانسوں کے یہاں بھی مادہ، دوسروں پر انحصار کرتی ہے اور ان کا پالا بھی مقابلے پر اترے ہوئے تند خو نروں کے ساتھ رہتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود، ان جانوروں میں مادر سری یا مادر شاہی پائی جاتی ہے۔ ان جانوروں میں اب چونکہ مادہ کو بیرونی مدد کی ضرورت پڑتی ہے تو وہ اس مقصد کے لیے اپنی سماجی صلاحیتوں کو استعمال میں لا کر تعاون اور اطمینان کو پاتی ہیں۔ ہتھنیاں اور مادہ بونوبو بن مانس آپس میں ایسا گہرا تعلق بناتی ہیں کہ کئی کئی مادین، جتھے کے ایک ایک بچے کو مل کر پالتی ہیں۔ ان جتھوں کے نر، ان ذمہ داریوں سے آزاد ایک دوسرے سے لڑتے بھڑتے، مقابلہ کر کے وقت گزارتے ہیں۔ ان کے بیچ سماجی صلاحیتیں اور تعلق ناپید ہوتا ہے۔ بونوبو بن مانسوں اور ہاتھیوں کے یہاں جتھوں کا سماجی کنٹرول ہتھنیوں اور مادہ بونوبو بن مانسوں کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ وہ جتھوں کو اپنے بے مثال اشتراک، تعاون اور گٹھ جوڑ کی مدد سے چلاتی ہیں جبکہ تعاون نہ کرنے والے خود غرض اور بے دید ہاتھیوں اور نر بونوبو بن مانسوں کو دیوار سے لگا دیا جاتا ہے۔ بونوبو بن مانسوں کے یہاں

بالخصوص، اگرچہ مادہ بونوبو، کسی بھی اوسط نر کے مقابلے میں جسمانی طور پر انتہائی کمزور ہوتی ہے لیکن پھر بھی جب موقع آتا ہے تو مادہ بونوبو اکٹھی ہو کر ان نروں کی خوب چھینٹی لگاتی ہیں جو ان کی حدود سے نکل کر پھدکنے کی کوشش کرتا ہے۔

اگر ایسا ہاتھیوں اور بونوبو بن مانسوں کے یہاں ممکن ہے تو پھر آدمی کے یہاں کیوں نہیں؟ آدمی نسبتاً ایک کمزور جانور ہے جس کو صرف یہ امتیاز حاصل ہے کہ وہ بڑی تعداد میں اکٹھے ہو کر تعاون اور اشتراک قائم کر سکتا ہے۔ اب اگر ایسا ہی ہے تو پھر بیرونی مدد پر انحصار کرنے والی عورتوں سے بھی تو یہ توقع رکھی جا سکتی ہے کہ ان کا بھلے دارومدار مردوں پر ہو۔۔۔ وہ بھی تو مل جل کر مردوں کی نسبت برتر سماجی صلاحیتوں کو استعمال میں لا کر ایسا اشتراک قائم کر سکتی ہیں جس کی مدد سے وہ تند خو، خود مختار اور بے دید مردوں کو چھٹی کا دودھ یاد دلا دیں؟ اب یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک ایسی نوع جس کی خاصیت اور کامیابی کی ضمانت ہی اس کی تعاون اور اشتراک کی قابلیت پر ہے۔ اس نوع کے بعض افراد (مرد) جو کہ نسبتاً اشتراک اور تعاون کے کم اہل ہیں، ان افراد (عورتوں) پر حاکمیت اور غلبہ پا لیتے ہیں جن کے بارے خیال ہے کہ وہ ان خصوصیات میں کہیں برتر ہیں؟ اس ضمن میں، آج کی تاریخ میں ہمارے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں ہے۔ یہ عین ممکن ہے کہ عام طور پر پائے جانے والے یہ تصورات ہی غلط ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انسانوں میں آدمی کی نوع میں یہ معاملہ جسمانی طاقت، تند خوئی اور مقابلے کے رجحان کا نہیں بلکہ یہ برتر سماجی صلاحیتوں کا کھیل ہے؟ کیا خبر، مرد واقعی عورتوں سے اس معاملے میں آگے ہوں؟ ہم تسلی سے کچھ نہیں کہہ سکتے۔۔۔ ہم اس بارے نہیں جانتے۔

تاہم، ہمیں یہ ضرور پتہ ہے کہ حالیہ تاریخ میں۔۔۔ بالخصوص پچھلی صدی کے دوران صنفی کرداروں میں بے پناہ تبدیلی دیکھی گئی ہے، بلکہ کہیے ایک انقلاب آ گیا ہے۔ آج دنیا بھر کے زیادہ سے زیادہ معاشروں میں مردوں اور عورتوں کو قانونی طور پر مساوی حقوق حاصل ہیں۔ سیاسی حقوق بھی مل گئے ہیں۔۔۔ عورتوں کے لیے برابری کی سطح پر معاشی مواقع بھی پیدا کیے جا رہے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ آج کئی معاشرے انتہائی سنجیدگی کے ساتھ صنف اور جنسیت بارے اپنے تصورات اور طرز فکر میں بھی تبدیلی لا رہے ہیں۔

آج بھی دنیا بھر میں صنفی امتیاز اور تفریق بہت زیادہ پائی جاتی ہے لیکن اس فرق میں خاتمے کا سفر انتہائی تیزی، ہوش گنوا دینے والی تیزی کے ساتھ طے ہو رہا ہے۔ بیسویں صدی کے آغاز میں عورتوں کو ووٹ ڈالنے کے حق کی بات کی جاتی تو امریکہ میں طوفان برپا ہو جاتا تھا۔ اس زمانے میں کابینہ میں کسی عورت کی شمولیت اور سپریم کورٹ میں کسی عورت کی بطور جج تعیناتی کے بارے سوچنے والوں کو احمق قرار دیا جاتا تھا۔۔۔ ہم جنس پرستی تو ایسی کوئی نجس شے ہوا کرتی تھی کہ اس بارے سرے سے بات ہی نہیں کی جا سکتی تھی۔ لیکن آج، اکیسویں صدی کے آغاز میں عورتوں کو حاصل ووٹ ڈالنے کے حقوق گویا عام بات ہے۔ کوئی شخص، امریکی کابینہ میں عورتوں کی شمولیت بارے کوئی بات نہیں کرتا۔۔۔ یہ عام بات ہے۔ یہی نہیں بلکہ 2013ء میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی سپریم کورٹ میں نو ججوں پر

مشتمل پینل نے۔۔۔ چار کے مقابلے میں پانچ ججوں کی حمایت سے ریاست امریکہ میں ہم جنس پرستی کو قانونی طور پر جائز قرار دیا تھا۔ اس فیصلے کی حمایت کرنے والے پانچ ججوں میں سے تین عورتیں تھیں جبکہ اس فیصلے کی مخالفت کرنے والے چاروں جج مرد تھے۔

حالیہ تاریخ کے دوران صنفی میدان میں یہ ڈرامائی تبدیلیاں ہیں خود صنف کی تاریخ بارے بھی کچھ پتہ دیتی ہیں، جو کہ انتہائی حیران کن اور پریشان کر دینے والے اشارے ہیں۔ اگر جیسا کہ آج مانا جاتا ہے کہ پدرشاہی کا غلبہ تاریخی حالات و واقعات یا حادثاتی طور پر کوئی سماجی رخ نہیں بلکہ اس کی ٹھوس اور معروضی حیاتیاتی، یعنی سائنسی وجوہات ہوتی ہیں تو پھر حالیہ تاریخ میں برپا ہونے والی یہ ڈرامائی تبدیلیاں کس کھاتے میں آئیں گی۔ اس ضمن میں سائنسی اور معروضی عوامل تو جوں کے توں ہیں۔۔۔ صرف قانون، رسم، رواج اور ریت بدل رہا ہے۔ تو پھر جب ہم کہتے ہیں کہ صنفی امتیاز، دراصل ایک آفاقی اور مستحکم نظام ہے۔۔۔ اس کی آفاقیت اور استحکام کے پاؤں تلے سے تو زمین کھسک رہی ہے۔ بھئی، یہ کیسا آفاقی نظام ہے؟

حصہ سوئم: وحدت انسانی

24 مکہ میں دنیابھر سے تعلق رکھنے والے مسلمان زائرین کا کعبہ کے گرد طواف

تاریخ کا تیر

زرعی انقلاب کے بعد انسانی معاشرے پھیل کر بڑے ہوتے گئے۔ جیسے جیسے یہ پھیلتے گئے، پیچیدگی بڑھتی گئی۔ جہاں یہ، وہیں سماج کو جوڑ کر رکھنے والی تصوراتی ترا کیبیمیں بھی خوب صراحت آتی گئی۔ لوگوں کے لیے اساطیر اور فکشن روایت بن گیا اور وہ اس سے خوب مانوس بھی ہو گئے۔ اب ایسا ہوتا تھا کہ پیدائش کے لمحے سے ہی مخصوص سوچ حاوی کر کے، مخصوص اقدار کو مانتے ہوئے رویے پالے جاتے، مخصوص اشیاء کی خواہش پالتے اور چند مخصوص اصولوں کی پاسداری کی جاتی تھی۔ اس طرح مصنوعی جبلت کا ایسا جال بچھ گیا جس کے تحت لاکھوں اجنبی لوگ ایک دوسرے کے ساتھ انتہائی موثر انداز میں تعاون اور اشتراک کی راہ پر گامزن ہو گئے۔ مصنوعی جبلت کے اس جال کو ہم تہذیب و تمدن کہتے ہیں۔

بیسویں صدی کے پہلے نصف میں محققین یہ سکھاتے تھے کہ ہر تہذیب اور ثقافت اپنے آپ میں ہم آہنگ ہوتی ہے۔ ہر معاشرے کا اپنا ایک رنگ، غیر متغیر جوہر ہوتا ہے جو اس کا اساسی ضامن ہوتا ہے۔ ہر انسانی گروہ کا دنیا کے بارے اپنا الگ نکتہ نظر، نقطہ نگاہ ہوتا ہے جس کے تحت اس معاشرے میں سماجی، قانونی اور سیاسی بندوبست کیا جاتا ہے۔ یہ ایسا زبردست اور مربوط بندوبست ہوتا ہے جس کی مثال ایسے ہے جیسے نظام شمسی میں سورج کے گرد سیاروں کا چکر، جس میں تبدیلی، ہلکی سی لغزش کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ انسانی معاشرے، سیاروں کی طرح ایک ہی رفتار اور ایک ہی جانب گامزن رہتے ہیں۔ ان کا راستہ صرف اسی وقت بدل سکتا ہے جب باہر سے کوئی قوت اثرانداز ہوتی ہے۔ اسی لیے علم بشریات کے ماہرین، تاریخ دان اور سیاستدان ساموئی تہذیب یا کوئی دوسری مثلاً تسمانوی تہذیب کو ہمیشہ ایک ہی جیسے اعتقاد، رسوم اور اقدار کی پابند تہذیب اور تمدن سمجھتے آئے ہیں۔ ان کے خیال میں، چند بنیادی اور آفاقی عقیدے، رسوم اور اقدار ہیں جو امریکی ساموئی اور آسٹریلوی تسمانوی باشندوں کی خاصیتوں میں یکسانیت اور ہم آہنگی پیدا کرتے ہیں۔

آج تہذیبوں پر تحقیق کرنے والے تقریباً سبھی محقق اس نظریے کے متضاد کو درست مانتے ہیں۔ اب یہ مانا جاتا ہے کہ ہر تہذیب کے اپنے مخصوص عقیدے، رنگ، رسوم اور اقدار ضرور ہوتی ہیں لیکن یہ ہر وقت تغیر کے بہاؤ میں رہتی ہیں۔ ہر تہذیب اپنے ماحول کے مطابق خود کو بدل سکتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ اپنے ارد گرد دوسری تہذیبوں کے زیر اثر رہنے کی وجہ سے بھی اس میں بڑی تبدیلی ممکن ہے۔ یہ تو بیرونی عوامل ہیں۔۔۔ تہذیبیں تو اندرونی وجوہات کی بناء پر بھی تغیر اور بدلاؤ کے دھارے میں بہہ جاتی ہیں۔ اس کی وجہ تہذیب کی اندرونی حرکیات ہوتی ہیں۔ یہاں تک کہ ایک بالکل الگ تھلگ، باقی دنیا سے کٹ کر رہنے والی تہذیب بھی، مستحکم ماحولیاتی عوامل کے باوجود بھی تغیر اور تبدیلی سے بچ کر نہیں رہ سکتی۔ یہ طبیعات کے آفاقی اصولوں جیسا معاملہ ہرگز نہیں ہے۔ طبیعات کے آفاقی اصول تو بے اصولی اور عدم مطابقت سے پاک ہوتے ہیں جبکہ انسان کی تخلیق کردہ تہذیب اور نظام اندرونی خلفشاروں سے پر ہوتے

ہیں۔ انسانی تہذیبیں اسی اندرونی خلفشار اور تضادات سے نبٹنے کے لیے ہمہ وقت کوشش میں جتی رہتی ہے اور یہی اس میں مستقل بدلاؤ کا ایندھن بھی ہوتے ہیں۔

مثال کے طور پر قرون وسطیٰ کے دور میں یورپ کی اشرافیہ عیسائیت اور شجاعت اور دلیری پر مبنی شہ سواری کے نظام میں بھی یقین رکھتی تھی۔ اس دور کے کسی عالی نسب شخص کی مثال لیں جو عیسائیت اور شہ سواری، دونوں میں ہی اعتقاد رکھتا ہو۔ وہ ایک دن صبح چرچ جاتا ہے جہاں کوئی پادری نہایت جوش و خروش سے ولیوں اور درویشوں کی برگزیدگی پر خطبہ دے رہا ہے۔ پادری کہتا ہے،'خود نمائیوں کی بہتات ہے۔۔۔ ہر طرف جھوٹی شان اور خود نمائی کا دور دورہ ہے۔ لوگو۔۔ یاد رکھو کہ امارت، ہوس اور شہرت خطرناک بہکاوے ہیں۔ تم اس تحریص اور رغبت سے اوپر اٹھو اور یسوع مسیح کی پیروی کرو۔ یسوع مسیح کی طرح نرم مزاجی اور عاجزی اختیار کرو۔ تشدد اور اسراف سے دور رہو۔ اگر کوئی تمھیں ایک تھپڑ رسید کرے تو اس کو جواب میں اپنا دوسرا گال پیش کر دو!'۔ یہ خطبہ سن کر وہ عالی نسب عیسائی شخص عاجزی اور نرم مزاجی طاری کیے متفکر واپس گھر کی راہ لیتا ہے۔ لیکن اتوار کی دوپہر میں وہ اپنا سب سے قیمتی، ریشمی لباس زیب تن کر کے، خوب بن ٹھن کر، ٹھسے اور غرور کے ساتھ اپنے شاہی خطاب سمیت شہنشاہ کے محل میں پر تکلف ضیافت میں مدعو، پہنچ جاتا ہے۔ اس شاہی ضیافت میں شراب پانی کی طرح بہہ رہی ہے، طرح طرح کے پر تعیش کھانے چنے گئے ہیں جبکہ گویے۔۔۔ بہترین راگ چھیڑ رہے ہیں۔ ایسے میں مہمان، ایک دوسرے کے ساتھ بے جا کی فضول، فحش گوئی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے ہیں۔ خود نمائی ہو رہی ہے جبکہ سورمائی جھاڑ رہے ہیں،'غیرت اور شجاعت سے مر جانا ہی آدمیت کی معراج ہے۔۔۔'، ایک سورما جاگیردار کہتا ہے اور باقی کان لگا کر سنتے ہیں،'شرم سے جینا، جھک کر زندہ رہنا بھی کوئی جینا ہوتا ہے؟ اگر کوئی تمھاری غیرت کو للکارے۔۔۔ اس بے عزتی کا بدلہ تو صرف خون ہے۔ ویسے بھی، اس منظر سے بہتر منظر کیا ہو گا جب دشمن تمھارے تنے ہوئے سینے کو دیکھ کر بھاگ نکلے اور اس کی بیٹیاں دہشت سے تمھارے قدموں میں کانپ رہی ہوں؟'

قرون وسطیٰ کے دور میں یہ تضاد کبھی پوری طرح حل نہیں ہو پایا لیکن اس کے باوجود یورپ کی اشرافیہ، اہل کلیسا اور عوام اس تضاد کے ساتھ ہمیشہ دست بدست رہی۔ اس الجھاؤ اور آنکڑے کا نتیجہ یہ نکلا کہ یورپی تہذیب میں بدلاؤ آ گیا۔ پہلی دفعہ تبدیلی آئی تو صلیبی جنگجو پیدا ہوئے۔ صلیبی جنگوں میں عیسائی سورما بیک وقت اپنی عسکری اور مذہبی عقیدت کا اظہار کر سکتے تھے۔ بعد ازاں یہی تضاد تھا جس کی بنیاد پر ٹمپلر یا معبدی اور کرسچن مشنری ہسپتالوں کا عسکری نظام پیدا ہوا۔ یہ وہ نظام تھے جن کے تحت عیسائیت اور شجاعت پر مبنی شہ سواری نظاموں کا جال مزید سختی سے پھیل گیا۔ یہی تضاد قرون وسطیٰ کے دور کے آرٹ اور ادب کی وجہ بھی بنا۔ کنگ آرتھر کی دلیری اور شجاعت کی داستان اور یسوع مسیح کا عشائے آخری میں استعمال ہونے والے پیالے کی شبیہ۔۔۔ یہ اسی تضاد کی پیداوار ہیں۔ کنگ آرتھر

کی سلطنت کے دار لحکومت کا احوال اس کے سوا کچھ بھی نہیں ہے کہ ایک عظیم جنگجو۔۔۔ عظیم عیسائی بھی ہوتا ہے اور یہ عظیم عیسائی ہی ہوتے ہیں جو عظیم جنگجو بن سکتے ہیں۔

اسی طرح کی دوسری مثال آج جدید دور کا سیاسی نظام ہے۔ جب سے فرانسیسی انقلاب وقوع پذیر ہوا ہے، دنیا بھر میں لوگ برابری اور شخصی آزادی کو بنیادی اقدار سمجھتے چلے آرہے ہیں۔ لیکن یہ دونوں اقدار ایک دوسرے کے منافی ہیں۔ ان میں واضح تضاد پایا جاتا ہے۔ وہ یوں کہ سب کے لیے برابری کا حق صرف اسی صورت ممکن بنایا جاسکتا ہے جب امیر طبقے کی شخصی آزادی کو سلب کر دیا جائے۔ دوسری جانب، لوگوں کو شخصی آزادی کی گارنٹی دینے کے لیے ضروری ہے کہ برابری اور مساوات کے تصور سے پیچھے ہٹا جائے اور لوگوں کو اپنی منشاء، من مرضی کرنے کی کھلی چھٹی دے دی جائے۔ 1789ء کے بعد سے آج تک، دنیا کی ساری سیاسی تاریخ اسی تضاد کو حل کرنے کے لیے گتھم گتھا چلی آرہی ہے۔

اگر کسی نے چارلس ڈکنز کے ناول پڑھ رکھے ہیں تو وہ خوب جانتا ہو گا کہ یورپ میں انیسویں صدی کی لبرل حکومتیں اور بادشاہتیں شخصی آزادی کو خوب بڑھاوا دیتی تھیں۔۔۔ بھلے اس کے لیے غریبوں کی کثیر تعداد کو جیلوں میں سڑنے کے لیے کیوں نہ پھینک دیا جائے؟ یا پھر یتیموں کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ سکول میں پڑھنے نہیں بلکہ صرف اور صرف جیب کترنے کے لیے جایا کریں۔ اگر کسی نے الیکزینڈر سلزینستائن کے ناول پڑھ رکھے ہیں تو وہ خوب جانتا ہو گا کہ کیسے مساوات اور برابری پر یقین رکھنے والے کمیونسٹوں نے آمریت اور استبداد پر مبنی جابرانہ حکومتیں قائم کیں جو زندگی کے ہر آزاد پہلو کو غصب کر کے سب کو برابر کر دیتی تھیں۔

دورِ حاضر کی امریکی سیاست بھی اسی تضاد کے ارد گرد گھومتی ہے۔ ڈیموکریٹ ایک مساوی اور منصفانہ معاشرہ چاہتے ہیں۔ اس مقصد کو، یعنی غریبوں، بزرگوں اور کمزوروں کی مدد کرنے کے لیے ٹیکس بڑھا کر امدادی پروگرام بھی شروع کرنے پڑیں تو وہ اسے ضروری سمجھتے ہیں۔ لیکن مساوات اور برابری پر مبنی ان تصورات کی قیمت ان افراد کی شخصی آزادی پر ضرب ہو گی جو اپنا پیسہ، اپنی مرضی سے خرچ کرنا چاہتے ہیں۔ کوئی بھی حکومت، مجھے ہیلتھ انشورنس خریدنے پر مجبور کیسے کر سکتی ہے جبکہ میں اپنا پیسہ، اپنے بچوں کی بہتر تعلیم پر خرچ کرنا چاہتا ہوں؟ دوسری جانب ری پبلکن ہیں۔ وہ شخصی آزادی پر مبنی معاشرے کے خواہاں ہیں۔ اس مقصد کے حصول کا مطلب یہ ہے کہ امیر اور غریب کے بیچ فرق بڑھتا جائے گا اور امریکیوں کی کثیر تعداد صحت کی سہولیات سے محروم ہو سکتی ہے۔

جس طرح قرون وسطیٰ کا یورپ عیسائیت اور شہ سواری کے بیچ فرق نہیں مٹا سکا۔ اسی طرح آج کی جدید دنیا بھی شخصی آزادی اور برابری کے بیچ تفاوت کو ختم نہیں کر سکتی۔ لیکن یہ کوئی نقص یا خامی نہیں ہے۔ اس طرح کے تضادات ہر انسانی معاشرے کا لازمی اور لاینفک جز ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس طرح کے تضادات کی مثال انسانی تہذیب میں انجن کی طرح ہے۔ جو ہماری نوع کو ہر دم تخلیق، ہمہ گیر فکر اور متحرک رہنے پر مجبور کرتے ہیں۔ جس طرح سر اور تال مل کر موسیقی کو جنم دیتے ہیں یا نشیب اور فراز ایک ساتھ چل کر لہریں پیدا

کرتے ہیں۔۔۔ تو ہمارے متضاد نظریات، تخیل اور اقدار بھی بالکل ویسے ہی ہمیں سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔ خود پر تنقیدی نظر ڈالنے کا موقع فراہم کرتے ہیں اور اپنی سمت درست کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ یاد رکھیے، مستقل مزاجی اور استقامت۔۔۔ کند ذہنوں کا خاصہ ہوتی ہے۔

اگر تناؤ، تنازعات اور ناقابل حل مخمصے ہر تہذیب میں مرچ مسالے کی مثال ہوں تو کسی مخصوص تہذیب اور تمدن، ثقافت سے تعلق رکھنے والے آدمی کے لیے لازم ہے کہ وہ صحیح معنوں میں اس کا ذائقہ چکھنے کے لیے متضاد عقائد اور نظریات پالا کرے۔ وہ ایک دوسرے سے متضاد اقدار کے بیچ بٹ کر، دولخت ہو کر۔۔۔ خود کو چیر کر بسر کیا کرے۔ یہ انسانی تہذیب اور تمدن کا اتنا ضروری جزو ہے کہ اس کا نام بھی رکھا گیا ہے۔ اسے، 'شعوری ناسازگاری' یا بالکل سادہ الفاظ میں 'آگاہی کی ناہمواری' بھی کہا جاسکتا ہے۔ عام طور پر آگاہی میں تضادات کی وجہ سے اس ناہمواری، اس بھونڈے پن، ناموزونیت یا بے سرے پن کو انسانی نفس اور سائیکی کی ناکامی تصور کیا جاتا ہے۔ سچ یہ ہے کہ یہ اصل، جاودانی اور حیات بخش اثاثہ ہے۔ اگر لوگ متضاد عقائد، نظریات اور اقدار پالنے کے اہل نہ ہوتے تو انسانی تہذیب کو برقرار رکھنا ممکن ہی نہ ہوتا۔ انسانی تہذیب وجود ہی نہ رکھ پاتی۔۔۔ تاریخ گواہ ہے کہ وہ تہذیبیں فنا ہو گئیں جہاں یہ فرق، یہ تضاد مٹ گئے تھے۔

اگر کوئی عیسائی، ان مسلمانوں کو واقعی سمجھنا چاہتا ہے جو اس کے گھر کے پاس۔۔۔ مسجد میں نماز پڑھنے آتے ہیں۔ تو اسے چاہیے کہ وہ ان قدیم اقدار پر نظر نہ رکھے جو ہر مسلمان کے لیے انتہائی مقدس اور محترم ہیں۔ بجائے، اسے چاہیے کہ وہ ان حالات و واقعات پر نظر دوڑائے جو مسلمانوں کی تہذیب اور ثقافت کی راہ میں رکاوٹ بنتے ہیں اور وہ اپنے عقائد اور ان حالات و واقعات کے بیچ بٹ کر بسر کرتے ہیں۔ ان جگہوں پر غور کرے جہاں قواعد، عقائد کے ساتھ ٹکراتے ہیں اور دونوں کے معیار اور حدود ایک دوسرے کے ساتھ گتھم گتھا ہوتی ہیں۔ یہیں سے ایک نئی ثقافت جنم لیتی ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں پر مسلمان دو انتہاؤں کے بیچ بٹ کر، لڑکھڑا کر گزرتے ہیں اور یہیں پر ان کو صحیح معنوں میں سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

جاسوس سیارچہ

یہ تو طے ہے کہ انسانی تہذیب ہر دم بہاؤ میں رہتی ہے۔ لیکن کیا یہ بہاؤ انٹ شنٹ اور بے مقصد ہے؟ یا اس کا کوئی مخصوص انداز، مقصد اور طرز بھی ہوتی ہے؟ دوسرے الفاظ میں، کیا انسانی تاریخ کا کوئی رخ ہوتا ہے؟ یا یہ بس۔۔۔ وقوع پذیر ہوتی جا رہی ہے؟

اس سوال کا جواب ہے کہ انسانی تاریخ کا واقعی ایک رخ ہے۔ ایک مخصوص چال ڈھال ہے۔ وہ یوں کہ پچھلے دس ہزار سال میں چھوٹی اور سادہ معاشرے اور ثقافتیں بتدریج مل کر بڑی سے بڑی اور پیچیدہ تہذیبوں میں یکجان ہو جائیں۔ کچھ یوں کہ دنیا میں صرف چند ہی

بڑے بڑے معاشرے رہ جائیں۔ ان میں سے ہر ایک معاشرہ، اولین دور کے معاشروں سے لاکھوں گنا بڑا اور بہتیرا پیچیدہ ہو۔ اب ظاہر ہے، یہ اس بابت انتہائی خام قیاس ہے اور صرف بڑے پیمانے پر ہی درست ہے۔ چھوٹے پیمانے پر ایسا لگتا ہے کہ ہر معاشرہ جو ایک بڑی تہذیب میں ضم ہو جاتا ہے۔۔۔ وہ بالآخر بڑی اور دیوہیکل تہذیب کو ٹکڑوں میں توڑ دیتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک وقت ایسا آیا جب منگول تہذیب، ایک وسیع سلطنت کی صورت میں ایشیاء کے طول و عرض اور یورپ کے کچھ حصوں تک پھیل چکی تھی لیکن پھر وہ دیکھتے ہی دیکھتے، چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹ کر پاش پاش ہو گئی۔

اسی طرح عیسائیت نے ایک وقت میں دسیوں لاکھ لوگوں کو یہ مذہب اختیار کرنے پر قائل کر دیا لیکن پھر اسی عیسائیت میں لاتعداد فرقے اور مسلک نکل آئے۔ لاطینی زبان مغربی اور وسطی یورپ میں بہت عام ہو گئی لیکن پھر اس کے کئی کئی لہجے نکل آئے اور ایک وقت ایسا آیا کہ یہ کئی کئی اقوام کی قومی زبانوں صورت بٹ گئی۔ لیکن یاد رہے، کسی بھی تہذیب کا یوں ذرہ ذرہ ہو جانادراصل پہلے سے کہیں بڑی اور عظیم الجثہ اتحاد اور واحدنیت سے قبل وقتی اور عارضی الٹ پلٹ ہی ہوتا ہے۔

تاریخ کے رخ سے متعلق یہ سمجھ بوجھ اور ادراک نقطہ نگاہ پر منحصر ہوتا ہے۔ مرادیہ ہے کہ اگر ہم تاریخ پر طائرانہ نظر ڈالیں۔۔۔ گویا اڑتے پرندے کی آنکھ سے نسبتاً قریب سے دیکھتے ہوں۔۔۔ تاریخ میں دہائیوں اور صدیوں کو صرف آسمان میں اڑے ایک پرندے کی نگاہ سے دیکھیں تو بالکل پتہ نہیں چلے گا کہ تاریخ تنوع کی طرف بڑھ رہی ہے یا ہم آہنگ ہو کر وحدانیت میں بدل رہی ہے؟ تاہم یہ یاد رہے کہ طویل مدت پر مبنی ان عوامل کو ایک پرندے کی نظر سے اتنے قریب سے دیکھنا فریب نظر بھی ہو سکتا ہے۔

اسی لیے، تاریخ کا رخ صحیح معنوں میں دیکھنے کے لیے ہمیں ایک مصنوعی سیارچے کی نظر چاہیے۔ ایک ایسا مصنوعی سیارچہ جو بہت دور، بہت ہی دور خلا میں جاسوسی پر مامور ہے اور وہ دہائیوں اور صدیوں کی بجائے ہزاروں سال کو ایک ہی نظر سے دیکھنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ ایسے نقطہ نگاہ سے دیکھنے پر صاف صاف نظر آئے گا کہ انسانی تاریخ بجا طور پر یگانگت، اتحاد اور وحدانیت کی طرف بڑھ رہی ہے۔ عیسائیت میں فرقہ بندی اور منگولوں کی سلطنت کا چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹ جانے کی مثال ایسے ہی جیسے تاریخ کی سپیڈ ہائی وے پر چند سپیڈ بریکر ہوتے ہیں۔

تاریخ کے رخ کی عمومی صورت کو سمجھنے کے لیے سب سے سادہ پیمانہ یہ ہو سکتا ہے کہ مختلف ادوار میں کرہ ارض پر پائی جانے والی مختلف انسانی دنیاؤں کی تعداد کا شمار کیا جائے۔ آج، ہم کرہ ارض پر بسنے والی انسانی دنیا کو واحد اکائی سمجھتے ہیں لیکن تاریخ بھر میں یہ کرہ ارض، انسانی دنیاؤں کی کہکشاں ہوا کرتی تھی۔

مثال کے طور پر تسمانیہ کی مثال لیں۔ تسمانیہ، جنوبی آسٹریلیا پر واقع رقبے کے لحاظ سے ایک اوسط جزیرہ ہے۔ یہ جزیرہ دس ہزار قبل مسیح میں برفانی دور کے اواخر میں براعظیم آسٹریلیا سے سمندری سطح بلند ہونے کی وجہ سے الگ ہو گیا۔ کئی ہزار تا حتیٰ اس جزیرے پر ہی رہ گئے

اور ان کا باقی کی انسانی آبادیوں سے رابطہ اور تعلق کٹ کر رہ گیا۔ انیویں صدی میں یہ رابطہ اس وقت دوبارہ بحال ہوا جب یورپی اس جزیرے پر پہنچے۔ یعنی، بارہ ہزار سال تک باقی دنیا کو تسمانوی قبائل بارے کچھ خبر نہ تھی اور تسمانویوں کو بھی باقی دنیا کے وجود بارے کچھ پتہ نہیں تھا۔ تسمانویوں کا اپنا معاشرہ تھا۔ ان کی اپنی جنگیں، تنازعات، سیاسی تحریک، سماجی جھول اور ثقافتی رنگ تھے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اس تمام عرصے کے دوران چینی سلطنتوں اور عراقی تمدن کے لیے تسمانوی گویا کسی دوسرے سیارے پر بسنے والی دنیا تھی۔ تسمانوی، اسی کرہ ارض پر اپنی الگ ہی دنیا میں آباد تھے۔

امریکہ اور یورپ بھی تاریخ بھر میں الگ الگ دنیائیں رہی ہیں۔ 378ء میں رومی شہنشاہ والنس نے ادرنہ کے مقام پر گوت ھاؤں سے شکست کھائی توقتل کر دیا گیا۔ اسی برس سلطنت مایا میں تیکال کا فرمانروا چک توک اچک اول، توتیوا کان افواج سے شکست کھا گیا اور قتل کر دیا گیا۔ (تیکال، مایا تہذیب کا اہم شہر تھا جبکہ توتیوا کان تب براعظم امریکہ میں سب سے بڑا شہر تھا جس کی آبادی تقریباً ڈھائی لاکھ تھی۔ یعنی، اس دور میں توتیوا کان اور روم، ایک ہی جتنے بڑے شہر تھے)۔ لیکن، اس دور کی دنیا میں، اسی برس میں روم کی شکست اور توتیوا کان کی فتح کا آپس میں سرے سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس وقت کرہ ارض پر یہ دو بالکل الگ انسانی دنیائیں تھیں۔ ان کی مثال ایسے ہی تھی جیسے شہر روم مریخ جبکہ توتیوا کان سیارہ مشتری پر واقع تھا۔

تو کرہ ارض پر آخر ایسی کتنی انسانی دنیائیں ایک ساتھ الگ الگ آباد رہی ہیں؟ 10000 قبل مسیح میں، کرہ ارض پر ایسی دسیوں ہزار دنیائیں آباد تھیں۔ 2000 قبل مسیح میں ان کی تعداد چند سو تھی یا زیادہ سے زیادہ ایک یا دو ہزار رہی ہو گی۔ 1450ء تک یہ تعداد انتہائی تیزی سے کم ہوئی۔ یہ وہ وقت تھا جب یورپی اس کرہ ارض کی کھوج میں نکلے اور کرہ ارض پر تسمانیہ جیسی لاتعداد دنیائیں آباد تھیں۔ لیکن اس کے باوجود، انسانوں کی نوے فیصد آبادی اب ایک بڑی دنیا میں آباد ہو چکے تھے۔ یہ افریشیائی دنیا تھی جس میں براعظم ایشیاء، یورپ اور افریقہ (افریقی صحرائے اعظم کا تقریباً حصہ) کے بڑے حصے شامل تھے۔ یہ افریشیائی دنیا صحیح معنوں میں ثقافتی، سیاسی اور معاشی زنجیر میں بندھ چکے تھے۔

انسانی آبادی کا باقی ماندہ دس فیصد حصہ صرف چار مزید دنیاؤں میں بٹا ہوا تھا جو حجم اور پیچیدگی کے لحاظ سے معنی خیز تھیں:

الف۔ وسط امریکی دنیا، جس میں وسطی اور شمالی امریکہ کا تقریباً حصہ شامل تھا۔

ب — سلسلہ کوہ اینڈیز کی دنیا، جس میں جنوبی امریکہ کا تقریباً مغربی حصہ شامل تھا۔

ج۔ آسٹریلوی دنیا، جس میں سارا براعظم آسٹریلیا شامل تھا۔

د۔ بحر پاش دنیا، جس میں جنوب مغربی بحرالکاہل کے نیوزی لینڈ سے لے کر ہوائی تک کے سبھی جزائر شامل تھے۔

اگلے تین سو برسوں میں، افریشیائی دنیا کا دیو باقی ساری دنیاؤں کو نگل لے گا۔ سب سے پہلے 1521ء میں اس نے وسط امریکی دنیا کو اس وقت صرف کیا جب ہسپانویوں نے سلطنت ازٹیک کو فتح کر لیا۔ اسی عرصے کے دوران اس دیو نے بحر پاش دنیا پر بھی ہاتھ صاف کیا جب فرڈیننڈ میگلان نامی پرتگالی سیاح نے کرہ ارض کا دنیا کے گرد بحر گردی مکمل کی اور اس کے فوراً بعد یہ دنیا زیر ہو گئی۔ سلسلہ کوہ انڈیز کی دنیا 1532ء میں درماندہ ہوئی جب ہسپانوی فاتحین سلطنت انکا کو بھی شکست دینے میں کامیاب ہوئے۔ براعظم آسٹریلیا میں پہلے یورپی نے 1606ء میں قدم رکھا اور یہ قدیم دنیا 1788ء میں اس وقت خاتمے پر پہنچی جب انگریزوں نے نو آبادیاتی منصوبے پر عمل درآمد کا فیصلہ کر لیا۔ اس کے پندرہ برس بعد ہی انگریزوں نے تسمانیہ میں بھی اپنا جھنڈا گاڑ لیا اور یوں آخری خود مختار دنیا افریشیائی کرہ میں ضم ہو گئی۔

اس کے بعد افریشیائی دیو کو ان ساری دنیاؤں کو ہضم کرنے میں کئی صدیاں لگ گئیں۔ تاہم، یہ طے تھا کہ یہ عمل ناقابل تنسیخ تھا۔ یہاں سے واپسی کا کوئی راستہ نہیں تھا اور یہ ناقابل ترمیم تبدیلیاں تھیں۔ آج کرہ ارض پر بسنے والے سبھی انسان ایک ہی جغرافیائی سیاست (بین الاقوامی سطح پر تسلیم شدہ ریاستیں)، یکساں معاشی نظام (کرہ ارض کے دور دراز علاقوں میں بھی سرمایہ دارانہ نظام کی موجودگی)، ایک ہی قانونی نظام (انسانی حقوق اور بین الاقوامی قوانین کم از کم از روئے نظریہ ہر جگہ تسلیم شدہ ہیں)، حتیٰ کہ ایک ہی سائنسی نظام (ایران، اسرائیل، آسٹریلیا اور ارجنٹائن۔۔۔الغرض ہر جگہ پر ایٹمی ساخت اور ٹی بی کے علاج سے متعلق ایک ہی نکتہ نظر رکھتے ہیں) پر عمل پیرا ہیں۔

لیکن یہ عالمگیر ثقافت ہرگز بھی ہم جنس اور ہم نوع نہیں ہے۔ یہ ہرگز بھی ایک جیسی خصلت نہیں رکھتی۔ اس کی مثال ایک نامیاتی جسم جیسی ہے جس میں مختلف اقسام کے اعضاء اور خلیے ہوتے ہیں۔ ہماری یہ عالمگیر تہذیب مختلف طرح کے لوگوں اور زندگی کی طرزوں پر مشتمل ہے۔ اس میں نیویارک کے سٹاک بروکر سے لے کر افغان چرواہوں اور اسی طرح کے لاتعداد لوگ اور ان کی طرز زندگی پائی جاتی ہے۔ یہ ایک دوسرے سے انتہائی مختلف ہیں لیکن پھر بھی ایک دوسرے کے ساتھ سختی سے جڑے ہیں اور دنیا کے دو مختلف کونوں میں بسنے کے باوجود ایک دوسرے پر ان گنت طریقوں سے اثر انداز ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ یہ ایک دوسرے سے لڑتے ہیں، جھگڑتے ہیں اور ان کی اختلافی بحث ختم ہونے میں نہیں آتی لیکن یہ ایک دوسرے سے ایک ہی طرح کے تصور کلی، سمجھ اور بوجھ کی بنیاد اور ایک ہی جیسے ہتھیاروں سے گتھم گتھا ہیں۔ اصل 'تہذیبوں کے بیچ تصادم' تو حقیقت میں بہروں کے بیچ کہاوتی مباحثے سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ یہ تصادم حقیقت میں تصادم اس وقت ہوتا جب دو تہذیبوں کو ایک دوسرے کی سمجھ ہی نہ آتی۔ آج جب ایران اور امریکہ ایک دوسرے کو دھمکا کر تلواریں سونت لیتے ہیں تو یہ دونوں ہی دراصل ایک ہی طرح کے تصورات اور معاملات جیسے قومی ریاستوں، سرمایہ دارانہ معیشتوں، بین الاقوامی قوانین اور نیوکلیئر فزکس کی زبان میں بات کرتے ہیں۔

1450ء کی دنیا۔ چودھویں صدی کے نامی گرامی مسلمان سیاح ابن بطوطہ نے جن مقامات کا سفر اختیار کیا، ان کی نشاندہی افریشیائی دنیا میں کی گئی ہے۔ ابن بطوطہ کا تعلق مراکش کے شہر ٹینجئیر سے تھا اور اس نے ٹمبکٹو، زینزی بار، جنوبی روس، وسطی ایشیاء، ہندوستان، چین اور انڈونیشیاء تک سفر کیا۔ ابن بطوطہ کے سیاحتی سفروں سے جدید دور سے عین پہلے افریشیائی دنیا کے اتحاد اور یگانگت کا پتہ چلتا ہے۔

ہم آج بھی 'اصل اور مستند' ثقافتوں کے بارے راگ الاپتے رہتے ہیں لیکن اگر اصلی اور مستند سے مراد یہ کہ ایسی ثقافتیں جو خود مختار اور بیرونی دباؤ، اثر ورسوخ سے محفوظ رہ کر ترقی پاتی ہیں تو لکھ رکھیے، اس زمین پر کوئی اصلی یا مستند یا مصدقہ ثقافت باقی نہیں رہی۔ پچھلی چند صدیوں کے دوران دنیا کی سبھی ثقافتیں اور معاشرے، عالمگیر تاثیر اور اثر ورسوخ کے سیلابی ریلے میں بہہ چکی ہیں۔

اس عالمگیریت یا گلوبلائزیشن کی ایک دلچسپ مثال 'ثقافتی' یا 'روایتی' کھانوں سے متعلق ہے۔ مثال کے طور پر کسی اطالوی ریستوان میں ٹماٹر کی چٹنی کے ساتھ سپیگٹی، پولش اور آئرش ریستوانوں میں آلو کی تراکیب، ارجنٹائنی ریستوانوں میں گائے کے گوشت کے 'بیف سٹیک'، ہندوستانی ریستوانوں میں مرچ مسالے دار کھابے اور سوئس کیفوں کی خاصیت گرما گرم چاکلیٹ اور چھنی ہوئی دودھ بالائی ہوتی ہے۔ لیکن، ان میں سے کوئی بھی خوراک ان ملکوں کی آبائی نہیں ہے۔ مثلاً ٹماٹر، مرچوں اور کوکو کا اصل دیس میکسیکو ہے جو یورپ اور ایشیاء میں ہسپانویوں نے میکسیکو کی فتح کے بعد متعارف کروایا تھا۔ شہنشاہ سیزر اور مشہور اطالوی شاعر دانتے نے اپنی زندگی میں کبھی ٹماٹر میں لتھڑی ہوئی سپیگٹی کانٹے (تب کانٹے بھی ایجاد نہیں ہوئے تھے) پر لپیٹ کر نہیں کھائی۔ سوئس ہیرو ولیم ٹیل نے کبھی چاکلیٹ کا ذائقہ نہیں چکھا اور بدھا نے پوری زندگی کبھی سرخ مرچ استعمال نہیں کی ہوگی۔ پولینڈ اور آئرلینڈ میں آلو صرف چار سو سال پہلے پہنچے اور 1492ء میں ارجنٹائن میں صرف الاما پچل کے قتلے ملتے ہوں گے، گائے کا گوشت تب وہاں دستیاب نہیں ہوتا تھا۔

ہالی ووڈ کی مشہور فلموں میں ریڈ انڈینز کو دلیر اور جانباز گھڑسوار بنا کر پیش کیا جاتا ہے جو اپنے آباء کی روایات کے تحفظ کے لیے گھوڑوں پر تن کر سوار، یورپی نو واردوں پر ہر وقت لڑتے بھڑتے رہتے ہیں۔ تاہم، امریکہ میں گھڑسواری، ریڈ انڈینز کی قدیم، اصل روایت ہرگز نہیں

ہے۔ بجائے، یہ تو اس فوجی اور سیاسی انقلاب کا نتیجہ ہے جس نے سترھویں اور اٹھارہویں صدی کے دوران شمالی امریکہ کے مغربی حصوں کو لپیٹ میں لیے رکھا۔ یہ اسی عرصے کے دوران امریکہ میں یورپی گھوڑے متعارف ہونے کا نتیجہ تھا۔ 1492ء میں براعظم میں گھوڑے نام کا کوئی جانور نہیں ہوتا تھا۔ بجائے یہ تو انیسویں صدی میں سو آنی اور آپاچی قبائل میں پائی جانے والی گھڑسواری کی ثقافت کی دین ہے۔ یہ نسبتاً جدید ثقافت کی خصوصیات ہیں جو کہ 'عالمگیر' قوتوں کی دین ہے۔ اس میں اصل یا مستند کیا ہے؟

عالمگیریت کا تصور

عملی تناظر میں دیکھا جائے تو عالمگیر سطح پر یگانگت اور اتحاد صحیح معنوں میں پچھلے چند سو سالوں کا قصہ ہے۔ یہ وہ دور ہے جب بڑی بڑی سلطنتیں اور فرمانروائیاں پروان چڑھیں اور تجارت زور پکڑ گئی۔ افریشیاء، امریکہ، آسٹریلیا اور بحرالکاہل میں واقع سبھی جزائر کے لوگوں کے بیچ ہمیشہ کے لیے تن جانے والے روابط پیدا ہوئے۔ یہ انہی قریبی روابط کا نتیجہ ہے کہ میکسیکو کی مرچ ہندوستانی کھانوں کی پہچان بن گئی اور ہسپانوی ڈھور ڈنگر ارجنٹائن کے میدانوں میں چرنے لگے۔ لیکن نظریاتی پہلو سے دیکھا جائے تو عالمگیریت کا تصور آج سے تین ہزار سال پہلے ہی اپنی جڑیں مضبوط کرنا شروع ہو گیا تھا۔ یہ وہ دور تھا جب پہلی بار آفاقی تصورات نے انسانی سوچ اور فکر میں جگہ بنانی شروع کی تھی۔ ہزاروں سال تک عالمگیریت کا تصور انتہائی سست روی سے چلتا آرہا تھا۔ یہ اس وقت بھی گھونگے کی چال چلتا ہوا لیکن بہرحال موجود تھا جب زیادہ تر لوگوں کے لیے ایک ایسے عالمگیر نظام کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا جو پوری دنیا میں رائج ہو سکتا تھا۔

25: ایک ریڈ انڈین سردار (1905ء)- 1492ء سے قبل کسی ریڈ انڈین اور دوسرے امریکی میدانوں کے قبائل میں گھوڑے کا استعمال نہیں ہوتا تھا

آدمی کی ارتقائی خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ ہمیشہ ہی لوگوں کو 'تم' اور 'میں' کے بیچ یا 'آپ' اور 'ہم' کے بیچ بٹا ہوا دیکھتے ہیں۔ 'ہم' سے مراد ہمارے ارد گرد لوگوں کے گروہ ہوا کرتے تھے جبکہ 'آپ' اور 'وہ' باقی ساری دنیا تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ کوئی بھی سماجی جانور کبھی بھی اپنی مخصوص نوع اور جنس کے مجموعی مفادات کی بنیاد پر کبھی پروان نہیں چڑھتا۔ کوئی بن مانس یا بن مانسوں کا ایک جتھا، بن مانسوں کی پوری نوع بارے فکرمند نہیں ہوتا۔ کوئی گھونگا، گھونگوں کے عالمگیر سماج کی خاطر اپنا گیرہ تک نہیں اٹھاتا۔ شیروں کے کسی جتھے کا برتر نر کبھی بھی دنیا جہاں کے شیروں سے برتر ہونے کی خواہش نہیں پالتا۔ آج تک شہد کی مکھیوں کے کسی چھتے میں یہ نعرہ نہیں لگایا گیا کہ،

'دنیا جہاں کی کارکن مکھیوں۔۔۔ متحد ہو جاؤ!'

لیکن شعور اور آگاہی کا ادراک ہوتے ہی آدمی اس لحاظ سے دوسرے جانوروں سے بتدریج ممتاز ہوتا چلا گیا۔ لوگوں نے معمولاً بڑی تعداد میں اجنبی لوگوں کے ساتھ تعاون اور اشتراک قائم کرنا شروع کر دیا جو ان کے تصوراتی 'بھائی' اور 'دوست' ہوا کرتے تھے۔ لیکن یہ 'بھائی چارہ' بھی آفاقی نہیں تھا۔ پہاڑ کی دوسری طرف وادی میں یا پہاڑی سلسلوں کے اس پار اب بھی 'آپ' یا 'وہ' نظر آ ہی جاتے تھے۔ یہ تو پرانی بات ہے لیکن 3000 قبل مسیح میں جب مصر کے پہلے فرعون نے مصریوں کو اکٹھا کیا تو سبھی جانتے تھے کہ مصر کی ایک سرحد

ہے، جس کے اندر سارے مصری 'بھائی بھائی' ہیں۔ لیکن اس سرحد کے اس پار 'وہ' یعنی باقی ساری دنیا 'غیر مہذب'، 'جاہل' اور 'اجڈ' بستے ہیں۔ ان غیر مہذب غیروں سے مصر کو ہر وقت خطرہ لاحق رہتا تھا، وہ بیگانے تھے، مخالف بھی تھے اور مصریوں کی 'ان' میں دلچسپی صرف اتنی سی تھی کہ 'وہ' زرخیز رقبے اور قدرتی وسائل کے مالک تھے۔ مصری ان زرخیز رقبوں اور قدرتی وسائل کی چاہ رکھتے تھے۔ تاریخ میں لوگوں نے جتنے بھی تصوراتی نظام قائم کیے، ان میں 'انسانیت' کا عنصر ناپید ہوا کرتا تھا۔

لیکن آج سے تین ہزار سال پہلے پہلی دفعہ تین ایسے مختلف تصوراتی نظام پیدا ہوئے جو ممکنہ طور پر 'آفاقی نظام' ہونے کا درجہ رکھتے تھے۔ ان نظاموں کے پیروکار پہلی دفعہ پوری دنیا اور بنی نوع انسان سے تعلق رکھنے والے ہر آدمی کو ملا کر ایک اکائی سمجھنے کی سوچ رکھتے تھے۔ یہ دنیا اور اس میں بسنے والا ہر آدمی، ایک ایسی اکائی تھی جس کو مخصوص قوانین اور اصولوں کے تحت چلایا جاسکتا تھا۔ اس تصور کے تحت، ہر کوئی احتمالی طور پر 'ہم' تھا۔ اب 'وہ' باقی نہیں رہے۔ کوئی غیر نہیں تھا۔ ان میں سب سے پہلا 'آفاقی نظام' معاشی تھا۔ اسے ہم 'مالیاتی نظام' کہتے ہیں۔ دوسرا سیاسی تھا۔ اسے ہم 'سامراجی نظام' کہتے ہیں۔ تیسرا آفاقی نظام مذہبی تھا۔ اس نظام میں مختلف مذاہب جیسے بدھ مت، عیسائیت اور اسلام وغیرہ شامل ہیں۔

تاجر، فاتحین اور پیغامبر یا انبیاء وہ لوگ ہیں جنھوں نے پہلی بار ارتقاء کی دوہری تقسیم پر سبقت حاصل کر لی۔ 'ہم بمقابلہ آپ' کو زیر کر لیا اور انسانیت کو متحد کرنے کے امکانات کی پیش بینی کی۔ تاجروں کے لیے پوری دنیا ایک واحد منڈی کی طرح تھی اور سبھی انسان گاہک تھے۔ انھوں نے ایک ایسا معاشی نظام قائم کرنے کی ٹھان لی جو ہر جگہ، ہر کسی پر لاگو ہو سکتا تھا۔ فاتحین کے لیے ساری دنیا ایک واحد سلطنت تھی جس میں ہر آدمی امکانی طور پر رعایا تھا۔ اسی طرح پیغامبروں یا انبیاء کے لیے پوری دنیا میں صرف ایک ہی سچ وجود رکھتا تھا اور سبھی انسان اس سچ پر ایمان رکھنے والے دین دار تھے۔ انھوں نے بھی اپنے تئیں ایسا نظام قائم کرنے کی کوشش کی جو ہر جگہ، ہر شخص کے لیے موزوں اور قابل اطلاق تھا۔

پچھلے تین ہزار برسوں کے دوران لوگوں نے بڑھ چڑھ کر بلند حوصلگی کے ساتھ جری عالمگیر تصورات کو پروان چڑھانے کی کئی کئی کوششیں کی ہیں۔ اگلے تین ابواب میں ہم دیکھیں گے کہ کیسے اس دنیا میں پیسہ یا زر، سلطنتیں اور آفاقی مذاہب پھیلے اور یہ بھی کہ کیسے آج کی متحد دنیا کی بنیاد ڈالی گئی۔ ہم اس ضمن میں سب سے پہلے تاریخ کے سب سے بڑے فاتح کی کہانی پر نظر ڈالیں گے۔ یہ ایسا فاتح ہے جو انتہائی درجے کی برداشت رکھتا ہے اور بے پناہ مطابقت کی خصوصیت کا حامل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہر شخص اس کا پرجوش چیلا ہے۔ اس فاتح کا نام 'زر' یا 'پیسہ' ہے۔ وہ لوگ جو ایک جیسے خداؤں میں یقین نہیں رکھتے، ایک ہی بادشاہ کی رعایا نہیں ہیں لیکن وہ بجا طور پر، بلا شک و شبہ ایک ہی چیز کو ضرور مانتے ہیں۔ وہ ایک چیز 'زر' یا 'پیسہ' ہے۔ مثلاً اسامہ بن لادن امریکہ کا سخت جانی دشمن تھا۔ وہ امریکی

ثقافت، امریکی مذاہب اور امریکی سیاست کو سخت ناپسند کرتا تھا لیکن وہ بہرحال امریکی ڈالر کا دلدادہ تھا۔ آخر 'زر' یا 'پیسہ' اس اس جگہ پر کاری کیسے ہو جاتا ہے جہاں خدا اور بادشاہ ناکام ہو جاتے ہیں؟ ہم یہی جانیں گے۔

پیسے کی خوشبو، زر کی چمک

1519ء میں جب ہرنان کورتیس اور اس کے ہسپانوی فوجی دستوں نے میکسیکو پر حملہ کیا۔ تب تک میکسیکو ایک الگ ہی انسانی دنیا ہوا کرتی تھی۔ میکسیکو میں بسنے والے لوگ خود کو ازٹیک کہا کرتے تھے۔ انھوں نے جلد ہی بھانپ لیا کہ نو وارد ہسپانویوں کو ایک مخصوص زرد دھات میں غیر معمولی دلچسپی تھی۔ سچ تو یہ تھا کہ ہسپانوی، اس دھات کے بارے بات کرتے تھکتے نہیں تھے۔ میکسیکو کے آبائی باشندے اس زرد دھات، یعنی سونے سے ناواقف نہیں تھے۔ یہ خوبصورت دھات تھی اور آسانی سے توڑی اور مروڑی جا سکتی تھی۔ اسی لیے وہ اس دھات کو زیورات اور مجسمے بنانے کے لیے جبکہ کبھی کبھار سونے کی دھول کو اشیاء کے تبادلے کے لیے استعمال کرتے تھے۔ لیکن ازٹیک باشندوں کے یہاں جب کوئی چیز خرید و فروخت کی جاتی تو اس کے عوض عام طور پر کوکو کے بیج اور کپڑے کے تھان ادا کیے جاتے تھے۔ چنانچہ ازٹیک باشندوں کے لیے ہسپانویوں کا سونے سے متعلق یہ خبط ناقابل بیان تھا۔ یہ ایک دھات سے متعلق کیسا خبط تھا؟ اس دھات کو نہ تو کھایا جا سکتا تھا، پیس کر مشروب بنتا تھا اور نہ ہی اسے اوڑھا جا سکتا تھا۔ پھر یہ اتنا نرم تھا کہ اس سے اوزار اور ہتھیار بنانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ تبھی، جب ازٹیک باشندوں نے ہرنان کورتیس سے اس بارے استفسار کیا تو اس نے جواب دیا، '۔۔۔اس خبط کی وجہ یہ ہے کہ میں اور میرے ساتھی دل کی ایسی بیماری میں مبتلا ہیں جس کا علاج صرف اور صرف سونا ہے!'

ہسپانویوں کی افریشیائی دنیا میں سونے سے متعلق یہ خبط واقعی ایک وبا کی صورت پھیلا ہوا تھا۔ یہاں تک کہ ایک دوسرے کے سخت اور تلخ دشمن بھی صرف اسی بے کار زرد دھات کے لیے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے۔ میکسیکو فتح ہونے سے تین سو سال قبل ہرنان کورتیس کے آباء و اجداد اور ان کی افواج نے مذہب کی بنیاد پر آئبیریا اور شمالی افریقہ میں مسلم سلطنتوں کے خلاف جنگ کا آغاز کیا تھا۔ یسوع مسیح کے پیرو کار اور اللہ کے بندوں نے ایک دوسرے کا ہزاروں کی تعداد میں قتل عام کیا تھا۔ کھیت، کھلیان اور باغوں کو جلا کر راکھ اور عظیم شہروں کو نیست و نابود کیا تھا۔ یہ سب یسوع مسیح کی عظمت اور اللہ کی بڑائی بچانے کے لیے کیا گیا تھا۔

لیکن پھر یہ ہوا کہ جوں جوں عیسائیوں کا پلڑا بھاری ہوتا گیا تو انھوں نے اپنی فتوحات کو یادگار بنانے کے لیے مساجد تباہ کیں اور نئے عالیشان چرچ بھی کھڑے کیے لیکن اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے سونے اور چاندی کے نئے سکے بھی جاری کیے۔ ان سکوں پر صلیب کا نشان تھا اور خداوند یسوع مسیح کا شکر ادا کیا گیا تھا، جس نے ان کی ملحدین کے خلاف جنگ میں مدد کی تھی۔ اس نئی کرنسی کے ساتھ ساتھ، عیسائی فاتحین نے ایک دوسری قسم کا سکہ بھی جاری کیا جس کو ملیرا اور بعد میں درہم کہا جاتا تھا۔ بہرحال، اس ملیرا نامی سکے پر یکسر مختلف

پیغام درج ہوتا تھا۔ صلیبی فاتحین نے ان چو کور سکوں پر عربی میں جلی حروف میں نقش کاری کروائی جو کچھ یوں تھی: 'اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں'۔ یہاں تک کہ میلگوئیل اور اگد کے کیتھو لک پادریوں نے بھی ان مقبول اسلامی سکوں کا اجراء کیا اور خداوند یسوع مسیح کے متقی اور پرہیز گار عیسائی بھی ان سکوں کو خوب ذوق و شوق سے استعمال کرتے تھے۔

اسی طرح کی برداشت دوسری جانب بھی دیکھی گئی۔ شمالی افریقہ کے سبھی مسلمان تاجر بصد شوق تجارت کے لیے عیسائی سکے جیسے فلورنس کے فلورن، وینس کے ڈیوکٹ اور نیپلز کے گیگلیاؤ ان دنوں بہت مقبول تھے۔ مسلمان حکمران جو عام طور پر ملحد اور زندیق عیسائیوں کے خلاف بڑھ چڑھ کر جہاد پر زور دیتے تھے، وہ بھی ٹیکس کی صورت وہ سکے بخوشی قبول کر لیتے تھے جن پر خداوند کے فرزند یسوع مسیح اور مریم عذرا کی طرف رجوع کرنے پر زور دیا گیا ہوتا تھا۔

زر کی قیمت کیا ہے؟

تاختیوں کے یہاں زر یا پیسہ نہیں ہوتا تھا۔ تاختی آدمیوں کا ہر گروہ شکار کرتا، خوراک جمع کرتا اور خود ہی ہر اس شے کی کاریگری کرتا جس کی اسے ضرورت رہا کرتی تھی۔ گوشت سے لے کر دوا دارو، چپلوں سے لے کر سفلی علم۔۔۔ الغرض ہر شے کے وہ خود ہی کاریگر ہوتے تھے۔ ہر گروہ میں لوگوں نے اپنے اپنے تئیں مختلف قسم کے ہنر میں مہارت ضرور حاصل کر رکھی تھی لیکن وہ ایک دوسرے کے ساتھ اس بخشش اور ذمہ داریوں پر مبنی معیشت کو اشیائے صرف کے تبادلے اور خدمات وغیرہ میں حصہ داری کی صورت مل بانٹ کر چلاتے تھے۔ اگر کوئی شخص دوسرے شخص کو گوشت کا ایک ٹکڑا مفت بانٹ دیتا تھا تو اس کا متبادل کسی دوسری شے، مثال کے طور دوا دارو کی صورت لوٹانے کا قیاس جڑا ہوتا تھا۔ اس لحاظ سے ہر گروہ اپنے تئیں معاشی طور پر آزاد اور خود مختار ہوا کرتا تھا۔ صرف مخصوص اشیاء جو گروہ یا اس علاقے میں دستیاب نہ ہوتیں، اجنبیوں سے حاصل کی جاتی تھیں۔ مثال کے طور پر سیپیاں، صدفیے، رنگ، بر کانی شیشہ وغیرہ۔ یہ بھی سادہ ترین بارٹر یا مبادلے کے زریعے ممکن تھا، 'ہم تمھیں اعلیٰ بر کانی شیشہ دیں گے جس کے بدلے تم ہمیں بہترین قسم کی چقماق لوٹاؤ گے!'۔

زرعی انقلاب برپا ہونے کے ساتھ اس طور میں بہت ہی کم تبدیلی دیکھنے میں آئی۔ زیادہ تر لوگ اب بھی چھوٹی اور انسیت پر مبنی بستیوں میں سکونت رکھتے تھے۔ کسی تاختی گروہ کی طرح، ہر بستی اور گاؤں بھی معاشی طور پر اپنے تئیں خود مختار اور خود کفیل اکائی ہوا کرتا تھا۔ یہاں بھی آپس میں مال اور خدمات کا تبادلہ ہوا کرتا تھا اور صرف مخصوص اشیاء کی دوسرے گاؤں یا بستی کے ساتھ مبادلہ کیا جاتا تھا۔ مثلاً ایک دیہاتی جوتے بنانے کا ماہر موچی تھا تو دوسرا حکمت سمجھنے والا عطائی تھا۔ فلاں اگر مٹی کے برتن بنانے والا کمہار ہے تو یہ کھڈی پر کپڑا بننے والا جولاہا ہے۔ چنانچہ سب کو پتہ تھا کہ اگر کسی کا جوتا ٹوٹ گیا ہے تو کس کے پاس جانا ہے اور کمر درد کا کشتہ کہاں سے ملے گا؟ مٹی کی

رکابیاں کون دے سکتا ہے اور نئے کپڑے کس کے پاس ہوں گے۔ لیکن چونکہ یہ دیہات اور بستیاں چھوٹی اور ان معیشت انتہائی محدود ہوا کرتی تھی تو یہاں کوئی بھی شخص پورا وقت کسی ایک دھندے یا ہنر کے لیے وقف نہیں کرتا تھا۔ موچی، جوتے بھی سی لیتا ہے لیکن وہ گندم بھی اگاتا تھا۔ جولاہے کی کھڈی سارا دن چپ رہتی تھی لیکن شام کے آس پاس چلتی تھی۔

یہ تو قصبات، شہروں اور بادشاہتوں کے ظہور اور نقل و حمل کے ذرائع میں بہتری کا کرشمہ ہے کہ لوگوں کے لیے مخصوص پیشوں اور تجارتی میں مہارت حاصل کرنے کے مواقع پیدا ہوئے۔ گنجان آباد شہروں میں صرف پیشہ ور موچیوں اور حکیموں کے لیے ہی نہیں بلکہ ہر طرح کے پیشہ وروں جیسے جولاہوں، مستریوں، ترکھانوں، کمہاروں، پادریوں، سپاہیوں اور وکیلوں وغیرہ کی بھی جگہ بن گئی۔ صرف افراد ہی نہیں بلکہ کئی کئی دیہات بھی اس لحاظ سے مخصوص پیشوں اور مصنوعات کے لیے مشہور ہو گئے۔ مثلاً وہ دیہات جہاں اعلیٰ ' 'شراب پیدا ہوتی تھی، زیتون کا تیل نکلتا تھا یا ظروف مشہور تھے۔۔۔ پورے پورے گاؤں اور دیہاتوں نے باقی سب مشغولات ترک کر کے یہی مخصوص پیشے جیسے شراب کشیدی اور ظروف سازی وغیرہ اختیار کر لیے۔ ان پیشوں اور کاریگری سے حاصل ہونے والی آمدن سے اب وہ دوسری بستیوں کے ساتھ ان چیزوں کی بہتر تجارت کر سکتے تھے جو انھیں درکار رہتی تھیں۔ یہ طور قابل فہم بھی تھا۔ مٹی کی اقسام مختلف ہوتی ہیں اور ہر جگہ کا اپنا موسم ہوتا ہے۔ تو پھر، اپنے علاقے کے عام انگوروں سے بنائی جانے والی گھٹیا شراب کی بجائے فلاں گاؤں کی اعلیٰ ' 'شراب کیوں نہ نوش کی جائے، جہاں کے انگور اس جگہ کی مٹی اور موسم کی وجہ سے خوب ذائقہ دار ہوتے ہیں؟ اگر آپ کے گاؤں میں پائی جانے والی مٹی سے مضبوط اور خوبصورت برتن بن سکتے ہیں تو پھر ان خوبصورت برتنوں کو زر مبادلہ کے لیے استعمال کیوں نہ کریں؟ یہی نہیں بلکہ کل وقتی طور پر مے فروشی، ظروف سازی، حکمت اور دلالی میں مہارت حاصل کر کے سبھی لوگوں کے فائدے کا سامان کیوں نہ کیا جائے؟ لیکن اس پیشہ وری اور مہارت سے ایک مسئلہ پیدا ہو گیا۔ مسئلہ یہ تھا کہ آخر ان کل وقتی پیشہ وروں کے بیچ مال وغیرہ کا تبادلہ کیسے ہو؟ اس کا کیا انتظام ہو گا؟

بخشیش اور ذمہ داریوں کی بنیاد پر چلنے والی معیشت بڑی تعداد میں اجنبیوں کے بیچ نہیں چل سکتی۔ اپنی بہن یا پڑوسی کو مفت خدمت فراہم کرنا ایک شے ہے لیکن پردیسیوں کی دیکھ بھال کرنا بالکل الگ معاملہ ہے کیونکہ پردیسی آپ کا یہ احسان غالباً کبھی بھی لوٹا نہیں پائیں گے۔ اجنبیوں اور پردیسیوں کے ساتھ بارٹر یا مبادلہ ہو سکتا تھا لیکن اس کی بھی اپنی قیود تھیں۔ مبادلہ تو صرف چند مخصوص اشیاء کے تبادلے پر ہی موقوف تھا۔ یہ کسی پیچیدہ معیشت کی بنیاد نہیں بن سکتا تھا۔

مبادلے کے نظام کی محدودیت کو سمجھنے کی غرض سے فرض کریں، آپ کے پاس اس علاقے کے مشہور باغات کا ایک سیب ہے جس کی قسم عام طور پر پورے صوبے میں ذائقے اور معیار کے لحاظ سے مشہور ہے۔ آپ نے یہ سیب پیدا کرنے کے لیے اپنے باغ میں اتنی محنت کی کہ جوتے پھٹ گئے۔ تو آپ اپنی گدھا گاڑی نکالتے ہیں اور دریا کنارے، وادی میں قصبے کا رخ کرتے ہیں۔ آپ کے پڑوسی

نے آپ کو اس قصبے میں ایک موچی کا پتہ بتایا ہے جس نے اس کے لیے اتنے زبردست جوتے بنائے تھے جو پچھلی پانچ فصلوں کے دوران بھی خراب نہیں ہوئے۔ آپ اس موچی کی دکان پر پہنچتے ہیں اور اس کے ساتھ اپنے اعلیٰ ' ' سیبوں کے عوض مضبوط جوتوں کا سودا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

موچی یہ سودا کرنے میں ہچکچاتا ہے۔ وہ جوتوں کے ایک جوڑے کے عوض کتنے سیبوں کا مطالبہ کرے؟ اس کا ہر روز کئی گاہکوں سے پالا پڑتا ہے۔ آپ کے پاس سیبوں سے بھری بوری ہے جبکہ دوسرے گندم، بکریاں، کپڑا اور نہ جانے کیا کیا لے کر جوتے خریدنے آتے ہیں۔ یہ سب مختلف اشیاء ہیں اور ہر شے کا معیار مختلف ہے۔ کئی تو ایسے بھی آتے ہیں جو کمر درد کا علاج کرنا جانتے ہیں جبکہ اکا دکا تو بادشاہ کے دربار میں عرضی ڈالنے کا طریقہ بھی جانتا تھا۔ اب پچھلی دفعہ جب اس موچی نے سیبوں کے بدلے جوتے فروخت کیے تھے تو وہ تین مہینے پرانی بات تھی۔ اس وقت تو اس نے ایک جوڑے کے عوض تین بوری سیب مانگے تھے۔ یا چار بوری تھے؟ لیکن وہ عام سیب تھے جبکہ یہ تو اعلیٰ ' ' سیب ہیں۔ یہی نہیں، پچھلی دفعہ جو شخص سیبوں کے عوض جوتے خریدنے آیا تھا۔۔ اسے عورتوں کے جوتے درکار تھے جبکہ اب کی بار مردوں کے نسبتاً بڑے اور سخت چمڑے سے بنے جوتے درکار ہیں۔۔ پھر یہ بھی تو ہے کہ حالیہ ہفتوں میں ریوڑوں پر بیماری آگئی تھی تو اچھا چمڑا ملنا بھی محال ہو گیا تھا۔ چمڑا رنگنے والے دباغوں نے بھی پچھلے مہینے کی نسبت اب جوتوں کے ایک مکمل جوڑے کے عوض آدھی مقدار میں چمڑا دینا شروع کر دیا ہے۔ کیا مجھے اس مہنگے چمڑے کے بارے نہیں سوچنا چاہیے؟

بارٹر یا مبادلے پر مبنی معیشت میں موچیوں اور سیب کے کاشتکاروں کو ہر روز درجنوں اجناس کی قیمتوں کو خاطر میں لا کر سودا کرنا پڑتا ہے۔ اگر کسی منڈی میں ہر روز سو کے لگ بھگ اجناس کی تجارت کی جاتی ہو تو اس لحاظ سے خریداروں اور فروخت کنندگان کو ہر روز چار ہزار نو سو پچاس مختلف اشیاء کے مبادلہ پر مبنی نرخ طے کرنے پڑیں گے۔ اگر ایک ہزار اجناس کی تجارت ہو تو پھر انہیں ہر روز چار لاکھ ننانوے ہزار پانچ سو مختلف نرخ اور شرح مبادلہ طے کرنا پڑے گا۔ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟

بلکہ حل کی بجائے یہ معاملہ اور بھی بدتر ہو جائے گا۔ بالفرض اگر آپ جوتوں کے ایک جوڑے کے عوض سیبوں کی تعداد کا تعین، یعنی شرح مبادلہ طے بھی کر لیں تو پھر بھی عین ممکن ہے کہ مبادلہ نہ ہو سکے۔ وہ یوں کہ مبادلے کے ہر بیوپار میں ضروری ہے کہ دونوں فریقین کو وہ شے ملے جو اسے درکار ہے۔ مثلاً، دہقان کو جوتوں کا جوڑا درکار ہے لیکن اگر موچی کو سیب درکار نہ ہوں تو پھر؟ پتہ چلے، موچی کو اعلیٰ ' ' درجے کے سیب نہیں بلکہ طلاق درکار ہے۔ یہ درست ہے کہ اب دہقان کسی ایسے وکیل کو تلاش کر لائے جو اس کے سیبوں کے عوض موچی کو طلاق دلوا دے؟ لیکن کیا پتہ۔۔۔ وکیل کے پاس پہلے سے ہی سیبوں کا انبار لگا ہوا اور اسے کسی حجام کی تلاش ہو جو اس کی شیو بنا سکے؟

بعض معاشروں میں ان مسائل سے نبٹنے کے لیے ایک مرکزی مبادلے کا نظام وضع کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اس مرکزی نظام کے تحت مختلف پیشہ وروں سے ان کی مصنوعات اور خدمات کو جمع کر لیا جاتا تھا اور پھر انھیں ان لوگوں میں تقسیم کر دیا جاتا جنھیں یہ مصنوعات اور خدمات درکار ہوتی تھیں۔ تاریخ میں اس طرح کا سب سے بڑا اور مشہور تجربہ سوویت یونین میں کیا گیا تھا جو انتہائی بری طرح ناکام ہوا۔ اس نظام کے تحت طے ہوا کہ 'ہر شخص اپنی قابلیت کے مطابق خدمات سرانجام دے گا جبکہ اپنی ضروریات کے حساب سے وصول کرے گا' لیکن اصل میں یہ ہوا کہ 'ہر شخص جتنا کم ہو سکتا تھا، جان بچا کر تھوڑی سی خدمات سرانجام دیتا اور بدلے میں جتنا زیادہ ممکن ہو سکتا تھا۔۔۔ ضروریات سے کہیں زیادہ، جس کا جتنا زور چلتا، دھر لیتا تھا'۔ اس ضمن میں چند دوسرے معتدل اور کامیاب تجربات بھی ہوئے۔۔۔ ان میں ایک مثال سلطنت انکا میں دیکھی گئی تھی۔ لیکن تاریخ میں زیادہ تر، بلکہ تقریباً سبھی معاشروں نے پیشہ وروں کی جتنی مرضی بڑی تعداد ہو۔۔۔ ان کے بیچ مبادلے سے متعلق ان مسائل کا انتہائی آسان اور سادہ حل نکال لیا۔ ان معاشروں نے 'زر'، 'دولت' یا 'پیسہ' ایجاد کر لیا۔

کوڑیاں اور سگریٹ

دھن، دولت، زر، سکہ رائج الوقت یا روپیہ پیسہ کئی دفعہ، کئی جگھوں پر مختلف انداز میں ایجاد ہوا۔ اس کی ایجاد کے لیے کسی تکنیک اور نہ ہی روک یا فکر کی ضرورت تھی۔ یہ سراسر ذہنی انقلاب تھا۔ لوگوں نے بس یہ کیا کہ ایک نئی بین موضوعی تصوراتی حقیقت تخلیق کر لی جو سبھی کے اجتماعی سوچ اور تخیل میں وجود رکھتی تھی۔

دھن، دولت، زر یا روپیہ پیسہ۔۔۔ سکے اور نوٹ نہیں ہیں۔ بلکہ یہ تو ہر وہ چیز ہے جو دوسری اشیاء اور خدمات کے مبادلے کے لیے عکس یا نمونے کے طور پر طریق اور نظم و ضبط کے ساتھ پیش کرنے کے خواہشمند ہوں۔ زر یا پیسہ ایسی شے ہے جو لوگوں کو فوری طور پر چیزوں کا تقابل کرنے میں مدد دیتی ہے اور یوں مختلف اشیاء یا خدمات (جیسے سیب، جوتے اور طلاق وغیرہ) کی قیمت کا تعین ہو جاتا ہے۔ جب یہ تعین ہو جائے تو چیزوں کا مبادلہ آسان ہو جاتا ہے اور دولت کو نہایت سہولت کے ساتھ جمع بھی کیا جا سکتا ہے۔ زر یا پیسے کی کئی اقسام ہوتی ہیں۔ ان میں سب سے شناسا قسم ایک معیاری سائز کے مہر شدہ دھاتوں سے بنے سکوں کی ہے۔ لیکن زر یا پیسہ سکوں کی ایجاد سے بھی بہت پہلے وجود رکھتا تھا اور انسانی تہذیب اور معاشرے مختلف اشیاء کو زر یا کرنسی کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ سیپیاں، صدفیے، ڈھور ڈنگر، چمڑی، نمک، غلہ، موتی، منکے، کپڑا اور اقراری نوٹ وغیرہ۔۔۔ کوڑیاں اور سیپیاں تقریباً چار ہزار سال تک زر یا پیسے کے طور پر افریقہ،

جنوبی ایشیاء، مشرقی ایشیاء اور بحرالکاہل کے جزائر میں استعمال ہوتا رہا ہے۔ یہاں تک کہ بیسویں صدی کے اوائل تک برطانوی سامراج میں یوگنڈا کے لوگ کوڑیوں اور سیپیوں کی شکل میں ٹیکس ادا کرتے تھے۔
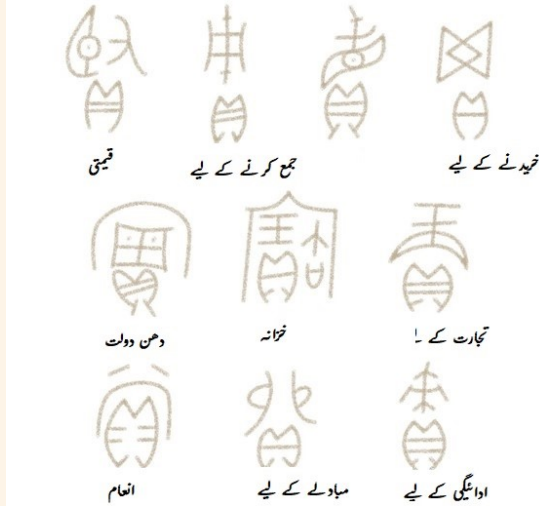
26: قدیم چینی رسم الخط میں کوڑیوں پر یہ عبارتیں کندہ کی جاتی تھیں۔ یہ کوڑیاں زر اور پیسے کے طور پر استعمال ہوتی تھیں، مثلاً 'خریداری' اور 'ادائیگی' وغیرہ کے لیے

جدید جیلوں اور جنگی قید خانوں میں سگریٹ زر کی صورت میں استعمال ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ سگریٹ استعمال نہ کرنے والے قیدی بھی سگریٹ کو ادائیگی کے لیے قبول کرتے ہیں۔ جیلوں میں سبھی اشیاء اور خدمات کی قیمت سگریٹوں میں ہی طے ہوتی ہے۔ آؤشوٹس کے نازی کیمپ میں بچ جانے والے ایک قیدی نے سگریٹ کے بطور کرنسی استعمال بارے بتایا، 'ہماری اپنی کرنسی ہوا کرتی تھی جس کی قدر و قیمت بارے کوئی سوال نہیں اٹھاتا تھا۔ یہ کرنسی سگریٹ تھی۔ ہر شے کی قیمت سگریٹوں میں بیان ہوتی تھی۔ مثلاً 'عام' حالات۔۔۔ یعنی جن دنوں کے دوران قیدیوں کو قاعدے کے مطابق گیس چیمبروں میں بھیجا جاتا تھا، ڈبل روٹی کی قیمت بارہ سگریٹ، مارجرین کے تین سو گرام پیکٹ کی قیمت تیس سگریٹ، گھڑی کی قیمت اسی سے دو سو سگریٹ جبکہ ایک لیٹر شراب کی بوتل چار سو سگریٹوں میں ملتی تھی۔'

در حقیقت، آج بھی سکے اور بینک نوٹ زر یا پیسے کی نادر شکل ہیں۔ وہ یوں کہ مثال کے طور پر 2006ء میں دنیا میں زر یا پیسے کی کل مالیت چھ سو کھرب امریکی ڈالر ہے لیکن سکوں اور بینک نوٹوں کی شکل میں پوری دنیا میں صرف ساٹھ کھرب امریکی ڈالر پائے جاتے ہیں۔ یعنی، زر یا پیسے کا نوے فیصد حصہ صرف ہمارے بینک اکاؤنٹوں میں، یعنی صرف کمپیوٹروں پر درج ہندسوں کی شکل میں ہے۔ دنیا میں تقریباً ہر جگہ بڑے بڑے تجارتی بیوپار اور سودے ایک کمپیوٹر فائل سے دوسری کمپیوٹر فائل میں زر سے متعلق معلومات اور ریکارڈ کے تبادلے کی صورت ہوتا ہے اور واقعی نقدی کا کوئی تبادلہ نہیں ہوتا۔ آج صرف جرائم پیشہ لوگ ہی ہیں جو گھروں اور مہنگی گاڑیوں وغیرہ کی خرید و فروخت بینک نوٹوں کے بھرے ہوئے سوٹ کیسوں کے تبادلے سے کرتے ہیں۔ جب تک لوگ مال و اشیائے منقولہ اور خدمات کی

لین دین برقی ریکارڈ اور برقی ٹرانزیکشن کی صورت میں کرتے رہیں گے تو بہتر ہی ہے کیونکہ یہ چمکتے ہوئے سکوں اور کڑکتے بینک نوٹوں سے بہتر ہے۔ اس میں سہولت ہے، محفوظ اور اس کا ریکارڈ رکھنا بھی آسان ہے۔

لیکن اس کے باوجود کمرشل نظاموں کو چلانے کے لیے زر کی بعض اقسام کا وجود لازمی ہے۔ زر کی بنیاد پر چلنے والی معیشت میں ایک موچی کے لیے صرف اتنا کافی ہے کہ وہ اپنی دکان پر مختلف جوتوں کی قیمت یاد رکھے۔ اسے جوتوں اور سیبوں یا بکریوں وغیرہ کے بیچ شرح مبادلہ بارے پریشانی کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ زر یا پیسہ سیب کے مالکان کے لیے بھی آسانی پیدا کرتا ہے کیونکہ اسے جوتے خریدنے کے لیے ایسے کسی موچی کو تلاش کرنے کی ضرورت نہیں جسے سیبوں کی طلب ہو یا کوئی ایسا وکیل جو اس کے سیب لے کر، موچی کی طلاق کروا دے تو تبھی اسے پہننے کے لیے جوتے دستیاب ہو سکتے ہیں۔ موچی اور سیب مالکان کے لیے آسانی کی وجہ یہ ہے کہ ہر شخص ہمیشہ ہی پیسے کا طلب گار ہوتا ہے۔ غالباً یہ زر یا پیسے کی سب سے بنیادی خصوصیت ہے۔ ہر شخص کو ہمیشہ پیسہ اس لیے درکار ہوتا ہے کیونکہ دوسرے لوگوں کو بھی ہر وقت پیسہ درکار رہتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ زر یا پیسے کے عوض جو آپ چاہیں، جس چیز کی ضرورت ہو۔۔۔ اس کا مبادلہ کر سکتے ہیں۔ ایک موچی ہمیشہ ہی آپ کا پیسہ بخوشی وصول کرے گا کیونکہ ان پیسوں کے عوض وہ جو شے چاہے، سیب، بکری، چمڑا، کپڑا، طلاق۔۔۔ خرید سکتا ہے۔

اس لحاظ سے زر یا پیسہ ایک ایسا آفاقی زریعہ بن جاتا ہے جو لوگوں کو کسی بھی شے کو کسی دوسری شے میں بدلنے کی آزادی فراہم کرتا ہے۔ فوج سے ریٹائر ہونے والا کوئی بھی مضبوط پٹھا فوج میں خدمات کے عوض ملنے والا پیسہ کالج میں پڑھائی پر خرچ کر کے اپنے دماغ کو بھی استعمال میں لا سکتا ہے۔ زرعی زمین کو پیسے کے عوض بیچ کر ملنے والی زر کو کاروبار میں لگانے سے ایک دہقان، دکاندار بن سکتا ہے۔ کسی مریض کا علاج کر کے ڈاکٹر صاحبان پیسہ کما سکتے ہیں اور اس پیسے کی مدد سے کسی وکیل کی فیس ادا کر کے یا کسی جج کو رشوت دے کر دیرینہ مقدمہ جیت سکتے ہیں۔ یعنی، صحت کو انصاف میں بدلا جا سکتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ پیسے یا زر کی مدد سے جنسی تعلقات کو نجات یا مکتی میں بدل دیا جائے۔ مثلاً پندرھویں صدی میں کوٹھوں پر پیسے کے عوض اپنا جسم بیچ کر بعد ازاں اس پیسے میں سے کچھ حصہ کیتھولک چرچ کو خیرات کی صورت ادا کر کے دنیا میں معافی اور اخروی زندگی میں مکتی حاصل کر سکتی تھیں۔

زر کی معیاری اقسام لوگوں کو نہ صرف کسی ایک شے کو دوسری شے میں بدلنے کی سہولت بلکہ دھن اور دولت کو جمع کرنے کی صورت بھی فراہم کرتی ہیں۔ کئی قیمتی اشیاء کو جمع کر کے زخیرہ نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً وقت اور حسن کو زخیرہ نہیں کیا جا سکتا۔ بعض اشیاء کو صرف مختصر عرصے کے لیے زخیرہ کیا جا سکتا ہے، مثلاً سٹرابری جلد ہی خراب ہو جاتی ہے۔ بعض چیزیں خاصی دیرپا اور پائیدار تو ہوتی ہیں لیکن وہ بہت سی جگہ گھیرتی ہیں اور انھیں زخیرہ کرنے پر الگ خرچہ اٹھتا ہے۔ مثال کے طور پر غلے کو کئی برسوں تک زخیرہ کیا جا سکتا ہے لیکن اس کے لیے بڑے بڑے گودام چاہیے ہوتے ہیں اور چوہوں، پھپھوندی، پانی، آگ اور چوروں سے بچاؤ کا انتظام بھی کرنا پڑتا ہے۔ پیسہ

چاہے وہ کسی صورت میں بھی ہو۔۔۔بینک نوٹ، سکے، کمپیوٹر کے ڈیٹا یا کوڑیوں اور سیپیوں کی شکل میں ہو،ان تمام مسائل کو بھی حل کر دیتا ہے۔ کوڑیاں اور سیپیاں گلتی سڑتی نہیں ہیں، چوہوں کو ہضم نہیں ہوتیں اور آگ میں جلتی بھی نہیں ہیں۔یہی نہیں یہ اتنی ٹھوس اور کسی ہوئی دبی چھوٹی ہوتی ہیں کہ باآسانی ایک تجوری میں جمع کی جاسکتی ہیں۔

دولت کو استعمال کرنے کے لیے اس کو ذخیرہ کرنا ہی کافی نہیں ہوتا۔ اس کو بعض دفعہ نقل و حمل کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ دولت کی بعض اشکال جیسے جائیدادیں وغیرہ کی سرے سے نقل و حمل ممکن ہی نہیں ہوتی۔ اسی طرح بعض اشیاء جیسے گندم اور چاول وغیرہ کو منتقل کرنے کے لیے کافی پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ کسی ایسے امیر کبیر زمیندار کے بارے سوچیں، جس کی بسر ایسی جگہ ہو جہاں پیسہ نہ چلتا ہو۔ وہ زمیندار کسی دوسرے صوبے میں نقل مکانی کرنا چاہے تو کیا ہو گا؟اس کی کل دھن اور دولت اس کا عالیشان گھر اور چاول کے کھیت ہیں۔ یہ امیر کبیر دہقان اپنے گھر اور چاول کی کھیتیوں کو ساتھ نہیں لے جاسکتا۔ یہ ہوسکتا ہے کہ وہ اپنی اس جائیداد کے عوض کسی دوسرے مالدار زمیندار سے چاول کی بھاری مقدار وصول کرلے لیکن اس چاول کو دوسری جگہ منتقل کرنا اور اس کی حفاظت الگ درد سر ہو گا۔ پیسہ، اس زمیندار کے یہ مسائل حل کر سکتا ہے۔ اگر وہ زمیندار اپنے گھر اور کھیتیوں اور کھلیان کو ایک بوری کوڑیوں یا بینک نوٹوں کے عوض فروخت کرلے تو وہ اس بوری کو جہاں چاہے ساتھ لے جاسکتا ہے۔

اب چونکہ زر یا پیسہ ایسی شے ہے جو تبدیل کیا جاسکتا ہے، اس کی کئی اشکال اور اقسام ہوسکتی ہیں، اس کو جمع کر کے باآسانی ذخیرہ بھی کیا جا سکتا ہے اور اس کی نقل و حمل بھی آسان ہوتی ہے۔ ان ساری خصوصیات کا نتیجہ ہے کہ اس کی بدولت جلد ہی انتہائی پیچیدہ تجارتی نیٹ ورک تشکیل پا گئے اور طرح طرح کی محرک منڈیاں اور بازار بھی نکل آئے۔ اگر پیسہ نہ ہوتا تو یہ کمرشل نیٹ ورک، تجارتی جال اور ہمہ جہت منڈیاں ہمیشہ ہی محدود جبکہ پیچیدگیوں اور حرکیات سے خالی رہتیں۔

پیسہ کیسے چلتا ہے؟

بات یہ ہے کہ چاہے یہ سمندری کوڑیاں ہوں یا امریکی ڈالر۔۔۔ ان کی قدر و قیمت صرف ہمارے اجتماعی تصور اور عام فہم میں پائی جاتی ہے۔ کوڑیوں اور امریکی ڈالروں کی اصل قدر و قیمت، کوڑیوں یا کاغذ کی کیمیائی خصوصیت میں، ان کے رنگوں اور شکل وغیرہ میں نہیں ہوتی۔ دوسرے الفاظ میں زر یا پیسہ کوئی مادی حقیقت نہیں ہے بلکہ یہ ایک نفسیاتی ترکیب ہے۔ یہ اسی صورت کام کرتا ہے جب کوئی مادی شے، سمجھ اور عقل میں ڈھل جائے۔ لیکن اس کی کامیابی کی وجہ کیا ہے؟ یہ سوال تو پیدا ہوتا ہی ہے کہ آخر کوئی بھی ذی شعور اور عقلمند شخص چاول کی زرخیز کھیتی کو مٹھی بھر کوڑیوں یا کاغذ کے ٹکڑوں کے عوض کیوں بیچ دے گا؟ آپ کو کیا پڑی ہے کہ دن بھر

تپتے ہوئے توے پر بر گر کے بن الٹاتے، صحت کی سہولت بیچتے اور گھنٹوں دماغ کو ماؤف کر دینے والے بچوں کی آیا گیری میں گزار دیتے ہیں جبکہ اس کے بدلے میں آپ کو چند رنگین کاغذوں کے سوا کچھ بھی نہیں ملتا؟

لوگ یہ سب اسی وقت کرتے ہیں جب انھیں سب کے اجتماعی تخیل اور تصور پر اعتبار ہوتا ہے۔ اعتبار اور بھروسا وہ خام مال ہے جس سے دنیا بھر کے ٹکسالوں میں پیسہ اور زر تیار کیا جاتا ہے۔ جب ایک امیر کبیر زمیندار اپنی ساری جائیداد بوری بھر کوڑیوں کے عوض فروخت کر کے دوسرے صوبے کا رخ کرتا ہے تو اسے یقین ہوتا ہے کہ اس کی منزل پر لوگ ان کوڑیوں کے عوض اسے بھی چاول کی کھیتیاں، ایک گھر اور کھلیان فروخت کرنے پر تیار ہوں گے۔ اسی لیے پیسے یا زر کا نظام، باہمی اعتماد اور ساکھ کا واقعی نظام ہے اور صرف ایک باہمی اعتماد کا نظام نہیں ہے۔ مراد یہ ہے کہ آج تک تاریخ میں تشکیل دیے جانے والے باہمی تعاون، اشتراک اور اعتماد کے ہر نظام کے مقابلے میں پیسے یا زر کا نظام صحیح معنوں میں آفاقی اور موثر ترین، بر تر نظام ہے۔

اس اعتماد کو قائم کرنے میں نہایت پیچیدہ اور طویل مدتی سیاسی، سماجی اور معاشی محرکات کا عمل دخل ہے۔ مثال کے طور پر خود سے پوچھیے کہ آپ ایک کوڑی، سونے کے سکے یا ڈالر کے نوٹ پر اتنا یقین اور اعتماد کیوں رکھتے ہیں؟ اس کی سادہ سی وجہ ہے اور وہ یہ کہ میرے پڑوسی بھی اس پر یقین رکھتے ہیں۔ میرے پڑوسی اس لیے یقین رکھتے ہیں کیونکہ میں ان چیزوں پر یقین رکھتا ہوں۔ ہم سب ان سب چیزوں پر یقین رکھتے ہیں کیونکہ ہمارے ملک کا سربراہ ان پر یقین رکھتا ہے اور انہی چیزوں کی شکل میں ہم سے ٹیکس کا مطالبہ کرتا ہے۔ پادری اور مولوی بھی اس پر یقین رکھتے ہیں کیونکہ وہ ہر سال ہماری پیداوار کا دسواں حصہ عشر کی شکل میں انہیں چیزوں کی صورت میں ہم سے ادا کرواتے ہیں۔ آپ ایک کرنسی نوٹ، مثال کے طور پر امریکی ڈالر کا کوئی بھی نوٹ نکال کر اسے غور سے دیکھیں۔ یہ ایک رنگین کاغذ ہے جس کی ایک جانب امریکی وزیر خزانہ کے دستخط ثبت ہیں جبکہ دوسری جانب 'In God We Trust' یا 'ہم خدا میں یقین رکھتے ہیں' کے الفاظ نعرے کی مانند چھپے ہیں۔ ہم امریکہ ڈالر کو ادائیگیوں کے لیے قبول کرتے ہیں کیونکہ ہم خدا اور امریکی وزیر خزانہ میں یقین رکھتے ہیں۔ اعتماد اور بھروسے کا یہ انتہائی اہم کردار ہے جس کی بدولت پتہ چلتا ہے کہ ہمارا مالیاتی نظام کس طرح سے ہمارے سیاسی، سماجی اور نظریات کے تصوراتی نظام سے انتہائی مضبوطی کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ ہمیں یہ پتہ چلتا ہے کہ ہمارے مالیاتی بحران۔۔۔ سیاسی بحرانوں کی وجہ سے کیوں سر اٹھاتے ہیں اور ہمیں پتہ چلتا ہے کہ حصص کی تجارتی منڈیاں ہر روز تاجروں کے دنیاوی اور معاشرتی معاملات بارے اطمینان، شکوک و شبہات، آراء اور احساسات کی وجہ سے بنتی یا بگڑتی کیوں ہیں؟

اوائل دور میں جب پیسہ تخلیق کیا گیا تو لوگوں کو اس قدر اعتماد نہیں ہوا کرتا تھا۔ چنانچہ، یہ ضروری تھا کہ ان اشیاء کو 'پیسے' یا 'زر' کی صورت استعمال کیا جائے جن کی واقعی یا حقیقی قدر و قیمت رہا کرتی تھی۔ اس ضمن میں تاریخ کی زر کی سب سے پہلی شکل سمیریوں کے یہاں باجرے کی بطور زر استعمال بہترین مثال ہے۔ زر کی یہ اولین قسم سمیر میں 3000 قبل مسیح میں سامنے آئی۔ یہ عین وہی زمان و

مکان ہے جب پہلی بار تحریر ایجاد ہوئی تھی۔ جس طرح تحریر کی شکل میں انتظامی مسائل کا حل نکل آیا تھا، اسی طرح باجرے کی شکل میں معاشی مسائل کا بھی حل نکال لیا گیا تھا۔

زر باجرہ، باجرہ ہی تھا۔ باجرے کی مخصوص مقدار کو 'آفاقی' طور پر باقی تمام اشیاء صرف اور خدمات کی قیمت طے کرنے اور مبادلے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ اس ضمن میں سب سے عام پیمانہ 'صلہ' ہوا کرتا تھا۔ ایک صلہ، کم و بیش ایک لیٹر کے برابر ہوا کرتا تھا۔ ایک معیار کے تحت بڑے پیمانے پر ایسے پیالے وسیع مقدار میں پیدا کیے گئے جن میں ایک 'صلہ' باجرہ ماپا جاسکتا تھا۔ چنانچہ جب لوگ کوئی بھی چیز خریدنا یا بیچنا چاہتے تو باجرے کی ضروری مقدار ان پیالوں سے صلوں میں ناپ کر ادا یا وصول کر لی جاتی تھی۔ تنخواہیں بھی باجرے کے صلوں میں ادا کی جاتی تھیں۔ مثال کے طور پر ایک مرد مزدور کی ماہانہ تنخواہ باجرے کے ساٹھ صلے ہوا کرتی تھی جبکہ عورت مزدور کی ماہانہ تنخواہ تیس صلے مقرر تھی۔ ایک فورمین تقریباً بارہ سو سے پانچ ہزار باجرے کے صلے کمالیتا تھا۔ اب ظاہر ہے کوئی بھی فورمین بلکہ جنم جنم کا کوئی بھوکا فورمین بھی ایک مہینے میں باجرے کے پانچ ہزار لیٹر نہیں کھاسکتا تھا لیکن وہ خوراک کے علاوہ صلوں کو دوسری ہر طرح کی اشیائے ضرورت جیسے تیل، بکریاں، غلام اور باجرے کے علاوہ کھانے پینے کی اشیاء وغیرہ خریدنے کے لیے استعمال کرسکتا تھا۔

اگرچہ باجرے کی حقیقی قدر و قیمت ضرورت تھی لیکن لوگوں کو دوسری اشیاء کی بجائے صرف باجرے کو ہی بطور 'زر' استعمال کرنے آمادہ کرنا آسان نہیں تھا۔ اس کی وجہ سمجھنے کے لیے صرف یہی مثال کافی ہوگی کہ اگر آج آپ ایک بوری میں باجرہ بھر کر کسی شاپنگ سینٹر میں جا کر اس کے عوض پیزا یا کوئی شرٹ خریدنے کی کوشش تو کر کے دکھائیں؟ کیا ہوگا۔۔۔غالباً پہلے تو دکاندار آپ کو سنکی سمجھیں گے، پھر وہ سیکورٹی کو بھلا بھیجیں گے۔ لیکن ان مشکلات کے باوجود باجرے کو بطور اولین 'زر' متعارف کروا کر لوگوں کا بھروسہ حاصل کرنا اس لیے نسبتاً آسان رہا ہوگا کیونکہ فطری طور پر باجرے کی ایک حیاتیاتی اور نامیاتی قدر و قیمت ضرور ہے۔ انسان باجرے کو خوراک کے طور پر استعمال کرسکتے تھے جبکہ دوسری جانب، باجرے کو ذخیرہ کرنا اور اس کی نقل و حمل انتہائی مشکل کام تھا۔ یعنی، کوئی بھی بڑی مقدار میں باجرہ چرا بھی نہیں سکتا تھا اور اگر چرا لے بھی جاتا تو زیادہ دور تک نہیں لے جاسکتا تھا۔ زر سے متعلق تاریخ میں سب سے اہم مرحلہ تو اس وقت طے ہوا جب لوگوں کا زر کی ان اشکال میں اعتماد قائم ہوا جس کی کوئی فطری قدر و قیمت تو نہیں تھی لیکن اس کو ذخیرہ کرنا اور اس کی نقل و حمل نہایت آسان تھی۔ اس طرح کی زر قدیم عراقی تمدن میں تقریباً ساڑھے پانچ ہزار سال پہلے سامنے آئی۔ یہ چاندی کے بٹے تھے۔

چاندی کے بٹے، سکے نہیں تھے بلکہ ایک بٹہ سوا آٹھ گرام چاندی کے وزن برابر ہوا کرتا تھا۔ جب حمورابی کے قانون میں حکم جاری کیا گیا کہ ایک عالی نسب شخص کے ہاتھوں کسی غلام عورت کے قتل کا ہرجانہ چاندی کے بیس بٹے ہوں گے تو مراد بیس سکے نہیں بلکہ تقریباً ایک سو چھیاسٹھ گرام چاندی ہوا کرتی تھی۔ زر سے متعلق قدیم عہد ناموں میں حوالے سکوں کی بجائے چاندی کی صورت بیان کیے گئے

ہیں۔ یوسف کے بھائیوں نے یوسف کو اسماعیلیوں کے ہاتھ چاندی کے بیس بٹوں کے عوض فروخت کیا تھا یا کہیے کہ ایک سو چھیاسٹھ گرام چاندی کے عوض فروخت کیا تھا۔ اس زمانے میں یہ ایک غلام عورت کی قیمت کے برابر زر تھا۔
باجرے کے صلوں کے برعکس، چاندی کے بٹوں کی حقیقی معنوں میں کوئی قدر و قیمت نہیں تھی۔ آپ چاندی کو کھا نہیں سکتے۔ اسے پیا بھی نہیں جا سکتا اور اس کو اوڑھنا بھی ممکن نہیں ہے۔ چاندی اتنی نرم ہوتی ہے کہ اس سے کار آمد اوزار بھی نہیں بنائے جا سکتے۔ چاندی سے نہ تو ہل اور نہ ہی تلواریں بنائی جا سکتی ہیں۔ انھیں زیادہ سے زیادہ زیورات، تاج اور رتبہ ظاہر کرنے کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ ان سے پر تعیش اشیاء بنائی جا سکتی ہیں جن کی مدد سے کسی مخصوص معاشرے کے افراد اونچے سماجی رتبے کی نمود کر سکتے تھے۔ چاندی اور سونے کی قدر و قیمت صرف اور صرف ثقافتی ہے، یعنی تصوراتی ہے۔
قیمتی دھاتوں کے طے شدہ وزن کے نتیجے میں سکوں نے جنم لیا۔ تاریخ میں پہلی بار 640 قبل مسیح میں مغربی اناطولیہ کے شہنشاہ الیاتس کے دور میں سکے متعارف کروائے گئے۔ یہ سونے اور چاندی کے معیاری وزن کے حامل سکے تھے اور ان پر مخصوص شناختی علامات نقش کی گئی تھیں۔ یہ نقش کردہ علامات دو چیزوں کی تصدیق تھی۔ پہلی یہ کہ کسی بھی سکے میں قیمتی دھات کی کتنی مقدار شامل تھی۔ جبکہ دوم یہ کہ زیر استعمال سکہ کس مقتدر حاکم نے جاری کیا تھا اور وہی اس سکے کی ترکیب کا ضامن تھا۔ آج بھی، دنیا بھر میں جتنے سکے استعمال ہوتے ہیں۔۔۔ دراصل شہنشاہ الیاتس کے دور میں جاری کردہ سکوں کے نمونوں پر جاری کیے جاتے ہیں۔
سکوں کو بغیر تصدیق شدہ مہر کی حامل قیمتی دھات کی ڈلیوں پر دو انتہائی اہم طرح سے فوقیت حاصل تھی۔ پہلی تو یہ قیمتی دھات کی ڈلیوں اور بٹوں کو ہر سودے سے قبل تولنا پڑتا تھا جبکہ سکے اس کوفت سے آزاد تھے۔ دوسری یہ کہ قیمتی دھات کی ڈلیوں اور بٹوں کو صرف تولنا ہی کافی نہیں تھا۔ مثال کے طور پر ایک موچی کو کس طرح پتہ چلے گا کہ جوتوں کے عوض ادا کئے گئے چاندی کے بٹے، خالص چاندی ہی ہیں؟ اسے کیسے پتہ چلتا کہ یہ خالص چاندی نہیں بلکہ سیسہ ہے جس پر چاندی کا پانی چڑھا رکھا ہے؟ سکوں کی مدد سے یہ شبہ بھی جاتا رہا تھا۔ سکوں کے اوپر نقش کردہ علامات اور معلومات سے ان کی اصل قیمت کا پتہ چل جاتا تھا۔ چنانچہ، کسی بھی موچی کو اپنی دکان میں ایک ترازو رکھنے کی کوئی حاجت باقی نہیں رہی تھی۔ اس سے بھی اہم یہ تھا کہ سکوں کے اوپر ایک سیاسی حاکم کا دستخط ثبت تھا جو اس سکے کی اصل قیمت کی ضمانت ہوا کرتی تھی۔
نقش کردہ علامات کی اشکال اور حجم تاریخ بھر میں مختلف رہا ہے لیکن پیغام ہمیشہ ایک ہی ہوا کرتا تھا، 'میں۔۔۔ شہنشاہ فلاں ابن فلاں، آپ کو اپنی ذاتی ضمانت دیتا ہوں کہ اس دھاتی سکے میں بعینہ پانچ گرام سونا شامل کیا گیا ہے۔ اگر کسی نے اس سکے میں کھوٹ ملانے کی کوشش کی تو اس کا مطلب شہنشاہ فلاں ابن فلاں کے دستخط میں کھوٹ تصور ہو گی۔ یہ شہنشاہ فلاں ابن فلاں کی ساکھ پر وار اور اعتماد کو ٹھیس کے مترادف ہے۔ میں۔۔۔ شہنشاہ فلاں ابن فلاں اس جرم کی سخت سے سخت سزا دوں گا'۔ یہی وجہ ہے کہ زر یا پیسے میں

کھوٹ اور تلبیس، جعلسازی آج بھی غداری جتنابڑا جرم ہی تصور کیا جاتا ہے۔ زر اور پیسے میں جعلسازی صرف دھوکا یا جھانسہ نہیں ہوتا بلکہ یہ کسی بھی ریاست، اس کے حکمران یا بادشاہ کی خود مختیاری، طاقت، اختیار، استحقاق اور ساکھ پر وار ہے۔ اس جرم کے لیے قانونی طور پر 'lese-majesty' یا 'شان جاہ جلال کی بے حرمتی' کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ عام طور پر اس جرم کی سزا تعذیب اور اذیت کے بعد موت ہوا کرتی تھی۔ جب تک لوگ کسی بادشاہ کی ساکھ اور طاقت میں یقین رکھتے تھے، وہ سکہ رائج الوقت میں بھی اعتبار کرتے تھے۔ دنیا بھر کے کسی کونے میں بسنے والا شخص بھی رومی کرنسی کے سکوں پر یقین کر لیتا تھا کیونکہ وہ رومی شہنشاہ کی طاقت اور سالمیت پر اعتبار رکھتا تھا۔ وہ اس سکے پر نہیں بلکہ اس شہنشاہ کی نقش کردہ شبیہ کی ساکھ پر یقین رکھتا تھا۔

27: قدیم ترین سکہ، ساتویں صدی قبل مسیح میں جاری کیا گیا اناطولیہ کے شہنشاہ الیاتس کی جانب سے جاری کیا گیا سکہ

اس لحاظ سے شہنشاہوں کی طاقت، رومی کرنسی کے سکوں پر دھری رہتی تھی۔ ذرا سوچیے، رومی سلطنت کو سکوں کے بغیر چلانا کس قدر مشکل ہوتا؟ اگر شہنشاہ کو ٹیکس اور تنخواہیں باجرے اور گندم کی شکل میں ادا کرنی پڑ جاتیں تو سلطنت سرے سے چل ہی نہ پاتی۔ رومی سلطنت کے لیے کسی طور یہ ممکن نہ ہوتا کہ شام میں باجرے کو بطور 'زر' ٹیکس وصول کر کے، اس بھاری مقدار کو روم کے خزانے میں جمع کروایا جاتا۔ وہاں سے اس ذخیرے کو دوبارہ برطانیہ کی سرحد پر واقع چھاؤنی میں بھجوایا جاتا تا کہ وہاں مامور فوجی دستوں کو تنخواہیں ادا کی جا سکیں۔ اسی طرح سلطنت کے معاملات اس وقت بھی چلانا مشکل ہو جاتا اگر رومی سلطنت کے باشندے چاندی نہیں بلکہ سونے کے سکوں میں یقین رکھا کرتی۔ یا کہیے کہ چاندی کی بجائے لوگ کوڑیوں، ہاتھی دانت سے بنے منکوں یا کپڑے کے تھان کی قدر و قیمت پر شہنشاہی مہر اور نقوش پر مبنی چاندی کے سکوں سے بڑھ کر یقین رکھتے؟

سونے اور زر کا عقیدہ

رومی کرنسی سکوں میں لوگوں کا اعتماد اور بھروسا اتنا مضبوط تھا کہ سلطنت کی سرحدوں سے باہر بھی لوگ چاندی کے ان رومی سکوں میں ادائیگیوں کو بخوشی وصول کر لیتے تھے۔ پہلی صدی عیسوی میں رومی کرنسی یعنی چاندی کے سکے ہندوستان کی تجارتی منڈیوں میں بھی

مبادلے کے لیے استعمال ہوا کرتے تھے حالانکہ یہاں سے روم کی قریب ترین سرحدی فوجی چھاؤنی ہزاروں کلومیٹر دور تھی۔ ہندوستانیوں کو رومی کرنسی اور شہنشاہ کی مہر اور شبیہ پر اتنا اعتماد رہا کرتا تھا کہ جب ہندوستان کے مقامی حکمرانوں نے اپنے سکے جاری کیے تو ان سکوں پر بھی ہو بہو، رومی شہنشاہ کی مہر اور شبیہ ثبت کی۔ تب، رومی کارنسی سکوں کا نام 'دینارِس' ہوا کرتا تھا اور دینارِس سکوں کا عام نام مشہور ہو گیا۔ سکوں کو دینارِس کہا جانے لگا۔ مسلمان خلفاء نے بعد ازاں اسی نام کو عربی میں ڈھال کر 'دینار' قرار دیا۔ آج بھی اردن، عراق، سربیا، مقدونیہ، تیونس اور کئی دوسرے ممالک کی سرکاری کرنسی کا نام دینار ہی ہے۔

جب لیدائی سکوں کا نظام بحیرہ روم کے آس پاس سارے خطے سے لے کر بحیرہ ہند کے علاقوں تک پھیل رہا تھا تو اسی زمانے میں چینیوں نے قدرے مختلف مالیاتی نظام وضع کیا۔ یہ نظام کانسی کے سکوں اور بلانشان چاندی اور سونے کی ڈلیوں پر مبنی تھا۔ ان دونوں مالیاتی نظاموں میں کئی قدریں مشترک تھیں، جیسا کہ دونوں ہی نظاموں میں چاندی اور سونے کا بیش بہا استعمال کیا گیا تھا۔ انہی مشترک قدروں کی بنیاد پر چین اور لیدائی سلطنتوں کے بیچ تجارتی تعلقات قائم ہو سکے تھے ورنہ یہ ممکن نہ ہوتا۔ مسلمان اور یورپی تاجروں اور فاتحین نے بتدریج لیدائی مالیاتی نظام اور سونے پر یقین کے عقیدے کو کرہ ارض کے کونے کونے تک پھیلا دیا۔ جدید دور کے آغاز تک پوری دنیا میں ایک ہی مالیاتی نظام رائج ہو چکا تھا۔ یہ نظام پہلے پہل سونے اور چاندی پر انحصار کرتا تھا جو بعد میں چند گنی چنی مضبوط کرنسیوں جیسے برطانوی پاؤنڈ اور امریکی ڈالر تک محدود ہو کر رہ گیا۔

ایک واحد بین الاقوامی اور بین الثقافتی مالیاتی نظام تشکیل پایا تو اس کی بنیاد پر پہلے پہل افریشیائی دنیا متحد ہو گئی جبکہ آگے چل کر یہ پوری دنیا کو واحد معاشی اور سیاسی کرہ میں تبدیل کرنے کا سبب بھی بن گیا۔ لوگ آج بھی آپس میں ناقابل فہم اور طرح طرح کی بعید از قیاس زبانیں بولتے ہیں، مختلف طرز کی حکومتوں کی پیروی کرتے ہیں، جداگانہ عقائد اور ہر طرح کے خداؤں کو پوجتے ہیں لیکن یہ سب سونے اور چاندی میں ایک ہی طرح کا یقین بھی رکھتے ہیں۔ اس دنیا میں بسنے والے ہر شخص کو چاندی اور سونے کے سکوں میں ایمان کی حد تک اعتبار ہے۔ اس 'آفاقی' یقین کے بغیر بین الاقوامی سطح پر تجارت ناممکن ہوتی۔ سولہویں صدی عیسوی کے ہسپانوی فاتحین نے جو سونا اور چاندی امریکہ میں دریافت کیا تھا، اس کی مدد سے یورپی تاجروں نے مشرقی ایشیاء میں ریشم، چینی ظروف اور مسالہ جات خریدے اور یوں یورپ اور مشرقی ایشیاء کے بیچ معاشی ترقی کا سبب بنے۔ میکسیکو اور انڈیز کی کانوں سے نکلنے والا سونا یورپی ہاتھوں میں سے نکل کر بالآخر چینی ریشم اور ظروف بنانے والے کاریگروں کی جیبوں تک پہنچا۔ ذرا سوچیے، عالمی معیشت کا کیا رخ ہوتا اگر چینیوں کو بھی سونے اور چاندی کے خبط کی 'دل کی بیماری' لاحق نہ ہوتی جو کبھی ہسپانوی فاتحین کو لاحق تھی۔ دنیا کی معیشت کہاں کھڑی ہوتی، اگر چینی سونے اور چاندی میں ادائیگیوں کو رد کر دیتے؟

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر چینی، ہندوستانی، مسلمان اور ہسپانوی وغیرہ جو ایک دوسرے بالکل مختلف تہذیبوں اور تمدن سے تعلق رکھتے ہیں۔۔۔یہ آپس میں کسی بھی شے پر اتفاق نہیں کرتے لیکن اس کے باوجود یہ سونے پر ایک ہی جیسا باہمی یقین کیسے رکھ سکتے ہیں؟ آخر کیوں؟ باقی معاملات کی طرح، یہاں بھی ایسا کیوں نہیں ہوا کہ ہسپانوی سونے میں، مسلمان باجرے، ہندوستانی کوڑیوں جبکہ چینی ریشم کے بنڈلوں پر اعتبار اور یقین کیا کرتے؟ معیشت دانوں کے پاس اس سوال کا جواب پہلے سے تیار ہے۔ ہوتا یوں ہے کہ جب تجارت دو مختلف علاقوں کو آپس میں جوڑتی ہے تو فوراً ہی رسد اور طلب کی قوتیں قابل نقل و حمل تجارتی سامان اور مال کی قیمتوں کو برابر کرنے میں مصروف عمل ہو جاتی ہیں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ یہ سمجھنے کے لیے ایک فرضی مثال لے لیں۔ فرض کریں کہ جب پہلی بار ہندوستان اور بحیرہ روم کے آس پاس علاقے کے بیچ تجارت شروع ہوئی تو صورتحال یہ تھی کہ ہندوستانیوں کو سونے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی، یعنی ہندوستان میں یہ بے وقعت تھا۔ لیکن دوسری جانب، بحیرہ روم کے آس پاس علاقے میں سونا انتہائی مرغوب اور علامت رتبہ ہوا کرتا تھا۔ اسی لیے یہاں اس کی اچھی خاصی قدر و قیمت تھی۔ اب اس صورتحال میں کیا ہوگا؟

وہ تاجر جو ہندوستان اور بحیرہ روم کے آس پاس علاقے کے بیچ سفر کرتے تھے، انھوں نے فوراً ہی سونے کی قدر و قیمت میں اس فرق کو جان لیا ہوگا۔ منافع کمانے کی غرض سے یہ تاجر ہندوستان سے انتہائی کم قیمت پر سونا خرید کر بحیرہ روم کے آس پاس علاقے میں مہنگے داموں بیچ دیا کرتے ہوں گے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہوگا کہ ہندوستان میں سونے کی قیمتیں آسمان سے باتیں کرنے لگی ہوں گی اور اس کی قدر میں یکدم خوب اضافہ ہو گیا ہوگا۔ جب ہندوستان میں یہ ہوا تو اسی وقت بحیرہ روم کے آس پاس علاقوں میں چونکہ سونے کی بہتات ہو گئی تھی، اس کی قیمت فوراً ہی گر جائے گی۔ یوں، انتہائی مختصر عرصے میں ہندوستان اور بحیرہ روم کے آس پاس علاقوں میں سونے کی قدر اور قیمت یکساں طور پر برابر ہو گئی ہوگی۔ فقط صرف اتنی سی حقیقت کہ بحیرہ روم کے آس پاس علاقوں میں لوگ سونے کی قدر و قیمت میں یقین رکھتے ہیں، ہندوستانیوں کو بھی اس کی قدر و قیمت پر یقین کرنے پر قائل کر لیتی ہے۔ اگرچہ ہندوستانیوں کے پاس سونے کے واقعی استعمال کی ابھی بھی کوئی خاص وجہ نہیں تھی لیکن چونکہ بحیرہ روم کے ارد گرد بسنے والے لوگوں کو اس کی خواہش تھی، ہندوستانیوں کے لیے بھی اس کی قدر بنانے کے لیے کافی تھی۔

اسی طرح، اگر کوئی شخص کوڑیوں یا امریکی ڈالروں یا برقی بائٹس پر مبنی ڈیٹا پر یقین رکھتا ہے تو یہ ان چیزوں پر ہمارے یقین اور اعتقاد کا باعث بھی ہوگا۔ ہمیں اس بات سے کوئی غرض نہیں ہوگی کہ ہم اس شخص سے بھلے کتنی نفرت کرتے ہو، اس کا مذاق اڑاتے ہوں یا اس کو ناپسند کرتے ہوں۔ عیسائی اور مسلمان، مذہبی عقائد پر تو ایک دوسرے کو ہرگز قائل نہیں کر سکتے لیکن بہرطور یہ دونوں ہی ایک طرح کے مالیاتی تصورات اور اعتقاد پر متفق ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مذہب ہمیں کسی شے پر یقین اور ایمان لانے کا حکم دیتا ہے جبکہ 'زر یا پیسہ' ہمیں اس چیز پر یقین اور اعتقاد قائم کرنے کا حکم دیتا ہے جس پر دوسرے لوگ یقین اور بھروسا رکھتے ہیں۔

ہزاروں سال تک فلسفیوں، مفکروں اور پیغامبروں نے زر اور پیسے کو رسوا کیے رکھا اور اسے برائی کی جڑ قرار دیتے آئے ہیں۔ ان کی سوچ اور فکر اپنی جگہ لیکن حقیقت یہ ہے کہ تاریخ بھر میں زر اور پیسہ انسانی برداشت کا لافقی اور صحیح معنوں میں مدار رہا ہے۔ پیسہ یا زر ایسی شے ہے جو زبانوں، ریاستی قوانین، ثقافتی روایات، مذہبی عقائد اور سماجی اطوار سے کہیں بڑھ کر کشادہ دل اور وسیع النظر کا حامل ہے۔ انسانوں کے تخلیق کردہ تصوراتی نظاموں میں زر یا پیسے کا مالیاتی نظام واحد مثال ہے جو ہر طرح کے ثقافتی، تہذیبی اور تمدنی فرق کو مٹا دینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہ مذہب، صنف، نسل، عمر اور جنسی تشریق کی بنیاد پر کسی کے ساتھ امتیاز نہیں برتتا۔ یہ پیسے اور زر کی ہی دین ہے کہ آج وہ لوگ جو ایک دوسرے کو سرے سے جانتے ہی نہیں بلکہ ایک دوسرے پر اعتبار اور بھروسا بھی نہیں کرتے لیکن پھر بھی وہ ایک دوسرے کے ساتھ تعاون، اشتراک اور مل جل کر بسر کرنے اور کام کرنے پر تیار ہو جاتے ہیں۔

سونے کا مول

زر یا پیسے کی بنیاد دو آفاقی اصولوں پر کھڑی ہے:

الف۔ آفاقی تبدل پزیری: یعنی یہ کہ پیسے یا زر کیمیا گر ہوتا ہے۔ آپ زمین کے ٹکڑے کو نمک حلالی، انصاف کو صحت اور ایک قسم کی شے کو دوسری قسم کی شے میں بدل سکتے ہیں۔

ب۔ آفاقی یقین اور ساکھ: یعنی یہ کہ پیسے یا زر کو دلال یا ایجنٹ بنا کر کوئی بھی دو لوگ کسی بھی کام کے حوالے سے تعاون اور اشتراک میں اکٹھے کام کر سکتے ہیں۔

ان دو اصولوں کی بدولت لاکھوں ہی نہیں کروڑوں اجنبی لوگ تجارت اور صنعت میں ایک دوسرے کے ساتھ اشتراک اور تعاون کرتے ہیں لیکن ان معمولی اور بظاہر خیر اندیش اصولوں کا ایک تاریک پہلو بھی ہے۔ اب جبکہ ان اصولوں کے تحت ہر شے کا مبادلہ ہو سکتا ہے اور یہ کہ اعتماد اور بھروسا غیر موسوم اور گمنام سکوں اور کوڑیوں پر منحصر ہے تو اس سے مقامی روایات ٹوٹ پھوٹ جاتی ہیں۔ انسانی اقدار اور انسیت پر قائم رشتوں اور تعلقات کو گھن لگ جاتی ہے اور ان کی جگہ طلب و رسد کا بے حس قانون لے لیتا ہیں۔

انسانی معاشرے، خاندان اور رشتے ہمیشہ سے ہی 'انمول' تصورات جیسے غیرت، وفاداری، اخلاقیات اور محبت پر قائم کیے گئے ہیں۔ یہ ساری 'انمول' چیزیں، تجارتی منڈیوں سے اوپر کی چیز ہیں۔ یہ چیزیں زر خرید نہیں ہوتیں اور نہ ہی ان کی خرید و فروخت ہونی چاہیے۔ بھلے منڈی میں ان چیزوں کی بہترین قیمت ملتی ہو لیکن بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں۔۔۔ ان پر سودا اور سمجھوتہ نہیں کرنا چاہیے۔ کسی باپ کو اپنے بچوں کو غلام بنا کر نہیں بیچنا چاہیے۔ ایک پارسا عیسائی کو کبھی بھی لذت گناہ میں نہیں پڑنا چاہیے۔ ایک وفادار جری سپاہی کو چاہیے کہ وہ کبھی اپنے حاکم اعلیٰ ' ' سے غداری نہ کرے اور قبائیلیوں کی آبائی زمینیں کبھی بھی غیروں کے ہاتھ نہیں بیچنی چاہیے۔

لیکن پیسے اور زر نے ہمیشہ ہی ان حدود کو توڑ کر نکلنے کی بالکل ایسے ہی کوشش کی ہے جیسے پانی ٹپک ٹپک کر پتھر میں سوراخ کر لیتا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ باپ اپنے چند بچوں کو غلامی میں بیچ کر باقی بچوں کے لیے خوراک اور ضروریات زندگی پوری کرتا آیا ہے۔ پارسا عیسائیوں نے بھی قتل، چوری اور دھوکہ دہی کا ارتکاب کیا ہے اور پھر زر اور پیسہ لٹا کر چرچ سے معافی خرید لی۔ سورما اور جری سپاہی زور بازو اور تلوار سب سے اونچی بولی لگانے والے کے ہاتھ بیچتے آئے ہیں اور پھر زر اور دولت لٹا کر اپنے لوگوں میں نیک نامی بھی کمائی ہے۔ ریاستوں نے قبائلیوں کی آبائی زمینیں اور وسائل غیروں کے ہاتھ بیچی ہیں تاکہ وہ اس بخشش کے عوض عالمی معیشت میں حصہ لینے کا ٹکٹ خرید سکیں۔

پیسے اور زر کا اس سے بھی آگے، ایک دوسرا لیکن انتہائی تاریک پہلو بھی ہے۔ یہ تو درست ہے کہ پیسے کے بل بوتے پر اجنبیوں کے بیچ آفاقی اعتماد اور بھروسہ قائم ہو جاتا ہے لیکن یہ بھروسا دوسرے لوگوں، سماج اور مقدس اقدار میں خرچ نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ بھروسہ تو دراصل واپس زر پر اور غیر شخصی نظام پر لگ جاتا ہے۔ مثلاً، ہم پیسے کی مدد سے کسی اجنبی یا اپنے پڑوسی پر اعتماد نہیں کرتے بلکہ ہم اصل میں اس پیسے پر نظر رکھتے ہوئے بھروسے کا رشتہ قائم کرتے ہیں جو اس شخص کی جیب میں ہے۔ اگر وہ شخص کنگلا ہو جائے، ہمارا بھروسہ بھی ختم ہو جاتا ہے۔ یہ ایسا لمبا چکر ہے کہ افراد، خاندان، سماج، ریاستیں، مذاہب اور پوری دنیا۔۔۔ ایک بہت بڑی، بے حس اور سنگدل منڈی بن جانے کے خطرات سے دوچار ہو جاتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ انسان کے یہاں معاشی تاریخ ایک نازک رقص کی مانند چلی آ رہی ہے۔ لوگ پیسے اور زر پر بھروسا قائم کر کے اجنبیوں کے ساتھ تعاون اور اشتراک قائم کرتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ انھیں ہر دم یہ خوف بھی لاحق رہتا ہے کہ یہ انسانی اقدار اور قریبی تعلقات کو دیمک کی طرح چاٹ جائے گا۔ لوگوں کا تو یہ ہے کہ وہ ایک ہاتھ سے اس سماجی بند کو تباہ کرتے چلے آ رہے ہیں جس کی بدولت زر اور کاروبار طویل عرصے سے چل رہا ہے۔ لیکن دوسرے ہاتھ سے وہ نئے سماجی بند بھی تعمیر کر رہے ہیں جس کی بدولت ان کے معاشروں، مذاہب اور ارد گرد ماحول کو منڈیوں اور تجارت کی بے رحم طاقتوں سے تحفظ حاصل ہوتا ہے۔

آج کل تو لوگ عام طور پر یہی سمجھتے ہیں کہ منڈی کا پلڑا ہمیشہ بھاری رہتا ہے اور زر کے سیلابی بہاؤ کے سامنے بادشاہوں، پادریوں اور معاشرے نے جو بند باندھ رکھا ہے۔۔۔ وہ کبھی نہیں ٹک سکتا۔ یہ انتہا درجے کی سادہ لوحی ہے۔ بے رحم جنگجوؤں، مذہبی انتہا پرستوں اور فکرمند شہریوں نے ہمیشہ ہی ناپ تلا حساب رکھنے والے تاجروں کو بار بار شکست دی ہے اور ہر بار معیشت کی تشکیل نو کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج انسانیت کی وحدت کو صرف اور صرف معاشی عوامل کی بنیاد پر سمجھنا ناممکن ہے۔ اگر یہ سمجھنا مقصود ہو کہ آخر ہزاروں الگ تھلگ، بٹے ہوئے معاشرے اور تہذیبیں وقت کے ساتھ آج کی عالمگیر دنیا تک کیسے پہنچیں تو اس کے لیے ضروری

ہے کہ ہم سونے اور چاندی کے ساتھ ساتھ۔۔۔ لوہے اور سٹیل کے کردار کو بھی برابر کی سطح پر دیکھنے کی کوشش کریں۔ یعنی، سامراج کو بھی ذہن میں رکھیں۔

سامراجی تصور

قدیم رومی شکست کے عادی تھے۔ تاریخ کی سبھی عظیم ترین سلطنتوں کے حکمرانوں کی طرح، رومی بھی ایک کے بعد دوسری اور کئی کئی لڑائیوں میں شکست کھاتے رہتے تھے لیکن بالآخر جنگ جیت جاتے تھے۔ کوئی بھی سلطنت اگر چھوٹی موٹی شکستوں کو سہارنے کی خاصیت نہیں رکھتی تو اس کا تادیر قائم رہنا ممکن نہیں ہوتا بلکہ وہ سرے سے سلطنت ہی نہیں کہلائے گی۔ قدیم رومی سلطنت ایسی ہی سخت جان اور انتہائی مضبوط، واقعی سلطنت تھی۔ لیکن رومی سلطنت بھی دوسری صدی قبل مسیح کے وسط میں شمالی آئبریا سے آنے والی خبر کو سہار نہ سکی۔ ہوا یوں کہ شمالی آئبریا میں ایک چھوٹا، ادنیٰ سا پہاڑی قصبہ ہوا کرتا تھا۔ اس قصبے کا نام نومانسیا تھا جس کے جزیرہ نما میں آبائی طور پر سیلٹ قبائل بسر کرتے تھے۔ سیلٹبے رین آبادیوں نے رومیوں کے ہاتھوں محکومی کو رد کر کے غلامی کا طوق اتار پھینکا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب رومی بحیرہ روم کے طاس میں مسلمہ تسلط رکھتے تھے۔ انھوں نے مقدونیہ اور سلوکسی سلطنتوں کو بھی زیر کر لیا تھا، یونان کی عظیم شہری ریاستوں کو مغلوب اور کارتھج کے شہر کو راکھ کا ڈھیر بنا چکے تھے۔ ایسے حالات میں نومانسیوں کے ہاتھ میں کچھ نہیں تھا لیکن وہ آزادی کے سخت دلدادہ تھے۔ علاوہ ازیں، نومانسیا سخت بنجر اور مشکل علاقہ بھی تھا۔ لیکن، اس کے باوجود نومانسی طویل عرصے تک رومی افواج کے پے در پے حملوں کو روکنے اور عظیم فوج کے عظیم دستوں کو بار بار پیچھے ہٹنے پر مجبور اور شکست سے دوچار کرتے آئے تھے۔

بالآخر، 134 قبل مسیح میں رومیوں کا صبر جواب دے گیا۔ رومی سلطنت کی سینٹ نے نومانسیا کا قبلہ درست کرنے کے لیے اسکیپیو امیلیانوس کو بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ اسکیپیو رومی افواج کا ایک نہایت جری اور ممتاز ترین جرنیل تھا۔ یہ اسکیپیو ہی تھا جس کی کمان میں اس سے قبل رومی افواج کارتھج کے شہر کو جلا کر راکھ کر چکی تھیں۔ اب کی بار، رومی سلطنت نے اسکیپیو کو نومانسیا سے نبٹنے کے لیے تیس ہزار فوجیوں پر مشتمل دستے سمیت، کھلی چھٹی دے دی۔ اسکیپیو نومانسیوں کی لڑنے کی صلاحیت اور جنگی سمجھ بوجھ کا قائل تھا بلکہ وہ اسی وجہ سے ان کی عزت بھی کرتا تھا۔ اسی لیے، اس نے بجائے غیر ضروری مڈھ بھیڑ میں پڑنے اور اپنا فوجی نقصان کروانے کی بجائے نومانسیا کا محاصرہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ نومانسیا کے ارد گرد مضبوط چوکیاں اور قلعے بنا لیے گئے اور اس شہر کا راستہ باقی دنیا سے کٹ کر رہ گیا۔ محاصرہ شروع ہو گیا اور جلد ہی بھوک نے اپنا کام کر دکھایا۔ ایک سال کے مختصر عرصے میں ہی نومانسیا کے خوراک کے ذخائر ختم ہو گئے۔ جب نومانسیوں نے جان لیا کہ اب امید کی کوئی صورت باقی نہیں رہی تو انھوں نے خود اپنے ہاتھوں سے اپنے شہر کو آگ لگا دی۔ رومی روایات

کے مطابق، شہر کو آگ لگانے کے بعد نومانسیوں کی اکثریت نے رومی محکومی قبول کرنے کی بجائے خود کو ہلاک کرنے کو ترجیح دی۔ نومانسیا کی آبادی کے بڑے حصے نے اجتماعی خودکشی بھی کر لی۔

بعد ازاں نومانسیا ہسپانوی آزادی اور جرات کی علامت بھی بن گیا۔ نامور ہسپانوی ادیب میگوئیل دسروانتس، جس نے شہرہ آفاق ناول 'ڈان کے خوتے' (اردو: خدائی فوجدار) نامی ناول بھی تحریر کیا تھا۔ میگوئیل نے ہی ایک تعزیہ 'نومانسیا کا محاصرہ' کے نام سے بھی لکھا تھا۔ یہ تعزیہ جہاں ایک طرف شہر کی بربادی پر منتج ہوتا ہے، وہیں دوسری جانب سپین کے عظیم مستقبل کا تصور بھی پیش کرتا ہے۔ شاعروں نے نومانسیا کے بہادر محافظوں کے قصیدے لکھے اور مصوروں نے کینوس پر محاصرے کے مناظر کو محفوظ کر لیا۔ 1882ء میں نومانسیا کی باقیات کو 'قومی یادگار' کا درجہ دے دیا گیا اور سپین سے محبت رکھنے والے محب وطن شہری یہاں لازماً حاضری دیتے تھے۔ 1950ء اور 1960ء کی دہائی میں سپین کے بچوں کے مشہور ہیرو سپائڈرمین یا سپرمین نہیں بلکہ رسالوں میں ال جباتو کے کارنامے چھپتے تھے۔ ال جباتو قدیم آئبیریائی ہیرو کا تخیل تھا جس نے رومی جابروں کے خلاف جدوجہد کی تھی۔ قدیم نومانسیائی باشندے آج بھی سپین میں حب الوطنی اور جوانمردی کا پیمانہ قرار دیے جاتے ہیں اور ملک کے نوعمر نوجوانوں کے لیے رول ماڈل کے طور پر بڑھا چڑھا کر پیش کیے جاتے ہیں۔

لیکن اس سب کے باوجود ہسپانوی محب وطن، آج نومانسیوں کی بہادری اور حب الوطنی کے قصے ہسپانوی زبان میں سناتے ہیں۔ ہسپانوی ایک رومانوی زبان ہے اور لاطینی سے نکلی ہوئی ہے۔ نومانسیائی باشندے ایک کیلٹک زبان بولتے تھے جو اب ناپید ہو کر تاریخ میں گم ہو چکی ہے۔ میگوئیل سروانتس نے نومانسیا کے لیے تعزیہ بھی لاطینی رسم الخط میں لکھا تھا اور اس پر بنے تھیٹر ڈرامے بھی یونان و رومی طرز پر پیش کیے جاتے ہیں۔ نومانسیا میں تھیٹر نہیں ہوتے تھے۔ وہ ہسپانوی وطن پرست جو آج نومانسیائی جوانمردی کے قصوں کو سینے سے لگائے پھرتے ہیں، ان میں اکثریت رومی کیتھولک چرچ کی پیروکار ہے۔ یہ انتہائی دلچسپ صورتحال ہے، نومانسیا کا پرچار کرنے والے ایسے چرچ کو مانتے ہیں جو آج بھی روم میں ہے اور اس چرچ کا خدا لوگوں کے ساتھ لاطینی زبان میں بات کرنا پسند کرتا ہے۔ اسی طرح، بھلے جدید سپین کی بنیاد نومانسیائی بہادری اور جرات پر رکھی گئی ہو لیکن سپین کے دستور کا ماخذ رومی قوانین ہی ہیں۔ سپین کی سیاست، روم کی سیاسی بنیادوں پر قائم ہے جبکہ سپین کے روایتی کھانوں میں آئبیریا کے کیلٹک کھانوں کا نہیں بلکہ رومی ورثے کا ذائقہ حاوی ہے۔ آج چند باقیات اور آثار قدیمہ کے سوا اقعی معنوں میں نومانسیا کا کچھ بھی باقی نہیں ہے۔ یہاں تک کہ نومانسیا کے بارے قصے اور کہانیاں بھی ہم تک رومی تاریخ دانوں کے ہاتھ سے لکھی تحاریر کے ذریعے پہنچی ہیں۔ یہ کہانیاں، قصے اور حکایات رومی سلطنت کے قارئین کی دلچسپی کے لیے لکھے گئے تھے۔ ان کہانیوں میں نومانسیائی باشندوں کو آزادی اور خودمختاری کے دلدادہ لیکن غیر مہذب اور بدتہذیب بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ نومانسیا

پر رومی سلطنت کی فتح کو اس طرح مکمل انداز میں پیش کیا گیا ہے کہ غالب فاتحین، مغلوب کے ساتھ برابر بلکہ کئی جگہوں پر ان سے برتر نظر آتے ہیں۔

نومانیا کی رومی ریکارڈ کے مطابق بیان کردہ کہانی، ہماری دلچسپی کا سامان نہیں ہے۔ ہمیں تو کمزور اور پامال، مغلوب کی جیت چاہیے ہوتی ہے۔ لیکن کیا کیجیے، تاریخ میں انصاف نہیں ہے۔ تاریخ کے تقریباً سبھی قدیم معاشرے اور تہذیبیں یکے بعد دیگرے، کسی نہ کسی جابر اور سفاک سلطنت کی افواج کے ہاتھوں زیر ہوتے چلے گئے۔ ان سلطنتوں نے قدیم انسانی تہذیبوں کو فراموشی اور نسیان کی پاتال تک پہنچا کر چھوڑ دیا۔ یہ عظیم لیکن انتہائی سفاک اور ظالم سلطنتیں بھی اپنا وقت آنے پر تباہ و برباد ہو کر فراموش ہو گئیں لیکن اپنے پیچھے دیرپا، متمول اور اور تقریباً مستقل ترکہ چھوڑ گئیں۔ آج، اکیسویں صدی میں بسنے والا ہر آدمی کسی نہ کسی سلطنت، ایک یا دوسرے شہنشاہ کی نسل یا اس کی اہم رعایا کی نسل سے تعلق رکھتا ہے۔

سلطنت کیا ہوتی ہے؟

سلطنت ایک ایسا سیاسی نظام ہوتا ہے جس کی دو بنیادی لیکن اہم خصوصیات ہوتی ہیں۔ اول یہ ہے کہ سلطنت میں قابل ذکر تعداد میں ممیز اور جداگانہ لوگوں پر حکمرانی ہو۔ یہ ضروری ہے کہ ان لوگوں میں طرح طرح کی ثقافتی شناخت اور ان کی بسر جداجدا علاقوں میں ہو۔ اب کتنی طرح کے لوگ؟ دو یا تین طرح کے مختلف لوگ کافی نہیں ہیں جبکہ بیس یا تیس طرح کے لوگ بہت زیادہ ہیں۔ سامراجی دہلیز، اسی پیمانے کے بیچ جھولتی رہتی ہے۔

دوسری خصوصیت یہ ہے کہ سلطنتوں کی سرحدیں قابل ترمیم اور لچکدار ہوتی ہیں جبکہ ریاستی بھوک کی کوئی انتہا نہیں ہوتی۔ سلطنتیں ایک کے بعد دوسری، کئی کئی اقوام کو نگل جاتی ہیں اور سرحدیں پھیلتی ہی چلی جاتی ہیں لیکن اس کی بنیادی ساخت اور شناخت جوں کی توں برقرار رہتی ہے۔ مثلاً، آج ریاست برطانیہ کی سرحدیں بہت واضح ہیں اور یہ اپنی ریاستی ساخت اور شناخت سے آگے نہیں بڑھ سکتی۔ ایک سو سال پہلے، کرہ ارض کا ہر کونا اور سرا سلطنت برطانیہ کا حصہ بن سکتا تھا۔

ثقافتی تنوع اور علاقائی لچک سلطنتوں کی بے مثال خصوصیات ضرور ہیں لیکن اس سے بھی بڑھ کر، تاریخ میں سلطنتوں کے مرکزی کردار کی ضامن بھی ہیں۔ یہ انہی دونوں خصوصیات کا ثمر ہے کہ سلطنتوں نے تاریخ میں متنوع نسلوں اور ثقافتوں کے گروہوں اور طرح طرح کے ماحولیاتی خطوں اور پٹیوں کو ایک ہی بڑی سیاسی چھتری تلے یکجا کر دیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کرہ ارض پر بڑے بڑے انسانی گروہوں اور مختلف تہذیبوں اور نظاموں سے تعلق رکھنے والے آدمیوں کو ایک دوسرے میں ضم ہونے کا موقع مل گیا۔

یہاں، یہ یاد رکھنا انتہائی اہم ہے کہ ریاست صرف اور صرف ثقافتی تنوع اور لچکدار سرحدوں کی بدولت ہی پہچانی جاتی ہے۔ کسی بھی سلطنت کا نقطہ آغاز، اس کا ماخذ، طرز حکومت، علاقائی وسعت اور آبادی کی تعداد جیسی چیزیں اس کی تعریف میں کچھ معنی نہیں رکھتیں۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ سلطنت ہمیشہ ہی کسی عسکری مہم کے نتیجے میں فتح کے نتیجے میں پیدا ہو۔ ایتھنز کی سلطنت سراسر ایتھنز کے شہریوں نے قصداً تشکیل دی تھی۔ اسی طرح آسٹریا کی سلطنت ہیپسبرگ، شاہی خاندان میں شادی بیاہ کے پیچ در پیچ معاملات اور روایات کا نتیجہ تھی۔ اس سلطنت کو قائم رکھنے کے لیے سوچ سمجھ کر شادی بیاہ اور ازدواجی رشتے بنائے گئے تھے۔ اسی طرح یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ ایک سلطنت کا فرمانروا ہمیشہ ہی کوئی آمریت پسند شہنشاہ ہوا کرے۔ مثال کے طور پر سلطنت برطانیہ تاریخ کی سب سے بڑی سلطنت تھی لیکن یہ سلطنت جمہوریت کے ذریعے چلائی جاتی تھی۔ اسی طرح کی دوسری جمہوری سلطنتوں کی کئی مثالیں ہیں۔ ان میں جدید ولندیزی، فرانسیسی، بیلجیئن اور امریکی سلطنتیں شامل ہیں۔ اسی طرح کی ماقبل جدیدیت، جمہوریہ نوگورود، رومی سلطنت، کارتھج اور ایتھنز جیسی سلطنتوں کی مثالیں بھی ہیں۔

اسی طرح، سلطنت کا حجم یا رقبہ بھی غیر اہم ہے۔ سلطنتیں، ادنیٰ اور معمولی بھی ہو سکتی ہیں۔ سلطنت ایتھنز جب اپنے جوبن پر تھی تو اس کا کل رقبہ اور آبادی آج کے یونان سے بہت ہی کم تھا۔ سلطنت ازٹیک، آج کے میکسیکو سے کئی گنا چھوٹی ہوا کرتی تھی۔ لیکن یہ ایتھنز اور ازٹیک، دونوں ہی سلطنتیں تھیں جبکہ آج جدید یونان اور جدید میکسیکو سلطنتیں نہیں ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایتھنز اور ازٹیک کی سلطنتوں نے درجنوں بلکہ سینکڑوں مختلف سیاسی نظریوں کو یکجا کر کے لچکدار سرحدوں میں باندھ رکھا تھا جبکہ جدید یونان اور میکسیکو ان دونوں خاصیتوں سے محروم ہیں۔ ایتھنز کی سلطنت میں سو سے زیادہ خود مختار اور آزاد شہری ریاستیں ہوا کرتی تھیں جبکہ ازٹیک کی سلطنت کا تسلط (اگر ٹیکس کے دستیاب ریکارڈ پر بھروسا کیا جائے تو صرف۔۔۔)371 قبیلوں پر قائم تھا۔

یہ کیسے ممکن ہوا کہ طرح طرح سے مختلف انسانی تہذیب اور ثقافتوں کی پنکھڑیوں اور پھولوں کو ایک ہی گلدستے، یعنی جدید ریاست کے گلدستے میں جمع کرنا کیسے ممکن ہوا؟ ایسا اس لیے ممکن ہوا کیونکہ ماضی میں دنیا کے کونے کونے پر بھانت بھانت کے لوگوں کی ممیز تعداد بستی تھی۔ ان میں سے ہر گروہ کی چھوٹی آبادیاں اور آج کے عام روایتی لوگوں کی نسبت بہت ہی تھوڑے سے علاقے پر قبضہ رہا کرتا تھا۔ اس کی ایک واضح مثال یہ ہے کہ آج بحیرہ روم سے لے کر دریائے اردن کے بیچ واقع وسیع علاقے پر صرف دو طرح کے لوگوں کا تنازعہ جاری ہے لیکن توریت کے زمانے میں یہاں با آسانی درجنوں مختلف اقوام، دسیوں قبائل، معمولی بادشاہتوں اور کئی شہری ریاستوں کی گنجائش نکل سکتی تھی۔

انسانی تنوع میں بڑے پیمانے پر تخفیف اور منہائی کی ایک بڑی وجہ سلطنتیں بھی تھیں۔ سامراجی رولر ایسی شے تھی جس نے بتدریج بھانت بھانت لوگوں (مثلاً نومانسیا کے باشندے) کی یکتا اور بے مثل خصوصیات کو کچل کے رکھ دیا اور آہن گری سے پہلے سے کہیں بڑے، یکجا گروہ تشکیل دے دیے۔

کیا سلطنت شیطانی ہوتی ہے؟

آج ہمارے زمانے کی سیاسی گالیوں کی لغت میں 'سامراجیت' کو صرف 'فسطائیت یا فاشزم' سے ایک درجہ ہی کم سمجھا جاتا ہے۔ لیکن سلطنتوں کے دور میں ہم عصر ناقدین عام طور پر دو دلائل کا سہارا لیے کرتے تھے:

الف۔ سلطنتیں ناکام ہیں۔ اس لیے کہ مغلوب آبادیوں کی اکثریت پر موثر انداز میں طویل مدت تک حکومت ممکن ہی نہیں ہے۔

ب۔ اگر کوئی سلطنت ایسا کر بھی لے تو اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے کیونکہ سلطنتیں تباہی اور استحصال کے شیطانی انجن ہوتی ہیں۔ لوگوں کو حق خودارادیت کا حق حاصل ہے اور ان پر کسی غیر کی حکومت اور جبر کسی بھی صورت جائز نہیں ہے۔

تاریخی تناظر سے دیکھا جائے تو پہلی دلیل احمقانہ اور سراسر لغویات ہے۔ دوسری دلیل غیر واضح لیکن انتہائی پریشان کن ہے۔

سچ یہ ہے کہ پچھلے پچیس سو برس سے سلطنتیں اور شہنشاہیت اس دنیا میں سیاسی تنظیم کی سب سے عام اور مقبول شکل ہے۔ ان ڈھائی ہزار سالوں کے دوران تقریباً سبھی انسان ایک یا دوسری صورت کسی نہ کسی سلطنت میں بسر کرتے آرہے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ سامراج پر مبنی سلطنتیں، حکومت کی مستحکم شکل ہیں۔ زیادہ تر سلطنتوں کے لیے غدر اور بغاوت وغیرہ کو کچلنا ڈرا دینے کی حد تک نہایت آسان رہا ہے۔ عمومی طور پر زیادہ تر سلطنتوں کا خاتمہ بیرونی حملوں یا اشرافیہ کی آپسی چپقلش کے نتیجے میں دیکھا گیا ہے۔ اس کے برعکس، محکوم اور مغلوب کیے گئے عام لوگوں کا سامراجی آقاؤں سے خود مختاری اور آزادی حاصل کرنے کا ریکارڈ کچھ اتنا اچھا نہیں ہے۔ ان میں سے تقریباً سبھی لوگ سینکڑوں برسوں تک محکوم و مغلوب رہے۔ مرادیہ ہے کہ سامراج کا طریقہ واردات یہی ہوتا ہے۔ ان سینکڑوں برسوں کے دوران یہ لوگ بتدریج صحیح معنوں میں فاتح شہنشاؤں کے ہاتھ مسلسل مغلوب ہوتے گئے جبکہ ان کی اپنی الگ، ممیز تہذیب اور ثقافت جل جل کر راکھ اور دھواں ہو گئی۔

مثال کے طور پر 476ء میں جرمانی قبائل کے مہلک حملوں نے مغربی رومی سلطنت کے بخیے اڑا دیے۔ مغربی رومی سلطنت کا خاتمہ ہوا تو رومیوں کے ہاتھ صدیوں قبل محکوم ہونے والے، بھولے بسرے ہوئے لوگ جیسے نومانیائی، آرورنی، بیلویشانی، سامنی، لوسٹینیائی، امبریانی، ایٹرور یائی وغیرہ اس اندر سے گل کر سڑتی ہوئی سلطنت کے پیٹ سے، مثال مچھلی کے پیٹ سے یونس کی طرح بر آمد نہیں ہوئے۔ ان میں سے کوئی بھی باقی نہیں بچا تھا۔ حیاتیاتی طور پر جو لوگ خود کو ان 'عظیم' اقوام کا فرد گنواتے تھے، ان قوموں کی اپنی بولیاں ہوا کرتی

تھیں، اپنے اپنے خداؤں کو پوجتے تھے اور ان کی اپنی اساطیر اور حکایات تھیں۔۔۔ اب ان کی اولاد رومیوں کی طرح رہتے تھے۔ رومیوں کی زبان بولتے اور رومیوں کی ہی طرح، رومیوں کے خداؤں کی عبادت کیا کرتے تھے۔

بہت سے موقعوں پر تو یہ بھی ہوا کہ کسی ایک سلطنت کا خاتمہ اس علاقے کی رعایا کی آزادی کا ضامن نہیں بنا۔ بجائے، شکست خوردہ اور منہدم ہونے والی سلطنت کی جگہ ایک نئی سلطنت نے لے لی۔ اس کی واضح مثال مشرق وسطیٰ میں دیکھی جاسکتی ہے۔ آج مشرق وسطیٰ میں سیاسی تاروں کا جھرمٹ نظر آتا ہے۔ کئی خود مختار اور آزاد سیاسی ریاستوں کا وجود ہے جن کی تھوڑی یا بہت، بہر حال مستحکم سرحدیں بھی پائی جاتی ہیں۔ لیکن پچھلے چند ہزار سالوں کے دوران کبھی ایسی صورتحال نہیں رہی۔ مشرق وسطیٰ میں آخری دفعہ اس طرح کی خود مختار اور آزادانہ صورت آٹھویں صدی قبل مسیح میں دیکھی گئی تھی۔ یہ آج سے تقریباً تین ہزار سال پہلے کی بات ہے۔ آٹھویں صدی قبل مسیح میں آشوری سلطنت کی ابتداء سے لے کر بیسویں صدی عیسوی کے وسط میں انگریزی اور فرانسیسی سلطنتوں کے خاتمے تک مشرق وسطیٰ ایک سلطنت کے ہاتھوں، دوسری سلطنت کو کسی عہدے دار کی سوٹی کی طرح منتقل ہوتا رہا۔ جب انگریز اور فرانسیسی اس خطے سے نکلے تو اس وقت تک قدیم آرامی، امونی، فونیشائی، فلسطی، موآبی، ادومی (عیسیٰ کا قبیلہ) اور سینکڑوں دوسرے لوگ جو آشوریوں کے ہاتھ مغلوب ہوئے۔۔۔ ان کو گزرے، بھولے بسرے ہوئے بھی کئی زمانے گزر چکے تھے۔

یہ درست ہے کہ آج یہودی، آرمینیائی اور جارجیائی باشندے قدیم زمانے کے مشرق وسطیٰ سے تعلق رکھنے والے باشندوں کی حلفیت کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اگرچہ ان کو استثنیٰ حاصل ہے لیکن پھر بھی یہ اسی نکتے کو واضح کرتے ہیں۔ یہ بھی یاد رہے کہ ان کا یہ دعویٰ اکثر ہی مبالغہ آرائی پر مبنی ہوتا ہے۔۔۔ یہ اکثر و بیشتر ہی بے پر کی ہانکتے ہیں۔ مثال کے طور پر آج جدید یہودیوں کی سیاسی، معاشی اور سماجی اطوار میں قدیم مملکت یہوداہ سے زیادہ ان سلطنتوں کی روایات کا عمل دخل بہت بڑھ کر ہے جن کے جھنڈے تلے پچھلے دو ہزار سال ان کی بسر رہی ہے۔ مثال کے طور پر اگر آج قدیم یہودی مملکت کے بادشاہ داؤد کو یروشلم میں یہودیوں کی کسی نامور اور راسخ العقیدہ عبادت گاہ میں جانے کا موقع ملے تو وہ یقیناً اپنے لوگوں کو یورپی لباس پہن کر جرمن لہجے (یدیش) میں بابل کی کتابوں (تلمود) کے گہرے مفہوم اور معنی پر مباحثے کرتے دیکھ کر ششدر رہ جائے گا۔ قدیم مملکت یہوداہ اور داؤد کے زمانے میں ایسی عبادت گاہیں، تلمود کی جلدیں بلکہ خود تورات کے بھی طومار کاغذی یا چرمی پلندے نہیں ہوتے تھے۔

عام طور پر ایک سلطنت کھڑی کرنے کے لیے انتہا درجے کی خباثت اور بد طینتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بڑے پیمانے پر انسانی آبادیوں کا قتل عام اور باقی بچ رہنے والوں پر بے انتہا جبر اور استبداد لازمی جز ہوتا تھا۔ سامراج کی معیاری ٹول کٹ میں جنگیں، محکومی، غلامی، جلاوطنی اور نسل کشی جیسی چیزیں عام تصور ہوتی ہیں۔ جب 83ء میں رومیوں نے سکاٹ لینڈ پر حملہ کیا تو انھیں مقامی اسکاچستانی قبائل کی جانب سے سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے نتیجے میں یہ اکاچستانیوں کا پورا علاقہ تاراج ہو کر برباد اور ویران ہو گیا۔ رومیوں کی جانب

سے امن کی پیشکش کے جواب میں ان قبائل کے سردار کالگاکس نے رومیوں کو 'اس دنیا کے بدمعاش' قرار دیتے ہوئے کہا، 'انھوں نے لوٹ کھسوٹ، خون ریزی اور لٹیرے پن کو سلطنت اور فرمانروائی کی بنیاد اور نام بنا رکھا ہے۔ یہ پہلے ہنستے بستے، خوشحال علاقے کو صحرا میں بدل دیتے ہیں اور پھر اسے امن کا نام دیتے ہیں؟'

تاہم، اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ سلطنتوں کے لیے کسی قسم کا فائدہ باقی نہیں رہتا۔ تمام سلطنتوں کو یک جنبش قلم سیاہ کاری سے موسوم کر دینا اور تاریخ میں سلطنتوں کے ترکے کو رد کر دینے کا مطلب انسانی تہذیب اور معاشروں کے تقریباً قابل ذکر حصے سے منہ موڑنے کے مترادف ہوگا۔ سامراجی اشرافیہ نے فتوحات سے حاصل ہونے والے مالی فوائد کو قلعے اور افواج کھڑی کرنے میں خرچ کیا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ فلسفے، فنون، انصاف اور فلاح و بہبود پر بھی توجہ دی گئی۔ انسانی تہذیب اور تمدن کی اہم اور قابل ذکر کامیابیوں میں انسانی آبادیوں کی مفتوحہ کا بڑا حصہ شامل ہے۔ رومی سامراج نے جتنا بھی فائدہ اٹھایا اور خوشحالی دیکھی، یہ اسی کا ثمر ہے کہ سیسرو، سینکا اور سینٹ آگسٹین کو آسودہ ماحول اور پر تعیش زندگی دستیاب ہوئی۔ وہ اسی آسودگی کی بدولت فکر کرنے اور لکھنے کے قابل بنے۔ ہندوستانیوں کے استحصال کے بغیر یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ مغل دولت اکٹھی کر کے عشق اور محبت کا شاہکار، تاج محل کھڑا کر سکتے۔ ہیپسبرگ کی سلطنت نے سلاویوں پر جبر کر کے خوب نفع حاصل کیا۔ ہنگری اور رومانیوی زبان بولنے والوں نے اپنا خون پسینہ ایک کر کے ہائیڈن جیسے موسیقار کی دولت میں حصہ ڈالا اور موزارٹ کو اپنی موسیقی کے بدلے خوب کمشن ملا۔ آپ کا کیا خیال ہے، آج ہم سکاٹ لینڈ کی تاریخ اور قبائلی سردار گالاکس کے خطبات بارے واقف ہیں تو کیا یہ اسکاچستانی قبائل کی علمی کوششوں کا نتیجہ ہے؟ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ گالاکس کے خطبات اور اسکاچستانیوں کا نام ہم تک رومی تاریخ دان اور سیاستدان تاسیتس کی وجہ سے پہنچا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ تاسیتس نے یہ سب خود سے گھڑ رکھا ہے۔ محققین کی اکثریت متفق ہے کہ دراصل تاسیتس نے اسکاچستانی قبائل کے گالاکس نامی سردار کا کردار اور اس کے خطبات خود سے گھڑے تھے تاکہ اسکاچستانیوں کو زبان مل سکے۔ اس کا مقصد یہ بھی تھا کہ اس طرح رومیوں کا نکتہ نظر اور خود اسکاچستانیوں کا اپنے وطن سے متعلق خیال بھی عام فہم ہو سکے۔

اگر ہم اعلیٰ ' 'فنون، شہ پاروں اور اشرفی تہذیب سے نکل کر عام آدمی کی دنیا پر بھی دھیان دیں تو ہمیں سامراج کی دی ہوئی بڑی بڑی نشانیاں مل جائیں گی۔ آج ہم میں سے اکثریت ان سامراجی زبانوں میں بول چال، فکر اور خواب بنتے ہیں جو کبھی ہمارے اجداد پر تلوار کی مدد سے جبری طور پر لاگو کی گئی تھیں۔ مثلاً، مشرقی ایشیاء کی تقریباً آبادیاں وہ زبان استعمال کرتے ہیں جو ہان سلطنت کے شاہی سلسلے نے عام کی تھی۔ شمالی اور جنوبی دونوں ہی امریکی براعظموں میں بھانت بھانت کے لوگ، بھلے وہ کسی بھی ماخذ سے تعلق رکھتے ہوں۔۔۔ آج ان براعظموں کی تقریباً ساری آبادی صرف چار یعنی ہسپانوی، پرتگالی، فرانسیسی اور انگریزی زبانیں بولتی ہے۔ یہ چاروں زبانیں سامراجیت کی ہی دین ہیں۔ آج مصری عربی بولتے ہیں اور خود کو عرب سمجھتے ہیں۔ وہ اپنا ناطہ اس عرب سلطنت سے جوڑنے کی کوشش

کرتے ہیں جس نے ساتویں صدی عیسوی میں مصر فتح کیا تھا اور پھر طویل عرصے تک مصر میں اٹھنے والی بغاوتوں سے بارہا آہنی ہاتھوں سے نبٹتے ہوئے جبر کا بازار گرم کیے رکھا تھا۔ آج جنوبی افریقہ کے ایک کروڑ زولو، انیسویں صدی کے دور زولو کی کامرانی کے گیت گاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے اکثریت ان قبائل سے تعلق رکھتے ہیں جو کبھی زولو سلطنت کے سخت مخالف رہے تھے۔ ان قبائل کو زولو سلطنت نے آہن کے زور پر، لاتعداد فوجی مہمات، بے پناہ جبر اور خون ریزی کے بعد طویل عرصے کی مشق کے نتیجے میں زیر کیا تھا۔

یہ آپ کے اپنے حق میں بہتر ہے

تاریخ میں وہ پہلی سلطنت جس کے بارے واقعاتی معلومات دستیاب ہیں، وہ سلطنت اکد ہے جس کی بنیاد عظیم فرمانروا سارگن اعظم یا سرجون اکدی نے 2250 قبل مسیح میں رکھی تھی۔ سارگن اس سے قبل کش کا بادشاہ ہوا کرتا تھا۔ کش عراقی تمدن میں ایک چھوٹی سی شہری ریاست تھی۔ چند دہائیوں کے اندر ہی سارگن نے نہ صرف بحیرہ روم کے آس پاس عراقی تمدن کی سبھی شہری ریاستوں کو زیر کر لیا بلکہ اس خطے سے باہر نکل کر وسیع علاقوں میں بھی اپنی فرمانروائی قائم کی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سارگن اعظم پوری دنیا کو فتح کرنے کا دعویٰ کیا کرتا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ اس کا تسلط صرف خلیج فارس سے لے کر بحیرہ روم تک ہوا کرتا تھا۔ یہ وہ علاقہ ہے جس میں آج عراق اور شام کے ممالک جبکہ ایران اور ترکی کا کچھ حصہ شامل ہے۔

سارگن اعظم کی موت کے بعد اکد کی سلطنت تو تادیر قائم نہیں رہی لیکن عظیم شہنشاہ اپنے پیچھے ایک ایسا سامراجی چوغہ ضرور چھوڑ گیا جس کو آنے والی تاریخ میں بار بار، کئی شہنشاہوں نے پہنا۔ اگلے سترہ سو برسوں میں آشوریہ، بابل، حتی اقوام نے سارگن اعظم کے ہی نقش قدم پر چلتے ہوئے ایسی سلطنتیں کھڑی کیں جن کے بارے ان کا بھی دعویٰ یہی رہا کہ گویا، انھوں نے دنیا فتح کر لی۔ پھر 550 قبل مسیح میں کوروش اعظم کا دور آیا۔ کوروش اعظم نے ان سب سے بڑی سلطنت کھڑی کی اور دنیا کی فتح سے متعلق اس کی شیخی بھی ان سب سے کہیں بڑی تھی۔

اکدی سلطنت اور فارسی سلطنت

آشوریہ کے بادشاہ، ہمیشہ آشوریہ کے بادشاہ رہے۔ انھوں نے اپنے تئیں دنیا فتح کر لی لیکن پھر بھی ان کا محور آشوریہ ہی رہا۔ یہ صاف ظاہر تھا کہ وہ یہ فتوحات آشوریہ کی برتری اور عظمت میں کرتے جا رہے تھے اور وہ اس بارے قطعاً کسی شرمندگی سے دوچار نہیں تھے۔ کوروش اعظم کا معاملہ دوسرا تھا۔ اس نے نہ صرف پوری دنیا پر حکمرانی کا دعویٰ کیا بلکہ ایسا اس نے 'سبھی لوگوں' کی عظمت کا حق جتاتے ہوئے کیا۔ فارسیوں نے دعویٰ کیا، 'ہم اپنے فائدے کے لیے فتوحات کرتے ہیں'۔ کوروش اپنی رعایا سے انسیت اور رغبت کی توقع رکھتا تھا۔ وہ مفتوح آبادیوں سے فارسی سلطنت کا حصہ ہونے پر فخر کا خواہشمند رہا۔ اس ضمن میں کوروش اعظم کی جانب سے اٹھائے گئے اقدامات میں سب سے مقبول جلاوطن یہودیوں کی بابل سے اپنے آبائی وطن یہودیہ کی جانب واپسی اور معبد کی تعمیر نو کی اجازت تھی۔ یہی نہیں بلکہ اس نے تو یہودیوں کو مالی امداد بھی فراہم کی۔ کوروش اعظم خود کو صرف فارس کا ایسا بادشاہ نہیں سمجھتا تھا جو یہودیوں پر بھی حکمران تھا بلکہ وہ فارسیوں کے ساتھ ساتھ یہودیوں کا بھی بادشاہ تھا۔ وہ جتنا فارسیوں، اتنا ہی یہودیوں کے فلاح و بہبود کا بھی ذمہ دار تھا۔

پوری دنیا پر، دنیا کے سبھی باشندوں کے فلاح، بہبود اور بہتری کے لیے حکمرانی کا تصور۔۔۔ بلکہ کیسے اس وقت قیاس اور گمان خاصا تعجب خیز ثابت ہوا۔ ارتقاء نے خردمند آدمی کو باقی سماجی ممالیہ جانوروں کی طرح غیروں سے نفرت کی حد تک دور رہنے والی مخلوق کے طور پر تیار کیا تھا۔ آدمی کی نفسیات میں خوف آشنائی کوٹ کوٹ کر بھرا ہوتا ہے۔ یہ آدمی کی خصلت ہے کہ وہ یکدم ہی انسانیت کو دو حصوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔۔۔ یعنی، 'وہ' اور 'ہم' کا راگ الاپتا ہے۔ ہم لوگوں سے مراد وہ سارے لوگ ہیں جو ہماری زبان بولتے ہیں، ہم ایک جیسے مذہب کو مانتے ہیں اور ہماری روایات بھی ایک ہی ہیں۔ ہم سب ایک دوسرے کے ذمہ دار ہیں لیکن ہم کسی بھی طور 'ان' کے ذمہ دار

نہیں ہیں۔ 'ہم' ہمیشہ ہی 'ان' سے ممتاز، الگ ہوتے ہیں اور 'ہمارا'، 'ان' سے کچھ لینا دینا نہیں ہے۔ ہم، انھیں اپنے علاقے میں دیکھنا پسند نہیں کرتے اور ہمیں کوئی پرواہ نہیں ہے کہ ان کے علاقے میں کیا ہوتا ہے؟ 'وہ' بھلے انسان ہوں لیکن 'وہ' تو انسان ہونے کے لائق بھی نہیں ہیں۔ سوڈان کے 'ڈنکا' قبائل سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی زبان میں 'ڈنکا' کا مطلب 'لوگ' ہیں۔ یعنی، صرف ڈنکا ہی لوگ ہیں اور جو ڈنکا نہیں ہے۔۔۔ ان کے نزدیک وہ سرے سے آدمی ہی نہیں ہے۔ ڈنکا کے جانی دشمن نویر لوگ ہیں۔ نویروں کی زبان میں 'نویر' کا پتہ کیا مطلب ہے؟ اس کا مطلب ہے، 'اصل لوگ'۔ سوڈان کے صحراؤں سے ہزاروں کلومیٹر دور یخ بستہ الاسکا اور شمال مشرقی سائبیریا میں 'یوپیک' نامی لوگوں کا بسیرا ہے۔ یوپیک کی زبان میں اس لفظ یوپیک کا کیا مطلب ہے؟ اس کا مطلب بھی 'اصل لوگ' ہے۔

اس نسلی اور گروہی امتیازیت کے برعکس، کوروش اعظم کے سامراجی نظریات مشمولات اور ہر طرح سے احاطہ بندی کے حامل تھے۔ یہ درست ہے کہ سلطنتوں میں اکثر ہی حکمرانوں اور رعایا کے بیچ نسلی اور ثقافتی تفریق ابھر کر سامنے آ ہی جاتی تھی لیکن اس کے باوجود پوری دنیا میں بنیادی میل، ہم آہنگی اور وحدانیت کا ضامن، ہر زمان و مکان میں حاکمیت پر مبنی معیاری اصولوں کے مجموعے کا وجود اور انسانوں کی مشترکہ اور اجتماعی ذمہ داریوں پر مبنی یہ تصور اہمیت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اس کی معنویت اور وقعت سے کسی کو انکار نہیں ہے۔ انسانیت کو ایک بڑے خاندان کی نظر سے دیکھ پانا، جہاں والدین کو حاصل اختیار اور حق، بچوں کی کفالت کی ذمہ داری اور فرائض کے ساتھ، شانہ بشانہ چلتا ہے۔

سامراج کا یہ نیا تصور کوروش سے فارسیوں کی اگلی نسلوں، سکندر اعظم اور پھر یونانی بادشاہوں، رومی شہنشاہوں، مسلمان خلفاء، ہندوستانی مہاراجوں اور سلاطین سے ہوتا ہوا یہ سوویت وزراء اور امریکی صدور کو منتقل ہوا۔ سامراجیت کا یہ نیک نہاد اور فیض رساں تصور سلطنتوں کے وجود کی دلیل بن گیا۔ اور پھر ہوا یوں کہ اس تصور کی نیک نامی اس قدر مشہور کی گئی کہ اس تصور نے رعایا کی جانب سے بغاوتوں اور سرکشی کو تو چھوڑو، آزاد اور خود مختاری سے بسر کرنے والوں کو بھی کسی طور خاطر میں نہیں لایا۔ تاریخ گواہ ہے، جب جب کوئی سامراجی توسیع اور بڑائی کی راہ میں آیا، وہ خاک میں ملا دیا گیا۔

فارسی ماڈل کے اسی سامراجی تصور کی دوسری شکلیں، دنیا کے دوسرے حصوں میں بھی اپنے جداگانہ اور آزادنہ رنگ میں ظاہر ہوئیں۔ مثال کے طور پر وسطی امریکہ، کوہ انڈیز کے سلسلوں اور چین میں ان تصورات کا اپنا ہی الگ رنگ دیکھا گیا۔ چین کے روایتی سیاسی نظریے کے مطابق فردوس یا آسمان (تیان) اس دنیا میں جائز حاکمیت کا اصل ماخذ ہے۔ یہ آسمانوں کی دین ہے کہ سب سے عمدہ اور شایان شخص یا خاندان کو منتخب کر کے حاکمیت کا اختیار بخشا جاتا ہے۔ یہ شخص یا خاندان ہر اس شے پر حاکم ہے جو آسمانوں کے نیچے پائی جاتی ہے اور یہ ہر شخص، ذی روح کے اپنے فائدے اور حق میں بہتر ہے۔ مرادیہ ہے کہ حاکمیت کا یہ جائز حق، تعریف کی رو سے آفاقی

ہوتا ہے۔ اگر کوئی حاکم آسمانوں یا فردوس کے فرمان یا تفویض کیے گئے اختیار پر پورا نہیں اترتا تو اسے آسمان تلے بسنے والے ایک بھی شہر پر حکمرانی کا جائز حق نہیں ہے۔ لیکن اگر یہ شخص تفویض کردہ اختیار اور فرمان پر پورا اترتا ہے تو اس پر لازم ہے کہ وہ پوری دنیا میں انصاف اور ہم آہنگی کا بول بالا کرے۔ آسمانوں کی طرف سے تفویض کردہ یہ حق، ایک ہی وقت میں کئی کئی امیدواروں کو نہیں بخشا جا سکتا اور نتیجتاً ایک ہی آزاد ریاست کے علاوہ، دوسری کوئی ریاست جائز اور نہ ہی اسے اپنے وجود کا کوئی استحقاق حاصل ہے۔

چنانچہ متحدہ چینی سلطنت کے پہلے فرمانروا چن شی ہوانگ خودستائی سے شیخی بگھارتا تھا، '(کائنات کی) چھ میں سے چھ سمتوں پر پائی جانے والی ہر شے شہنشاہ کی ملکیت ہے۔۔۔ جہاں جہاں بھی انسان کا قدم پہنچا ہے، کوئی بھی ایسا شخص نہیں ہے جو شہنشاہ وقت کی رعایا نہ ہو۔ شہنشاہ کی رحم دلی، بیلوں اور گھوڑوں پر بھی لاگو ہوتی ہے۔ کوئی ایک بھی ایسا شخص نہیں ہے جو شہنشاہ کی رحمت سے محروم ہو۔ شہنشاہ کی چھت تلے ہر آدمی محفوظ ہے'۔ یہی وجہ ہے کہ چین کی سیاسی فکر اور چین کی تاریخی یادداشت میں سامراجیت کا یہ دور تنظیم اور انصاف کا گویا سنہرا دور گردانا جاتا ہے۔ آج مغربی فکر کے تحت یہ سمجھا جاتا ہے کہ ایک انصاف پسند دنیا میں جدا جدا قومی ریاستیں ضروری ہیں۔ اس فکر کے برعکس چین کی تاریخ گواہ ہے کہ سیاسی فرقہ بندی کے نتیجے میں ہمیشہ افراتفری اور تاریکی ہی پھیلی ہے۔ چینی تاریخ پر اوپر بیان کردہ تصورات اور ادراک کے دوررس نتائج مرتب ہوئے ہیں۔ اسی لیے چین میں جب بھی کوئی سلطنت گری تو اس کی جگہ لینے کے لیے اسی سیاسی نظریے کے تحت لوگوں اور طاقتوں نے بجائے جدا ریاستیں بنانے کے، دوبارہ سے 'متحد' اور 'جائز' سلطنت کھڑی کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ چاہے، اس کی شکل جو بھی رہی ہو لیکن جلد یا بدیر، یہ کوشش ہمیشہ ہی کامیاب ہوتی چلی آ رہی ہے۔

جب وہ، ہم ہو گئے

انسانی تاریخ میں سلطنتوں نے کئی کئی چھوٹی ثقافتوں کا آمیزہ بنا کر چند بڑی تہذیبوں اور ثقافتوں کو تخلیق کرنے میں فیصلہ کن کردار ادا کیا ہے۔ کسی بھی خطے میں تصورات، لوگ، تجارتی مال اور ٹیکنالوجی ایک بڑی سلطنت کی سرحدوں کے اندر، سیاسی طور پر کئی چھوٹی اور بٹی ہوئی ریاستوں کی نسبت زیادہ تیزی سے پھیلتے تھے۔ اکثر و بیشتر تو یہ سلطنتیں ہی ہوا کرتی تھیں جو جان بوجھ اور سوچ سمجھ کر مخصوص تصورات، اداروں، روایات، رسوم اور معیار پھیلاتی تھیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ اس سے سلطنت کی اپنی زندگی آسان ہو جاتی تھی۔ ایک ایسی سلطنت کو چلانا تقریباً ناممکن ہوتا ہے جس کے ہر ضلع میں اپنا الگ قانون، رسم الخط، زبان اور کرنسی رائج ہو۔ معیار مقرر کر دینے سے شہنشاہوں کی شہنشاہیت میں خوب برکت پڑ جاتی اور وہ خوش باش رہا کرتے تھے۔

اس کی دوسری وجہ بھی پہلی ہی وجہ جتنی اہم ہے۔ سلطنتیں ایک ہی طرز کی ثقافت کو اس لیے پھیلاتی تھیں کیونکہ اس طرح ان کو اپنے وجود کا جواز ملنے کا قوی امکان ہوتا تھا۔ کورش اور چن شی ہوانگ کے زمانے سے لے کر آج تک سلطنتوں نے اپنے کردار اور افعال کا

ہمیشہ یہ کوئی نہ کوئی جواز تراشا ہے۔ شاہراہیں بنانے سے لے کر خون خرابے تک۔۔۔ ہر فعل سے اپنے وجود کا جواز نکالا ہے۔ ان افعال اور جواز سے برتر تہذیب اور ثقافت کو پھیلانے کا دعویٰ کچھ یوں کیا جاتا ہے کہ فاتحین سے زیادہ، مفتوح رعایا کو اس کا زیادہ فائدہ ہے۔ یہ رعایا کے اپنے حق میں بہتر ہے۔

سلطنتوں کے افعال، بعض دفعہ واضح طور پر فائدہ مند نظر آتے تھے۔ جیسے قانون کی بالادستی، شہری پلاننگ، وزن اور تول کے یکساں معیاری پیمانے وغیرہ۔ لیکن بعض دفعہ ان پر سوال بھی اٹھتے تھے۔ جیسے ٹیکس کے معاملات، جبری بھرتیاں اور شہنشاہ کی بے پایاں طاقت اور اطاعت کی ضرورت وغیرہ۔ لیکن سامراجی اشرافیہ کی اکثریت کا یقین یہی تھا کہ وہ سلطنت کے تمام باسیوں کے عمومی فلاح و بہبود کی غرض سے کام کر رہے ہیں۔ چین کا حکمران طبقہ، اپنی سلطنت کے پڑوسیوں اور غیر ملکیوں کو سخت بد تہذیب اور خستہ حال اجڈ جاہل گردانتے تھے، جنھیں تہذیب اور تمدن کی سخت ضرورت تھی۔ ان کے خیال میں باقیوں کو بھی اس ثقافتی آداب پہنچانا لازم تھا۔ آسمانوں نے چینی شہنشاؤں کو دنیا میں تباہی، تاخت و راج کی کھلی چھٹی نہیں دی تھی بلکہ انسانیت کو تعلیم و تربیت کا فرض سونپا تھا۔ اسی طرح رومی بھی اپنے تسلط کی یہ دلیل پیش کرتے تھے کہ وہ ان بد تہذیب اور جہلاء میں امن، انصاف اور نفاست بخشنے کی غرض سے موجود ہیں۔ وحشی جرمن اور جسم رنگنے والے گال پستی، غلاظت اور جہالت میں بسر کرتے آرہے تھے، پھر رومیوں نے انھیں قانون کا پابند بنا کر، عوامی غسلخانوں میں نہلا دھلا کر فلسفہ کی تعلیم دی۔ تیسری صدی قبل مسیح میں سلطنت موریا نے جاہل اور گنوار دنیا میں بدھا کی تعلیمات پھیلانے کی ٹھان لی تھی۔ اسی طرح مسلمان خلیفہ خدائی فرمان کے عین مطابق خدا کے رسول کی تعلیمات کو عام کرنے نکل پڑے تھے۔ یہ مقصد امن اور صلح صفائی سے حاصل ہو جاتا تو بہت بہتر تھا لیکن اگر تلوار استعمال کرنا پڑ جائے تو کوئی مضائقہ نہیں تھا۔ ہسپانوی اور پرتگالی سلطنتوں نے دعویٰ کیا کہ وہ سلسلہ انڈیز اور امریکہ کی دولت نہیں بلکہ یہاں کی آبادیوں میں 'سچا مذہب اور عقیدہ' پھیلانے نکلے تھے۔ تصوراتی طور پر برطانوی سلطنت کی سرحدوں پر آزاد خیالی اور آزاد تجارت کے مشن کا سورج کبھی غروب نہیں ہوتا تھا۔ روسی سوویت نے ہمیشہ ہی خود کو سرمایہ داروں کے خلاف محنت کش طبقے کی سخت گیر حکومت کی جانب جد و جہد کا ذمہ دار سمجھا تھا۔ آج، امریکیوں کی اکثریت بھی یہی سمجھتی ہے کہ یہ ان کی منتخب کردہ حکومت کا اخلاقی فرض ہے کہ وہ تیسری دنیا کے محکوم اور پستی میں ڈوبے ممالک کی عوام کو جمہوریت اور انسانی حقوق کے فوائد سے روشناس کروائیں، بھلے اس کے لیے انھیں کروز میزائل اور ایف سولہ بمبار طیارے ہی کیوں نہ استعمال کرنا پڑیں۔

کسی بھی سلطنت کی جانب سے پھیلائے جانے والے تصورات کبھی بھی صرف حکمران اشرافیہ کی تخلیق نہیں رہے بلکہ ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا تھا۔ اب چونکہ بنیادی سامراجی تصورات آفاقی اور مشمول ہوا کرتے تھے، اسی لیے حکمران اشرافیہ کے لیے باقی کے تصورات، روایات اور معیارات، جہاں سے بھی ملتے۔۔۔ ان کے ساتھ ڈھل جانا نسبتاً آسان ہوتا تھا۔ حکمران اشرافیہ کبھی بھی تنگ نظری سے متعصب

روایات کے ساتھ چمٹ کر محصور نہیں ہوتی۔ جہاں چند شہنشاہ ایسے تھے جو اپنی آبائی تہذیب کو بہتری اور نرمل کی طرف لے جانا چاہتے تھے، جس کے لیے وہ اپنی اصل کی طرف لوٹ گئے۔ تاہم، تاریخ میں سلطنتوں کی اکثریت نے بالآخر دوغلی تہذیبوں کو جنم دیا۔ مفتوحہ رعایا نے سلطنتوں کی اس دوغلی شکل میں بڑا حصہ ڈالا۔ رومی سلطنت کی پیدا کردہ سامراجی ثقافت جتنی رومی، اتنی ہی یونانی بھی تھی۔ اسی طرح عباسیوں کی پیدا کردہ سامراجی ثقافت فارسی، یونانی اور عرب روایات کا ملغوبہ تھی۔ منگولوں کی سامراجی ثقافت چینیوں کی نقل ہوا کرتی تھی۔ آج بھی، ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی سامراجی ثقافت میں ایک امریکی صدر کی اصل کینیا تھی جبکہ وہ اطالوی پیزا کھاتے ہوئے اپنی پسندیدہ فلم، 'لارنس آف عریبیہ' دیکھتا ہے۔ لارنس آف عریبیہ عظیم برطانوی فلم ہے جس میں ترکوں کے خلاف عربوں کی بغاوت دکھائی گئی تھی۔

یہ صاف ظاہر ہے کہ اس تہذیبی کٹھالی میں ثقافتی تحلیل مغلوب ہونے والوں کے لیے آسان رہی ہے۔ سامراجی تہذیب نے ہمیشہ ہی مفتوح آبادیوں کی انسانی تمدن میں لازوال حصے کو مدغم کر لیا۔ ایسا عمل تھا جس کے نتیجے میں ایسے دوغلے نتائج بر آمد ہوئے کہ کئی کئی معاشرے پریشان کن حالت کا شکار ہو گئے۔ یہ صورتحال، آج بھی اکثریت کے لیے بیگانی اور نامانوس ہے۔ نتیجہ تو ایک طرف، خود یہ عمل بھی اکثر ہی انتہائی تکلیف دہ اور دردناک رہا کرتا تھا۔ وہ مقامی روایات جو آپ کے معاشرے کی خاصیت اور مانوسیت ہو، ان سے ہاتھ دھونا آسان نہیں ہوتا۔ یہی نہیں بلکہ ان مقامی روایات کے بدلے ایک نئی ثقافت کا حصہ بننا، اس سے بھی زیادہ مشکل کام ہے۔ اس سے بھی بدتر صورتحال یہ ہوتی ہے کہ مقامی مفتوح آبادیوں کو اگر صدیاں نہ سہی، نئی ثقافت کا حصہ بننے میں کئی کئی دہائیاں لگ جاتی ہیں۔ سامراجی اشرافیہ اس عمل سے گزرنے کے بعد بمشکل ان 'غیروں' کو 'اپنا' سمجھتے ہیں۔ 'وہ' سے 'ہم' تک پہنچنے میں کئی نسلیں گزر جاتی ہیں۔ یہ نسلیں سخت کرب اور اذیت میں مبتلا رہتی ہیں۔ یہ وہ نسلیں ہیں جنھوں نے ایک طرف تو اپنی محبوب مقامی ثقافت اور روایت کھوئی ہوتی ہے لیکن دوسری جانب انھیں نئی سامراجی دنیا میں برابری بھی نہیں ملتی تھی۔ ان کے لیے اصل دکھ کی بات تو یہ تھی کہ وہ جس تہذیب کا حصہ بننے پر مجبور کیے گئے اور اب وہ اس نئے تمدن کا حصہ بننے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا رہے تھے۔۔۔ وہ ارفع تہذیب انھیں اب بھی بدتہذیب اور گنوار ہی سمجھتی تھی۔

مثال کے طور پر ایک آئبریائی کے بارے سوچیں۔ یہ وہ شخص ہے جو نومانیا کی تباہی کے سو سال بعد کے زمانے سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ اپنے گھر میں والدین کے ساتھ تو آبائی سیلٹک لہجے میں روزمرہ بول چال کرتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس نے بوجوہ لاطینی زبان بھی سیکھ لی ہے۔ وہ لاطینی بولنے میں قدرے ماٹا ہے لیکن یہ اس کی مجبوری ہے کیونکہ اسے اپنا کاروبار دنیا اور حکام کے ساتھ معاملات چلانے کے لیے لاطینی زبان میں مہارت درکار تھی۔ وہ اپنی بیوی کو سبھی عورتوں کی طرح مقامی سیلٹک رجحان میں دلچسپی اور ذوق شوق کی وجہ سے سستے اور چمکیلے نمائشی زیور تو دلا دیتا ہے لیکن اس پر اسے قدرے الجھن بھی ہوتی ہے کیونکہ وہ چاہتا ہے کہ اس کی بیوی نئے طور

طریقے اپناتے ہوئے، رومی عورتوں کی طرح سادہ اور پروقار زیور پہنا کرے۔ جیسے، رومی گورنر کی بیوی پہنتی ہے۔ وہ خود رومی چوغہ پہنتا ہے۔ اب چونکہ اسے روم کے تجارتی قوانین کی تھوڑی بہت سمجھ آگئی ہے تو وہ مال مویشی کا ایک کامیاب تاجر بھی بن چکا ہے۔ اس نے نہایت شوق سے رومی طرز کا مکان بھی تعمیر کر لیا ہے۔ اس نے تو رومیوں کی جاری کردہ انجیل بھی دل سے حفظ کر لی ہے لیکن کیا کیجیے، رومی اسے اب بھی بد تہذیب اور جزوی طور پر جاہل اور گنوار ہی سمجھتے ہیں۔ اس کو جلد ہی سمجھ آجاتی ہے کہ بھلے وہ کچھ بھی کر لے، وہ کبھی بھی کسی اہم سرکاری اور عوامی عہدے پر فائز نہیں ہو سکتا۔ اس کی مایوسی کی انتہا نہیں رہتی کیونکہ وہ اپنے ہی علاقے میں، اپنے ہی معاشرے اور لوگوں میں۔۔۔ گمنام ہو چکا ہے۔

انیسویں صدی کے اواخر میں کئی پڑھے لکھے، تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کے ساتھ انگریزوں کا یہی طور رہا کرتا تھا۔ وہ ہر دم انھیں یہی سبق پڑھاتے تھے۔ اس ضمن میں ایک مشہور روایت بھی ہے۔ ایک اولعزم ہندوستانی تھا۔ اس نے انگریزی زبان پر عبور حاصل کیا۔ مغربی طرز کا رقص بھی سیکھا اور چھری کانٹے سے کھانے کا طریقہ اور عادت بھی بنالی۔ وہ یہ آداب سیکھ چکا تو اس نے برطانیہ کا سفر کرنے کا فیصلہ کیا۔ برطانیہ میں اس نے یونیورسٹی کالج لندن میں قانون کی اعلیٰ 'تعلیم بھی حاصل کر لی اور ایک لائق اور کامیاب بیرسٹر ثابت ہوا۔ پھر ایک دن، اس پڑھے لکھے مہذب اور سوٹ ٹائی میں ملبوس ہندوستانی کو جنوبی افریقہ کی برطانوی نو آبادیاتی میں ٹرین سے اتار پھینکا گیا۔ یہ ہندوستانی، تھرڈ کلاس کی بجائے فرسٹ کلاس میں سفر کرنے پر مصر تھا۔ تھرڈ کلاس 'سیاہ فاموں' کے لیے مختص تھی اور انتظامیہ کے خیال میں یہ شخص اسی کا اہل تھا۔ اس ہندوستانی کی مایوسی اور محرومی دیکھنے لائق رہی ہو گی کیونکہ مستقبل نے یہی ثابت کیا۔ اس ہندوستانی کا نام، موہن داس کرم چند گاندھی تھا۔

بعض مقامات پر ایسا بھی ہوا کہ تہذیبی انضمام اور ثقافتی تحلیل اتنی بڑھی کہ بالآخر نو واردوں اور پرانی اشرافیہ کے بیچ باڑ دور ہو گئی۔ اب فاتحین، سلطنت میں غلبے اور تسلط کی سوچ سے باہر آگئے۔ یہی نہیں بلکہ غالب اور مغلوب دونوں ہی برابری کی سطح پر اٹھ گئے۔ اب حکمران اور رعایا ایک دوسرے کو برابر سمجھتے تھے جبکہ 'ان' میں اور 'ہم' میں فرق مٹ گیا تھا۔ مثال کے طور پر صدیوں کی سامراجی حکمرانی کے بعد بالآخر رومیوں کے ہاتھ مغلوب ہونے والی سبھی اقوام کو بالآخر روم کی شہریت عطا کر دی گئی۔ وہ جو نسلاً رومی نہیں تھے، وہ بھی اب اعلیٰ 'عہدوں پر فائز ہونے لگے۔ افواج میں چیدہ افسرانہ عہدوں پر بھی غیر رومی بھرتی ہو گئے جبکہ سینٹ میں بھی اب رومیوں کے سوا لوگ بھی نظر آنے لگے۔ 48ء میں شہنشاہ کلاڈیوس نے سینٹ میں خطاب کرتے ہوئے غیر رومی اراکین کو مخاطب کرتے ہوئے تسلیم کیا کہ 'آپ رسم و رواج، ثقافت اور شادی بیاہ کے رشتوں میں بندھ کر رومی تہذیب میں مدغم ہونے کے بعد اب ہم میں سے ہیں اور ہم بلاشبہ ایک ہیں'۔ اس خطاب پر گھمنڈی رومی سینیٹر سخت چیں بہ جبیں ہوئے اور ان سابقہ دشمنوں کو سلطنت روم کے سیاسی مرکز میں یوں متعارف کرنے پر سراپا احتجاج ہو گئے۔ اس پر شہنشاہ کلاڈیوس نے انھیں متنبہ کیا اور اس تکلیف دہ حقیقت کو باریکی سے سمجھنے اور اس

کے ساتھ نباہ کرنے کی یاد دہانی کروائی۔ شہنشاہ کلاڈیوس نے انھیں یاد کروایا کہ اس ایوان میں براجمان 'اصل رومی' دراصل ان خاندانوں سے تعلق رکھتے ہیں جو کسی زمانے میں خود بھی اطالوی قبائل سے تعلق رکھتے تھے اور انھوں نے بھی کسی وقت میں رومیوں کے خلاف جنگ لڑی تھی۔ بعد ازاں، انھیں بھی تو رومی شہریت مل ہی گئی تھی۔ پھر شہنشاہ نے ایوان میں افراتفری کو اس نکتے سے تھاما کہ، 'یاد رکھیں۔۔۔ آپ کا شہنشاہ بھی تو ایک سابینی قبیلے کا فرد ہے لیکن وہ آج صرف رومی شہری ہی نہیں بلکہ روم کا شہنشاہ ہے!'۔

دوسری صدی عیسوی میں روم پر حکمرانی کرنے والے شہنشاؤں کی تعداد میں زیادہ تر وہ تھے جن کا تعلق آئبیریا سے تھا۔ یہ آئبیریائی خون تھا جو کسی زمانے میں روم کے سخت ناقد ہوا کرتے تھے۔ نومانسیائی بھی تو آئبیریا سے تعلق رکھتے تھے۔ تراجان، حادریان، انتونیوس پیوس اور مارکوس آئوریلیوس کے ادوار کو رومی سلطنت میں سنہر ادور سمجھا جاتا ہے۔ یہ سارے رومی شہنشاہ غیر رومی تھے۔ اس کے بعد تو یہ ہوا کہ رومی سلطنت میں نسلی بند مکمل طور پر ٹوٹ گئے۔ شہنشاہ سیپٹیموس سوروس (193ء–211ء) لیبیا کے فونیشی خاندان کی ایک شاخ سے تعلق رکھتا تھا۔ شہنشاہ ھلیو گابال (218ء–222ء) شامی تھا۔ شہنشاہ فلپ (244ء–249ء) کو روزمرہ عام بول چال میں 'فلپ عربی' کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ رومی سلطنت کے نئے شہریوں نے رومی سامراج کے طور طریقے اور ثقافت اس قدر زوق وشوق سے اپنائی کہ آنے والی کئی صدیوں اور رومی سلطنت کے خاتمے کے تقریباً ہزار سال بعد بھی سلطنت کی ہی رائج زبان بولتے تھے اور اس عیسائی خدا میں یقین رکھتے چلے آرہے تھے جو رومی سلطنت کے بحیرہ روم کے مشرقی ساحل پر واقع ایک لیونٹی صوبے سے مستعار لیا گیا تھا۔ وہ رومی سلطنت کے منہدم ہونے کے ہزار سال بعد بھی، سلطنت کے قوانین اور دستور پر زندگی گزار رہے تھے۔

اسی طرح کا احوال عرب کی سلطنت کا بھی ہے۔ جب ساتویں صدی عیسوی کے وسط میں عرب سلطنت قائم ہوئی تو عرب سے تعلق رکھنے والی مسلمان اشرافیہ اور مفتوح مصریوں، شامیوں، ایرانیوں اور بربریوں کے بیچ سخت نکیلی تقسیم پائی جاتی تھی۔ یہ مفتوح آبادیاں عرب اور نہ ہی مسلمان تھیں۔ ان علاقوں میں بسنے والی مغلوب آبادیوں نے بتدریج اسلامی مذہب اختیار کیا، عربی زبان سیکھی اور بالآخر اسلامی سامراج کی دوغلی تہذیب کو جنم دیا۔ قدیم عرب اشرافیہ جب ان علاقوں کی نودولتی آبادیوں کی طرف دیکھتے تو انھیں سخت نفرت کا احساس ہوتا اور انھیں اپنا غیر معمولی رتبہ اور شناخت خطرے میں پڑتی ہوئی محسوس ہوتی۔ یہ نو مسلم عجمی سر دھڑ کی بازی لگا رہے تھے اور اسلامی سلطنت اور اسلامی دنیا میں برابر کا مقام حاصل کرنے کے خواہاں تھے۔ آخر کار، ایسا ہو بھی گیا۔ مصریوں، شامیوں اور عراقیوں کو بالآخر عربی سمجھا جانے لگا۔ پھر یہ ہوا کہ خود عرب سے تعلق رکھنے والے اصیل عربوں، مصری عربوں اور شامی عربوں پر تیزی کے ساتھ 'غیر عربوں' یا اب واقعی 'عجمیوں' یعنی ایرانیوں، ترکوں اور بربریوں کا اثر ورسوخ حد سے زیادہ بڑھنے لگا۔ عربوں کے اس سامراجی منصوبے کی سب سے بڑی کامیابی یہ تھی کہ ان کی متعارف کردہ سامراجی ثقافت اور تہذیب کو غیر عرب یا عجمی آبادیاں بڑی تعداد میں بڑھ چڑھ کر اپنا رہی تھیں۔ یہی نہیں بلکہ وہ اس عرب تہذیب اور تمدن کی خوب رکھوالی بھی کرتی تھیں، اس میں نت نئی ترقی لاتی

تھیں اور اسے پھیلا بھی رہی تھیں۔ اصل اسلامی سلطنت تو ختم ہو گئی، عربوں نے اپنا اثر و رسوخ کھو دیا لیکن ان کی سامراجی ثقافت پھیلتی ہی چلی گئی۔

چین میں تو سامراجی منصوبہ کہیں زیادہ بار آور ثابت ہوا۔ دو ہزار سال تک وہ نسلی اور ثقافتی گروہ جنھیں پہلے پہل جاہل، گنوار اور بد تہذیب قرار دیا جاتا تھا، چین کے سامراجی رنگ میں ایسے رنگے گئے کہ اب وہ 'ہان چینی' کہلانے لگے۔ ہان چینیوں نے سلطنت ہان کی بنیاد رکھی جس کا جوبن 206ء قبل مسیح سے 220 عیسوی تک دیکھا گیا۔ یہ اس قدر کامیاب سلطنت تھی کہ اس کا اثر و رسوخ، آج بھی باقی ہے۔ یہ سلطنت تبت اور سن کیانگ جیسے علاقوں کے سوا آج بھی چین کے طول و عرض میں اپنے بھرپور اثرات دکھا رہی ہے۔ آج چین کی نوے فیصد آبادی خود کو 'ہان چینی' ہی قرار دیتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ہان خود کبھی اولین چینی سامراج کے مفتوح رہا کرتے تھے۔

ہم پچھلی چند دہائیوں میں وقوع پذیر ہونے والی نو آبادیات سے دستبرداری کے عمل کو بھی اسی پیرائے میں با آسانی سمجھ سکتے ہیں۔ جدید دور میں یورپیوں نے دنیا کے تقریباً تمام حصوں پر اپنا غلبہ اور نو آبادیاں قائم کی تھیں۔ ان نو آبادیوں میں مغربی تہذیب اور ثقافت خوب پھیلی۔ یہ عمل اس قدر کامیاب تھا کہ اربوں لوگوں نے اس تہذیب کو اپنایا اور یہ ثقافت ان کی روزمرہ زندگیوں میں رچ بس گئی۔ ہندوستانیوں، افریقیوں، عربوں، چینیوں۔۔۔ حتیٰ کہ نیوزی لینڈ کے ماؤری لوگوں نے بھی فرانسیسی، انگریزی اور ہسپانوی زبان اور ثقافت اپنالی ہے۔ آج ہم دیکھتے ہیں دنیا بھر میں لوگ بنیادی انسانی حقوق اور حق خود ارادیت میں یقین رکھتے ہیں۔ آج دنیا کی اکثریت بوجوہ مغربی تصورات جیسے روشن اور آزاد خیالی، سرمایہ داری نظام، اشتراکیت، حقوق نسواں اور وطن پرستی وغیرہ پر دل و جان سے یقین رکھتے ہیں۔

سامراجی سلسلہ

سامراجیت میں سلسلہ وار مرحلہ	رومی	اسلامی	یورپی سامراج
ایک چھوٹا گروہ عظیم سلطنت کی بنیاد رکھتا ہے	رومیوں نے رومی سلطنت کی بنیاد رکھی	عربوں نے عرب خلافت کی بنیاد رکھی	یورپیوں نے یورپی سلطنتوں کی بنیاد رکھی
ایک سامراجی تہذیب اور ثقافت جنم لیتی ہے	رومی اور یونانی تہذیب	عرب اور مسلمان تہذیب	مغربی تہذیب

مفتوح آبادی سامراجی تہذیب اور ثقافت اپنالیتی ہے	مفتوح آبادیوں نے لاطینی زبان، رومی قوانین و دستور، رومی سیاسی نظریات وغیرہ اپنالیے	مفتوح آبادیوں نے عربی زبان، مذہب اسلام وغیرہ اپنا لیا	مفتوح آبادیوں نے انگریزی، فرانسیسی، ہسپانوی زبان، اشتراکیت، قوم پرستی، انسانی حقوق کے تصورات وغیرہ اپنا لیے
مفتوح آبادیاں برابری کی سطح پر حقوق، رتبے اور یکساں سامراجی اقدار کے خواہاں بن گئے	الیریائی، گال اور فونیشیائی آبادیوں نے رومیوں کے برابر رتبے اور رومی اقدار کا مطالبہ کیا	مصریوں، ایرانیوں اور بربریوں نے عربوں جیسے رتبے اور یکساں اسلامی اقدار کا مطالبہ کیا	ہندوستانیوں، چینیوں، افریقیوں نے یورپیوں جیسے رتبے اور مغربی اقدار جیسے قوم پرستی، اشتراکیت اور یکساں انسانی حقوق، حق خودارادیت کا مطالبہ کیا
سلطنتوں کے بانی اپنے غلبے اور تسلط سے ہاتھ دھو بیٹھے	رومیوں کی منفرد نسلی حیثیت ختم ہو گئی۔ سلطنت کا اختیار کثیر گروہی سلسلوں کے ہاتھ میں چلا گیا	عربوں کا اسلامی دنیا پر اختیار ختم ہو گیا اور علاقائی سطح پر کثیر گروہی مسلم اشرافیہ نے جنم لیا	یورپیوں کے ہاتھ سے عالمگیر دنیا کا اختیار نکل گیا اور کثیر گروہی رواج چل نکلا جو مغربی اقدار اور طرز فکر پر مبنی تھا۔ اقوام عالم اور خودمختیار ریاستیں وجود میں آئیں
سامراجی ثقافت اور تہذیب بدستور پنپتی رہی	الیریائی، گال اور فونیشیائی آبادیاں بدستور رومی ثقافت اور تہذیب اپناتی رہیں	مصری، شامی، عراقی، ایرانی اور بربری بدستور اسلامی ثقافت اور تہذیب کو اپناتے رہے	ہندوستانی، چینی اور افریقیوں نے بدستور مغربی ثقافت اور تہذیب کو اپنائے رکھا بلکہ اپنا رنگ نکال لیا

بیسویں صدی عیسوی میں وہ مقامی آبادیاں جنھوں نے مغربی اقدار کو اپنایا، انھوں نے یورپی فاتحین کے برابر حقوق کے حصول کے لیے انھی اقدار کی بنیاد پر سینگ لڑائے۔ نو آبادیات اور سامراجیت کے خلاف چلنے والی تحاریک انھی اقدار جیسے حق خودارادیت، اشتراکیت اور بنیادی انسانی حقوق کی بنیاد پر چلائی گئیں۔ یہ سارے تصورات مغربی تہذیب کے ہی دین تھے۔ جس طرح مصریوں، ایرانیوں اور

ترکوں نے عرب فاتحین کی سامراجی تہذیب اپنائی تھی بالکل ویسے ہی ہندوستانیوں، چینیوں اور افریقیوں نے مغربی حاکمین کی سامراجی تہذیب اور ثقافت اپنالی ہے۔ یہ آبادیاں، ہر دو صورت گاہے بگاہے اس دوغلی ثقافت اور تہذیب کو اپنی ضرورت اور مقامی روایات کے مطابق ڈھالتے رہنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔

تاریخ کے ہیرو اور ولن

تاریخ کو صاف صاف ہیرو اور ولن بنا کر، ایسے منقسم دیکھنا خاصا دلکش اور لبھانے والا تصور ہوتا ہے۔۔۔ بالخصوص سلطنتوں کو اگر ولن بنا کر دیکھا جائے تو اور بھی تحریک ملتی ہے۔ اس کی وجہ بھی ہے کیونکہ تاریخ کی سبھی سلطنتوں کی بنیاد انسانی خون کی ندیوں پر رکھی گئی تھی اور ان کا کاروبار جبر اور جنگ پر چلتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود، آج دنیا جہاں کی تہذیب اور تمدن اسی سامراج کا ورثہ ہے۔ اگر سلطنتیں ولن ہوا کرتی تھیں تو پھر ہم کیا ہیں؟

کئی ایسے مکاتب فکر اور سیاسی تحاریک بھی ہیں جو انسانی تہذیب سے سامراجیت کو کاٹ پھینکنے کی، اسے بھلا دینے کی حامی ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ اگر سامراجیت کو الگ کر دیا جائے تو پیچھے خالص اور مصدقہ تہذیب بچ رہے گی، جو اخلاقی بدکرداری سے پاک ہو گی۔ یہ نظریات خالصتاً بھولا پن ہے۔ بلکہ، اس بارے سب سے ناموافق بات یہ ہے کہ یہ ابن الوقتی اور بدنیتی پر مبنی ایسے تصورات ہیں جو عموماً قوم پرستی اور تعصب کو سجا بجا کر پیش کرنے کی کوشش ہوتے ہیں۔ غالباً آپ ایسا کہہ سکتے ہیں کہ تہذیبوں اور ثقافتوں کے ان گنت شمار میں چند معاشرے ایسے ضرور تھے جو خالص اور مستند رہے ہوں گے۔ ان پر دوسرے معاشروں اور ثقافتوں کا سرے سے کوئی اثر نہ ہوا ہو۔ وہ اپنے زمانے میں بے شک بے چھوئے رہے ہوں گے۔ لیکن اول دن سے ہی ایسی کوئی ثقافت نہیں ہے، جو اس طرح کا دعویٰ کر سکے بلکہ آج پائے جانے والی تہذیبوں میں تو ایک بھی اس دعویٰ کی روادار نہیں ہے۔ آج ہر انسانی تہذیب، سامراجی تہذیب ہے اور ہر معاشرہ سلطنتوں کا ترکہ ہے۔ ایسی صورتحال میں یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ علمی اور سیاسی جراحی 'مریض معاشروں' کو ہلاک کیے بغیر سامراجی ورثے کو کاٹ کر الگ کر سکے۔

مثال کے طور پر آزاد اور خود مختار بھارتی جمہوریہ اور تاج برطانیہ کے بیچ کھٹے میٹھے تعلق بارے غور کیجیے۔ انگریزوں نے جب ہندوستان کو فتح کیا تو دسیوں لاکھ ہندوستانیوں کی جان چلی گئی۔ یہی نہیں بلکہ اس تسلط اور غلبے کی وجہ سے کروڑوں ہندوستانی تذلیل اور استحصال کا بھی شکار ہوئے۔ لیکن اس کے باوجود، کروڑوں ہندوستانیوں نے نومریدی کی حد تک جوش و خروش سے مغربی ثقافت، حق خود ارادیت اور انسانی حقوق کے تصورات کو اپنایا۔ ہندوستانیوں کو انگریزوں کی جانب سے اس وقت سخت دہشت نال ہول اور نراس کا سامنا

بھی کرناپڑا جب انگریزی سامراج، اپنی ہی پرچار کردہ اقدار سے پیچھے ہٹتے ہوئے محوس ہوئے۔ انگریز طویل عرصے تک ہندوستانیوں کو برابری کے حقوق اور آزادی دینے سے انکاری رہے، جس سے غم و غصہ بڑھتا چلا گیا۔

اس سب کے باوجود، آج جدید بھارتی ریاست بجاطور پر برطانوی سلطنت کا بالک قرار دی جاسکتی ہے، بلکہ یہ واقعی ہے۔ انگریزوں نے برصغیر کے باسیوں پر ظلم و جبر کے پہاڑ گرادیے۔ ان گنت ہلاکتیں اور کئی گھاؤ لگے لیکن یہ بھی سچ ہے کہ انگریزی سامراج کے خلاف پہلی دفعہ ہندوستان کے طول و عرض میں ایک دوسرے کے سخت حریف ہندوستانی راجوں، مہاراجوں، نوابوں، قلم ووَں، صاحبوں اور قبائلی سرداروں کو حیران کن حد تک اکٹھ قائم کرنے کا موقع ملا۔ یہ تاریخ میں پہلی دفعہ ایسا ہوا کہ ہندوستانیوں میں ایسا اتحاد قائم ہوا کہ انھیں اجتماعی طور پر قومی شناخت اور شعور کا ادراک ہوا کہ وہ ایک ایسے ملک کا خواب دیکھنے کے قابل ہو گئے جو ہر طرح کے اختلافات اور تفرقات کے باوجود ایک واحد سیاسی اکائی بن سکتا تھا۔ انگریزوں نے بھارتی نظام انصاف کی بنیاد رکھی۔ انتظامی ڈھانچہ کھڑا کیا اور مشہور و معروف ریل نیٹ ورک بچھایا جو آج بھی بھارت میں معاشی انضمام اور ادغام کے لیے ریڑھ کی ہڈی سمجھا جاتا ہے۔ جب ہندوستان آزاد ہوا تو بھارتیوں نے انگریزی تجسیم میں مغربی جمہوریت کا نظام اور انگریزی طرز حکومت رائج کیا۔ آج بھی بھارت کے طول و عرض میں انگریزی مشترکہ اور مخلوط زبان سمجھی جاتی ہے۔۔۔ہندی، تامل، اردو، درواڑی اور طرح طرح کی سینکڑوں زبانیں بولنے والوں کے لیے انگریزی، مشترکہ زبان ہے۔ بھارتی کرکٹ کے دلدادہ اور چائے کے سخت شوقین ہیں۔ یہ دونوں چیزیں، انگریزی سامراج کا ہی ورثہ ہے۔ انیسویں صدی کے وسط تک ہندوستان میں کسی بھی جگہ پر تجارتی بنیادوں پر چائے کی پیداوار نہیں تھی اور ایسٹ انڈیا کمپنی نے یہاں چائے متعارف کروائی۔ آج ہندوستان کے طول و عرض میں چائے شوق سے پی جاتی ہے۔ یہ گھمنڈی انگریز لاٹ صاحب ہی تھا جس نے برصغیر کے کونے کونے میں چائے کی چسکیاں لینے کا رواج عام کیا۔

28: ممبئی میں چتراپتی شیواجی ریلوے سٹیشن جس کا پرانا نام وکٹوریہ سٹیشن بمبئی تھا۔ یہ سٹیشن انگریزوں نے گوتھک طرز پر تعمیر کیا تھا جو انیسویں صدی میں بہت مقبول ہوا کرتا تھا۔ ہندو پرست سیاسی جماعت نے حکمرانی میں آتے ہی اس ریلوے سٹیشن اور شہر، دونوں کا ہی نام بدل دیا لیکن اس عظیم والشان عمارت کو گرانے میں کوئی دلچسپی نہیں دکھائی۔ حالانکہ، یہ عمارت بیرونی جابر سلطنت کی دین ہے۔

اب آپ خود سوچیے، آج کتنے بھارتی ہوں گے جو جمہوریت، انگریزی، ریلوے نیٹ ورک، نظام انصاف، کرکٹ اور چائے جیسی سامراجی وراثت کو بھارتی ریاست سے نکال باہر کرنے کے لیے ووٹ ڈالنے پر تیار ہوں گے؟ چلو مان لیا، وہ ایسا کر بھی لیتے ہیں تو کیا ووٹ کے ذریعے یہ فیصلہ کرنا، سابقہ آقاؤں کی دیے ہوئے جمہوری تصور کے تحت نہیں ہو گا؟ اچھا چلو، اگر وہ اس ظالم سامراجی سلطنت کی میراث کو ترک کر کے کس جانب لوٹیں گے؟ وہ 'خالص اور مستند ہندوستانی' ثقافت کے کس روپ کی طرح جائیں گے؟ امکان یہی ہے کہ وہ اس سے قبل، اس جیسی ہی کسی قدیم اور بہیمانہ سلطنت کا دفاع کرتے ہوئے نظر آئیں گے۔ وہ جو برطانوی راج کے ہاتھوں ہندوستانی ثقافت کی کاٹ چھانٹ پر غصہ ناک ہیں، وہ غیر ارادی طور پر مغل سلطنت کی میراث پر راضی ہو جائیں گے؟ وہ جو مغل سلطنت سے نالاں ہیں، کیا وہ دہلی کے سلاطین کو یاد کریں گے؟ اب یہ قصہ یہیں ختم نہیں ہوتا۔۔۔ 'اصلی اور مستند ہندوستانی ثقافت' کو دوبارہ زندہ کرنے نکلیں تو جب اسلامی سلطنتوں کے ترکے سے بھی جان چھڑا لیں تو ہندوستانی خود کو پہلے گپتا، پھر کوشان اور بالآخر موریہ سلطنت کا اسیر پائیں گے۔ اگر شدت پسند ہندو قوم پرست انگریز سامراج کی کھڑی کی ہوئی ساری تعمیرات جیسے ممبئی کا ریلوے سٹیشن تباہ بھی کر لیں تو وہ ہندوستان کے مسلم شہنشاؤں اور سلاطین کی کھڑی ہوئی عمارتیں جیسے تاج محل بدستور ان کا منہ نہیں چڑائے گی؟

29: آگرہ کا تاج محل جسے ہندوستان کا 'اصل' تہذیبی ورثہ قرار دیا جاتا ہے۔ کیا یہ 'اصل' ورثہ ہے یا اسلامی سامراج کی تخلیق ہے؟

تہذیبی اور ثقافتی وراثت سے متعلق پرخار سوال کا کسی کے پاس کوئی جواب اور حل نہیں ہے۔ ہم اس ضمن میں کوئی بھی راستہ چن لیں، اس سے قبل اس سارے المیے کی پیچیدگی کو دل وجان سے قبول کرنا لازم ہو گا۔ ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ تاریخ کو ہیرو اور ولن میں بانٹنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ ہم اس راستے پر چل کر کہیں بھی نہیں پہنچ سکتے۔ یہ ضرور ہے کہ اگر ہم یہ ماننے پر تیار ہو جائیں کہ تاریخ بھر میں ہم ہیرو کے ساتھ نہیں بلکہ عام طور پر ہمیشہ ہی ولن کے ساتھ کھڑے رہے ہیں تو یہ الگ بات ہے۔

جدید عالمگیر سلطنت

پچھلے تقریباً پچیس سو برسوں سے، بالخصوص 200 قبل مسیح سے تقریباً انسان سلطنتوں میں بسر کرتے آئے ہیں۔ امکان یہی ہے کہ مستقبل میں بھی انسانوں کی اکثریت کسی نہ کسی سلطنت میں بسر کرتے رہیں گے۔ لیکن، اب کی بار یہ ایک عالمگیر سلطنت ہو گی۔ پوری دنیا پر ایک اور صرف ایک سامراج کے غلبے کا تصور بالآخر پورا ہو کر رہے گا اور ایسا ہمارے سروں پر منڈلاتا ہوا صاف دکھائی دے رہا ہے۔
جیسے جیسے اکیسویں صدی کی تہیں کھل رہی ہیں، قوم پرستی کے پیروں تلے سے زمین سرک رہی ہے۔ اب ہمیشہ سے بڑھ کر لوگوں کی اکثریت اس تصور پر یقین کرتے جا رہے ہیں کہ پوری انسانیت سیاسی بالادستی اور اقتدار کی جائز حقدار ہے۔ یہ صرف اور صرف مخصوص قومیتوں سے تعلق رکھنے والوں کا استحقاق نہیں ہے۔ یہی نہیں بلکہ انسانی حقوق اور بنی نوع انسان کے اجتماعی مفادات کا تحفظ ہی دراصل سیاست کے لیے مشعل راہ ہونا چاہیے۔ اگر ایسا ہے تو اس صورت میں دنیا بھر میں پھیلی ہوئی دو سو سے زائد آزاد اور خود مختار ریاستیں، اس

مقصد کے حصول کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔ اب چونکہ سوئس، انڈونیشیائی اور نائجیریا کے باشندے۔۔۔ برابر اور یکساں انسانی حقوق کے حقدار ہیں تو یہ کیسے ممکن ہو گا؟ کیا اس کا سادہ ترین طریقہ یہ نہیں کہ ان الگ الگ قومیتوں سے تعلق رکھنے والے انسانوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے پوری دنیا میں، ایک ہی عالمگیر حکومت قائم ہو؟

اب یہ وہ دنیا ہے جہاں جنم لینے والے مسائل کی نوعیت بھی عالمگیر ہے۔ دنیا میں ہر جگہ پگھلتی ہوئی برف کی چوٹیاں ہر روز خود مختار اور آزاد ریاستوں کے وجود کے باقی ماندہ جواز کو بھی ساتھ بہا کر لے جا رہی ہیں۔ کوئی بھی خود مختار ریاست، تن تنہا اور صرف اپنے بل بوتے پر موسمیاتی تبدیلیوں اور گلوبل وارمنگ کے مسئلے سے نبٹ نہیں سکتی۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ جب چین میں آسمانوں نے منتخب کردہ انسانوں کو پوری انسانیت کے مسائل کا حل تلاش کرنے کا ذمہ دار بنایا تھا۔ اب وہ دن قریب آتا جا رہا ہے کہ انسانیت کے لیے ضروری ہو جائے گا کہ وہ آسمانوں کو بچانے اور فردوس کو درپیش مسائل کا حل تلاش کرنے کے لیے کسی کو یہ ذمہ داری تفویض کرے۔ آج آسمانوں میں گرین ہاؤس گیسوں کے جمع ہونے سے سوراخ وسیع ہوتا جا رہا ہے۔ اس نئی، عالمگیر سلطنت کا رنگ۔۔۔ سرسبز ہونا لازم ہے۔

2014ء تک صورتحال یہ تھی کہ دنیا ابھی تک سیاسی طور پر بٹی ہوئی ہے لیکن ریاستیں نہایت تیزی کے ساتھ اپنی خود مختاری کھو رہی ہیں۔ دو سو سے زائد ریاستوں میں ایک بھی ایسی نہیں ہے جو آزاد معاشی پالیسیاں تشکیل دے سکے۔ کسی ریاست کے لیے ممکن نہیں ہے کہ وہ اپنی مرضی اور صرف ہٹ دھرمی کے بل بوتے پر جب چاہے، جہاں چاہے جنگ چھیڑ دے۔ بلکہ، اب تو صورتحال یہ ہو چکی ہے کہ ریاستیں اپنی مرضی اور منشاء کے مطابق اندرونی معاملات بھی احسن طریقے سے چلانے کے قابل نہیں رہیں۔ ریاستوں کی حال یہ ہے کہ وہ عالمی تجارتی منڈیوں کی جوڑ توڑ اور ریشہ دوانی کے سامنے ہتھیار پھینک چکی ہیں۔ وہ اب عالمی سطح پر بڑی بڑی کمپنیوں اور غیر منافع بخش اداروں کی جانب دیکھتی ہیں اور بین الاقوامی سطح پر عوامی رائے اور انصاف کے نظام کو فوقیت دی جاتی ہے۔ آج ریاستوں کے لیے لازم ہے کہ وہ مالیاتی رویوں، ماحولیاتی پالیسی اور انصاف کے عالمی تقاضوں کی ہر صورت پاسداری کریں۔ آج دنیا میں ہمیشہ سے بڑھ کر سرمایہ کاری، کاروبار، محنت کشی اور معلومات کا نہ صرف انتہائی طاقتور سیلاب آ چکا ہے بلکہ اسی بنیاد پر دنیا کی تشکیل نو بھی ہو رہی ہے۔ سرحدیں ٹوٹ رہی ہیں اور ریاستی بیانیوں سے صرف نظر کیا جاتا ہے اور اعراض بڑھتا ہی جا رہا ہے۔

ہماری آنکھوں کے سامنے بتدریج ایک ایسی عالمگیر سلطنت پک کر تیار ہو رہی ہے جس پر کسی مخصوص ریاست یا نسلی گروہ کی حکمرانی نہیں ہے۔ اس عالمگیر سلطنت کی مثال رومی سلطنت کے اواخر جیسی ہی ہے۔ اس سلطنت پر بھی کثیر النسلی اشرافیہ کی حکومت ہے جو مشترکہ ثقافت اور مفادات کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ دنیا بھر میں روز بروز منظم انداز میں کاروبار بڑھ رہے ہیں، مہم جوئی عام ہو چکی ہے۔ منتظمین، انجنیئر، ماہرین، محققین، وکلاء اور پڑھے لکھے کاروباریوں کی تعداد نہ صرف بڑھ رہی ہے بلکہ انھیں اس عالمگیر سلطنت کا حصہ بننے

کی طرف مائل کیا جارہا ہے۔ اب یہ لوگوں پر منحصر ہے کہ وہ اس عالمگیر سامراجیت کی طرف رجوع کرتے ہیں یا وہ اپنی ریاستوں اور آبائی لوگوں کے وفادار رہتے ہیں۔ سچ یہ ہے کہ آج دنیا بھر میں زیادہ سے زیادہ لوگ، جوق در جوق عالمگیر سلطنت کا انتخاب کر رہے ہیں۔

مذہب کی لاٹھی، دین کا دستور

یہ قرونِ وسطیٰ کے دور میں سمرقند کے ایک بازار کا منظر ہے۔ سمرقند وسط ایشیاء کے عظیم نخلستان میں ایک بڑا شہر تھا۔ سمرقند کے اس بازار میں شامی تاجر جگہ جگہ رک کر چینی ریشم پر ہاتھ پھیر پھیر کر معیار کا اندازہ لگا رہے تھے۔ وسط ایشیاء کے دشت و بیاباں سے تعلق رکھنے والے تند خو قبائلی گھنگھریالے بالوں والے غلاموں کی تازہ کھیپ لے کر پہنچ چکے تھے اور دکاندار جیبوں میں وہ چمکدار سونے کے سکے بھر رہے تھے جن پر انجان بادشاہوں کی غیر زبانوں میں مہریں ثبت تھیں۔ یہ وہ جگہ ہے جو مشرق، مغرب، شمال اور جنوب کے راستے آن کر ملتے تھے اور یہاں انسانیت صحیح معنوں میں یکجا، وحدت کی صورت نظر آتی تھی۔ اسی طرح کا منظر 1281ء میں بھی دیکھنے کو ملا تھا جب قبلائی خان کی افواج جاپان پر دھاوا بولنے کو تیار تھیں۔ منگول چمڑی اور فر سے سلی ہوئی پوشاکیں پہنے گھڑسوار، بانس کی لمبوتری ٹوپ پہنے چینی پیادوں، نشے میں دھت مددگار کوریائی سپاہیوں، جنوبی بحیرہ چین سے تعلق رکھنے والے ملاحوں، وسط ایشیائی معماروں اور طویل قامت یورپی مہم جوؤں کے شانہ بشانہ۔۔۔ایک واحد شہنشاہ کی کمان میں حملے کے حکم کا انتظار کر رہے تھے۔

اسی زمانے میں عرب کے شہر مکہ میں کعبہ کے گرد انسان ایک اور ہی رنگ میں یکجا ہو چکے تھے۔ اگر آپ کو 1300ء میں مسلمانوں کی مقدس مسجد الحرام میں حج کا موقع ملتا تو آپ دیکھتے کہ آپ کے ارد گرد طرح طرح کے لوگ جمع ہیں۔ آپ کو اپنی دائیں جانب عراقیوں کا ایک جتھا۔۔۔ سر پر عمامے باندھے، پیراہن اڑاتے گزرتا ہوا نظر آتا۔ ان کی آنکھوں میں غضب کی چمک ہوتی اور منہ سے مسلسل خدا کی بڑائی بیان ہوتی رہتی۔ آپ کے آگے یہ کون ہے؟ ایک ترک پہاڑوں سے تعلق رکھنے والا بوڑھا بزرگ شخص، ایک ہاتھ سے عصا ٹیکتے اور دوسرے سے داڑھی کھجاتا، کسی سوچ میں گم چلتا دکھائی دیتا۔ اس طرف سونے کے زیورات میں لدے پھندے تک سیاہ جلد کے مالک۔۔۔ یہ غالباً افریقی بادشاہت، مالی سے تعلق رکھنے والے مسلمانوں کا گروہ ہے۔ پھر آپ کو لونگ، ہلدی، الائچی اور سمندری نمک کی بھینی بھینی خوشبوں سونگھنے کو ملتی تو پتہ چلتا کہ ہندوستان سے ہمارے بھائی بھی یہاں موجود ہیں۔۔۔یا کیا خبر وہ ہندوستان سے بھی آگے، جنوب مشرقی ایشیاء کے مشہور مسالوں کی سرزمین سے تعلق رکھتے ہوں؟

آج عام طور پر مذہب کو تفریق، عدم اتفاق اور پھوٹ کی وجہ سمجھا جاتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود سچ یہ ہے کہ انسانیت کو یکجا کر کے اتحاد اور یگانگت کی راہ پر ڈالنے والے زر اور سلطنتوں کے بعد تیسرا بڑا عنصر ہے۔ اب چونکہ تمام سماجی نظام اور سلسلے تصوراتی ہوتے ہیں، یہ اسی وجہ سے کمزور اور بودے بھی واقع ہوتے ہیں۔ کوئی معاشرہ جتنا بڑا ہوتا جائے گا، یہ تصوراتی سلسلہ بھی اتنا ہی پھوٹک اور کمزور ہوتا چلا

جائے گا۔ تاریخ میں مذہب کا یہی کلیدی کردار رہا ہے۔ یہ اسی ناپائیدار معاشرتی ساخت اور سماجی ڈھانچے کو ملکوتی جواز فراہم کرتا آیا ہے۔ دنیا کے سبھی مذاہب پر زور دعویٰ کرتے ہیں کہ ہمارے قوانین صرف انسانی دماغ کی اختراع نہیں ہیں۔ یہ ہرگز وسواس نہیں ہیں۔ بلکہ یہ ایک مطلق اور برتر اعلیٰ '،بالادست حاکم کے جاری کردہ ابدی فرمان ہیں۔ اس اصرار اور حتمی توثیق سے کم از کم چند بنیادی قوانین کو اعتراض اور عذر سے بچاو مل جاتا ہے اور یوں اجتماعی طور پر سماجی استحکام حاصل ہوتا ہے۔

اس لحاظ سے مذہب کی تعریف کچھ یوں ہوگی، 'مذہب انسانی قواعد اور اقدار کا ایسا سلسلہ ہے جو ملکوتی نظام پر اعتقاد اور ایقان کی بنیاد پر قائم کیا گیا ہے'۔ اس تعریف کی رو سے دو جدا معیاری اصول ابھر کر سامنے آتے ہیں:

الف۔ مذاہب اس تصور پر کھڑے ہیں کہ ایک ملکوتی نظام وجود رکھتا ہے۔ یہ ملکوتی نظام انسانی خیال اور اتفاق رائے کی پیداوار نہیں ہے۔ مثال کے طور پر پیشہ ور فٹ بال کا کھیل ایک مذہب نہیں ہے۔ فٹ بال کے کئی کئی قانون، شعار اور بعض انتہائی منفرد رسومات بھی ہیں لیکن یہ بہر حال مذہب نہیں ہے کیونکہ سبھی جانتے ہیں کہ انسانوں نے اس کھیل کو ایجاد کیا تھا۔ یہی نہیں بلکہ فیفا نامی انجمن کسی بھی وقت ان قوانین، شعائر اور روایات میں تبدیلی کرنے کا فیصلہ کر سکتی ہے۔ مثلاً، اگر انجمن چاہے تو وہ گول پوسٹ کا سائز، گیند کا حجم، کھیل کے میدان کی لمبائی وغیرہ گھٹا یا بڑھا سکتی ہے۔ وہ چاہے تو آف سائیڈ رول کو یک جنبش قلم ختم کر سکتی ہے اور پنلٹی کارنروں کی روایت کو کھیل سے یکسر باہر نکال سکتی ہے۔

ب۔ اس ملکوتی نظام کی بنیاد پر، مذہب چند ایسے شعائر اور اقدار وضع کرتا ہے جسے یہ لازمی طور پر واجب قرار دیتا ہے۔ جیسے مغربی ملکوں میں بسر رکھنے والے لوگ آج بھی بھوت پریت، پریوں اور دوسرے جنم وغیرہ پر یقین تو رکھتے ہیں لیکن یہ اخلاقیات اور چال چلن، انسانی برتاو کے معیار کا ماخذ نہیں ہیں۔ اسی لیے، یہ تصورات مل کر مذہب نہیں قرار دیے جا سکتے۔ مذہبی تصورات، شعائر اور اقدار کے لیے لازم ہے کہ وہ انسانی کردار، چال چلن، برتاو، سلوک اور اخلاقیات کے معیار مقرر کریں۔

اگرچہ مذاہب وسیع پیمانے پر سماجی اور سیاسی نظام کی حلال زادگی اور جواز کے اہل ہوتے ہیں لیکن ہر مذہب میں اس امکان کو اجاگر کرنے کی اکساہٹ نہیں ہوتی۔ اگر کوئی مذہب اپنی ابدیت تلے وسیع علاقے اور بڑے سے بڑے انسانی معاشرے کو یکجا کرنے کی صلاحیت کو اجاگر کرنا چاہے تو اسے دو مزید خصوصیات درکار ہوتی ہیں۔ پہلی یہ کہ وہ ایک ایسے 'آفاقی' ملکوتی نظام کی تائید کرے زمان و مکان کی قید سے آزاد وجود اور سچائی سے لبریز ہو۔ سچ یہ ہے کہ قدیم زمانے کے مذاہب کی اکثریت مقامی اور امتیازی ہوا کرتے تھے۔ ان مذاہب کے پیرو کار مقامی ارواح اور چھوٹے خداؤں پر یقین رکھتے تھے اور انھیں پوری بنی نوع انسان کے عقائد کو بدلنے میں کوئی دلچسپی نہیں ہوتی تھی۔ جہاں تک ہمارا علم اور تحقیق ہمیں بتاتا ہے، 'آفاقی' اور 'تبلیغی' مذاہب آج سے تقریباً تین ہزار سال پہلے کے عرصے میں ظاہر ہونا شروع ہوئے۔ ان مذاہب کا ظہور، تاریخ کے ایک اہم انقلابی سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان مذاہب نے انسانیت کو

یکجا کرنے میں نہایت اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان آفاقی مذاہب کا یہ کردار اتنا ہی اہم تھا جتنا کہ تاریخ بھر میں آفاقی زر اور آفاقی سلطنتوں کا رہا ہے۔

میمنوں کی زبان بندی

جب ظاہریت اس دنیا کا غالب اعتقادی سلسلہ تھا تو اس وقت انسانی شعائر اور اقدار کو اپنے ارد گرد دوسرے موجود وجودات جیسے جانوروں، درختوں، بھوت پریت اور ارواح کے مفادات اور نقطہ نظر کو بھی لحاظ میں رکھنا پڑتا تھا۔ مثال کے طور پر دریائے گنگا کی وادیوں میں آدمی کے تاختی گروہوں پر انجیر کے درختوں کو عمومی اور بعض بڑے درختوں کو بالخصوص کاٹنے پر پابندی رہی ہوگی۔ یہ الگ بات ہے کہ اگر ان مخصوص انجیر کے درختوں پر بسر رکھنے والی ارواح اور پریاں دشمنی پر اتر آئیں تو ان کا قلع قمع ضروری رہا ہوتا ہو گا۔ لیکن دوسری جانب دریائے سندھ کی وادیوں میں بسر رکھنے والے تاختی باشندوں کے یہاں سفید دم والی لومڑیوں کے شکار پر پابندی رہی ہوگی کیونکہ ایک دفعہ کا قصہ ہے کہ کسی سفید دم والی ایک لومڑی نے کسی دانا عورت پر کشف کیا تھا کہ سندھ کی وادیوں میں بسر رکھنے والے گروہ جلد ہی قیمتی برکانی شیشہ دریافت کریں گے لیکن اس کے لیے انھیں قربانی دینی پڑے گی۔۔۔ فلاں علاقے میں مہم کر کے وقت کا چلہ لگانا پڑے گا۔ اس لومڑ کا کشف، سچ ثابت ہوا تھا۔

تو کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اس طرح کے ظاہراتی مذاہب کا نقطہ نگاہ نہایت مقامی اور محدود رہا کرتا تھا۔ یہ مخصوص علاقوں، ماحول اور مظاہر قدرت کے نرالے خدوخال پر تکیہ کرتے تھے۔ تاختیوں کی اکثریت اپنی پوری زندگی چند سو یا ہزار کلومیٹر کے علاقے میں مقید رہ کر گزارا کرتے تھے۔ بقاء اور معاش کے لیے کسی مخصوص وادی کے باشندوں کو صرف ایسے ملکوتی نظام کو سمجھنے کی ضرورت تھی جو صرف اور صرف ان کے آبائی علاقے اور وادیوں کو منظم رکھ سکے اور ان باشندوں کے رویے اور طرز زندگی، اس کے تحت ترتیب میں چلتی رہے۔ کسی دوسری وادی کے باسیوں کو انھی شعائر، قوانین اور عقائد پر راضی کرنے کی کوئی وجہ اور نہ ہی کوئی معنی تھا۔ دریائے سندھ کی وادیوں میں بسر کرنے والے قدیم آدمیوں نے کبھی گنگا کی وادیوں میں 'تبلیغی' جماعتیں ارسال نہیں کیں تاکہ وہ ان آبادیوں کو بھی سفید دم والی لومڑیوں کے شکار سے دور رہنے پر قائل کر سکیں۔

حقائق یہ بتاتے ہیں کہ زرعی انقلاب کے ساتھ ساتھ مذہبی انقلاب بھی برپا ہوا۔ تاختی اور شکاری آدمی جنگلی نباتات جمع کرتے تھے اور جانوروں کا پیچھا کر کے گزارہ کرتے تھے۔ ان کے نزدیک ان نباتات اور جانوروں کی حیثیت اور رتبہ انسانوں کے برابر ہی تھا۔ اگر آدمی کسی جنگلی بھیڑ کا شکار کرتا تھا تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا کہ جنگلی بھیڑیں انسانوں سے کمتر ہوتی ہیں۔ یہ بالکل ایسے ہی تھا جیسے شیر انسانوں کا شکار کرتے تھے لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا کہ شیر انسان سے برتر ہوتے ہیں۔ اس زمانے میں وجودات ایک

دوسرے سے سیدھا اور براہ راست رابطہ قائم کر سکتے تھے اور اپنے مشترکہ مسکن پر رائج اصولوں اور قوانین پر خود ہی گفت وشنید اور فیصلہ کرنے کے اہل تھے۔ اس کے برعکس دہقانوں کا جانوروں اور نباتات پر تسلط اور غلبہ تھا۔ وہ اپنے اس 'دھن'، 'مال' یا 'ملکیت' پر حاوی رہ کر ساز باز کرتے تھے اور ان کے لیے خود کو اپنی 'ملکیت' کے درجے پر گرا کر سمجھوتہ کرنا خارج از قیاس تھا۔ چنانچہ زرعی انقلاب کے نتیجے میں سب سے پہلا مذہبی اثر یہ ظاہر ہوا کہ نباتات کی فصلیں اور جانور روحانی گول میز پر برابری کے رتبے سے گر کر 'ملکیت' اور 'جائیداد' بنا دیے گئے۔

تاہم، اس سے ایک بہت بڑا مسئلہ پیدا ہو گیا۔ دہقان اپنی بھیڑوں پر مطلق اختیار اور انضباط کی خواہش رکھتے تھے لیکن وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ ان کا یہ تسلط محدود ہے۔ وہ بھیڑوں کو باڑوں اور ڈربوں میں بند کر سکتے تھے، بینڈھوں کو خصی بھی کر لیتے تھے اور بھیڑوں کے حمل کا فیصلہ بھی کر لیتے تھے لیکن وہ کسی طور بھی بھیڑوں کو اپنی مرضی سے حمل پر مجبور نہیں کر سکتے تھے اور نہ ہی ان کا پیدا ہونے والے میمنوں کی جنس اور صحت مندی پر کوئی اختیار تھا۔ وہ بھیڑوں کے ریوڑوں میں پھیلنے والی وبائی امراض کا بھی کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے۔ تو پھر وہ ریوڑوں کی زرخیزی اور باروری کو کیسے ممکن بنا سکتے تھے؟

خداؤں کی ابتدا بارے ایک نامی گرامی نظریے کی دلیل یہ ہے کہ خداؤں کو اہمیت اسی لیے ملی کہ وہ اس مسئلے کا حل تجویز کرتے تھے۔ کئی کئی خدا جیسے تولیدی باروری کی دیوی، فلک میں بادلوں کا خدا اور چارہ گر خدا وغیرہ اس وقت منظر پر آئے جب نباتات اور حیوانات نے بولنے کی صلاحیت کھو دی۔ خداؤں کا مرکزی کردار یہی تھا کہ وہ انسانوں اور نباتات وحیوانات کے بیچ ثالثی کریں۔ یہ خداؤں کی ذمہ داری تھی کہ وہ نباتاتی فصلوں اور جانوروں کو زبان بندی پر مجبور کریں، انسانوں کا اطاعت شعار بنائیں۔ تقریباً ساری قدیمی اساطیر اصل میں انسانوں اور خداؤں کے بیچ ایک ایسا قانونی معاہدہ ہے جس کے تحت انسانوں نے ابد تک خداؤں کی اطاعت شعاری قبول کر رکھی تھی۔ اس کے بدلے میں خدا انسانوں کو نباتات اور حیوانات پر دسترس دیتے تھے۔ توریت کی کتاب کے پہلے ابواب اس کی سب سے بڑی مثال ہیں۔ زرعی انقلاب کے بعد ہزاروں سال تک مذہبی رسوم اور عبادت کے مسلمہ طریقوں میں خدائی رضامندی کے لیے بھیڑ بکریوں کی قربانی، خداؤں کے لیے شراب اور غلے کی بھینٹ چڑھانا اور اپنی عزیز ترین 'اشیاء' کو خدا کے لیے ترک اور قربان کرنا وغیرہ عام تھا۔ اس کے بدلے، خدا انسانوں کو فصلوں کی بہترین پیداوار اور ثمر آور ریوڑوں سے نوازتے تھے۔

آغاز میں، زرعی انقلاب کا مظاہر پرست نظام میں انسان کے علاوہ دوسری مخلوقات اور موجودات جیسے چٹانوں، دریاوں، چشموں، بھوت پریتوں اور آسیب وغیرہ پر اثر ورسوخ بہت چھوٹے پیمانے پر ہوتا تھا۔ تاہم، یہ ساری چیزیں بتدریج نئے خداؤں کے سامنے اپنی حیثیت اور رتبہ کھو گئے۔ جب تک لوگ اپنی پوری زندگی چند سو مربع کلومیٹر کے اندر، محدود علاقوں میں بسر کرتے رہے ان کی ضروریات انھی

مقامی ارواح اور موجودات کی مدد سے پوری ہوتی رہیں۔ لیکن جب چھوٹی بادشاہتیں اور تجارتی نیٹ ورک پھیلنا شروع ہوئے تو لوگوں کو ایسی ہستیوں اور ناتوں سے رابطہ کرنے کی ضرورت پیش آئی جن کی طاقت اور اختیار پوری بادشاہت اور تجارتی طاس پر لاگو ہوتی تھی۔ ان ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ہی پہلی دفعہ کثرت پرستی یا مشرکانہ مذہبی تصورات نے جنم لیا۔ اب کئی کئی خدا ظاہر ہو گئے۔ کثرت پرست یا اصنام پرست یا شرک پر مبنی مذاہب یہ سمجھتے تھے کہ اس دنیا کے نظام کو طاقتور خداؤں کا ایک گروہ مل کر چلاتا ہے۔ مثلاً تولیدی بار آوری کی دیوی، ہواؤں اور بارشوں کا خدا اور جنگ و جدل کا غضب ناک خدا وغیرہ۔ انسان ان خداؤں کے حضور اپنی درخواست قربانیوں، بھینٹ اور اطاعت گزاری دے سکتے تھے۔ اگر خداؤں کو مناسب مقدار میں تواتر کے ساتھ قربانی اور اطاعت ملتی رہتی تو وہ باران کو رحمت بنا کر برساتے، فتح عطا ہوتی اور صحت بحال رہتی۔

کثرت پرستی کی آمد سے مظاہر پرستی مکمل طور پر ختم نہیں ہوئی۔ آسیب، بھوت، پریت، مقدس چٹانیں، پتھر، متبرک چشمے تقریباً سبھی کثرت پرست یا مشرک مذاہب کا حصہ رہے ہیں۔ یہ ارواح وغیرہ عظیم خداؤں سے کہیں کم اہمیت کے حامل تھے لیکن بہر حال عام لوگوں کی معمولی ضروریات کے لیے لازم تھے۔ یہ اپنا کام ابھی بھی بخوبی سرانجام دے رہے تھے اور لوگوں کے لیے کافی تھے۔ جب کسی شہر کے مرکز میں کوئی بادشاہ درجنوں موٹے تازے بینڈھوں کو جنگ و جدل کے خدا کے قدموں میں قربان کر کے پڑوس کے بد تہذیب اور جاہل لوگوں پر فتح اور برتری کے لیے دعائیہ عبادت کا اہتمام کر رہا ہوتا تھا تو اسی وقت ایک غریب دہقان اپنی بستی میں انجیر کے بڑے درخت میں بسنے والی پری کی خوشنودی کے لیے موم بتی جلا کر دعا مانگتا نظر آتا، تاکہ اس کے بیمار بیٹے کو شفا مل جائے۔

تاہم، یہ سمجھنا انتہائی لازم ہے کہ کئی کئی عظیم خداؤں کے ظہور کا واقعی اثر بھیڑوں یا آسیبوں پر نہیں بلکہ آدمی کی حیثیت اور رتبے پر نظر آیا۔ مظاہر پرست انسانوں کو دنیا میں بسنے والی لاتعداد مخلوقات میں سے ایک سمجھتے تھے۔ لیکن اس کے برعکس، کثرت پرستوں یا مشرکوں نے دنیا کو صرف اور صرف خداؤں اور انسانوں کے بیچ تعلق کے عدسے سے دیکھنا شروع کر دیا۔ اب ہماری عبادتیں، دعائیں، قربانیاں، گناہ اور نیکیاں پورے ماحولیاتی نظام کی قسمت کا تعین کرنے لگیں۔ اب یوں ہونے لگا کہ جب ہولناک سیلاب کے نتیجے میں کروڑوں چیونٹیاں، لاکھوں ٹڈے، ہزاروں کچھوے، سینکڑوں بارہ سنگھے اور دسیوں ہاتھی اور زرافے برباد ہو جاتے تو اس کی وجہ صرف یہ ہوتی تھی کہ چند بیوقوف اور احمق آدمیوں نے خداؤں کو ناراض کر دیا تھا۔ مشرکانہ یا کثرت پرستی پر مبنی ان مذاہب نے نہ صرف خداؤں کو عالی مقام اور بلند مرتبت بنا دیا بلکہ انسانوں کو بھی سربلند اور ممتاز مخلوق کا تاج پہنا دیا۔ قدیم مظاہر پرستی پر مبنی سلسلے کے کردار اپنا رتبہ اور حیثیت کھوتے چلے گئے اور اب ان کی حیثیت زائد اور اضافی تھی۔ وہ اب انسانوں اور خداؤں کے تعلق پر مبنی اس ڈرامے کے خاموش لیکن اب بھی سجے سجائے تماشائی بن چکے تھے۔

بت پرستی کے فوائد

دو ہزار سال تک توحید پرستی پر مبنی تصورات کی دماغ شوئی کا نتیجہ ہے کہ مشرق اور مغرب میں لاتعداد لوگ کثرت پرستی یا مشرکانہ عقائد کو سخت جہالت اور بچگانہ بت پرستی سے زیادہ کچھ نہیں سمجھتے۔ یہ سراسر ناانصافی پر مبنی کلیشہ ہے اور لکیر کی فقیری کا معاملہ ہے۔ کثرت پرستی کی اندرونی منطق کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ کئی کئی خداؤں میں ایمان اور ایقان کی پشت پر سہارا دینے والے مرکزی خیال کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔

مشرکانہ عقائد یا کثرت پرستی میں ضروری نہیں ہے کہ پوری کائنات پر حاکم ایک واحد آفاقی طاقت یا آفاقی قانون کی لازمی نفی ہو۔ حقیقت تو یہ ہے کہ کثرت پرستی کی تقریباً اشکال بلکہ مظاہر پرست مذاہب میں بھی ایسی یکتا اور آفاقی قوت کو تسلیم کیا جاتا ہے جو باقی کے سبھی خداؤں، آسیبوں یا مقدس پتھروں اور چٹانوں کی پشت پر کھڑی ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر کلاسیک یونانی کثرت پرست عقائد اور اساطیر میں زیوس، ہیرہ، اپالو اور باقی کے سبھی خدا ایک قادر مطلق اور ہر شے کا احاطہ کرنے والی طاقت 'قسمت' (مویری اور انانکے) کی رعایا ہوتے ہیں۔ نورڈک تہذیب میں پائے جانے والے کئی کئی خدا، اسی 'قسمت' نامی آفاقی طاقت کے قیدی تھے۔ یہی طاقت تھی جس نے ان خداؤں کو ریگناروک (خداؤں کا انحطاط) نامی طوفانی سیلاب میں غرق کر دیا تھا۔ اسی طرح مغربی افریقہ میں یوروبا نامی مشرکانہ عقائد پر مبنی مذہب میں سبھی خداؤں نے ایک سب سے عظیم خدائی طاقت اولوڈیمور کے بطن سے جنم لیا تھا۔ یہ سبھی خدا، اولوڈیمور کے اطاعت گزار تھے۔ ہندوؤں کے یہاں کثرت پرستی میں ارفع ترین حصہ 'آتما' ہوتی ہے۔ یہ کونیاتی ذات ہے، جو نہ صرف اس کرہ ارض پر موجود ہر جاندار اور شے بلکہ اس کائنات کے ہر سیارے اور ستارے، اجرام فلکی میں بھی حلول ہے۔ یہ آتما ہی ہے جو ان گنت خداؤں، ارواح، انسانوں کے لیے حیاتیاتی اور طبیعی دنیا کو کنٹرول کرتی ہے۔ آتما اس کائنات کی بھی روح ہے۔

کثرت پرستی کی بنیادی فراست اور پرکھ ایسی ہے جو اسے توحید پرستی سے الگ کرتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ بلند و برتر آفاقی طاقت جو دنیا جہاں کی حاکم ہے۔۔۔ دراصل مفادات اور تعصب سے پاک ہوتی ہے۔ اسے انسانوں کی معمولی خواہشات، اندیشوں اور چنتاؤں سے کوئی مطلب نہیں ہوتا۔ یہ ایسی برتر اور عظیم لیکن بے نیاز طاقت ہے کہ جس سے جنگوں میں فتح، صحت مندی اور بارش کی دعا کر کے طلب اور توقع رکھنا بے سود ہے۔ وہ اس لیے کہ اس کی معراج ایسی ہے کہ اس طاقت کو چنداں کوئی فرق نہیں پڑتا کہ کوئی بادشاہت فتح سے سرشار ہوتی ہے یا غرق ہو جاتی ہے۔ کوئی شہر خوشحال ہے یا برباد ہو رہا ہے۔ کوئی شخص جیے یا مرے، اس کو پرواہ نہیں ہے۔ یونانیوں نے اسی لیے کبھی 'قسمت' اور ہندوؤں نے کبھی بھی 'آتما' کی پوجا کے لیے مندر تعمیر کیا ہے اور نہ ہی قربانی کی بھینٹ چڑھائی ہیں۔

اس عظیم آفاقی اور برتر طاقت تک رسائی کی صرف اور صرف یہی وجہ ہو سکتی ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی ساری خواہشات ترک کر دے۔ برائی کے ساتھ ساتھ نیکی سے بھی بے نیاز ہو جائے اور بلا چوں و چراں شکست، غربت، بیماری اور موت کو گلے لگانے کے قابل ہو جائے۔ اسی لیے بعض ہندو، جنھیں سادھو یا سنیاسی کہا جاتا ہے۔۔۔ اپنی پوری زندگی آتما سے یکجا ہونے کے لیے مشقت میں جھونک دیتے ہیں۔ جب ان کی محنت رنگ لاتی ہے تو ان کو روشن خیالی اور آگاہی کا تحفہ ملتا ہے۔ سادھو اور سنیاسی دنیا کو اسی آفاقی برتر طاقت کے نکتہ نظر سے دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں اور انھیں اس ابدی تناظر سے دیکھنے پر پتہ چلتا ہے کہ دراصل تمام معمولی خواہشات اور اندیشے بے معنی ہیں۔ یہ سراب ہے۔ یہ چند روزہ زندگی بے ثبات ہے۔ ہر شے فنا ہونے والی ہے۔

لیکن ہندوں کی اکثریت سادھو نہیں ہوتی۔ وہ سر کے بالوں تک معمولی خواہشات، اندیشوں اور کاروبار دنیا میں ڈوبے رہتے ہیں۔ اس ابتر صورتحال میں آتما ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتی۔ اس طرح کے معاملات میں مدد کے لیے ہندو ان خداؤں کے در کا رخ کرتے ہیں جن کے پاس جزوی طاقت ہوتی ہے۔ ان کی جزوی طاقت اور خصوصیت ہی ان کے کار آمد ہونے کا پتہ دیتی ہے۔ اسی لیے گنیشا، لکشمی اور سروسوتی نامی خداؤں اور دیویوں کی اپنی اپنی سکت تو ہوتی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ مفادات اور تعصبات بھی ہوتے ہیں۔ انسان، اپنے معمولی اور ادنی معاملات کو حل کرنے کے لیے ان جزوی طاقتوں کے حامل خداؤں کے ساتھ جوڑ توڑ کر سکتے ہیں اور ان کی مدد سے جنگوں میں فتح اور بیماریوں سے نجات پا سکتے ہیں۔ اب چونکہ ایک عظیم آفاقی طاقت آتما کی ابدی طاقت کو تقسیم کرنا پڑے تو پھر یہ قوت اور سکت ہزاروں، لاکھوں بلکہ کروڑوں حصوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ اسی لیے، ایک سے زیادہ خدا جنم لیتے ہیں۔ اسی لیے شرک پیدا ہوتا ہے۔ اسی لیے کثرت پرستی کا بول بالا ہوتا ہے۔ اسی لیے ہندوں کے یہاں کروڑوں خدا پائے جاتے ہیں۔

کثرت پرستی یا مشرکانہ عقائد کی فراست پر غور کریں تو پتہ چلتا ہے کہ یہ مذہبی برداشت اور رواداری کی بے پناہ صلاحیت کے حامل ہوتے ہیں۔ اب چونکہ کثرت پرستوں کا ایقان یہ ہے کہ ایک طرف عظیم برتر طاقت ہے جو مکمل طور پر بے نیاز ہوتی ہے۔ دوسری جانب کئی کئی جزوی اور طرفداری پر مائل طاقتیں ہیں۔ یعنی، کسی ایک خدا کے ماننے والے کو کسی دوسرے خدا کے وجود اور کارگری سے کوئی انکار نہیں ہوتا بلکہ وہ ہر خدا کے وجود کو ماننے میں کسی مشکل کا سامنا نہیں کرتے۔ کثرت پرستی، خلقی طور پر وسیع النظری اور نئے تصورات کو جگہ دینے کے قابل ہوتی ہے۔ یہ شاذ و نادر ہی کسی کو 'کافر'، 'زندیق'، 'بدعتی' یا 'ملحد' قرار دیتی ہے۔

تاریخ میں ایسا کئی بار ہوا کہ کثرت پرستوں یا مشرکوں نے عظیم سلطنتوں کو فتح کر کے انتظام سنبھال لیا۔ لیکن اس کے باوجود، انھوں نے کبھی اپنی رعایا کو مذہب بدلنے پر مجبور نہیں کیا۔ مصری، رومی اور ازٹیک مشرکوں نے کبھی بھی دوسرے خطوں اور دیسوں میں اپنی 'تبلیغی' یا 'مشنری' جماعتیں نہیں بھجوائیں۔ انھوں نے کبھی غیر لوگوں کو ایزیرس، مشتری یا وتسلوپوچٹلی (عظیم ازٹیک خدا) کی عبادت پر مائل نہیں کیا اور اس مقصد کے لیے فوجی مہمات ہرگز نہیں کیں۔ مشرک سلطنتوں میں رعایا سے سلطنت کے خداؤں اور شعائر کی تعظیم

سے متعلق توقع رکھی جاتی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی ان خداؤں اور مذہبی شعائر کی بنیاد پر سلطنتوں کو اپنے وجود کا جواز اور تحفظ ملتا تھا لیکن اس کے باوجود رعایا کو اپنے مقامی خداؤں، عقائد اور شعائر پر قائم رہنے کی کھلی آزادی تھی۔ مثلاً ازٹیک سلطنت میں رعایا پر لازم تھا کہ وہ اوتسلوپوچٹلی کے لیے مندر تعمیر کیا کریں۔ یہ مندر مقامی خداؤں اور شعائر کے ساتھ لازمی تھے۔۔۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ ازٹیک سلطنت نے صرف اور صرف اوتسلوپوچٹلی کے لیے مندروں کی تعمیر یا مقامی مندروں کو ڈھا کر ان کی جگہ اوتسلو پوچٹلی کے لیے مندر تعمیر کروانے کے لیے زور اور جبر کیا ہو۔ ہر طرح کے عقیدے، ساتھ ساتھ پنپنے کی آزادی تھی۔ کئی دفعہ تو ایسا ہوا کہ سامراجی اشرافیہ نے رعایا کے خداؤں اور شعائر کو بھی اپنالیا۔ مثال کے طور پر رومیوں نے بخوشی ایشیائی دیوی کیبلی (مامتا کی دیوی) اور مصری دیوی آئی سس (فطرت کی دیوی) کو اپنی عبادت گاہ عامہ کا خاص حصہ بنایا۔

تاریخ بھر میں صرف ایک خدا ایسا تھا جو رومیوں نے برداشت کرنے سے انکار کر دیا۔ یہ توحید پرست عیسائیوں کا تبلیغ پر مبنی اناجیلی خدا تھا۔ رومی سلطنت نے کبھی عیسائیوں کو اپنے عقائد اور شعائر کو ترک کرنے پر تو مجبور نہیں کیا لیکن وہ عیسائیوں سے یہ توقع ضرور رکھتے تھے کہ وہ سلطنت کے محافظ خداؤں اور شہنشاہ وقت کی الہامی تقدیس کی تعظیم ضرور کریں۔ یہ ہر لحاظ سے سلطنت کے ساتھ سیاسی وفاداری کا پیمانہ بھی تھا۔ اب عیسائی، توحید پرست تھے۔ جب انھوں نے شدت اور تندی کے ساتھ سلطنت کے اس تقاضے کو نہ صرف رد کر دیا بلکہ مفاہمت اور سمجھوتے کی سبھی راہیں بھی بند کر دیں تو رومیوں نے سخت قدم اٹھانے کا فیصلہ کیا۔ رومی سلطنت کا یہ ردعمل دراصل ان کی سمجھ کے مطابق سیاسی طور پر باغیوں سے نبٹنے کے مترادف تھا۔ تاریخی ریکارڈ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ رومیوں کا سخت جوابی عمل کا فیصلہ نیم دلی سے لیا گیا تھا۔ عیسیٰ کو سولی چڑھانے کے تین سو برس بعد بالآخر قسطنطین اعظم نامی رومی سلطنت کے شہنشاہ نے عیسائیت قبول کر لی اور یوں عیسائی یا نصرانی بازنطینی سلطنت کی بنیاد رکھی گئی۔ ان تین سو برسوں کے عرصے کے دوران مشرک رومی سلطنت نے عیسائیوں پر جور و ستم، عقوبت کی زیادہ سے زیادہ صرف چار عام مہمات چلائیں۔ مقامی حکام اور ریاستی گورنروں کی جانب سے عیسائی دشمن تحریکیں اور تشدد ان کا اپنا فیصلہ تھا۔ رومی سلطنت کی جانب سے ایسی صرف چار مہمات کا ریکارڈ دستیاب ہے۔ لیکن اس کے باوجود اگر ان سبھی عیسائی دشمن تحریکوں سے متاثر ہونے والے عیسائیوں کی تعداد کا اندازہ لگایا جائے تو وہ تین سو برسوں کے دوران مشرک رومیوں کے ہاتھ قتل ہونے والے توحید پرست عیسائیوں کی تعداد چند ہزار سے زیادہ نہیں ہے۔ اس کے برعکس، اس سے اگلے پندرہ سو برسوں میں خود عیسائیوں نے دوسرے مذاہب اور عقیدوں کے پیرو کاروں کو تو چھوڑو۔۔۔ خود محبت اور خدا ترسی کے عقیدے پر یقین رکھنے والے دوسرے عیسائیوں کو معمولی تفرقے اور مسلکی اختلافات کی بنیاد پر، مذہب کو تحفظ دینے کے نام پر لاکھوں کی تعداد میں ہلاک کیا۔

کیتھولک اور پروٹیسٹنٹ کے بیچ مذہبی جنگوں نے جس طرح پورے یورپ کو سولھویں اور سترھویں صدی کے دوران لپیٹ میں لیے رکھا۔۔۔ یہ دونوں صدیاں تو اس حوالے سے بالخصوص رسوائی کا سامان ہیں۔ ان جنگوں کے دونوں فریق اور ہر شخص یسوع مسیح کی تقدیس اور تعلیمات پر دل و جان سے ایقان رکھتا تھا۔ تاہم، ان کا آپس میں اختلاف یسوع مسیح کی انسانیت سے محبت کے طریقہ کار اور اس کے معنوں پر تھا۔ پروٹیسٹنٹ کا خیال تھا کہ یسوع مسیح کی انسانیت سے مقدس محبت اتنی عظیم تھی کہ خدا ان کے روپ میں زمین پر اتر آیا اور یہ خدا ہی تھا جس نے انسانیت کے لیے دکھ، الم، جسمانی تکلیف سہی اور بالآخر انسانیت کی محبت میں سولی بھی چڑھ گیا۔ یوں انسانیت کے سارے گناہ دھل گئے اور جنت کے دروازے ان لوگوں کے لیے کھل گئے جو اس کی ذات سے محبت اور یقین رکھتے ہیں۔ دوسری جانب، کیتھولک عیسائی فرقے کا ماننا تھا کہ اگرچہ ایقان اور ایمان ضروری ہے لیکن صرف یہی کافی نہیں ہے۔ جنت میں داخل ہونے کے لیے ایقان اور ایمان رکھنے والوں کے لیے چرچ کی رسومات اور شعائر میں بھرپور حصہ لینا اور نیک کام کرنا لازم تھا۔ پروٹیسٹنٹوں نے اس تشریح کو قبول کرنے سے انکار کیا اور دلیل یہ پیش کی کہ یہ خواہ مخواہ کا ادل بدل اور شعائری مغالطے خدا کی عظمت اور بے پناہ محبت کو بے وقعت کرنے، اس کی قدر و قیمت گھٹانے کے مترادف ہے۔ وہ جو یہ سمجھتے ہیں کہ جنت میں داخلے کا دارومدار اس کی اپنی نیکیوں اور مذہبی رسومات سے ہے تو گویا وہ اپنی اہمیت جتلا رہا ہے۔ اسے یسوع مسیح کی جدوجہد، انھوں نے جو اذیت جھیلی اور سولی پر چڑھ کر دی ہوئی قربانی۔۔۔ یعنی خدا کی انسانیت کے لیے عظیم محبت پر اعتبار نہیں ہے؟ وہ خدا کی عظیم رحمت پر اعتبار نہیں کرتا؟

یہ مذہبی تنازعات اس قدر بڑھے کہ تشدد پر منتج ہوئے۔ سولہویں اور سترھویں صدی کے دوران کیتھولک اور پروٹیسٹنٹ نے ایک دوسرے کے دسیوں ہزار، لاکھوں لوگ کو موت کی گھاٹ اتارا۔ 23 اگست 1572ء کو فرانسیسی کیتھولک (جو نیکو کاری اور چرچ کی رسوم پر یقین رکھتے تھے) نے فرانسیسی پروٹیسٹنٹ (جو خدا کی انسانیت کے لیے عظیم محبت پر یقین رکھتے تھے) کی آبادیوں پر بھرپور حملہ کیا۔ اس حملے کو 'یوم بارتلمی کے قتل عام' کے نام سے جانا جاتا ہے جس کے نتیجے میں چوبیس گھنٹوں کے اندر 5000 سے 10000 پروٹیسٹنٹ کو بہیمانہ طریقے سے قتل کر دیا گیا۔ جب روم میں پوپ نے فرانس سے آنے والی یہ خبر سنی تو اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ پوپ نے جشن کا اہتمام کیا اور دعائیہ تقریبات کا انعقاد کیا تاکہ اس واقعہ کو بھرپور طریقے سے منایا جائے۔ یہی نہیں بلکہ پوپ نے جورجو وازاری نامی مشہور اطالوی مصور کو ویٹی کن کے ایک کمرے میں اس قتل عام کی منظر کشی کرنے کا باقاعدہ کام بھی سونپا۔ ویٹی کن میں یہ کمرہ آج بھی موجود ہے لیکن عام عوام کو یہاں داخلے کی اجازت نہیں ہے۔ اس ایک روز، چوبیس گھنٹوں کے اندر عیسائیوں نے اپنے بھائی بند عیسائیوں پر اتنا خون بہایا، جتنا مشرک رومی سلطنت نے عیسائیوں کے ساتھ اپنے پورے دور میں جبر نہیں کیا ہو گا۔

خدا ایک ہے

وقت کے ساتھ یوں ہوا کہ مشرکین یعنی ایک سے زیادہ خداؤں کے پیرو کاروں میں سے چند ایسے بھی تھے جو اپنے مخصوص متولی خدا کے ایسے گرویدہ ہوئے کہ کثرت پرستی کی بنیادی درک اور بصیرت سے دور ہوتے چلے گئے۔ وہ بتدریج اس ایقان پر پہنچ گئے کہ ان کا خدا ہی صرف خدا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ان کا خدا ہی اس کائنات کی ابدی اور عظیم تر طاقت ہے۔ لیکن مشرکانہ تصورات کے عین خلاف، وہ اپنے اس خدائے واحد کو آفاقی قرار دینے کے علاوہ، اس کے ساتھ مفاد اور تعصبات کو بھی جوڑنے لگے۔ ان کا خیال یہ تھا انسان، اس آفاقی اور عظیم بر تر خدا کے ساتھ براہ راست تعلق جوڑ کر سودا بھی کر سکتا ہے۔ یوں، توحید پرست مذاہب کا جنم ہوا۔ توحید پرست مذاہب کے پیرو کار نہ صرف یہ کہ خدائے واحد کو ابدی اور آفاقی، عظیم تر طاقت سمجھتے تھے بلکہ اس کی منت سماجت کر کے بیماریوں سے چھٹکارا بھی پاتے تھے، التجا کر کے قسمت آزائی کے کھیل بھی کھیل سکتے تھے اور استدعا کر کے جنگوں میں فتح بھی پاتے تھے۔

دنیا کا پہلا توحید پرست مذہب 350ء میں مصر میں ظاہر ہوا۔ اس وقت مصر پر اخناتون نامی فرعون کی حکومت تھی۔ اخناتون نے پوری سلطنت میں منادی کرا کے احکامات جاری کیے کہ مصری عبادت گاہ عامہ میں آتن نامی قدرے صغیر خدا ہی دراصل وہ عظیم، ابدی اور آفاقی طاقت ہے جو اس کائنات پر حاکم ہے۔ اخناتون نے آتن کی عظمت اور بڑائی کو اداریت میں ڈھالتے ہوئے، اس کی عبادت کو لازمی قرار دے دیا۔ آتن کو ریاستی مذہب بنا دیا اور دوسرے سبھی خداؤں کی عبادت کو ترک کرنے کے سخت احکامات جاری کر دیے بلکہ تقریباً پابندی لگا دی۔ تاہم، اخناتون کا یہ مذہبی انقلاب ناکام رہا۔ اس کی موت کے بعد آتن کی عبادت ترک کر دی گئی اور پرانا مصری عبادت گاہ عامہ کا رجحان دوبارہ بحال کر دیا گیا۔

مشرکانہ عقائد میں سے ہی یہاں اور وہاں، گاہے بہ گاہے دوسرے کئی توحید پرست مذاہب نے جنم لیا لیکن یہ ہمیشہ ہی کنارہ کش رہے۔ اس کی صرف ایک ہی وجہ تھی کہ توحید پرست عقائد کے لیے اپنے ہی آفاقی پیغام کو ہضم کرنا مشکل تھا۔ اس ضمن میں یہودیت کی مثال دیکھ لیں۔ یہودیت کی دلیل یہ ہے کہ ابدی اور آفاقی خدائے واحد کے اپنے مفادات اور تعصبات ہوتے ہیں لیکن اس کا سب سے بڑا مفاد ایک معمولی اور ننھی سی قوم، یعنی یہودیوں اور اسرائیل جیسے گمنام علاقے کے ساتھ جڑا ہے۔ یہودیت میں دوسری اقوام کے لیے دلچسپی کا کوئی سامان نہیں تھا۔ اسی لیے یہودیت اول دن سے ہی، کبھی بھی 'تبلیغی' یا 'مشنری' مذہب نہیں رہا۔ یہودیت کی اس حالت کو ہم 'مقامی توحید پرستی' کی حالت قرار دے سکتے ہیں۔ یہ توحید پرستی کی سب سے بنیادی اور اولین لیکن صرف یہ ہے کہ باقاعدہ شکل ہے۔

توحید پرستی میں اصل دریافت تو عیسائیت کی صورت ہوئی۔ یہ مذہب ابتداء میں ایک ایسا مخفی یہودی فرقہ تھا جو یہودیوں کو قائل کرنے کی کوشش کرتا تھا کہ دراصل یسوع ناصری ہی ان کے اصل مسیحا ہیں جن کا انھیں طویل عرصے سے انتظار تھا۔ تاہم، اس فرقے کے اولین راہبروں میں سے ایک پولوس نامی مبلغ تھا۔ پولوس نے دلیل پیش کی کہ اگر ابدی اور آفاقی خدائے واحد کے واقعی مفادات اور تعصبات ہوتے ہیں اور اگر اس نے زمین پر اتر کر گوشت پوست میں سمو کر انسانیت کے لیے سولی پر چڑھ کر اذیت ناک موت قبول کرنے کی زحمت بھی اٹھائی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس ابدی اور آفاقی خدائے واحد کا پیغام صرف یہودیوں کے لیے نہیں ہے بلکہ یہ پیغام اور تعلیم تو ہر انسان تک پہنچائی جانی چاہیے۔ یہودیوں کے لیے یہ امتیازیت اور اختصاص منطق کے خلاف ہے۔ چنانچہ فیصلہ یہ ہوا کہ یسوع مسیح کا پیغام اور تعلیمات پوری دنیا میں پھیلا دی جائیں۔ اس پیغام کو ہم انجیل کے نام سے جانتے ہیں۔

پولوس کی اس دلیل کا بیج گویا زرخیز زمین پر گرا۔ عیسائیوں نے منظم طریقے سے تبلیغ اور مشن کا کام شروع کیا اور ہر انسان تک اس پیغام کو پہنچانے کا مقصد بنا لیا۔ آگے چل کر، تاریخ کے ایک انتہائی عجیب و غریب بل میں ایک ادنیٰ یہودی فرقہ عظیم رومی سلطنت کو اکھاڑ کر رکھ دے گا اور رہتی دنیا تک اس پر عیسائیت کی چھاپ لگ جائے گی۔ ایک وقت ایسا آیا کہ قدیم رومی سلطنت، جدید عیسائی، بازنطینی سلطنت میں ڈھل گئی۔

عیسائیوں کی یہ کامیابی ایک دوسرے توحید پرست مذہب کے لیے بھی مشعل راہ بن گئی۔ اسلام نامی یہ مذہب ساتویں صدی عیسوی میں جزیرہ عرب میں ظاہر ہوا۔ جزیرہ عرب، دنیا کا دور دراز کونہ تھا۔ عیسائیت کی طرح اسلام بھی اوائل دور میں دور دراز علاقے میں ایک چھوٹے سے فرقے کی صورت شروع ہوا۔ لیکن عیسائیت سے بھی بڑے اور سریع تاریخی اچنبھے کی صورت، اسلام نے جلد ہی عرب کے بیابان صحرا سے نکل کر فتوحات کا انبار لگا دیا۔ یوں ایک ایسی عظیم الشان سلطنت قائم ہوئی جس کی سرحدیں بحر اوقیانوس سے لے کر ہندوستان تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اس وقت سے لے کر آج تک توحید پرست تصورات، دنیا کی تاریخ میں مرکزی کردار ادا کرتے آ رہے ہیں۔

تاریخ گواہ ہے کہ توحید پرست، کثرت پرستوں کی نسبت کہیں زیادہ بلکہ بہت ہی زیادہ کٹر، شدت پسند اور مبلغ ثابت ہوئے ہیں۔ اس کی وجہ ہے۔ وہ یہ ایک ایسا مذہب (مشرکانہ عقائد پر مبنی) جو دوسرے طرح طرح کے مذاہب اور عقائد کے جواز اور وجود کو تسلیم کرتا ہو، اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے خدا کی عالی نسبت، برتری اور عظمت کو آفاقی اور کامل نہیں سمجھتا یا یہ کہ اس مخصوص عقیدے کا خدا 'آفاقی سچائی' کا بس ایک جزیا حصہ ہے۔ اب چونکہ توحید پرست عام طور یہ ایقان رکھتے ہیں کہ وہ صرف اور صرف ایک یعنی خدائے واحد کے پیغام کا پرچار کرتے ہیں تو ان کے لیے دوسرے ہر طرح کے مذاہب کو رد کر دینا، قدرتی طور پر لازمی ہو جاتا ہے۔ پچھلے دو ہزار

سال سے توحید پرستوں نے اپنا ہاتھ اور اس عقیدے کو مضبوطی سے پھیلانے کے لیے نہایت تند خوئی اور شدت کے ساتھ ہر طرح کے مقابلے کا صفایا کرنے کی کوشش کی ہے۔

ہم آج کہہ سکتے ہیں کہ توحید پرستوں کی یہ شدت اور کٹرپن کام بھی کر گئی ہے۔ وہ یوں کہ پہلی صدی عیسوی میں توحید پرستوں کی تعداد نہایت کم تھی بلکہ نہ ہونے کے برابر تھی۔ 500ء میں دنیا کی سب سے بڑی سلطنتوں میں سے ایک، یعنی رومی سلطنت عیسائوں کا عہد حکومت بن چکی تھی۔ اس سلطنت کی چھتر چھایا میں عیسائی مشن اور تبلیغی اس توحید پرست عقیدے کو یورپ، ایشیاء اور افریقہ کے کونے کونے میں پھیلا رہے تھے۔ 1000ء تک یورپ، مغربی ایشیا اور شمالی افریقہ میں بسنے والے تقریباً سبھی لوگ توحید پرستی کے قائل ہو چکے تھے۔ یہی نہیں بلکہ بحر اوقیانوس سے لے کر ہمالیہ کی سربلند چوٹیوں تک خدائے واحد کا ڈنکا بج رہا تھا۔ سولھویں صدی عیسوی کے اوائل میں توحید پرست افریشیائی دنیا کے تقریباً حصے پر غالب آ چکے تھے۔ اب تک افریشیاء میں صرف مشرقی ایشیاء اور افریقہ کے جنوبی حصے ہی بچ گئے تھے۔ چنانچہ توحید پرستی نے یہاں بھی پوری تندی کے ساتھ جنوبی افریقہ، امریکہ اور بحرالکاہل و اس کے قریبی سمندری جزیروں میں گیرے پھیلانا شروع کیے۔ آج مشرقی ایشیاء سے باہر تقریباً انسان ایک دوسرے توحید پرست مذہب کو مانتے ہی ہیں اور عالمی سیاسی نظام بھی توحید پرستانہ بنیادوں پر ہی کھڑا ہے۔

لیکن جس طرح مظاہر پرستی، مشرکانہ اور کثرت پرست تصورات کے جوبن میں بھی کسی نہ کسی صورت بزقی رہی، اسی طرح آج مشرکانہ عقائد بھی توحید پرستی کے جوبن میں باقی ہے۔ نظریاتی طور پر اگر کوئی شخص ایک دفعہ کائنات کی ایسی ابدی اور عظیم تر طاقت میں یقین قائم کر لے جس کے اپنے مفادات اور تعصبات بھی ہیں تو پھر جزوی طاقتوں اور بٹی ہوئی طاقتوں کے حامل خداؤں کو پوجنے کا کیا فائدہ ہے؟ اب کوئی اپنی عرضی لے کر ایک کلرک نما بیورو کریٹ کے پاس کیوں جائے گا جبکہ اس کی پہنچ صدر کے دفتر تک ہو؟ تو ظاہر ہے، یقینی طور پر توحید پرست مذہبی عقائد برتر اور عظیم تر خدائے واحد کے سوا باقی سبھی خداؤں کے وجود کو رد کر دیتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اگر کوئی شخص ان کئی کئی خداؤں کی عبادت کی جرات کرے گا تو خدائے واحد، وہ بزرگ و برتر طاقت ایسے برباد لوگوں پر جہنم کی آگ برسنے اور ایسے لوگوں کو دوزخ کا ایندھن بنانے میں ہرگز پس و پیش سے کام نہیں لے گا۔ اس خدائے عظیم، واحد ہستی پر ایقان قائم کرنے والے۔۔۔ بعد از موت تو ایک طرف، مشرکوں اور ملحدوں کو دنیا میں بھی کہیں کا نہیں چھوڑیں گے۔
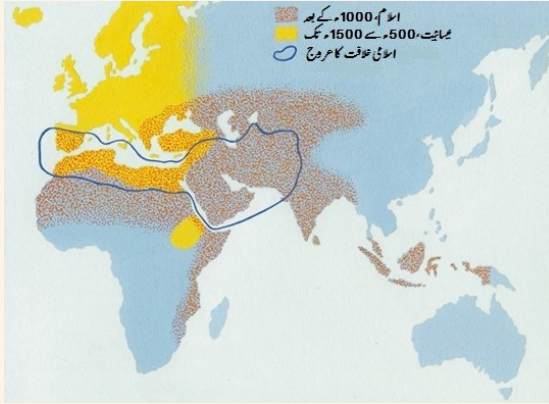
عیسائیت اور اسلام کا پھیلاؤ

لیکن اس کے باوجود دینیاتی تصورات اور تاریخی حقائق کے بیچ ایک عجب طرح کا شگاف پایا جاتا ہے۔ یہ عجب نفاق ہے۔ زیادہ تر لوگوں کے لیے توحید پرست تصور پوری طرح ہضم کرنا مشکل ہوجاتا ہے۔ یہ لوگ، اسی وجہ سے دنیا کی 'آپ' اور 'ہم' میں تقسیم جاری رکھتے آئے ہیں اور ان کے نزدیک کائنات کی ابدی عظیم تر خدائی طاقت۔۔۔ انسانوں کی معمولی ضروریات پوری کرنے کے لیے بہت ہی بڑی، بہت ہی دور اور اجنبی طاقت ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ توحید پرست مذاہب نے چھوٹے خداؤں کو سامنے کے دروازے سے تو خوب دھوم دھام سے نکال باہر کر لیا لیکن پھر جلد ہی پچھلے دروازے سے ایک دوسری شکل میں دوبارہ بلا لائے۔ مثال کے طور پر عیسائیت میں ولیوں اور رشیوں کی بڑی تعداد جمع ہوگئی۔۔۔ ہر ولی اور رشی کا اپنا فرقہ، اپنا مسلک بن گیا۔ ان کے مسالک کثرت پسندوں یا مشرکین کے اگر ہوبہو خداؤں کے پرستشی نظام کی طرح نہیں لیکن ان سے مختلف بھی نہیں تھے۔

جس طرح مشتری نامی خدا، سلطنت روم اور اوتسلوپوچٹلی نامی خدا، ازٹیک سلطنت کے محافظ تھے اسی طرح ہر عیسائی بادشاہت کا اپنا سرپرست ولی چلا آتا تھا جو بوقت ضرورت بادشاہت کو مشکلات سے چھٹکارا اور جنگوں میں فتح دلاتا تھا۔ انگلینڈ کو سینٹ جارج کا تحفظ، سکاٹ لینڈ کو سینٹ اینڈریو، ہنگری کو سینٹ سٹیفن جبکہ فرانس پر سینٹ مارٹن کا سایہ قائم تھا۔ شہر اور قصبات، پیشے اور یہاں تک بیماریوں سے شفا کے لیے اپنے اپنے ولی اور درشی مختص تھے۔ مثلاً اطالوی شہر میلان پر سینٹ امبروز جبکہ وینس پر سینٹ مارک کی نظر کرم رہتی تھی۔ سینٹ فلورئین آتش دانوں کی چمنیاں صاف کرنے والوں کا تحفظ جبکہ سینٹ میتھیو پر ٹیکس جمع کرنے والوں کو مصیبت اور تنگدستی کے دوران مدد فراہم کرنے کی ذمہ داری تھی۔ اگر آپ کو مسلسل سر درد کی شکایت ہوتی تو اس مرض سے شفا کے لیے سینٹ آگاتھئیس کے حضور دعا کرنی پڑتی تھی لیکن دانت کے درد کے لیے سینٹ اپولونیا سے بہتر مسیحائی کوئی نہیں کرسکتا تھا۔

عیسائی ولیوں اور درشیوں کی مثال قدیم مشرک خداؤں کی طرح نہیں تھی لیکن اکثر ہی یہ وہی پرانے خداؤں کا بہروپ ہی لگتے تھے۔ مثال کے طور پر عیسائیت سے قبل سیلٹک آئرلینڈ کی برتر دیوی برجیڈ ہوا کرتی تھی۔ جب آئرلینڈ میں عیسائیت عام ہو گئی تو برجیڈ کو بھی بپتسمہ کی رسم پر پورا اتارا گیا۔ بپتسمہ ہو گیا تو دیوی برجیڈ، سینٹ برجیڈ ہو گئی۔ آج بھی کیتھو لک آئرلینڈ میں سینٹ برجیڈ سب سے برتر، معظم اور مقدس ہستی ہے۔

نیکی اور بدی کی جنگ

مشرکانہ عقائد یا کثرت پرستی کے بطن سے صرف توحید پرست مذاہب ہی پیدا نہیں ہوئے بلکہ دو قطبی، دو خدائی یا دوئی نامی تصور بھی پیدا ہوا۔ اس تصور کی بنیاد پر قائم ہونے والے مذاہب کو 'ثنویت' کہا جاتا ہے۔ ثنوی مذاہب کے پیرو کار دو متضاد طاقتوں کے وجود پر یقین رکھتے ہیں۔ یہ نیکی اور بدی کی طاقتیں ہیں۔ توحید پرستی کے برعکس دوئی کے ماننے والوں کا ایقان یہ ہے کہ بدی ایک ایسی خود مختار طاقت ہے جسے کسی نیکو کار خدا نے تخلیق نہیں کیا اور نہ ہی وہ اس کے تابع ہے۔ دوئی کے تصورات کی توجیہ یا تفسیر یہ ہے کہ پوری کائنات دو قوتوں کے بیچ لڑائی کا میدان ہے اور اس دنیا میں وقوع پذیر ہونے والی ہر شے اسی جد وجہد اور مزاحمت کا حصہ ہے۔

دوئی ایک دلچسپ تصور ہے بلکہ یہ دنیا کا ایسا دلکش منظر ہے جس سے نامی گرامی بدی کے مسئلے کا مختصر لیکن انتہائی جامع اور سادہ جواب مل جاتا ہے۔ بدی ایسی شے ہے جو ہمیشہ سے انسانی سوچ اور فکر کا بنیادی جزر ہی ہے۔ 'دنیا میں بدی کیوں ہے؟ یہاں اتنی اذیت اور تکلیف کیوں ہے؟ اچھے اور نیکو کار لوگوں کے ساتھ برا کیوں ہوتا ہے؟' ان سوالات کے جواب دے پانا توحید پرستوں کے لیے خاصا درد سر ہوتا ہے۔ وہ اپنے علیم، مقتدر اعلیٰ، نیکو کار اور کامل خدا کی من مرضی سے اس دنیا پر اس قدر تکلیف، اذیت اور مصیبتوں کی وضاحت پیش کرنے کے لیے ہر دم علمی دلائل کی عقلی ورزش کرنی پڑتی ہے۔ اس ضمن میں ایک نامی گرامی وضاحت یہ پیش کی جاتی ہے کہ یہ رحیم و کریم خدا کی طرف سے انسان کے لیے نیت اور خواہش، انتخاب اور مرضی کا تحفہ ہے۔ اگر بدی نہ ہوتی تو بھلا انسان نیکی اور بدی کے بیچ چناؤ کیسے کرتا؟ اگر انسان چناؤ کرنے کا اہل نہ ہوتا تو ظاہر ہے۔۔۔ انسان کو حاصل آزادی اختیار اور من مرضی سرے سے وجود ہی نہ رکھتی۔ تاہم یہ وجدان اور الہام سے خالی جواب ہے اور پہلی ہی نظر میں کئی نئے سوال جنم لے لیتے ہیں۔ نیت کی آزادی اور من مرضی چلانے کی اہلیت سے انسانوں کو نیکی کی بجائے بدی کے انتخاب کی اجازت مل جاتی ہے۔ انسانوں کی کثیر تعداد بدی کا انتخاب کرتی ہے اور توحید پرستی کی معیاری روایت کے مطابق ان انسانوں کے لیے اس انتخاب کا نتیجہ خدا کی جانب سے جہنم میں ابد تک جلنے کی صورت بر آمد ہو گا۔ اب چونکہ خدا علیم ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ پہلے سے ہی جانتا تھا کہ فلاں فلاں شخص اپنی مرضی اور منشاء کی آزادی کا استعمال کرتے ہوئے بدی کا ہی انتخاب کرے گا تو پھر خدا نے ایسے انسان کو پیدا ہی کیوں کیا؟ ایسے سوالات کے جوابات دینے کے

لیے دینیات کے عالم لاتعداد کتابیں لکھ چکے ہیں۔ ان جوابات سے بعض لوگ قائل ہو جاتے ہیں۔۔۔ بعض دوسرے پھر بھی نہیں مانتے۔ تو یہ بحث چلتی رہتی ہے، مکالمہ جاری رہتا ہے۔ لیکن یہ امر طے ہے کہ توحید پرستوں کے لیے بدی نامی شے کے مسئلے سے نبٹنے میں خاصی مشکل پیش آتی رہتی ہے۔

دوئی یا ثنوی مذہب کے ماننے والوں کے لیے بدی کی وضاحت پیش کرنا نہایت آسان ہے۔ اچھے اور نیکوکار لوگوں کے ساتھ بھی برائی یا بدی اس لیے پیش آتی ہے کیونکہ اس دنیا پر صرف ایک نیکوکار اور اچھے خدائے واحد کی حکومت نہیں ہے۔ اس نیکی کے حامی خدا کے متضاد بدی کی طاقت بھی اس دنیا میں آزادانہ دندناتی پھرتی ہے۔ یہ اصل میں طاقت بد ہے جو برائی کا موجب ہے۔ یہی بدی اس دنیا میں آفتوں، مصیبتوں اور اذیتوں کی ذمہ دار ہے۔

یہاں پہنچ کر پتہ چلتا ہے کہ ثنویت یا دوئی میں بھی مخصوص نوعیت کے نقائص اور عیب ہیں۔ جب دوئی پر یقین رکھنے والے بدی کے مسئلے کی وضاحت پیش کرتے ہیں تو اس سے نظام کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ وہ یوں کہ اگر یہ دنیا ایک، بزرگ و برتر، نیکی کے قائل خدا نے پیدا کی تھی تو اسی لیے اس دنیا میں ایک واضح نظام موجود ہے اور ہر شے یکساں اصولوں اور قوانین کی پابند ہے۔ لیکن اگر نیکی اور بدی کے بیچ اس دنیا پر غلبہ پانے کے لیے لڑائی جاری رہتی ہے تو پھر اس کائناتی جنگ میں آفاقی اصولوں اور قوانین کو لاگو کون کرتا ہے؟ نیکی اور بدی جس نظام میں گتھم گتھا ہیں، وہ نظام کون چلا رہا ہے؟ دو مخالف ریاستیں، طبیعیات کے یکساں اصولوں کی حد میں رہ کر ایک دوسرے سے جنگ لڑتی ہیں۔ پاکستان سے چھوڑا گیا میزائیل سیدھا بھارت میں نشانے پر جا لگے گا کیونکہ ان دونوں ریاستوں کے لیے کشش ثقل کا یکساں اصول ہے۔ اسی طرح جب نیکی اور بدی کے بیچ لڑائی ہوتی ہے تو پھر یہ کون سے مشترک اصولوں اور قوانین کی پابندی کرتے ہیں؟ یہ جن اصولوں اور قوانین کی پابندی کرتے ہیں، وہ کس نے وضع کیے ہیں؟

قصہ مختصر، توحید پرستی سے آفاقی نظام کی وضاحت تو ہوتی ہے لیکن بدی کا معاملہ اسے چکرا کر رکھ دیتا ہے۔ دوسری جانب، ثنویت یا دوئی سے بدی کی وضاحت تو مل جاتی ہے لیکن نظام کے معاملے میں پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس پہیلی کو حل کرنے کے لیے ایک منطقی جواب دیا جاسکتا ہے۔ اس ضمن میں ایک ہی معقول دلیل ہو سکتی ہے اور وہ یہ ہے کہ اس کائنات کو عظیم ترین، مطلق العنان اور بزرگ و برتر خدائے واحد نے پیدا کیا تھا لیکن یہ خدائے بزرگ و برتر۔۔۔ بدی کا قائل ہے۔ یہ عقلی اور دلیل پر مبنی جواب ہے لیکن تاریخ میں اس جواب کو ہضم کرنے اور اس طرح کا عقیدہ پالنے کی ہمت کسی میں نہیں ہوئی۔

دوئی یا ثنویت پر مبنی مذاہب ہزار برس سے زیادہ عرصے تک پنپتے رہے۔ 1500 قبل مسیح سے لے کر 1000 قبل مسیح کے عرصے کے دوران زرتشت نامی ایک مذہبی پیشوا وسط ایشیاء میں گزرا ہے۔ زرتشت کو پیغمبر کا درجہ بھی دیا جاتا ہے۔ اس کے پیش کردہ ثنویت پر مبنی عقائد نسل در نسل منتقل ہوتے رہے اور بالآخر دوئی پر مبنی مذاہب کی بنیاد بنے۔ ان ثنوی مذاہب کو زرتشتیت بھی کہا جاتا

ہے۔ زرتشیت کو پارسی، آتش پرستی اور مجوسیت وغیرہ کے ناموں سے بھی پکارا جاتا ہے۔ آتش پرستوں کے نزدیک ہماری یہ دنیا نیک خدا اہورا مزدا اور بد خدا اہرمن کے بیچ جاری کائناتی لڑائی کا میدان ہے۔ اس لڑائی میں انسانوں سے نیک خدا کا ساتھ دینے کی توقع رکھی جاتی ہے۔ فارسیوں کی ہخامنشی سلطنت (550 قبل مسیح سے 330 قبل مسیح) میں آتش پرستی ایک اہم مذہب ہوا کرتا تھا اور بعد ازاں فارسیوں کی ہی ساسانی سلطنت (224ء سے 651ء) تک یہ سلطنت کا سرکاری مذہب رہا۔ زرتشت کے تصورات اور آتش پرستوں کے مذہب نے مشرق وسطیٰ اور وسطی ایشیاء کے سبھی مذاہب پر انتہائی گہرا اثر چھوڑا۔ انھی تصورات سے کئی دوسرے دوئی پر مبنی مذاہب بھی پیدا ہوئے۔ ان میں سب سے مشہور مذاہب عرفانیت اور مانویت پر مبنی ہیں۔

تیسری اور چوتھی صدی عیسوی میں مانویت پرست عقائد چین سے لے کر شمالی افریقہ تک پھیل چکے تھے۔ یہ وہ دور تھا جب ایسا لگنے لگا تھا کہ مانویت پرستی، عیسائیت کو مات دے کر رومی سلطنت پر غلبہ حاصل کر لے گی۔ لیکن ہوا یہ کہ مشرک روم پر عیسائیت کی فتح ہو گئی اور دوسری جانب آتش پرست فارس کی ساسانی سلطنت پر توحید پرست مسلمانوں نے دھاوا بول دیا۔ یوں دوئی پر مبنی مذاہب، دیکھتے ہی دیکھتے ڈوب کر بیٹھ گئے۔ آج دوئیوں کی بس گنی چنی ہی تعداد باقی ہے جو بھارت اور مشرق وسطیٰ میں پائی جاتی ہے۔ یہ انتہائی محدود تعداد میں پائے جانے والے پارسی ہیں۔

توحید پرستی نے اپنی بھرپور اٹھان کے باوجود دوئی کے تصورات کو صحیح معنوں میں ختم نہیں کیا۔ یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں کی توحید پرستی نے بجائے دوئی عقائد کو کثیر تعداد میں اپنے تصورات کا حصہ بنالیا۔ یہ عقائد نہ صرف توحید پرستی کے بنیادی تصورات میں رچ بس گئے بلکہ یہ تبلیغی تعلیمات اور اعمال میں بھی بھرپور نظر آنے لگے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ آج جن تصورات کو ہم بنیادی 'توحید پرستی' قرار دیتے ہیں، دراصل ان کی اصل اور روح دوئی پر مبنی ہیں۔ آج بے شمار عیسائی، مسلمان اور یہودی بدی کی ایک انتہائی زبردست طاقت پر یقین رکھتے ہیں۔ اس طاقت کو عیسائی شیطان، مسلمان ابلیس اور یہودی ہارا کے نام سے جانتے ہیں۔ شیطان یا ابلیس خود مختار ہے، پوری آزادی کے ساتھ نیکو کار خدا سے لڑتا بھڑتا ہے اور اس کا کام ازل سے لے کر ابد تک انسانوں کو گمراہ کرنا ہے۔ توحید پرستوں کے بنیادی عقائد کے مطابق یہ خدائے واحد، بزرگ و برتر کی اجازت کے بغیر جب تک یہ دنیا باقی ہے، انتقام لے سکتا ہے اور بے پناہ تباہی مچا سکتا ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ توحید پرست اس طرح کے دوئی پر مبنی تصورات پر کیسے یقین کر سکتے ہیں؟ یہاں یاد رہے کہ عہد نامہ قدیم یا الہامی کتاب تورات میں نیک اور بد طاقتوں کی لڑائی پر مبنی دوئی کے یہ تصورات کہیں بھی درج نہیں ہیں۔ منطقی طور پر توحید پرستی میں دوئی کی آمیزش ممکن ہی نہیں ہے۔ وہ یوں کہ آپ یا تو ایک مطلق خدائے واحد پر یقین رکھ سکتے ہیں یا پھر آپ دوئی یعنی نیک اور بد، دو خداؤں پر ایقان قائم کر سکتے ہیں جن میں سے ایک بھی مطلق نہیں ہے۔ لیکن، یہ انسان کی حیران کن اور نہایت عمدہ قابلیت اور فراخی ہے کہ وہ نہایت آسانی سے تضادات میں یقین کر لیتا ہے۔ اس میں حیرانگی کی چنداں کوئی بات نہیں ہے کہ آج لاکھوں، کروڑوں بلکہ اربوں

متقی عیسائی، مسلمان اور یہودی بیک وقت ایک مطلق خدائے واحد پر بھی یقین رکھتے ہیں اور اس کے مقابلے میں آزاد اور خود مختار شیطان کی طاقت کے بھی قائل ہیں۔ اس ضمن میں حتمی دلیل یہ پیش کی جاتی ہے کہ دراصل مطلق اور بزرگ و برتر خدائے واحد نے شیطان کو چھوٹ دے رکھی ہے۔ عیسائیوں، مسلمانوں اور یہودیوں کے بے شمار تعداد یہ بھی مانتی ہے کہ خدائے واحد، جو مطلق اور کامل ہستی ہے۔۔۔ اسے شیطان اور بدی کے خلاف جنگ میں گاہے بگاہے انسانوں کی مدد کی ضرورت بھی پڑتی رہتی ہے۔ اس حوالے سے توحید پرست آئے دن نفسی جدوجہد اور معاشرتی سدھار پر مبنی تحاریک کے علاوہ شدت پسندی پر مبنی جہاد اور صلیبی جدوجہد کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے لوگوں کو عسکریت پر بھی اکساتے رہتے ہیں۔

اسی طرح دوئی پر مبنی ایک دوسرا تصور بھی ہے۔ یہ تصور مانویت اور عرفانیت پرستوں کے یہاں بہت عام ہوا کرتا تھا۔ اس تصور کے مطابق جسم اور روح میں بلا کی تفاوت پائی جاتی ہے۔ یہ نفس اور مادے کا فرق ہے۔ مانویت اور عرفان پرستوں کے یہاں ایقان تھا کہ نیکو کار خدا نے روح کو پیدا کیا جب کہ بد کار خدا نے جسم اور مادے کی تخلیق کی تھی۔ اس عقیدے کے مطابق ہر آدمی ان دونوں خداؤں کی جنگ کا میدان ہے۔ آدمی کا جسم اور روح یکجا ہو کر یہ میدان بن جاتے ہیں۔ توحید پرستوں کے نزدیک، یہ انتہائی احمقانہ اور لغو بات ہے۔ جسم اور روح کے بیچ فرق کو اس تندی سے تفاوت میں ڈھلنے کا مطلب کیا ہے؟ پھر یہ کیا بات ہوئی کہ جسم اور مادہ بدی پر مبنی ہے؟ بہر صورت، یہ تو طے ہے کہ ہر شے کا خالق خدائے بزرگ و برتر، وہ مطلق اور واحد ہستی ہی ہے۔ تو یہ اس لیے بھی بے معنی بات ہے کیونکہ نیکو کار اور بد کار خدا کا تصور ہی فاسق ہے۔ خدا تو ایک ہی ہے۔ لیکن توحید پرست، اس زبردست دلیل کے بعد بھی خود کو دوئی پر مبنی ان دو نوعیتی تصورات سے خود کو الگ نہیں رکھ پاتے، غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ دوئی پر مبنی تصورات بدی کا مسئلہ حل کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ، توحید پرستوں کی یہ مجبوری بالآخر ایک دفعہ پھر عیسائیت اور اسلام کے بنیادی تصورات کی بنیاد بن جاتے ہیں۔۔۔ جنت اور جہنم کا تصور جنم لے لیتا ہے۔ جنت اور جہنم بھی دوئی کا تصور ہے۔ عہد نامہ قدیم یا تورات میں جنت اور جہنم کا کوئی ذکر اور نہ ہی وعدہ ہے۔ تورات میں یہ دعویٰ بھی نہیں ہے کہ لوگوں کی روحیں، جسم کی موت کے بعد بھی زندہ رہتی ہیں۔

حقیقت پسندی کی نظر سے دیکھا جائے تو توحید پرستی کا اصل کمال یہ ہے کہ اس نے تاریخ میں واحدانیت، دوئیت، مشرکیت اور مظاہریت کے سبھی تصورات کو جمع کر کے واحد ساوی، یعنی الہام کی ربانی چھتری تلے کھڑا کر دیا ہے۔ آج ایک اوسط عیسائی واحدانیت پر مبنی موحد خدا پر دل و جان سے یقین رکھتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ دوئیت پر مبنی شیطان، مشرکانہ عقائد پر مبنی ولیوں اور ظاہریت پر مبنی بھوت پریت پر بھی ایقان باندھتا ہے۔ دینیات کے عالم اس طرح متوازی اور بیک وقت کئی مختلف، حتیٰ کہ متضاد تصورات کو تسلیم کرنے اور مختلف طرز اور ماخذ سے شعائر و مراسم کو اپنانے کو اچھی طرح سمجھتے ہیں اور انھوں نے ہی اسے ایک نام بھی دے رکھا ہے۔

علم دینیات کی زبان میں اسے امتزاج ضدین، اتحاد پسندی یا توفیقیت کہا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے، توفیقیت یا امتزاج ضدین۔۔۔ یعنی مذہبی عقائد کے بیچ یہ اتحاد پسندی ہی اس دنیا کا سب سے بڑا اور عظیم ترین مذہب ہے۔

قدرت کا قانون

ابھی تک ہم نے جتنے بھی مذاہب پر بحث کی ہے، ان میں ایک خصوصیت مشترک ہے۔ ان سب مذاہب کی توجہ خداؤں اور دوسری ملکوتی طاقتوں کے تصورات پر مرکوز ہوتی ہے۔ عام لوگوں، بالخصوص مغرب کے باسیوں کے لیے یہ مذہب کی صاف اور واضح صورت ہے کیونکہ وہ آج تک عام طور پر موحد یا مشرک عقائد سے ہی آشنا رہے ہیں۔ تاہم، حقیقت یہ ہے کہ دنیا کی مذہبی تاریخ صرف خداؤں کی تاریخ کے ساتھ جڑی ہوئی نہیں ہے۔ آج سے تین ہزار سال پہلے افریشیائی خطے میں مذاہب کی ایک بالکل الگ قسم کا نہ صرف ظہور ہوا بلکہ وہ انتہائی کامیاب بھی رہے۔ ہندوستان میں جین مذہب اور بدھ مت، چین میں تاؤ مت اور کنفیوشس مت، بحیرہ روم کے آس پاس رواقیت، کلبیان اور اپیکوریسیم وغیرہ چند ایسی مثالیں ہیں جن کی خصوصیت یہ تھی کہ خداؤں کا کوئی تصور نہیں تھا۔

ان عقائد کے تحت وہ ملکوتی نظام جو اس دنیا کو چلا رہا ہے دراصل ربانی منشاء اور خیال نہیں بلکہ قدرتی قوانین کا نتیجہ ہیں۔ قدرتی قوانین پر مبنی مذاہب میں سے بعض خداؤں کے وجود کو بھی بدستور مانتے رہے لیکن ان کے خدا انسانوں اور باقی نباتات اور حیوانات کی ہی طرح قدرت کے قوانین کے پابند تھے۔ ان کے یہاں خداؤں کی طاقت بھی ماحولیاتی نظام میں ہی طاق رکھی گئی تھی۔ جس طرح ہاتھیوں اور خارپشتوں کی اپنی اپنی طاقت ہوتی ہے، ان خداؤں کی بھی اپنی اپنی طاقت تھی اور وہ بھی ان جانوروں کی طرح قدرت کے قوانین کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے۔ ایسے مذاہب میں سب سے بڑی مثال بدھ مت کی ہے۔ بدھ مت قدرت کے قوانین پر مبنی قدیم مذاہب کے ناموں میں اہم رہا ہے اور آج کی دنیا میں پائے جانے والے بڑے مذہبی عقائد میں سے ایک ہے۔

بدھ مت کا مرکزی کردار کوئی خدا نہیں بلکہ ایک انسان، گوتم بدھ ہے۔ گوتم بدھ کا اصل نام سدھارتھ تھا۔ بدھ روایت کے مطابق گوتم سدھارتھ تقریباً 500 قبل مسیح میں ہمالیہ میں ایک چھوٹی سی بادشاہت کا جانشین تھا۔ اس نوعمر شہزادے پر اپنے ارد گرد انسانی تکالیف اور مصیبت دیکھ کر گہرا اثر ہوا۔ اس نے دیکھا کہ مرد، عورتیں بچے اور بوڑھے صرف کبھی کبھار نازل ہونے والی آفتوں سے ہی نہیں بلکہ جنگ، جدل، بیماریوں کے ساتھ ساتھ اندیشوں، مایوسی، محرومی اور عدم اطمینان سے بھی سخت اذیت اور مصیبت کا شکار رہتے تھے۔ یہ تکالیف اور مصیبتیں انسانی کیفیت کا ناگزیر حصہ بن چکی تھیں۔ لوگ دولت اور طاقت کے پیچھے بھاگتے تھے، وہ علم اور جائیداد جمع کرتے تھے، کئی کئی بیٹے اور بیٹیاں پیدا کرتے تھے، گھر اور عالیشان محل بھی تعمیر کرتے تھے۔ لیکن وہ کچھ بھی کر لیتے، بھلے بہت کچھ پا کر کامیاب بھی ہو جاتے تو پھر بھی مطمئن نہیں ہوتے تھے۔ انسانوں کے یہاں آسودگی اور قناعت کا دور دور تک کوئی واسطہ نہیں تھا۔ وہ جو غربت

میں پستے، دولت کے خواب دیکھتے تھے۔ وہ جو لاکھوں کے مالک تھے، کروڑوں کی تمنا رکھتے۔ جن کے پاس کروڑوں تھے، وہ اربوں پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ یہاں تک کہ سب سے دولتمند اور مشہور لوگ بھی مطمئن نہیں تھے۔ فکر اور اندیشے ان کا بھی پیچھا کرتے تھے۔۔۔ یہاں تک کہ ان کو بیماری، بڑھاپا اور موت آلیتی اور یونہی ان کا خاتمہ ہو جاتا تھا۔ آدمی پوری زندگی جو کچھ جمع کرتا رہتا تھا بالآخر دھویں کی طرح اڑ کر بیکار ہو جاتا۔ یہ زندگی، ایک چوہے کی دوڑ جیسی تھی۔ لیکن اس دوڑ سے کیسے بچا جائے؟ یہی اصل سوال تھا۔

انتیس برس کی عمر میں گوتم سدھارتھ نے ایک دن اپنا گھربار، خاندان اور دھن دولت۔۔۔ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر رات کی تاریکی میں چوری چھپے محل کی دیوار پھلانگ کر تن تنہا سفر اختیار کر لیا۔ اب اس کا کوئی گھربار نہیں تھا۔ وہ شمالی ہندوستان میں دور دراز علاقوں تک خانہ بدوشوں کی طرح مارا مارا پھرتا رہا اور انسانی تکلیف اور مصیبت سے چھٹکارے کا طریقہ ڈھونڈتا رہا۔ اس نے آشرموں میں پناہ لی اور گروؤں کے قدموں میں بیٹھ کر تپسیا کی لیکن کوئی شے ایسی نہ تھی جو اس کو مکمل طور پر آزادی اور خلاصی دلا سکتی۔۔۔ عدم اطمینان کسی نہ کسی صورت ہمیشہ باقی رہتی تھی۔ لیکن وہ مایوس نہیں ہوا۔ اس نے طے کر لیا کہ اب وہ اس انسانی مصیبت اور تکالیف کی جڑ تک خود اپنے بل بوتے پر پہنچے گا اور جب تک وہ مکمل آزادی کا کوئی طریقہ نہیں ڈھونڈ لیتا۔۔۔ وہ پیچھے نہیں ہٹے گا۔ چنانچہ، اس نے چھ برس تک انسانی اذیت کی اصل، وجوہات اور علاج کے بارے مسلسل غور و فکر اور مراقبہ کیا۔ اس کڑی محنت، مشقت اور بیش بہا غور و فکر سے اس کو پتہ یہ چلا کہ دراصل انسانی اذیت اور تکالیف کی وجہ بدقسمتی، سماجی بے انصافی یا خداؤں کی ناراضگی یا امتحان نہیں ہوتی بلکہ یہ تو انسان کے اپنے دماغ کی دین ہے۔ انسان کو درپیش اذیت اور مصیبت تو اصل میں خود انسانی دماغ کے مخصوص رویوں سے متعلق ہے۔

گوتم بدھ کا وجدان اور بصیرت بتاتی ہے کہ انسانی ذہن بھلے کچھ بھی محسوس کرتا ہو۔۔۔ اس کا عمومی ردعمل شدید طلب اور خواہش کی صورت پیدا ہوتا ہے۔ خواہش اور طلب کی بھوک انسان کو عدم اطمینانی اور عدم تسکین کی طرف لے جاتی ہے۔ جب انسانی دماغ کسی ناگوار شے کو محسوس کرتا ہے تو اس کے دل میں اس ناگواری سے چھٹکارا پانے کی خواہش جنم لیتی ہے۔ دوسری طرف جب انسانی دماغ کسی بھلی شے کو محسوس کرتا ہے تو اس کے دل میں اس راحت اور لذت کو جاری رکھنے اور اس کو بڑھاوا دینے کی طلب جنم لیتی ہے۔ نتیجتاً، انسانی دماغ ہمیشہ ہی عدم اطمینان اور بے سکونی کا شکار رہتا ہے۔ یہ انتہائی صاف اور واضح مشاہدہ تھا۔ یہ تو طے ہے کہ جب ہم ناگوار چیزیں۔۔۔ جیسے درد اور رنج کو محسوس کرتے ہیں تو جب تک یہ درد اور غم باقی رہتا ہے، ہم بے سکون رہتے ہیں اور اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کی سعی کرتے رہتے ہیں بلکہ اس سے بچنے کی تدابیر بھی سوچتے ہیں۔ لیکن جب ہم خوشگوار احساسات کا سامنا کرتے ہیں تو پھر بھی کبھی مطمئن نہیں ہوتے۔ ہمیں یا تو یہ خوف لاحق ہو جاتا ہے کہ مسرت اور خوش خرمی غائب ہو جائے گی یا پھر ہم اس تگ و دو میں لگ جاتے ہیں کہ یہ سرور اور حظ کی کیفیت ہمیشہ برقرار رہے بلکہ یہ بڑھتی ہی جائے۔ لوگ برسوں تک محبت کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہیں۔۔۔ دن رات اس کے خواب دیکھتے ہیں لیکن جب انھیں محبت مل جاتی ہے تو وہ اس سے کبھی راضی نہیں ہوتے،

انھیں تسلی نہیں ہوتی۔ بعض اس اندیشے میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ ان کا ساتھی انھیں چھوڑ کر چلا جائے گا جبکہ دوسروں کو محسوس ہوتا ہے کہ شاید وہ اس سے کہیں بہتر ساتھی کے حقدار تھے۔۔۔ وہ اگر کچھ انتظار اور کر لیتے تو شاید انھیں اس سے بھی بہتر ساتھ مل جاتا۔ ہم سب ایسے لوگوں کو خوب جانتے ہی ہیں۔۔۔ جو دونوں ہی اپنی محبت سے متعلق ان دونوں کیفیات کے خبط اور اذیت میں مبتلا رہتے ہیں۔

بدھ مت کا پھیلاؤ

عظیم خدا ہم پر بارش برسا سکتے ہیں، سماجی ترتیب ہمیں انصاف اور صحت کی بہتر سہولیات فراہم کر سکتی ہے اور قسمت کھل جائے تو ہم چھپر پھاڑ کر دولت مل سکتی ہے لیکن۔۔۔ ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو ہمارے نفس اور دماغ کے بنیادی سانچے میں ذرہ برابر بھی تبدیلی لا سکے۔ چنانچہ عظیم سے عظیم ترین بادشاہ بھی بالآخر کرب اور تکلیف کی زندگی جینے پر مجبور ہوتے ہیں۔۔۔ وہ ہر دم اندیشے میں مبتلا، دکھ کا شکار۔۔۔ ہمیشہ بہتر سے بہتر آسائش، لذت اور سرور کے پیچھے بھاگتے رہتے ہیں۔

گوتم بدھ نے چوہوں کی دوڑ، اس بدطینت چکر سے چھٹکارے کی راہ بھی ڈھونڈ نکالی۔ وہ یوں کہ جب ہمارا دماغ کوئی خوشگوار یا ناگوار چیز محسوس کرتا ہے تو وہ ان چیزوں کو جیسی یہ ہیں، صرف ویسی محسوس کرے تو اذیت اور تکلیف، کوفت نہیں ہوتی۔ مثال کے طور پر جب آپ غم الم محسوس کرتے ہیں تو اس غم سے چھٹکارے کی خواہش نہ پالیں۔ آپ بدستور رنج اور الم محسوس کرتے رہیں گے لیکن آپ اس کی وجہ سے اذیت میں مبتلا نہیں ہوں گے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ رنج اور الم میں بڑی ثروت ہوتی ہے۔ اسی طرح، خوشگوار کیفیات کو طوالت دینے یا بڑھاوا دینے کی خواہش رکھے بغیر اس کیفیت کو جاری رہنے دیں تو آپ کو ذہنی سکون گنوائے بغیر خوشی ملتی رہے گی۔

لیکن سوال یہ ہے کہ آخر ہم اپنے دماغ کو خواہشات اور طلب پیدا کیے بغیر چیزوں کو قبول کرنے پر کیسے مجبور کریں؟ دکھ کو صرف دکھ، خوشی کو صرف خوشی اور درد کو صرف درد کیسے سمجھا جائے؟ اس مقصد کے لیے گوتم بدھ نے مراقبے کی چند تکنیکیں ایجاد کی تھیں جن کی مشق سے دماغ کو حقیقت اپنے اصل معنوں میں محسوس کرنے میں مدد ملتی ہے اور طلب و خواہشات وغیرہ نہیں پیدا ہوتیں۔ یہ ساری مشقیں دماغ کی توجہ "میں اس وقت کیا محسوس کر سکتا تھا؟' کی بجائے اس سوال کہ، "میں اس وقت کیا محسوس کر رہا ہوں؟' پر مرکوز کرنے کی سعی ہوتی ہیں۔ یہ درست ہے کہ یہ دماغی کیفیت حاصل کرنا مشکل ضرور ہے لیکن ناممکن نہیں ہے۔

گوتم بدھ نے مراقبے کی ان تکنیکوں کو چند اخلاقی اصولوں میں باندھ دیا ہے تاکہ لوگ آسانی سے توجہ مرکوز کر سکیں اور احساس کی اصل میں موجود رہیں اور کبھی خواہشات اور سراب خیال میں مبتلا نہ ہوں۔ گوتم بدھ نے اپنے پیرو کاروں کو قتل، بے روک ٹوک جنسی تعلقات اور چوری چکاری سے منع کیا کیونکہ اس طرح کے افعال خواہشات (طاقت، شہوانیت اور دولت وغیرہ) کی آگ کو بھڑکا دیتے ہیں۔ جب یہ الاؤ بجھ جاتا ہے تو پھر خواہشات کی جگہ کامل اطمینان اور سکون لے لیتا ہے۔ اس کامل اطمینان اور سکون کو 'نروان' کہا جاتا ہے۔ نروان، سنسکرت کا لفظ ہے جس کے اصل معنی بھی 'آگ بجھانا' ہے۔ وہ جنھیں نروان حاصل ہو جائے وہ اذیت اور تکلیف سے مکمل طور پر آزاد ہو جاتے ہیں۔ وہ حقیقت کو مقدور بھر صاف صاف دیکھنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ سراب خیال اور مغالطوں سے چھٹکارا پا لیتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ وہ بدستور ناگواری کی کیفیات جیسے درد، رنج، الم اور غم کا سامنا کرتے ہی ہیں لیکن ان کیفیات کی وجہ سے وہ کبھی بدحالی اور مصیبت کا شکار نہیں ہوتے۔ گوتم بدھ کی تعلیمات کا حاصل یہ ہے کہ 'جو شخص خواہشات اور توقعات نہیں پالتا۔۔ وہ کبھی مصیبت کا شکار نہیں ہوتا'۔

بدھ مت کی روایت کے مطابق گوتم بدھ کو نروان مل گیا تھا۔ وہ مصیبت اور آزاری سے مکمل طور پر آزاد ہو گیا تھا۔ چنانچہ، تب سے گوتم سدھارتھ کا نام گوتم بدھ پڑ گیا۔ بدھا کے معنی گیانی یا دانش مند کے ہیں۔۔۔ یعنی ایسا شخص جسے روشن خیالی مل گئی ہو۔ بدھا نے نروان ملنے کے بعد باقی زندگی اپنی دریافتیں اور تعلیمات دوسرے لوگوں کو سکھاتے گزار دی تاکہ وہ بھی اس مصیبت اور آزار سے چھٹکارا حاصل کر سکیں۔ گوتم بدھ نے اپنی ساری تعلیمات کو ایک بنیادی اصول میں مجتمع کر کے حوالے کیں: 'انسان کو درپیش آزار یا مصیبت خواہشات کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اس آزار اور مصیبت آزادی حاصل کرنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے کہ طلب اور خواہشات سے آزادی حاصل کی جائے۔ طلب اور خواہشات سے آزادی حاصل کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ اپنے دماغ کو حقیقت سے روشناس کرایا جیسے ہے ویسے ہی سامنا کرنے کا عادی بنالیا جائے۔'

اس اصول کو دھرم کہا جاتا ہے اور بدھ مت کے پیرو کاروں کے لیے ایک آفاقی قانون فطرت ہے۔ ان کے لیے 'آزار، خواہشات کی پیداوار ہے' کا قانون وہی حیثیت رکھتا ہے جو جدید طبیعیات میں کشش ثقل کو حاصل ہے۔ یعنی یہ بدھ مت میں اٹل قانون ہے۔

بدھ مت کے پیرو کار اس قانون میں پورے دل و جان سے یقین رکھتے ہیں اور تمام تر اعمال اسی قانون کی ٹیک سے چلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے لیے خداؤں میں یقین ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔ توحید پرستوں کے یہاں پہلا اصول ہی یہ ہے کہ 'خدا وجود رکھتا ہے۔۔۔ وہ مجھ سے کیا چاہتا ہے؟' بدھ مت میں پہلا اصول یہ ہے کہ، 'آزار اور مصیبت وجود رکھتی ہے۔ میں اس سے کیسے بچ سکتا ہوں؟'۔

تاہم، بدھ مت خداؤں کے وجود کو رد نہیں کرتا۔ ان کے بارے یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ طاقتور ہستیاں ہیں جو بارشیں برسا سکتی ہیں اور فتوحات عطا کر سکتی ہیں لیکن ان برتر ہستیوں کا اس قانون پر کوئی اثر و رسوخ نہیں ہے جس کے تحت خواہشات اور طلب سے مصیبت اور آزار جنم لیتا ہے۔ ان کے نزدیک اگر ایک آدمی کا دماغ ہر طرح کی خواہشات سے آزاد ہو جائے تو خدا بھی اسے دکھ اور مصیبت میں مبتلا نہیں کر سکتا۔ اسی طرح اگر کسی شخص کے دماغ میں خواہش اور طلب جگہ بنا لے تو پھر کائنات کا کوئی خدا بھی اسے دکھ اور آزار سے نہیں بچا سکتا۔

لیکن توحید پرست مذاہب کی طرح قدرتی قوانین پر مبنی مذاہب، جیسے بدھ مت بھی خود کو خداؤں کی پوجا سے باز نہیں رکھ پائے۔ بدھ مت کی تعلیمات تو یہ ہیں کہ لوگوں کی زندگی کا نصب العین یہی ہو کہ وہ سیاسی طاقت اور معاشی خوشحالی کی بجائے ہر طرح کے دکھ اور آزار سے آزادی حاصل کر لیں۔ تاہم، ننانوے فیصد بدھ مت کے پیرو کار کبھی نروان حاصل نہیں کر پاتے۔ اگرچہ بھلے وہ اگلی کسی زندگی میں ایسا کر پانے کی امید رکھتے ہوں گے لیکن اس زندگی میں وہ ہمیشہ ہی معمولی کامیابیوں کے حصول کے پیچھے بھاگتے رہتے ہیں۔ ان معمولی کامیابیوں کے لیے انھیں بہر حال خداؤں کی پرستش کی ضرورت پڑتی ہی رہتی ہے۔ اسی لیے بدھ مت کے پیرو کار بھارت میں ہندو، تبت میں بون اور جاپان میں شنتو خداؤں کو پوجتے ہیں۔

مزید بر آں، جیسے جیسے وقت گزرتا گیا۔۔۔ بدھ مت میں بھی فرقے پیدا ہوتے رہے۔ ان فرقوں نے بدھ مت میں بھی دو شاخیں نکال لیں۔ ان میں ایک تو کامل بدھ جبکہ دوسرے بودھی ستوا ہوتے ہیں۔ بدھ تو وہ ہیں جنھوں نے نروان پا لیا تھا لیکن بودھی ستوا وہ ہوتے ہیں جو نروان حاصل کرنے کے قریب ہوتے ہیں لیکن وہ بدھ کا رتبہ حاصل کرنے کی بجائے دوسرے انسانوں کو دکھ اور آزار کے چکر سے نکالنے کے لیے خدمت کو ترجیح دیتے ہیں۔ یعنی، یہ انسانی (زندہ بودھی ستوا) اور غیر انسانی (گیانی بدھ سادیاں) دونوں ہی طرح کی ہستیاں ہوتیں ہیں۔ بدھ مت کے پیرو کار خداؤں کی بجائے ان گیانی بدھوں اور بودھی ستواؤں کی پوجا شروع کر دیتے ہیں۔ وہ نہ صرف نروان پانے کے لیے ان دو طرح کی ہستیوں سے مدد مانگتے ہیں بلکہ اپنے معمولی روزمرہ کے مسائل سے نبٹنے کے لیے بھی انھی کو آواز دیتے ہیں۔ اسی لیے آج مشرقی ایشیاء میں ہر جگہ پر بدھ اور بودھی ستوا پائے جاتے ہیں۔ یہ بدھ اور بودھی ستوا نروان ہی نہیں بلکہ بارشیں برسانے، وبائیں روکنے اور خونی جنگیں جیتنے میں بھی بدھ مت کے پیرو کاروں کی مدد کرتے ہیں۔ جبکہ بدھ مت کے پیرو کار

دعاؤں، رنگ برنگے پھولوں، سلگتی اگربتیوں اور چاولوں اور مٹھائی کی نیاز چڑھا کر ان بدھوں اور بودھی ستواؤں کو خوش کرتے رہتے ہیں۔

آدمی کی پرستش

پچھلے تین سو برسوں پر محیط دور کو عام طور پر سیکولرزم یا لادینیت کا دور کہا جاتا ہے۔ لادینیت کے اس دور میں بڑے پیمانے پر مذاہب اہمیت کھوتے چلے گئے ہیں۔ خدا پرست مذاہب کے حوالے سے تو یہ بڑی حد تک درست بات ہے۔ لیکن اگر ہم قانون قدرت پر مبنی مذاہب کی بات کریں تو جدیدیت مذہبی طور پر خاصی گرم جوش، بے نظیر مذہبی تبلیغ کی کوششوں پر مائل اور مذاہب کی بنیاد پر تاریخی اور خونی جنگوں کی صورت ابھر کر سامنے آئی ہے۔ جدید دور میں کئی نئے قانون قدرت پر مبنی مذاہب سامنے آئے ہیں۔ ان میں آزاد خیالی (لبرلزم)، اشتراکیت (کمیونزم)، سرمایہ داری (کیپیٹلزم)، قوم پرستی (نیشنلزم) اور نازیت (نازیزم) وغیرہ بہت مقبول ہوئے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ عقائد خود کو مذاہب کہلوانے سے کتراتے ہیں اور اپنے آپ کو 'نظریات' کہلواتے ہیں۔ یہ صرف لفظوں کی شعبدہ بازی ہے، ورنہ معنوی لحاظ سے یہ مذہب ہی ہیں۔ اگر ایک مذہب سے مراد انسانی قواعد اور اقدار کا ایسا سلسلہ ہے جو کسی ملکوتی نظام پر مبنی ہو تو پھر سوویت اشتراکیت، اسلام کی ہی طرح کا ایک مذہب تھا۔

یقیناً اسلام۔۔۔ اشتراکیت سے بالکل الگ سلسلہ ہے۔ اسلام میں وہ ملکوتی نظام جو دنیا پر حکمرانی کرتا ہے، وہ ایک مطلق خدائے واحد کا فرمان ہے جبکہ سوویت اشتراکیت سرے سے کسی خدا پر یقین ہی نہیں کرتی۔ لیکن یہ بھی تو دیکھیے کہ بدھ مت بھی خداؤں کو معمولی اہمیت دیتا ہے لیکن وہ اس کے باوجود ایک مذہب کے طور پر جانا جاتا ہے؟ بدھ مت کے پیرو کاروں کی طرح، اشتراکیت پر یقین کرنے والے بھی ایک ایسے ملکوتی نظام پر ایقان قائم کرتے ہیں جس کی بنیاد فطری اور غیر متغیر قوانین پر رکھی گئی تھی اور یہی قوانین انسانی افعال کے لیے مشعل راہ ہیں۔ جیسے بدھ مت کے پیرو کاروں کو یہ یقین ہے کہ ان کے مذہب کی بنیاد بننے والے فطرت کے قوانین گوتم سدھارتھ نے دریافت کیے تھے، اسی طرح اشتراکیت پر یقین رکھنے والے یہ مانتے ہیں کہ ان کے 'نظریات' کی بنیاد بننے والے فطری قوانین کارل مارکس، فریڈرک اینگلز اور ولادمیر لینن نے دریافت کیے تھے۔ یہ تشابہت یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ دوسرے مذاہب کی طرح اشتراکیت کی بھی اپنی مقدس دستاویز اور پیغمبرانہ کتابیں ہیں۔ مثال کے طور پر کارل مارکس کی 'داس کیپیٹل' اشتراکیت کی سب سے مشہور کتاب ہے۔ داس کیپیٹل میں مارکس نے پہلے ہی پیشن گوئی کر دی تھی کہ محنت کش طبقے کی عوامی فتح کے ساتھ ہی تاریخ کا جلد خاتمہ ہو جائے گا۔ اشتراکیت کے اپنے تہوار اور تعطیلات ہوتی ہیں جیسے یکم مئی کا 'یوم مزدور' اور 'انقلاب اکتوبر' کی سالانہ برسی وغیرہ۔۔۔ اشتراکیت کے عالم بھی ہوتے تھے جو جدلیاتی مادہ پرستی کے فلسفے پیش کرتے تھے اور سوویت افواج میں 'پادری' بھی ہوا

کرتے تھے جنھیں ناظر کہا جاتا تھا۔ یہ 'پادری' نما 'ناظر' سوویت سپاہیوں اور افسران کی پارسائی اور نیکوکاری پر نظر رکھتے تھے۔ اشتراکیت میں شہید بھی ہوتے تھے، ان کی مقدس جنگیں بھی تھیں اور ان کے یہاں ٹراٹسکی یا عالمی عوامی انقلاب کا تصور پالنے والے بدعتی بھی ہوتے تھے۔ سوویت اشتراکیت ہر طرح سے ایک کٹر اور تبلیغ پسند مذہب ہوا کرتا تھا۔ ایک کٹر اشتراکیت پسند یا کمیونسٹ کبھی بھی عیسائی یا بدھ مت کا پیروکار نہیں ہو سکتا تھا۔ یہی نہیں اس سے یہ بھی توقع کی جاتی تھی کہ وہ مارکس اور لینن کے تصورات کو گھول کر پی لے، ان کا پرچار کرے اور اگر اس جدوجہد میں اسے جان کی بازی لگانی پڑے تو وہ کسی بھی طرح سے باز نہ آئے۔
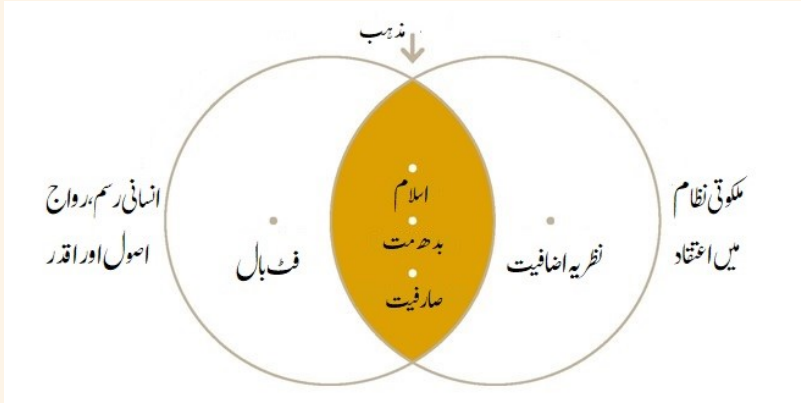
مذہب انسانی رسم، رواج، اصولوں اور اقدار کا ایسا مجموعہ ہوتا ہے جو ایک ملکوتی نظام میں اعتقاد پر قائم کیا جاتا ہے۔ نظریہ اضافیت ایک مذہب نہیں ہے کیونکہ (ابھی تک) اس نظریے کی بنیاد پر کوئی انسانی رسم، رواج، اصول یا قدر کھڑی نہیں کی گئی۔ دوسری جانب فٹ بال ایک مذہب نہیں ہے کیونکہ کوئی شخص یہ یقین نہیں رکھتا کہ اس کھیل میں کسی مافوق العقل ذات یا نظام کا کوئی ہاتھ ہے۔ اسلام، بدھ مت اور صارفیت وغیرہ سب مذاہب ہیں کیونکہ یہ سبھی انسانی رسوم، رواجوں، اصولوں اور اقدار کا ایسا مجموعہ نظام ہیں جن کی بنیاد ملکوتی یا مافوق العقل نظریات کی بنیاد پر رکھی ہے۔ نوٹ: یہاں ملکوتی سے مراد مافوق العقل ہے اور اس سے مراد مافوق الفطرت ہرگز نہیں ہے۔ مثال کے طور پر بدھ مت کے فطری قوانین اور مارکس کے تاریخی قوانین دونوں ہی ملکوتی (مافوق العقل) ضرور ہیں لیکن یہ ملکوتی (مافوق الفطرت) نہیں ہیں۔

غالباً بعض قارئین کے لیے اس طرح کا استدلال اور دلالت سخت تکلیف اور پریشانی کا باعث ہو۔ اگر آپ بہتر سمجھیں تو بے شک اشتراکیت کو مذہب کی بجائے نظریہ قرار دیتے رہیں۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہم عقائد کو خدائی مذاہب اور ملحد نظریات میں منقسم کر سکتے ہیں۔ لیکن، پھر مطابقت قائم رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم بعض مذاہب جیسے بدھ مت، تاؤمت اور رواقیت کو بھی نظریات کہا کریں۔ اس کی ضد میں ہمیں یہ بھی ماننا ہو گا خدائی تصور آج پائے جانے والے کئی جدید مقبول نظریات میں بھی عام پایا جاتا ہے۔ ان میں سے بعض (مثال کے طور پر آزاد خیالی یا لبرلزم) ایسے ہیں جو خدائی تصور کے بغیر کوئی معنی نہیں رکھتے۔

یہاں سارے جدید عقائد کی تاریخ کا جائزہ لینا تو بالخصوص اس لیے ممکن نہیں ہو گا کیونکہ ان کے بیچ واضح حدبندی نہیں ہوتی۔ ان کی مثال بھی 'امتزاج ضدین' کی ہی ہے۔ ان کے بیچ امتزاج اتنا ہی ہے جیسے مثال کے طور پر توحید پرستی اور بدھ مت میں پایا جا سکتا ہے۔ جیسے

بدھ مت کا کوئی پیرو کار ہندو خداوں کی پوجا کرتا ہے، یا ایک توحید پرست شیطان کے وجود کا بھی قائل ہوتا ہے۔۔۔ اسی طرح آج ایک اوسط امریکی شہری بھی بیک وقت قوم پرست (امریکی قوم کے تصور اور تاریخ میں کردار پر یقین)، سرمایہ دارانہ تصور پرست (آزاد مسابقت اور ذاتی مفاد کی بنیاد پر خوشحال معاشرے کے تصور پر یقین) اور آزاد خیال انسان پرست (خالق کی جانب سے ہر انسان کو عطا کردہ بنیادی انسانی حقوق اور شخصی آزادی کے تصور پر یقین) ہو سکتا ہے۔ اس ضمن میں نوٹ کر لیں کہ ہم اگلے ابواب میں 'قوم پرستی' اور 'سرمایہ داری نظام' کے تصورات کو حسب ترتیب سولہویں اور اٹھارہویں باب میں تفصیل سے زیر بحث لائیں گے۔ سرمایہ داری نظام تو جدید مذاہب میں جیتی جاگتی مثال ہے جس کے اپنے بنیادی عقائد اور رسومات بھی ہیں۔ فی الوقت، ہم اس باب میں انسان پرست مذاہب پر نظر ڈالتے ہیں۔

خدا پرست مذاہب میں خداوں کی پرستش پر زور دیا جاتا ہے۔ انسان پرست مذاہب میں انسانیت کی پوجا کی جاتی ہے۔۔۔ بلکہ کہیے، خرد مند آدمی کی آدمیت کا منتر جاپا جاتا ہے۔ مذہب انسانیت کے عقیدے کی بنیاد میں یہ ایقان جڑا ہوتا ہے کہ ہر آدمی ایک بے مثال اور مقدس فطرت کا حامل ہوتا ہے۔ یہ ایسی یکتا فطرت ہے جو باقی تمام جانوروں کی فطرت سے بنیادی طور پر بالکل مختلف ہوتی ہے۔ انسان پرست یہ مانتے ہیں کہ آدمی کی یہ انوکھی اور مقدس فطرت اس دنیا کی سب سے اہم شے ہے اور اسی کی بنیاد پر کائنات میں وقوع پذیر ہونے والی ہر شے کے معنی طے ہوتے ہیں۔ چنانچہ سب سے اعلیٰ خوبی اور فضیلت یہی ہے کہ آدمی کا نفع، اس کی خیر ہو۔ یہ دنیا اور ما فیہا۔۔۔ دوسرے سبھی وجود صرف اور صرف آدمی کی بھلائی اور نفع کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔

سبھی انسان پرست، انسانیت کی پوجا کرتے ہیں لیکن وہ اس کی تعریف پر متفق نہیں ہیں۔ آج انسان پرستی تین انتہائی مختلف اور ٹکر کے فرقوں میں بٹی ہوئی ہے۔ ان کے بیچ اس تفاوت اور رقابت کی اصل وجہ انسانیت کی تعریف ہے۔ ان کی مثال ان عیسائی فرقوں کی طرح ہی ہے جو کبھی خدا اور خدائی محبت کی اصل تعریف پر ایک دوسرے کے ساتھ گتھم گتھا ہا کرتے تھے۔ آج انسان پرستی کا سب سے اہم فرقہ 'آزاد خیال انسان پرستوں' کا ہے۔ یہ فرقہ افراد کی آزادی اور انفرادیت کا پرچار کرتا ہے، اسی لیے سب سے مقدس سمجھا جاتا ہے۔ آزاد خیالوں کے مطابق انسانیت کی تقدیس، انفرادی سطح پر ہر آدمی کے وجود میں پائی جاتی ہے۔ انفرادی سطح پر انسانوں کا باطنی قلب ہی اس دنیا کو معنی بخشتا ہے اور یہی اخلاقی اور سیاسی طاقت کا ماخذ بھی ہے۔ اگر ہمارا سامنا کسی اخلاقی یا سیاسی مشکل اور ورطہ سے ہو تو ہمیں اپنے اندر جھانک کر، اپنے قلب کی آواز سننی چاہیے۔ یہ انسانیت کی آواز ہوتی ہے۔ آزاد خیال انسان پرستی کے اہم ترین مقدس احکام کا مقصد اس آزاد منش انسانیت کی آواز، خود مختاری اور استحقاق کو مداخلت اور ضرر سے محفوظ رکھنا ہے۔ ان 'مقدس اور آفاقی احکامات' کو ہم بنیادی انسانی حقوق کے نام سے جانتے ہیں۔

مثال کے طور پر، اسی لیے آزاد خیال لبرل تشدد اور سزائے موت پر سخت نالاں رہتے ہیں۔ جدید یورپ کے اوائل دور میں قاتلوں کے بارے یہ خیال ہوا کرتا تھا کہ وہ 'کائنات کے آفاقی نظام' کی خلاف ورزی اور عدم استحکام کے مرتکب ہوتے ہیں۔ کائنات میں توازن قائم کرنے کے لیے لازم ہے کہ مجرم کو کھلم کھلا اور عوامی انداز میں تشدد کا نشانہ بنا کر عوامی چوک میں پھانسی دے دی جائے تا کہ ہر آدمی یہ منظر دیکھے اور سمجھے کہ کائنات کا نظام دوبارہ سے بحال کر دیا گیا ہے۔ شیکسپئیر اور مولیر کے زمانے میں لندن اور پیرس کے باسیوں کے لیے چوکوں اور عوامی مرکزوں میں ہولناک پھانسیوں کا تماشا دیکھنا پندیدہ مشغلہ رہا کرتا تھا۔ آج یورپ میں قتل کو انسانیت کی تقدیس پر ضرب اور خلاف ورزی سمجھا جاتا ہے۔ اس انسانی تقدیس کے نظام کو بحال کرنے کے لیے یورپ میں مجرموں کو تشدد کا نشانہ نہیں بنایا جاتا اور نہ ہی انھیں پھانسی وغیرہ دی جاتی ہے۔ بجائے، قاتلوں کو سزا دینے کے لیے سب سے 'انسان صفت اور نرم خو' طریقہ ڈھونڈا جاتا ہے تا کہ انسانی تقدس کا تحفظ اور نظام کی تحریم بھی باقی رہے۔ قاتلوں کی انسانی فطرت کو عزت اور تکریم بخش کر ہر شخص پر باور کرایا جاتا ہے کہ انسانی تقدیس اور حرمت بہر حال افضل ہے اور نظام بھی بحال ہے۔ قاتلوں کو دفاع کا موقع دے کر ہم یہ ثابت کرتے ہیں کہ اس قاتل نے جو غلط کیا، اس قاتل انسان کی غلطی کو ہم نہیں دہرائیں گے۔ قاتل کو تو ہر صورت سزا ملے گی لیکن یہ قاتل بحیثیت انسان بدستور مقدس اور حرمت کے لائق ہے۔

اب اگرچہ انسان پرستی پر مبنی یہ آزاد خیال تصورات انسانوں کے تقدس کا بھرپور پرچار کرتے ہیں لیکن وہ خدا کے وجود سے بھی انکار نہیں کرتے۔۔۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ تصورات توحید پرستی کے عقائد پر ہی مبنی ہیں۔ آج آزاد خیالی پر مبنی ہر فرد کی خود مختار اور مقدس فطرت کے تصورات روایتی طور پر آزاد، خود مختار اور لازوال انسانی روح کے عیسائی عقائد کا ہی ترکہ ہیں۔ اب تادوام اور لازوال انسانی روح اور اس مقدس روح کے مقدس خالق کے بندوبست کے سوا۔۔۔ آپ خود سوچیے، آزاد خیال اور لبرل آدمی کی نوع انسانی بارے یہ سارے تصورات کس بنیاد پر کھڑے کریں گے؟ وہ کیسے سمجھائیں گے کہ خردمند آدمی نامی نوع میں تقدس اور تکریم لائق ایسی کیا خاص بات ہے؟

انسان پرستی کا دوسرا اہم فرقہ اشتراکی تصورات (سوشلسٹ) پر مبنی ہے۔ انھیں اشتراکی انسان پرست بھی کہا جاتا ہے۔ اشتراکی یہ مانتے ہیں کہ 'انسانیت' انفرادی یا شخصی نہیں بلکہ ایک اجتماعی معاملہ ہے۔ یہ ہر فرد کی قلبی آواز اور شخصی آزادی کو نہیں بلکہ انسانوں (یعنی خردمند آدمی کی نوع) کی اجتماعی تقدیس کو بالاتر سمجھتے ہیں۔ جہاں لبرل انسان پرستی ہر فرد کی شخصی آزادی پر زور دیتی ہے، وہیں سوشلسٹ انسان پرستی انسانوں (یعنی خردمند آدمی کی نوع) کے بیچ برابری کا پرچار کرتی ہے۔ اشتراکی انسانیت پر یقین رکھنے والوں کے نزدیک عدم مساوات اور تفریق انسانی تقدیس کی سب سے بری شکل ہے بلکہ یہ کفر کا ارتکاب ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسانوں کے بیچ مساوات اور برابری کی سماجی خصوصیات، انسانوں کی آفاقی ماہیت اور روح سے بھی برتر ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر جب کسی امیر کو غریب پر

فوقیت ملتی ہے تو اس تفریق اور عدم مساوات کا مطلب یہ ہے کہ ہم انسانوں کی آفاقی ماہیت اور روحانی تقدس سے زیادہ دولت اور امارت کو اہمیت دیتے ہیں۔ انسانی ماہیت اور جوہر تو سب کا برابر ہوتا ہے لیکن اس عدم مساوات کی بدولت، ہم اس بنیادی تصور کی خلاف ورزی کرتے ہیں، گویا کفر کے مرتکب ہوتے ہیں۔

لبرل یا آزاد خیال انسان پرستی کی طرح سوشلسٹ یا اشترا کی انسان پرستی کی بنیاد بھی توحید پرست تصورات پر رکھی گئی ہے۔ انسانوں کے بیچ مساوات اور برابری کا تصور توحید پرستی کی اس ایقان کی توثیق ہے جس کے تحت خدا کی نظر میں سب انسان برابر ہیں۔ انسان پرستی کا صرف ایک ہی فرقہ ایسا ہے جو روایتی توحید پرستانہ تصورات کی بنیاد پر کھڑا نہیں کیا گیا۔ اس فرقے کو ارتقائی انسان پرستی کا نام دیا جاتا ہے۔

ارتقائی انسان پرستی کے سب سے بڑے نمائندہ اور حامی نازی ہوتے ہیں۔ نازیوں اور دوسرے انسان پرست فرقوں کے بیچ سب سے بڑا اختلاف ہی 'انسانیت' کی تعریف پر رہا ہے۔ نازیوں کے تصورات پر ارتقائی نظریات کا بے پناہ اثر و رسوخ پایا جاتا ہے۔ دوسرے انسانیت پرستوں کے مقابلے میں نازیوں کا ایقان یہ ہے کہ انسانیت کوئی آفاقی یا لازوال تصور نہیں ہے بلکہ انسان ایک قابل تغیر اور ناپائدار نوع ہے جو ارتقاء کے ہاتھوں بن کر غالب اور بگڑ کر ختم بھی ہو سکتی ہے۔ آدمی، ارتقاء کے نتیجے میں فوق البشر یعنی انسانیت سے اوپر بھی اٹھ سکتا ہے اور انحطاط اور اصلیت کھو کر نیم بشر بھی ہو جاتا ہے۔

نازیوں کا کی سب سے بڑی چاہ یہی تھی کہ وہ نوع انسانی کو انحطاط سے محفوظ کریں اور اس کی بتدریج ترقی پسند ارتقاء کو بڑھاوا دیں۔ یہی وجہ تھی کہ نازیوں کے نزدیک آریائی نسل۔۔۔ باقی انسانی نسلوں اور گروہوں سے برتر اور انسانیت کی سب سے بہترین شکل تھی۔ اس انسانی نسل کو ہر صورت تحفظ اور فروغ فراہم کرتے ہوئے دوسری کمتر انسانی نسلوں جیسے یہودیوں، رومیوں، ہم جنس پرستوں اور دماغی طور پر معذوروں وغیرہ کو قرنطینہ میں ڈالنا ضروری۔۔۔ بلکہ جڑ سے کاٹ کر نیست و نابود کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں تھا۔ نازیوں نے اس تصور کی وضاحت کچھ یوں پیش کی کہ تاریخ گواہ ہے کہ بنی نوع انسان میں خرد آدمی بھی ارتقاء کے نتیجے میں 'برتر' نوع یا جنس بن کر ابھرا تھا اور باقی 'کمتر' انواع اور اجناس جیسے نینڈرتھل وغیرہ معدوم ہو گئی تھیں۔ پہلے پہل انسانی انواع بھی ایک دوسرے سے مختلف نہیں تھیں لیکن وقت کے ساتھ ہر نسل اپنی مرضی اور حالات و واقعات کی بنیاد پر مختلف ارتقائی راستوں پر چل پڑیں۔ نازیوں کے مطابق یہی ارتقائی عمل آدمی کی نسلوں میں بھی دوبارہ، اسی طرح وقوع پذیر ہوا ہے۔ ان کے مطابق اب آدمی کی نسلیں کئی کئی ہیں اور ایک دوسرے سے انتہائی مختلف ہیں اور ہر نسل کی اپنی امتیازی خصوصیات ہیں۔ ان میں سے ایک نسل۔۔۔ آریائی نسل بہر حال سب سے برتر اور عمدہ خصوصیات جیسے عقلیت، حسن، راست بازی اور جانفشانی وغیرہ کی حامل ہے۔ نازی یہ سمجھتے تھے کہ آریائی نسل بلا شک و شبہ آدمی کی حیثیت سے اٹھ کر ملکوتی شکل یعنی، سپر ہیومن بننے کے قابل تھی۔ دوسری نسلیں جیسے یہودی اور سیاہ فام

وغیرہ۔۔۔ آج کے جدید دور کے نینڈرتھل اور کھڑا آدمی تھے۔ وہ کمتر خصوصیات کی حامل نسلیں ہیں۔ اگر انھیں افزایش نسل کی اجازت دی جاتی رہی۔۔۔ بالخصوص آریائی نسل کے ساتھ شادی اور ازدواجی جیسے تعلق کی اجازت دی گئی تو وہ پوری انسانی آبادی میں کھوٹ ڈال دیں گے اور یوں بالآخر خرد آدمی کی یکتا اور خوب نوع بھی معدومیت کا شکار ہو جائے گی۔

تب سے لے کر آج تک، حیاتیات کے ماہرین نازیوں کی اس نسلی نظریے کے پول کھولنے میں مصروف رہے ہیں۔ 1945ء کے بعد ہونے والی جینیاتی تحقیق نے تو بالخصوص ثابت کیا ہے کہ مختلف انسانی نسلوں کے بیچ پایا جانے والا موروثی فرق نہایت معمولی ہے اور یہ ہرگز بھی نازیوں کے ارتقائی مفروضے پر پورا نہیں اترتا۔ لیکن، یہ دریافتیں قدرے نئی ہیں۔ اس حوالے سے 1933ء میں نہ صرف دستیاب سائنسی علم اور تحقیق محدود تھی بلکہ اس کے ساتھ ساتھ نازیوں کا ڈنکا بھی بج رہا تھا۔ اس سے انکار، گویا موت کو دعوت ہوا کرتی تھی۔ مختلف انسانی نسلوں کا وجود، سفید فام نسل کی برتری اور اس 'اعلیٰ و برتر' نسل کے تحفظ اور آبیاری پر مبنی یہ تصورات اصل میں مغربی اشرافیہ کے یہاں بہت عام پائے جاتے تھے۔ مغربی دنیا کی نامی گرامی یونیورسٹیوں اور تحقیقی اداروں میں بڑے بڑے محققین نے اس زمانے میں رائج راسخ العقیدہ سائنسی طریقوں کی بنیاد پر ایسی ایسی تحقیق شایع کی جس کے تحت ثابت ہوتا تھا کہ سفید فام نسل دوسری نسلوں جیسی افریقیوں یا ہندوستانیوں کی نسبت زیادہ ذہین، اخلاقی اور ہنرمند تھے۔ واشنگٹن، لندن اور کینبرا وغیرہ میں سیاستدانوں نے گویا سفید فام نسل کے تحفظ اور کھوٹ سے بچاو کو اپنا نصب العین بنا لیا بلکہ اسے اپنی اولین ذمہ داری سمجھ لیا۔ مثال کے طور پر اس زمانے میں غیر آریائی نسلوں جیسے چینیوں اور یہاں تک کہ اطالویوں کی بھی 'آریائی' ممالک جیسے امریکہ اور آسٹریلیا وغیرہ میں داخلے اور مستقل سکونت پر پابندیاں عائد کر دی گئی تھیں۔

<table>
<tr><th colspan="3">انسان دوست مذاہب—وہ مذاہب جو انسانیت پر یقین رکھتے ہیں</th></tr>
<tr><td>لبرل یا آزاد خیال مذہب انسانیت</td><td>سوشلسٹ یا اشتراکی مذہب انسانیت</td><td>ارتقائی مذہب انسانیت</td></tr>
<tr><td colspan="3">بنی نوع انسان میں خردمند آدمی کی یکتا اور مقدس فطرت ہے جو باقی انواع اور دوسرے جانداروں سے مختلف ہے۔ اس دنیا کی سب سے اعلیٰ اور برتر صفت انسانیت کی صفت اور خدمت ہے</td></tr>
<tr><td>انسانیت ایک انفرادیت پسندانہ صفت ہے جو بنی نوع انسان میں ہر آدمی اور فرد میں یکتا پائی جاتی ہے۔</td><td>انسانیت ایک اجتماعی صفت ہے جو بنی نوع انسان میں خردمند آدمی کی مجموعی نوع میں پائی جاتی ہے</td><td>انسانیت سے مراد بنی نوع انسان میں ارتقائی تغیر سے متعلق ہے۔ انسان انحطاط کا شکار ہو کر انسان کے درجے سے گر سکتا ہے یا پھر</td></tr>
</table>

		ارتقاء حاصل کر کے انسانی درجے سے اوپر بھی اٹھ سکتا ہے
سب سے اہم اور مقدس فرمان یہ ہے کہ ہر آدمی اور فرد کی شخصی آزادی اور باطنی قلب کا تحفظ کیا جائے	سب سے اہم اور مقدس فرمان یہ ہے کہ خردمند آدمی کی نوع انسانی میں برابری اور مساوات کا تحفظ کیا جائے	سب سے اہم اور مقدس فرمان یہ ہے کہ بنی نوع انسان کو انحطاط کا شکار ہو کر انسانی درجے سے گرنے سے بچایا جائے اور برتر انسانی نسلوں کو ارتقاء میں مدد فراہم کر کے برتر ملکوتی انسانوں میں ڈھالا جا سکتا ہے

اب دنیا میں یہ صورتحال سائنسی تحقیق کی بنیاد پر پیدا ہوئی اور نہ ہی اس کے نتیجے میں بدلی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تبدیلی اور حالات و واقعات کے بدلاو میں سماجی اور سیاسی عوامل کہیں بڑھ کر بلکہ کلیدی کردار ادا کرتے ہیں۔ اس کو یوں سمجھیے کہ ہٹلر نے صرف اپنی ہی نہیں بلکہ عمومی طور پر نسل پرستی کی بھی قبر کھودلی تھی۔ جب اس نے دوسری جنگ عظیم شروع کی تو اس نے خود اپنی قوم اور دشمنوں کو بالخصوص 'ہم' اور 'تم' کا فرق باور کرایا تھا۔ اب یوں ہوا کہ چونکہ نازی نظریات سخت نسل پرستانہ تھے تو بعد اس سارے معاملے کے مغرب کے طول و عرض میں نسل پرستی اتنی بدنام ہوئی کہ اس کی ساکھ ختم ہو کر رہ گئی۔ یہ لوگوں میں اتنی غیر معتبر ہوئی کہ اب عوام اس سے باقاعدہ بدظن ہو گئی۔ یہ تو فوری ردعمل تھا لیکن واقعی معنوں میں بدلاو آنے میں خاصا وقت لگا۔ مثال کے طور پر امریکی سیاست کے دھارے میں سفید فام بالادستی ساٹھ کی دہائی میں بھی باقی تھی۔ آسٹریلیا کی سفید فام پالیسی 1973ء تک لاگو رہی۔ اس پالیسی کے تحت آسٹریلیا میں سفید فاموں کے علاوہ دوسری نسلوں کی ہجرت اور سکونت پر پابندی تھی۔ آبجین آسٹریلیائی باشندوں کو 1960ء کی دہائی تک برابر سیاسی حقوق حاصل نہیں تھے اور ان پر انتخابی عمل میں حصہ لینے کی اس لیے ممانعت تھی کیونکہ وہ بطور شہری، کند ذہن سمجھے جاتے تھے اور اس سنجیدہ سماجی عمل کا حصہ بننے کے اہل نہیں تھے۔
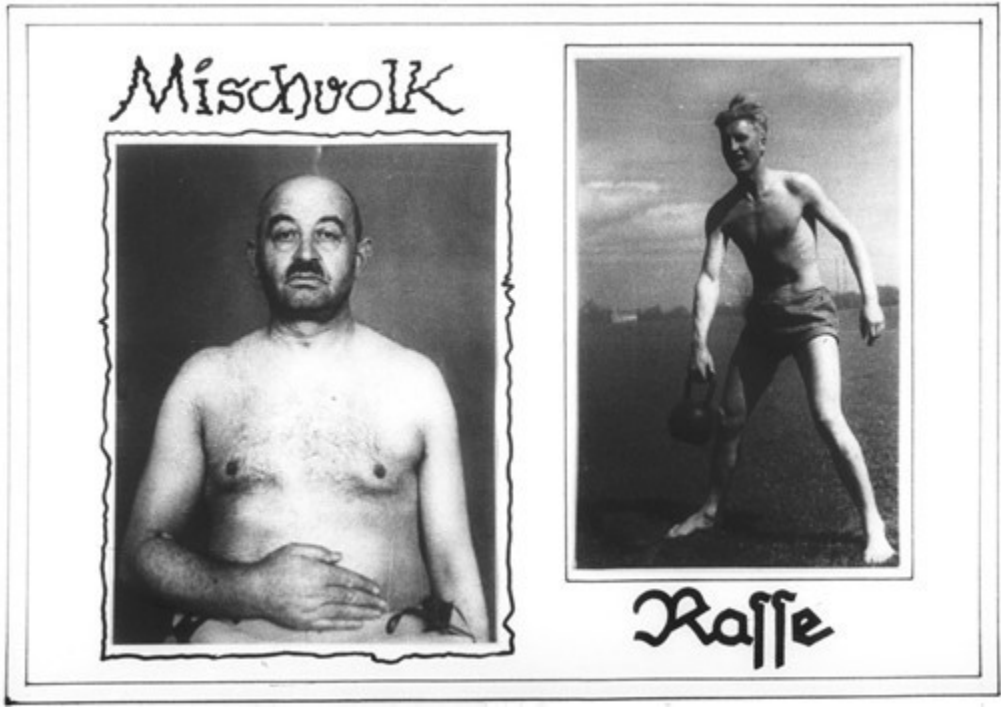
30: نازی دور کا ایک پروپیگنڈہ پوسٹر جس میں دائیں جانب ایک 'خالص نسلی آریائی' اور بائیں جانب 'دو نسلا' دکھایا گیا ہے۔ نازیوں کا انسانی جسم کے ساتھ لگاؤ بالکل واضح اور ثابت ہے جس کے تحت انھیں خوف لاحق ہو گیا کہ ادنیٰ نسلیں انسانی موروثے کو آلودہ کر کے اس کے انحطاط کا باعث بن جائیں گی۔

ایسا نہیں تھا کہ نازیوں کو انسانیت سے نفرت تھی۔ نازیوں نے لبرل انسان دوستی، انسانی حقوق اور اشتراکیت کے ساتھ جنگ اس لیے لڑی تھی کیونکہ وہ انسانیت کے دلدادہ تھے اور نوع انسانی یعنی آدمی کی زبردست طاقت اور وجوبی کے امکان پر یقین رکھتے تھے۔ لیکن ڈارون کے نظریہ انتخاب کی منطق کو استعمال میں لاتے ہوئے قدرتی انتخاب کے حامی تھے۔ یعنی، ناموزوں اور ناقص افراد کی گوڈی کر کے پیچھے صرف ایسے لوگوں کو بقا اور افزائش نسل کا موقع دیا جائے جو بقائے اہل ہوں۔ تنازعہ یہ تھا کہ آزاد خیالی اور اشتراکیت پر مبنی تصورات کے حامی نہ صرف ان ناموزوں اور ناقص افراد کو بقا کا ماحول فراہم کرتے تھے بلکہ افزائش نسل کا بھی پورا پورا موقع دیا جاتا تھا۔ یوں، نازیوں کے نزدیک آزاد خیالی اور اشتراکیت قدرتی انتخاب کی آفاقی حقیقت کو جھٹلانے کا باعث تھیں۔ اب ایسی دنیا میں یہ طے تھا کہ آگے چل کر انحطاط کا شکار انسانی نسلوں کے بیچ برتر اور اہل انسان غرق ہو جائیں گے۔ یوں بنی نوع انسان رفتہ رفتہ، ہر نسل کے ساتھ نقص اور خستہ حالی کا شکار ہو جائے گی۔ انسانوں میں اس قدر انحطاط پیدا ہو گا کہ بالآخر نسل انسانی معدوم ہو جائے گی۔

1933:31ء میں شایع ہونے والا ایک نازی کارٹون جس میں ہٹلر کو ایک مجسمہ ساز دکھایا گیا ہے۔ اس کارٹون میں ایک عینک پوش آزاد خیال مفکر کو 'ملکوتی انسان' کی تخلیق کے لیے در کار تشدد کو دیکھ کر سخت حیرت زدہ دکھایا گیا ہے۔ (اس کارٹون میں دکھائے گئے مجسمے میں انسانی جسم کی جنسی طور پر تجلیل کو بالخصوص ملاحظہ کریں)۔

1942ء میں جرمنی کے سکولوں میں پڑھائی جانے والی حیاتیات کی نصابی کتب میں ایک باب شامل تھا۔ اس باب کا عنوان 'فطرت کے قوانین اور بنی نوع انسان' تھا۔ اس باب میں فطرت کے برتر قوانین کے بارے معلومات فراہم کی گئی تھیں اور بتایا گیا تھا کہ کیسے جانداروں کی ہر نوع اور قسم بقاء کی سخت اور بے رحم جنگ لڑ رہی ہے۔ پودوں کی رقبوں پر جنگ اور بھوتروں کی جماعی اہلیت پر جنگ وغیرہ کی تفصیلات سمجھانے کے بعد اس باب کا خلاصہ کچھ یوں تحریر کیا گیا تھا:

'وجود کے لیے جنگ انتہائی سخت اور بے رحم ہوتی ہے لیکن زندگی کو مستحکم رکھنے کا یہی واحد طریقہ ہے۔ یہ جدوجہد اور جنگ ہر اس شے کو حذف کر دیتی ہے جو زندگی کے لیے موزوں نہ ہو اور ہر اس شے کا انتخاب کرتی ہے جو بقاء کے لیے اہل ہو۔ یہ وہ فطری قوانین ہیں جو مسلم اور ناقابل تردید ہیں۔ اس کا ثبوت جاندار مخلوق کو ہر طرح کے حالات و واقعات میں بقاء کی صورت پیش کرنا پڑتا ہے۔ یہ قوانین سخت کینہ ور بھی ہوتے ہیں۔ وہ جاندار جو ان قوانین پر پورا نہیں اترتے، بالآخر ختم ہو کر صفحہ ہستی سے مٹ جائیں گے۔ حیاتیات ہمیں نہ صرف نباتات اور حیوانات کے بارے بتاتی ہے بلکہ ہمیں وہ قوانین اور اصول بھی سمجھاتی ہے جو ہمیں اپنی زندگی پر لاگو کرنے چاہییں۔ انھی فطری قوانین اور اصولوں کی بنیاد پر ہم اپنی زندگی کا مقصد تلاش کریں اور انھی قوانین اور

اصولوں کی برتری اور غلبے کے لیے جدوجہد بھی کریں۔ زندگی کا مطلب ہی جدوجہد ہے۔ وہ جو ان قوانین اور اصولوں کی نافرمانی کرے، شدید بدقسمت اور ملول ہے۔'

اس کے بعد اڈولف ہٹلر کا ایک قول درج کیا گیا تھا، 'وہ شخص جو قدرت کی آہنی منطق سے لڑنے کی کوشش کرتا ہے، اصل میں ان اصولوں کے ساتھ نبرد آزما ہوتا ہے جن کے تحت وہ انسانی زندگی کا اہل ہوا۔ فطرت کے ساتھ جنگ، خود اپنے آپ پر تباہی نازل کرنے کے مترادف ہے'۔

آج اکیسویں صدی کے ساتھ ہی تیسری عیسوی ہزاری کا آغاز ہو چکا ہے لیکن ارتقائی انسان پرستی کا مستقبل ابھی تک غیر واضح اور مبہم ہے۔ ہٹلر کے خلاف جنگ ختم ہونے کے بعد تقریباً ساٹھ سے ستر برس تک انسان پسندی کو ارتقاء کے ساتھ جوڑنے پر سخت بندش رہی ہے۔ یہی نہیں بلکہ حیاتیاتی طریقوں سے انسانوں کی عضویاتی اور اعصابی سرفرازی کے طریقوں کو بھی سخت بری نظر سے دیکھا جاتا رہا ہے۔ لیکن آج اس طرح کے کئی منصوبے مقبول ہو رہے ہیں۔ اب کوئی شخص کمتر نسلوں اور ناقص انسانوں کو جڑ سے کاٹ پھینکنے کی بات نہیں کرتا لیکن بہت سے لوگ اس امر پر غور و فکر کر ہی رہے ہیں کہ حیاتیات کا علم بڑھا کر اور عملی تحقیق کی مدد سے انسانی جسم میں ایسی تبدیلیاں لائی جائیں جو بالآخر برتر انسانی نوع جنم لے سکے۔

جہاں ایک طرف یہ، وہیں اس کے ساتھ ساتھ آزاد خیالی پر مبنی انسان پرستی اور حیاتیاتی سائنس کی جدید ترین تحقیق کے بیچ بھی ایک خلیج تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ یہ ایسی خلیج ہے جو زیادہ دیر تک نظر انداز نہیں کی جا سکتی۔ ہمارے شخصی آزادی پر مبنی سیاسی اور دستوری نظام کی بنیاد اس ایقان پر رکھی گئی تھی کہ ہر فرد مقدس اور باطنی قلب اور فطرت کا حامل ہے۔ انسانی قالب ایسی شے ہے جو غیر متغیر اور ناقابل تقسیم ہے۔ اسی انسانی قالب سے دنیا کو معنی ملتے ہیں اور یہی اخلاقی اور سیاسی حاکمیت کی ماخذ بھی ہے۔ جیسا کہ ہم نے دیکھا یہ تصورات دراصل روایتی عیسائی عقائد کا اوتار ہیں جس کے تحت ہر فرد کے جسم میں آزاد اور لازوال روح کا تصور پیش کیا جاتا ہے۔ لیکن پچھلے دو سو سالوں میں حیاتیاتی سائنس نے اس تصور کی نفی ہی کی ہے۔ وہ سائنسدان جو انسانی اعضاء اور نامیاتی جسم کا مطالعہ کرتے ہیں۔۔۔ انھیں آج تک روح نامی کسی شے کا سراغ نہیں ملا۔ اب ان سائنسدانوں اور محققین کی اکثریت بھی قائل ہو چکی ہے کہ انسانی رویے دراصل ہارمونز، غدودوں، موروثوں اور عصبیوں کی کارستانی ہے۔ اس میں آزاد مشیتی اور شخصی آزادی کا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔ یہ وہی چیزیں ہیں جو بن مانسوں، لومڑوں، بھیڑیوں اور چیونٹیوں کے رویوں کا بھی تعین کرتی ہیں۔ ہمارے سیاسی اور دستوری نظام، عام طور پر اس طرح کی پریشان کن تحقیقوں اور مقالوں کو چھپانے کی کوشش کرتے ہیں یا پھر یکسر رد کر دیتے ہیں۔ لیکن آپس کی بات ہے، آپ دل پر ہاتھ رکھ کر تاریخ کو گواہ بنا کر بتائیں۔۔۔ ہم حیاتیات کے علم کو سیاسیات اور قانون کے علم سے کتنی دیر تک الگ رکھ سکتے ہیں؟ یہ وہ عشق اور مشک ہے۔۔۔ جو زیادہ دیر تک چھپی نہیں رہ سکتی۔

کامیابی کا راز

تجارت، سلطنتیں اور آفاقی مذاہب۔۔۔یہ وہ تین عوامل تھے جس نے ہر براعظم پر سکونت رکھنے والے ہر آدمی کو ایک ایسی عالمگیر دنیا میں پہنچا دیا ہے جہاں آج ہماری بسر ہے۔ توسیع اور وحدت کا یہ عمل، ظاہر ہے خطی اور نہ ہی بے خلل تھا۔ کئی راستے بدلنے پڑے اور بہت سی رکاوٹوں کو پار کرنا پڑا لیکن بڑی تصویر کا مشاہدہ کریں تو یہ صاف ظاہر ہے کہ لاتعداد چھوٹی ثقافتیں مدغم ہوتی گئیں اور پھر چند بڑی تہذیبیں اور تمدن وجود میں آئے اور اب ایک واحد عالمی معاشرہ تشکیل پا چکا ہے۔ یہ انسانی تاریخ کی ہر حرکیات اور آفریں کا نتیجہ ہے۔ ایسا ہو رہنا، اٹل اور ناگزیر تھا۔

لیکن صرف یہ کہہ دینا یہ عالمی معاشرہ ناگزیر تھا، یا انسانی تہذیب کا اس مقام تک پہنچنا اٹل تھا۔۔۔کافی نہیں ہو گا۔ یہ درست ہے کہ شاید ایسا ہونا ناگزیر تھا لیکن کیا ہم یہ بھی کہہ سکتا ہیں کہ صرف ایسا ہونا ہی اٹل تھا۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ عالمگیر دنیا کا عالمگیر معاشرہ۔۔۔تاریخی عوامل کی بنیاد پر کوئی اور رخ اور شکل بھی تو اختیار کر سکتا تھا۔ یقیناً، ہم دوسری طرح کی دنیاوں کا خیال پیش کر سکتے ہیں۔ مثلاً، آج دنیا بھر میں انگریزی کی بجائے ڈٹمار کی زبان عام کیوں نہیں ہے؟ آج دنیا میں دو ارب عیسائی اور ڈیڑھ ارب مسلمان ہیں جبکہ پارسیوں کی تعداد صرف ڈیڑھ لاکھ اور مانوی ایک بھی نہیں ہے؟ اگر ہم آج سے دس ہزار سال پہلے کے عرصے میں چلے جائیں اور اس عمل کو دوبارہ دہرائیں اور ہم ایسا بار بار کریں تو کیا ہم ایسی پھر بھی ہمیشہ ایسی ہی دنیا میں پہنچ جائیں گے جہاں ثنویت کا نہیں بلکہ توحید پرستوں کا ہی غلبہ ہوتا ہے؟

اب چونکہ ہم ایسا کوئی تجربہ نہیں کر سکتے تو ہم اس بارے کچھ بھی یقین سے نہیں کہہ سکتے بلکہ ہمیں اس کا کبھی علم نہیں ہو پائے گا۔ لیکن، تاریخ کی دو انتہائی اہم اور فیصلہ کن خصوصیات ایسی ہیں جن سے ہمیں کچھ نہ کچھ اندازہ ہو ہی جائے گا۔

سمجھ کا مغالطہ

تاریخ کا ہر مقام ایک چوراہے کی مانند ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے انسانیت نے ایک طویل سڑک پر سفر کیا جو اسے ماضی سے حال تک تو لے آئی ہے لیکن مستقبل ہمیشہ ہی ان گنت راستوں میں بٹا ہوا نظر آتا تھا۔ ان میں سے بعض راستے تو وہ تھے جو انتہائی کھلے، ہموار اور نشان دار بھی تھے۔۔۔اسی لیے انسانیت نے فوراً ہی ان راستوں کا انتخاب کیا۔ لیکن بعض دفعہ تاریخ۔۔۔بلکہ کیسے تاریخ بنانے والے لوگوں نے ایسے ایسے غیر متوقع راستوں کا بھی انتخاب کیا کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

مثال کے طور پر چوتھی صدی عیسوی میں رومی سلطنت کے سامنے مستقبل میں مذاہب کے کئی کئی راستے کھلے پڑے تھے۔ رومی سلطنت کے لیے یہ بھی ممکن تھا کہ وہ روایتی اور گوناگوں کثرت پرستی کے راستے پر ہی گامزن رہتی۔ لیکن اس وقت رومی سلطنت کے شہنشاہ قسطنطین اعظم نے جب چڑچڑا کر پچھلی ایک صدی سے جاری خانہ جنگی کی طرف مڑ کر دیکھا تو یقیناً سوچا ہو گا کہ صرف ایک واضح عقائد کا حامل مذہب۔۔۔اس نسلی اور گروہی طور پر بٹی ہوئی متنوع ریاست کو یقینی طور پر یکجا کرنے میں مدد دے سکتا ہے۔ اس ضمن میں اس وقت کئی مسالک اور دین موجود تھے۔ وہ چاہتا تو کسی بھی عقیدے کو قومی مذہب بنا سکتا تھا۔ مانویت، مترائیت، فطرت کی دیوی کا عقیدہ، آتش پرستی، یہودیت بلکہ وہ تو بدھ مت جیسے ہم عصر مذہب کا انتخاب بھی کر سکتا تھا۔ لیکن اس نے یسوع مسیح کو ہی کیوں چنا؟ کیا عیسائیت میں کوئی ایسی خوبی تھی کہ جس کا وہ ذاتی طور پر مداح تھا یا پھر اس نے اس مذہب کے بارے سوچا ہو گا کہ اس کے مقصد کو پورا کرنے کے لیے یہی مذہب ساز گار ہے؟ کیا یہ قسطنطین کا مذہب پر اپنا تجربہ تھا یا اس کے وزراء اور مشیران نے اسے مشورہ دیا تھا کہ چونکہ عیسائیت عام عوام میں بہت تیزی کے ساتھ مقبولیت پکڑ رہی ہے تو بہتر یہی ہے کہ سلطنت بھی اسی مذہبی گاڑی پر سوار ہو جائے؟ اس بارے تاریخ دان صرف اندازے ہی لگا سکتے ہیں لیکن حتمی جواب کبھی نہیں دے سکتے۔ وہ یہ تو بتا سکتے ہیں کہ آخر عیسائیت نے رومی سلطنت کو کیسے آن لیا لیکن وہ یہ کبھی نہیں بتا سکتے کہ صرف یہی مخصوص مذہب کیوں غالب ہوا؟

کسی بھی واقعے، بالخصوص تاریخی واقعے کے وقوع پذیر ہونے کے بیان میں 'کیسے' اور 'کیوں' کے فرق کیسے بتایا جاسکتا ہے؟ کوئی بھی واقعہ 'کیسے' وقوع پذیر ہوا، یہ تو بہت آسان ہے۔ اس کے لیے مخصوص حالات و واقعات کے ایک سلسلے کو جوڑنا پڑتا ہے اور یوں ہمیں پورے واقعے کا ایک سرے سے دوسرے سرے تک 'کیسے۔۔۔' کا احوال مل جاتا ہے۔ لیکن کوئی واقعہ 'کیوں' پیش آیا۔۔۔یہ تھوڑا سا مشکل ہوتا ہے۔ کسی بھی واقعہ کی وجہ بیان کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہر وقوعے کے سبب اور اس کا ایسا تعلق تلاش کیا جائے جس کی بنیاد پر اگلا وقوعہ پیش آیا اور یوں حالات و واقعات کا ایسا سلسلہ قائم ہو جو ایک بڑے اور اہم تاریخی واقعے کی شکل اختیار کر لے اور باقی سبھی ممکنہ حالات اور واقعات کو اس سلسلے سے منہا کر دے۔

بعض محققین جبری طریقے سے تاریخی واقعات جیسے مثال کے طور پر عیسائیت کی اٹھان بارے زبردستی کی وضاحتیں پیش کرتے ہیں۔ وہ انسانی تاریخ کو خواہ مخواہ ہی صرف حیاتیاتی، ماحولیاتی اور معاشی عوامل میں قید کر لیتے ہیں۔ ان کی دلیل یہ ہوتی ہے کہ یہ بحیرہ روم کے آس پاس علاقے کے جغرافیے، انسانی جینیات یا معاشی حالات و واقعات نے ایسا رخ اختیار کیا کہ توحید پرست مذاہب کی اٹھان ناگزیر ہو گئی۔ لیکن تاریخ دانوں کی اکثریت اس طرح کے جبری علمی نظریوں کو کبھی سنجیدہ نہیں لیتے اور ہمیشہ متشکک نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔۔۔ کبھی ان کی ہاں میں ہاں نہیں ملاتے۔ علم تاریخ کے مضمون کا یہی امتیازی وصف بھی ہے کہ کسی بھی مخصوص تاریخی دور یا واقعہ بارے ہم جتنا زیادہ جانتے ہوں۔۔۔اس کی وجوہات کی وضاحت کرنا اتنا ہی مشکل ہو تا جاتا ہے۔ یہ بتانا مشکل ہو تا جاتا ہے کہ واقعات نے یہی

مخصوص رخ کیوں اختیار کیا اور حالات کا اونٹ کسی دوسری کروٹ کیوں نہیں بیٹھا؟ وہ لوگ جنھیں کسی مخصوص دور بارے سطحی علم ہو، وہ صرف اور صرف اس نتیجے پر توجہ مرکوز رکھتے ہیں جو بالآخر برآمد ہوا۔ وہ اس واقعہ یا دور کے عیاں نتائج سے متعلق اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق قصے گھڑتے ہیں اور یہ باور کرانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں کہ ایسا ہی ہو رہنا کیوں ناگزیر تھا اور یہ اٹل کیوں ہے؟ لیکن وہ لوگ جو کسی تاریخی دور یا واقعہ کا واقعی۔۔۔ مفصل علم رکھتے ہیں، ان کی ساری توجہ ان راستوں پر مرکوز رہتی ہے جس پر تاریخ نہیں جاسکی۔ روایات و حکایات اور سنجیدہ علم تاریخ میں یہی فرق ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ وہ لوگ جو کسی تاریخی دور سے متعلق سب سے زیادہ علم رکھتے تھے۔۔۔ یعنی وہ لوگ جو اس دور میں جیتے تھے، وہی سب سے زیادہ اس دور میں برپا ہونے والے حالات و واقعات کی وجوہات سے لاعلم رہے ہیں۔ قسطنطین کے دور میں ایک اوسط رومی کے لیے مستقبل میں دھندلاہٹ کے سوا کچھ نظر نہیں آسکتا تھا۔ یہ تاریخ کا آہنی قانون ہے کہ آج جو شے تاریخی سمجھ بوجھ میں ناگزیر اور اٹل نظر آتی ہے۔۔۔ خود اپنے زمانے میں اس کی کوئی صورت واضح نہیں رہی ہوگی۔ یہ کلیہ، آج بھی جوں کا توں صادق ہے۔ مثال کے طور پر ہم یہی سوچتے رہتے ہیں کہ جی اچھا، کیا یہ معاشی بحران ٹل گیا ہے یا ابھی کچھ مزید بھی باقی ہے؟ کیا چین اسی طرح معاشی ترقی کرتا رہے گا تاآنکہ اس دنیا کی نئی سپرپاور بن جائے؟ کیا ریاستہائے متحدہ امریکہ واقعی اپنی برتری اور حاویت کھو رہا ہے؟ یہ جو آج توحید پرستوں نے جگہ جگہ بنیاد پرستی کی لہر اٹھا رکھی ہے۔۔۔ کیا یہ بالآخر پوری دنیا کو بہالے جائے گی یا یہ صرف ایسا مقامی بھنور ہے جس کی طویل مدت میں کوئی اہمیت نہیں ہے؟ کیا ہم ماحولیاتی تباہی کی طرف بڑھ رہے ہیں یا ٹیکنالوجی کی جنت ہمارا انتظار کر رہی ہے؟ ان سارے موجودہ حالات و واقعات کے ماحاصل پر ہر طرح کے دلائل پیش کیے جاسکتے ہیں لیکن ان میں سے کسی شے بارے حتمی طور پر کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ چند دہائیوں بعد لوگ پیچھے مڑ کر آج کے دور کی طرف دیکھیں گے اور یہ سوچا کریں گے کہ ان سب سوالات کے جوابات تو بالکل سامنے پڑے تھے۔ آج دنیا کے حالات و واقعات کوئی بھی کروٹ لیں۔۔۔ آنے والی کل میں یہ اٹل ہی محسوس ہو گا۔

یہاں خصوصی طور پر ان امکانات پر زور دینا انتہائی ضروری ہے جو ہم عصر دور میں تو ناممکن نظر آتے تھے لیکن بہر حال اکثر ہی بالآخر ہو کر رہے ہے۔ مثال کے طور پر جب قسطنطین نے 306ء میں تخت سنبھالا تو اس وقت عیسائیت ایک دقیق اور مخفی مشرقی فرقے سے زیادہ کچھ نہیں تھی۔ اگر اس وقت کوئی یہ کہتا کہ یہ بالآخر رومی سلطنت کا سرکاری مذہب بن جائے گا تو یقیناً ہر شخص اسی طرح ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو جاتا جس طرح آج اگر کوئی یہ کہے کہ 2050ء تک امریکہ کا سرکاری مذہب ہری کرشنا ہو گا۔ اکتوبر 1913ء میں روسی اشتراکی جماعت 'بالشویک' انتہائی محدود اور ایک انتہائی معمولی روسی بنیاد پرست دھڑے سے زیادہ کچھ نہیں تھا۔ اس وقت کوئی بھی معقول آدمی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ اگلے صرف چار برسوں کے مختصر عرصے میں یہ شدت پسند دھڑا پورے ملک پر غالب آجائے گا۔ اسی طرح 600ء میں یہ خلاف از قیاس تھا کہ صحرائی عرب جلد ہی بحراوقیانوس سے لے کر ہندوستان تک اتنی بڑی سلطنت کھڑی کر دیں

گے کہ عقل حیران رہ جائے گی۔ یہ درست ہے کہ اگر بازنطینی مسلمانوں کے اوائل حملوں کو روکنے میں کامیاب ہو جاتے تو غالباً اسلام بدستور ایک گمنام مسلک ہی رہتا جس کے ماننے والوں کی تعداد حجاز سے باہر کہیں نہ ملتی بلکہ دنیا میں کسی کو اس کی خبر بھی نہ ہوتی۔ اگر ایسا ہوتا تو پھر محققین کے لیے مکہ سے تعلق رکھنے والے ایک تاجر پر نازل ہونے والی وحی اور اس کے نتیجے میں جنم لینے والے ایک دین کی وضاحت پیش کرنا خاصا آسان ہوتا بلکہ شاید اس دنیا میں زیادہ تر لوگوں کو ان کی تحقیق سے بھی کوئی مطلب نہ ہوتا۔

یہ درست ہے کہ ہر شے ممکن نہیں ہوتی۔ بالخصوص جغرافیائی، حیاتیاتی اور معاشی عوامل تو بالخصوص رکاوٹیں کھڑی کرتے ہیں۔ لیکن رکاوٹوں کے باوجود اتنا موقع ہر شے کے لیے بہر حال باقی رہتا ہی ہے کہ وہ پنپ سکیں اور بسا اوقات عقل کو دنگ کر دینے کی حد تک ترقی پالیں۔ لیکن یہ طے ہے کہ کسی بھی شے کو ثابت کرنے کے لیے جبری نظریات اور تعیینی کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔

یہ اخیر اور تصفیہ ان لوگوں کے لیے انتہائی مایوس کن ہوگا جو تاریخ کو تعیناتی کی رو سے، اپنے جبری نظریات کی عینک سے دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ جبریت یعنی یہ نظریہ کہ جملہ موجودات و واقعات سابقہ حالات کا لازمی نتیجہ ہوتے ہیں۔۔۔ اس لیے پرکشش ہوتا ہے کیونکہ اس سے ہماری دنیا اور ہمارے عقائد کو تاریخ کا فطری اور اٹل نتیجہ ثابت کرنے میں نہایت آسانی رہتی ہے بلکہ ہمارے ایقان اور دنیا کی انتہائی سہانی تصویر بن کر ابھرتی ہے۔ آج یہ بالکل قدرتی اور اٹل امر محسوس ہوتا ہے کہ ہم قوم پرست ریاستوں میں بسر رکھتے ہیں، ہم نے اپنی معیشت کو نہایت مزے سے سرمایہ دارانہ نظام سے ہم آہنگ کر رکھا ہے اور نہایت پرجوش انداز میں بنیادی انسانی حقوق میں بھی یقین رکھتے ہیں۔ تاریخ کو نظریہ جبر میں نہ تولنے کا مطلب یہ بھی ہے کہ ہم یہ مان لیا کریں کہ آج زیادہ تر لوگ قوم پرستی، سرمایہ دارانہ نظام اور انسانی حقوق میں یقین ایک اتفاق کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے۔

تاریخ کو جبری لحاظ سے نہیں سمجھایا جاسکتا اور نہ ہی اس کی کوئی پیش گوئی کی جاسکتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تاریخ کلی انتشار اور بدنظمی، افراتفری کا شکار رہتی ہے۔ اس کے رخ کا تعین کرنے میں کئی کئی عوامل پیش پیش ہوتے ہیں اور یہ عوامل ایک دوسرے کے ساتھ اتنی پیچیدگی سے گڈمڈ ہوتے ہیں کہ ان عوامل سے متعلق چھوٹی سی چھوٹی کمی بیشی بھی نتائج میں بڑی سی بڑی تبدیلی اور تغیر کا باعث بن سکتی ہے۔ ایسے بدنظم اور انتشار پر مبنی سلسلے دو درجاتی شکلوں میں پائے جاتے ہیں۔ انتشار اور بدنظمی کا پہلا درجہ تو یہ ہوتا ہے اس نظام پر کی گئی پیش گوئیوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔۔۔ اسی لیے پیش گوئیاں درست ثابت ہوسکتی ہیں لیکن اس پر نظام کی جانب سے کوئی ردعمل سامنے نہیں آتا۔ موسم، اس پہلے درجے کی بہترین مثال ہے۔ یہ درست ہے کہ موسم پر کثیر تعداد میں عوامل اثر انداز ہوتے ہیں لیکن بھلے ہم موسم کے بارے پیش گوئی کر لیں، موسم کو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ یہ ضرور ہے کہ اگر ہم موسمیاتی ڈیٹا جمع کرتے رہیں اور اس میں ان گنت تعداد میں اثر انداز ہونے والے عوامل کو بھی نظر میں رکھیں تو بجا طور پر ہم روز بروز، موسم کے بارے بہتر پیش گوئی کرنے کے قابل ہوسکتے ہیں لیکن خود موسم پر اس پیش گوئی کا کوئی اثر نہیں پڑے گا۔

دوسرے درجے کے انتشار ایسے ہوتے ہیں کہ نظام پر کئی گئی پیشن گوئیوں کا بے انتہا اثر ہوتا ہے اور ان کے بارے کبھی بھی صاف صاف قطعی پیشن گوئی نہیں کی جاسکتی اور نظام ان پیشن گوئیوں کے جواب میں بھرپور ردعمل دکھاتا ہے۔ اس ضمن میں تجارتی منڈیوں کی مثال بہترین ہے۔ مثال کے طور پر اگر ہم ایسا کمپیوٹر پروگرام بنالیں جو منڈی میں کل صبح تیل کی بالکل صاف صاف، سوفیصد درست پیشن گوئی کرسکتا ہو۔ تو کیا ہو گا؟ کل صبح یہ ہو گا کہ منڈی میں تیل کی قیمتوں پر بجا طور پر اس پیشن گوئی کا اثر ہو گا، اس کا ردعمل دیکھنے میں آئے گا اور یوں ہماری کمپیوٹر پروگرام پر کی گئی ساری محنت اکارت چلی جائے گی۔ اس کو سادہ الفاظ میں یوں بیان کیا جاسکتا ہے۔ فرض کریں، تیل کی موجودہ قیمت 90 ڈالر فی بیرل ہے جبکہ ہمارا بے چوک کمپیوٹر پروگرام پیشن گوئی کرتا ہے کہ کل صبح تیل کی قیمت 100 ڈالر فی بیرل ہو گی۔ دنیا بھر کے تاجر تیل خریدنے کی دوڑ میں لگ جائیں گے۔۔۔ تا کہ کل صبح وہ فی بیرل 10 ڈالر کا منافع کما سکیں۔ اس دوڑ کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ منڈی میں تیل کی مانگ بڑھ جائے گی اور کل کی بجائے، آج ہی تیل کی قیمت 100 ڈالر تک پہنچ جائے گی۔ تو پھر کل کیا ہو گا؟ اس بارے کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا!

سیاست بھی دوسرے درجے کا منتشر اور بدنظم نظام ہے۔ آج لوگوں کی اکثریت سابق سوویت یونین پر نظر رکھنے والے محققین کو لعن طعن کرتے رہتے ہیں کہ وہ 1989ء کے روسی انقلاب کی آمد سے بے خبر رہے۔ اسی طرح مشرق وسطیٰ کے معاملات پر مہارت رکھنے والوں کی سرزنش کی جاتی ہے کہ انھیں 2011ء میں عرب اسپرنگ کی کانوں کان خبر تک نہ ہوئی؟ یہ ان محققین اور ماہرین کے ساتھ انتہا کی زیادتی ہے۔ انقلاب، تعریف کی رو سے ہی ناقابل پیشگوئی ہوتے ہیں۔ ایک ایسا انقلاب، جس کی پیشگوئی کی جائے۔۔۔ کبھی برپا نہیں ہوتا۔

کیوں نہیں؟ اس امر کو سمجھنے کے لیے ایک دفعہ پھر فرض کریں۔ وقت کو پیچھے دوڑا کر 2010ء میں لے جائیں اور سوچیں، سیاسیات کے چند ماہرین نے کمال کر دکھایا ہے اور ایک ایسا کمپیوٹر پروگرام ایجاد کر لیا ہے، جو جادو کی چھڑی سے الگورتھم استعمال کر کے، یقینی طور پر انقلاب کی پیشگوئی کرنے کا اہل ہے۔ وہ اس کمپیوٹر پروگرام کو لے کر مصر کے صدر حسنی مبارک کے پاس پہنچ جاتے ہیں اور منہ مانگی قیمت لے کر صدر مبارک کو بتاتے ہیں کہ آج سے لے کر ایک اگلے ایک برس کے عرصے کے دوران ایک ایسا انقلاب اٹھے گا جو مصر کو توڑ کر رکھ دے گا۔ آپ کا کیا خیال ہے، صدر حسنی مبارک کا ردعمل کیا ہو گا؟ یقیناً فوری طور پر ٹیکسوں میں کمی اور عوامی منصوبوں میں اربوں ڈالر کی سرکاری سرمایہ کاری کے علاوہ بوجوہ خفیہ پولیس فورس کو بھاری طور پر مسلح کر کے چوکنا رکھنے کے بھی احکامات جاری کر دیے جاتے۔ یہ اقدامات اپنا اثر ضرور دکھاتے۔ وہ سال آکر گزر جاتا اور پتہ چلتا۔۔۔ جس انقلاب کی اتنی دھوم تھی، وہ کبھی برپا ہی نہیں ہوا۔ حسنی مبارک، اپنا پیسہ واپس مانگ لیتا ہے اور کہتا ہے، 'تمھارا الگورتھم ہی بیکار ہے۔۔۔ کیا انقلاب، کونسا انقلاب؟ خواہ مخواہ میرا اتنا پیسہ برباد کروا دیا۔۔۔ میں بجائے ایک نیا اور پرتعیش محل تعمیر کر لیتا!'۔ سائنسدان ہکا بکا جواب دیتے، 'لیکن سر۔۔۔ انقلاب اسی لیے تو برپا

نہیں ہوا کیونکہ ہم نے کامیابی کے ساتھ پہلے ہی اس کی پیشگوئی کر دی تھی!' تو مبارک صاحب ان سائنسدانوں کو گرفتار کروانے سے پہلے جواب دیتے، 'ارے چھوڑو۔۔۔ تم لوگوں کی مثال اس عامل جیسی ہے، جس کی پیشگوئی کبھی پوری نہیں ہوتی۔ تم دو ٹکے کے لوگ۔۔۔ تم جیسے تو قاہرہ کی گلیوں میں ہزاروں مارے مارے پھرتے ہیں!'

تو پھر ہم تاریخ کا مطالعہ کیوں کریں؟ طبیعیات اور معاشیات کے برعکس، تاریخ کا علم کسی صورت بھی ہو بہو اور درست پیشگوئی کرنے کا ذریعہ نہیں ہے۔ ہم تاریخ کا مطالعہ اس لیے نہیں کرتے کہ مستقبل کی جانکاری حاصل کریں بلکہ ہم تاریخ کا مطالعہ اس لیے کرتے ہیں کہ ہماری وسعت نظر میں اضافہ ہو سکے۔ ہم اپنی موجودہ صورتحال اور حالات کو سمجھ سکیں۔ ہم یہ سمجھ سکیں کہ ہماری یہ حالت فطری اور نہ ہی اٹل ہے اور ہمارے سامنے ان حالات و واقعات کے علاوہ بھی ہزار ہزار دوسرے امکانات ہر وقت دھرے رہتے ہیں۔ یہ امکانات اتنے زیادہ ہیں کہ ہماری سوچ اور سمجھ سے بھی زیادہ ہیں۔ ہم یہ سمجھ پائیں کہ دراصل ہم سمجھ کے مغالطے کا شکار رہتے ہیں۔ مثال کے طور پر افریقیوں پر یورپیوں کے غلبے کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے ہمیں یہ سمجھ آتی ہے کہ نسلی سلسلوں اور برتری کی کوئی فطری اور نہ ہی اٹل حقیقت ہے۔۔۔ اگر سمجھ کا مغالطہ نہ ہوتا تو بلاشبہ دنیا اس سے کہیں مختلف، کہیں بہتر ہو سکتی تھی۔

کلیو، تاریخ کی دیوی

ہم تاریخ کے ہاتھوں حالات و واقعات کے انتخاب اور چناؤ کی وضاحت تو پیش نہیں کر سکتے لیکن ان تاریخی حالات و واقعات بارے ایک اہم چیز ضرور کہہ سکتے ہیں: تاریخ کا انتخاب کبھی بھی انسانوں کے مفاد کو ذہن میں رکھ کر نہیں کیا گیا۔ اس ضمن میں ایسا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ جیسے جیسے تاریخ آگے بڑھی، انسانوں کا حال بھی حتمی طریقے سے بہتر ہوتا گیا ہو۔ ایسا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ وہ ثقافتیں جو انسانوں کے لیے فائدہ مند تھیں، بالضرور ہی بے رحمانہ طریقے سے کامیابی کے ساتھ پھیل رہے ہوں اور وہ ثقافتیں جو کم فائدہ مند تھیں، رفتہ رفتہ ختم ہو گئے۔ اس امر کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ عیسائیت، قطعی طور پر مانویت سے بہتر تھی۔۔۔ یا عربوں کی اسلامی سلطنت، ساسانیوں کی مجوسی سلطنت سے بہتر تھی۔

اس بات کا قطعاً کوئی ثبوت نہیں ہے کہ تاریخ کی کنڈلی انسانوں کے مفاد کو مدنظر رکھ کر کھلتی آئی ہے کیونکہ ہمارے پاس ایسا کوئی معروضی پیمانہ نہیں ہے جو اس طرح کے انسانی مفاد اور نفع کو ماپ سکے۔ مختلف ثقافتیں اور تہذیبیں فائدے اور اچھائی کو مختلف طریقے سے بیان کرتی ہیں اور ہمارے پاس ایسا کوئی معروضی گز کا پیمانہ نہیں ہے کہ ہم ان کے بیچ فیصلہ کر سکیں۔ فاتحین ہمیشہ ہی یہ سمجھتے آئے ہیں کہ انسانی مفاد کی وہ تعریف بالکل درست ہے جو ان کی ایجاد کردہ ہے۔ لیکن کیا ہمیں فاتحین پر یقین کر لینا چاہیے؟ عیسائی یہ یقین رکھتے ہیں کہ مانویت پر عیسائیت کی برتری اور غلبہ انسانیت کے مفاد میں تھی لیکن اگر ہم عیسائیوں کے اس یقین سے اتفاق نہ کریں تو ہمارے

پاس ان کی دلیل کے ساتھ اتفاق کرنے کی کوئی دوسری وجہ نہیں ہے۔ مسلمانوں کو یقین ہے کہ ان کے ہاتھوں ساسانی سلطنت کا خاتمہ دراصل انسانیت کے لیے فائدہ مند رہی ہے۔ لیکن انسانیت کا یہ مفاد اسی وقت قابل بھروسا ہے جب ہم مسلمانوں کے دعویٰ کو تسلیم کر لیں۔ ہمیں کیا خبر، عیسائیت اور اسلام بھول بھلا دیے جاتے یا شکست خوردہ ہوتے تو کیا پتہ، ہم بہتر دنیا میں جیتے؟ کیا پتہ۔۔۔ ہم اس سے بدتر دنیا میں جیتے؟ ہم کچھ بھی قطعی طور پر نہیں کہہ سکتے۔

اب زیادہ سے زیادہ محققین ثقافتی اور تہذیبی عوامل کو دماغی چھوت چھات یا طفیلی بیماری کے طور پر دیکھتے ہیں۔ انسان، نادانستگی میں اس بیماری کا شکار ہیں، یعنی طفیلی نواز ہیں۔ نامیاتی طفیلیے جیسے وائرس، بیکٹیریا وغیرہ کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے میزبان یا طفیلی نواز کے جسم کے اندر رہ کر پنپتے ہیں۔ وہ افزایش سے ضرب کھاتے ہیں اور ایک میزبان سے دوسرے میں منتقل ہو کر پھیلتے ہیں۔ میزبان کے جسم پر پلتے ہیں، انھیں کمزور کرتے ہیں اور بعض اوقات ہلاک بھی کر دیتے ہیں۔ جب تک میزبان زندہ رہتا ہے، وہ طیفیلیے کو دوسرے لوگوں میں منتقل کرنے کے اہل ہوتے ہیں جبکہ طفیلیوں کو اپنے میزبان کی بگڑتی ہوئی کیفیت اور حالت کی کوئی پرواہ اور نہ ہی مطلب ہوتا ہے۔ اسی طرز پر، ثقافتی تصورات بھی انسان کے دماغ میں پلتے ہیں۔ وہ انسانی دماغ میں ضرب کھا کر پھلتے پھولتے ہیں اور پھر ایک سے دوسرے آدمی کے دماغ میں منتقل ہو جاتے ہیں۔ وہ رفتہ رفتہ اپنے میزبانوں کو کمزور کرتے جاتے ہیں اور بعض دفعہ انھی تصورات کی وجہ سے آدمی مر بھی جاتے ہیں۔ ایک ثقافتی تصور، جیسے عیسائیوں کی بعد از موت جنت اور اشترا کیت میں اسی دنیا میں جنت جیسے تصورات وغیرہ انسانوں کو اپنی پوری زندگی انھی تصورات اور عقائد کو پھیلانے میں صرف کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔۔۔ ان تصورات کو پھیلانے میں اکثر لوگوں کی جان بھی چلی جاتی ہے بلکہ وہ ہنسی خوشی ان تصورات کو پھیلانے میں اپنی جان دے دیتے ہیں۔ انسان تو مر جاتا ہے لیکن یہ تصور نہ صرف باقی رہتا ہے بلکہ پھیلتا بھی جاتا ہے۔ اس لحاظ سے تہذیب و تمدن اور ثقافتیں چند لوگوں کی اپنے مفادات کے تحفظ اور نفع کے لیے گھڑی ہوئی سازش نہیں ہوتی (جیسے مارکسٹس کہتے ہیں)۔ بلکہ تہذیب و تمدن، ثقافت کے سماجی تصورات اور عقائد تو دماغی طفیلیے ہوتے ہیں جو کلی طور پر حادثاتی ہوتے ہیں۔ یہ انسان نہیں ہیں جو ان تصورات سے فائدہ اٹھاتے ہیں بلکہ یہ تصورات ہیں جو عفونت زدہ لوگوں کو اپنے فائدے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

اس طرز نظر کو بعض اوقات تمثلیات بھی کہا جاتا ہے۔ تمثلیات سے مراد یہ ہے کہ جس طرح نامیاتی ارتقاء کی بنیاد نامیاتی معلومات کی اکائیوں یعنی موروثوں کے ذریعے نسل در نسل منتقلی پر ہوتی ہے۔ موروثے نامیات کی بنیاد میں استعمال ہونے والے پتھروں کی طرح ہوتے ہیں۔۔۔ اسی طرح تہذیبی یا ثقافتی ارتقاء کی بنیاد بھی تہذیبی یا ثقافتی معلومات کی اکائیوں یعنی 'تمثل' یا 'تصور' کے ذریعے ہوتی ہے۔ تمثل یا تصور ہی دراصل کسی بھی تہذیب یا ثقافت کی بنیاد میں استعمال ہونے والے پتھر ہوتے ہیں۔ کامیاب تہذیبیں یا ثقافتیں وہ ہوتی ہیں

جو اپنے تمثّل اور تصورات کو از سر نو تخلیق کر کے پھیلانے کے ماہر ہوتے ہیں۔۔۔ وہ اس ضمن میں انسانی قیمت اور مفادات کی سرے سے کوئی پرواہ نہیں کرتے۔

علم تاریخ و ادب کے محققین اور ماہرین کی اکثریت اس تمثلیاتی طرز نظر کو سخت برا سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ اناڑی پن اور غیر پیشہ ورانہ انداز ہے اور ہم خواہ مخواہ ہی شوقیہ انداز میں ثقافتی عوامل کو بھونڈے انداز میں حیاتیاتی قیاس کے ساتھ تمثیلی انداز میں گڈمڈ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن انھی محققین کی اکثریت، تمثلیات کی بجائے اس کی جڑواں بہن یعنی مابعد جدیدیت کو استعمال میں لانے کا مشورہ بھی دیتے ہیں۔ مابعد جدیدیت کے مفکرین تمثّل یا تصور کی بجائے ہم عصر مباحثوں اور مکالمے پر زور دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک تمثّل یا تصور نہیں بلکہ مکالمہ ہی کسی بھی تہذیب یا ثقافت کا بنیادی جز ہوتا ہے۔ لیکن اس طرز نظر میں بھی انسانیت کے مفاد کی بجائے تہذیب یا ثقافت کا پھیلاو اور اشاعت ہی ابھر کر سامنے آتا ہے۔ مثال کے طور پر مابعد جدیدیت کے حامی مفکرین قوم پرستی کو ایسی مہلک اور تباہ کن وبا کے طور پر دیکھتے ہیں جس نے انیسویں اور بیسویں صدی میں پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ قوم پرستی کے نتیجے میں جنگیں، جبر، نفرت اور نسل کُشی جیسی قباحتیں اور مصیبتیں عام ہوگئیں۔ اس دور میں اس کی مثال وبا کی طرح یوں تھی کہ جیسے ہی کسی ایک ملک میں لوگ قوم پرستی کا شکار ہوئے، پڑوسی مما لک میں بھی یہ 'وائرس' پھیلتا چلا گیا یا اس کا تصور عام ہو گیا۔ قوم پرست وائرس نے خود کو انسانوں کے لیے سود مند بنا کر پیش کیا لیکن اصل میں یہ قوم پرستی کا تصور تھا، جو خوب پھلتا اور پھولتا رہا۔ انسان تو سخت مضرت کا شکار ہو گئے۔

سماجیات میں اس طرح کے دلائل بہت عام ہیں۔ سماجی سائنس کی زبان میں اسے نظریہ کھیل کے پتے یا حکمت چال کے کر کہا جاتا ہے۔ نظریہ کھیل یہ ہے کہ ایک سے زیادہ کھلاڑیوں کے نظام میں ایسے تصورات، نظریات اور رویے جو سبھی کھلاڑیوں کے لیے مضر ہوں، وہ انتہائی تیزی اور خوبی کے ساتھ جڑ پکڑ لیتے ہیں۔ اس کی بہترین مثال، ہتھیاروں کی دوڑ ہے۔ ہتھیاروں کی دوڑ ایسی چال ہے جس کو کھیلنے والا ہر کھلاڑی کا بالآخر دیوالیہ نکل جاتا ہے اور فوجی طاقت کا توازن بھی کبھی بحال نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر جب پاکستان جدید جنگی طیارے خریدتا ہے تو بھارت بھی جوابی طور پر ایسا ہی کرتا ہے۔ جب بھارت ایٹمی ہتھیار بناتا ہے تو پاکستان بھی اسی دوڑ میں لگ جاتا ہے۔ جب پاکستان اپنی نیوی کی استعداد بڑھاتا ہے تو بھارت بھی جواباً اپنی نیوی کو نت نئی آبدوزوں سے لیس کر دیتا ہے۔ اس عمل کے آخر میں فوجی طاقت کا توازن تو شاید اتنا ہی رہے جتنا پہلے تھا لیکن اربوں ڈالر اس دوڑ میں پھونک دیے جاتے ہیں۔ پاکستان اور بھارت، یہی اربوں ڈالر ہتھیاروں کی بجائے اپنے شہریوں کے فلاح و بہبود، تعلیم یا صحت وغیرہ پر بھی خرچ کر سکتے تھے۔ لیکن ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہتھیاروں کی اس دوڑ کی حرکیات ایسی ہیں کہ پاکستان اور نہ ہی بھارت کے لیے اس پر روک لگانا ممکن ہے۔ 'ہتھیاروں کی دوڑ' رویوں کا ایسا نمونہ ہے جو ایک ملک سے دوسرے اور پھر پورے خطے میں وائرس کی طرح پھیل جاتا ہے۔۔۔ اس سے ہر ملک کو

بھاری نقصان اٹھانا پڑتا ہے لیکن اس کا سراسر فائدہ صرف کود اس دوڑ کو ہوتا ہے۔ اس دوڑ کی مثال ارتقائی لحاظ سے نہایت خوب ہے، جو بقاء اور افزائش پر چلتا ہے۔ یہاں یہ بھی یاد رہے کہ 'ہتھیاروں کی دوڑ'، ایک کرو موسوم میں موروثے کی طرح ہی ہوتا ہے جسے یہ ادراک نہیں ہوتا کہ وہ دانستہ بقاء اور افزائش کے عمل میں مصروف ہے۔ اس کا پھیل پھیلاو، ایک انتہائی طاقتور محرک کا غیر ارادی نتیجہ ہے۔

آپ اس کو کچھ بھی نام دے دیں۔۔۔ نظریہ کھیل، مابعد جدیدیت یا تمثالیت وغیرہ لیکن یہ طے ہے کہ تاریخ کی حرکیات کبھی بھی انسانی فلاح و بہبود اور آسودگی کے لیے رخ نہیں پکڑتیں۔ اس طرز فکر کی کوئی اساس ہی نہیں ہے کہ تاریخ میں سب سے کامیاب تہذیب اور ثقافت وہی رہی ہے جو لازمی طور پر آدمی کے لیے بہترین ثابت ہوئی ہو۔ ارتقاء کی طرح، تاریخ بھی انفرادی سطح پر نامیات کی اجناس اور انواع کی خوشی کو ہرگز خاطر میں نہیں لاتی۔ اور یہ کہ انفرادی سطح پر انسان۔۔۔ اپنے بل بوتے اور زور میں عام طور پر اتنے بے خبر اور بودے ہوتے ہیں کہ وہ تاریخ کے دھارے کو اپنے مفاد کے لیے بہانے پر سرے سے کوئی اثر و رسوخ نہیں رکھتے۔

تاریخ زمانے کی سڑک پر ایک چوک سے دوسرے اور تیسرے۔۔۔ چوک سے چوک تک چلتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ یہ ہر چوک پر نہایت ہی پر اسرار انداز میں پہلے ایک، پھر دوسرا۔۔۔ انتہائی مختلف موڑ مڑ لیتی ہے۔ 1500ء کے آس پاس، تاریخ میں سب سے یادگار اور عظیم موڑ اس وقت آیا جب اس نے انسانیت کی قسمت اور کایا پلٹ کر رکھ دی بلکہ کیسے۔۔۔ صرف انسان ہی نہیں کرہ ارض پر ہر جاندار کی کایا پلٹ دی۔ ہم اس عظیم موڑ کو سائنسی انقلاب کے نام سے جانتے ہیں۔ یہ انقلاب مغربی یورپ میں افریشیائی دنیا کی مغربی خلیج کے ایک کونے میں نظر آیا۔ اس کونے نے اس وقت تک تاریخ میں، کبھی بھی۔۔۔ کسی بھی صورت کبھی کوئی کلیدی کردار ادا نہیں کیا تھا۔ سوال پھر وہی ہے کہ آخر سائنسی انقلاب پوری دنیا کو چھوڑ۔۔۔ چین یا ہندوستان نہیں بلکہ اس کونے میں ہی وقوع پذیر ہونا کیوں شروع ہوا؟ یہ سائنسی انقلاب دوسری ہزاری عیسوی کے وسط میں کیوں برپا ہوا؟ اس سے دو صدیاں قبل یا بعد میں ہی کیوں نہیں برپا ہوا؟ ہم اس بارے کچھ نہیں کہہ سکتے۔ اس ضمن میں محققین نے اپنی عادت سے مجبور۔۔۔ کئی کئی نظریے پیش کیے ہیں لیکن ان میں سے کوئی ایک بھی بھروسے کے لائق نہیں ہے۔

تاریخ میں امکانات کا دائرہ نظر۔۔۔ افق بہت ہی وسیع ہوتا ہے اور امکانات کی اکثریت، کبھی ممکن نہیں ہو پاتی۔ ہم بجا طور پر ایک ایسی تاریخ کا تصور ذہن میں لا سکتے ہیں جو یوں ہی بوجھل انداز میں ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہوتی رہی اور اس تاریخ میں سائنسی انقلاب کبھی برپا ہی نہیں ہوا۔ یہ عین ممکن تھا۔۔۔ بالکل ویسے ہی جیسے ایک ایسی تاریخ کا امکان بھی ہے جس میں عیسائیت، رومی سلطنت اور سونے چاندی کے سکے بھی نہیں ہوتے۔ تاریخ، امکانات کا گڑھ اور ممکنات کا قبرستان ہوا کرتی ہے۔

حصہ چہارم: سائنسی انقلاب

32 ایلاموگورڈو میں 16 جولائی 1945ء -5:29:53 کا آٹھ سینکڈ کے وقفے سے منظر جب پہلا ایٹمی دھماکہ کیا گیا تھا۔ ایٹمی طبیعیات دان رابرٹ اوپن ہائیمر نے اس دھماکے کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر بعد ازاں اپنی سوانح میں لکھا تھا، 'اب میں موت بن چکا ہوں۔ میں دنیاؤں کے خاتمے کا اہل ہو چکا ہوں'۔

جہالت اور بے علمی کی دریافت

فرض کریں، ایک ہسپانوی دہقان ہے۔ وہ 1000ء میں کسی بھلے دن لمبی تان کر سوتا ہے اور پھر 500 برس بعد اس کی آنکھ کھلتی ہے۔ وہ اپنے آپ ایک بندر گاہ پر پاتا ہے جہاں غل غل کرتے ملاح کولمبس کی کشتیوں نینا، پینٹا اور سانتا ماریا پر سوار ہوتے ہوئے دکھائی دے رہے ہیں۔ اسے یہ منظر دیکھ کر ہرگز حیرانگی نہ ہوتی۔۔۔ اس کے لیے دنیا ابھی تک وہیں کھڑی تھی جہاں پانچ سو برس پہلے ہوتی تھی۔ یہ درست ہے کہ اب تک ٹیکنالوجی، آداب اور سیاسی سرحدوں میں کافی بڑی تبدیلیاں آچکی تھیں لیکن بہر حال اس قرون وسطی کے دور کے دقیانوسی خیالات کے شخص کو دونوں ادوار میں کوئی بڑا فرق نظر نہ آتا۔ لیکن فرض کریں، کولمبس کی کشتی پر سوار ہونے والا کسی ملاح کی آنکھ لگ جاتی اور پھر اس کی آنکھ اکیسویں صدی میں آئی فون کی جھنجھناتی ہوئی رنگ ٹون سے کھلتی تو اس کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ جاتیں۔ وہ خود کو ایسی دنیا میں پاتا جو اس کے خواب و خیال سے بھی کہیں آگے تھی۔' کیا یہ جنت ہے؟' وہ خود سے پوچھتا اور پھر بڑبڑا کر خود ہی جواب دیتا،' کیا خبر۔۔۔ یہ جہنم ہو!'

پچھلے پانچ سو برسوں میں انسانی قوت میں بے پناہ بلکہ غیر معمولی اور بے نظیر اضافہ ہوا ہے۔ 1500ء میں دنیا کی انسانی آبادی تقریباً پچاس کروڑ نفوس پر مشتمل تھی۔ آج، پوری دنیا میں سات ارب لوگ بستے ہیں۔ 1500ء میں انسان دنیا بھر میں سالانہ قریباً 250 ارب امریکی ڈالروں (آج کی قیمت) کی مالیت کا تجارتی مال اور خدمات پیدا کر ارہا تھا۔ آج کل دنیا بھر میں انسانی پیداوار کی مالیت سالانہ تقریباً 60000 ارب امریکی ڈالروں کے برابر ہے۔ 1500ء میں انسانوں کی پوری آبادی روزانہ تقریباً 13 ہزار ارب کیلوریز روزانہ استعمال کرتے تھے جبکہ آج ہم ہر روز تقریباً 15 لاکھ ارب کیلوریز چٹ کر جاتے ہیں۔ ان اعداد و شمار پر ایک دفعہ پھر نظر دوڑائیں تو آپ کو پتہ چلے گا کہ 500 سال کے عرصے میں انسانی آبادی چودہ گنا، پیداوار 240 گنا جبکہ حراروں کا استعمال 115 گنا بڑھ چکا ہے۔

اب پھر فرض کریں کہ آج کے جدید دور کا ایک معمولی لیکن قدرے مناسب جنگی بحری جہاز کولمبس کے دور میں جا پہنچتا ہے۔ یہ بحری جہاز، چند منٹوں کے اندر اندر نینا، پنٹا اور سانتا ماریا نامی کولمبس کے جہازوں کو پاش پاش کر کے رکھ دے گا۔ یہی نہیں بلکہ یہ تن تنہا اس زمانے کی ہر سپر طاقت کے پورے پورے بحری بیڑوں کو بغیر کوئی نقصان۔۔۔ بلکہ خراش کے سمندر کی تہہ میں ڈبو دینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ آج کے دور میں پائے جانے والے اوسط درجے کے صرف پانچ جدید مال بردار بحری جہاز، اس زمانے میں دنیا کے سارے کے سارے مال بردار بحری بیڑوں پر لدے ہوئے مال کو اٹھانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ آج صرف ایک جدید کمپیوٹر نہایت آسانی کے ساتھ قرون وسطی کے دور میں پائی جانے والی ہر لائبریری کی ہر کتاب اور چرمی کاغذ کے طومار میں لکھا ہر لفظ جمع کرنے کی صلاحیت

رکھتا ہے۔۔۔ بلکہ اس کمپیوٹر میں پھر بھی خاصی مقدار میں خالی جگہ بچ جائے گی۔ آج کی جدید دنیا کے کسی بھی صرف ایک اوسط لیکن نسبتاً بڑے بینک میں جدید دور سے قبل کی ہر بادشاہت کی کل دولت سے زیادہ زر جمع رہتا ہے۔

1500ء میں پوری دنیا میں صرف چند ایسے شہر تھے جن کی آبادی تقریباً ایک لاکھ نفوس پر مشتمل ہو۔ اس زمانے میں تقریباً ساری عمارتیں گارے، لکڑی اور بھوسے سے تعمیر کی جاتی تھیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب تین منزلہ عمارت کو 'فلک بوس عمارت' سمجھا جاتا تھا۔ گلیوں سے مراد کھڈوں سے بھرپور، گرمیوں میں دھول اور سردیوں میں کیچڑ سے اٹے راستے ہوا کرتی تھی۔ ان راستوں پر پیدل لوگ، گھوڑے، بھیڑ بکریاں، مرغیاں اور چند ریڑھیاں رش بنائے رکھتی تھیں۔ اس زمانے میں سب سے عام شہری شور و غل انسانوں اور جانوروں کا ہی رہا کرتا تھا اور یہاں وہاں۔۔۔ آریاں اور ہتھوڑیاں چلتی سنائی دیتی تھیں۔ سورج غروب ہوتے ہی 'شہروں' پر تاریکی چھا جاتی تھی اور دور تک سیاہ اندھیرے میں کوئی موم بتی یا لالٹین بوجھل روشنی میں ٹمٹماتی ہوئی دکھائی دے جاتی تھی۔ اگر ایسے کسی شہر کا کوئی باسی، آج کی تاریخ میں رات کے وقت جدید ٹوکیو، نیویارک یا ممبئی میں جا نکلے تو اس کی کیا حالت ہو گی؟

سولہویں صدی سے قبل کبھی کسی انسان نے پوری زمین کا گول چکر نہیں لگایا تھا۔ 1522ء میں یہ صورتحال اس وقت بدل گئی جب میگیلان نامی پرتگالی جہاز راں 72000 کلومیٹر کا یہ گول چکری فاصلہ طے کر کے واپس سپین پر لنگر انداز ہوا۔ اس سفر کو مکمل کرنے میں اسے تین سال کا عرصہ لگا اور اس کے سبھی بحری ساتھیوں کو اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑا۔ بعد ازاں، میگیلان خود بھی اس سفر کی سختیوں کی تاب نہ لا کر جلد ہی چل بسا تھا۔ 1873ء میں جولس ورن نامی فرانسیسی ادیب کے تصور میں فلیس فوگ نامی امیر کبیر برطانوی مہم جو کے کردار کا خیال آیا تھا جو دنیا کے گرد صرف اسی دن میں چکر مکمل کرنے نکل پڑا تھا۔ آج، مڈل کلاس سے تعلق رکھنے والا کوئی بھی شخص، معقول رقم کے ساتھ نہایت آسانی اور محفوظ طریقے کے ساتھ صرف اڑتالیس گھنٹوں میں پوری دنیا کا چکر لگا سکتا ہے۔

1500ء میں انسان زمین کے ساتھ چپک کر بسر کرنے پر مجبور تھا۔ یہ درست ہے کہ اس زمانے میں آدمی کھمبے کھڑے کر کے یا پہاڑوں پر چڑھ ہی سکتے تھے لیکن آسمان۔۔۔ صرف پرندوں، فرشتوں اور خداوں کے لیے مختص تھا۔ 20 جولائی 1969ء کو انسان نے پہلی دفعہ چاند پر قدم رکھا۔ یہ صرف ایک تاریخی کامیابی نہیں تھی بلکہ یہ ارتقائی اور کائناتی کارنمایاں بھی تھا۔ پچھلے چار ارب سال پر محیط ارتقائی عمل میں۔۔۔ کوئی ایک بھی ایسا نامیاتی جسم نہیں تھا جس نے کرہ ارض کی فضاوں سے نکل کر خلا میں پہنچ حاصل کی ہو۔ ایسا تو ظاہر ہے، ہر گز کوئی نہیں تھا جس نے خلا پار کر کے چاند پر قدم رکھا ہو۔

تاریخ کے تقریباً سارے حصے میں، انسان اس کرہ ارض پر بسنے والے 99.99 فیصد نامیاتی اجسام، یعنی جرثوموں کے بارے کچھ نہیں جانتا تھا۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ جرثوموں کا انسانوں سے کوئی واسطہ، لینا دینا نہیں تھا۔ ہم میں سے ہر شخص کے جسم پر اور اندر اربوں کی تعداد میں یک خلوی جرثومے بستے ہیں اور یہ بے مقصد نہیں ہے۔ یہ جرثومے ہمارے بہترین دوست بھی ہیں اور بدترین دشمن بھی

ثابت ہوتے ہیں۔ ان میں سے بعض ہماری خوراک کو ہضم کرنے میں مدد دیتے ہیں اور انتڑیوں کی صفائی کرتے رہتے ہیں جبکہ دوسری اقسام کے جرثومے بیماریاں اور وبائیں پھیلاتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود، 1674ء میں انسانی آنکھ نے پہلی بار ان جرثوموں کا نظارہ کیا۔ انتونی وین لیونیہوک نامی ماہر حیاتیات نے گھریلو سطح پر ایجاد کردہ، دنیا کی پہلی مائیکروسکوپ میں، پانی کے ایک قطرے میں اربوں کی تعداد میں مشتمل جرثوموں کی پوری ایک دنیا کو محرک دیکھا تو اس کی حیرت آسمان کو چھونے لگی۔ اس کے بعد، اگلے تین سو برسوں میں انسانوں نے ان جرثوموں پر خوب تحقیق کی اور آج یہ خود ان جرثوموں کی نت نئی، دوست اور دشمن اقسام خود تخلیق کرنے کا اہل ہے۔ ہم نے اسی بدولت تاریخ کی چند انتہائی مضر اور ہولناک بیماریوں کو شکست دینے میں کامیابی حاصل کی ہے اور ایسے ایسے جرثومے تخلیق کیے ہیں جو ہماری طبی ضروریات کو پورا کرتے ہیں اور صنعتوں میں خوب مدد فراہم کرتے ہیں۔ آج ہم بیکٹیریا کو ادویات بنانے، حیاتیاتی ایندھن کشید کرنے اور دوسرے طفیلیوں کو ہلاک کرنے میں بے انتہا پیمانے پر استعمال کرتے ہیں۔

لیکن، ان ساری ایجادات اور ترقی سے بڑھ کر پچھلے پانچ سو برس کی محنت کا غیر معمولی اور فیصلہ کن لمحہ 16 جولائی 1945ء، عین 05:29:45 کے وقت آیا جب امریکی سائنسدانوں نے نیو میکسیکو کے علاقے ایلاموگورڈو میں پہلی بار ایٹم بم کا کامیاب تجربہ کیا۔ یہ وہ لمحہ تھا جس کے بعد انسانیت نے صرف تاریخ کا دھارا بدلنے ہی نہیں بلکہ تاریخ کو سرے سے ختم کرنے کی صلاحیت بھی حاصل کر لی۔

وہ صدیوں پر محیط تاریخی عمل جس کے نتیجے میں انسان ایلاموگورڈو اور چاند کی سطح تک پہنچا۔۔۔ اسے ہم سائنسی انقلاب کے نام سے جانتے ہیں۔ اس انقلاب کے دوران انسانیت نے سائنسی تحقیق میں وسائل خرچ کر کے بے پناہ اور نت نئی طاقتیں حاصل کیں۔ اس تاریخی عمل کو بجا طور پر انقلاب اس لیے قرار دیا جاسکتا ہے کیونکہ 1500ء تک انسانوں کو اس دنیا میں اپنی قابلیت پر ہمیشہ شک و شبہ ہی رہا تھا۔ انسان نئی طبی، عسکری اور معاشی طاقت بننے کی صلاحیت سے صرف ہچکچاتا ہی نہیں بلکہ بے یقینی کا شکار چلا آرہا تھا۔ اس زمانے میں حکومتوں اور دولتمند سرپرستوں کی جانب سے تعلیم و تربیت اور وظائف کا اجراء دراصل انسانوں کی تب دستیاب صلاحیتوں کو محفوظ بنانے کے لیے کیا جاتا تھا۔ ان کا ہرگز مقصد نت نئی ایجادات اور تجربے نہیں رہا۔ جدید دور سے قبل کے زمانے میں اگر کوئی روایتی حکمران پادریوں، فلسفیوں یا شعراء کو دولت عطا کرتا تھا تو اس کا مقصد ان اثر و رسوخ کے حامل پیشہ وروں کے ہاتھ اپنے اقتدار کو طول دلوانا اور سماجی نظام کو برقرار رکھنے میں مدد طلب کرنا ہوا کرتا تھا۔ وہ ان حضرات سے نئی دواؤں، ہتھیاروں کی ایجاد اور معاشی ترقی کی توقع نہیں رکھتا تھا۔

پچھلی پانچ صدیوں میں، تقریباً ہر روز ہی انسانوں کی اس سوچ اور یقین میں اضافہ ہوتا گیا ہے کہ سائنسی تحقیق میں سرمایہ کاری سے ان کی قابلیت اور استعداد بڑھتا ہی چلا جائے گا۔ یہ اندھا یقین اور اعتقاد نہیں تھا بلکہ یہ ایسی اٹل حقیقت تھی جو عملی اور تجرباتی طور پر ہر نئی دریافت

کے ساتھ ثابت ہورہی تھی۔ جوں جوں سائنسی تحقیق کی کامیابیوں کے ثبوت بڑھتے گئے، زیادہ سے زیادہ امراء اور حکومتیں سائنس کی دلدادہ ہوتی چلی گئیں۔ آج بھی ہم امراء اور حکومتوں کی سرمایہ کاری کے بغیر ہرگز بھی چاند پر چلنے، جرثوموں پر بادشاہی کرنے اور ایٹم کو پھاڑنے کے اہل نہیں ہوسکتے تھے۔ مثال کے طور پر امریکی حکومت نے پچھلی چند دہائیوں میں نیوکلئیر فزکس کے میدان میں تحقیق اور ایجادات پر اربوں ڈالر کی سرمایہ کاری کی ہے۔ اس تحقیق کے نتیجے میں حاصل ہونے والے علم کی بنیاد پر نت نئی طرز کے ایٹمی بجلی گھروں کی تعمیر ممکن ہوسکی ہے۔ یہ ایٹمی بجلی گھر سستی بجلی پیدا کرنے کا ذریعہ ہیں۔ یہ سستی بجلی امریکی صنعتیں استعمال کرتی ہیں اور خوب کاروبار کرتی ہیں۔ اس کاروبار اور آمدن پر امریکی حکومت کو دگنا اور چوگنا ٹیکس حاصل ہوتا ہے۔ اس ٹیکس کی آمدن میں سے کچھ رقم، ایک دفعہ پھر نیوکلئیر فزکس کی تحقیق کے لیے مختص کردی جاتی ہے تاکہ آنے والے وقت میں مزید علم حاصل ہو۔
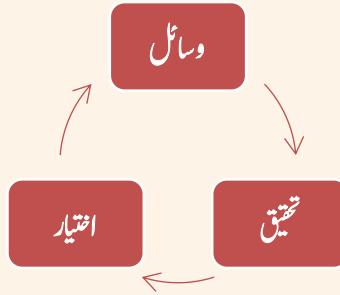
سائنسی انقلاب کا حلقہ۔ سائنس کو ترقی کرنے کے لیے تحقیق کے علاوہ بھی کچھ درکار رہتا ہے۔ اس ترقی میں سائنس، سیاست اور معیشت کا مل کر کام کرنا ضروری ہوتا ہے۔ سیاسی اور معاشی ادارے وہ وسائل فراہم کرتے ہیں جن کے بغیر سائنسی ترقی ممکن ہی نہیں ہوتی۔ ان وسائل کے بدلے میں سائنس نت نیا اختیار اور طاقت فراہم کرتا ہے۔ اس اختیار اور طاقت سے نئے وسائل حاصل ہوتے ہیں جن میں سے کچھ دوبارہ سائنسی تحقیق کے لیے استعمال کرلیے جاتے ہیں۔

لیکن سوال یہ ہے کہ آخر جدید انسانوں نے تحقیق کی مدد سے طاقت اور صلاحیت حاصل کرنے کا یہ یقین کیوں پروان چڑھایا؟ آخر سائنس، سیاست اور معاشیات میں یہ انمٹ تعلق کیسے پیدا ہوا؟ اس باب میں ہم جدید سائنس کی غیر معمولی قدرت پر نظر دوڑائیں گے، جس سے مندرجہ بالا سوالات کے پہلے حصے سے متعلق کچھ نہ کچھ پتہ چلے گا۔ اگلے دو ابواب میں ہم سائنس، یورپی سلطنتوں اور سرمایہ دارانہ معیشت کے بیچ اتفاق اور اتحاد پر بھی نظر ڈالیں گے۔

ناداں شخص

انسان نے اس کائنات کو سمجھنے کے لیے کم از کم شعور اور آگاہی کا انقلاب برپا ہونے کے ساتھ ہی کوششیں لازماً شروع کر دی تھیں۔ ہمارے اجداد اپنے وقت اور محنت کا بڑا حصہ ان اصولوں کو سمجھنے میں لگاتے تھے جن کے تحت قدرتی دنیا چلتی رہتی ہے۔ لیکن، تین ایسے تنقیدی جائزے ہیں جن کی بناء پر جدید سائنس علم گزشتہ سبھی روایات سے ہٹ کر ہے:

الف: جہالت اور بے علمی کے اعتراف پر آمادگی۔ جدید سائنس کی بنیاد ایک لاطینی امر اور تاکید پر رکھی گئی ہے۔ یہ امر ignoramus یا لفظی ترجمہ 'ہم نہیں جانتے!' ہے۔ اس امر کے تحت یہ اخذ کیا جاتا ہے کہ ہم ہر شے کے بارے میں نہیں جانتے۔ اس سے بھی زیادہ تنقیدی انداز میں سوچا جائے تو اس کا مطلب یہ اعتراف اور قبولیت ہے کہ ہم جن چیزوں کے بارے جان کر بیٹھے ہیں۔۔۔ وہ آگے چل کر، نت نئے علم کی بنیاد پر غلط بھی ثابت ہو سکتا ہے۔ یعنی، کوئی بھی تصور، فکر، گمان یا نظریہ اٹل اور نہ ہی مقدس ہے۔ ان میں سے ہر شے قابل اعتراض اور عذر ہے۔

ب: مشاہدے اور ریاضی کی مرکزیت۔ جب اپنی نادانی اور کم علمی کا اعتراف کر لیا تو جدید سائنس کا اگلا مقصد نت نئے علم کا حصول ہے۔ اس مقصد کے لیے مشاہدات کو جمع کر کے ریاضیاتی یا حتمی اوزاروں کو بروئے کار لا کر ان مشاہدات کو جامع اور مدرکہ نظریات میں ڈھال دیا جاتا ہے۔

ج: نت نئی پہنچ اور اختیارات کا حصول۔ جدید سائنس صرف نت نئے نظریات پیش کرنے پر تکیہ نہیں کرتی بلکہ ان نظریات کو عملی شکل دے کر نت نئی پہنچ اور اختیارات حاصل کرتی ہے۔ یہ پہنچ اور اختیارات، آگے چل کر نت نئی ٹیکنالوجی کو بنانے میں مدد دیتے ہیں۔ سائنسی انقلاب، علم کا انقلاب نہیں ہے بلکہ یہ تو جہالت اور بے علمی کا انقلاب ہے۔ وہ عظیم دریافت جس کی بنیاد پر سائنسی انقلاب برپا ہوا وہ جہالت کی دریافت تھی۔ وہ اس امر کی دریافت تھی کہ انسان سب سے اہم سوالات کے جواب سرے سے نہیں جانتے۔

جدید دور سے قبل علم کی روایات اسلام، عیسائیت، بدھ مت اور کنفیوشس مت وغیرہ تھیں۔ ان ساری روایات نے ہمیشہ زور دیا کہ ہر وہ شے جو دنیا کے لیے اہم اور جاننے لائق ہے۔۔۔ پہلے سے معلوم ہے۔ کئی عظیم خدا، ایک خدائے بزرگ و برتر یا ماضی کے وہ دانش مند لوگ جو ہر طرح کا علم رکھتے تھے۔۔۔ انھوں نے ہی ہم پر ہر طرح کا علم الہامی کتابوں اور زبانی روایات کی مدد سے ہم تک پہنچا دیا ہے۔ اب دنیا کے باقی سب فانی اور عام انسان انھی قدیم آیتی پیغامات اور روایات کی خوب چھان بین اور تہہ در تہہ کھوج لگا کر معنی اخذ کر کے سمجھ بوجھ میں اضافہ اور علم حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ ایک طویل عرصے تک، بلکہ آج بھی دنیا کے بعض حصوں میں یہ

خیال ہی ناقابل تصور ہے کہ انجیل، قرآن اور وید وغیرہ جیسی الہامی کتب میں کائنات کا کوئی راز بیان نہ کیا گیا ہو۔ وہ راز جو گوشت اور پوست سے بنے فانی انسانی مخلوق نے دریافت کرنے ہوں۔

علم کی قدیم روایات صرف دو طرح کی جہالت اور بے علمی کا اعتراف کرتی تھیں۔ پہلی یہ کہ ایک فرد کسی اہم شے بارے جہل یا بے علمی کا شکار ہو سکتا ہے۔ یعنی، انسان انفرادی طور پر نادان واقع ہوتا ہے۔ اس ضمن میں اگر انسانوں کو انفرادی سطح پر علم درکار ہوتا تو اس کے لیے دانش مند لوگ موجود تھے۔ وہ رہنمائی کے لیے ان دانش مندوں سے رجوع کر سکتا تھا۔ اس کے لیے، جو شے علم میں ہی نہیں ہے۔۔۔ اس کو دریافت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ مثال کے طور پر تیرھویں صدی میں کوئی یارک شائر نامی کسی گاؤں میں کوئی دہقان انسانی نسل کی ابتداء بارے جاننا چاہتا تو وہ اپنے تئیں یہ طے کر لیتا تھا کہ دراصل اس ضمن میں عیسائی روایت ہی مستند ہے اور یہی اس کا حتمی جواب ہے۔ عیسائی روایت جاننے کے لیے اس کو صرف اور صرف مقامی پادری سے رابطہ کرنے کی ضرورت تھی اور اس سے زیادہ کچھ نہیں تھا۔

دوم یہ کہ علم کی پوری روایت کسی غیر اہم شے بارے لاعلم ہو سکتی ہے۔ تعریف کی رو سے، مراد یہ ہے کہ ماضی کے عظیم خدا اور دانش مند لوگ ہیں ان چیزوں کے بارے کچھ بھی بتانے کی زحمت نہیں اٹھاتے جو غیر اہم ہوں۔ مثال کے طور پر یارک شائر کا وہی دہقان یہ جاننا چاہے کہ مکڑیاں جالا کیسے بنتی ہیں تو اس بارے کسی پادری سے استفسار کرنا بے معنی تھا۔ کیونکہ اس سوال کا کسی عیسائی روایت یا الہامی کتاب میں کوئی جواب نہیں تھا۔ تاہم، اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ عیسائیت کے علم میں کچھ کمی ہے۔ بجائے، اس کا مطلب یہ تھا کہ مکڑیوں اور ان کے جالوں بارے علم۔۔۔ غیر اہم ہوتا ہے۔ ویسے بھی، خدا بہتر جانتا ہے کہ مکڑیاں ایسا کیسے کرتی ہیں۔ اگر یہ معلومات اہم ہوتی یا اس طرح کے علم کی انسانی آسودگی اور ابدی نجات میں کوئی کردار ہوتا تو یقیناً خدا انجیل میں اس سوال کا خاطر خواہ جواب پہلے سے دے دیتا۔

عیسائیت نے کبھی لوگوں کو مکڑیوں بارے علم حاصل کرنے سے منع نہیں کیا۔ لیکن اگر قرون وسطیٰ کے دور میں کوئی مکڑیوں کے علم کا محقق گزرا بھی تھا تو اس کو سماج میں اپنی ثانوی حیثیت کا بخوبی اندازہ رہا کرتا ہو گا۔ وہ یہ بھی اچھی طرح جانتا ہو گا کہ اس کا یہ علم اور تحقیق عیسائیت کی لازوال سچائیوں سے کہیں پرے اور غیر متعلق سمجھی جاتی تھی۔ اب یہ عالم بھلے مکڑیوں ہی نہیں بلکہ تتلیوں، پتنگوں اور دوسرے حشرات بارے جتنا بھی علم جمع کر لے۔۔۔ کئی کئی دریافتیں کر لے، اس کا یہ سارا علم بے سود اور ادنیٰ تھا۔ کیونکہ یہ سماج، سیاست اور معیشت کی بنیادی حقیقتوں بارے کسی بھی طور معنی خیز نہیں تھا۔

حقیقت تو یہ ہے کہ یہ معاملات اتنے سادہ بھی نہیں تھے۔ ہر دور۔۔۔ دین دار اور قدامت پسند دور میں بھی ایسے لوگ تھے جو کئی ایسے اہم معاملات کی صاف صاف نشاندہی کرتے ہی رہتے تھے جن کے بارے رائج علم کی روایات بے بہرہ تھیں۔ لیکن اس طرح کے لوگ عام

طور پر کنارہ کش کر دیے جاتے تھے یا پھر انھیں سخت دقت کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ وہ ستائے جاتے تھے اور انھیں ایذائیں جھیلنی پڑتی تھیں۔ چند ایک مواقع پر ایسا بھی ہوا کہ ایسے لوگوں نے اپنی الگ علمی روایت قائم کر لی اور یہ دعویٰ کرنے لگے کہ دراصل وہ 'سب کچھ' جانتے ہیں جو جاننے لائق ہے۔ مثال کے طور پر اسلام کے پیغامبر محمد نے اپنی الگ مذہبی روایت کا آغاز ہی اپنے ہم عصر عربوں کی جہالت اور ربانی سچائیوں سے لاعلمی کی نشاندہی سے شروع کیا۔ وہ عربوں۔۔۔ یہاں تک کہ اپنے خاندان اور بزرگوں کو بھی اس جہالت پر سخت تنقید کا نشانہ بنانے سے نہیں چوکتے تھے۔ لیکن کچھ ہی عرصے بعد خود محمد بھی یہ دلیل پیش کرنے لگے کہ صرف وہی واحد شخص ہیں جو مکمل سچائی کا ادراک رکھتے ہیں اور اس کی خدائی آیات بھی موجود ہیں۔ جلد ہی ان کے پیروکار، محمد کو 'خاتم النبیین' قرار دے کر قطعیت دکھانے لگے۔ مراد یہ ہے کہ بعد ان آیات کے، جو محمد پر نازل ہوئیں۔۔۔ اب کسی نئی آیت اور علم کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی۔ 'دین' مکمل ہو گیا۔

آج جدید سائنس کی علمی روایت ایک منفرد اور نہایت بے مثل شے ہے۔ اس لیے کہ یہ کھلے عام اہم ترین سوالات کے جوابات سے نابلد ہونے کا کھلے عام، صاف صاف اجتماعی جہالت کا اعتراف کر لیتی ہے۔ ڈارون نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ 'خاتم حیاتیات داں' یا 'آخری ماہر علم حیاتیات' ہے اور اس نے حیات کی گتھی قطعی طور پر، ہمیشہ کے لیے سلجھادی ہے۔ آج بھی، صدیوں سے جاری وسیع اور جامع سائنسی تحقیق کے بعد حیاتیات داں کھلے دل سے اعتراف کرتے ہیں کہ ان کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں ہے کہ آخر انسانی دماغ کو شعور اور آگاہی کا ادراک کیسے ہوتا ہے؟ طبیعیات داں یہ تسلیم کرتے ہیں کہ وہ بگ بینگ کے پیچھے محرکات اور وجہ بتا پانے سے قاصر ہیں یا یہ کہ وہ ابھی تک یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ قدری میکانیات کو عمومی اضافیت کے ساتھ کیسے ہم آہنگ کیا جائے؟

اسی طرح کئی مواقع ایسے بھی آتے ہیں جب ایک دوسرے سے متضاد سائنسی نظریات نت نئے ثبوت ہاتھ آنے پر غل مچا کر مباحثوں میں دھکیل دیے جاتے ہیں۔ اس کی ایک مقبول مثال معیشت کو چلانے سے متعلق نظریات بارے آئے روز مکالموں اور مباحثوں پر بالکل صادق آتی ہے۔ انفرادی سطح پر تو ہر معیشت داں یہی سمجھتا ہے کہ اسی کا طریقہ درست ہے لیکن یہ راسخ العقیدہ اور کٹر سچائیاں ہر نئے مالیاتی بحران اور سٹاک ایکسچینج کریش کے ساتھ ہی بدل جاتا ہے اور یوں معاشیات یا اقتصادیات پر حتمی فرمان نہیں دیا جا سکتا اور سبھی متعلقہ ماہرین اس پر اتفاق کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ بھی دستیاب ثبوتوں کی بنیاد پر مخصوص نظریات کی اس قدر زور و شور اور تواتر سے حمایت کی جاتی ہے کہ ان نظریات کے علاوہ باقی سبھی خیالات طویل عرصے سے گمنامی میں چلے گئے ہیں۔ اس طرح کے نظریات کو معروضی سچ قرار دیا جاتا ہے لیکن اس کے باوجود ہر کسی کا یہ اتفاق پھر بھی باقی ہے کہ اگر مستقبل میں موجودہ 'کامل' نظریے سے متصادم ثبوت منظر عام پر آئے تو ہم اپنے خیالات

اور سمجھ بوجھ کا دوبارہ سے جائزہ لیں گے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ 'کامل' نظریہ مکمل طور پر فِق قرار پا جائے۔ اس طرح کے نظریات کی چند مثالیں ارضیات کے میدان میں ساختمانی تختیوں کا نظریہ اور انتہائی نامی گرامی حیاتیات کے میدان میں ارتقاء کے نظریات وغیرہ ہیں۔

لاعلمی اور جہل کا اعتراف کرنے پر آمادگی کا نتیجہ ہے کہ آج جدید سائنس نہایت متحرک ہے۔ یہ گزشتہ کسی بھی علمی روایت سے کہیں بڑھ کر ہمہ جہت، لچکدار اور متجسس، یعنی تحقیق پسند واقع ہوئی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اس دنیا میں چلنے والے معاملات کو سمجھنے کی انسانی سکت اور صلاحیت میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ہم نت نئی ٹیکنالوجی ایجاد کرنے کے بھی قابل ہو چکے ہیں۔ لیکن جہاں یہ، وہیں جدید سائنس نے ہمارے لیے ایک ایسا مسئلہ بھی کھڑا کر دیا ہے جو اس سے قبل ہمارے اجداد کے لیے کبھی پیدا نہیں ہوا بلکہ ان کا کبھی واسطہ نہیں پڑا تھا۔ اب چونکہ ہم یہ فرض کرتے ہیں کہ ہم ہر شے بارے نہیں جانتے بلکہ ہیں جو علم حاصل بھی ہے تو وہ سرسری، تجرباتی اور آزمائشی طور پر ان اساطیر پر مبنی ہے جس کے تحت لاکھوں کروڑوں لوگ ایک دوسرے کے ساتھ اشتراک اور تعاون کرتے ہیں۔ اب ایسے ثبوت منظر عام پر آتے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اساطیر، تصورات اور حکایتیں تو مشکوک اور قابل اشتباہ ہیں۔۔۔ تو پھر ہم اپنے سماج اور معاشرے کو اکٹھا کیسے رکھیں گے؟ پھر ہمارے گروہ، سماج، ریاستیں اور بین الاقوامی نظام کام کیسے کریں گے؟

اسی لیے آج بھی سماجی اور سیاسی نظام کو مستحکم رکھنے کے لیے جتنی بھی جدید کوششیں کی گئی ہیں، ان کے پاس سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں رہا کہ وہ مندرجہ زیل دو میں سے کسی ایک غیر سائنسی طریقہ کار پر عمل کریں:

الف۔ ایک سائنسی نظریہ لیں اور معیاری سائنسی طریقہ کار کے عین منافی یہ اعلان کر دیں کہ یہی سائنسی نظریہ قطعی اور مکمل سچ ہے۔ یہ وہ طریقہ تھا جو نازیوں اور اشتراکیت پسندوں نے استعمال کیا تھا۔ نازیوں نے اعلان کیا تھا کہ نسل پرست پالیسیاں دراصل حیاتیاتی حقائق پر مبنی تحقیق سے اخذ کی گئی ہیں۔ جبکہ اشتراکیت پسندوں نے دعویٰ کیا تھا مارکس اور لینن نے مطلق اور ہمہ گیر معاشی حقیقتیں واضح کر دیں ہیں جن میں رد و بدل کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

ب۔ سائنس کو اس سارے معاملے سے نکال کر الگ رکھ دیا جائے اور غیر سائنسی، مطلق اور قطعی سچ کے تحت بسر رکھی جائے۔ یہ وہ طریقہ ہے جو آزاد خیال انسانیت پرستوں نے اپنا رکھا ہے۔ ان کا نظریہ انسانی حقوق اور انسانی جان کی قدر و قیمت سے متعلق کٹر اور ہٹ دھرم عقیدے پر قائم ہے۔ یہ ایسا بنیادی عقیدہ ہے جس کی بنیاد میں سرے سے کوئی سائنسی ثبوت ہی نہیں ہے بلکہ یہ تو حیاتیات میں بنی نوع انسان سے متعلق ہر تحقیق سے متضاد بھی ہے۔

لیکن ہمیں یہ جان کر حیرانگی کی چنداں کوئی ضرورت نہیں ہے۔ سچ تو یہ بھی ہے کہ خود سائنس بھی ان مذہبی اور تصوراتی عقائد پر تکیہ کرتی ہے تا کہ اسے تحقیق کے لیے جواز اور وسائل دستیاب ہو سکیں۔

بہر طور، یہ بھی طے ہے کہ جدید تہذیب اور ثقافت نے جس طرح لاعلمی اور جہالت کو گلے لگانے میں آمادگی ظاہر کی ہے، اس طرح کی ماضی میں کوئی نظیر نہیں ملتی۔ اس حوالے سے یہ یاد رکھنا لازم ہے کہ آج جس چیز نے جدید سماجی نظام کو مستحکم اور یکجا رکھنے میں مدد دی ہے، وہ بھی اصل میں سائنس سے ہی متعلق ہے۔ آج دنیا بھر میں ہر جگہ، ہر معاشرے میں ٹیکنالوجی اور معیاری سائنسی طریقہ کار پر کٹر اور مذہبی عقائد کی حد تک، بلکہ بعض اوقات ان سے بھی کہیں بڑھ کر ایقان قائم ہے۔ آج صورتحال یہ ہے کہ بتدریج، سائنسی ٹیکنالوجی اور معیاری طریقہ کار نے کسی حد تک مطلق اور قطعی سچائیوں پر یقین کی جگہ لے لی ہے۔

سائنسی عقیدے اور اصول

جدید سائنس کا کوئی عقیدہ اور نہ ہی کوئی باقاعدہ اصول ہے۔ لیکن اس کے باوجود تحقیقی اسلوب اور طریقہ کار کا ایک واضح قالب بھی موجود ہے۔ یہ طریقہ کار عملی مشاہدات کو جمع کرنے کی اساس پر قائم ہے۔ عملی مشاہدات سے مراد وہ ہیں جو ہم اپنی پانچ حسوں میں سے کسی ایک کی مدد سے محسوس کر سکتے ہوں۔ ان عملی مشاہدات کو ریاضیاتی اصولوں کی مدد سے یکجا کر دیا جاتا ہے۔

تاریخ بھر میں لوگ ہمیشہ سے ہی عملی مشاہدات جمع کرتے آئے ہیں لیکن ان مشاہدات کی اہمیت عمومی طور پر محدود رہا کرتی تھی۔ تب یہ سوچ عام تھی کہ جب ہمارے پاس ہماری ضرورت کے سبھی جوابات موجود ہیں تو پھر قیمتی وسائل کو نت نئے عملی مشاہدات جمع کرنے پر کیوں ضائع کیا جائے؟ لیکن جدید دور میں لوگ یہ تسلیم کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے کہ انھیں چند انتہائی اہم سوالات کے جواب پتہ نہیں ہیں تو یہ ضروری ہے کہ مکمل طور پر نیا علم تلاش کیا جائے۔ یہ سوچ اس قدر عام ہو گئی ہے کہ آج ہر جگہ جدید سائنسی طریقہ کار کا ہر طرف ڈنکا بج رہا ہے۔ آج سائنس، پرانے زمانے میں اپنی علمی حیثیت کو یکسر بھلا چکی ہے اور جدید دور میں انسانوں کے یہاں صرف یہی طریقہ کار اپنا لینا، بہت ہی عام بات بن گئی ہے۔ اب بجائے قدیم روایات کا مطالعہ کیا جائے، آج کل زیادہ زور تازہ مشاہدات اور تجربات پر دیا جاتا ہے۔ جب کوئی جدید مشاہدہ کسی قدیم روایت کے ساتھ متصادم ہوتا ہے تو ہم جدید مشاہدے کو ہی فوقیت دیتے ہیں۔ بے شک، وہ طبیعیات داں جو دور دراز کی کہکشاؤں کے راز کھوج رہے ہیں۔۔۔ وہ ماہرین آثار قدیمہ جو ہر روز صبح جاگ کر کانسی کے زمانے کے کسی شہر کی باقیات میں نت نئی چیزیں تلاش کرتے رہتے ہیں اور وہ سیاسیات کے ماہرین جو آئے دن سرمایہ داری نظام میں نت نئی قباحتیں نکال لاتے ہیں۔۔۔ کسی بھی طور علمی روایت کی نفی نہیں کرتے۔ وہ اپنی تحقیق اور مشاہدے کا آغاز ہی اس مواد سے کرتے ہیں جو اس سے قبل، ماضی میں دانشمند لوگوں کا شیوہ رہا ہے۔ ہر علمی میدان میں ماضی کے دانشمند لوگوں کی کہی ہر بات، مشاہدات اور تحاریر کو نئی تحقیق سے قبل گویا، گھول کر پینا لازم ہے۔ لیکن ہر جگہ اور ہر کالج میں پہلے برس ہی۔۔۔ طبیعیات، آثار قدیمہ اور سیاسیات جیسے بے شمار

علمی میدانوں کے طالبعلموں یہی پڑھایا جاتا ہے کہ ان کا مقصد دستیاب علمی روایات پر عبور حاصل کرنا ہی نہیں ہے بلکہ انھیں آئن سٹائن، ھانریش شلیمان اور میکس ویبر کے علمی مشاہدات سے کہیں آگے جانے کی کوشش کرنی چاہیے۔

تاہم، یہ یاد رہے کہ زیادہ سے زیادہ مشاہدات جمع کرنے کا مطلب علم ہرگز نہیں ہے۔ کائنات کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم جمع شدہ مشاہدات کے نقطے کچھ یوں ملائیں کہ ایک جامع اور قابل فہم نظریہ ابھر کر سامنے آجائے۔ قدیم علمی روایات میں نظریات کو جامع اور قابل فہم انداز میں پیش کرنے کے لیے داستانوں، کہانیوں، قصوں اور حکایات کا سہارا لیا جاتا تھا۔ جدید سائنس میں ہم اسی مقصد کے لیے ریاضی کو استعمال کرتے ہیں۔

انجیل، قران، وید یا کلاسیکی کنفیوشس میں مساوات، ترسیمی گراف اور گنی پر مبنی حسابات نہ ہونے کے برابر تھے۔ جب روایتی اساطیر اور الہامی کتب میں عمومی اصول اور قوانین کو پیش کیا جاتا تھا تو اس مقصد کے لیے ریاضیاتی اشکال کی بجائے بیانیے کو ترجیح دی جاتی تھی۔ چنانچہ، مانویت کے مذہب میں ایک بنیادی اصول کچھ یوں زوردار بیان کی شکل اختیار کرلیتا تھا کہ۔۔۔ دنیا نیکی اور بدی کے بیچ جنگ کا میدان ہے۔ بدی کی طاقت نے مادے اور اجسام کو پیدا کیا جبکہ نیکی کی طاقت نے روح کو جنم دیا۔ انسان، انھی دونوں طاقتوں کے بیچ بٹ کر رہتا ہے اور اس کے لیے لازم ہے کہ وہ نیکی کو بدی پر ترجیح دے، وغیرہ وغیرہ۔ غور کیجیے، مانی نے اس اصول کو ریاضیاتی فورمولا یا نسخے کی صورت پیش کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی، حالانکہ انسانی مرضی سے متعلق اندازے کو دو متضاد قوتوں کے بیچ، ایک یا دوسری قوت کی سکت کے تناظر میں نہایت بھلے طریقے سے عددی انداز میں پیش کیا جاسکتا تھا۔ مانی نے یہ حساب نہیں لگایا کہ،

'آدمی پر اثرانداز ہونے والی قوت، روح کی سرعت اور اس کے جسم کی کمیت پر تقسیم ہونے کے برابر ہوتی ہے!'

سائنسدان اسی نتیجہ پر پہنچنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ 1687ء میں آئزیک نیوٹن نے ایک کتاب شایع کی تھی۔ اس کتاب کا عنوان تھا، 'قدرتی فلسفے کے ریاضیاتی اصول'۔۔۔ یہ غالباً جدید تاریخ میں لکھی گئی سب سے اہم کتاب ہے۔ نیوٹن نے حرکت اور تبدیلی سے متعلق ایک عمومی نظریہ پیش کیا تھا۔ نیوٹن کے اس نظریے کی عظمت کائنات میں ہر جسم کی حرکت سے متعلق پیشگوئی کی وضاحت کرنے کی صلاحیت تھی۔ یہ نظریہ پیڑ سے ٹپک کر گرتے ہوئے سیبوں سے لے کر دمدار ستاروں تک ہر طرح کے اجسام کی حرکت کو ریاضی کے تین نہایت سادہ اصولوں کو استعمال میں لاکر سمجھا جاسکتا تھا:

1. $\sum \vec{F} = 0$

2. $\sum \vec{F} = m\vec{a}$

3. $\vec{F}_{1,2} = -\vec{F}_{2,1}$

بعد اس کے، ہر وہ شخص جو کسی توپ کے گولے یا کسی سیارے کی حرکت بارے پیشگوئی کرنا چاہتا یا اس کی حرکت کو سمجھنا چاہتا۔۔۔ وہ نہایت سادہ طریقے سے، اس جسم (توپ کے گولے یا سیارے وغیرہ) کی کمیت، سمت، سرعت اور اثرانداز ہونے والی قوتوں کا ناپ اعداد کی شکل میں جمع کر لیتا۔ وہ ان اعداد کو نیوٹن کی مساوات میں ڈال دیتا تو اس جسم کی حرکت اور مستقبل میں مقام اور موقع کا تعین ہو جاتا۔ یہ حساب جادو کی طرح کام کرتا تھا اور بالکل درست پیشگوئی کر دیتا تھا۔ انیسویں صدی کے اواخر تک یوں ہی چلتا رہا لیکن پھر سائنسدانوں کا سامنا بعض ایسے مشاہدات سے ہوا جہاں نیوٹن کے یہ اصول فٹ نہیں بیٹھتے تھے۔ اس کے نتیجے میں طبیعیات کے علمی میدان میں اگلا انقلاب آیا اور یوں نظریہ اضافیت اور قدری میکانیات وغیرہ سامنے آئیں۔

نیوٹن نے پہلی بار ثابت کیا کہ قدرت کی کتاب کو ریاضی کی زبان میں بھی لکھا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر بعض ابواب تو صرف اور صرف ریاضی کی مساوات پر مشتمل ہے۔ یہ تو خیر طبیعیات کا قصہ ہے ورنہ جب حیاتیات، معاشیات اور نفسیات ماہرین نے نیوٹن کی ہی طرح اپنے اپنے میدان میں اسی طرح کی ریاضی اور مساوات کی زبان لاگو کرنے کی کوشش کی تو انھیں پتہ چلا، یہ سارے میدان اس قدر پیچیدہ ہیں کہ اس طرح کی کوشش بے سود ہو گی۔ تاہم، اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ ان علمی میدانوں نے ریاضی کو سرے سے چھوڑ دیا۔ 250 برس پہلے، ریاضی کی ایک نئی شاخ ایجاد ہوئی۔ اس شاخ کی مدد سے حقیقت کے پیچیدہ پہلوؤں پر بھی صرف نظر ہو سکتی تھی۔ ریاضی کی اس شاخ کو ہم شماریات کے نام سے جانتے ہیں۔

شماریات کا قصہ کچھ یوں ہے کہ 1744ء میں سکاٹ لینڈ سے تعلق رکھنے والے الیگزینڈر ویبسٹر اور رابرٹ ویلس نامی دو پریسبیٹیرین پادری تھے۔ ان دونوں نے زندگی کا بیمہ کرنے والے ایک ایسا فنڈ شروع کرنے کا فیصلہ کیا جس کا مقصد دوران سروس انتقال کر جانے والے پادریوں کی بیواؤں اور یتیموں کے لیے پنشن کی صورت کفالت کا انتظام کرنا تھا۔ اس ضمن میں ان دونوں نے یہ تجویز دی کہ چرچ کا ہر پادری باقاعدگی سے اپنی آمدن کا تھوڑا سا حصہ اس فنڈ میں جمع کروائے گا۔ فنڈ اس جمع ہونے والی رقم کو سرمایہ کاری میں استعمال کرے گا۔ اگر کوئی پادری انتقال کر جاتا تو اس کی بیوہ کو باقاعدگی کے ساتھ اس فنڈ کے منافع سے حصہ ملتا رہتا۔ یوں، وہ اپنی باقی زندگی اطمینان اور آسودگی سے بسر کر سکتی تھی اور بچوں کی کفالت آرام سے ہو جاتی۔ لیکن یہاں ایک مسئلہ تھا۔ سب سے پہلے تو یہ کہ ان دونوں کو یہ طے کرنا تھا کہ آخر ہر پادری، اپنی آمدن کا کتنا حصہ فنڈ میں جمع کروائے تا کہ یہ فنڈ خوش اسلوبی سے اپنے ذمہ تقاضے پر پورا اترے۔ اس کے علاوہ ویبسٹر اور ویلس کو یہ اندازہ بھی لگانا تھا کہ ہر سال کتنے پادری انتقال کریں گے، ان کے اہل خانہ میں کتنی بیوائیں اور یتیم بچے ہوں گے اور آخر یہ بیوائیں۔۔۔ اپنے شوہر کی موت کے بعد کتنے برس تک جئیں گی؟

اب یہاں نوٹ کیجیے، ان دونوں پادریوں نے اس پیچیدہ سوال کا جواب تلاشنے کے لیے کیا نہیں کیا؟ سب سے اول، اس سوال کا جواب حاصل کرنے کے لیے انھوں نے خدا کے حضور گڑگڑا کر دعا نہیں کی۔ انھوں نے اس سوال کا جواب مقدس الہامی کتب میں

بھی تلاش نہیں کیا اور نہ ہی کسی قدیم عالم دینیات کی لکھی کتابوں میں جواب ڈھونڈا۔ اسی طرح، اس سوال کا جواب تلاش کرنے کے لیے کوئی تجریدی اور فلسفیانہ مباحثے کا اہتمام بھی نہیں کیا۔ سکاٹ لینڈ کے باسی عملیت پر یقین رکھتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے اس پیچیدہ مسئلے کا حل تلاش کرنے کے لیے ایڈن برگ کی یونیورسٹی میں ریاضی کے ایک پروفیسر، کولن مک لورین سے رابطہ کیا۔ ان تینوں نے مل کر لوگوں کی طوالت عمر اور اموات سے متعلق ڈیٹا اکٹھا کیا اور ایک اوسط سال میں انتقال کرنے والے پادریوں کی تعداد کا حساب لگالیا۔

ان کا یہ کامیابی، اس زمانے میں شماریات اور امکانیات کے میدان میں ہونے والی شہرہ آفاق دریافتوں کی مرہون منت تھی۔ بالخصوص، جیکب برنولی کے 'کثیر اعداد کے قانون' نے تو بہت زیادہ مدد دی۔ برنولی نے ایک ایسا اصول مرتب کیا تھا جس کے تحت، چونکہ بعض مخصوص یا مجرد واقعے۔۔۔ جیسے کسی فرد کی موت کی پیشگوئی کرنا ناممکن تھا تو اس صورت میں اگر ایسے کئی واقعات، مراد کثیر تعداد میں رونما ہونے والے ایسے ہی دوسرے واقعات کو جمع کر کے اوسط نکال لی جائے تو ٹھیک ٹھیک، بالکل صحیح پیشگوئی کی جا سکتی ہے۔ اب، اس مقصد کے لیے ظاہر ہے مک لورین ریاضی کو استعمال کر کے یہ تو نہیں بتا سکتا تھا کہ کیا ویبسٹر اور ویلس اگلے برس انتقال کر جائیں گے۔۔۔ لیکن وہ یہ ضرور کر سکتا تھا کہ فراہم کردہ ڈیٹا (کثیر اعداد) کو استعمال کر کے ویبسٹر اور ویلس کو یہ ضرور بتا سکتا تھا کہ پورے سکاٹ لینڈ میں اگلے برس ایک درست اندازے کے مطابق کل تقریباً کتنے پر سبیٹیرین پادری انتقال کر سکتے ہیں۔ خوش قسمتی سے، ان سکاٹ لینڈ کے پریبیٹیرین چرچ کے پاس مطلوب ڈیٹا، یعنی پادریوں کی طوالت عمر اور تاریخ پیدائش اور انتقال کا کثیر اعدادی اور قابل استعمال ڈیٹا دستیاب تھا۔ اس ضمن میں رجسٹرار کے دفتر میں پچھلے پچاس برس کا ڈیٹا، جدول کی شکل میں بھی مل گیا۔ یہ جدول، ایڈمنڈ ہالے کی کاوش تھی جو سکاٹ لینڈ کے رجسٹرار استعمال کرتے آئے تھے۔ ہالے نے جرمنی کے شہر بریسلو کے ریکارڈ میں سے پیدائش اور اموات کی عددی معلومات حاصل کر کے یہ جدول ایجاد کیا تھا۔ بہر حال، ہالے کے اس جدول کی مدد سے یہ جاننا ممکن تھا کہ مثال کے طور پر اگر اگلے برس میں ایک بائیس برس کی عمر کے نوجوان کا امکان اگر سو میں سے ایک تھا تو وہیں پچاس برس کے ایک ادھیڑ عمر شخص کا اسی برس میں مرنے کا امکان انتالیس میں سے ایک تھا۔

بہر حال، جب ویبسٹر اور ویلس نے مک لورین کی مدد سے ان کثیر اعداد کو عمل سے گزار لیا تو انھیں پتہ چل گیا کہ اوسطاً، ہر وقت کل 930 پادری اپنی خدمات فراہم کرتے ہیں اور اوسطاً ہر برس ستائیں پادری انتقال کر جاتے ہیں۔ مزید یہ کہ اوسطاً ان میں سے اٹھارہ پادری ایسے ہوتے ہیں جن کے لواحقین میں بیوائیں بھی ہوتی ہیں۔ اوسطاً پانچ ایسے پادری ہوتے ہیں جن کی بیوائیں تو نہیں لیکن یتیم بچے رہ جاتے ہیں اور اوسطاً دو پادری ایسے ہوتے ہیں جن کے لواحقین میں بیواؤں کے ساتھ ساتھ سولہ سال کی عمر سے کم بچے بھی شامل ہوتے ہیں۔ اس ڈیٹا پر انھوں نے مزید حساب لگا کر یہ بھی پتہ کر لیا کہ اوسطاً بیوائیں کس عمر یا کتنے عرصے میں انتقال کر جاتی ہیں یا دوسری شادی

کر لیتی ہیں۔ ان میں سے ہر دو صورت، پنشن کی ادائیگی بند ہو جاتی تھی۔ ان اعداد و شمار کی مدد سے ویبسٹر اور ویلس یہ طے کرنے کے قابل ہو گئے کہ ہر پادری کو ہر سال اپنی آمدن کا کتنا حصہ فنڈ کے لیے وقف کرنا پڑے گا تا کہ بعد از موت ان کے پیاروں کی کفالت ممکن ہو سکے۔ انھوں نے طے کر لیا کہ اگر ہر پادری ہر سال اپنی آمدن میں سے دو پاونڈ، بارہ سینٹ اور دو ڈائم فنڈ میں جمع کرواتا رہے تو بعد از موت، اس کے لواحقین کو ہر برس دس پاونڈ کی پنشن ادا کی جا سکتی ہے۔ دس پاونڈ اس زمانے میں اچھی خاصی رقم ہوتی تھی۔ لیکن اگر کوئی پادری یہ سمجھتا ہے کہ یہ اس کے لیے کافی نہیں ہے تو وہ بے شک زیادہ، یعنی ہر برس چھ پاونڈ، گیارہ سینٹ اور تین ڈائم فنڈ میں جمع کروا کے بعد از موت اپنے خاندان کے لیے پچیس پاونڈ فی برس کی معقول ادائیگی کو بھی یقینی بنا سکتا تھا۔

ان کے حساب کتاب کے مطابق پیشگوئی پر مبنی ایک اندازہ یہ بھی لگایا گیا کہ 1765ء میں اس فنڈ کے اکاونٹ میں ہر قسم ادائیگیوں کے بعد بھی تقریباً 58,348 پاونڈ کی خطیر رقم جمع ہو گی۔ ان کا یہ اندازہ حیران کن طور پر بالکل سچ ثابت ہوا۔ جب 1765ء میں اکاونٹ کی رپورٹ آئی تو پتہ چلا، اس فنڈ میں 58,347 پاونڈ جمع تھے۔ یہ اولین اندازے سے صرف ایک پاونڈ کم تھا۔ یہ واقعی حیران کن تھا اور مثال یہ تھی کہ یہ اندازے حبقوق، یرمیاہ اور سینٹ جان کے علاوہ ہر پیغمبر کی پیشگوئیوں سے کہیں بہتر اور بالکل درست ثابت ہوئے تھے۔ آج، ویبسٹر اور ویلس فنڈ جسے 'سکاٹش وڈوز' کے نام سے جانا جاتا ہے، دنیا کی ایک بہت بڑی پنشن اور انشورنس کمپنی ہے۔ اس کے اثاثوں کا تخمینہ تقریباً سوارب پاونڈ تک لگایا گیا ہے اور اب یہ صرف پادریوں اور سکاٹش بیواوں کی ہی نہیں بلکہ دنیا بھر میں ہر اس شخص کو پنشن اور انشورنس کی سہولیات فراہم کرتی ہے، جو اس کمپنی کی پالیسیاں خریدنے میں دلچسپی رکھتا ہو۔

جس طرح ان دو پادریوں نے امکانات کا اندازہ لگایا، یہ آگے چل کر صرف ایک بیمہ دار نظریاتی سائنس نہیں رہی بلکہ یہ عملی طور پر پنشن اور انشورنس کے کاروبار کا بنیادی جز بھی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ، یہ مردم نگاری اور آبادیات میں بھی وسیع پیمانے پر استعمال ہونے والا عملی نظریہ ہے۔ تاہم، مردم نگاری اور آبادیات ایک دوسرے پادری، تھامس رابرٹ مالتھس کی ایجاد تھی۔ مردم نگاری اور آبادیات کی یہ سائنس بعد ازاں چارلس ڈارون (یہ بھی ایک پادری تھا) کے نظریہ ارتقاء پر مبنی علمی کام کی بنیاد بھی بن گیا۔ اب چونکہ ریاضی کی ایسی کوئی مساوات اور مسئلہ دستیاب نہیں تھا جس کے تحت کسی مخصوص نامیاتی جسم کا مخصوص حالات میں ارتقاء کا اندازہ لگایا جا سکتا تو اسی لیے ماہر جینیات نے امکانیات پر مبنی حساب کتاب کو ایک بڑی آبادی میں کسی مخصوص تبدل اور تغیری امکان کا تعین کرنے کے لیے خوب استعمال کیا۔ یہ تو صرف ایک مثال ہے ورنہ دیکھتے ہی دیکھتے امکان یا احتمال پر مبنی ایسے بیسیوں ماڈل نکل آئے اور معاشیات، سماجیات، نفسیات، سیاسیات اور طرح طرح کے دوسرے سماجی اور قدرتی علمی میدانوں کا مرکزی خاکہ بن گئے۔ یہاں تک کہ طبیعیات جیسے خالص ریاضیاتی میدان میں بھی احتمالی خاکے استعمال کرنا پڑے۔ وہ یوں کہ نیوٹن کی حرکیاتی مساوات، جب ریاضی کے مسائل

سے دو چار ہوئیں تو قدری میکانیات نامی نظریوں ثابت کرنے کے لیے ریاضی کے مسائل نہیں بلکہ شماریات کے امکانی ماڈلوں کی مدد لینی پڑی تھی۔

اگر ہم تعلیم و تربیت کی تاریخ پر صرف سرسری نظر بھی دوڑائیں تو ہمیں واقعی اندازہ ہو جائے گا کہ اس عمل نے ہمیں کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔ تاریخ بھر میں یہ صورتحال رہی ہے کہ ریاضی کو صرف ایک ایسا دقیق اور مخفی میدان سمجھا جاتا رہا ہے کہ پڑھے لکھے لوگ بھی اس کے سنجیدہ مطالعے کو شاز و نادر خاطر میں لاتے تھے۔ قرون وسطی کے دور میں یورپ اور باقی دنیا۔۔۔ صرف منطق، گرائمر، خطابت اور انشاء پر وردی جیسے میدانوں کو ہی علم و تربیت کا حاصل سمجھتی آئی تھی۔ ریاضی کا تو یہ حال تھا کہ اسے صرف گنتی اور اعداد کی بنیادی جمع منفی، ضرب اور تقسیم کے علاوہ جیومیٹری کا محدود علم سمجھا جاتا تھا۔۔۔ صرف انھی چیزوں کا عملی طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ اس زمانے میں شماریات کا مطالعہ کرنے والا کوئی بھی نہیں تھا۔ یہ وہ دور تھا جب سائنس کی اماں ریاضی نہیں بلکہ دینیات ہوا کرتی تھی۔

آج علم خطابت، علم انشاء اور منطق وغیرہ فلسفے کے میدان تک محدود ہو کر رہ گئے ہیں جبکہ دینیات صرف مذہبی مکتبوں اور مدرسوں میں ہی چند لوگ پڑھتے ہیں۔ اب زیادہ سے زیادہ لوگ ریاضی پڑھنے پر مائل ہوتے ہیں جبکہ جو مائل نہ ہوں۔۔۔ ان بچوں کو یہ زبردستی پڑھائی جاتی ہے۔ یہ وہ دور ہے جب 'کامل سائنسی علوم' انتہائی پر کشش ہو چکے ہیں۔ یہاں کامل سائنس سے مراد، ریاضی کے اصول ہیں۔ ان سے ہرگز مراد سائنس کی کاملیت نہیں ہے۔ اب تو یہ صورتحال ہے کہ وہ میدان جو کبھی ادب اور فلسفے کا میدان سمجھے جاتے تھے۔۔۔ مثلاً لسانیات اور نفسیات وغیرہ بھی آئے روز، پہلے سے کہیں بڑھ کر ریاضی کے انھی کامل اصولوں کی مدد سے خود کو 'کامل سائنسی علم' ثابت کرنے کی دوڑ میں لگے رہتے ہیں۔ شماریات کے کورس، صرف طبیعیات اور حیاتیات ہی نہیں بلکہ نفسیات، سماجیات، معاشیات اور سیاسیات وغیرہ میں بھی بنیادی اور لازمی سمجھے جاتے ہیں۔

مثلاً، ہماری یونیورسٹی میں نفسیات کے شعبے میں پڑھائے جانے والے کورس کی فہرست میں سب سے پہلا مضمون ہی 'شماریات کا تعارف اور نفسیات میں تحقیق کے طریقے' ہے۔ نفسیات کے شعبے میں سال دوم کے طلباء کے لیے 'نفسیات کی تحقیق میں شماریاتی طریقے' نامی مضمون پڑھنا لازم ہے۔ اگر آج کنفیوشس، گوتم بدھ، عیسی اور محمدؐ کو یہ پتہ چلے کہ انسانی دماغ اور اس کو لاحق علالتوں اور دکھوں کا علاج سمجھنے کے لیے سب سے پہلے ریاضی کی شاخ شماریات پڑھنا لازم ہے تو سوچیں۔۔۔ ان کے تحیر اور حیرت زدگی کی انتہا کیا ہو گی؟

علم بڑی طاقت ہے

زیادہ تر لوگوں کو جدید سائنس ہضم نہیں ہوتی کیونکہ اس کی ریاضیاتی زبان کو سمجھنا ہمارے دماغ کے لیے قدرے مشکل ہوتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس کی کئی ایسی دریافتیں بھی ہیں جو ہمارے عام فہم اور عقل سلیم سے تضاد کھاتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ آپ خود ہی سوچیے، آج دنیا کی سات ارب کی آبادی میں کتنے لوگ ہیں جو قدرتی میکانیات، خلوی حیاتیات اور کلاں اقتصادیات کی واقعی سمجھ بوجھ رکھتے ہیں؟ لیکن اس کے باوجود سائنس بے انتہا درجے کا اثر و نفوز۔۔۔ خوف شہرت اور عزت کی حامل ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی دریافتوں کے سبب ہر انسان کو بے پناہ طاقت اور اختیار مل گیا ہے۔ ملکوں کے صدور اور دنیا کے کسی بھی ملک کی افواج کے جرنیل نیوکلئیر فزکس کی سمجھ بوجھ تو نہیں رکھتے لیکن انھیں یہ اچھی طرح پتہ ہے کہ ایک ایٹمی بم کیا کر سکتا ہے؟ اسی طرح، ایک عام آدمی موبائل فون میں برقی بورڈ کی تفصیلات کو تو نہیں سمجھتا لیکن وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ موبائل فون کیا کیا کرشمے دکھا سکتا ہے۔

1620ء میں فرانسس بیکون نے ایک سائنسی منشور شایع کیا تھا۔ اس کا عنوان تھا، 'نیا اوزار!'۔ اس منشور میں دلیل پیش کی گئی تھی کہ، 'علم بڑی طاقت ہے!'، اس سے مراد یہ ہے کہ کسی بھی علم کا اصل امتحان یہ نہیں ہوتا کہ وہ سچا ہے یا نہیں۔۔۔ بلکہ اس کا اصل امتحان تو یہ ہے کہ کیا وہ مخصوص علم ہمیں طاقت اور اختیار عطا کرتا ہے یا نہیں؟ سائنسدان عام طور پر اسی مفروضے پر قائم رہتے ہیں کہ کوئی بھی نظریہ سو فیصد درست نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ اب 'سچائی' علم کے معیار کا ایک انتہائی بودا اور دقیانوسی پیمانہ بن کر رہ گیا ہے۔ علم کا اصل امتحان اس کی افادیت یعنی سود مندی ہے۔ ایک ایسا نظریہ جو ہمیں نت نئی چیزیں بنانے اور کام کرنے کی صلاحیت عطا کرے، دراصل وہی اصل علم ہے۔

پچھلی کئی صدیوں سے سائنس نے ہمیں کئی نئے اوزار فراہم کیے ہیں۔ ان میں سے بعض دماغی اوزار بھی ہیں جن کی مدد سے ہم شرح اموات اور معاشی ترقی کی شرح وغیرہ کی پیشگوئی کر سکتے ہیں۔ ان سے بھی زیادہ اہم ٹیکنالوجی کے اوزار ہیں۔ آج سائنس اور ٹیکنالوجی کے بیچ تعلق اتنا گہرا ہو چکا ہے کہ زیادہ تر لوگ ان دو شعبوں میں سرے سے کوئی فرق ہی نہیں دیکھ پاتے بلکہ ایک ہی چیز سمجھا جاتا ہے۔ ہم عام طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ سائنسی تحقیق کے بغیر نئی ٹیکنالوجی ایجاد کرنا ممکن ہی نہیں ہے اور اگر کوئی سائنسی تحقیق، نت نئی ٹیکنالوجی بنانے میں براہ راست مدد نہیں دے سکتی تو وہ انتہائی تھڑی ہوئی بیکار اور بے مصرف ہوتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے بیچ یہ تعلق حالیہ دور کا شاخسانہ ہے۔ 1500ء سے قبل سائنس اور ٹیکنالوجی دو بالکل مختلف علمی میدان ہوا کرتے تھے۔ جب سترھویں صدی میں بیکن نے ان دونوں کو جوڑ کر دکھایا تو یہ ایک انقلابی تصور بن گیا۔ سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں یہ تعلق اور بھی گہرا ہوتا چلا گیا لیکن ان کے بیچ اصل بندھن انیسویں صدی میں قائم ہوا۔ بلکہ، 1800ء تک بھی دنیا

کے زیادہ تر حکمران جنھیں مضبوط افواج درکار ہوتی تھیں۔۔۔یا وہ بڑے بڑے تاجر جو ایک کامیاب تجارتی کاروبار کے خواہشمند رہا کرتے تھے۔۔۔وہ بھی طبیعیات،حیاتیات اور معاشیات میں سائنسی تحقیق کو منہ نہیں لگاتے تھے اور نہ ہی اس میں سرمایہ کاری پر راضی تھے۔

یہاں،یہ ہرگز مراد اور دعوی یہ نہیں ہے کہ اس طرز میں استثناء نہیں ہے۔ کوئی بھی اچھا تاریخ دان،ہر طرح کی شے کا نمونہ اور نظیر ڈھونڈ کر لاسکتا ہے۔لیکن بہترین تاریخ دان وہ ہوتے ہیں جو یہ سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہوں یہ نمونے اور نظیریں،دراصل تجسس اور شوق تحقیق ہے جو بڑی تصویر کو دھندلا سکتا ہے۔تو عمومی سطح پر اگر بات کی جائے تو جدید دور سے قبل کی دنیا میں حکمران اور تجارت سے منسلک لوگ کائنات کی سمجھ بوجھ بڑھانے والی سائنسی تحقیق کو اس لیے سرمایہ فراہم نہیں کرتے تھے کہ اس کے نتیجے میں نت نئی ٹیکنالوجی ترقی پا سکے گی۔حکمران ان تعلیمی اداروں کے لیے خزانے کا منہ کھول دیتے تھے جو سلطنت میں روایتی علوم پر تحقیق کرکے پڑھاتے تھے تاکہ سیاسی اور سماجی نظام کو طول اور استحکام فراہم کیا جاسکے۔

یہاں اور وہاں۔۔۔اکادکا صورتوں میں نئی ٹیکنالوجی بھی دریافت ہو ہی جاتی تھی لیکن یہ عام طور پر ان پڑھ ہنرمندوں کا کرشمہ ہوتا تھا۔ایک منظم اور باقاعدہ سائنسی تحقیق کے ماہرین کا اس ضمن میں کوئی ہاتھ نہیں ہوتا تھا۔مثال کے طور پر ہتھ ریڑھیاں بنانے والے ہنرمند، سالہا سال تک ایک ہی انداز اور ایک ہی جیسے خام مال سے ایک ہی جیسی ہتھ ریڑھیاں بنا بنا کر بیچتے رہتے تھے۔اس زمانے میں کسی ہنرمند نے اپنے سالانہ منافع کا ایک حصہ ہتھ ریڑھی کے نت نئے ماڈل بنانے کے لیے،جدت طرازی اور تحقیق کے لیے کبھی مختص نہیں کیا ہوگا۔ہتھ ریڑھیوں کے ڈیزائن بعض دفعہ بہتر ہو جاتے تھے لیکن عام طور پر یہ کسی ایسے ترکھان کی ہوشیاری کا نتیجہ ہوتا تھا جس نے کبھی کسی مدرسے اور جامعہ میں قدم نہیں رکھا تھا بلکہ وہ تو بنیادی پڑھائی اور لکھائی سے بھی نابلد ہوتا تھا۔

یہ حکومتی اور نجی۔۔۔دونوں طرح کے شعبوں پر صادق تھا۔آج جدید ریاستوں میں یہ رواج بہت عام ہے کہ وہ سب سے پہلے اپنے سائنسدانوں کو طلب کرتے ہیں اور ان کی ہدایات کے مطابق،قومی پالیسیوں کے ہر حصے میں حل تجویز کیے جاتے ہیں۔توانائی کے شعبے سے لے کر صحت۔۔۔یہاں تک کہ کوڑے کرکٹ کو ٹھکانے لگانے کے طریقے ڈھونڈنے کے لیے بھی سائنس کی خدمات لی جاتی ہیں۔قدیم دور کی بادشاہتوں میں ایسا کوئی رواج نہیں تھا۔تب اور آج کے زمانے میں جو واضح فرق نظر آتا ہے،وہ اسلحہ سازی کے شعبے میں نہایت واضح اور عیاں طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔امریکہ کے چونتیویں صدر ڈیوائٹ ڈی آئزن ہاور نے 1961ء میں اقتدار چھوڑا تو اپنے الوداعی خطاب میں عسکری اور صنعتی شعبوں کے بیچ بڑھتی ہوئی مطابقت اور طاقت پر سخت تشویش کا اظہار کیا لیکن وہ اپنے اس مساوات میں ایک انتہائی اہم حصہ صاف صاف گول کر گئے۔اصولی طور پر،آئزن ہاور کو چاہیے تھا کہ وہ اپنی قوم کو عسکری،صنعتی اور سائنسی شعبوں کے بیچ مطابقت اور بڑھتی ہوئی طاقت کی پیچیدگیوں سے متنبہ کرتے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ آج کے دور میں جنگ،سائنسی پیداوار سے

لڑی جاتی ہیں۔ آج دنیابھر کی افواج انسان کی سائنسی تحقیق اور ٹیکنالوجی کی ترقی کا ایک بہت بڑا حصہ عسکری اور دفاعی شعبے کو بہتر بنانے کے لیے مختص کر کے بیٹھی ہیں۔

جب پہلی جنگ عظیم خندقوں کے لامتناہی سلسلے میں پہنچ کر گارے میں پھنس گئی تو دونوں فریقین نے اپنے اپنے ملک کے سائنسدانوں کو طلب کیااور ان سے اس تعطل کو ختم کر کے قوم کی مدد کرنے کی اپیل کی۔ سفید لیب کوٹ پہنے سائنسدانوں نے بھی اس موقع پر لبیک کہااور کام میں جت گئے۔ جلد ہی لیبارٹریوں میں سے طرح طرح کی نت نئی ٹیکنالوجی پر مبنی حیرت انگیز ہتھیار وقت کی تیزندی میں آگے پیچھے بہتے ہوئے نکلنے لگے۔ جنگجو ہوائی جہاز، زہریلی گیسیں، ٹینک، آبدوزیں اور طرح طرح کی نت نئی اور نہایت موثر مشین گنیں، توپیں، رائفلیں اور بم وغیرہ اسی چند سالہ مختصر عرصے کی یادگار ہیں۔

33: جرمن وی ٹو راکٹ چلانے کے لیے تیار کھڑا ہے۔ اس کی مدد سے اتحادیوں کو شکست تو نہیں دی جا سکی لیکن نازی جرمن جنگ عظیم کے آخری دم تک ایسے ہی کسی ٹیکنالوجیکل معجزے کے انتظار میں رہے۔

سائنس نے دوسری جنگ عظیم میں تو پہلے سے بھی کہیں بڑھ کر کردار ادا کیا۔ 1944ء کے اواخر تک جرمنی جنگ ہار رہا تھا بلکہ اس کی شکست طے ہو چکی تھی۔ وہ یوں کہ اس سے ایک سال قبل جرمنی کے بڑے اتحادیوں یعنی اطالویوں نے مولینی کو ہٹا کر امریکہ اور اس کے اتحادیوں کے سامنے ہتھیار پھینک دیے تھے۔ لیکن جرمنی نے امریکہ، برطانیہ اور سوویت افواج کے سر پر پہنچ آنے کے باوجود بھی

جنگ جاری رکھی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ جرمن افواج اور شہریوں کو یہ امید لگی ہوئی تھی کہ جرمن سائنسدان اس لہر کو 'معجزاتی ہتھیاروں' جیسے وی ٹو راکٹوں اور جنگی جیٹ طیاروں کی مدد سے پلٹانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

جس وقت جرمن راکٹ اور جیٹ طیارے ایجاد کرنے میں مشغول تھے، امریکہ میں مین ہیٹن پراجیکٹ کامیابی کے ساتھ ایٹم بم ایجاد کر چکا تھا۔ 1945ء میں اگست کے مہینے میں جس وقت تک یہ بم چلانے کو تیار ہوا، تب تک جرمنی پہلے ہی ہتھیار ڈال چکا تھا۔ لیکن دنیا کے دوسرے کونے پر جاپانی ابھی تک جنگ لڑ رہے تھے اور کسی طور پیچھے ہٹنے کو تیار نظر نہیں آتے تھے۔ امریکی افواج کے لیے جاپانی جزائر پر حملہ کرنا ناگزیر ہو چکا تھا۔ جاپانی پرعزم تھے اور موت تک لڑنے کو تیار بیٹھے تھے۔ جاپانیوں کے تیور اور روایت کو دیکھا جاتا تو اس دھمکی اور اندیشے میں ذرہ برابر شک کی گنجائش نہیں تھی۔ امریکی جرنیلوں نے صدر ٹرومین کو بریفننگ میں صاف صاف بتا دیا تھا کہ جاپان کے آبائی جزائر پر حملے کے نتیجے میں تقریباً دس لاکھ امریکی فوجیوں کی ہلاکت ہو گی اور جنگ کم از کم ایک برس مزید طویل ہو سکتی ہے۔ چنانچہ ٹرومین نے یہ نیا ایٹمی ہتھیار جاپانیوں پر استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ دو ہفتوں اور دو ایٹم بم گرانے کے بعد جاپان نے غیر مشروط طور پر ہتھیار پھینک دیے اور جنگ عظیم دوم اپنے اختتام کو پہنچ گئی۔

لیکن سائنس صرف جارحیت سے متعلق نہیں ہے۔ یہ ہمارے دفاع میں بھی اہم کردار ادا کرتی ہے۔ آج امریکیوں کی اکثریت یہ سمجھتی ہے کہ دہشت گردی کا حل سیاسی نہیں بلکہ ٹیکنالوجی میں چھپا ہے۔ یہ مانا جاتا ہے کہ کروڑوں ڈالر کا سرمایہ نینو ٹیکنالوجی کی صنعت میں تحقیق پر لگایا جائے تو امریکیوں کے ہاتھ برق حیاتی مکھیاں ہاتھ آ جائیں گی۔ ان برق حیاتی مکھیوں میں افغانستان کے غاروں، یمن کے مورچوں اور شمالی افریقہ کے پڑاو میں کھلا چھوڑ دیں۔ جب یہ ہو جائے تو اسامہ بن لادن کی القاعدہ چائے کی ایک پیالی بھی پئیں گے تو۔۔۔ چائے ختم ہونے سے پہلے ہی اس کی خبر سی آئی اے کے ہیڈ کوارٹر میں پہنچ چکی ہو گی۔ اسی طرح دماغی تحقیق پر بھی کروڑوں کا سرمایہ لگائیں اور ہر ائیرپورٹ پر جلد ہی ایسے سیکنر نصب ہو جائیں گے جن سے فوراً لوگوں کے ذہن میں پھرتے ہوئے نفرت اور غصے پر مبنی سوچیں سامنے آ جائیں گی۔ لیکن کیا اس سے مسئلہ حل ہو جائے گا؟ کسی کو خبر نہیں ہے۔ کیا برق حیاتی مکھیاں اور سوچ پر دسترس حاصل کرنے والے سکینر ایجاد کرنا دانشمندی ہو گی؟ یہ ضروری نہیں ہے۔ یہ بحث تو چلتی ہی رہے گی لیکن جب آپ یہ تحریر پڑھ رہے ہیں۔۔۔ امریکہ کی وزارت دفاع پہلے سے ہی کروڑوں ڈالر کا سرمایہ نینو ٹیکنالوجی کی صنعت اور دماغ پر تحقیق کے اداروں پر خرچ کر رہا ہے۔ اس کا مقصد ایسی نت نئی ٹیکنالوجی اور دوسری طرح طرح کی دریافتیں کرنا ہے۔

نت نئی رائفلوں سے لے کر ٹینکوں اور ایٹم بموں سے لے برق حیاتی مکھیوں تک۔۔۔ عسکری ٹیکنالوجی سے یہ لگاو اور دل و دماغ پر اس کا تسلط، حیران کن طور پر حالیہ دور کا مظہر ہے۔ انیسویں صدی تک، عسکری شعبے میں جتنے بھی انقلابی اقدامات دیکھے گئے ہیں، ان کا تعلق ٹیکنالوجی سے نہیں بلکہ تنظیم اور جمعیت سے ہوا کرتا تھا۔ جب ایک دوسرے سے بیگانی تہذیبوں کو پہلی بار ایک دوسرے کے قریب

آنے، ٹکرانے کا موقع ملا تو اس وقت بھی ٹیکنالوجی کا کردار کبھی کبھار ہی دیکھنے کو ملتا تھا۔ وہ یوں کہ تاریخ کی تقریباً سبھی سلطنتیں ٹیکنالوجی کی جادوگری کے سبب سرفراز نہیں ہوئیں بلکہ ان سلطنتوں کے حکمران تو ٹیکنالوجی میں ترقی کو سرے سے خاطر میں بھی نہ لاتے تھے۔ عربوں کی اسلامی سلطنت نے فارسیوں کی ساسانی سلطنت کو اس لیے شکست نہیں دی کہ عربوں کے پاس بہتر تیر کمانیں اور ان سے زیادہ تیز دھار تلواریں ہوا کرتی تھیں۔ اسی طرح سلجوقوں کو بازنطینیوں پر کسی بھی طرح سے ٹیکنالوجی میں برتری حاصل نہیں تھی۔ منگولوں نے چین اس لیے فتح نہیں کیا کہ ان کے ہاتھ کوئی نیا نکور، کرشماتی ہتھیار لگ گیا تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ جتنی بھی سلطنتیں اور اقوام زیر ہوئیں، ان کے پاس بھی اپنے حریفوں جتنی ہی برتر اور اعلیٰ عسکری اور سول ٹیکنالوجی ہوا کرتی تھی۔

اس ضمن میں رومی افواج کی مثال بالخصوص بہت خوب ہے۔ رومی افواج اپنے دور میں دنیا کی سب سے بہترین عسکری طاقت ہوا کرتی تھی۔ لیکن ٹیکنالوجی کی رو سے دیکھا جاتا تو رومیوں کو کارتھج، مقدونیہ یا سلوکی سلطنتوں پر کسی بھی طرح سے برتری حاصل نہیں تھی۔ رومی افواج کی اصل طاقت استعداد، تنظیم، جمعیت اور کثیر تعداد میں چھپی ہوئی تھی۔ اب رومی افواج میں کبھی بھی تحقیق اور جدت طرازی کا شعبہ نہیں رہا۔۔۔ اس کے اہم ہتھیار تقریباً وہی تھے، جو غالباً کئی صدیوں سے ایسے ہی چلے آ رہے تھے۔ اگر سکیپو نامی جرنیل جس نے کارتھج کو تہہ تیغ کر کے رکھ دیا تھا اور بعد ازاں نومانسائیوں کو بھی شکست دی تھی۔۔۔ اگر وہ اپنے جری دستوں کے ہمراہ پانچ سو سال بعد قسطنطین اعظم کے زمانے میں بھی جنگ لڑنے پہنچ جاتا تو عین ممکن ہے کہ وہ قسطنطین کو ناکوں چنے چبوا سکتا تھا۔ لیکن ذرا یہ تصور کریں۔۔۔ اگر صرف چند صدیوں پہلے سے تعلق رکھنے والا کوئی جرنیل۔۔۔ مثلاً نپولین اپنی پوری فوج کو لے کر آج دنیا کی کسی جدید فوج کے صرف ایک بریگیڈ سے جنگ کرنے نکل آئے تو کیا ہو گا؟ یہ درست ہے کہ نپولین ایک شاطر آدمی تھا۔ فن جنگ کا ماہر، مدبر اور اس کی فوج نہایت پیشہ ور تھی لیکن ان کی یہ ساری صلاحیتیں جدید ہتھیاروں کے سامنے کسی قابل نہیں ہوں گی۔ ایک چھوٹی سی بریگیڈ، اتنی بڑی فوج کو چند گھنٹوں کے اندر اندر ہتھیار پھینکنے پر مجبور کر دے گی۔

جس طرح روم میں، ویسے ہی قدیم چین میں بھی زیادہ تر فلسفی اور جرنیل نت نئے ہتھیار بنانے کو اپنی ذمہ داری نہیں سمجھتے تھے۔ چین کی تاریخ میں سب سے اہم عسکری دریافت بارود کی تھی۔ تاہم، جس قدر ہمیں علم ہے۔۔۔ بارود کی ایجاد بھی ایک حادثاتی واقعہ تھا۔ یہ تاؤمت کے کیمیا گروں کی کارستانی تھی جو آب حیات بنانے کا تجربہ کر رہے تھے۔ اس کے بعد آنے والے زمانوں میں بارود کے ساتھ جو ہوا، وہ تو اور بھی دلچسپ ہے۔ عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ شاید بارود کی حادثاتی ہی سہی لیکن ایجاد نے چین کو دنیا کی سپر طاقت بنا دیا ہو گا۔ حقیقت یہ ہے کہ چین میں اس انتہائی اہم ایجاد کی اصل قسمت آتش بازی اور پٹاخوں میں لکھی ہوئی تھی۔ منگول حملہ آوروں کی یورش کے نتیجے میں جب چینی سلطنت منہدم ہو رہی تھی، اس وقت بھی کسی چینی شہنشاہ نے قرون وسطیٰ کے دور میں "مین ہیٹن پراجیکٹ" کی طرح کا کوئی منصوبہ شروع نہیں کیا جو سلطنت کو قیامت خیز انجام سے بچا سکتی۔ یہ تو پندرھویں صدی میں۔۔۔ جب بارود کو ایجاد ہوئے

600برس گزر چکے تھے، پہلی بار توپوں میں بارودی گولے استعمال کرنے کا رجحان پیدا ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب بارودی گولوں کی توپیں پہلی بار افریشیائی خطے کی جنگوں میں فیصلہ کن کردار ادا کرنا شروع ہوئیں۔ تو آخر بارود جیسی انتہائی مہلک شے کو عسکری استعمال میں لانے کے لیے اتنا طویل عرصہ کیوں لگ گیا؟ اس کی واقعی سمجھ میں آنے والی وجہ تو یہی ہے کہ یہ وہ زمانہ تھا جب بادشاہ، محققین اور نہ ہی تاجر یہ سمجھتے تھے کہ نت نئی عسکری ٹیکنالوجی انھیں دفاع اور نہ ہی دولت عطا کر سکتی تھی۔

یہ صورتحال پندرھویں اور سولھویں صدی میں بدلنا شروع ہوئی لیکن پھر بھی تقریباً200 سال مزید اس لیے لگ گئے کیونکہ دنیا کے زیادہ تر حکمران اب بھی نئے ہتھیاروں کی ایجاد کے لیے جدت طرازی اور تحقیق پر رضامند اور نہ ہی دلچسپی رکھتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ ابھی تک فوجی نظم وانصرام اور جنگی حکمت عملی کو جدید ٹیکنالوجی سے لیس ہتھیاروں سے بڑھ کر جنگی نتائج میں اہم سمجھا جاتا تھا۔ مثلاً، 1805ء میں نپولین کی وہ عسکری طاقت جس نے یورپی طاقتوں کو آسٹرلیٹز کے مقام پر کچل کر رکھ دیا تھا۔۔۔ اس کے ہاتھ میں کم وبیش وہی ہتھیار تھے جو کبھی شہنشاہ لوئس کی افواج کے استعمال میں ہوا کرتے تھے۔ اگرچہ نپولین خود توپخانے کا فوجی تھا لیکن نئے ہتھیاروں کی ایجاد میں اس کی دلچسپی نہ ہونے کے برابر تھی۔ یہاں تک کہ اس کے ارد گرد سائنسدان اور موجدین اس کو اڑنے والی مشینوں، آبدوزیں اور راکٹ بنانے کا مشورہ۔۔۔ بلکہ خاک تک دے چکے تھے۔ اس نے بہرحال، ان کی تجاویز پر کان نہیں دھرا۔

سائنس، صنعت اور عسکری ٹیکنالوجی صرف اس وقت صحیح معنوں میں آپس میں گوندھی گئیں جب سرمایہ داری نظام سامنے آیا اور صنعتی انقلاب برپا ہوا۔ تاہم، جب یہ تعلق پیدا ہو گیا تو اس سے دنیا کی کایا ہی پلٹ کر رہ گئی۔

مثالی ترقی کا تصور

جب تک سائنسی انقلاب برپا نہیں ہوا، تب تک کوئی بھی انسانی تہذیب ترقی اور نمو کے مثالی تصور میں یقین نہیں رکھتی تھی۔ یہ تصور عام تھا کہ اب چونکہ سنہری ماضی کا حصہ بن چکا ہے تو دنیا اگر پستی میں نہیں گر رہی تو جمود کا بالضرور ہی شکار ہو چکی ہے۔ یہ خیال کیا جاتا تھا کہ اگر ہم قدیم زمانوں کی دانش اور حکمت سے جڑے رہیں تو کیا خبر، گزرا ہوا سہانا دور لوٹ آئے گا اور انسانی ہنر مندی غالباً ہماری مجموعی طرز زندگی اور روزمرہ زندگی میں بہتری لا پائے گی۔ تاہم، انسانوں کے لیے دنیا کے بنیادی مسائل سے نبٹنے کی صلاحیت کی توقع رکھنا بے کار تھا۔ اگر محمد، عیسی، گوتم بدھ اور کنفیوشس جیسے دانا لوگ۔۔۔ جو سب کچھ جانتے تھے، وہ دنیا میں سے بھوک، افلاس، غربت، بیماری اور جنگ کا خاتمہ نہیں کر سکتے تو عام عوام ایسا کیسے کر سکتے تھے؟

زیادہ تر عقائد اسی تصور پر تکیہ کیے بیٹھے تھے کہ کسی دن ایک مسیحا کا ظہور ہو گا۔۔۔ جو اس دنیا کی ساری جنگوں کا خاتمہ کر دے گا۔ دنیا سے بھوک، افلاس، غربت اور یہاں تک کہ موت بھی ہوا ہو جائے گی۔ لیکن یہ تصور یا گمان پالنا کہ انسانیت خود ہی اپنے بل بوتے پر جدید علم

حاصل کر کے اور نت نئے اوزاروں کی ایجاد سے ممکن بنا سکتی ہے۔۔۔ یہ طفلانہ اور مضحکہ خیز بات سمجھی جاتی تھی۔ یہ بے کار کی رعونت اور گھمنڈ تھا۔ بابل کے برج کی کہانی، ایکاروس کا قصہ، گولم کی حکایت، شہداد کی جنت اور اس طرح کی دوسری لاتعداد اساطیر سے لوگوں کو یہی سمجھایا اور پڑھایا جاتا تھا کہ اگر کوئی انسان اپنی متعین کردہ حد سے نکلنے کی کوشش کرے گا تو اس کی قسمت میں مایوسی اور تباہی ہی لکھی جائے گی۔

جب جدید انسانی تہذیب نے یہ تسلیم کر لیا کہ کئی ایسی انتہائی اہم چیزیں ہیں جن کا انھیں سرے سے کوئی علم نہیں ہے۔۔۔ اور جب جہالت اور بے علمی کے اس اعتراف کا سائنسی تحقیق اور دریافتوں کے نتیجے میں حاصل ہونے والے اختیار کے تصور سے عقد بندھ گیا تو پہلی دفعہ لوگوں کو شبہ سا ہوا کہ مثالی ترقی کا یہ سفر، بہر حال اپنے بل بوتے پر بھی ممکن ہے۔ اب جوں جوں سائنس ایک کے بعد دوسرے لاینحل مسائل کو حل کرنا شروع ہوئی تو ہر کوئی قائل ہو ہی گیا کہ انسانیت ہر طرح اور ہر قسم کے مسئلے کو جدید علم حاصل کرنے کے بعد لاگو کرے تو، حل نکل ہی آتا ہے۔ غربت، بیماری، جنگ، بھوک، افلاس۔۔۔ غالباً بڑھاپا اور خود موت جیسے مسائل کے بارے بھی امید پیدا ہو گئی کہ یہ انسانیت کی اٹل قسمت نہیں ہیں۔ یہ پتھر پر لکھی ہوئی کوئی لوح نہیں ہے۔ یہ صرف اور صرف ہماری لاعلمی کا نتیجہ، جہالت کی سزا ہیں۔

34 بینجامین فرینکلن خداؤں کو غیر مسلح کرتے ہوئے۔۔۔

ایک مشہور مثال آسمانی بجلی کی ہے۔ کئی تہذیبوں اور معاشروں میں مانا جاتا تھا کہ آسمانی بجلی خدا کے غصے کا ہتھوڑا ہوتی ہے۔۔۔ جو وہ گناہ گاروں کو سزا دینے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اٹھارہویں صدی کے وسط میں سائنسی تاریخ کا ایک انتہائی نامور تجربہ کیا گیا۔ بنجمن فرینکلن نے آسمانی بجلی سے کڑکتے ہوئے طوفان میں پتنگ اڑا کر اس قیاس کو ثابت کرنے کی کوشش کی کہ آسمانی بجلی، صرف برقی رو کی حرکت ہے۔ فرینکلن کا یہ عملی مشاہدہ جب برقی توانائی سے متعلق علم کے ساتھ یکجا ہوا تو اس کو برق کش سلاخ ایجاد کرنے میں مدد ملی۔۔۔ گویا اس نے خداؤں کو غیر مسلح کر دیا۔

اسی طرح غربت کی مثال بھی ہے۔ کئی تہذیبوں اور تمدن میں غربت کو ہمیشہ ہی اس ناقص دنیا کا ناگزیر حصہ سمجھ کر توکل کیا ہے۔ عہد نامہ جدید یا انجیل مقدس میں بتایا گیا ہے کہ سولی پر چڑھانے سے قبل ایک عورت نے 300 دیناری مالیت کے قیمتی تیل سے عیسیٰ کی مالش کی۔ عیسیٰ کے پیرو کاروں نے اس عورت کو یوں اتنی بڑی رقم غریبوں میں بانٹنے کی بجائے یوں ضائع کر دینے پر سخت ملامت کیا لیکن عیسیٰ نے اس عورت کا دفاع کرتے ہوئے کہا، 'غریب۔۔۔ ہمیشہ تمھارے ساتھ رہیں گے اور تم جب چاہو، ان کی مدد کر سکتے ہو۔ لیکن، میں تمھارے پاس نہیں رہوں گا' (مارک 14:7)۔ آج کم سے کم لوگ۔۔۔ بشمول کم سے کم عیسائی اس معاملے پر عیسیٰ سے متفق نظر آتے ہیں۔ آج غربت کو ایک ایسا تکنیکی مسئلہ سمجھا جاتا ہے جو شفاعت اور توسط کی مدد سے حل کیا جا سکتا ہے۔ یہ عام فہم حکمت اور سمجھ بوجھ کا معاملہ ہے کہ اگر زراعت، معیشت، طب اور سماجی پالیسیوں کو بہتر بنا لیا جائے تو غربت، ختم کی جا سکتی ہے۔

دنیا کے کئی حصوں میں انسانی آبادیوں کو بدترین محرومی سے نکالنے میں متاثر کن کامیابیاں حاصل ہو چکی ہیں۔ تاریخ بھر میں انسانی معاشرے غربت کی دو اشکال کے ہاتھوں مجبور رہے ہیں۔ ان میں پہلی تو سماجی غربت ہے۔ سماجی غربت سے مراد یہ ہے کہ کسی بھی سماج میں بعض لوگوں کو ان مواقع سے محروم کر دیا جاتا ہے جو باقی سب کو میسر ہوتے ہیں۔ دوسری حیاتیاتی غربت ہے۔ حیاتیاتی غربت سے مراد یہ ہے کہ کسی بھی آبادی میں بعض لوگ بنیادی ضروریات جیسے مناسب خوراک، صحت، چھت وغیرہ نہ ملنے کی وجہ سے محرومی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ غالباً، سماجی غربت تو کبھی ختم نہ ہو لیکن دنیا کے بہت سے ممالک میں حیاتیاتی غربت اب قصہ پارینہ بن چکی ہے۔ حالیہ دور تک، دنیا میں لوگوں کی ایک بڑی تعداد حیاتیاتی غربت کی لکیر کے بالکل قریب رہتے تھے۔ یعنی، اس لکیر سے نیچے لوگوں کو ضرورت کے مطابق مناسب مقدار میں حرارے نہ ملیں تو وہ غذائی قلت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ طویل عرصے تک غذائی قلت کا شکار رہنے کا نتیجہ سخت مشکلات جیسے بیماری، غربت اور کمزوری کی شکل میں نکلتا ہے۔ بھول چوک، غلط اندازوں اور بدقسمتی کے ہاتھوں بھی لوگ نہایت آسانی کے ساتھ اس لکیر سے نیچے بھوک اور افلاس میں دھکیلے جاتے ہیں۔ قدرتی آفات اور انسان کی پیدا کردہ تباہی کے نتیجے میں بڑی آبادیاں یکدم ہی بھوک، غربت اور افلاس کی پاتال میں گر جاتی ہیں۔ بسا اوقات تو ان آفتوں کے نتیجے میں لاکھوں انسانوں کو جان سے بھی ہاتھ دھونے پڑتے ہیں۔ آج دنیا کی تقریباً آبادی کو عوامی فلاح اور بہبود کی سہولیات میسر ہیں۔ لوگوں کو انشورنس جیسی سہولیات با

آسانی مل جاتی ہیں، ریاستیں بالخصوص سماجی فلاح اور بہبود کے منصوبے وضع کرتی ہیں جبکہ مقامی اور بین الاقوامی غیر سرکاری امدادی اداروں کی پوری فوج ہر دم،دنیا کے کونے کونے میں آفت زدہ لوگوں کی مدد کو تیار رہتی ہے۔ جب کوئی آفت کسی مخصوص خطے پر نازل ہوتی ہے تو دنیا بھر سے حالات کو بدتر ہونے سے بچانے کے لیے امدادی کاروائیوں کا آغاز کر دیا جاتا ہے۔ یہ درست ہے کہ کئی لوگ آج بھی بے انحطاط کا شکار ہوتے ہیں،ان کو تذلیل کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور غربت جیسی آلائش سے نبٹنا پڑتا ہے لیکن مجموعی طور پر اب زیادہ تر ملکوں میں اکثریت بھوک اور افلاس کی وجہ سے فاقہ کشی پر مجبور نہیں ہوتی۔ سچ تو یہ ہے کہ آج دنیا کے کونے کونے میں لوگوں کو بھوک اور افلاس سے زیادہ موٹاپے سے خطرات لاحق ہیں۔ یہ حقائق ترقی یافتہ ہی نہیں بلکہ ترقی پذیر مما لک میں بھی صادق ہیں۔

گلگامش کا خاکہ

انسان کو درپیش ہر طرح کے لاینحل مسائل میں ایک ایسا ہے جو پریشان کن، دلچسپ اور انتہائی اہم ہے۔۔۔ یہ موت کا مسئلہ ہے۔ موت کے بارے یہ ہے کہ ہمیشہ سے ہی اس مسئلے کے بارے مذاہب اور ہر نظریہ میں بھی یہی فرض کیا جاتا رہا ہے کہ یہ ہماری اٹل قسمت ہے۔ مزید بر اں یہ کہ زیادہ تر مذاہب اور عقائد نے موت کو زندگی کے معنی کشید کرنے کا ذریعہ بنالیا۔ اس دنیا میں اسلام، عیسائیت اور قدیم مصری مذاہب کا تصور موت کے بغیر نامکمل ہوں گے۔ ان عقائد نے لوگوں کو یہ سکھایا کہ وہ موت کی تیاری کر لیں اور بجائے یہ کہ اس دنیا میں رہتے ہوئے موت کو شکست دے کر یہیں قیام رکھنے کی بجائے اپنی ساری امیدیں بعد از موت، ابدی زندگی کے ساتھ وابستہ کر لیں۔ تاریخ کے بہترین دماغ بھی موت سے بچ نکلنے کی تدبیر کرنے کی بجائے اس کو معنی بخشتے رہے۔

اس ضمن میں ایک تاریخی اسطور ہے، جو اسی نکتے کو واضح کرتا ہے۔ یہ قدیم سمیر میں گلگامش کا تصوراتی خاکہ۔۔۔ ایک نہایت مشہور فرضی داستان ہے۔ اس داستان کا ہیرو دنیا کا سب سے طاقتور اور اہل ترین شخص تھا۔ اس کا نام گلگامش تھا جو اوروک نامی بادشاہت کا فرمانروا تھا۔ گلگامش اتنا طاقتور تھا کہ وہ لڑائی میں کسی کو بھی پچھاڑ سکتا تھا۔ ایک دن گلگامش کا انتہائی قریبی دوست انکیدو مر گیا۔ گلگامش رنج اور غم میں ڈوبا اپنے دوست کی لاش کے سرہانے بیٹھ گیا اور کئی دن تک اس کا مشاہدہ کرتا رہا۔ چند دن ہی گزرے تھے کہ گلگامش نے دیکھا کہ انکیدو کے نتھنے میں سے ایک کیڑا بر آمد ہوا۔ یہ منظر دیکھ کر گلگامش پر ہولناکی چھا گئی اور سخت خوفزدہ ہو گیا۔ اس نے خود سے وعدہ کرتے ہوئے فیصلہ کیا کہ وہ خود کبھی موت کا شکار نہیں ہو گا۔ پھر یوں ہوا کہ اسے موت کو شکست دینے کا موقع ہاتھ آ گیا۔ وہ موت کو شکست دینے کی غرض سے کائنات کے آخری سرے پر پہنچنے کے لیے سفر پر نکل کھڑا ہوا۔ راستے میں اسے کئی شیروں کو چت کرنا پڑا، بچھو نما آدمیوں سے لڑائی لڑنی پڑی اور پوشیدہ دنیا تک پہنچنے کے لیے سخت مشقت اٹھانی پڑی۔ اس زیر زمین دنیا میں اس نے پتھریلے دیوؤں کا مقابلہ کیا اور اور شانابی نامی مرداروں کے دریا میں ملاح کو بھی شکست دی۔ پھر اسے یہیں اوتن پشتیم بھی مل گیا۔ اوتن

پشتیم نوح کی کشتی میں سیلاب کی تباہ کاریوں سے بچ کر زندہ رہ جانے والا آخری شخص تھا۔ اوتن پشتیم،گلگامش کا باوا،جد امجد تھا اور اب ابدی زندگی جی رہا تھا۔ یہاں تک پہنچ کر،اوتن پشتیم سے ملاقات کے بعد بھی گلگامش اپنی مہم اور مقصد میں ناکام رہا۔ وہ خالی ہاتھ ہی گھر لوٹ آیا۔ وہ اب بھی پہلے کی طرح فانی ہی تھا لیکن اس کے ہاتھ دانش کے چند موتی لگ گئے تھے۔ گلگامش کو پتہ چل چکا تھا کہ جب خداؤں نے آدمی کی تخلیق کی تو موت کو اس کی اٹل منزل مقرر کر دیا تھا۔ اب یہ آدمی کے لیے لازم ہے کہ وہ اس اٹل حقیقت کے ساتھ نباہ کر کے جینا سیکھ لے۔

ترقی کے چیلے، اس طرح کی شکست خوردہ ذہنیت کو ہر گز قبول نہیں کرتے۔ سائنس پر یقین رکھنے والوں کے لیے موت کوئی اٹل منزل نہیں بلکہ محض ایک تکنیکی مسئلہ ہے۔ ان کے نزدیک،لوگ اس لیے نہیں مرتے کہ خداؤں نے ان کی قسمت میں موت کا پروانہ لکھ چھوڑا ہے۔۔۔لوگ اس لیے مرتے ہیں کہ ان کے جسمانی اعضاء اور افعال کے ساتھ کئی طرح کے تکنیکی مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔ مثلاً دل کا دورہ، کینسر یا پھر کوئی اور مضر بیماری انسان کی موت کا باعث بن جاتی ہے۔ یہ سب تکنیکی مسائل ہیں اور ہر تکنیکی مسئلے کا کوئی نہ کوئی تکنیکی حل بھی ہوتا ہے۔ اگر دل پھڑپھڑا رہا ہے تو اس کی رفتار کو مستحکم کرنے کے لیے مصنوعی آلہ نصب کیا جا سکتا ہے یا پھر پورے کا پورا دل ہی بدلا جا سکتا ہے۔ اگر کینسر ناسور کی طرح سرایت کر رہا ہے تو اس ناسور کو طاقتور دوائیوں اور تابکاری کی مدد سے ہلاک کیا جا سکتا ہے۔ اگر کوئی جرثومہ جسم میں اتنی افزائش کر رہا ہے کہ انفیکشن پیدا ہو گیا ہے تو اسے اینٹی بائیوٹک نامی دوا سے روک کر ختم کیا جا سکتا ہے۔ یہ درست ہے کہ فی الوقت ہم ہر طرح کے سبھی تکنیکی مسائل کو حل نہیں کر سکتے لیکن ان پر پوری تندہی سے کام جاری ہے۔ آج ہمارے بہترین دماغ، موت کو معنی عطا کرنے میں مصروف نہیں ہیں۔ بلکہ، وہ بیماری اور بڑھاپے کا سبب بننے والے عضویاتی، فعلیاتی، ہارمونی اور جینیاتی مسائل پر تحقیق کر رہے ہیں۔ وہ آئے روز نت نئی دوائیاں دریافت کرتے ہیں، انقلابی علاج ڈھونڈ کر نکال لاتے ہیں اور مصنوعی اعضاء بنا رہے ہیں تاکہ انسان کی زندگی کو طوالت بخشی جا سکے اور امید کرتے ہیں کہ ایک دن ایسا بھی آئے گا کہ موت کا مجسم۔۔۔خود اپنے آپ کو موت کے حوالے کر دے گا۔

آپ نے آج تک کسی سائنسدان،دوسرے محققین اور معالجوں کو موت کے بارے، کند اور کھنڈے انداز میں بات کرتے نہیں سنا ہو گا۔ ان کا اصرار یہی ہوتا ہے کہ 'موت کو شکست؟ یہ کیا احمقانہ بات ہے۔۔۔ہم تو صرف کینسر کا علاج کر رہے ہیں، ٹی بی کو روک رہے ہیں اور الزیمر کے مریضوں کو نجات دلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔۔۔'۔ لوگ موت کے مسئلے سے نظریں اس لیے چرا لیتے ہیں کیونکہ یہ مسئلہ نہایت مبہم اور مغالطے کا باعث بن سکتا ہے۔ تو ایسے گریزاں اور مبہم مسئلے سے متعلق زیادہ توقعات کیوں پالیں؟ تاہم، اب ہم اس نکتے پر پہنچ چکے ہیں کہ اس گھمبیر مسئلے کے بارے کھل کر بات کر سکتے ہیں۔ سائنسی انقلاب کا سب سے پیش رس اور نمایاں منصوبہ یہ ہے کہ انسانوں کو لازوال زندگی کا مالک بنا دیں۔ اگرچہ، موت کو موت کے منہ میں دھکیلنے کا نصب العین ابھی بھی خاصا دور ہے

لیکن اس طویل سفر میں ہم نے کئی ایسی کامیابیاں حاصل کر ہی لی ہیں جن کا تصور چند سو سال پہلے محال تھا۔ 1199ء میں انگلستان کا شہنشاہ رچرڈ اول، لڑائی کے دوران بائیں کندھے میں تیر لگنے سے زخمی ہو گیا تھا۔ زخم اتنا بگڑا کہ اس کی ہلاکت ہو گئی۔ آج، ہم اسے معمولی زخم قرار دیتے ہیں لیکن 1199ء میں اینٹی بائیوٹک اور جراثیم کش دوائیاں نہ ہونے کی وجہ سے معمولی زخم بھی بگڑ کر ناسور بن جاتا تھا۔ اس وقت اس ناسور کو روکنے کا یہی طریقہ تھا کہ متاثرہ عضو کو کاٹ دیا جاتا۔ اب شہنشاہ رچرڈ اول کی بدقسمتی یہ تھی کہ اس کے کندھے پر زخم آیا تھا اور کندھے کو کاٹ کر الگ کرنا ناممکن تھا۔ چنانچہ، یہ زخم عظیم شہنشاہ کے جسم میں اتنا پھیل گیا کہ اس کی کوئی مدد نہیں کی جا سکتی تھی۔ شہنشاہ رچرڈ دو ہفتوں تک سخت تکلیف میں مبتلا رہنے کے بعد موت کے منہ میں چلا گیا۔

یہ تو انیسویں صدی تک بھی صورتحال یہی تھی کہ ڈاکٹروں کو انفیکشن اور بافتوں کو گلنے سڑنے سے بچانے کی کوئی تدبیر نہیں سوجھتی تھی۔ فیلڈ ہسپتالوں میں معمولی زخموں کے حامل سپاہیوں کے بھی ہاتھ، بازو اور ٹانگیں وغیرہ گوشت کی سڑن کے ڈر سے کاٹ کر الگ کر دی جاتی تھیں۔ یہ قطع عضو پر مبنی جراحت اور ایسے دوسرے طبی عمل (مثلاً دانت اکھاڑنا وغیرہ) بے ہوشی کی دوائیں استعمال کیے بغیر ہی مکمل کیے جاتے تھے۔ بے ہوشی کی اولین دوائیں جیسے ایتھر، کلوروفارم اور مارفین وغیرہ کا مغربی طب میں باقاعدگی کے ساتھ استعمال انیسویں صدی کے وسط میں شروع ہوا تھا۔ کلوروفارم کی آمد سے قبل چار سے چھ سپاہی مل کر زخمی سپاہی کو قابو کرتے تھے اور یوں ڈاکٹر آری وغیرہ سے ٹانگ یا بازو وغیرہ کاٹ دیا کرتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ 1815ء میں جب واٹر لو کی لڑائی ختم ہوئی تو اس سے اگلے دن فیلڈ ہسپتالوں کے آس پاس کٹے ہوئے اعضاء جیسے ہاتھ، بازو، پیر اور ٹانگوں وغیرہ کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ ان دنوں میں وہ ترکھان اور قصائی جو فوج سے منسلک ہوتے تھے، انھیں طبی دستوں کے ساتھ روانہ کیا جاتا تھا کیونکہ جراحت کا کام چھری، چاقو اور آریوں سے زیادہ متعلق ہوتا ہے۔

واٹر لو کی لڑائی کو دو صدیاں گزر چکی ہیں۔ اب صورتحال اتنی بدل چکی ہے کہ پہچان مشکل ہے۔ واٹر لو کے واقعات پر یقین ہی نہیں آتا۔ گولیاں، انجکشن اور شایستہ مگر انتہائی گنجلک جراحی آپریشن ہمیں ان بیماریوں اور زخموں سے صاف صاف بچا کر نکال لاتے ہیں جو کبھی موت کا پروانہ سمجھے جاتے تھے۔ یہ ساری چیزیں ہمیں ہر روز بے شمار طریقوں سے چھوٹے موٹے درد اور علالت سے بھی تحفظ فراہم کرتے ہیں۔ جدید دور سے قبل لوگ اس طرح کے روگ اور امراض کو زندگی کا ناگزیر حصہ سمجھتے تھے۔ آج انسانوں کی اوسط متوقع عمر عالمی سطح پر تقریباً پچیس برس سے بڑھ کر سڑسٹھ جبکہ ترقی یافتہ ممالک میں یہی اوسط تقریباً بیالیس برس سے بڑھ کر اسی برس تک پہنچ چکی ہے۔

موت کو اصل دھچکا تو بچوں کی شرح اموات میں دیکھنا پڑا ہے۔ بیسویں صدی تک زرعی معاشروں کے ایک چوتھائی سے لے کر تقریباً تین چوتھائی تک بچے کبھی بھی بلوغت کی عمر تک نہیں پہنچ پاتے تھے۔ بچوں میں ان اموات کا باعث بننے والی سب سے عام بیماریاں خناق، خسرہ اور چیچک وغیرہ ہوا کرتی تھیں۔ سترھویں صدی کے انگلستان میں صورتحال یہ تھی کہ اوسطاً ہر ہزار میں سے تقریباً ڈیڑھ سو شیر

خوار پہلی سالگرہ تک نہیں پہنچ پاتے تھے جبکہ بچوں کا تیسرا حصہ پندرہ سال کی عمر تک پہنچنے سے پہلے ہی چل بستا تھا۔ آج، برطانیہ میں اوسطاً ہر ہزار میں سے صرف پانچ شیر خوار بچے پہلے برس جب کہ ہر ہزار میں سے صرف سات ہی پندرہ برس کی عمر تک پہنچنے سے قبل چل بستے ہیں۔

ہم اس غیر معمولی اثر کو انسانی سطح پر سمجھنے کے لیے شماریات کو چھوڑ، کہانیوں کا سہارا لیتے ہیں۔ اس سلسلے میں ایک اچھی مثال انگلستان کے کنگ ایڈورڈ اول (1237ء–1307ء) کے خاندان کی ہے۔ کنگ ایڈورڈ کی بیوی کا نام ملکہ ایلیانور (1241–90ء) تھا۔ ان کے بچوں کو قرونِ وسطیٰ کے یورپ میں جس قدر ممکن ہو سکتا تھا، سب سے زیادہ بہترین ماحول اور سہولیات دستیاب تھیں۔ ان کی رہائش محلات میں رہتی تھیں اور وہ جس قدر چاہتے، غذائیت سے بھرپور خوراک، گرم کپڑے، گرم چھتیں اور آتش دان، صاف پانی، نوکروں کی پوری فوج اور انگلستان کے بہترین طبیب میسر تھے۔ ریکارڈ سے پتہ چلتا ہے کہ ملکہ نے 1255ء سے لے کر 1284ء تک کل سولہ دفعہ بچوں کو جنم دیا:

1۔ بیٹی، بے نام، 1255ء میں زچگی کے دوران چل بسی

2۔ بیٹی، کیتھرین، ایک سے تین سال کی عمر میں چل بسی

3۔ بیٹی، جو آن، چھ ماہ کی عمر میں چل بسی

4۔ بیٹا، جان، پانچ سال کی عمر میں چل بسا

5۔ بیٹا، ہینری، چھ سال کی عمر میں چل بسا

6۔ بیٹی، ایلیانور، انتیس سال کی عمر میں چل بسی

7۔ بیٹی، بے نام، پانچ ماہ کی عمر میں چل بسی

8۔ بیٹی، جو آن، پینتیس سال کی عمر میں چل بسی

9۔ بیٹا، ایلفانزو، دس سال کی عمر میں چل بسا

10۔ بیٹی، مارگریٹ، اٹھاون سال کی عمر میں چل بسی

11۔ بیٹی، برینگریا، دو سال کی عمر میں چل بسی

12۔ بیٹی، بے نام، پیدائش کے فوراً بعد چل بسی

13۔ بیٹی، میری، ترپن سال کی عمر میں چل بسی

14۔ بیٹا، بے نام، پیدائش کے فوراً بعد چل بسا

15۔ بیٹی، الزبتھ، چونتیس سال کی عمر میں چل بسی

16۔ بیٹا، ایڈورڈ۔

سب سے چھوٹا بیٹا، ایڈورڈ۔۔۔لڑکوں میں پہلا تھا جو بچپن کے خطرناک برسوں کے دوران جانبر ہونے میں کامیاب ہوا اور شہنشاہ رابرٹ کی وفات کے بعد انگلستان کا بادشاہ بنا۔ اس کا پورا نام، شہنشاہ ایڈورڈ دوم تھا۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ایلیانور کو انگلستان کی ملکہ ہونے کے ناطے سب سے بنیادی فرض کو پورا کرنے، یعنی اپنے شوہر کو اولاد نرینہ دینے کے لیے سولہ کوششیں کرنی پڑیں۔ ایڈورڈ دوم کی ماں یقیناً غیر معمولی صبر اور حوصلے کی حامل رہی ہوگی۔ لیکن ایڈورڈ کی بیوی، فرانس کی ازبیلا۔۔۔اس کی ماں جیسی صبرناک نہیں تھی۔ ازبیلا نے ایڈورڈ کو تینتالیس سال کی عمر میں قتل کروادیا تھا۔

ہمیں جس قدر علم ہے، ایلیانور اور ایڈورڈ اول کا جوڑا صحت مند اور تندرست تھا۔ ان کے بیچ کسی جان لیوا موروثی بیماری کا بھی کوئی امکان نہیں تھا اور نہ ہی یہ بیماریاں ان دونوں کے بچوں میں نظر آئیں۔ اس کے باوجود سولہ میں سے دس (62 فیصد) بچے، بچپن میں ہی چل بسے تھے۔ ان میں صرف چھ بچے گیارہ سال کی عمر تک پہنچ پائے اور صرف تین (18 فیصد) بچے چالیس سال سے زیادہ جیے۔ ان پیدائشوں کے علاوہ بھی امکان یہی ہے کہ ایلیانور کو کئی اسقاط حمل کو بھی جھیلنا پڑا تھا۔ یوں، اوسطاً ایڈورڈ اور ایلیانور نے ہر تین برس میں اپنے کسی نہ کسی بچے کی موت دیکھ رکھی تھی۔ ان کے کل دس بچے، ایک کے بعد دوسرا۔۔۔موت کے منہ میں چلے گئے۔ آج دنیا میں کوئی بھی والدین۔۔۔باپ یا ماں، اس طرح کے دکھ اور نقصان کا سوچ بھی نہیں سکتا۔

اب اہم سوال یہ ہے کہ ہمارا گلگامش کا یہ منصوبہ۔۔۔یعنی غیر فانیت اور حیات جاودانی کی جستجو کو مکمل ہونے میں کتنا عرصہ لگے گا؟ سو برس؟ پانچ سو برس؟ ہزار برس؟ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ صرف سو برس پہلے، یعنی 1900ء میں ہم انسانی جسم کے بارے کتنا علم رکھتے تھے۔۔۔اور آج کی صورتحال کے ساتھ، وسیع طبی علم اور جدت کے ساتھ تقابل کیا جائے تو اس حوالے سے تھوڑی سی نہیں بلکہ کافی ساری امید کی وجہ نظر آہی جاتی ہے۔ حال ہی میں ایک ایسی تحقیق سامنے آئی ہے جس کے تحت جینیاتی انجنیئروں نے کیڑوں کی ایک قسم کی اوسط طبعی عمر میں دگنا اضافہ کر دکھایا ہے۔ کیا وہ ایسا ہی آدمی کی عمر بڑھانے کے لیے بھی کر سکتے ہیں؟ نینو ٹیکنالوجی کے سائنسدان، دن رات ایک کر کے ایک ایسا برق حیاتی نظام مدافعت بنانے کی کوشش کر رہے ہیں جو لاکھوں کی تعداد میں نینو روبوٹس کا استعمال کرے گا۔ یہ نینو روبوٹ ہمارے جسم میں خون کے ساتھ، رگوں میں بہتے رہیں گے اور رگوں میں خون کے بہاو سے متعلق رکاوٹوں کو دور کر سکیں گے، جرثوموں جیسے بیکٹیریا اور وائرس کا مقابلہ کریں گے، کینسر کے خلیوں کو ہلاک کر دیں گے اور یہاں تک کہ بڑھاپے کے عمل کو بھی الٹا سکیں گے۔ چند سنجیدہ محققین اور سائنسدانوں کا محتاط اندازہ یہ ہے کہ 2050ء تک بعض انسان قدرتی

طور پر فناپذیری سے آزاد ہوجائیں گے۔ قدرتی فناپذیری سے آزادی اس لیے کہ وہ حادثات وغیرہ سے بدستور مر سکتے ہیں۔۔۔ مراد یہ ہے کہ کسی جان لیوا زخم کے بغیر انسانی زندگی لاانتہا طور پر طویل ہوسکتی ہے۔

اب ہمارا یہ گلگامش کا منصوبہ کامیاب ہوتا ہے یا نہیں لیکن تاریخ نکتہ نظر سے دیکھا جائے تو یہ انتہائی متاثر کن ہے کہ جدید دور کے مذاہب اور نظریات نے موت اور موت کے بعد زندگی کو مساوات سے خارج کر دیا ہے۔ اٹھارھویں صدی تک مذاہب موت اور بعد از موت کی زندگی کو خود زندگی کے معنی بیان کرنے میں مرکزی جگہ دیتے تھے۔ یہ تو پچھلے صرف دو سو سال کا قصہ ہے کہ آزاد خیالی، اشتراکیت اور حقوق نسواں اور انسانی حقوق جیسے مذاہب اور نظریات کی دلچسپی موت کے بعد کی زندگی میں بالکل ختم ہو کر رہ گئی۔ ایک کمیونسٹ کے ساتھ مرنے کے بعد کیا ہوتا ہے؟ نسوانیت کے حامی مر کر کیا حاصل کرتے ہیں؟ مارکس، ایڈم سمتھ اور سیمون دی بووار کی تحاریر میں اس طرح کے سوالوں کا جواب تلاش کرنا، بے سود رہے گا۔ آج، جدید نظریات میں صرف ایک ایسا تصور ہے جو موت کو مرکزی جگہ دیتا ہے۔ یہ قوم پرستی کا نظریہ ہے۔ آج جدید قوم پرستی قدیم اور جدید عقائد اور تصورات کے بیچ جھولتی ہوئی وعدہ کرتی ہے کہ ایسا ہر شخص جو قوم کی خاطر، نازک لمحات میں اپنی جان وار دے گا تو وہ ہماری اجتماعی یادداشت میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔ اس کی قربانی کبھی نہیں بھلائی جائے گی۔ جدید قوم پرستی کا المیہ یہ ہے کہ وہ وطن پر اپنی جان قربان کرنے والوں کے ساتھ اپنی جدتی مجبوریوں کی وجہ سے قدیم عقائد کی طرح جنت، شہادت اور لازوال زندگی کا وعدہ بھی نہیں کر سکتی لیکن پھر بھی موڑ توڑ کر جو وعدہ کرتی بھی ہے تو وہ اس قدر مبہم اور دھندلا ہے کہ زیادہ تر قوم پرستوں کو سمجھ ہی نہیں آتی کہ وہ اس وعدے کا کیا کریں؟

سائنس، کئی آشناؤں کی ایک داشتہ

ہم آج ایک تکنیکی دور میں بسر رکھتے ہیں۔ لوگوں کی اکثریت کو یقین ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی ان کے سارے مسائل کو حل کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ ہمارا کام صرف یہ ہے کہ سائنسدانوں اور ٹیکنیشنوں کو اپنا کام کرنے دیں اور وہ ہمارے لیے اسی دنیا میں جنت کھڑی کر دیں گے۔ لیکن سائنس کوئی انٹرپرائز نہیں ہے، جو کسی برتر اور اعلیٰ اخلاقی اور روحانی طاقت کے کہے پر، انسانوں کی دسترس سے اوپر کے فرمان پر چلتی ہو۔ ہماری تہذیب کے باقی اجزاء کی طرح، سائنس بھی معاشی، سیاسی اور مذہبی عوامل اور لوگوں کے مفادات اثرانداز ہوتے ہیں۔

سائنس کا خرچہ بھی بہت زیادہ ہوتا ہے۔ ایک ماہر حیاتیات کے لیے انسان کے مدافعتی نظام کو سمجھنے واسطے بھری پری لیبارٹریوں، ٹیسٹ ٹیوبوں، کیمیائی مادوں اور برقی مائیکروسکوپ جیسی سہولیات کے ساتھ ساتھ لیب اسسٹنٹوں، الیکٹریشنوں، پلمبروں اور جمعداروں کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر کوئی معیشت دان جدید تجارتی منڈیوں میں حصص کے اتار چڑھاو پر نظر رکھنا چاہے تو اسے انتہائی مہنگے

کمپیوٹروں، ڈیٹا بینکوں اور پیچیدہ سافٹ ویئر پروگراموں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی طرح، اگر کوئی ماہر آثار قدیمہ قدیم زمانے کے تاخیتی آدمیوں کے رویوں کو سمجھنا مقصود ہو تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ ہزاروں میل دور دور علاقوں کا سفر اختیار کرے، قدیم باقیات کو کھود کر نکالے اور پھر ملنے والی باقیات جیسے ہڈیوں اور نوادرات کو کئی کئی لیبارٹریوں میں ٹیسٹ کیا کرے۔ ان سارے کاموں پر اچھا خاصا پیسہ خرچ ہوتا ہے۔

پچھلے پانچ سو سالوں میں جدید سائنس نے حیرت انگیز کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ یہ کامیابیاں حکومتوں، تجارتی کاروباروں، غیر سرکاری اداروں اور نجی سرمایہ داروں اور انسان دوستوں کی مرہون منت ہیں۔ انھوں نے اربوں ڈالر کی خطیر رقم سائنسی تحقیق کے لیے مہیا کی ہے۔ یہ اربوں ڈالر نچھاور ہوئے تو طرح طرح کے کام ہوئے۔ مثلاً کائنات، دنیا اور ہر جگہ کا نقشہ اور جغرافیہ پتہ چل گیا اور نامیات (حیوانات اور نباتات) کی خصوصیات کے ساتھ فہرستیں دستیاب ہوگئیں۔۔۔ یہ فہرست بہت طویل ہے لیکن سائنس کی کامیابیوں کی فہرست اس سے بھی طویل ہے۔ اسی رقم سے گیلیلیو، کرسٹوفر کولمبس اور چارلس ڈارون جیسے ذہین لوگوں کو کھل کر کھیلنے کا ایسا موقع ملا کہ دنیا کی کایا ہی پلٹ گئی۔ مگر سچ یہ ہے کہ اگر یہ ذہین لوگ پیدا نہ ہوتے تو ان کے حصے کا کام کوئی دوسرا ذہین آدمی کر ہی لیتا۔۔۔ لیکن اگر ان کو کام کرنے کے لیے سرمایہ نہ ملتا تو بھلے کوئی کتنا ہی ذہین فطین کیوں نہ ہو۔۔۔ وہ کچھ نہیں کر سکتا۔ مثال کے طور پر اگر ڈارون جنم نہ لیتا تو آج ہم نظریہ ارتقاء کے موجد کو الفرڈ رسل ویلس نامی شخص کے نام سے جانتے۔۔۔ ویلس نے قدرتی انتخاب پر مبنی ارتقاء کا نظریہ ڈارون سے علیحدہ پیش کیا تھا، صرف یہ ہے کہ اس نے یہ کام صرف چند سال کے وقفے سے کر دکھایا تھا۔ ہر دو صورت۔۔۔ یہ طے ہے کہ اگر یورپی طاقتوں نے عرصہ پہلے جغرافیے، حیوانات اور نباتات پر سائنسی تحقیق کے لیے سرمایہ لگانے پر حامی نہ بھری ہوتی تو ڈارون اور نہ ہی ویلس کو قیمتی علمی ڈیٹا نہ مل پاتا اور وہ کسی بھی صورت نظریہ ارتقاء کا علمی مشاہدہ پیش کرنے کے قابل نہ ہوتے۔۔۔ بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اپنی پوری زندگی، اس کام کی طرف متوجہ ہی نہ ہوتے۔

یہاں سوال یہ ہے کہ آخر حکومتوں اور تجارتی کاروباروں کی جانب سے فراہم کیا گیا اربوں ڈالر کا سرمایہ لیبارٹریوں اور یونیورسٹیوں کے صندوقوں میں ہی کیوں جمع ہوتا ہے؟ علمی دنیا میں ایسے نادانوں کی کوئی کمی نہیں ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ شاید وہ خالصتاً سائنس کی خدمت کر رہے ہیں۔ وہ یہ یقین رکھتے ہیں کہ حکومتیں اور وسیع تجارتی کاروبار اپنی جیب اس لیے خالی کرتے ہیں تاکہ یہ محققین اور سائنسدان تسلی سے، اپنی من مرضی کے سائنسی پراجیکٹ تشکیل دیا کریں۔۔۔ سچ یہ ہے کہ سائنس کو ملنے والی امداد کی ہرگز یہ حقیقت نہیں ہے۔

سائنسی مطالعوں کی اکثریت کو فنڈ اس لیے مل جاتا ہے کیونکہ اس کے پیچھے کوئی نہ کوئی ایسا شخص ضرور ہوتا ہے، جو یہ یقین رکھتا ہے کہ اس تحقیق یا مقالے کی مدد سے سیاسی، معاشی یا مذہبی مقاصد حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر سولہویں صدی عیسوی میں یورپی بادشاہوں اور بینکاروں نے جغرافیائی مہم جوئیوں پر مبنی دنیا بھر کے بحری سفروں کے لیے بے پناہ وسائل فراہم کیے تھے۔ لیکن انھی

بادشاہوں اور بینکاروں نے اس زمانے میں بچوں کی نفسیات کا مطالعہ کرنے کے لیے ایک پائی بھی نہیں لگائی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بادشاہوں اور بینکاروں نے اندازہ لگالیا کہ جغرافیائی مہم جوئیوں سے حاصل ہونے والے علم کی مدد سے وہ نت نئے دیس فتح کر سکتے ہیں اور ان غیر دیسوں کے ساتھ تجارتی روابط قائم کر کے عظیم والشان سلطنتیں کھڑی کی جاسکتی ہیں۔۔۔ جبکہ بچوں کی نفسیات سمجھنے سے انھیں کچھ حاصل نہیں ہو گا۔

1940ء میں امریکہ اور سوویت یونین کی حکومتوں نے بے پناہ وسائل کو زیر سمندر آثار قدیمہ کے مطالعے کی بجائے نیوکلئیر فزکس کے میدان میں سرمایے کی صورت جھونک دیے۔ انھوں نے اندازہ لگالیا تھا کہ نیوکلئیر فزکس کی تحقیق کے نتیجے میں حاصل ہونے والے علم سے وہ ایٹمی ہتھیار حاصل کر سکتے ہیں جبکہ زیر سمندر آثار، جنگ جیتنے میں ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ سائنسدانوں کا حال یہ ہے کہ وہ خود بھی تقریباً ہمیشہ ان سیاسی، معاشی اور مذہبی مقاصد سے لاعلم ہوتے ہیں جن کی وجہ سے پیسہ پانی کی طرح بہایا جارہا ہوتا ہے۔ سائنسدان ایسی مخلوق ہیں جن میں سے اکثریت، یہ مطالعات اور تحقیق وغیرہ، نت نئی ایجادات صرف اور صرف علمی تجسس کی وجہ سے کرتے ہیں۔ بہر حال، یہ طے شدہ امر ہے کہ سائنسدان کبھی بھی سائنسی ایجنڈا طے نہیں کرتے۔۔۔ وہ اپنا سارا وقت، سائنسی تحقیق میں کھپا دیتے ہیں۔

اگر ہم وسائل کو صرف اور صرف، خالص سائنس کے لیے۔۔۔ کسی سیاسی، معاشی یا مذہبی مفادات کے بغیر مختص کرنا بھی چاہیں تو غالباً یہ ناممکن ہو گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے وسائل انتہائی محدود ہیں۔ اپنے ملک کی حکومت، کانگرس، سینٹ یا اسمبلی کے کسی بااختیار رکن سے قومی سائنسی ادارے کے لیے رسمی بجٹ کے علاوہ دس بارہ لاکھ ڈالر کا اضافی فنڈ مانگ کر تو دیکھیں۔۔۔ اس کا فوری جواب یہی ہو گا، کیا خیال ہے۔۔۔ یہ پیسہ سکولوں کی مرمت یا فلاں روڈ کی تعمیر کے لیے زیادہ کار آمد نہیں ہو گا؟ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ محدود وسائل کا بہترین استعمال کرنے کے لیے لازم ہے کہ ہم خود سے پوچھا کریں، 'ہمارے لیے زیادہ اہم کیا ہے؟' اور 'ہمارے لیے بہتر اور فائدہ مند شے کیا ہے؟' اور یہ ہر گز بھی سائنسی سوالات نہیں ہیں۔ سائنس ہمیں اس دنیا کی ہر شے بارے نت نئی معلومات اور پیچیدہ علم فراہم کر سکتی ہے۔۔۔ یہ بتا سکتی ہے کہ چیزیں کیسے کام کرتی ہیں اور یہ بھی بتا سکتی ہے کہ مستقبل میں کیا کیا ممکن ہو سکتا ہے۔ تعریف کی رو سے یہ ہر گز ایسا دعوی نہیں ہے۔ جو کہے، مستقبل میں کیا کیا ہونا چاہیے یا حتمی طور پر ہونے جارہا ہے۔ یہ صرف مذاہب اور نظریات کا خاصا ہے کہ وہ اس طرح کے سوالات کو جنم دے کر حتمی جوابات تلاش کرتے ہیں۔

اس ضمن میں یہ مثال دیکھیں: دو حیاتیات داں ہیں، ایک کا نام پروفیسر تھامسن اور دوسرے کا نام پروفیس ایڈورڈ ہے۔ وہ دونوں ایک ہی ڈیپارٹمنٹ میں کام کرتے ہیں اور دونوں کی قابلیت اور اہلیت بھی برابر ہے۔ ان دونوں نے ہی علیحدہ علیحدہ لاکھوں ڈالر کی ایک گرانٹ کے لیے درخواست دے رکھی ہے تا کہ وہ اپنے تحقیقی پراجیکٹ پر کام مکمل کر سکیں۔ ان میں جو پروفیسر تھامسن ہے، وہ ایک ایسی بیماری پر تحقیق کرنا چاہ رہا ہے۔ جو گائیوں کے تھنوں پر سوزش کا باعث بن جاتی ہے اور نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ گائیوں میں دودھ کی پیداوار

تقریباً دس فیصد تک کم ہو جاتی ہے۔ دوسری طرف پروفیسر ایڈورڈ یہ تحقیق کرنا چاہ رہا ہے کہ جب گائیوں کو اپنے بچھڑوں سے الگ کر دیا جاتا ہے تو اس کا گائیوں پر نفسیاتی اثر کیا ہوتا ہے؟ اب چونکہ وسائل محدود ہیں اور ان دونوں پراجیکٹوں میں سے صرف ایک ہی کو فنڈ دیے جاسکتے ہیں۔ آپ کے خیال میں ان دونوں پراجیکٹوں میں سے کس کو فنڈ ملیں گے؟ یا کہیے، کونسے پراجیکٹ کو فنڈ 'ملنے چاہیے'؟ اس سوال کا کوئی سائنسی جواب نہیں ہے۔ اس طرح کے سوالات کے صرف سیاسی، معاشی اور مذہبی جوابات ہوتے ہیں۔ آج کی دنیا میں یہ صاف ظاہر ہے کہ پروفیسر تھامسن کے پراجیکٹ کو فنڈ ملنے کے امکانات زیادہ ہیں۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ سائنسی طور پر گائیوں کے تھن کی بیماری، گائیوں کی نفسیات سے زیادہ دلچسپ موضوع ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ گائیوں کے تھن کی بیماری پر تحقیق سے دودھ کی صنعت کو زیادہ فائدہ مل سکتا ہے۔ دودھ کی صنعت، جانوروں کے حقوق کی علمبردار لابی سے سیاسی اور معاشی طور پر زیادہ مضبوط ہے۔

لیکن اگر یہی معاملہ ہو بہو، مثال کے طور پر ایک سخت گیر ہندو معاشرے میں درپیش ہو تو پھر؟ ہندو معاشرے میں گائے کو مقدس سمجھا جاتا ہے۔۔۔ یا کوئی دوسرا ایسا معاشرہ جہاں جانوروں کے حقوق برتر ہوں تو پروفیسر ایڈورڈ کی تحقیق جو گائیوں کی نفسیات سے متعلق ہے، عین ممکن ہے فنڈ حاصل کرلے۔ لیکن اگر پروفیسر ایڈورڈ کسی ایسے معاشرے میں بسر رکھتے ہیں جہاں انسانی صحت اور دودھ کی تجارتی قدر وقیمت، گائیوں کے احساسات سے زیادہ ہے۔۔۔ پروفیسر کو چاہیے کہ وہ اپنا تحقیقی مقالے کا مسودہ برتر مفروضوں پر پورا اترنے کے لیے تیار کریں۔ مثال کے طور پر پروفیسر ایڈورڈ اپنی تحقیقی مقالے کا خلاصہ کچھ یوں بھی پیش کر سکتے ہیں کہ: 'گائے میں ڈپریشن دودھ کی پیداوار میں کمی کا باعث ہو سکتا ہے۔ اگر ہم دودھ دینے والی گائیوں کی نفسیاتی حالت کو سمجھ سکیں تو عین ممکن ہے کہ ہم ایسی ذہنی اور اعصابی دوائیاں ایجاد کر سکتے ہیں جو گائیوں کی خو اور طبیعت کو بہتر بنا سکتی ہیں۔ ان دوائیوں کے استعمال سے دودھ کی پیداوار میں دس فیصد اضافے کا قوی امکان بن سکتا ہے۔ ہمارے اندازے کے مطابق، دودھ کی دس فیصد اضافی پیداوار کے ساتھ ساتھ گائیوں کی ذہنی اور اعصابی دوائیوں کے لیے سالانہ بین الاقوامی سطح پر 250 ملین ڈالر کی تجارت بھی ممکن بنائی جاسکتی ہے'۔

تو کہنے کا مقصد یہ ہے کہ سائنس خود اپنی ترجیحات کا تعین کرنے سے قاصر ہے۔ اسی طرح یہ ہر طرح کی دریافتوں کے استعمال سے متعلق بھی کچھ کہنے کی اہل نہیں ہوتی۔ مثال کے طور پر ایک خالص سائنسی نکتہ نظر سے دیکھا جائے تو ہم نہیں جانتے کہ آخر ہم روز بروز جینیات سے متعلق بڑھتی ہوئی سمجھ بوجھ کے ساتھ کیا کریں؟ کیا ہم اس علم کو کینسر کے علاج کے لیے استعمال کریں، جینیاتی طور پر ایک ملکوتی انسان تخلیق کریں یا بڑے بڑے تھن والی گائیوں کی نسل بڑھائیں جو دودھ کی خوب پیداوار کریں؟ یہ صاف ظاہر ہے کہ ایک آزاد خیال لبرل حکومت، ایک اشتراکی یا سوشلسٹ حکومت، ایک نازی حکومت اور ایک سرمایہ دارانہ کاروباری فرم۔۔۔ ایک ہی سائنسی دریافت کو

ایک دوسرے سے بالکل مختلف مقاصد کے لیے استعمال کرنے کو ترجیح دیں گے۔ ان کے اس ترجیحاتی فیصلے کی کوئی سائنسی وجہ نہیں ہو سکتی۔

مختصراًیہ کہ کوئی بھی سائنسی تحقیق کسی نظریے یا عقیدے کے ساتھ جڑے بغیر کبھی نہیں پنپ سکتی۔ یہ عقائد اور نظریاتی تصورات ہی ہوتے ہیں جو سائنسی تحقیق پر اٹھنے والے خرچ کا جواز پیدا کرتے ہیں۔ اس سودے کے بدلے میں نظریاتی تصورات نہ صرف یہ کہ سائنسی ایجنڈے پر اثرانداز ہوتے ہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ سائنسی دریافتوں کے استعمال کا فیصلہ اور تعین بھی یہی کرتے ہیں۔ چنانچہ انسانیت کا یوں سائنسی طور پر کسی اور طرف نکلنے کی بجائے ایلاموگورڈو میں ایٹمی تجربے اور چاند پر قدم رکھنے کے معاملے کو سمجھنے کے لیے صرف اور صرف طبیعیات، حیاتیات اور سماجیات کے شعبوں خالصتاً سائنسدانوں کی کامیابیوں پر صرف نظر کرنا کافی نہیں ہو گا۔ ہمیں ان نظریاتی، سیاسی اور معاشی عوامل کو بھی خاطر میں لانا ہو گا جن کی بنیاد پر طبیعیات، حیاتیات اور سماجیات کی ترجیحات طے ہوتی ہیں، یہ شعبے سائنسی تحقیق میں ایک مخصوص راستہ پکڑ کر باقی سبھی راستوں کو چھوڑ دیتے ہیں۔

اس ضمن میں دو عوامل ایسے ہیں جو ہماری توجہ کے متقاضی ہیں۔ ان میں اول تو سامراجیت ہے جبکہ دوسرا ہمارا سرمایہ داری نظام ہے۔ سائنس، سلطنت اور سرمائے یا وسائل کے بیچ جو چکر چل پڑا ہے۔۔۔ یہ پچھلے 500 سالہ تاریخ کا واقعی انجن ثابت ہوا ہے۔ اگلے ابواب میں ہم اسی چکر پر نظر ڈالیں گے اور دیکھیں گے کہ یہ چکر کیسے چلتا ہے؟ سب سے پہلے تو ہم سائنس اور سلطنت کی جڑواں ٹربائن کا جائزہ لیں گے اور دیکھیں گے کہ یہ ایک دوسرے میں کیسے گراریوں کی طرح پیوست ہیں اور پہیوں کی مانند چلتی ہے تو دریافتیں ہوتی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ لیکن بعد میں ہم یہ بھی دیکھیں گے کہ اس جڑواں ٹربائن کو چلانے والا سرمایہ داری نامی مالیاتی وسائل کا پمپ اس ٹربائن کے ساتھ کیسے جڑ کر کام کرتا ہے۔

سائنس اور سلطنت کا بیاہ

زمین اور سورج کے بیچ کتنا فاصلہ ہے؟ یہ ایسا سوال ہے جو ہر جدید ماہر فلکیات کی دلچسپی کا سامان رہا ہے۔ یہ سوال اس وقت مزید دلچسپ ہو گیا تھا جب کوپرنیکس نامی پولش ماہر فلکیات نے 1510ء میں یہ دلیل پیش کی کہ کائنات کا مرکز زمین نہیں بلکہ سورج ہے۔ یہ دلیل عام ہوتے ہی ماہرین فلکیات اور ریاضی دانوں کی کثیر تعداد اس فاصلے کا حساب کتاب لگانے میں مصروف ہو گئی لیکن ان کے استعمال کردہ مختلف طریقوں سے ملنے والے نتائج ایک دوسرے سے بہت ہی زیادہ مختلف نکلے۔ اس فاصلے کا تعین کرنے کے لیے ایک مستند طریقہ کہیں اٹھارھویں صدی کے وسط میں پہنچ کر سامنے آیا۔ ہوتا یوں ہے کہ سیارہ زہرہ ہر چند سال کے بعد عین سورج اور زمین کے درمیان میں سے گزرتا ہے۔ اگر زمین کے دور دراز یا مختلف سروں پر کھڑے ہو کر مشاہدہ کریں تو سیارہ زہرہ کے اس گزر کا دورانیہ

مختلف ہوتا ہے۔ اس کی وجہ مشاہدے کے مقام اور دیکھنے کے زاویے سے جڑی ہوتی ہے۔ اگر سیارہ زہرہ کے اس گزر کو مختلف براعظموں سے کئی کئی بار مشاہدہ کریں تو حاصل ہونے والی معلومات کو مجتمع کرنے کے لیے سادہ ٹرگنومیٹری یا مثلثات کافی ہوتی ہے۔۔۔اور یوں مثلثات کی مدد سے ہمیں زمین اور سورج کے بیچ بالکل درست فاصلے کا پتہ چل جاتا ہے۔

فلکیات کے ماہرین نے پیشگوئی کی کہ سیارہ زہرہ اگلی بار 1761ء اور پھر 1769ء میں سورج اور زمین کے درمیان سے گزرے گا۔ چنانچہ، یورپ سے دنیا کے چاروں کونوں میں مہماتی ٹکڑیاں روانہ کی گئیں تاکہ وہ سیارہ زہرہ کے اس گزر کا جتنی دور اور جتنی زیادہ مقامات سے ممکن ہو، مشاہدہ کر سکیں۔ 1761ء میں سائنسدانوں نے اس گزر کا مشاہدہ سائبیریا، شمالی امریکہ، مڈاگاسکر اور جنوبی افریقہ کے مقامات پر کیا۔ جیسے جیسے 1769ء کا گزر نزدیک آتا گیا، یورپ کی سائنسی کمیونٹی نے بھتیرا زور ڈال کر سائنسدانوں کو کینیڈا اور کیلیفورنیا بھجوایا۔ اس وقت کینیڈا اور کیلیفورنیا، دونوں ہی مقامات بیابان اور ویرانہ ہوا کرتے تھے۔ لندن کی قدرتی علوم سے متعلق رائل سوسائٹی نے اندازہ لگایا کہ غالباًیہ کافی نہیں ہو گا۔ چنانچہ، مزید بہتر نتائج حاصل کرنے کے لیے ضروری تھا کہ کسی ماہر فلکیات کو جنوب مغربی بحرالکاہل کی جانب بھی روانہ کیا جائے۔

اس ضمن میں رائل سوسائٹی نے چارلس گرین نامی ممتاز ماہر فلکیات کو تاہیٹی نامی جزیرے پر بھجوانے کا فیصلہ کیا۔ اس مقصد کے لیے ہر کوشش اور پیسے کی ہر کوڑی کی دستیابی کو یقینی بنایا گیا۔ لیکن اب چونکہ یہ ایک نہایت مہنگی مہم تھی تو صرف ایک ماہر فلکیات کو صرف ایک فلکیاتی مشاہدے کے لیے روانہ کرنا، احمقانہ بات تھی۔ چنانچہ، گرین کے ساتھ آٹھ دوسرے شعبوں کے ماہرین کو بھی تیار کیا گیا۔ اس ٹیم کی سربراہی نباتات کے ماہر جوزف بینکس اور ڈینئیل سولانڈر کر رہے تھے۔ ٹیم میں چند فن کاروں کو بھی شامل کر دیا گیا تھا جن کا کام یہ تھا کہ وہ نئے علاقوں، نباتات، حیوانات اور لوگوں کی مصوری کریں تاکہ سائنسدانوں کو بعد میں اپنے مشاہدے میں کوئی شک و شبہ نہ رہے اور ریکارڈ بھی حاصل ہو جائے۔ رائل سوسائٹی اور انگلستانی بینکوں نے اس زمانے کے حساب سے جدید ترین سائنسی آلات خریدنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی اور یوں یہ مہم بالآخر جیمز کک نامی تجربہ کار ملاح کی سرپرستی میں شروع کر دی گئی۔ جیمز کک صرف ملاح ہی نہیں بلکہ انتہائی معتبر جغرافیہ دان اور نژاد نامہ نگار بھی تھا۔

یہ مہم جو مشن 1768ء میں انگلستان سے روانہ ہوا اور 1769ء میں تاہیٹی کے جزیرے پر سیارہ زہرہ کی گزر کا بھرپور مشاہدہ کیا۔ اس بحری سفر کے دوران مشن نے فلکیاتی مشاہدے کے ساتھ ساتھ بحرالکاہل کے کئی جزیروں بارے معلومات جمع کیں، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ بھی پہنچے اور پھر 1771ء میں کامیابی کے ساتھ واپس انگلستان لوٹ گئے۔ اس مہم کے دوران فلکیاتی، جغرافیائی، موسمیاتی، نباتاتی، حیواناتی اور بشریات کے شعبوں سے متعلق معلومات کا وسیع ذخیرہ جمع کیا گیا تھا جو کئی سائنسی شعبوں میں انتہائی کارآمد ثابت ہوا۔ علاوہ ازیں، اس

مہم اور حاصل ہونے والے علم نے یورپیوں کی جنوبی بحرالکاہل سے متعلق دلچسپی اور تخیل کو آسمان کی بلندیوں پر پہنچا دیا جبکہ فلکیات اور فطری علوم کے ماہرین کی آنے والی کئی نسلوں کے لیے فیض اور تحریک کا سامان بھی بن گیا۔

کک مشن ناامیاس شہرہ آفاق سائنسی مہم سے بالخصوص فائدہ اٹھانے والا شعبہ طب کا تھا۔ اس زمانے میں، دور دراز سمندری سفر پر نکلنے والے بحری بیڑوں کو پہلے سے ہی اندازہ ہوتا تھا کہ آدھے سے زیادہ جہازی عملہ یہ سفر مکمل نہیں کر پائے گا۔ اس ہلاکت خیز حقیقت کی وجہ دشمنوں کے جنگی جہاز، بپھری ہوئی مقامی آبادیاں، سمندری طوفان یا یادِ وطن کا ملال نہیں ہوتی تھی بلکہ ایک پُراسرار بیماری تھی۔ اس بیماری کو اسقربوط یا اسکروی جیسے مختلف ناموں سے جانا جاتا ہے۔ جن لوگوں کو یہ بیماری لاحق ہو جاتی تو انھیں بے پناہ تھکن اور افسردگی کا احساس ہوتا۔ پھر ان کے موڑوں، جبڑوں اور گوشت کے باقی نرم بافتوں سے خون بہنے لگتا۔ جیسے جیسے بیماری بڑھتی جاتی، مریض کے دانت گرتے جاتے، زخم کھل کر پھیلتے جاتے اور سخت بخار اور یرقان بھی ہو جاتا۔ آخر کار، مریض اپنی ٹانگوں پر کھڑے ہونے سے بھی قاصر ہو جاتا۔ ایک اندازے کے مطابق سولھویں سے اٹھارھویں صدی کے بیچ سکروی کی وجہ سے تقریباً بیس لاکھ ملاح اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ اس کا سبب کسی کو معلوم نہیں تھا۔ کوئی دوا، دارو اور تدبیر علاج کا کام نہیں کرتی تھی۔۔۔ ملاح گویا انبوہ میں مرتے رہے۔ اس ضمن میں فیصلہ کن موڑ 1747ء میں سامنے آیا۔ ایک برطانوی طبیب تھا جس کا نام جیمز لند تھا۔ جیمز لند نے اس بیماری سے متاثرہ ملاحوں پر ایک مضبط تجربہ کیا۔ وہ یوں کہ اس نے سکروی کے مریضوں کو کئی گروہوں میں بانٹ دیا اور ہر گروہ کا علاج مختلف دوائی اور طریقے سے کرنا شروع کیا۔ ان میں سے مریضوں کا ایک گروہ ایسا تھا جسے ہدایت دی گئی کہ وہ ترش اور ترنجی پھلوں کا خوب استعمال کریں۔ سکروی کے علاج کے لیے ترش اور ترنجی پھل جیسے لیموں اور چکوترے وغیرہ کو تریاق سمجھا جاتا تھا۔ اس گروہ کے مریضوں کی حالت میں ترش پھلوں کے باقاعدہ استعمال سے یکدم ہی بہتری آ گئی۔ لند یہ نہیں جانتا تھا کہ ملاح اس شے کی کمی کا شکار ہیں جو ترش پھلوں میں بکثرت پائی جاتی ہے۔۔۔ آج ہم اس 'شے' کو وٹامن سی کے نام سے جانتے ہیں۔ اس وقت بحری جہازوں پر استعمال ہونے والی عام غذا میں وہ خوراکیں شامل نہیں ہوتی تھیں جن میں اس انتہائی ضروری جز کی کثرت ہو۔۔۔ یعنی طویل مدت کے بحری سفروں پر بوجوہ بسکٹ، بیف کے قتلے اور ایسی خوراکیں استعمال کی جاتی تھیں جو جلد خراب نہ ہوں۔ ان طویل بحری سفروں پر جانے والے ملاح سبزیوں اور پھلوں کا بالکل بھی استعمال نہیں کرتے تھے۔

لند کے یہ تجربات رائل نیوی کو تو قائل نہیں کر سکے لیکن جیمز کک کو لند کی تحقیق پر پورا بھروسا تھا۔ چنانچہ، اس نے ڈاکٹر لند کی اس تحقیق کو عملی مشاہدے میں ڈھال کر ثابت کرنے کا فیصلہ کیا۔ جیمز کک نے اپنے بحری بیڑے پر روایتی کرم کلہ کے اچار کی وسیع مقدار بھی جمع کر لی۔ اچار کو روزمرہ خوراک کا لازمی جز بنا دیا گیا اور سارے ملاحوں کو حکم دیا کہ وہ جب بھی کسی بندرگاہ پر لنگر انداز ہوں تو زیادہ سے زیادہ تازہ پھلوں اور سبزیوں کا استعمال کریں۔ اس بحری مہم کے دوران، جیمز کے بحری بیڑے میں شامل ایک بھی ملاح سکروی کا

شکار نہیں ہوا۔ آنے والی دہائیوں میں دنیا بھر کی نیویوں اور تجارتی بحری بیڑوں نے کک کی ملاحی خوراک کا استعمال شروع کر دیا اور یوں تب سے لے کر آج تک لاتعداد ملاحوں اور مسافروں کی زندگیاں محفوظ ہو گئیں۔

تاہم، کک مشن کا ایک اور نتیجہ بھی بر آمد ہوا۔ یہ بے ضرر اور معمولی نتیجہ نہیں تھا۔ کک صرف تجربہ کار ملاح اور جغرافیہ دان ہی نہیں بلکہ ایک نیول افسر بھی تھا۔ اگرچہ اس مہم پر اٹھنے والے خرچ کا بڑا حصہ رائل سوسائٹی نے اپنی جیب سے ادا کیا تھا لیکن بحری جہاز، بہر حال رائل نیوی کا فراہم کردہ تھا۔ نیوی نے اس سفر پر اپنے پچاسی ملاحوں اور بحری فوجیوں کو توپخانے، توڑے دار بندوقوں، بارود اور دوسرے ہتھیاروں سے مسلح کر کے جہاز پر ساتھ روانہ کر دیا۔ اس مہم کے نتیجے میں جمع ہونے والی معلومات۔۔۔ بالخصوص فلکیاتی، جغرافیائی، موسمیاتی اور بشریاتی معلومات کی صاف اور عیاں سیاسی اور عسکری اہمیت تھی۔ سکروی کے موثر علاج کی دریافت سے انگریزوں کو دنیا بھر کے سمندروں پر کنٹرول حاصل کرنے کی دوڑ میں واضح برتری مل گئی تھی اور اب وہ بڑی بڑی افواج کو دنیا کے کسی کونے میں بھی بھجوا سکتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ جیمز کک نے اس مہم کے دوران ان جزیروں اور علاقوں پر انگلستان کا جھنڈا اور دعویٰ بھی قائم کر دیا جو اس نے 'دریافت' کیے تھے۔ ان میں سب سے اہم، آسٹریلیا کا براعظمی جزیرہ تھا۔ یہ جیمز کک ہی تھا جس نے اس مہم کی صورت میں انگریزوں کی جنوب مغربی بحرالکاہل پر تسلط کی بنیاد ڈالی اور اس کے نتیجے میں آسٹریلیا، تسمانیہ اور نیوزی لینڈ پر فتح حاصل کرنے کی راہ صاف کی۔ اس مہم کے نتیجے میں یورپیوں کے لیے ان نئی کالونیوں میں سکونت کا راستہ بھی بن گیا اور مقامی تہذیبیں، ثقافتیں اور انسانی آبادیاں پامالی کا شکار ہو گئیں۔ یعنی، ان کا ناس مارا گیا۔

کک مشن کے تقریباً ایک سو سال بعد یورپیوں نے آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کی زرخیز اراضیوں پر قبضہ کر کے مقامی آبادیوں کو نکال باہر کیا۔ یہاں کی تقریباً نوے فیصد آبادیاں مر مٹ گئیں جبکہ باقی بچ رہنے والوں کو سخت راج، نسلی جبر اور بے رحم استبداد کا سامنا کرنا پڑا۔ کک مشن آسٹریلیا کے ابراجینوں اور نیوزی لینڈ کے ماؤریوں کے لیے اس تباہی اور بربادی کا آغاز ثابت ہوا، جس سے وہ پھر کبھی بھی دوبارہ سنبھل نہیں سکے۔

تسمانیہ کی مقامی اور آبائی آبادیوں پر تو اس سے بھی کہیں زیادہ بدبختی ٹوٹ پڑی۔ یہ وہ آبادیاں تھیں جو پچھلے دس ہزار سال سے باقی دنیا سے کٹ کر نہایت طمانیت سے بسر کرتی چلی آ رہی تھیں۔۔۔ اب، صرف سو سال کے عرصے میں ہی ان کے آخری مرد، عورت اور بچے تک کا بھی صفایا ہو گیا۔ یورپی آباد کاروں نے سب سے پہلے ان مقامی باشندوں کو جزیرے کے زرخیز علاقوں سے نکال باہر کیا اور پھر باقی بچ رہنے والی بیابان اور جنگل وغیرہ میں تسمانیوں کا پیچھا کر کے نہایت منظم انداز میں چن چن کر قتل کر دیا گیا۔ وہ جو پھر بھی بچ گئے، انھیں مشنری کیمپوں میں جبری بھرتی کر دیا گیا۔۔۔ جہاں اپنے تئیں خیر خواہ لیکن انتہائی تنگ ذہن عیسائی پادریوں نے ان تسمانیوں کو زبردستی جدید دنیا کے طور طریقے اور عقیدے سکھانا شروع کر دیے۔ تسمانیوں کو لکھنے اور پڑھنے کے گر سکھانے کے ساتھ

ساتھ عیسائیت اور کئی 'فائدہ مند ہنر' جیسے کپڑے سینا اور کاشتکاری وغیرہ بھی زبردستی سکھانے کی بھرپور کوشش کی گئی لیکن تسمانیوں نے یہ سب سیکھنے سے یکسر انکار کر دیا۔ بجائے، وہ اب پہلے سے کہیں زیادہ مالیخولیا کا شکار ہو گئے۔ انھوں نے بچے پیدا کرنا چھوڑ دیا اور مکمل طور پر زندگی میں دلچسپی کھو دی اور یوں آخر میں اس جدید دنیا کی سائنس اور ترقی سے جان چھڑانے کے واحد راستہ۔۔۔یعنی موت کو چن لیا۔

قصہ یہاں تمام نہیں ہوا۔ تسمانیوں کو تو موت کے بعد بھی سکون نہ مل سکا۔ سائنس اور ترقی نے اب بھی ان کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ دنیا کے آخری تسمانیوں کی لاشوں پر بشریات کے ماہرین اور عجائب خانوں نے سائنس کے نام پر قبضہ کر لیا۔ ان کی لاشوں کی چیر پھاڑ کی گئی، وزن اور پیمائش کر کے تحقیق کے بعد یہ علم طویل مقالوں میں تجزیوں کی صورت پیش کیا گیا۔ جب یہ سب ہو گیا تو تسمانیوں کی کھوپڑیاں اور ڈھانچوں کو بشریاتی نوادرات بنا کر عجائب گھروں کی زینت بنا دیا گیا۔ یہ تو 1976ء میں ایسا ہوا کہ تسمانوی عجائب گھر نے پرزور احتجاج کے بعد سو برس پہلے انتقال کر جانے والی ترو گانینی نامی آخری تسمانوی عورت کے ڈھانچے کو باعزت طریقے سے دفن کرنے پر رضامندی ظاہر کی۔ برطانیہ کا رائل کالج آف سرجنز تو اس عورت کی جلد اور بالوں کے نمونوں کو 2002ء میں بھی چھوڑنے پر راضی نہ تھا لیکن بعد ازاں یہ باقیات بھی دفن کر دی گئیں۔

اب یہاں سوال یہ ہے کہ کیا کک مشن ایک سائنسی مہم تھی جس کو فوجی تحفظ حاصل تھا یا پھر یہ خالصتاً ایک فوجی مہم تھی جس میں چند سائنسدانوں کو بھی ساتھ نتھی کر دیا گیا تھا؟ یہ ایسے ہی جیسے پوچھا جائے کہ بھئی، آپ کے پانی کا گلاس آدھا خالی ہے یا آدھا بھرا ہوا ہے؟ یہ دونوں ہی تھے۔۔۔یہ فوجی اور سائنسی مہم تھی۔ سائنسی انقلاب اور جدید سامراجیت ایک دوسرے میں ایسے گندھ گئی تھیں کہ انھیں الگ کرنا بھی ممکن نہیں تھا۔ کیپٹن جیمز کک اور نباتات کے ماہر جوزف بینکس جیسے لوگ بھی سائنس اور سلطنت میں فرق نہیں دیکھ سکتے تھے۔۔۔صرف یہی نہیں بلکہ بدقسمت ترو گانینی بھی پوری زندگی سائنس اور سلطنت کے بیچ عقد میں ترقی نام کی اس بلا کو سمجھنے سے سرے سے قاصر رہی۔

یورپ ہی کیوں؟

یہ حقیقت کہ بحر اوقیانوس کے کسی جزیرے کے ہاتھوں آسٹریلیا کے جنوب میں ایک جزیرے کو فتح کرنا، تاریخ کا سب سے منفرد واقعات میں سے ایک تھا۔ کک مشن سے قبل تک، برطانوی جزائر اور مغربی یورپ عمومی طور پر بحیرہ روم کے ارد گرد پیچھے کی جانب بند پانیوں کی دنیا تھی۔ اس خطے میں قابل ذکر اور اہمیت کا حامل کچھ بھی نہیں تھا۔ یہاں تک کہ جدید دور سے قبل دور کی قابل ذکر یورپی سلطنت بھی وسائل جمع کرنے کے لیے شمالی افریقہ، بلقان اور مشرق وسطیٰ کے صوبوں پر تکیہ کرتی تھی۔ رومی سلطنت کے یہ مغربی

یورپی صوبے۔۔۔ غریب اور گنوار مشہور تھے جہاں سے معدنیات اور غلاموں کے سوا کچھ میسر نہ آتا تھا۔ شمالی یورپ تو اس قدر اجاڑ اور بربر تھا کہ اس کو فتح کرنے کا سرے سے کوئی مقصد ہی نہیں تھا۔

35: آخری تسمانوی عورت

یہ تو پندرھویں صدی کے اواخر کا قصہ ہے کہ یورپ اہم فوجی، سیاسی، معاشی اور ثقافتی ترقی کا مرکز بن گیا۔ 1500ء سے 1750ء کے درمیانی عرصے کے دوران مغربی یورپ نے پہلی دفعہ زور پکڑا اور 'بیرونی دنیا' کا آقا بن گیا۔ یعنی، دو امریکی براعظموں اور سمندروں پر اس کی حاکمیت قائم ہو گئی۔ لیکن یورپ ان فتوحات کے باوجود بھی ایشیاء کی عظیم طاقتوں کا کسی طور مقابلہ کرنے کا اہل نہ تھا۔ یورپیوں نے امریکہ کے براعظم اس لیے فتح کر لیے تھے کہ انھیں یہاں کسی قسم کی مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا بلکہ اس سے بھی اہم یہ تھا کہ ایشیائی طاقتوں کا ان سمندروں میں دلچسپی کا کوئی سامان نہیں تھا۔ جدید دور کے اوائل کا زمانہ بحیرہ روم کے ارد گرد عثمانیہ، فارس میں سفوید، ہندوستان میں مغل اور چین میں منگ اور چنگ سلطنتوں کے لیے سنہری دور کی حیثیت رکھتا تھا۔ ان سلطنتوں نے پہلے ہی اپنی سرحدیں اس قدر پھیلا رکھی تھیں کہ بے نظیر آبادیات اور معاشی ترقی کا مظہر تھیں۔ 1775ء میں عالمی معیشت میں ایشیاء کا حصہ تقریباً 80 فیصد تھا۔ چین اور ہندوستان کی معیشت مل کر عالمی پیداوار کی دو تہائی حصے پر مشتمل تھی۔ اس کے مقابلے میں یورپ ایک معاشی بونے کی طرح تھا۔

یہ تو صرف سو سال، یعنی 1750ء سے 1850ء کے درمیانی عرصے کا قصہ ہے کہ عالمی طاقت کا مرکز یورپ میں مجتمع ہو گیا۔ یہ وہ دور تھا کہ یورپیوں نے ایشیائی طاقتوں کو جنگ و جدل میں ایشیائیوں کو ذلیل و رسوا کر کے رکھ دیا اور اس دیو ہیکل براعظم کے تقریباً سارے حصے پر قبضہ کر لیا۔ 1900ء تک یورپی دنیا کی معیشت اور علاقے پر اپنا تسلط مضبوطی سے قائم کر چکے تھے۔ 1950ء میں صورتحال یہ تھی کہ مغربی یورپ اور ریاستہائے متحدہ امریکہ مل کر عالمی پیداوار کے آدھے حصے پر اجارہ دار تھے جبکہ اس پیداوار میں چینیوں کا حصہ

بمشکل 5 فیصد تھا۔ یورپیوں کی سرپرستی میں ایک نیا عالمی نظام اور تہذیب نے جنم لیا۔ آج، دنیا بھر کے انسان۔۔۔ بھلے وہ انکار کریں لیکن یہ حقیقت ہے کہ ایک یا دوسری صورت یورپی طرز پر لباس، سوچ اور ذوق کے حامل ہیں۔ وہ بھلے اپنے بیانیے میں یورپ کی زور و شور سے مخالفت کریں لیکن اس کرہ ارض پر بسنے والا ہر شخص سیاست، طب، عسکریت اور معیشت کو یورپی نظروں سے دیکھنے پر مجبور ہے۔ دنیا بھر کے لوگ وہ موسیقی سنتے ہیں جو یورپی ترنگوں پر بجائی جاتی ہے جبکہ وہ سب کچھ ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں جو یورپی زبانوں میں لکھا گیا ہے۔ آج چینی معیشت بہت تیزی کے ساتھ پھل پھول رہی ہے اور یہ عین ممکن ہے کہ جلد ہی عالمی برتری بھی حاصل کر لے گی لیکن حقیقت یہ ہے کہ چینی کا پیداواری اور مالیاتی ماڈل بھی اساسی طور پر یورپی ہی ہے۔

تو پھر یہ کیونکر ہوا کہ یوریشائی دنیا کے اس سرد اور مردہ حصے نے کرہ ارض کے دور دراز کونے سے قدرتی چنگل توڑ کر پوری دنیا کو فتح کرنے کی کامیابی حاصل کر لی؟ اس بے نظیر کامیابی کا سہرا عام طور پر یورپی سائنسدانوں کے سر پر باندھا جاتا ہے۔ اس امر میں تو سرے سے کوئی شک و شبہ نہیں ہے کہ 1850ء کے بعد یورپی تسلط اور غلبے میں عسکری، صنعتی اور سائنسی مثلث اور ٹیکنالوجی کا بھرپور ہاتھ ہے۔ آخری دور کی تقریباً سبھی جدید سلطنتوں نے سائنسی تحقیق کو اس امید پر بڑھاوا دیا کہ بالآخر ٹیکنالوجی کا سحر سر چڑھ کر بولے گا۔ یہی نہیں بلکہ سائنسدانوں کی اکثریت اپنا بھرپور وقت اپنے سامراجی آقاؤں کے لیے ہتھیار، ادویات اور مشینیں ایجاد کرنے میں گزاریں گے۔ یورپی سپاہیوں کے یہاں افریقی دشمنوں کا سامنا کرنے کے حوالے سے ایک عام کہاوت مشہور تھی، 'ان کو آنے دو۔۔۔ ہمارے پاس مشین گنیں ہیں، جو ان کے پاس نہیں ہیں!'۔ لیکن یہ کہاوت اس لیے معنی نہیں رکھتی تھی کیونکہ عسکری ٹیکنالوجی تو رہی ایک طرف، سول ٹیکنالوجی بھی فوجی مقاصد کے لیے بھرپور استعمال ہو سکتی تھی۔ فوجی ڈبہ بند خوراکیں استعمال کرتے تھے، ریل گاڑیاں اور بھاپ سے چلنے والے بحری جہاز فوجیوں کو اور ان کی ضروریات کو اگلے مورچوں تک فٹ سے پہنچا دیتے تھے جبکہ نت نئی ادویات سے سپاہی، ملاح اور ٹرین چلانے والے انجنیئر بھی دوبارہ سے تندرست ہو جاتے تھے۔ اس انصرامی جدت نے یورپیوں کو وہ برتری دی کہ افریقہ کسی مشین گن کے ذریعے نہیں بلکہ انتظام کی بدولت فتح ہوا تھا۔

لیکن 1850ء سے قبل حالات اتنے آسان نہیں رہے۔ یہ وہ دور تھا جب سائنسی، صنعتی اور عسکری مثلث ابھی شیر خواری میں تھی، سائنسی انقلاب کا پھل ابھی کچا تھا اور یورپی، ایشیائی اور افریقی طاقتوں کے بیچ ٹیکنالوجی کا فرق بہت ہی کم ہوا کرتا تھا۔ 1770ء میں جیمز کک کے پاس آسٹریلوی آبر جینوں کے مقابلے میں کہیں برتر ٹیکنالوجی تھی لیکن اس وقت ایسی ہی زبردست ٹیکنالوجی چینیوں اور عثمانیوں کے پاس بھی تھی۔ تو پھر ایسا کیوں ہوا کہ آسٹریلیا پر نو آبادیات کیپٹن جیمز کک نے قائم کیں جبکہ کیپٹن ژان ژینگژی اور کیپٹن حسین پاشا نے کبھی ایسی کوئی کوشش نہیں کی؟ اس سے بھی زیادہ اہم یہ تھا کہ اگر 1770ء میں یورپیوں کو مسلمانوں،

ہندوستانیوں اور چینیوں کے مقابلے میں کوئی تکنیکی برتری حاصل نہیں تھی تو پھر صرف سو برس کے عرصے میں انھوں نے اتنی زبردست جست کیسے لگالی؟ وہ باقی دنیا سے اتنے آگے کیسے نکل گئے؟

یہ عسکری صنعتی اور سائنسی مثلث یورپ میں کیوں پھل پھولا اور ہندوستان میں کیوں نہیں؟ جب انگلستان نے اس حوالے سے جست لگائی تو فرانس، جرمنی اور امریکہ نے فوراً ہی پیچھا کیا جب کہ چین نے بالکل کوئی کوشش نہیں کی؟ جب معیشت اور سیاست صنعتی اور غیر صنعتی اقوام کے بیچ واضح فرق پیدا کرنے والے عوامل ثابت ہوگئے تو روس، اٹلی اور آسٹریا نے تو فوراً ہی یہ راستہ چن لیا لیکن فارس، مصر اور سلطنت عثمانیہ نے خود کو کیوں نہیں ڈھالا؟ ویسے بھی، صنعتی دور کی پہلی لہر میں استعمال ہونے والی ٹیکنالوجی کا حصول خاصا آسان تھا۔ کیا چینیوں اور سلطنت عثمانیہ کے لیے بھاپ سے چلنے والے انجن، مشین گنیں ایجاد کرنا اور ریل کی پٹڑی بچھانا واقعی مشکل تھا؟

1830ء میں دنیا کی پہلی تجارتی ریل کی پٹڑی انگلستان میں کھولی گئی۔ 1850ء تک مغربی اقوام میں تقریباً چالیس ہزار کلومیٹر طویل ریل کی پٹڑی کا جال بچھ چکا تھا۔ لیکن اس وقت تک پورے ایشیاء، افریقہ اور لاطینی امریکہ میں ریلوے کی صرف چار ہزار کلومیٹر پٹڑی بچھ پائی تھی۔ 1880ء میں مغربی اقوام کے یہاں تین لاکھ پچاس ہزار کلومیٹر ریل کی پٹڑی تھی جبکہ باقی پوری دنیا میں یہ صرف پینتیس ہزار کلومیٹر تک ہی پہنچ پائی تھی۔ اس میں بھی زیادہ تر ریل کی وہ پٹڑی تھی جو انگریزوں نے ہندوستان میں بچھائی تھی۔ چین میں پہلی ریلوے لائن 1876ء میں کھلی۔ یہ پچیس کلومیٹر طویل ریلوے ٹریک تھا جو یورپیوں نے تعمیر کیا تھا۔ یہ ریلوے لائن بچھنے کے صرف ایک برس بعد چینیوں نے اسے تباہ کر دیا۔ 1880ء میں صورتحال یہ تھی کہ چینی سلطنت میں ایک بھی ریلوے ٹریک نہیں تھا۔ فارس میں پہلی ریلوے لائن 1888ء میں کھولی گئی۔ یہ ریلوے لائن تہران کو ایک اسلامی مقدس مقام کے ساتھ جوڑتی تھی جو شہر سے تقریباً دس کلومیٹر جنوب کی طرف واقع تھی۔ یہ ریلوے لائن بیلجیئم کی ایک کمپنی نے تعمیر کی تھی اور وہی اس کو چلانے کی ذمہ دار تھی۔ 1950ء تک فارس کا پورا ریلوے نیٹ ورک صرف 2500 کلومیٹر پٹڑی پر مشتمل تھا۔ ایک ایسے ملک میں، جو برطانیہ سے تقریباً سات گنا بڑا تھا۔۔۔ یہ ریلوے نیٹ ورک انتہائی اوسط اور معمولی تھا بلکہ نہ ہونے کے برابر تھا۔

چینی اور فارسیوں کے یہاں ٹیکنالوجی کا حصول کوئی مسئلہ نہیں تھا، جیسے بھاپ سے چلنے والے انجن با آسانی ایجاد کیے جا سکتے تھے بلکہ مفت نقل بھی ممکن تھی۔ حقیقت یہ تھی کہ چینی اور فارسیوں کے یہاں ان اقدار، اسطور، تصورات، قانونی سامان اور اس سماجی اور سیاسی ڈھانچے کی کمی تھی جو مغرب نے کئی سو برس لگا کر تشکیل دیے تھے۔ یہ ایسی شے تھے جو نقل کی جا سکتی تھی اور نہ ہی اندرونی سطح پر اس کو ترجیحی معاملہ بنایا جاسکتا تھا۔ فرانس اور امریکہ، برطانیہ کے قدموں میں قدم ملاتے ہوئے اس لیے اہل ہوگئے کیونکہ فرانسیسی اور امریکی بھی انگریزوں کے اہم ترین تصورات اور سماجی ڈھانچوں پر پہلے سے ہی یقین رکھتے تھے۔ چینی اور فارسی اس لیے پیچھے رہ گئے کیونکہ ان کے یہاں سوچ اور سماجی تنظیم، انتہائی مختلف طریقے سے برتائی جاتی تھی۔

اس وضاحت سے 1500ء سے لے کر 1850ء تک کے درمیانی عرصے پر نئی روشنی پڑ جاتی ہے۔ اس عرصے کے دوران یورپ کو کسی بھی صورت ،ایشیائی طاقتوں پر قطعاً بھی فنی،سیاسی، عسکری یا معاشی برتری حاصل نہیں تھی لیکن اس کے باوجود اس براعظم نے یکتا اور منفرد احتمال پیدا کیا جو ناقابل شکست تھا۔ یہ امکان کی ایسی طاقت تھی جس کی اہمیت 1850ء میں اچانک ہی پوری قوت کے ساتھ سامنے آ کر واضح ہو گئی۔ 1750ء میں یورپ، چین اور اسلامی دنیا کے بیچ واضح برابری کا خیال،ایک سراب کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اس امر کو سمجھنے کے لیے فرض کریں کہ دو معمار ہیں۔ یہ دونوں معمار اپنے اپنے مینار تعمیر کرنے میں مصروف ہیں اور دونوں ہی خوب محنت سے کام کر رہے ہیں۔ اس مقصد کے لیے ایک معمار گارے مٹی اور لکڑی کی جبکہ دوسرا سٹیل اور کنکریٹ کی اینٹیں استعمال کر رہا ہے۔ پہلی نظر میں تو یہی دکھائی دے گا کہ ان دونوں طریقوں میں کوئی فرق نہیں ہے کیونکہ دونوں مینار ایک ہی رفتار اور بلندی پر پہنچ رہے ہیں۔ تاہم، جب ایک مخصوص دہلیز پار ہو جاتی ہے تو یقیناً گارے مٹی اور لکڑی سے بنا معمار بوجھ سہار نہیں سکے گا اور دھڑام سے نیچے گر جائے گا جبکہ سٹیل اور کنکریٹ سے تعمیر کیے گئے مینار پر ایک کے بعد دوسری اور اس کے اوپر کئی جہاں تک نظر پہنچ سکے۔۔۔ منزلیں تعمیر ہوتی جائیں گی۔

یورپ نے جدید دور کے اوائل میں ایسی کون سی امکانی قوت پیدا کرنا شروع کی جس کی بناء پر وہ جدید دنیا پر غالب آ گیا؟اس سوال کے دو تکمیلی جواب ہیں، ان میں پہلا جدید سائنس اور دوسرا سرمایہ داری نظام ہے۔ یورپی بہت پہلے ہی سائنسی اور سرمایہ دارانہ انداز میں سوچنا شروع ہو گئے تھے۔۔۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب انھیں ابھی کسی بھی طرح سے قابل ذکر فنی برتری حاصل نہیں تھی۔ جب فنی اور صنعتی طور پر کامیابیاں حاصل ہونی شروع ہوئیں تو یورپیوں کے ہاتھ ایسی جادو کی چھڑی آ گئی جو دنیا میں باقی کسی کے پاس نہیں تھی۔ انھوں نے اتنے بڑے پیمانے پر خوشحالی کو سینچنا شروع کر دیا، جس کی پہلے کوئی مثال نہیں ملتی تھی۔ تو اس لحاظ سے یہ محض کوئی اتفاقی معاملہ نہیں ہے کہ یورپی سامراج نے سائنس اور سرمایہ داری کو اپنا شیوہ بنا لیا اور اکیسویں صدی کی بعد از یورپی دنیا میں بھی اس کا ترکہ اور موروثیت جاری و ساری ہے۔ یورپ اور یورپی اب اس دنیا پر غالب نہیں ہیں لیکن سائنس اور سرمائے کا زور روز بروز بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ اگلے باب میں ہم سرمایہ داری نظام کی جیت پر نظر ڈالیں گے۔۔۔ فی الوقت، اس باب میں ہم یورپی سامراجیت اور جدید سائنس کے بیچ گہری محبت بارے جانیں گے۔

تسخیر کائنات

یورپی سلطنتوں کی مہربانی سے جدید سائنس نے خوب ترقی پائی لیکن اس کی کامیابی میں قدیم سائنسی روایات کا بھی بہت بڑا ہاتھ تھا۔ بالخصوص کلاسیکی یونانی، چینی، ہندوستانی اور اسلامی روایات نے خوب مدد دی۔ تاہم، جدید سائنس کا واقعی منفرد اور بے نظیر کردار جدید دور

کے اوائل میں اس وقت ظاہر ہوا جب سپین، پرتگال، انگلستان، فرانس، روس اور ہالینڈ وغیرہ نے سامراجیت کو توسیع دی۔ یہ اس جدید دور کے اوائل دنوں کی بات ہے جب چینی، ہندوستانی، مسلمان، امریکی انڈین اور پولی نیشیائی ابھی بھی سائنسی انقلاب میں اہم حصہ ڈال رہے تھے۔ یہ مسلمان معیشت دانوں کی فکر اور فراست تھی جس سے ایڈم سمتھ اور کارل مارکس نے بصیرت حاصل کی۔ امریکی انڈین طبیبوں کے نسخے تھے جو بعد ازاں مغربی، بالخصوص انگلستان میں طب کی کتابوں کی زینت بنے۔ پولی نیشیائی مخبروں نے جو معلومات جمع کی تھیں۔۔۔ ڈیٹا کے اس وسیع خزانے کی بدولت ہی مغرب میں علم بشریات کے شعبے میں انقلاب آیا۔ لیکن بیسویں صدی کے وسط تک وہ لوگ جو ان سائنسی دریافتوں کا موازنہ کرنے اور اس کے نتیجے میں سائنسی شعبے قائم کیے۔۔۔ وہ اصل میں یورپی سلطنتوں کی علمی اور حکمران اشرافیہ تھی۔ مشرق بعید اور اسلامی دنیا میں بھی اتنے ہی ذہین اور متجسس لوگ پائے جاتے تھے، جتنے یورپ میں تھے۔ تاہم، 1500ء سے لے کر 1950ء تک کے درمیانی عرصے میں یورپیوں کے علاوہ باقی دنیا نے نیوٹن کی طبیعیات اور ڈارون کی حیاتیات جیسی کوئی شے پیدا نہیں کی۔ وہ اس طرز کی جدت اور واقعی دریافت سے کوسوں دور تھے۔

لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ یورپیوں کی فطرت سائنسی یا ان کا خمیر دریافتوں کے لیے گندھا ہوا ہے۔ یہ سراسر احمقانہ خیال ہے۔۔۔ بلکہ یہ بھی یاد رہے کہ عین ممکن ہے کہ یورپی ہمیشہ ہی طبیعیات اور حیاتیات کے مطالعے اور تحقیق میں غالب نہیں رہیں گے۔ ان کی مثال بھی ویسی ہے جیسی عربوں کے اسلام کے ساتھ دیکھنے میں آئی تھی۔ اوائل میں تو عرب اسلام اور اس کے عقائد و نظریات پر غالب تھے لیکن پھر دیکھتے ہی دیکھتے ترک اور فارسیوں نے اس کو ہتھیا لیا تھا۔ تو کہنے کا مقصد یہ ہے کہ بھلے جدید سائنس یورپیوں کی خاصیت ضرور ہو لیکن آج۔۔۔ ہم دیکھتے ہیں کہ یہ بلاشک و شبہ کثیر النسلی انٹرپرائز بن چکی ہے۔ اب یہ صرف یورپ کا طرہ امتیاز نہیں رہا۔

جدید سائنس اور یورپی سامراج کے بیچ یہ لازوال تعلق کیسے پیدا ہوا؟ اس کی وجہ ٹیکنالوجی تو ہرگز نہیں تھی کیونکہ فنی اور تکنیکی میوے تو انیسویں اور بیسویں صدی میں سامنے آنے والے عوامل ہیں۔ جدید دور کے اوائل میں تو ٹیکنالوجی کی اتنی خاص اہمیت بھی نہیں تھی۔ تب اس سلسلے کی سب سے اہم وجہ یہ تھی کہ نباتات میں دلچسپی رکھنے والے ماہرین اور نوآبادیات کا شوق رکھنے والے نیول افسروں کا طرز خیال ایک ہی تھا۔ سائنسدان اور فاتحین میں ایک قدر مشترک تھی۔ وہ یہ کہ یہ دونوں ہی اپنی بے علمی اور جہالت کو تسلیم کرتے تھے۔ یہ دونوں ہی خود سے ایک بات کہتے تھے، بیرون میں جو کچھ ہے۔۔۔ اس کا مجھے قطعاً کوئی علم نہیں ہے!۔ اور یوں، وہ دونوں ہی خود کو باہر نکل کر نت نئی دریافتیں کرنے پر مجبور پاتے۔۔۔ یہی نہیں بلکہ یہ دونوں ہی اس امید پر آگے بڑھتے جاتے کہ نت نئے علم اور دریافتیں کسی نہ کسی موڑ پر کام آئیں گی اور وہ دنیا جہاں کے آقا بن جائیں گے۔ یہ ایک انوکھی لیکن انتہائی موثر تصوراتی دنیا تھی۔

تاریخ میں آج تک جتنے بھی سامراجی منصوبے سامنے آئے، یورپی سامراج ان سے یکسر مختلف تھا۔ اس سے قبل جتنے بھی سلطنتیں کھڑی کرنے کے خواہاں گزرے تھے، وہ اپنے تئیں یہ فرض کر کے اٹھے تھے کہ وہ دنیا کی ہر شے بارے پورا پورا علم رکھتے ہیں۔ ان کی

فتوحات اور توسیعی نظریات کا مقصد صرف اور صرف اپنے نکتہ نظر کو دنیا میں عام کرنا تھا۔ اس ضمن میں سب سے مقبول مثال عربوں کی ہے۔ عرب مسلمانوں نے مصر، سپین یا ہندوستان کو اس لیے فتح نہیں کیا تھا کہ وہ ان علاقوں میں وہ کچھ جاننے کی کوشش کریں جن کا انھیں علم نہ تھا بلکہ اسلامی تعلیمات کو عام کرنا مقصود تھا۔ اسی طرح رومیوں، منگولوں اور ازٹیکوں نے دور دراز تک نئے علاقے طاقت اور دولت حاصل کرنے کی غرض سے فتح کیے۔۔۔ ان کا مقصد علم کا حصول ہرگز نہیں تھا۔ اس کے برعکس یورپی سامراج نے دور دراز۔۔۔ دنیا کے کونے کونے کو فتح کرنے نکلے تو انھیں امید تھی کہ نوآبادیات کے ساتھ ساتھ ان کے ہاتھ نیا علم اور آگاہی بھی ہاتھ آئے گی۔

جیمز کُک اس طرز کی سوچ پالنے والا پہلا مہم جو نہیں تھا۔ پرتگالی اور ہسپانوی مہم جو تو پندرھویں اور سولھویں صدی میں اس طرز کی سوچ پال کر پہلے ہی کئی کئی سفروں پر نکل چکے تھے۔ پرنس ہینری نامی جہاز راں اور واسکوڈی گاما نے افریقہ کے ساحلوں کو کھوج نکالا تھا اور اس دوران کئی جزیروں اور بندرگاہوں پر تسلط بھی جمالیا تھا۔ کرسٹوفر کولمبس نے امریکہ 'دریافت' کیا تھا اور یہاں قدم رکھتے ہی ان نئے علاقوں پر ہسپانوی شہنشاؤں کے نام پر دعویدار بن بیٹھا تھا۔ جب فرڈیننڈ میگلان نے دنیا کے گرد چکر پورا کرنے کا طریقہ ڈھونڈ نکالا تو اس نے بیک وقت سپین کے لیے فلپائن پر غلبے کی بنیاد بھی ڈال دی تھی۔

جوں جوں وقت گزرتا گیا علم کے حصول کی طلب اور علاقائی تسخیر کا جنون۔۔۔ ایک دوسرے میں مزید سختی سے مدغم ہوتے چلے گئے۔ اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے دوران یورپ سے جتنی بھی اہم عسکری مہمات کا دور دراز علاقوں کی جانب آغاز کیا گیا۔۔۔ ان مہمات میں سائنسدانوں کی کثیر تعداد بھی ہمراہ ہوتی تھی۔ یہ سائنسدان لڑائی لڑنے نہیں بلکہ نت نئی دریافتیں کرنے نکلتے تھے۔ جب نپولین نے 1798ء میں مصر پر حملہ کیا تو اس کے لشکر میں 165 عالم اور محققین بھی شامل تھے۔ ان محققین نے اس فوجی مہم کے دوران ایک نیا شعبہ ایجاد کیا۔۔۔ جسے ہم مصریات یا مصری آثار قدیمہ کا علمی شعبہ کے نام سے جانتے ہیں۔ یہ اس مہم میں شامل محققین ہی تھے جنھوں نے مذہب، لسانیات اور نباتات کے علم میں بھی خوب حصہ ڈالا۔

1831ء کا قصہ ہے۔ رائل نیوی نے ایچ ایم ایس بیگل نامی بحری جہاز کو جنوبی امریکہ، فاکلینڈ جزائر اور گالاپاگوز جزائر کے نقشے تیار کرنے کی غرض سے روانہ کیا۔ اس مہم کا مقصد نیوی کے لیے ایسی معلومات جمع کرنی تھیں جو جنگ کی صورت میں بھرپور تیاری میں مددگار ثابت ہوں۔ اس جہاز کا کپتان ایک شوقین سائنسدان بھی تھا جسے آپ بجا طور پر اتائی کہہ سکتے ہیں۔ چونکہ کپتان کا سائنس کے علم سے لگاؤ تھا، اس نے فیصلہ کیا کہ اس مہم پر وہ اپنے ساتھ چند ارضیات دانوں کو بھی ہمراہ لے جائے گا تاکہ وہ ارضیاتی تحقیق کے ذریعے یکتا معلومات جمع کر سکیں۔ اس زمانے کے کئی نامی گرامی پیشہ ور ارضیات دانوں نے سفر کی یہ دعوت ٹھکرا دی تو اسے مجبوراً بائیس برس کے ایک نوجوان کو ہمراہ رکھنا پڑا۔ یہ نوجوان کیمبرج کا پڑھا ہوا تھا اور اس کا نام چارلس ڈارون تھا۔ اگرچہ ڈارون انگلستانی گرجا سے

متعلق علم کا ماہر تھا لیکن اس کی دلچسپی انجیل کی بجائے ارضیات اور قدرتی سائنسی علوم میں کہیں زیادہ تھی۔ اس نے یہ موقع دیکھتے ہی فوراً حامی بھر لی اور اس کے بعد پیش آنے والے واقعات۔۔۔ تاریخ ہے۔ جہاز کے کپتان نے اپنا زیادہ تر وقت تو عسکری نقشے بنانے میں لگایا لیکن ڈارون نے اس سفر میں وہ عملی مشاہدہ اور ایسی فہم اور فراست حاصل کی جو بعد میں شہرہ آفاق ارتقاء کے نظریہ کی صورت ظاہر ہوئی۔

20 جولائی 1969ء کو نیل آرمسٹرانگ اور بز ایلڈرن نے چاند کی سطح پر قدم رکھا۔ اس تاریخی خلائی مہم سے قبل کئی مہینوں تک اپولو کے خلابازوں کو مغربی امریکہ میں واقع ایک دور دراز چاند کی سطح جیسے ایک صحرا میں تربیت سے گزارا گیا۔ یہ علاقہ کئی امریکی ریڈ انڈین قبیلوں کا آبائی گھر تھا۔ اس تربیت کے دوران پیش آنے والا ایک واقعہ۔۔۔ یا غالباً ایک فرضی قصہ مشہور ہے جو خلابازوں اور ایک مقامی ریڈ انڈین کے بیچ پیش آیا۔

ایک دن تربیت جاری تھی۔ ایسے میں، خلابازوں کا سامنا ایک بوڑھے امریکی ریڈ انڈین سے ہوا۔ اس شخص نے خلابازوں سے اس علاقے میں ان کی موجودگی سے متعلق استفسار کیا۔ خلابازوں نے جواب دیا کہ وہ ایک سائنسی تحقیق کی مہم کا حصہ ہیں اور جلد ہی چاند پر تحقیق کی غرض سے کھوج لگانے جائیں گے۔ جب بوڑھے شخص نے ان کی پوری بات سن لی تو وہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گیا۔ پھر اس نے خلابازوں سے کہا کہ اگر ممکن ہو تو وہ اس کا ایک کام کر دیں گے؟

'ہاں ہاں۔۔۔ کیوں نہیں، اگر ممکن ہوا تو ضرور، کیوں نہیں؟ بولو۔۔۔ کیا چاہیے؟' انھوں نے پوچھا،

'اچھا۔۔۔ تو پھر!' بوڑھے نے تحمل سے جواب دیا، 'میرے قبیلے کے لوگوں کا ماننا ہے کہ چاند پر مقدس ارواح کا بسیرا ہے۔ جب تم چاند پر اترو تو کیا تم میرے لوگوں کی طرف سے ان مقدس ہستیوں کو ہمارا پیغام پہنچا دو گے؟'

'پیغام کیا ہے؟' خلابازوں نے دلچسپی سے پوچھا تو بوڑھے شخص نے اپنی قبائلی زبان میں کچھ الفاظ کہے اور خلابازوں کو یہ الفاظ بار بار دہرانے کو کہا۔ دونوں خلابازوں کو یہ اچھی طرح یاد ہو گیا۔

'اس کا مطلب کیا ہے؟' خلابازوں نے پوچھا،

'نہ نہ۔۔۔ یہ میں تمھیں نہیں بتا سکتا۔ یہ ہمارے قبیلے کا راز ہے جو صرف اور صرف چاند کی روحوں کے لیے ہی جاننا ضروری ہے'۔

بہر حال، خلاباز لوٹ آئے اور انھوں نے ان الفاظ کے معنوں کی تلاش شروع کر دی۔ کئی دن بعد انھیں ایک ایسا شخص مل ہی گیا جو مقامی قبائل کی زبان بول اور سمجھ سکتا تھا۔ انھوں نے اس شخص کو یہ خفیہ پیغام سنایا اور ترجمہ کی درخواست کی۔ یہ پیغام سننا تھا کہ وہ شخص بے اختیار ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو گیا۔ جب ہنس چکا تو خلاباز معنی جاننے کو بیتاب ہو چکے تھے۔ اس شخص نے بتایا کہ دراصل جس جملے

کو انھوں نے پوری توجہ اور دلجمعی سے یاد کر رکھا ہے، اس کا مطلب ہے۔۔۔ 'ان لوگوں کی کسی بات پر یقین مت کرنا۔۔۔ یہ حرامزادے تمھارے دیس پر قبضہ کرنے آئے ہیں!'

خالی نقشے

جب دنیا کے نقشے خاکوں کی صورت سامنے آئے تو اس میں جدید دور کی 'کھوجو اور فتح کرو' کی ذہنیت نہایت خوبی کے ساتھ ابھر کر سامنے آگئی۔ دنیا کی تقریباً سبھی تہذیبوں میں جدید دور سے قبل ہی نقشوں کا رواج عام تھا، ہر جگہ یہ پائے ہی جاتے تھے۔ یہ الگ بات تھی کہ ان میں سے کسی تہذیب کو پوری دنیا کی خبر نہیں تھی۔ کسی افریشائی تہذیب کو امریکہ جبکہ امریکہ کی کسی تہذیب کو افریشائیوں کی خبر نہیں تھی لیکن غیر مانوس اور نامعلوم علاقوں کو بھی نقشوں پر خالی چھوڑ دیا جاتا تھا۔ کئی ایسے نقشے بھی تھے جہاں غیر مانوس دیسوں کی جگہ پر دیوؤں کی عفریت یا عجوبوں کو بھر دیا جاتا تھا۔ ان نقشوں میں کوئی خالی جگہ نہیں ہوتی تھی اور پوری دنیا سے متعلق ایک مانوسیت اور واقفیت کا احساس ہوتا تھا۔

پندرھویں اور سولھویں صدی میں یورپیوں نے دنیا کے نئے نقشے بنانا شروع کیے جن میں خالی جگہوں کی بہتات تھی۔ ان نقشوں سے ایک طرف تو سائنسی ذہنیت کی بلیدگی کا احساس ہوتا تھا جبکہ دوسری جانب یورپیوں میں سامراجی تحریک کا بھی پتہ چلتا تھا۔ یہی نہیں بلکہ نقشوں پر یہ خالی جگہیں نفسیاتی اور نظریاتی طور پر ایک رکاوٹ کو دور کرنے کے مترادف تھا۔۔۔ مراد یہ ہے کہ نقشوں پر خالی جگہیں دیکھ دیکھ کر یورپیوں کو اپنی کم علمی اور جہالت کا اور بھی بڑھ کر احساس ہوتا تھا۔

1492ء میں ایک زبردست موڑ اس وقت آیا جب کرسٹوفر کولمبس نے سپین سے مغرب کی جانب بحری سفر شروع کیا۔ اس کے اس سفر کا مقصد مغربی طرف سے مشرقی ایشیاء کا نیا بحری راستہ تلاش کرنا تھا۔ کولمبس ابھی تک پرانے لیکن مکمل دنیاوی نقشوں پر یقین رکھتا تھا۔ اس نے حساب لگایا کہ جاپان، سپین سے مغرب کی جانب سات ہزار کلومیٹر دور واقع ہونا چاہیے۔ حقیقت یہ تھی کہ یہ فاصلہ بیس ہزار کلومیٹر سے زیادہ تھا جبکہ سپین اور جاپان کے بیچ ایک نامعلوم براعظم بھی واقع تھا۔ 12 اکتوبر 1492ء کو، صبح دو بجے کے وقت کولمبس کا بحری جہاز ایک نامعلوم براعظم پہنچ گیا۔ رودریگو دی تریانا نامی ہسپانوی ملاح اس وقت بحری جہاز کے مستول پر چڑھا ہوا تھا۔ اس کی نظر ایک جزیرے پر پڑی۔ یہ باہاماس کا جزیرہ تھا۔۔۔ وہ یہ منظر دیکھ کر فرطِ مسرت سے چلایا، 'زمین۔۔۔ وہ دیکھو، زمین!'

کولمبس کا خیال تھا کہ غالباً وہ مشرقی ایشیاء کے ساحل پر کسی چھوٹے جزیرے پر پہنچ چکا ہے۔ یہاں اس نے جو لوگ دیکھے، اس نے انھیں 'انڈین' قرار دیا کیونکہ اس کا خیال تھا کہ شاید وہ انڈیز یا الہند پہنچ چکا ہے۔ الہند کے اس علاقے کو آج ہم ایسٹ انڈیز، مشرقی الہند یا انڈونیشائی بحرالجزائر کے نام سے جانتے ہیں۔ کولمبس مرتے دم تک یہی سمجھتا رہا بلکہ اس نے اپنی یہ غلطی نہیں سدھاری۔ اس کی ایک

وجہ تو یہ بھی تھی کہ ایک نامعلوم براعظم کی 'دریافت' اتنا بڑا کارنامہ تھا جس کا خود کولمبس بلکہ اس کے ہم عصر کسی بھی شخص اور پوری قوم کو یقین نہیں تھا۔ اس بے یقینی کی بھی ایک وجہ تھی۔ وہ یہ کہ ہزاروں سال تک نہ صرف عظیم مفکر اور عالم بلکہ مطلق اور معتبر، بے چوک الہامی صحیفوں میں بھی صرف یورپ، افریقہ اور ایشیاء سے ہی واقف رہے تھے۔ تو یہ سوال قدرتی تھا کہ کیا تاریخ کے سبھی دانش مند۔۔۔ سارے کے سارے قدیم و جدید عہد نامے۔۔۔ کیا وہ سب غلط تھے؟ کیا انجیل میں آدھی دنیا کا ذکر بس یوں ہی گول ہو گیا تھا؟ کولمبس کے ہاتھوں امریکہ کی 'دریافت' کا معاملہ کچھ یوں ہی تھا جیسے۔۔۔ فرض کریں، 1969ء میں اپولو نامی خلائی جہاز اپنی دھن اور مگن میں کسی اور مقصد کے لیے رواں دواں اچانک کسی نامعلوم 'چاند' نامی سیارچے پر اتر جاتا جو ہمیشہ سے کرہ ارض کے گرد چکر لگا رہا تھا لیکن کسی کو اس کی کانوں کان خبر نہ ہوتی۔ اس کا مطلب یہی ہوتا کہ خلا اور چاند سے متعلق ہمارے سارے سابقہ اندازے۔۔۔ غلط ثابت ہو جاتے؟ نہیں؟ 1492ء میں۔۔۔ ابھی اپنی کم علمی اور جہالت کا اعتراف کرنے کا رواج نہیں پڑا تھا۔ کولمبس بھی آخر قرون وسطیٰ کے دور کا آدمی تھا۔ اس کا بھی یہی ماننا تھا کہ وہ پوری دنیا کے بارے ہر علم سے پوری طرح واقف ہے۔ وہ اس معاملے میں اس قدر مطلق اور کٹر واقع ہوا تھا کہ خود اپنے ہاتھوں سے 'دریافت' کر کے اور اپنی آنکھوں سے اس 'دریافت' کو دیکھ کر بھی۔۔۔ مرتے مر گیا لیکن آخری دم تک اپنے اس کارنامے کو تسلیم نہیں کیا۔

36: 1459ء میں یورپیوں کے یہاں استعمال ہونے والا دنیا کا نقشہ (یورپ اوپر بائیں کونے پر ہے)۔ اس نقشے میں تفصیلات کا انبار ہے، یہاں تک کہ وہ علاقے بھی اتنی زور وشور سے دکھائے گئے ہیں جو اس وقت یورپیوں کے لیے بالکل اجنبی تھے۔

اس لحاظ سے پہلا واقعی جدید آدمی امریگو وسپوچی یا امریکو وسپوچی نامی اطالوی ملاح تھا۔ امریکو وسپوچی نے 1499ء سے 1504ء کے بیچ امریکہ کی جانب کئی بحری مہمات میں حصہ لیا۔ 1502ء اور 1504ء کے بیچ ان مہمات کے حوالے سے دو دستاویز ایسی ہیں جو یورپ میں شایع کی گئیں۔ یہ دونوں دستاویز وسپوچی سے منسوب ہیں۔ ان اہم دستاویزات میں عقلی بنیادوں پر دلائل پیش کیے گئے تھے کہ کولمبس نے مشرقی ایشیاء کے ساحلی جزائر نہیں بلکہ ایک پورا براعظم دریافت کیا تھا جس سے آج تک مقدس صحیفے، کلاسیکی اور ہم عصر یورپی دانشور اور جغرافیہ دان لاعلم چلے آرہے تھے۔ 1507ء میں ان دلائل سے متفق مارٹن والڈسیمولر نامی جرمن نقشہ نگار نے دنیا کا ایک نیا نقشہ

شائع کیا۔ یہ دنیا کا پہلا نقشہ تھا جس میں یورپ کے مغرب کی جانب بھی ایک الگ براعظم دکھایا گیا تھا۔ جب والڈ سیمولر نے یہ نقشہ تیار کر لیا تو اس نے اس براعظم کو نام بھی دے دیا۔ اب وہ اس بات پر سختی سے یقین رکھتا تھا کہ اس نئے براعظم کو دراصل صحیح معنوں میں کولمبس نے نہیں بلکہ امریگو ویسپوچی نے دریافت کیا تھا۔ چنانچہ، والڈ سیمولر نے اس براعظم کو 'واقعی دریافت' کرنے والے شخص کو عزت بخشنے کے لیے اس کا نام، امریگو یا امریکو کے نام پر 'امریکہ' رکھ دیا۔ والڈ سیمولر کا یہ نقشہ جلد ہی بہت مقبول ہو گیا اور یورپ کے طول و عرض میں نقشہ نگاروں نے اس کی لاتعداد نقلیں بنا کر پھیلا دیں۔ اس نئے نقشے کے ساتھ، نئے براعظم کا نام بھی مقبول خاص و عام ہو گیا۔ سچ پوچھیں تو یہ سوچ کر طمانیت کا عجب احساس ہوتا ہے کہ دنیا کے چوتھائی حصے یعنی سات میں سے دو براعظموں کا نام اس قدرے گمنام اطالوی شخص کے نام پر رکھا گیا ہے جس واحد کارنامہ یہ ہے کہ اس نے پوری دنیا کے سامنے نہایت دلیری کے ساتھ تسلیم کیا تھا کہ، 'ہم بے علم ہیں اور ہم نہیں جانتے!'۔

امریکہ کی 'دریافت' سائنسی انقلاب کا بنیادی واقعہ، نقطہ آغاز بن گیا۔ اس واقعہ نے یورپیوں کو نہ صرف یہ سکھا دیا کہ ماضی کی روایات کی بجائے حال کے مشاہدات کو ترجیح دی جائے بلکہ امریکہ کی دریافت کے بعد اس کو فتح کرنے کے جنون نے یورپیوں کو بہت تیزی کے ساتھ علم کے حصول کا پابند بھی بنا دیا۔ اگر وہ اس نئے براعظم پر وسیع تر علاقوں کو فتح کرنا چاہتے تھے تو اس کے لیے ضروری تھا کہ اس براعظم کے جغرافیے، موسم، آب و ہوا، نباتیات، حیوانیات، لسانیات، ثقافت اور تاریخ کا پورا پورا اور بھرپور علم حاصل کیا جائے۔ اس ضمن میں عیسائیت کی مقدس کتابیں، جغرافیے کی پرانی کتابیں اور قدیم روایات و حکایات زیادہ مدد نہیں کر سکتی تھیں۔

بعد اس کے صرف یورپی جغرافیہ دان ہی نہیں بلکہ علم کے کئی دوسرے شعبوں کے ماہرین اور عالم بھی ان خالی نقشوں کو نت نئی معلومات سے بھر کر خالی جگہیں پر کرنے لگے۔ انھوں نے صحیح معنوں میں اپنی بے علمی اور جہل کو تسلیم کر کے گلے لگا لیا اور یہ مان لیا کہ ان کے نظریات کامل نہیں ہیں اور اس دنیا میں کئی ایسی اہم چیزیں ہیں جن کے بارے ان کا علم نہ ہونے کے برابر ہے۔

یورپی نقشوں پر خالی جگہوں کی جانب ایسے لپکتے جیسے مقناطیس ہوں۔ جلد ہی یہ خالی جگہیں انتہائی تیزی کے ساتھ پر ہوتی گئیں۔ پندرھویں اور سولہویں صدی کے دوران یورپی مہمات نے افریقہ کا چکر پورا کر لیا، امریکہ میں کھوج لگائی، بحرالکاہل اور بحرہند کو پار کر لیا اور پوری دنیا میں کالونیوں اور چھاؤنیوں کی داغ بیل ڈال دی۔ یوں، یورپیوں نے تاریخ میں پہلی بار واقعی ایک عالمگیر سلطنت قائم کرنے کی طرف قدم بڑھائے اور پہلا عالمگیر تجارتی نیٹ ورک بھی بن دیا۔ یورپیوں کی ان سامراجی مہمات نے دنیا کی تاریخ کو بدل کر رکھ دیا۔ اس سے قبل دنیا کی تاریخ جداجدا لوگوں اور علیحدہ علیحدہ خطوں میں بٹی ہوئی تھی لیکن اب یہ واحد، مربوط اور یکجا انسانی معاشرے کی تاریخ بن گئی۔

37–1525ء میں شایع ہونے والا دنیا کا ساویاتی نقشہ جو تقریباً خالی ہے۔ اس کے مقابلے میں 1459ء کا نقشہ براعظموں، جزائر اور تفصیلات سے پر تھا۔ اس نقشے پر نگاہ دوڑائیں تو امریکی ساحلوں کے ساتھ ہی نظر جیسے چپک کر رہ جاتی ہے اور ایک مقام پر جا کر یہ گم ہو جاتی ہے۔ ہر وہ شخص جو اس نقشے پر نگاہ دوڑاتا ہے تو فوراً ہی خود سے پوچھنے لگتا ہے، 'آخر اس نقطے کے آگے کیا ہے؟' نقشے میں اس سوال کا جواب نہیں ہے بلکہ دعوت ہے کہ سیاحت اور سفر پر نکلیے اور دریافت کیجیے!

آج یورپیوں کی 'کھوج لگاؤ اور فتح کرو' کے نعرے پر مبنی مہمات ہمارے لیے اس قدر شناسا ہیں اور دنیا اس قدر جڑ چکی ہے کہ ہم اکثر بھول جاتے ہیں کہ یہ مہمات کس قدر حیرت انگیز اور غیر معمولی ہوا کرتی تھیں۔ اس طرح کی مہمات تاریخ میں پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آئیں۔ دور دراز اور طویل فاصلے تک فتوحات کی غرض سے مہمات قدرتی امر نہیں ہوتا تھا۔ تاریخ بھر میں، انسانی معاشروں کا یہی طور رہا تھا کہ وہ مقامی تنازعات اور اڑوس پڑوس میں جاری لڑائیوں کے ساتھ اس قدر مگن رہتے تھے کہ انھیں کھوج لگانے اور دور دراز علاقوں کو فتح کرنے کا موقع ہی نہ ملتا تھا بلکہ اس طرف سوچ جاتی ہی نہیں تھی۔ تاریخ کی سبھی بڑی بڑی سلطنتیں بھی اسی طرح، پڑوس میں ہاتھ بڑھاتے بڑھاتے ہی معرض وجود میں آئی تھیں۔ وہ دور دور تک اس لیے پھیلتی چلی گئیں کیوں کہ ان کے ہاتھ اپنے پڑوس میں لمبے ہوتے گئے تھے۔ مثلاً رومیوں نے سب سے پہلے روم کو تحفظ دینے کے لیے پڑوسی شہر ایٹروریا کو فتح کیا۔ (350–300 قبل مسیح) پھر انھوں نے ایٹروریا کو تحفظ دینے کے لیے درہ پو کو فتح کیا۔ (200 قبل مسیح) اس کے بعد درہ پو کو بچانے کے لیے پراوینس (حالیہ فرانس کا ایک قدیم علاقہ) نامی صوبے کو زیر کیا۔ (120 قبل مسیح) پراوینس کو تحفظ دینا مقصود تھا تو گالس (حالیہ جدید فرانس) کو بھی سلطنت کا حصہ بنانا پڑا۔ (50 قبل مسیح) اور انگلستان کو اس لیے فتح کیا کیونکہ اس سے گالس کو خطرہ تھا۔ (50ء)۔ روم سے لندن پہنچنے میں رومی سلطنت کو تقریباً 400 برس لگ گئے۔ 350 قبل مسیح میں کسی رومی کو یہ خیال نہیں آیا ہو گا کہ وہ بجائے بحری بیڑے پر سوار ہو کر سیدھا انگلستان کو فتح کرنے پہنچ جاتا۔

بعض اوقات ایسا ضرور ہوتا تھا کہ کسی اولوالعزم اور جری حکمران یا مہم جو کے دل میں آتی تو وہ دور دراز۔۔۔ طویل مدت پر مبنی دور مار فتوحات کے لیے نکل کھڑا ہوتا تھا لیکن ایسی تاریخی مہمات بھی عام طور پر پہلے سے بچھی ہوئی سامراجی اور تجارتی راہداریوں پر ہی جاری ہوتی تھیں۔ مثال کے طور پر سکندر اعظم جب مقدونیہ سے اٹھ کر دنیا فتح کرنے نکلا تو اس نے نئی سلطنت کھڑی نہیں کی بلکہ پہلے سے موجود ایک سلطنت یعنی فارس کا تختہ الٹ کر خود براجمان ہو گیا۔ قدیم تاریخ میں جدید یورپی سلطنتوں کے ٹکر کی سامراجیت ایتھنز اور کارتھج کی بحری سلطنتوں یا قرون وسطیٰ کے دور میں انڈونیشائی جاوا کی ماجاپہت سلطنت رہی ہے۔ ماجاپہت سلطنت بحری مہمات کا نتیجہ تھی جس نے چودھویں صدی میں تقریباً پورے انڈونیشیا پر غلبہ حاصل کیا تھا۔ لیکن ایتھنز، کارتھج یا ماجاپہت کی سلطنتیں بھی نامعلوم سمندروں کی طرف نہیں بڑھیں بلکہ جدید یورپیوں کی عالمگیر مہمات کے برعکس، مقامی سطح پر واقع بحروں اور سمندروں تک محدود رہیں۔

کئی محققین کا خیال یہ ہے کہ غالباً ژینگ ہی نامی چینی منگ سلطنت کے ایڈمرل کے سمندری سفروں اور مہمات کے سامنے یورپی کھوج پر مبنی بحری سفر ہیچ تھے۔ 1405ء سے لے کر 1433ء تک ژینگ ہی نے چین سے نکل کر بحرہند کے دور دراز علاقوں تک ہتھیار بند بحری جہازوں کے بڑے بیڑوں کے ساتھ کل سات سفر کیے۔ ان میں سے سب سے بڑی مہم میں تین سو بحری جہازوں اور تیس ہزار لوگوں نے ژینگ کے ہمراہ حصہ لیا۔ انھوں نے انڈونیشیاء، سری لنکا، ہندوستان، خلیج فارس، بحیرہ احمر اور مشرقی افریقہ تک کے علاقوں کا دورہ کیا۔ چینی بحری جہاز حجاز کی سب سے بڑی بندرگاہ جدہ اور کینیاء کی بندرگاہ ملنڈی پر بھی لنگر انداز ہوتے تھے۔ 1492ء میں کولمبس کا بحری بیڑہ صرف تین چھوٹے بحری جہازوں پر مشتمل تھا جس میں کل 120 ملاح سوار تھے۔ اس بحری بیڑے کی مثال ژینگ ہی کے بیڑے کے سامنے ایسی ہی تھی جیسے مچھر۔۔۔ ڈریگن کے سامنے آن کھڑے ہوں۔

لیکن اس کے باوجود ایک بنیادی فرق بہرحال پھر بھی موجود تھا۔ ژینگ ہی نے سمندروں اور بحروں کو پار کیا اور چینی حکمرانوں کو اپنی سلطنت چلانے میں مدد دی۔ اس نے جتنے بھی علاقوں کا دورہ کیا۔۔۔ کبھی بھی انھیں فتح کرنے یا نو آبادی بنانے کا نہیں سوچا۔ مزید بر آں یہ کہ ژینگ ہی کی مہمات کبھی بھی چین کی سیاست اور ثقافت سے متعلق نہیں تھیں بلکہ اس کا چینی سلطنت کی گہری سیاست کے ساتھ صرف سطحی تعلق تھا۔ جب 1430ء میں بیجنگ کا حکمران طبقہ بدلا تو نئے آقاؤں نے ژینگ ہی کی مہمات کے منصوبے کو ایک جنبش قلم ختم کر کے انجام تک پہنچا دیا۔ ژینگ ہی کا عظیم بحری بیڑہ تار تار کر دیا گیا اور 28 برس کے عرصے میں جمع کیا گیا جغرافیائی اور تکنیکی علم گم ہو گیا۔ بعد اس کے، کسی چینی بندرگاہ سے دوبارہ اس طرح کی مہم دوبارہ کبھی منظر عام پر نہیں آئی۔ آنے والی کئی صدیوں میں نئے چینی حکمرانوں نے۔۔۔ گزشتہ کئی صدیوں کے چینی حکمرانوں کی ہی طرح صرف مقامی طور پر چینی سطلنت کے اندرون ہی اپنے مفادات اور جاہ طلبی کو مقدم سمجھا اور اسی پر توجہ مرکوز رکھی۔

ژینگ ہی کی مہمات سے یہ تو بالضرور ہی ثابت ہوتا ہے کہ اس زمانے میں یورپ کو کسی طور بھی فن اور ٹیکنالوجی میں برتری حاصل نہیں تھی۔ یورپیوں کو ممتاز کرنے والی شے مادی نہیں بلکہ تصوراتی تھی۔ ان کے یہاں، کھوج لگانے اور فتح کرنے کے تصورات زبردست طریقے سے۔۔۔ غیر معمولی اور بے مثال انداز میں رچ بس چکے تھے۔ یہ ممکن ہے کہ کسی زمانے میں رومیوں کی طاقت اور استعداد اتنی ضرور رہی ہو گی کہ وہ چاہتے تو بالضرور ہی ہندوستان اور اسکینڈی نیویا کو بھی فتح کر لیتے۔ فارسی چاہتے تو مداگاسکر اور سپین کو بھی زیر کر سکتے تھے لیکن انھوں نے کبھی ایسی کوئی کوشش نہیں کی۔ چینی انڈونیشیا اور افریقہ پر غلبہ پا سکتے تھے لیکن وہ کبھی آگے بڑھے ہی نہیں۔۔۔ چینی حکمرانوں کا تو یہ تھا کہ انھوں نے پڑوس میں واقع جاپان کو تاریخ کے تقریباً حصے میں اپنے حال پر چھوڑے رکھا تھا۔ لیکن یاد رہے، رومیوں، فارسیوں اور چینیوں کی اس طرز میں کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ عجوبہ تو یہ تھا کہ جدید یورپیوں کو پہلی بار کھوج اور فتوحات کا وہ بخار چڑھا کہ وہ گھربار چھوڑ کر دور دراز سمندروں میں سفر پر نکل گئے اور ایسی ایسی جگہوں پر جا پہنچے جہاں اجنبی اور پردیسی تہذیبیں آباد تھیں۔ یورپیوں کی تو ایسی تفاخرانہ عادت بن گئی کہ وہ دوسروں کے ساحل پر اترتے ہی جھنڈا گاڑ دیتے اور فوراً ہی اعلان کرا دیا جاتا، 'ہم اس قطعہ زمین پر اپنے شہنشاہ فلاں ابن فلاں کے لیے۔۔۔ دعویٰ اقتدار کا اعلان کرتے ہیں!'
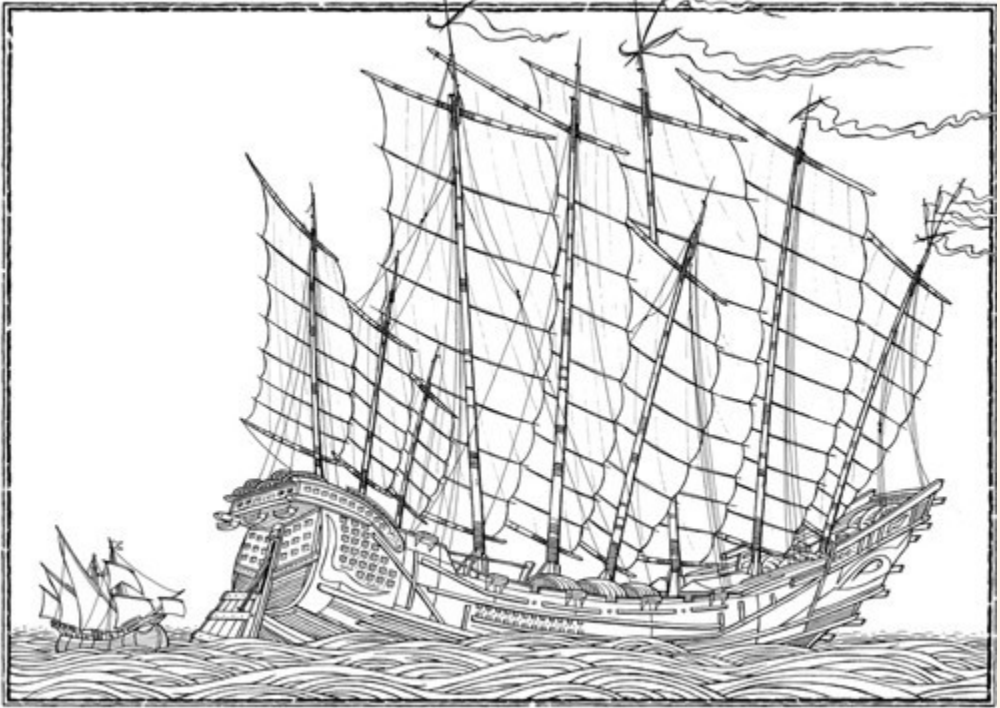
38–ژینگ ہی کے دیوہیکل بحری جہاز کے ساتھ کولمبس کا بحری جہاز دکھایا گیا ہے۔

خلائے بسیط (بیرونی خلاء) سے بدیسیوں کا حملہ

تقریباً1517ء میں ہسپانوی آباد کاروں تک میکسیکو کے وسط میں واقع ایک طاقتور سلطنت بارے گول مول اطلاعات اور افواہیں پہنچیں۔ صرف چار سال بعد، اس عظیم سلطنت ازٹیک کا دارالخلافہ تباہ وبرباد ہو کر کھنڈر میں تبدیل ہو چکا تھا جبکہ ازٹیک سلطنت قصہ پارینہ بن چکی تھی۔ بجائے، اب یہاں میکسیکو میں ہسپانوی سلطنت قائم ہو چکی تھی جس کا آقا ہرنان کورتیس تھا۔

ہسپانویوں نے یہاں پہنچ کر جشن مناتے ہی تکیہ نہیں کر لیا بلکہ انھوں نے تو دم بھی نہیں لیا۔ اس کامیابی کے فوراً بعد یہاں سے آگے کی جانب کھوج اور فتوحات کا سلسلہ چاروں طرف پھیلا دیا۔ وسطی امریکہ کے سابقہ حکمرانوں جیسے ازٹیک، ٹولٹیک اور مایا وغیرہ کو تو پوری طرح یہ بھی علم نہیں تھا کہ جنوبی امریکہ نامی جگہ بھی پائی جاتی ہے۔ انھوں نے اس جنوبی خطے کو دو ہزار سال میں کبھی زیر کرنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ لیکن میکسیکو فتح کرنے کے دس برس کے اندر ہی فرانسیسکو پیزارو نے جنوبی امریکہ میں انکا سلطنت 'دریافت' کر لی اور یہ سلطنت 1532ء میں ہسپانویوں کے ہاتھ تباہ وبرباد ہو کر مغلوب بھی ہو گئی۔

اگر ازٹیک اور انکا وغیرہ نے اپنے ارد گرد کی دنیا میں ذرہ برابر بھی دلچسپی ظاہر کی ہوتی اور یہ پتہ لگانے کی کوشش کر لیتے کہ ہسپانویوں نے ان کے پڑوسیوں کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے تو عین ممکن تھا کہ وہ ہسپانویوں کو اچھی بھلی مزاحمت دے پاتے بلکہ شاید انھیں پیچھے ہٹ کر رہنے پر مجبور بھی کر دیتے۔ 1492ء میں کولمبس کے امریکہ کی جانب پہلے سفر سے لے کر کارتیس کا1519ء میں میکسیکو پہنچنے کے واقعہ تک کے درمیانی برسوں میں ہسپانویوں نے غرب الہند کے تقریباً سارے جزائر فتح کر لیے تھے اور یہاں نو آبادیوں کا پورا ایک سلسلہ قائم ہو چکا تھا۔ محکوم کی گئی مقامی آبادیوں کے لیے یہ نو آبادیاں زمین پر کسی جہنم سے کم نہیں تھیں۔ لالچی اور بے ایمان نو آباد کار ان مقامی آبادیوں پر آہنی ہاتھوں سے حکم چلاتے تھے۔۔۔ غلامی کا طوق پہنے یہ مقامی لوگ کانوں اور شجر کاریوں میں مشقت اور بیگار کرنے پر مجبور تھے اور ہر اس مقامی شخص کو بے رحمی سے قتل کر دیا جاتا جو ذرہ برابر بھی مزاحمت دکھانے کی کوشش کرتا تھا۔ جلد ہی مقامی آبادی کی اکثریت سخت مشقت اور ان بیماریوں کے ہاتھ مر کھپ گئی جو ہسپانوی یورپ سے اپنے ساتھ بحری جہازوں پر وباء کی شکل میں لائے تھے۔ صرف بیس برس کی قلیل مدت میں جزائر غرب الہند کی ساری مقامی آبادی صفحۂ ہستی سے مٹ گئی۔ اب ہسپانوی نو آباد کاروں نے اس خلا کو پر کرنے کے لیے افریقی غلاموں کی درآمد شروع کر دی۔

ازٹیک سلطنت کی دہلیز پر انبوہ میں یہ انسانی قتل عام جاری رہا لیکن جب کارتیس اس سلطنت کے مشرقی ساحل پر اترا تو حیران کن طور پر ازٹیکوں کو اس بابت کچھ علم نہ تھا۔ ہسپانویوں کی آمد، ازٹیک سلطنت کے لیے خلائے بسیط یا بیرونی خلاء سے کسی حملے کی مانند تھی۔ ازٹیک بھی اس گمان میں زندہ تھے کہ وہ 'پوری دنیا' کا علم اور سمجھ بوجھ رکھتے ہیں اور ان کے نزدیک وہ پوری دنیا پر حاکم تھے۔ ان کے خواب وخیال

میں بھی یہ نہیں تھا بلکہ انھیں سرے سے یقین ہی نہیں آتا تھا کہ ان کی حاکمیت سے باہر بھی کوئی شے۔۔۔جیسے یہ ہسپانوی وغیرہ وجود رکھ سکتے ہیں۔ جب کارتیس اور اس کے ساتھی آج کے دور کے ویرا کروز کے چمکیلے ساحلوں پر اترے تو یہ پہلی دفعہ تھی کہ ازٹیکوں کا سامنا بدیسیوں، مکمل طور پر نامعلوم انسانوں سے ہوا تھا۔

ازٹیک کو سمجھ ہی نہیں آئی کہ ان کا ردعمل کیا ہونا چاہیے۔ وہ ان اجنبی بدیسیوں کے بارے شش و پنج کا شکار تھے،ان کے بارے فیصلہ کرنے میں تذبذب میں گھرے ہوئے تھے۔ وہ جن انسانوں کو جانتے تھے،ان کے برعکس ان بدیسیوں کی جلد سفید تھی۔ یہی نہیں بلکہ ان بدیسیوں کے چہرے پر گہری داڑھیاں بھی تھیں۔ ان میں سے بعض کے بالوں کا رنگ سورج کی مانند سنہری تھا۔ یہ نووارد سخت بدبودار تھے۔ (مقامی ازٹیک کے یہاں ہسپانویوں کی نسبت جسمانی صفائی ستھرائی کہیں بہتر تھی۔ جب ہسپانوی پہلی دفعہ میکسیکو پہنچے تو وہ مقامی باشندے جو ہسپانویوں کے ساتھ تعینات کیے گئے، وہ ہسپانویوں کے ساتھ جہاں جاتے،وہاں کی اگربتیاں جلائے رکھتے۔ ہسپانویوں کا خیال تھا کہ شاید یہ تقدیس اور عزت و حرمت کا مقامی طریقہ ہے۔ لیکن مقامی زرائع کے حوالے سے موجود ریکارڈ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ نوواردوں کے جسموں سے اٹھنے والے بدبو کے بھبھوکے ناقابل برداشت تھے)

نقشہ: ہسپانوی فتوحات کے وقت ازٹیک اور انکا سلطنتیں

بدیسیوں کی مادیت پرستی اور مادی اشیاء پر چلنے والی ثقافت الجھا دینے کی حد تک حیران کن تھی۔ ہسپانوی بڑے بڑے بحری جہازوں میں سوار ہو کر آئے تھے۔ اس طرح کے بحری جہاز ازٹیک کے وہم و گمان۔۔۔ انھوں نے ایسے جہاز کبھی دیکھے بھی نہیں تھے، تعمیر کرنا تو بہت دور کی بات تھی۔ اسی طرح وہ بڑے اور ڈرا دینے والے طاقتور جانوروں کی پشت پر سواری کرتے تھے۔۔۔ یہ جانور ہوا کی طرح تیز دوڑتے تھے۔ نو واردوں کے پاس ایسی دھاتی سونٹیاں تھیں جن کی مدد سے وہ چند لمحوں کے اندر ہی چمکتی بجلی اور زوردار دھماکہ پیدا کر سکتے تھے۔ یہی نہیں، ان کی لمبی تلواریں تیز دھار اور ان کی زرہ بکتریں ایسی تھیں کہ ناقابل نفوذ تھیں۔ آبائی باشندوں کی لکڑی کی تلواریں اور نوکیلی سونٹیاں ان ہتھیاروں کے مقابلے میں بے کار تھیں۔

بعض ازٹیک کا خیال تھا کہ یہ نو وارد دراصل خدا ہیں۔ کئی نے دلیل پیش کی کہ یہ آسیب ہیں۔۔۔ کچھ نے خیال کیا کہ یہ مردوں کی بدروحیں ہیں یا پھر انتہائی طاقتور ساحر اور فسوں گر ہیں۔ بجائے یہ کہ وہ ہسپانویوں کو نکال باہر کرنے کی ہر ممکن تدبیر کرتے۔۔۔ ازٹیک نے غور و فکر، کاہلی اور گفت و شنید شروع کر دی۔ ان کے نزدیک پھرتی دکھانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ ویسے بھی کارتیس کے ساتھ صرف 550 ہسپانوی تھے۔ اب پانچ ساڑھے پانچ سو نو وارد، لاکھوں کی ایک سلطنت کا بھلا کیا بگاڑ سکتے تھے؟

جیسے ازٹیک، ویسے ہی کارتیس بھی ان مقامی قبائل کے بارے نابلد تھا لیکن وہ اور اس کے آدمی اپنے ان حریفوں پر برتری رکھتے تھے۔ اب چونکہ ازٹیک کے باشندوں کے پاس اس طرح کے بدیسی اور بدبودار نو واردوں کو سمجھنے اور ان کے ساتھ برتاؤ کا کوئی تجربہ اور نہ ہی علم تھا لیکن دوسری جانب ہسپانوی اچھی طرح جانتے تھے کہ یہ دنیا نامعلوم انسانی بادشاہتوں سے بھری پڑی ہے۔ ہسپانویوں کے لیے نامعلوم اور غیر علاقوں پر برتری دکھانے اور حملہ کرنے کی صلاحیت اور اس طرح کی نابلد صورتحال سے نبٹنا گویا بچوں کا کھیل بن چکا تھا۔ کسی جدید یورپی سائنسدان کی طرح، جدید یورپی فاتحین کو بھی اس طرح کی نامعلوم اور نابلد صورتحال سے سامنا کرنا پڑتا تھا۔۔۔ ان کے جوش اور ولولے کی انتہا نہیں رہتی تھی۔

چنانچہ جب 1519ء میں جولائی کے مہینے میں کارتیس نے یہاں قدم رکھا تو اسے فوری اقدامات اٹھانے میں کسی ہچکچاہٹ کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ کسی سائنس فکشن فلم کی طرح، وہ اپنے 'خلائی جہاز' سے برآمد ہوا تو فوراً ہی حیران و پریشان مقامی ازٹیک آبادی کے سامنا اعلان کیا، 'ہم امن کی غرض سے آئے ہیں۔ ہمیں اپنے حکمران کے پاس لے چلو!'۔ کارتیس نے ان کو سمجھایا کہ وہ شہنشاہ سپین کی جانب سے بھجوائے گئے پرامن تبلیغی ہیں اور وہ ازٹیک کے حکمران مونتی زوما دوم کے ساتھ سفارتی ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔ (یہ بے انتہا بے شرمی کے ساتھ بولا گیا جھوٹ تھا۔ کارتیس چند لالچی مہم جوؤں کے ساتھ مل کر یہاں اپنی مرضی اور آزاد پہنچا تھا۔ شہنشاہ سپین کارتیس اور ازٹیک۔۔ ان دونوں کے بارے کچھ نہیں جانتا تھا)۔ کارتیس کی خوب آؤ بھگت کی گئی، ضیافتیں اور دعوتیں کی گئیں اور ازٹیک کی

جانب سے اپنے مقامی دشمنوں سے محفوظ رکھنے کے لیے اسے عسکری معاونت بھی فراہم کی۔ پھر وہ ازٹیک کے دارالخلافے، یعنی تنوچتیتلان کے عظیم شہر کی طرف روانہ ہوگئے۔

ازٹیک نے ان نوواردوں کو اپنے دارالخلافے کا صاف راستہ فراہم کیا اور پھر بدیسیوں کے سربراہ کو اپنے شہنشاہ مونتی زوما سے ملاقات کے لیے بھی لے گئے۔ اس ملاقات کے دوران، کارتیس نے ایک خفیہ اشارہ کیا اور لوہے کی تیز دھار تلواروں سے لیس ہسپانویوں نے مونتی زوما کے محافظوں کو آن کی آن میں چیر پھاڑ کر رکھ دیا۔ یہ محافظ لکڑی کے ڈنڈوں اور پتھر کے کند چاقوؤں سے لیس تھے۔ شہنشاہ مونتی زوما کو گرفتار کرلیا گیا۔

کارتیس اب ایک انتہائی نازک صورتحال سے دوچار ہوچکا تھا۔ اس نے شہنشاہ کو تو قابو کرلیا تھا لیکن اب وہ دشمن کے دسیوں ہزار غصے سے آگ بگولہ جنگجوؤں، لاکھوں منحرف شہریوں اور ایک ایسے براعظم میں گھر چکا تھا جس کے بارے اسے عملی طور پر کچھ علم نہیں تھا۔ اس کے ساتھ چند سو ہسپانوی تھے اور قریب ترین ہسپانوی کمک کا ذریعہ کیوبا میں واقع تھا۔۔۔ یہ مقام کیوبا سے تقریباً پندرہ سو کلومیٹر دور واقع تھا۔

کارتیس نے مونتی زوما کو اس کے محل میں قیدی بنا کر رکھ لیا اور ایسا تاثر دیا کہ گویا شہنشاہ ازٹیک آزاد ہے اور اب بھی سلطنت کا فرمانروا ہے جبکہ 'ہسپانوی سفارتکار' ابھی تک شاہی مہمان ہیں۔ ازٹیک سلطنت ایک انتہائی سخت مرکزی طرز حکومت پر قائم تھی۔ اس غیر معمولی صورتحال نے پوری سلطنت کو جمود کا شکار کر دیا تھا۔ مونتی زوما ابھی بھی اس سلطنت پر حاکم تھا اور ازٹیک کی اشرافیہ شہنشاہ کی اطاعت گزار تھی۔ یعنی، عملی طور پر شہنشاہ اور اشرافیہ دونوں ہی کارتیس کے اطاعت گزار تھے۔ یہ صورتحال کئی مہینوں تک جاری رہی اور اس دوران کارتیس نے باقاعدہ، سوچے سمجھے منصوبے کے تحت مونتی زوما اور اس کے حواریوں سے تفتیش جاری رکھی۔ اس کے ساتھ ساتھ اس نے کئی مترجموں کو کئی مقامی زبانوں کی تربیت بھی دلادی اور ہسپانوی مشن ازٹیک سلطنت کے طول و عرض میں روانہ کیے جن کا مقصد اس سلطنت کے علاقوں، قبائل، لوگوں اور ان شہروں کے بارے معلومات اکٹھی کرنا تھا جن پر مونتی زوما کی حکمرانی تھی۔

ازٹیک اشرافیہ نے بالآخر کارتیس اور مونتی زوما۔۔۔ دونوں کے خلاف بغاوت کر لی اور ایک نیا شہنشاہ منتخب کر لیا۔ یہی نہیں بلکہ ہسپانویوں کو تنوچتیتلان سے بھی باہر نکال دیا۔ تاہم، اب تک اس سلطنت کی عمارت میں کئی درزیں اور شگاف پڑ چکے تھے۔ کارتیس نے سلطنت کے بارے حاصل ہونے والا قیمتی علم اور دوسری معلومات کو استعمال میں لاتے ہوئے سلطنت میں پڑنے والی دراڑوں کو مزید گہرا کرنا شروع کر دیا اور یوں سلطنت کو اندر سے کھوکھلا کر دیا۔ اس نے سلطنت کے کئی قبائل کو قائل کیا اور یوں حکمران ازٹیک اشرافیہ کے سامنے لاکھڑا کیا۔ ازٹیک سلطنت کی باغی رعایا کا حساب کتاب سخت غلط تھا۔ وہ ازٹیک اشرافیہ کو اچھی طرح جانتے تھے، اسی لیے ان سے سخت نفرت کرتے تھے لیکن وہ ہسپانویوں کے بارے کچھ نہیں جانتے تھے۔ انھیں تو جزائر غرب الہند میں قتل عام کی بھی کانوں کان کوئی خبر نہ تھی۔ ان کا خیال یہ تھا کہ شاید ہسپانویوں کی مدد سے وہ ازٹیک اشرافیہ سے جان چھڑالیں گے لیکن ان کے

دل و دماغ میں کبھی بھی ہسپانویوں کے راج کا امکان نہیں گزرا۔ انھیں یہ سوجھا ہی نہیں کہ یہ ازٹیک اشرافیہ سے بھی بد تر آقا ثابت ہو سکتے ہیں۔ بلکہ ان کو تو یہ یقین تھا کہ اگر کارتیس اور اس کے مٹھی بھر پٹھوؤں نے زیادہ پھڑکنے کی کوشش کی تو وہ بغیر کسی مشکل کے انھیں ٹکا سکتے ہیں۔ ازٹیک باغیوں نے کارتیس کو دسیوں ہزار مقامی نفوس پر مشتمل فوج فراہم کی اور یوں کارتیس نے ایک دفعہ پھر، پوری قوت اور باقاعدہ جنگی حکمت عملی سے تونچتیتلان کو فتح کر لیا۔

اب اتنا وقت گزر چکا تھا کہ ہسپانوی کمک، ہزاروں سپاہیوں کی شکل میں میکسیکو پہنچ چکی تھی۔ ان میں سے کچھ تو کیوبا سے اور زیادہ تر سپین سے یہاں پہنچے تھے۔ جب مقامی لوگوں کو حالات کا واقعی ادراک ہوا تو بہت دیر ہو چکی تھی۔ ویرا کروز پر لنگر انداز ہونے کے سو سال کے اندر امریکی براعظموں کی نوے فیصد آبادی مر کھپ چکی تھی۔ یہ آبادیاں زیادہ تر ان غیر مانوس بیماریوں کا نشانہ بنیں جو حملہ آور اپنے ساتھ لائے تھے۔ جو مقامی افراد بچ گئے، وہ اب ازٹیک اشرافیہ سے کئی سو گنا بدتر، لالچی اور نسل پرست جابر حکمرانوں کے رحم و کرم پر تھے۔

پیزارو انکا سلطنت کے ساحلوں پر لنگر انداز ہوا تو کارتیس کو میکسیکو پہنچے دس برس بیت چکے تھے۔ اس کے ساتھ کارتیس سے بھی کہیں کم تعداد میں دست راست سپاہی تھے۔ اس کی اس مہم میں صرف 168 ہسپانوی شامل تھے۔ پیزارو نے براعظم امریکہ میں گزشتہ مہمات اور حملوں سے حاصل ہونے والے علم کا بھرپور استعمال کیا۔ پیزارو کے برعکس انکا کو ازٹیک بارے کچھ علم نہیں تھا جبکہ پیزارو نے کارتیس کی حکمت عملی کی بھرپور اور بہتر شکل میں نقل کی۔ اس نے بھی خود کو شہنشاہ سپین کا پر امن سفارتکار قرار دے کر پہچان کرائی، انکا کے حکمران آتاؤالپا کو سفارتی ملاقات کی دعوت دی اور پھر اسے اغوا کر لیا۔ پیزارو نے بعد اس کے مقامی اتحادیوں کی مدد سے جمود کے شکار سلطنت کو فتح کر لیا۔ اگر انکا سلطنت کی رعایا کو میکسیکو کے باسیوں کی بدبختی کا پتہ چل جاتا تو وہ کبھی بھی ان حملہ آوروں کو ساحل سے آگے نہ بڑھنے دیتے۔ لیکن کیا کیجیے، وہ اس بارے کچھ نہیں جانتے تھے۔

مقامی منظر نامے کی بھاری قیمت ادا کرنے والی یہ صرف امریکہ کی آبائی آبادیاں نہیں تھیں۔ ایشیاء کی عظیم سلطنتوں جیسے عثمانیوں، سفویدوں، مغلوں اور چینیوں تک بھی جلد ہی یہ خبر پہنچ گئی کہ یورپیوں کو کچھ بہت بڑا اور اہم ہاتھ لگ گیا ہے۔ اس کے باوجود انھوں نے ان نئی دریافتوں میں چنداں کوئی دلچسپی نہیں دکھائی۔ وہ ابھی تک یہی یقین کیے بیٹھے تھے کہ دنیا ایشیاء کے گرد گھومتی ہے۔ ان عظیم سلطنتوں نے امریکہ اور اس کے بیچ نئے اوقیانوس اور الکاہل کے سمندری راستوں پر غلبہ حاصل کرنے کے لیے ذرہ برابر بھی مقابلہ نہیں کیا۔ یورپ میں صورتحال یہ تھی کہ انتہائی معمولی سلطنتوں جیسے سکاٹ لینڈ اور ڈنمارک وغیرہ نے بھی چند کھوجی اور فتح کی غرض سے مہمات کو امریکہ روانہ کیا لیکن کھوج یا فتح کی غرض سے ایک بھی مہم اسلامی دنیا، ہندوستان یا چین سے روانہ نہیں کی گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ یورپ سے باہر اگر کسی طاقت نے اس طرح کی عسکری مہم جوئی کی کبھی کوشش کی ہے تو وہ صرف جاپان تھا۔ جاپان نے جون 1942ء میں ایک فوجی مہم شروع کی جس کے نتیجے میں الاسکا کے ساحل پر دو انتہائی معمولی کسکا اور اتو نامی دو جزائر ہی فتح ہو پائے۔ ان

جزیروں پر جاپانیوں کے ہاتھ دس امریکی فوجی اور ایک کتا آیا۔ جاپانی شمالی امریکہ کے براعظم کے واقعی قطعہ کے نزدیک بھی نہیں پھٹک پائے۔

یہ کہنا انتہائی مشکل ہے کہ ترکِ عثمانی اور چینی چونکہ بہت دور تھے، اس لیے مہم جوئی پر آمادہ نہیں ہوئے۔ یہ دلیل بھی جائز نہیں ہے کہ ان سلطنتوں کے پاس تکنیکی، فنی، معاشی یا عسکری وسائل کی کمی رہا کرتی تھی۔ اگر چینی سلطنت ژینگ ہی کے دیوہیکل بحری بیڑے کو 1420ء میں چین سے مشرقی افریقہ تک روانہ کر سکتی ہے تو اس کے لیے امریکہ میں مہم جوئی کوئی مشکل نہیں تھی۔ بلکہ ژینگ ہی جتنے وسائل میں تو ایک نہیں۔۔۔کئی کئی مہمات کا بلکہ پورے یورپ سے کہیں بڑھ کر انتظام ممکن تھا۔ چینیوں کو کبھی دلچسپی ہی نہیں رہی اور اس کے سوا اس امر کی کوئی دوسری دلیل نہیں ہے۔ اس ضمن میں چینیوں کی دلچسپی کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ ان کے یہاں وہ پہلا نقشہ جس میں امریکہ بھی دکھایا گیا تھا۔۔۔1602ء میں منظر عام پر آیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ چین میں یہ نقشہ متعارف کرنے والا بھی شخص بھی یورپ کا ایک عیسائی مشنری تھا۔

تین سو برس تک یورپیوں نے امریکہ اور، بحرالکاہل، بحرالکاہل کے جزائر اور بحر اوقیانوس پر بغیر کسی دخل اندازی کے خوب دسترس اور غلبہ قائم کیے رکھا۔ اس دوران اگر کوئی مزاحمت دیکھنے میں آئی تو وہ خود یورپی طاقتوں کے بیچ کھینچا تانی تھی۔ ان تین سو برسوں کے دوران جمع ہونے والی دولت اور وسائل کو استعمال میں لا کر یورپیوں نے ایشیاء پر بھی دھاوا بول دیا۔ ایشیاء کی عظیم سلطنتوں کو پچھاڑا اور پورے ایشیاء کو آپس میں بانٹ دیا۔ جب ترکِ عثمانیوں، فارسیوں، ہندوستانیوں اور چینیوں کو ہوش آیا تو بہت دیر ہو چکی تھی۔

یہ تو بیسویں صدی کا قصہ ہے کہ کہ یورپ سے باہر کی تہذیبوں نے پہلی بار ایک واقعی عالمگیر تصور سے آشنائی حاصل کی۔ یہی وہ اہم عنصر تھا جس کی بنیاد پر یورپیوں کی پوری دنیا میں یورپی طاقتوں کی بالادستی کا خاتمہ بھی ہوا۔ یہ اسی تصور کی دین ہے کہ الجیریا کی جنگ آزادی (1954ء–1962ء) کے دوران الجیریائی گوریلا نے فرانسیسی فوج کو حیران کن طور پر بہترین عددی، فنی اور معاشی برتری کے ساتھ شکست فاش کیا۔ الجیریا کا پلڑا بھاری رہا کیونکہ ان کے ساتھ عالمی سطح کا نوآبادیات مخالف نیٹ ورک اس جدوجہد میں شامل تھا۔ اس کی دوسری وجہ یہ تھی کہ الجیریا نے پہلی بار دنیا بھر کے زرائع ابلاغ کو اپنے مقصد کی طرف متوجہ کر لیا تھا۔۔۔یہاں تک کہ فرانس میں بھی الجیریا کی جدوجہد اور آزادی کی تحریک کا ڈنکا بج رہا تھا۔ اسی طرح، شمالی ویت نام میں امریکہ جیسی عالمی طاقت کو جس ہزیمت سے شکست کا سامنا کرنا پڑا تھا۔۔۔وہ بھی اسی طرح کے عالمی تصور پر مبنی حکمت عملی کا نتیجہ تھا۔ دنیا بھر میں گوریلا فوجوں نے مقامی ہی نہیں بلکہ دنیا کی عالمی طاقتوں کو بھی ایک نہیں بلکہ کئی کئی بار شکست سے دوچار کروا کر باور کروا دیا کہ انتہائی معمولی اور مقامی طاقت کے پیچھے کوئی عالمگیر ایجنڈا یا مقصد آن کر کھڑا کر دیا جائے تو وہ جدوجہد ناقابل تسخیر ہو جاتی ہے۔ جہاں یہ، وہیں یہ بھی سوچنا انتہائی دلچسپی کا حامل ہو گا کہ فرض

کریں۔۔۔اگر اپنے زمانے میں الجیریا اور شمالی ویت نام کی طرح، موتی زوما بھی سپین میں عوامی رائے کو اپنے حق میں موڑنے کے قابل ہوتا اور اسے بھی سپین کے کسی حریف۔۔۔پرتگال، فرانس یا عثمانی ترکوں کی حمایت حاصل ہو جاتی تو آج یہ دنیا، آخر کیسی دنیا ہوتی؟

نادر مکڑیاں اور بھولی بسری نوشت و تحاریر

جدید سائنس اور جدید سلطنتیں ہمیشہ ہی اس امر پر بے کل رہیں کہ شاید افق پر کچھ نہ کچھ ایسا ضرور ہے جسے کھوج کر فتح کرنا باقی ہے۔ یہ ان دونوں میں مشترک قدر تھی لیکن اس کے باوجود سلطنت اور سائنس کے بیچ تعلق اس سے بھی کہیں گہرا تھا۔ یہ صرف ترغیب کا معاملہ نہیں تھا بلکہ سلطنتیں کھڑی کرنے والے فاتحین کی دوسری راہیں بھی سائنسدانوں سے ملتی تھیں۔ جدید یورپیوں کے لیے ایک سلطنت کھڑی کرنا، کسی سائنس کے پراجیکٹ کی طرح تھا۔ اسی طرح کوئی نیا سائنسی شعبہ بنانا گویا ایک سامراجی منصوبے کو اپنے پیروں پر کھڑا کرنا تھا۔

جب مسلمانوں نے ہندوستان فتح کیا تو وہ آثار قدیمہ کے ماہرین ہمراہ نہیں لائے تاکہ ہندوستان کی تاریخ کا مطالعہ کر سکیں۔ ان کے ساتھ بشریات کے ماہر بھی نہیں تھے جو ہندوستانی ثقافت پر تحقیق کیا کرتی۔ اسی طرح ارضیات دان نہیں تھے جو ہندوستانی مٹی میں چھپے رازوں کو نکال لاتے یا ماہر حیوانیات بھی نہیں آئے جو ہندوستانی حیوانیہ پر غور و فکر کر سکیں۔ اس کے برعکس جب انگریزوں نے ہندوستان فتح کیا تو وہ اپنے ساتھ طرح طرح کے ماہر اور سائنسدان لائے جنھوں نے ہر قسم کی تحقیق کی۔ 10 اپریل 1802ء کو تاریخ میں پہلی بار عظیم سروے آف انڈیا کا آغاز کیا گیا۔ یہ سروے ساٹھ سال تک جاری رہا۔ دسیوں ہزار مقامی مزدوروں، آبائی اتائیوں اور جغرافیے میں راستہ دکھانے والوں کی مدد سے انگریزوں نے ہندوستان کے طول و عرض کی ہر طرح کی معلومات کو نقشوں میں ڈھال دیا۔ اس کی سرحدیں ماپ کر وضع کیں، فاصلوں کا تعین کیا گیا اور یہاں تک کہ پہلی بار ماؤنٹ ایورسٹ اور ہمالیہ کی دوسری چوٹیوں کی بلندی بھی منظر عام پر آئی۔ اسی سروے کے دوران انگریزوں نے ہندوستان کے ہر صوبے کے عسکری وسائل کی کھوج لگائی اور سونے کی کانوں کے مقامات کو نقشوں پر درج کر لیا۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے یہاں کی مقامی مکڑیوں، تتلیوں اور حشرات کا بھی ڈیٹا فہرستوں کی شکل میں جمع کیا اور قدیم ہندوستانی زبانوں۔۔۔یہاں تک کہ معدوم ہونے والی زبانوں کی معلومات بھی جمع کیں اور قدیم بھولے بسرے دنوں کو کھود کر دوبارہ نکال دیا۔ الغرض، ہندوستان سے متعلق ایسی کوئی شے نہیں تھی جسے انگریزوں نے ان ساٹھ برسوں کے دوران ٹٹولا نہ ہو۔

وادی سندھ کی تہذیب میں موہنجو دوڑو سب سے بڑا شہر تھا۔ یہ شہر پانچ ہزار سال پہلے قائم کیا گیا اور تقریباً 1900 قبل مسیح میں تباہ ہو گیا۔ انگریزوں سے قبل ہندوستان کے کسی حکمران۔۔۔موریا، گپتا، دہلی کے سلاطین اور نہ ہی عظیم مغلوں نے اس شہر کی باقیات پر کوئی

توجہ دی بلکہ انھوں نے کبھی مڑ کر بھی نہیں دیکھا۔ لیکن انگریز ماہرین آثار قدیمہ نے اس شہر کی باقیات پر 1922ء میں پہلی دفعہ توجہ دی۔ انگریزوں کی ایک ٹیم نے یہاں کھدائی شروع کی اور ہندوستان کی تاریخ کے جوہر، اولین انسانی تہذیب کو کھوج نکالا۔ یہ وہ بھولی بسری تہذیب تھی جس کے بارے خود ہندوستانی بھی نہیں جانتے تھے۔

انگریزوں کے سائنسی تجسس کی ایک دوسری چیدہ مثال خط میخی کے معانی دریافت کرنا، یعنی رمز کشائی تھی۔ یہ وہ رسم الخط ہے جو مشرق وسطیٰ کے طول و عرض میں تقریباً تین ہزار برس تک رائج رہا لیکن یہ خط غالباً پہلی ہزاری عیسوی میں معدوم ہو گیا تھا۔ تب سے لے کر آج تک اس خطے کے باسیوں کو اکثر ہی خط میخی میں لکھی نوشتیں اور تحاریر یادگاروں، تعویزوں، ستونوں، قدیم کھنڈرات اور ٹوٹے پھوٹے ظروف پر مل جاتی تھیں۔ لیکن اس عجیب و غریب لکھائی کو پڑھنے، اکھڑ اور تیکھے زاویوں میں عبارتوں کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں تھی۔۔۔ بلکہ ان کو سمجھنے کی کبھی کسی نے کوشش ہی نہیں کی۔ خط میخی پر یورپیوں کی توجہ پہلی دفعہ 1618ء میں مرکوز ہوئی۔ ہوا یوں کہ فارس میں ہسپانوی سفیر ایک قدیم شہر، تخت جمشید کے کھنڈرات کی سیاحت کو نکلا۔ اس نے یہاں خط میخی میں ایسی کندہ کاری اور نقش دیکھے جو کسی کے سمجھ میں نہ آتے تھے۔ یوں، اس سفیر کے ذریعے اس نامعلوم خط اور کندہ کاری کی خبر یورپ کے عالم اور فاضل حلقوں میں عام ہو گئی اور ان کا تجسس آسمان کو چھونے لگا۔ 1657ء میں پہلی بار یورپی ماہرین نے تخت جمشید میں پائے جانے والے اس خط کے نقوش کو شایع کیا۔ اس کے بعد تو جیسے لڑی سی بن گئی اور آئے روز نت نئے نقوش اور کندہ کاری شایع ہونے لگی۔ مغرب میں تقریباً دو سو برس تک ماہرین اس خط کے نقوش کی رمز کشائی کی کوشش کرتے رہے لیکن کسی کو کامیابی نہیں ملی۔

1830ء میں ہینری رالینسن نامی ایک انگریز افسر کو فارس میں تعینات کیا گیا۔ اس کے ذمے فارس کے شاہ کی فوج کو یورپین طرز پر تربیت دلوانے کا کام لگایا گیا تھا۔ رالینسن اپنے فارغ وقت میں فارس کے طول و عرض کا سفر اختیار کرتا تھا اور سیاحت کا دلدادہ تھا۔ ایک دن، مقامی گائیڈ اسے کوہ زاگرس کے سلسلے میں ایک ایسی چٹان دکھانے لے گئے جس پر عظیم الجثہ بیستون کے نقوش اور نوشتہ کندہ کیے گئے تھے۔ یہ نقوش پندرہ میٹر تک اونچے اور تقریباً پچیس میٹر تک چوڑے تھے۔ یہ نقوش تقریباً 500 قبل مسیح میں شہنشاہ دارا اول کے حکم پر اس چٹان پر کندہ کیے گئے تھے۔ ان نقوش میں تین زبانوں کو خط میخی میں نوشتہ کیا گیا تھا۔ یہ تین زبانیں قدیم فارسی، عیلامی اور بابلی تھیں۔ یہ نقوش مقامی آبادیوں کے لیے جانے پہچانے تھے لیکن کوئی بھی شخص ان کو پڑھنے کی اہلیت نہیں رکھتا تھا۔ رالینسن کو یقین ہو گیا کہ اگر وہ ان نقوش اور قدیم نوشتوں کی رمز کشائی کر لے تو یقیناً وہ خود اور دوسرے ماہرین بھی مشرق وسطیٰ کے طول و عرض میں آئے روز دریافت ہونے والی ان کندہ کاریوں اور تحاریر کو پڑھنے لائق ہو جائیں گے۔ اگر ایسا ہو جاتا ہے تو پھر ایک قدیم اور بھولی بسری دنیا کی جانب دروازہ کھل جائے گا۔

اس کام کو سرانجام دینے کے لیے پہلا قدم تو یہ تھا کہ وہ ان کندہ کاریوں اور نقوش کی ایک معیاری اور محتاط طریقے سے بالکل صحیح صحیح ایسی نقل تیار کرے جو یورپ بجھوائی جا سکتی ہو۔ رالینسن نے بجائے دور ہی سے۔۔۔ اپنی جان خطرے میں ڈال کر اس ترچھی اور ڈھلوان نما خطرناک چٹان پر چڑھ کر عجیب و غریب حروف اور تہجیوں کی نقل تیار کرنا شروع کر دی۔ اس کام کے لیے اس نے کئی مقامی افراد کی مدد بھی حاصل کی۔ ایک کردش لڑکے کا ذکر تو بہت ہی عام ہے جس نے چٹان کے انتہائی مشکل ترین حصوں پر چڑھ کر، سیدھا اور الٹا لٹک کر اور ترچھے انداز میں بلد ہو کر ان نقوش کے اوپری حصوں کو بالکل صحیح صحیح انداز میں نقل تیار کرنے میں رالینسن کی بھرپور مدد کی۔ 1847ء میں یہ کام مکمل ہو گیا اور اس قدیم یادگار کی بالکل اصل کی طرح نقل تیار کر کے یورپ بجھوا دی گئی۔

یہاں پہنچ کر رالینسن نے دم نہیں لیا۔ وہ چونکہ ایک فوجی افسر تھا، اس کے لیے سیاسی اور عسکری کام بھی ذمے لگائے گئے تھے۔ لیکن جب اسے فارغ وقت ملتا، وہ ان نقوش اور نوشتوں کی گتھی سلجھانے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔ وہ ایک کے بعد دوسرا طریقہ استعمال کرتا جاتا اور پہلے طریقے کو رد یا بہتر بنانے کی پوری سعی کرتا جاتا۔ اس مقصد کے لیے اس نے مقامی زبانیں بھی سیکھ لی تھیں۔ کئی طریقوں اور کچھ عرصہ زبانوں پر محنت کے بعد وہ سب سے پہلے ان نقوش میں قدیم فارسی پر مشتمل حصوں کے معانی نکال لانے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ سب سے آسان حصہ تھا کیونکہ قدیم اور جدید فارسی میں فرق نہایت کم تھا اور رالینسن کو ان فارسی پر عبور حاصل تھا۔ قدیم فارسی کے اس حصے کی سمجھ بوجھ مل جانے کے بعد اس کو وہ کنجی بھی مل گئی جس کے تحت عیلامی اور بابلی زبان کے حصوں کے رازوں کو بھی کھولا جا سکتا تھا۔ جیسے ہی رالینسن نے یہ رمز کشائی مکمل کی تو ایک عظیم دروازہ تاریخ کی جانب فٹ سے کسی سم سم کی طرح وا ہو گیا اور اس کے بعد تو جیسے قدیم آوازوں کا تانتا بندھ گیا۔ قدیم سمیری بازاروں کی چہل پہل، آشوری بادشاہوں کے تحکم بھرے فرمان، بابل کے بیورو کریٹوں کی چالاکیاں اور عالموں کی موشگافیاں۔۔۔ سب کچھ سامنے آ گیا۔ رالینسن جیسے جدید یورپی سامراج پسندوں کی محنت اور کوشش کے بغیر شاید ہم مشرق وسطیٰ کی قدیم، بھولی بسری سلطنتوں کے بارے کبھی نہ جان پاتے۔

اسی طرح کا ایک اور مشہور سامراج پسند عالم ولیم جونز تھا۔ ولیم جونز کو بنگال میں سپریم کورٹ کے جج کی حیثیت سے تعینات کیا گیا تو وہ ستمبر 1783ء میں ہندوستان پہنچ گیا۔ وہ ہندوستان کے عجوبوں اور پراسراریت کا اس قدر گرویدہ تھا کہ اپنی آمد کے صرف دو ماہ بعد ہی 'ایشیائی سوسائٹی' نام تنظیم کی بنیاد رکھ دی۔ اس علمی تنظیم کا مقصد ایشیاء، بالخصوص ہندوستان کی ثقافت، تاریخ اور سماج کا مطالعہ کرنا تھا۔ سوسائٹی کو قائم ہوئے صرف دو برس ہی ہوئے تھے کہ جیمز نے قدیم زبان سنسکرت پر اپنے مشاہدات کو باقاعدہ کتابی شکل میں شایع کر دیا۔ جیمز کی یہ کتاب بالآخر لسانیات میں تقابل کے سائنسی شعبے کی بنیاد بھی بن گئی۔

اپنے مشاہدات پر مبنی تصنیفات میں جیمز نے سنسکرت نامی ہندوؤں کی مقدس، قدیم ہندوستانی۔۔۔ یونانی اور لاطینی زبانوں میں پائی جانے والی مشترکہ خصوصیات کی نشاندہی کی تھی۔ صرف یہی نہیں بلکہ جیمز نے مشاہدہ کیا تھا کہ سنسکرت کی صرف یونانی اور لاطینی ہی نہیں بلکہ

کئی دوسری زبانوں جیسے گوتھک، سیلٹک، قدیم فارسی، جرمن، فرانسیسی اور انگریزی کے ساتھ بھی کئی قدریں مشترک ہیں۔ ان کے بیچ پائے جانے والے مماثلات حیران کن تھے۔ مثلاً، سنسکرت میں ماں کے لیے 'مہتر' کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ انگریزی میں یہ 'مدر'، لاطینی میں 'ماتر' اور قدیم سیلٹک زبان میں 'ماتھر' کا لفظ ملتا ہے۔ جیمز نے اندازہ لگایا کہ ان ساری زبانوں کا خمیر ایک ہی تھا اور ایک بھولا بسرا، قدیم اجداد ہی مشترکہ ماخذ تھا۔ یہ جیمز کی ہی دریافت تھی جو بعد ازاں لسانیات میں 'ہند-اور یائی' یا 'ہند-یورپی' زبانوں کا خاندان بن کر سامنے آئی۔

جیمز کا یہ مطالعہ اور مشاہدہ صرف اس لیے ایک اہم سنگ میل نہیں تھا کہ اس نے ایک نہایت جراتمند (اور بالکل صحیح) تحقیقی مفروضہ قائم کیا تھا بلکہ یہ اس لیے بھی اہم تھا کہ اس نے زبانوں کے بیچ تقابل اور لسانی جائزے کا جو منظم طریقہ کار ایجاد کیا تھا، وہ نہایت کارآمد ثابت ہوا۔ یہ طریقہ دوسرے ماہرین نے بھی خوب استعمال کیا اور یوں دنیا بھر کی زبانوں پر انتہائی منظم طریقے سے تحقیق، تقابل اور فہرست تیار کرنے میں بھرپور مدد ملی۔

لسانیات کو ہمیشہ ہی سامراج کی طرف سے بھرپور توجہ اور مدد ملتی رہی ہے۔ یورپی سلطنتوں کا ماننا تھا کہ کسی بھی خطے پر بھرپور اور موثر حکمرانی کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ رعایا کی زبان اور تہذیب و ثقافت کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔ ہندوستان میں تعینات کیے جانے والے انگریز افسروں کے لیے کلکتہ کالج میں تین برس تک مختلف مضامین کی پڑھائی لازم ہوتی تھی۔ وہ یہاں ہندو اور اسلامی شرعی قوانین کے ساتھ ساتھ انگریزی قانون کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ اس کے لیے وہ سنسکرت، اردو، فارسی کے ساتھ ساتھ یونانی اور لاطینی زبانیں بھی سیکھتے تھے۔ تامل، بنگالی اور ہندوستانی ثقافت کے ساتھ ساتھ انھیں ریاضی، معاشیات اور جغرافیے کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ اس عمل کے دوران لسانیات کا علم حاصل کرنا بھی لازم تھا کیونکہ اس کی مدد سے مقامی زبانوں کی گرامر اور ساخت سمجھنے میں نہایت آسانی ہوجاتی تھی۔

یہ ولیم جونز اور ہینری رالینسن جیسے لوگوں کی کاوشیں اور محنت تھی جس کی بدولت یورپی فاتحین کو اپنی سلطنتوں اور نوآبادیوں کی بھرپور سمجھ بوجھ ہوا کرتی تھی۔ ان کی یہ سمجھ بوجھ کسی بھی گزشتہ فاتح سے کئی کئی درجے بڑھ کر ہوتی تھی اور یہاں تک کہ مقامی آبادیوں سے بھی زیادہ یہ یورپی فاتحین باعلم ہوتے تھے۔ اس برتر علمی خزانے کی بدولت ان فاتحین کو عملی طور پر بھی خوب فائدہ حاصل ہوتا تھا۔ اس طرح کے علم کے بغیر یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ مضحکہ خیز، یعنی انتہائی محدود تعداد میں انگریز دسیوں لاکھ ہندوستانیوں پر حکومت کرنے کے اہل ہوتے۔۔۔ حکومت تو ایک طرف وہ ان صلاحیتوں کے بغیر کبھی بھی ہندوستان پر دو سو برس تک جبر اور یہاں لوٹ کھسوٹ اور استحصال کا بازار گرم ہی نہیں کر سکتے تھے۔ انیسویں اور بیسویں صدی کے دوران تقریباً صرف پانچ ہزار انگریز افسران، چالیس سے ستر ہزار تک انگریز فوجی اور غالباً ایک لاکھ انگریز کاروباری، تاجر، بیویاں اور ان کے بچے تیس کروڑ ہندوستانیوں پر فتح حاصل کر حکمرانی کرتے رہے۔

سلطنتوں کے لیے لسانیات، حیاتیات، جغرافیے اور تاریخ پر نظر کرم کی واحد وجہ ان شعبوں کی مدد سے حاصل ہونے والے عملی فوائد ہی نہیں تھے۔ جتنے عملی فوائد اہم تھے، اتنا ہی اہم یہ تھا کہ سائنس کی مدد سے سلطنتوں اور سامراج کو وجود کا بھرپور نظریاتی جواز بھی مل جاتا تھا۔ جدید یورپیوں کا ماننا ہے کہ جتنا زیادہ اور جس قدر علم ممکن ہو، اس کا حصول ہمیشہ ہی بہتر ہوتا ہے۔ حقیقت یہ تھی کہ یورپی سلطنتیں اس طرز کے نت نئے علم کے دریاؤں کو سامراجی طاقت کی مدد سے ہمیشہ تر اور بہتا ہوا رکھ سکتی تھیں۔ چنانچہ، سامراجیت ایک ترقی پسند اور مثبت انٹرپرائز بن کر ابھر آئی۔ آج بھی غور کریں تو پتہ چلے گا کہ جغرافیہ، آثار قدیمہ، بشریات اور نباتیات وغیرہ جیسے سائنسی شعبوں کی تاریخ بالواسطہ ہی سہی لیکن یورپی سلطنتوں کی ہی دین ہے۔ آج علم نباتات کی تاریخ میں آسٹریلیا کے ابرآجین قبیلوں پر جبر اور ظلم، مشقت اور مصیبت کا تو ذکر نہیں ملتا لیکن ہمیں اس شعبے کی تاریخ میں جیمز کک اور جوزف بینکس جیسے لوگوں کے لیے نرم گوشہ، تہینت اور شکر گزاری کے جذبات مل ہی جاتے ہیں۔

مزید برآں یہ کہ سلطنتوں اور سامراج نے جتنا بھی نت نیا علم جمع کیا، وہ اصولی طور پر ہی سہی لیکن مفتوح آبادیوں کے لیے بھی فائدہ مند ثابت ہوا اور انھیں بھی 'ترقی' کے ثمرات چکھنے کو مل گئے۔ یہ خاصی طعن آمیز لیکن بہرحال حقیقت ہے۔ ان مقامی آبادیوں کو بہرحال کسی نہ کسی صورت طبی سہولیات اور تعلیم و تربیت حاصل کرنے کا موقع بھی مل گیا۔ ان کے یہاں ریلوے نیٹ ورک اور نہری نظام تعمیر کر دیے گئے اور انصاف و سماجی تحفظ و آسودگی کا بہتر تصور پرورش پانے لگا۔ سامراجیت پسند یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ سلطنتوں اور نوآبادیاتی کارجوئیوں کا مقصد صرف جبر اور استحصال نہیں تھا بلکہ غیر یورپی انسانی نسلوں کے لیے ایثار اور بے غرضی کے اظہار پر مبنی منصوبے بھی تھے۔ رڈیارڈ کپلنگ نے اپنی نظم میں اس امر کو 'سفید فام آدمی پر بوجھ' کے نام سے یاد کیا تھا۔

Take up the White Man's burden—

Send forth the best ye breed—

Go bind your sons to exile—

To serve your captives' need;

To wait in heavy harness,

On fluttered folk and wild—

Your new-caught, sullen peoples,

Half-devil and half-child.

ظاہر ہے، حقائق اس مفروضے کے برعکس ہیں۔ انگریزوں نے ہندوستان کے سب سے دولتمند صوبے بنگال کو 1764ء میں فتح کیا۔ ان نئے حکمرانوں نے اپنی جیبیں بھرنے کے علاوہ اس خطے کی ترقی میں کوئی دلچسپی نہیں دکھائی۔ بلکہ انھوں نے ایک ایسی تباہ کن معاشی پالیسی اختیار کی کہ چند برسوں کے اندر ہی بنگال کے طول وعرض میں قحط سالی پھیل گئی۔ بنگال کا عظیم قحط 1769ء میں شروع ہوا اور 1770ء میں قیامت خیز حدوں کو چھونے لگا۔ یہ قحط 1773ء تک جاری رہا اور اس دوران فاقہ کشی، غذائی قلت اور گرانی کے ہاتھوں صوبے کی ایک تہائی آبادی ۔۔۔ یعنی ایک کروڑ بنگالی ہلاک ہو گئے۔

سچ تو یہ ہے کہ نہ تو جبر اور استحصال اور نہ ہی 'سفید فام آدمی پر بوجھ' کا بیانیہ مکمل طور پر حقائق کی ترجمانی کرتا ہے۔ یورپی سلطنتوں اور سامراج نے بہت بڑے پیمانے پر بہت سی مختلف چیزوں پر عمل درآمد کیا۔۔۔ اسی وجہ سے آپ بھلے دو میں سے کسی ایک بیانیے کی حمایت کرتے ہوں، اس کی کئی کئی مثالیں مل جائیں گی۔ آپ کا خیال ہے کہ یہ یورپی سلطنتیں ایسی شیطانی عفریت تھیں جو دنیا میں ہلاکت، جبر اور بے انصافی کا باعث تھیں؟ آپ نہایت آسانی کے ساتھ ان سلطنتوں کے جرائم کا پورا انسائیکلوپیڈیا تیار کر سکتے ہیں۔ کیا آپ کی دلیل یہ ہے کہ نو آبادیاتی سلطنتوں نے دنیا بھر میں اپنی رعایا کو نت نئی ادویات، بہتر معاشی حالات اور تحفظ فراہم کیا ہے؟ آپ ان عنایات اور خیر خواہی سے متعلق ان کامیابیوں کا بھی پورا انسائیکلوپیڈیا بھر سکتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ یورپی سامراجیت اور سائنس کے بیچ اس قدر گہرا تعاون اور اشتراک رہا ہے کہ ان سلطنتوں کو اتنی بیش بہا طاقت مل گئی۔ یہ طاقت اتنی زیادہ تھی کہ وہ دنیا میں بہت ہی بڑے پیمانے پر تبدیلی کا موجب بن گئے کہ اب غالباً ان یورپی سلطنتوں کو اچھا اور نہ ہی برا۔۔۔ یعنی یہ سیدھی سیدھی عفریت اور نہ ہی آسانی سے منفرادیت قرار دی جا سکتی ہیں۔ ان سلطنتوں نے اس دنیا کو وہ شکل دی ہے جو آج ہم جانتے ہیں۔۔۔ اس میں وہ نظریات اور تصورات بھی شامل ہیں جن کے تحت ہم ان سلطنتوں کو رحمت یا پھر زحمت قرار دیتے ہیں۔

جہاں یہ، وہیں یہ بھی سچ ہے کہ سامراجیت پسندوں نے سائنس کو عجب بدی اور شرارت کی غرض سے بھی بھرپور استعمال کیا ہے۔ بعض جگہ تو ایسا لگنے لگتا ہے کہ شاید سائنس، سامراجیت کی باندی بن کر رہ گئی تھی۔ حیاتیات دانوں، آثار قدیمہ کے ماہرین اور یہاں تک کہ لسانیات کے فاضلوں نے بھی ایسے ایسے سائنسی ثبوت پیدا کیے کہ یورپیوں کو یہ لگا کہ وہ بنی نوع انسان میں دوسرے سبھی انسانوں سے برتر نسل ہیں۔ اس برتری کی بنیاد پر، غالباً وہ باقی انسانوں پر حکمرانی کو اپنا 'فرض' تو نہیں لیکن 'حق' ضرور سمجھتے آئے ہیں۔ جب ولیم جونز نے ہند-یورپی زبانوں کو ایک خاندان، ایک ہی قدیم زبان کی بٹی ہوئی شاخیں ثابت کر دیا تو بہت سے محققین یہ جاننے کو بیتاب ہو گئے کہ آخر اس قدیم، آبائی زبان کے اصل بولنے والے کون تھے؟ یعنی، نسلی طور پر ایک دوڑ شروع ہو گئی۔ مزید تحقیق سے پتہ چلا کہ تین ہزار سال قبل سنسکرت بولنے والے جن حملہ آوروں نے وسطی ایشیاء سے ہندوستان پر دھاوا بولا تھا۔۔۔ وہ خود کو آریا کہلواتے تھے۔ اسی طرح قدیم فارسی زبان بولنے والے خود کو آریہ کہلواتے تھے۔ یورپی عالموں نے فوراً ہی یہ مفروضہ پال لیا کہ اولین دور میں قدیم زبان

بولنے والے وہ لوگ جن کے یہاں سنسکرت اور فارسی نے جنم لیا۔۔۔یورپ میں بھی یہ وہی لوگ تھے جن کے یہاں یونانی،لاطینی، گاتھک اور سیلٹک زبانوں نے جنم لیا تھا۔ اب سنسکرت اور فارسی بولنے والے دونوں ہی قدیم باشندے اگر خود کو آریا یا آریہ کہلواتے تھے تو یقیناً یورپ میں بھی یہ لوگ خود کو آریا ہی کہلواتے ہوں گے؟ اب کیا یہ محض ایک اتفاق ہے کہ وہ لوگ جنھوں نے عظیم ہندوستانی، فارسی، یونانی اور رومی تہذیبوں کی داغ بیل ڈالی۔۔۔وہ سارے ہی آریائی تھے؟

جب انگریز،فرانسیسی اور جرمن محققین نے ایک لسانی نظریے کی بنیاد پر آریائیوں کو سخت محنتی اور جفاکش (تاریخ کی عظیم تہذیبوں کے خالق) بھی قرار دے دیا تو اب آریائیوں کی جفاکشی کو ڈارون کے قدرتی انتخاب پر مبنی نظریے سے بھی نتھی کر دیا۔ یعنی، اب یہ کہنے لگے کہ آریائی صرف ایک لسانی نہیں بلکہ حیاتیاتی گروہ تھے۔ یعنی، وہ باقی انسانوں سے الگ نسل تھے۔ بلکہ وہ صرف ایک نسل نہیں تھے بلکہ برتر نسب کی نسل تھے۔ وہ بلند قامت، سرخ سپید اور سنہری رنگت، آبی چشم، محنت کش اور بے انتہاء کے عقلمند انسان تھے پوری دنیا میں تہذیب اور تمدن کی بنیاد رکھنے کے لیے شمال کے کہرے سے وارد ہوئے تھے۔ افسوسناک امر یہ تھا کہ جن آریائیوں نے ہندوستان اور فارس کو فتح کیا تھا، انھوں نے ان خطوں کے آبائی باشندوں میں بیاہ رچا لیے اور یوں اپنی سرخ و سپید رنگت، سنہری بالوں کی رنگت کھو دی۔۔۔اس کے ساتھ ساتھ ان کی عقلی صلاحیت اور جانفشانی بھی جاتی رہی۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان اور فارس میں کئی کئی تہذیبیں آئیں اور پھر انحطاط کا شکار ہو گئیں۔ دوسری جانب، یورپ میں آریائیوں نے اپنی نسلی عفت اور نفاست محفوظ رکھی۔ یہی وجہ ہے کہ یورپیوں نے بالآخر پوری دنیا فتح کر لی ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ اس دنیا پر حکومت کے لیے اہل ہیں۔ لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ خود کو کم تر نسلوں کے ساتھ مدغم نہ کریں اور احتیاط برتتے رہیں۔

اس طرح کی نسل پرست نظریات کئی دہائیوں تک نمایاں ہی نہیں بلکہ معزز بھی سمجھے جاتے رہے۔ لیکن اب یہی نظریات کو سائنسدان اور سیاستدان دونوں ہی یکساں طور پر نفرت انگیز سمجھتے ہیں۔ دنیا بھر میں لوگ آج بھی پوری تندہی کے ساتھ بڑھ چڑھ کر نسل پرستی کے خلاف جد وجہد کرتے ہیں لیکن وہ بھول جاتے ہیں کہ اب جنگی محاذ بدل چکا ہے۔ سامراجی نظریات میں اب نسل پرستی کی جگہ 'تہذیب یا ثقافت پرستی' نے لے لی ہے۔ ابھی تک تہذیب پرستی یا ثقافت پرستی عام نہیں ہوئی لیکن یہ صرف کچھ وقت کی بات ہے۔ آج کی اشرافیہ متنوع انسانی گروہوں میں میں تقابل اور امتیاز کی غرض سے تاریخی فرق میں نسلوں کے بیچ حیاتیاتی فرق کی بجائے تہذیبی اور ثقافتی امتیاز پر زور دیتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اب ہم کچھ مختلف دیکھتے ہیں تو یہ نہیں کہتے کہ، 'یہ ان کے خون میں شامل ہے۔۔۔ یا ان کی فطرت ہی ایسی ہے!' وغیرہ وغیرہ بلکہ کہتے ہیں، 'یہ ان کی ثقافت کا حصہ ہے!'۔

یورپ میں دائیں بازو کی وہ جماعتیں جو مسلمانوں کی نقل مکانی اور ہجرت کے سخت خلاف ہیں۔۔۔وہ مسلمانوں کے خلاف بالخصوص نسل پرستانہ دلائل سے پرہیز کرتی ہیں۔ فرض کریں، آج فرانس کی قوم پرست جماعت، 'فرنچ فرنٹ نیشنل' کی صدر مارین لوپوں کو ان کے

تقریر نویس یہ تجویز دیں کہ وہ قومی ٹی وی پر اعلان کر دیں،'ہم اس کمتر سامی نسل کو اپنے بر تر آریائی خون کو پلید کر کے آریائی تہذیب کو برباد نہیں ہونے دیں گے' تو کیا ہو گا؟ ان تقریر نویسوں کو اس قسم کی نسل پرستانہ تجویز دینے پر کھڑے کھڑے تحریک اور نوکری سے بے دخل کر کے لاتعلقی کا اعلان کر دیا جائے گا۔ اس کی بجائے یہ ہے کہ فرنچ فرنٹ نیشنل، ڈچ پارٹی آف فریڈم، الائنس فار فیوچر آف آسٹریا اور اس طرح کی کئی یورپی قوم پرست جماعتیں مغربی تہذیب اور ثقافت کی برتری کا راگ الاپتی ہیں۔ ان کے دلائل کا پورا زور یہی ہوتا ہے کہ یورپ میں مغربی تہذیب کی ارتقاء جمہوری اقدار، برداشت اور صنفی مساوات جیسی خصوصیات پر پہنچ آئی ہے۔ جبکہ دوسری جانب اسلامی ثقافت اور تہذیب نے مشرق وسطیٰ کے گھٹن زدہ ماحول میں ارتقائی مراحل طے کیے ہیں۔ اس تہذیب کی 'فطرت' میں خاندانی سیاست، مذہبی تعصب اور عورت سے بیر جیسی خصوصیات بھری پڑی ہیں۔ اب چونکہ یہ دو متضاد انتہائیں ہیں۔۔۔ ایک دوسرے سے قطعی ثقافتیں ہیں، بلکہ مسلمان تارکین وطن تو مغربی اقدار کو سرے سے اپنانے پر ہی راضی نہیں ہیں یا غالباً وہ ان اقدار کو اپنانے کے قابل ہی نہیں ہیں۔ اس لیے انھیں یورپ میں داخل ہونے کی قطعاً اجازت نہیں ہونی چاہیے۔ یہ یورپ میں خواہ مخواہ کے تنازعات کو سلگانے کا باعث بنتے رہتے ہیں اور اگر اب بھی ان کا راستہ نہ روکا گیا تو یہ جلد ہی یورپ کی جمہوری اقدار اور آزاد خیالی کو گھن کی طرح رفتہ رفتہ کھا جائیں گے۔

ان 'تہذیب پرستوں' کو یہ مواد سماجیات، ادب، تاریخ، فلسفہ اور لسانیات جیسے علوم میں سائنسی مطالعوں اور تحقیق میں سے ملتا ہے۔ اس طرح کی سائنسی تحقیق اور مطالعہ نام نہاد 'تہذیبوں کے ٹکراؤ' اور دنیا کی مختلف ثقافتوں کے بیچ بنیادی فرق اور تفاوتوں کو پیش پیش کر کے واضح کرنے کا کام کرتی ہیں۔ سارے تاریخ دان اور بشریات کے ماہرین اس طرز کے نظریات اور ان نظریات کے سیاسی استعمال کو قبول نہیں کرتے۔ آج حیاتیات کے شعبے میں نسل پرستی کو نہایت آسانی کے ساتھ رد کرنے کی معقول وجہ موجود ہے۔ ہمیں سائنسی تحقیق سے یہ پتہ چل چکا ہے کہ آج انسانی آبادیوں کے بیچ پائے جانے والے جینیاتی فرق معمولی اور کسی اہمیت کے حامل نہیں ہیں۔ لیکن تاریخ دانوں اور علم بشریات کے ماہرین کے لیے اس طور کے دلائل تہذیب پرستی کو روکنے کے لیے پیش کرنا آسان نہیں ہے۔ وہ یوں کہ اگر تاریخ دان اور بشریات کا شعبہ یہ مان لے کہ انسانی تہذیب اور ثقافتوں کے بیچ پایا جانے والا فرق معمولی اور خفیف۔۔۔ یعنی کم قدر ہے تو پھر ان تاریخ دانوں اور علم بشریات کے ماہرین کی علمی زندگی اور ان کے متعلقہ شعبوں کا عملی مقصد کیا ہے؟ انھیں کس بات کی تنخواہ ملتی ہے؟

سائنسدانوں نے سامراجی منصوبوں کو عملی طور پر استعمال ہونے والا علم، نظریاتی جواز اور ٹیکنالوجی کی نرالی مصنوعات فراہم کی ہیں۔ غالباً، اس سائنسی حصے کے بغیر یورپی کبھی بھی پوری دنیا پر فتح حاصل نہ کر پاتے۔ یورپی فاتحین نے بھی سائنس کا احسان خوب اتارا ہے اور سائنسدانوں کو معلومات، تحفظ، عجیب و غریب سائنسی تحقیق کے منصوبوں کے لیے وسائل اور سائنسی طرز فکر کو دنیا کے کونے کونے

تک پھیلانے کی کھلی چھٹی دیے رکھی ہے۔ سامراجی امداد کے بغیر، غالباً جدید سائنس کے لیے اس قدر ترقی کرنا کبھی ممکن نہ ہوتا۔ ایسے سائنسی شعبوں کی تعداد بہت ہی کم بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے جن کی ابتداء سامراجی ترقی کے ساتھ نہ جڑی ہو۔ سائنس کی ایسی کونسی شاخ ہے جس کے یہاں بڑی بڑی دریافتوں، بٹورن، تعمیرات اور وظائف میں فوجی افسران، نیوی کے کپتانوں اور سامراجی گورنروں کی کشادہ دلی اور فیاضی کا ہاتھ نہ ہو؟

ظاہر ہے کہ یہ مکمل کہانی نہیں ہے۔ سائنس کو صرف سامراجی سلطنتوں کا ہی نہیں بلکہ دوسرے اداروں اور دستوروں کا بھی ساتھ میسر رہا ہے۔ اسی طرح یورپی سلطنتیں صرف سائنس کے بل بوتے پر ہی دنیا میں غالب نہیں ہوئیں۔۔۔ ان کی اس کامیابی میں کئی دوسرے عوامل بھی کارفرما رہے ہیں۔ سچ یہ ہے کہ سائنس اور سامراجی سلطنتیں، ان دونوں کی اٹھان کے پیچھے ان سے کہیں بڑی قوت کا ہاتھ تھا۔ اس طاقت کا نام سرمایہ داری نظام ہے۔ اگر سرمایہ دار اور سوداگروں کو دولت اور زر کمانے کی چاہ نہ ہوتی تو بھلا کرسٹوفر کولمبس اپنے بل بوتے پر امریکہ دریافت کر سکتا تھا؟ یا کیا جیمز کک آسٹریلیا پہنچ سکتا تھا؟ یا کیا۔۔۔ نیل آرمسٹرانگ چاند کی سطح پر پہلا قدم رکھ سکتا تھا؟

سرمایہ داری کا دھرم

زر، دولت، نقدی یا پیسہ۔۔۔ آپ اس کو کوئی بھی نام دے دیں۔ سکہ رائج الوقت عظیم سلطنتیں کھڑی کرنے اور سائنس کی حوصلہ افزائی کرنے کے دونوں مقاصد پورے کرنے کے لیے لازم ملزوم رہے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ان دونوں کاموں کا حتمی نصب العین دولت کمانا ہے؟ یا ایسا کہیے، کیا یہ دولت جمع کرنے کے لیے خطرناک حد یہ دونوں کام ضروری ہیں؟

جدید تاریخ میں معاشیات اور اقتصادیات کا واقعی کردار سمجھ پانا اتنا آسان نہیں ہے۔ اس بارے کئی کئی جلدوں پر مشتمل لاتعداد کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ ان کتابوں میں سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے کہ پیسے کے بل بوتے پر کیسے ریاستیں کھڑی کی گئیں اور پھر انھیں تباہ کر دیا گیا۔ پیسے کی مدد سے نئے افق نظر آئے اور لاکھوں انسانوں کو غلامی کا طوق پہنا دیا گیا۔ صنعت کا پہیہ پیسے کا محتاج رہا اور کیسے اس پیسے اور دولت کی خاطر دسیوں ہزار انواع واقسام کی نامیات معدومی کے منہ میں چلی گئیں۔ لیکن اس کے باوجود، جدید معاشی تاریخ کو سمجھنے کے لیے صرف ایک لفظ کی سمجھ بوجھ کافی ہے۔ وہ ایک لفظ 'نمو' یا 'پیداوار' ہے۔ اچھے یا برے کے لیے، بیماری یا صحت کی حالت میں۔۔۔ جدید معیشت کسی نوعمر لڑکے کے ہارمونی خمار میں ترجسم کی طرح بڑھتی ہی چلی گئی ہے۔ اسے جو شے ملتی ہے، کھاتی جاتی ہے اور اس کا قد اندازوں سے کہیں بڑھ کر انچ در انچ بڑھتا جاتا ہے۔

تاریخ کے تقریباً سارے حصے میں معیشت کا حجم کم و بیش ایک جیسا ہی رہا ہے۔ یہ درست ہے کہ عالمی سطح پر پیداوار میں اضافہ دیکھنے میں آیا لیکن اس کی زیادہ تر وجہ آبادی میں اضافہ اور نئے علاقوں کی آبادیاتی رہی ہے۔ جہاں تک فی کس آمدنی کا سوال ہے تو وہ ہمیشہ ہی جامد رہی ہے۔ لیکن جدید دور کے ساتھ، معیشت کا یہ حال بھی بدل گیا۔ 1500ء میں مصنوعات اور خدمات کی عالمی پیداوار تقریباً 250 ارب امریکی ڈالر (آج کی قیمت) کے برابر تھی۔ آج، یہ 60،000 ارب امریکی ڈالر کے برابر ہے۔ اس سے بھی زیادہ اہم یہ ہے کہ 1500ء میں عالمی سطح پر اوسط سالانہ فی کس آمدنی تقریباً 550 امریکی ڈالر (آج کی قیمت) تھی جبکہ آج عالمی سطح پر اوسطاً ہر مرد، عورت، بچے کی سالانہ فی کس آمدن 8800 امریکی ڈالر ہے۔ اس عظیم اور حیرت انگیز نمو اور پیداوار کی وجوہات کیا ہیں؟

بات یہ ہے کہ معاشیات بدنامی کی حد تک ایک انتہائی پیچیدہ مضمون ہے۔ اسی لیے، معاملات کی سادگی کو برقرار رکھنے کے لیے ایک آسان مثال کا سہارا لینا مناسب ہوگا:

فرض کریں، سیموئیل گریڈی ایک سمجھدار بلکہ ایک عیار سرمایہ کار ہے۔ وہ کیلیفورنیا کے کسی شہر میں ایک بینک کی بنیاد رکھتا ہے اور اس کی پہلی شاخ کھل جاتی ہے۔

کیلیفورنیا کے اسی شہر میں ایڈ ورڈ سٹون نامی ایک ہونہار ٹھیکے دار ہے جس نے حال ہی میں ایک بڑا ٹھیکہ مکمل کیا ہے۔ اس ٹھیکے میں سٹون کو تقریباً دس لاکھ ڈالر کا خالص منافع حاصل ہوا ہے۔ سٹون، منافع کی یہ رقم مسٹر گریڈی کے بینک میں کھاتہ کھول کر جمع کروا دیتا ہے۔ یعنی، بینک کے پاس اب دس لاکھ ڈالر کا سرمایہ جمع ہو گیا ہے۔

کیلیفورنیا کے اسی شہر میں ایک تجربہ کار لیکن غریب اور مفلس باورچی ہے جس کا نام جین میک ڈونٹ ہے۔ مس جین، ایک جگہ نوکری کرتی ہے لیکن اس کے خیال میں شہر کے اس حصے میں کاروبار کی کافی گنجائش ہے کیونکہ یہاں کوئی اچھی بیکری نہیں ہے۔ اب مس جین کے پاس اتنا سرمایہ نہیں ہے کہ وہ کسی معقول جگہ پر کاروبار شروع کرنے کے لیے لیز پر دکان، صنعتی اوون، سنک، چھری چاقو اور برتن وغیرہ کا انتظام کر سکے۔ چنانچہ وہ مسٹر گریڈی کے بینک جاتی ہے۔ کاروبار کا منصوبہ پیش کرتی ہے اور بینک کو اس کاروبار میں سرمایہ کاری پر آمادہ کر لیتی ہے۔ مسٹر گریڈی کا بینک جین کے کاروبار کے لیے دس لاکھ ڈالر کا قرضہ منظور کر لیتا ہے۔ یہ رقم مس جین کے کھاتے میں جمع کر دی جاتی ہے۔

مس جین بیکری کے منصوبے میں تعمیرات اور دوسرے انتظامات کو پورا کرنے کے لیے مسٹر سٹون (ٹھیکیدار) کی خدمات حاصل کر لیتی ہے۔ مسٹر سٹون اور مس جین کے بیچ یہ کام مکمل کرنے کے عوض دس لاکھ ڈالر کا معاہدہ طے پا جاتا ہے۔

اب مس جین جب بھی مسٹر سٹون کو چیک کی صورت ادائیگی کرتی ہے تو وہ اس چیک کو مسٹر گریڈی کے بینک میں اپنے کھاتے میں جمع کروا لیتا ہے۔

اب مسٹر سٹون کے کھاتے میں کل کتنی رقم، کھاتے کی صورت جمع ہے؟ بیس لاکھ ڈالر۔

بینک کی تجوری میں کل کتنی رقم، نقدی کی صورت موجود ہے؟ دس لاکھ ڈالر۔

یہ چکر یہاں ختم نہیں ہوتا کیونکہ ٹھیکیداروں کے کام ایسے ہی ہوتے ہیں۔ ابھی کام پورا مکمل نہیں ہوا تھا جبکہ دس لاکھ ڈالر روپے خرچ بھی ہو گئے تھے۔ مسٹر سٹون نے مس جین کو صورتحال سے آگاہ کیا کہ کام مکمل کرنے کے لیے مزید دس لاکھ ڈالر درکار ہوں گے۔ یہ سن کر مس جین کو غصہ تو کافی آتا ہے لیکن اب کیا کیجیے، اس کام کو آدھی راہ کے بیچ میں تو نہیں چھوڑا جاسکتا تھا۔ خیر، مس جین دوبارہ بینک جا کر مسٹر گریڈی کو اضافی قرضے کی منظوری پر قائل کر لیتی ہے۔ مس جین کے کھاتے میں مزید دس لاکھ ڈالر جمع ہو جاتے ہیں۔ وہ یہ رقم، چیک کی صورت ٹھیکیدار کو ادا کر کے بیکری کا کام مکمل کروا دیتی ہے۔

اب مسٹر سٹون (ٹھیکیدار) کے کھاتے میں کتنی رقم درج ہے؟ اس کے پاس تیس لاکھ ڈالر ہیں۔

لیکن حقیقت میں بینک کے پاس کتنی نقدی پڑی ہے؟ ابھی بھی، صرف دس لاکھ ڈالر ہیں۔ اصل میں یہ وہی دس لاکھ ڈالر ہیں جو بینک کی تجوری میں پڑے رہے ہیں۔

امریکہ میں بینکاری کے قوانین کے مطابق، بینک ان دس لاکھ ڈالروں کے ساتھ یہی عمل سات دفعہ مزید دہرا سکتا ہے۔ ٹھیکیدار کے کھاتے میں یوں ایک کروڑ ڈالر جمع ہو کر درج تو ہو جائیں گے لیکن بینک کی تجوری میں وہی دس لاکھ ڈالر نقدی کی صورت موجود رہیں گے۔ بینکوں کو یہ اجازت حاصل ہے کہ وہ ایک ڈالر اصل دھن کے بدلے دس ڈالر کا قرض منظور کر سکتے ہیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے بینک کے کھاتوں میں درج شدہ یا کہیے جمع شدہ نوے فیصد رقم سکوں اور نوٹوں کی شکل میں، سرے سے وجود ہی نہیں رکھتی۔ اب، فرض کریں کہ اگر سٹی بینک کے سبھی کھاتے دار، ایک ساتھ ہی بینک سے اپنے کھاتوں میں درج رقم کو نقدی کی صورت مطالبہ کر دیں تو کیا ہو گا؟ ظاہر ہے، اگر حکومت نے دخل اندازی نہ کی تو سٹی بینک کا یکدم ہی بھٹہ بیٹھ جائے گا۔ یہی حال ہر بینک کا ہے۔۔۔ سٹی بینک، بارکلے، ڈار چویلے، سٹینڈرڈ چارٹرڈ، الائیڈ بینک اور دنیا کے ہر بینک کی بھی، یہی حقیقت ہے۔

اب یہ سننے میں تو ایک بہت بڑا مالی فراڈ یا پانزی سکیم محسوس ہوتا ہے۔ کیا ایسا نہیں ہے؟ لیکن اگر یہ ایک فراڈ ہے تو پھر جدید معیشت سالم فراڈ ہے۔ یہ حقیقت میں کوئی دھوکہ نہیں بلکہ انسانی تخیل کی حیرت انگیز صلاحیتوں کا مظہر ہے۔ یہ جو بینک اور پوری کی پوری جدید معیشت ہے۔۔۔ دراصل اس کی بقاء اور نمو ہمارے مستقبل میں اعتماد اور بھروسے کی وجہ سے ممکن ہوتی ہے۔ یہ ہمارا بھروسہ ہی ہے جس کی بنیاد پر پوری دنیا کی دولت اور زر۔۔۔ یعنی پیسے کی عمارت کھڑی ہوتی ہے۔

بیکری کی مثال میں دیکھا جائے تو ٹھیکیدار کے گوشوارے اور بینک میں اصل رقم کے بیچ جو فرق ہے، وہ مس جین کی بیکری کا ہے۔ مسٹر گریڈی نے بینک کا سرمایہ اس بھروسے پر بیکری کے اثاثے میں لگا دیا ہے کہ ایک دن یہ منافع بخش کاروبار ہو گا۔ اس بیکری میں ابھی

تک ایک بھی ڈبل روٹی تیار نہیں ہوئی لیکن اس کے باوجود مس جین اور مسٹر گریڈی کو توقع ہے کہ تقریباًایک سال بعد اس بیکری میں روزانہ ہزاروں کے حساب سے ڈبل روٹیاں، کریم رول، کیک اور بسکٹ پک کر بکیں گے اور یوں معقول منافع حاصل ہو گا۔ مس جین، یہ قرض بمعہ سود لوٹادے گی۔ اگر اس وقت مسٹر سٹون (ٹھیکیدار) اپنی جمع پونجی بینک سے طلب کرے تو مسٹر گریڈی یہ نقدی فراہم کر سکتا ہے۔ الغرض، یہ سرمایہ کاری پر مبنی تمام انٹرپرائز ایک فرضی مستقبل پر بھروسے کی بنیاد پر کھڑی ہے۔ نئی کاروباری، یعنی مس جین اور بینکار یعنی مسٹر گریڈی کو اپنے خوابوں کی بیکری پر بھروسہ ہے جبکہ کھاتے دار یعنی مسٹر سٹون کو بینک کی مستقبل میں استطاعت اور ادائے قرض کی صلاحیت پر پورا بھروسہ ہے۔

پچھلے ابواب میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ زر یا پیسہ کس قدر زبردست اور حیرت انگیز شے ہے کیونکہ یہ ان گنت اشیاء کی قدر و قیمت میں ترجمانی کر سکتا ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ تقریباًہر شے کے مبادلے کا ذریعہ بھی بن جاتا ہے۔ تاہم، جدید دور سے قبل زر یا پیسے کی یہ صلاحیت انتہائی محدود ہوا کرتی تھی۔ زیادہ تر تو یہی ہوتا تھا کہ پیسے یا زر کی مدد سے صرف انھی چیزوں کا مبادلہ ممکن تھا جو حال میں موجود تھیں۔ حال کے ساتھ اس ناطے کی وجہ سے نمو یا بڑھوتری پر سخت قدغن لگ جاتی تھی کیونکہ اس طرح نئی انٹرپرائز اور کاروباروں پر پیسہ لگانا تقریباً ناممکن ہو جاتا تھا۔

اس نکتے کو سمجھنے کے لیے ایک دفعہ پھر بیکری کی مثال لیں۔ اگر پیسہ صرف مادی اشیاء کا مبادل ہوتا تو کیا مس جین کے لیے بیکری کا کاروبار شروع کرنا ممکن تھا؟ ظاہر ہے، بالکل بھی نہیں تھا۔ کیونکہ مسئلہ حال کا تھا۔ حال میں تو اس کے پاس بیکری کا خواب ضرور ہے لیکن مادی وسائل نہیں ہیں۔ وہ بیکری کا کاروبار صرف اس صورت شروع کر سکتی ہے کہ اگر ٹھیکیدار اپنی جیب سے پیسہ خرچ کردے اور کئی سال بعد اس وقت وصولی کرے جب بیکری سے کافی ساری آمدن ہو جائے۔ لیکن، حال یا مثال کیسے۔۔۔ 'آج کل' ایسے ٹھیکیدار کہاں ہوتے ہیں؟ چنانچہ مس جین کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔ وہ ایک بیکری کے بغیر کیک نہیں پکا سکتی۔ کیکوں کے بغیر وہ پیسہ نہیں کما سکتی۔ پیسے کے بغیر وہ ایک ٹھیکیدار کی خدمات حاصل نہیں کر سکتی۔ ایک ٹھیکیدار کے بغیر، وہ بیکری کا کاروبار نہیں شروع کر سکتی۔ یعنی، حال میں سارے راستے مسدود ہیں۔

انسانیت ہزاروں سال تک اس تکلیف دہ صورتحال پر مبنی چکر میں پھنسی رہی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ معیشت ہمیشہ ہی جامد چلی آتی تھی۔ جب جدید دور میں مستقبل پر بھروسے اور اعتماد کے نئے نظام کے ساتھ بالآخر اس دام سے نکلنے کا طریقہ بھی ایجاد ہو ہی گیا۔ اس نظام میں پیسے یا زر کی خصوصی قسم ایجاد ہوئی۔ اس کو ہم 'کریڈٹ' کہتے ہیں۔ کریڈٹ کو ویسے تو ادھار بھی کہا جاتا ہے لیکن اس کا لفظی مطلب اعتبار یا بھروسا ہی ہے۔ کریڈٹ کی مدد سے ہم 'مستقبل' کے مصرف یا خرچے پر 'حال' تعمیر کرتے ہیں۔ یعنی، کریڈٹ کی بنیاد اس مفروضے

پر رکھی گئی ہے کہ 'مستقبل' کے وسائل، بلاشبہ ہمارے 'حال' کے وسائل سے کثیر ہی ہوں گے۔ یوں، جب ہم مستقبل کی آمدن استعمال کر کے حال کھڑا کرنے میں کامیاب ہوگئے تو اس کے نتیجے میں نت نئے اور حیرت انگیز، انتہائی عمدہ مواقع بھی پیدا ہونے لگے۔ اگر کریڈٹ یا بھروسا واقعی اتنی حیرت انگیز شے ہے تو پھر اس کے بارے پہلے کسی کو خیال کیوں نہیں آیا؟ ظاہر ہے۔۔۔ ادھار تو پہلے بھی ہوا ہی کرتا تھا اور لوگ ایک دوسرے پر بھروسا بھی کرتے تھے۔ یہ ایک یا دوسری صورت، کسی نہ کسی طور معلوم انسانی تہذیب میں وجود رکھتا چلا آیا ہے۔ قدیم سمیری تہذیب میں بھی اس کے آثار ملتے ہیں۔ پچھلے زمانوں میں مسئلہ یہ نہیں تھا کہ لوگوں کو اس کے بارے علم نہیں تھا یا انھیں طریقہ نہیں آتا تھا۔ تب اصل مسئلہ یہ تھا کہ لوگ بہت زیادہ ادھار دینے سے اس لیے پیچھے ہٹ جاتے تھے کیونکہ انھیں یہ بھروسا نہیں تھا کہ مستقبل، لازمی طور پر حال سے بہتر ہی ہو گا۔ وہ عام طور پر یہ یقین رکھتے تھے کہ ماضی یا گزرا ہوا زمانہ حال سے بہتر تھا اور مستقبل بدتر ہو گا۔۔۔ یا بہت بہتر بھی ہوا تو زیادہ سے زیادہ حال جیسا ہی ہو گا۔ اس معاملے کو معاشی پیرائے میں بیان کیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ پچھلے زمانوں میں لوگوں کا ایقان یہ تھا کہ اگر دولت بتدریج سکڑ کر گھٹ نہیں بھی رہی تو پھر بھی اس کی کل مقدار انتہائی محدود ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے لوگ یہ فرض کر لیتے تھے کہ مستقبل میں۔۔۔ بالفرض دس سال میں وہ انفرادی سطح پر، ان کی ریاست یا پوری دنیا۔۔۔ حال سے زیادہ دولت پیدا کر سکتی ہے۔ اس لحاظ سے کاروبار صرف اور صرف جمع خرچ بن کر رہ جاتا تھا۔ یعنی، ایک فریق کا فائدہ۔۔۔ کسی دوسرے کا نقصان ہوتا ہے۔ یہ درست ہے کہ کسی مخصوص بیکری کا کام چل پڑے تو اسے خوب منافع حاصل ہوتا ہے لیکن اس کا خمیازہ پڑوس کی دوسری بیکری کو بھگتنا پڑتا ہے۔ وینس کا شہر بھلے پھل پھول رہا ہے لیکن یہ بھی تو دیکھیے کہ جینیوا کا شہر تو ڈوب گیا ہے۔ انگلستان کے شہنشاہ کی تجوری تو خوب بھر رہی ہے لیکن اس نے یہ دولت فرانس کے شہنشاہ کی جیب سے نکالی ہے۔ دولت کی مقدار سے متعلق حد سے مراد یہ تھی کہ کسی کیک کو آپ طرح طرح جتنے بھی طریقوں اور ٹکڑوں میں کاٹ لیں۔۔۔ اس سے وہ کیک بڑا نہیں ہو جاتا۔

یہی وجہ ہے کہ بہت ساری تہذیبوں اور ثقافتوں میں دولت جمع کرنے کو گناہ اور بدکرداری کے زمرے میں شمار کیا جاتا رہا ہے۔ جیسے عیسیٰ نے کہا تھا، "میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ دولتمند کا آسمان کی بادشاہی میں داخل ہونا مشکل ہے اور پھر تم سے کہتا ہوں کہ اونٹ کا سوئی کے ناکے میں سے نکل جانا اس سے آسان ہے'۔ (میتھیو 19:24) اگر کیک کا حجم اور ناپ جامد اور بلا نمو ہے۔۔۔ اور میرے پاس اس کیک کا بڑا ٹکڑا ہو تو پھر اس کا یہی مطلب ہے کہ غالباً میں نے کسی اور کا حصہ ہتھیا رکھا ہے۔ اسی لیے، دولتمندوں کے لیے اپنے گناہوں اور بدکاریوں سے نجات حاصل کرنے کے لیے خیرات وغیرہ کرنا لازم قرار پایا تھا۔
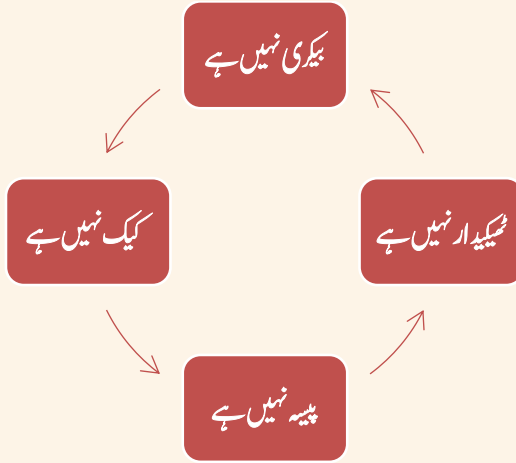
کاروباری مہم جوئی (انٹرپرائز) کا المیہ

یعنی، اگر عالمی سطح پر یہ کیک ایک ہی حجم کا رہے تو پھر کریڈٹ، یعنی ادھار اور بھروسے کی تو کوئی ضمانت ہی نہیں بچتی۔ کریڈٹ کی تو اصلیت ہی آج کے کیک اور کل کے کیک میں فرق پر کھڑی ہوتی ہے۔ اگر کیک کا حجم ایک ہی رہے گا تو پھر طویل مدت کے لیے ادھار دینے کا مقصد اور منطق ہی کیا ہے؟ بلکہ جب تک یہ یقین نہ ہو کہ فلاں باورچی یا بادشاہ کسی دوسری بیکری کے گاہک چرا کر یا بادشاہت کو لوٹ کر منافع کما لے گا۔۔۔ ادھار اور بھروسے میں تو سراسر گھاٹے کا ہی امکان منڈلاتا رہے گا۔ چنانچہ، یہی وہ وجہ تھی کہ جدید دور سے قبل کی دنیا میں یہ معاملہ تھوڑا مشکل رہا ہے۔ اگر کسی کو بھروسے پر ادھار دے بھی دیا جاتا تھا وہ عام طور پر اس کی مقدار انتہائی کم، قلیل مدتی اور شرح سود انتہائی بلند ہوتی تھی۔ اس طرح کی صورتحال میں نئے کاروباری افراد کے لیے بیکری وغیرہ یعنی دھندہ شروع کرنا اور بادشاہ جو محلات کی تعمیر یا جنگ لڑنا چاہتے۔۔۔ خاصی مشکل رہا کرتا تھا۔ اس مقصد کے لیے انھیں درکار سرمایہ جمع کرنے کے لیے قیمتوں میں گرانی اور بھاری ٹیکسوں کی وصولی میں سختی برتنا پڑتی تھی۔
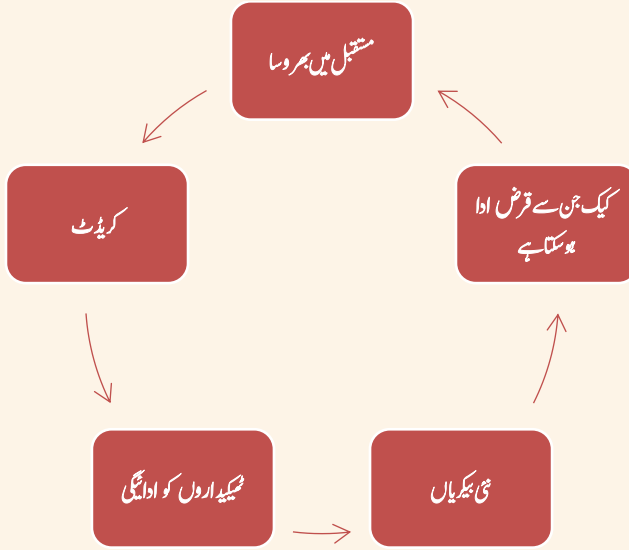
جدید معیشت کا جادوئی چکر

بادشاہوں کے لیے تو جب تک رعایا مطیع اور اطاعت گزار رہتی۔۔۔ بھاری ٹیکس اور جبری وصولیاں کوئی مسئلہ نہیں تھا لیکن ایک معمولی ملازمہ کے لیے امراء کے گھروں میں کھانے پکا، صفائی ستھرائی کا کام کر کے اپنی بیکری کھولنے اور دولت کمانے کا خواب، ہمیشہ خواب ہی رہ جاتا تھا۔

ویسے بھی، یہ ہر کسی کے لیے گھاٹے کا سودا تھا۔ اس کی وجہ بھروسے اور ادھار سے جڑی قیود تھی اور لوگوں کے لیے نئے کاروباروں پر سرمایہ لگانے میں اچھی خاصی دقت حائل تھی۔ اب چونکہ نئے کاروباروں کی تعداد بھی کم رہا کرتی تھی تو معیشت کھل کر نمو نہیں پاتی تھی۔۔۔ پیداوار کم ہی رہا کرتی تھی۔ اب چونکہ معیشت نمو نہیں پاتی تھی تو لوگ یہی سمجھتے رہتے تھے کہ اس میں کبھی بڑھوتری نہیں ہوگی۔ اب چونکہ نمو کی کوئی گنجائش نہیں تھی تو اسی لیے سرمایہ دار کبھی بھروسا نہیں کرتا تھا۔ یوں، توقع کے عین مطابق معیشت ہردم مندی کا شکار رہتی تھی۔

نمو و ترقی پاتا ہوا کیک

پھر یوں ہوا کہ سائنسی انقلاب آ گیا اور ہر طرف نمو اور ترقی کے تصور کا ڈنکا بجنے لگا۔ ترقی یا نمو کا یہ تصور اس گمان پر قائم تھا کہ اگر ہم اپنی لاعلمی اور جہالت کو تسلیم کر کے وسائل کو تحقیق میں صرف کریں تو حالات میں بہتری آسکتی ہے۔ یہ تصور جلد ہی معاشی پیرائے میں بھی

استعمال ہونے لگا۔ اب جو شخص ترقی اور نمو میں یقین رکھتا تھا، وہ یہ بھی یقین رکھتا تھا کہ جغرافیائی دریافتیں، ٹیکنالوجی میں ایجادات اور تنظیمی بالیدگی کے نتیجے میں مجموعی طور پر انسان کی پیداواری، کاروباری اور دولتمندی سے متعلق صلاحیتوں میں خاطر خواہ اضافہ کیا جاسکتا ہے۔ بحر اوقیانوس میں نئی تجارتی گزر گاہیں، بحر ہند کی پرانی تجارتی گزر گاہوں کو تباہ کیے بغیر بھی پنپ سکتی تھیں۔ سادہ سی مثال کے تحت، کوئی بھی شخص ایسی بیکری کھول سکتا تھا جس میں صرف چاکلیٹ کے کیک اور ہلالی روٹیاں پکا کر بیچی جاسکتی تھیں جس سے ڈبل روٹی بیچنے والی بیکریوں کو دیوالیہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ ہر شخص نت نئے ذائقوں سے آشنا ہو سکتا تھا اور زیادہ سے زیادہ کھا بے کھا سکتا تھا۔ میں، آپ کو غربت میں دھکیلے بغیر بھی امیر ہو سکتا تھا۔ میں آپ کو بھوک سے مارے بغیر بھی موٹا تازہ اور فربہ ہو سکتا تھا۔ یعنی، عالمی سطح پر یہ کیک اب بڑھ سکتا تھا، نمو پا کر پھل پھول سکتا تھا۔

پچھلے پانچ سو برسوں کے دوران ترقی اور نمو کے اس تصور نے لوگوں کو مستقبل میں بڑھ چڑھ کر بھروسا قائم کرنے پر قائل کر دیا ہے۔ اس بھروسے کے نتیجے میں کریڈٹ کی تخلیق ہوئی۔ کریڈٹ سے واقعی معنوں میں معاشی نمو اور بڑھوتری ممکن ہوگئی۔ نمو اور بڑھوتری سے مستقبل میں بھروسا پہلے سے بھی بڑھ کر مضبوط تر ہوتا گیا اور یوں مزید کریڈٹ کے لیے راہ صاف ہوتی گئی۔ لیکن یہ سب راتوں رات نہیں ہوا۔ اس سارے عرصے پر نظر دوڑائیں تو معیشت کی مثال ایک رولر کوسٹر کی طرح نظر آتی ہے۔ اگرچہ، یہ سطحی طور پر ایک غبارے کی مانند محسوس ہوتی ہے لیکن طویل مدت میں اس کی مثال رولر کوسٹر جیسی ہے۔ اس معاشی رولر کوسٹر کی راہ میں سے ایک دفعہ رکاوٹیں، دھکے اور ٹکریں ہوا ہو گئیں تو اس کے عمومی رخ میں کسی کو شک و شبہ نہیں رہا۔ آج دنیا میں کریڈٹ کی اتنی بہتات ہے کہ حکومتیں، تجارتی کارپوریشنیں اور نجی سرمایہ کار بھی نہایت آسانی کے ساتھ بڑی سے بڑی مقدار، طویل مدتی اور کم سے کم شرح سود پر اتنا قرضہ حاصل کر سکتے ہیں کہ جو ان کی حالیہ آمدن سے کہیں زیادہ، بہت ہی زیادہ ہوتا ہے۔

دنیا کی معاشی تاریخ کا مختصر جائزہ
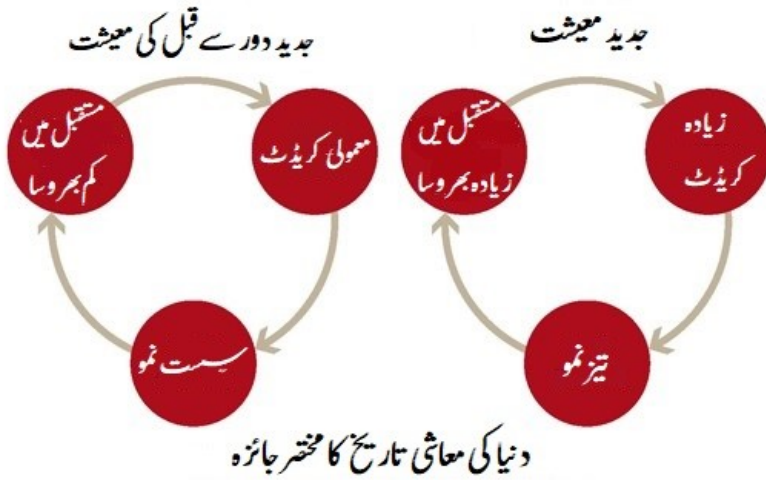
اس عالمی کیک میں نمو اور بڑھوتری کا تصور بالآخر انقلابی ثابت ہوا۔ 1776ء میں سکاٹ لینڈ سے تعلق رکھنے والے معاشیات دان ایڈم سمتھ نے 'اقوام کی دولت' نامی کتاب شائع کی جو غالباً تاریخ کا سب سے اہم معاشی دستور بھی ہے۔ اس کتاب کی پہلی جلد کے آٹھویں باب میں ایڈم سمتھ نے نہایت انوکھی دلیل پیش کی ہے۔ وہ یہ کہ جب ایک صاحب جائیداد، کوئی جولاہا یا کوئی موچی اپنے خاندان کی ضرورت سے زیادہ منافع کمالیتا ہے تو وہ اس زائد آمدن سے نئے معاون اور مددگار بھرتی کرتا ہے تاکہ وہ مزید منافع اور آمدن کما سکے۔ جتنا منافع زیادہ ہو گا، وہ اتنے ہی زیادہ معاون اور مددگار بھرتی کر سکے گا، جتنے مددگار زیادہ ہوں گے، پیداوار بھی اتنی ہی زیادہ ہو گی۔ جتنی زیادہ پیداوار ہو گی، اس کا منافع اور آمدن بھی اتنی ہی زیادہ بڑھتی جائے گی۔ اس دلیل کے مطابق ایک نجی کاروباری کی آمدن اور منافع میں اضافے کی بنیاد پر اجتماعی دولتمندی اور خوشحالی ممکن ہے۔

آج چونکہ ہماری بسر ایک ایسی سرمایہ دار دنیا میں ہے جہاں دولت کی ریل پیل ہے تو یہ دلیل، نہایت عام اور معمولی سمجھی جاتی ہے۔ آج کی دنیا میں ایڈم سمتھ کی یہ دلیل پہلے سے فرض شدہ، عام بات ہے۔ یعنی، ہمارا خیال ہے کہ کاروبار دنیا ایسے ہی تو چلتا ہے۔ ہم اس دلیل کی کئی کئی شکلوں بارے خبروں میں ہر روز سنتے ہی رہتے ہیں۔ اس کے باوجود ہمیں یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ ایڈم سمتھ کا اصل دعویٰ یہ ہے کہ خود غرضی پر مبنی انسانی تقاضوں اور طلب کے نتیجے میں حاصل ہونے والا نجی منافع اور آمدن۔۔۔ بالآخر اجتماعی دولت کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ یہ انسانی تاریخ کا سب سے انوکھا اور انقلابی تصور ہے۔ یہ معاشی نکتہ نظر کے حساب سے انقلابی تو ہے ہی لیکن اس کے سیاسی اور اخلاقی پہلو بھی نہایت عجیب و غریب اور پر آشوب ہیں۔ ایڈم سمتھ کے دعویٰ کا مطلب تو یہ بھی نکلتا ہے کہ دراصل لالچ، بری بلا نہیں ہے۔ میں لالچ پال کر امارت حاصل کر لوں تو صرف مجھے ہی نہیں بلکہ اس کا فائدہ سب تک پہنچتا ہے۔ اس دلیل کے تحت خود غرضی اور انا پرستی۔۔۔ اخوانیت اور ایثاریت بن جاتی ہے۔

ایڈم سمتھ نے لوگوں کو سکھایا کہ وہ معیشت کو گھاٹے کا نہیں بلکہ نفع کی شکل میں دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کریں۔ اس کو ایک ایسی شکل میں دیکھیں جہاں میرا نفع، تمھارا نفع بھی تو ہے۔ ہم دونوں مل کر بیک وقت معیشت کے اس کیک کا نہ صرف بڑا ٹکڑا اٹھا سکتے ہیں بلکہ تمھارے ٹکڑے کے حجم میں اضافہ، میرے کیک کے ٹکڑے کے حجم پر منحصر ہے۔ اگر میں غریب ہوں تو تم بھی غریب ہی رہو گے کیونکہ میں تمھاری مصنوعات اور خدمات خریدنے کے قابل ہی نہیں ہوں۔ اگر میں امیر ہوں تو تم بھی امیر ہو سکتے ہو کیونکہ اب تم مجھ پر کچھ نہ کچھ بیچ سکتے ہو۔ اسی طرح ایڈم سمتھ نے دولت اور اخلاقیات کے بیچ روایتی تضاد کو بھی رد کر دیا ہے اور یوں امارت کے لیے نئے جہان کے دروازے کھول دیے ہیں۔ اب امارت کا مطلب، خلق اور نیک چلنی ہے۔ ایڈم سمتھ کی تصوراتی کہانی میں لوگ اپنے پڑوسیوں کو لوٹ کر امارت حاصل نہیں کرتے بلکہ وہ معیشت کے کیک کا حجم بڑھا کر امیر ہوتے ہیں۔ جب اس کیک کا حجم بڑھتا ہے تو سبھی کا فائدہ ہوتا

ہے۔ اس لحاظ سے امیر کبیر معاشرے کے سب سے کار آمد اور خیر اندیش لوگ ہوتے ہیں کیونکہ وہ ہر کسی کے فائدے کے لیے نمو اور بڑھوتری کا پہیہ چلاتے ہیں۔

تاہم، یہ سب اسی وقت ممکن ہے جب معاشرے کے امیر کبیر اپنے منافعے اور آمدن کو غیر پیداواری کاموں میں ضائع کرنے کی بجائے نئی صنعتوں میں سرمایہ کاری کر کے نت نئی نوکریاں پیدا کیا کریں۔ اسی لیے ایڈم سمتھ کا مشہور قول، گویا منتریہ ہے کہ، 'جب منافع اور آمدن بڑھتی ہے تو صاحب جائیداد، جولاہا یا موچی نئے مددگار بھرتی کرتے ہیں'۔ ایڈم سمتھ کا منتریہ نہیں ہے کہ، 'جب منافع اور آمدن بڑھتی ہے تو کنجوس اور بخیل اپنی ساری دولت تجوری میں بھر لیتے ہیں اور صرف اسی وقت نکالتے ہیں جب اسے گننا مقصود ہو!'۔ یوں، جدید سرمایہ داری معیشت میں ایک نئی اخلاقی قدر نے جنم لیا جو جلد ہی اس نظام کا کلیدی جز بھی بن گئی۔ یعنی یہ کہ زائد آمدن اور منافع، جمع کرنے کی نہیں بلکہ یہ سرمائے کی صورت پیداواری کاموں میں دوبارہ خرچ کرنے کی شے ہے۔ اس سے مزید منافع اور آمدن حاصل ہوتی ہے، جو مزید سرمائے کی صورت خرچ ہوتا ہے، اس سے مزید آمدن حاصل ہوتی ہے اور یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ یہ سلسلہ روک دیا جائے تو یہ سخت کجی کی بات ہے۔ سرمایہ کاری کے بھی کئی طریقے ہوتے ہیں۔۔۔ کسی صنعت کو توسیع، سائنسی تحقیق، نت نئی مصنوعات وغیرہ۔ تاہم، سرمایہ کاری کے نتیجے میں پیداوار میں اضافہ اور زیادہ سے زیادہ منافع اور آمدن حاصل ہونا ضروری ہے۔

اس نئے سرمایہ دار دھرم، سب سے پہلا اور مقدس حکم یہ ہے کہ، 'پیداوار سے حاصل ہونے والی آمدن کو مزید پیداوار حاصل کرنے کے لیے سرمایے کی صورت خرچ کرنا ضروری ہے' یا سادہ الفاظ میں کہا جاتا ہے، 'پیسہ کمانے کے لیے پیسہ خرچ کرنا ضروری ہوتا ہے'۔ اسی لیے تو سرمایہ داری کو سرمایہ داری کہا جاتا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام میں 'سرمایہ' اور 'دولت' دو مختلف چیزیں ہوتی ہیں۔ 'سرمایہ' سے مراد وہ پیسہ، تجارتی مال اور وسائل ہیں جو پیداوار بڑھانے کے لیے خرچ کیا جا سکتا ہے۔۔۔ یعنی اس سے سرمایہ کاری ممکن ہوتی ہے۔ دوسری جانب 'دولت' کو جمع کر کے، تجوریوں میں بھر یعنی چھپا کر رکھا جاتا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام میں دولت سے مراد ہر طرح کی غیر پیداواری سرگرمیاں بھی ہوتا ہے۔ اگر کوئی فرعون اپنی سلطنت کے وسائل کو 'غیر پیداواری' اہرام کی تعمیر میں بہا دیتا ہے تو وہ سرمایہ دار نہیں ہے۔ ایک بحری قزاق بھی سرمایہ کار نہیں ہے کیونکہ وہ ہسپانوی بحری بیڑے کو لوٹ کر خزانہ جمع کرتا ہے اور اس سونے چاندی کو غرب الہند کے کسی جزیرے میں زمین کھود کر دفن کر دیتا ہے۔ تاہم، ایک ایسا محنت کش جو کسی فیکٹری میں مشقت اور مزدوری کر کے پیسہ کما کر، جب اس پیسے سے سٹاک مارکیٹ میں حصص خرید تا ہے تو وہ شخص۔۔۔ یقیناً ایک سرمایہ کار ہے۔

ویسے، یہ نہایت ہی عام فہم اور معمولی سا تصور ہے کہ 'پیداوار سے حاصل ہونے والی آمدن کو مزید پیداوار حاصل کرنے کے لیے سرمایے کی صورت خرچ کرنا ضروری ہے'۔ لیکن اس کے باوجود تاریخ بھر میں زیادہ تر لوگوں کے لیے یہ تصور ہمیشہ ہی اجنبی اور بیگانہ۔۔۔ بے میل رہا ہے۔ جدید دور سے قبل لوگوں کا خیال یہ تھا کہ پیداوار، کم و بیش ساکن رہتی ہے۔ آپ کچھ بھی کر لیں، اگر

پیداوار منجمد ہی رہتی ہے تو پھر اپنی دولت کو پیداوار بڑھانے کے لیے کیوں خرچ کیا جائے؟ اسی لیے قرون وسطیٰ کے دور میں عالی نسب سخاوت اور فیاضی جبکہ امراء اور اشرافیہ ناموری اور نمود سے اصراف اور خرچ پر زور دیتے تھے۔ وہ اپنی آمدن اور محصولات کو کھل کر کھیل کود، ضیافتوں، محلات، جنگوں، خیرات، یادگاروں اور گرجاؤں وغیرہ پر خرچ کرتے تھے۔ ان میں سے صرف کچھ ہی ایسے تھے جو اپنی آمدن کو کاروبار دنیا کی وسعت، نت نئی تحقیق مثلاً بہتر اقسام کی فصلوں یا پھر نئی منڈیوں کی تلاش پر خرچ کرتے تھے۔
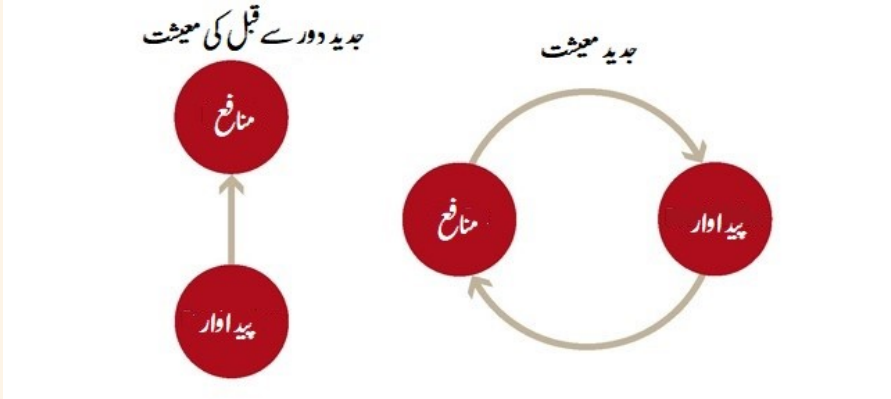
جدید دور میں طبقاتی شرافت اور عالی نسبت سے مراد ایسی اشرافیہ لی جاتی ہے جو صحیح معنوں میں اس سرمایہ دارانہ دھرم کے پیرو کار ہوتے ہیں۔ یہ نئی سرمایہ دار اشرافیہ شہزادے، نواب اور رانیاں نہیں بلکہ بورڈ کے چیئرمین، حصص کے تاجر اور صنعت کار ہیں۔ یہ صاحب ثروت اور مقتدر لوگ قرون وسطیٰ کے کسی بھی عالی نسب شخص سے کہیں بڑھ کر امیر کبیر ہوتے ہیں لیکن یہ اس دور کے کسی بھی رئیس کے مقابلے میں کہیں کم درجے فضول خرچ ہوتے ہیں۔ آج کی یہ اشرافیہ دولت لٹانے اور اصراف پر یقین نہیں رکھتی۔ وہ اپنی آمدن اور منافع کا بہت ہی معمولی حصہ ان تعیشات اور غیر پیداواری سرگرمیوں پر خرچ کرتے ہیں لیکن چونکہ یہ بے حد دولت مند ہیں تو ان کا اصراف پھر بھی بڑھ کر محسوس ہوتا ہے۔

قرون وسطیٰ کے دور میں عالی نسب اشرافیہ رنگ برنگے، سونے کی تاروں سے سیے گئے ریشمی لباس پہنتے تھے۔ ان کا زیادہ تر وقت ضیافتوں، رنگ رلیوں، عیش و عشرت اور کھیل کود میں بسر ہوتا تھا۔ لیکن اس کے مقابلے میں جدید دور کے سبھی نامور لوگ بے کیف لباس یعنی سوٹ بوٹ پہن کر جمع ہوتے ہیں تو لگتا ہے کہ جیسے کوؤں کا جھنڈ اکٹھا ہو گیا ہے۔ علاوہ ازیں، ان جدید لوگوں کے پاس میلے ٹھیلے اور رنگ رلیوں کے لیے وقت بھی نہیں ہوتا۔ ایک مثالی سرمایہ کار کے روز و شب ایک میٹنگ سے نکل کر دوسری میٹنگ، سرمایہ کاری کے نت نئے مواقع تلاش کرنے اور سٹاک مارکیٹ پر نظر رکھتے گزرتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ یہ تمثیلی سرمایہ دار مہنگے سوٹوں، گھڑیوں اور بوٹوں پر بے تحاشہ پیسہ خرچ کرتا ہو جبکہ اس کے پاس ذاتی ہوائی جہاز اور کئی کئی مہنگی گاڑیاں بھی ہوتی ہوں گی لیکن یہ خرچے۔۔۔اس سرمایہ کاری کا عشر عشیر بھی نہیں ہوتے جو وہ پیداوار بڑھانے کے لیے خرچ کرتا ہے۔

ویسے، یہ جو سرمایہ کاری ہے۔۔۔ وہ صرف ان لوگوں کا شیوہ نہیں ہے جو مہنگے سوٹ بوٹ پہن کر پیداوری صلاحیت بڑھاتے رہتے ہیں۔ جدید دور کی عام عوام اور حکومتی ادارے بھی انہی خطوط پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔ آپ خود ہی بتائیے، ہر روز دن اور رات۔۔۔ کھانے کی میز پر آپ کو یار دوستوں میں اکثر یہ بحث سننے کو مل ہی جاتی ہے کہ بھئی، بچت کو کہاں خرچ کیا جائے؟ کوئی کاروبار تو بتاؤ۔۔۔ میں بانڈ خریدوں یا حصص؟ رئیل اسٹیٹ کے بارے کیا خیال ہے۔۔۔ اس میں تو کبھی گھاٹا نہیں ہوتا؟ وغیرہ وغیرہ۔ اسی طرح دنیا بھر کی حکومتیں ٹیکس سے حاصل ہونے والی آمدن کو پیداواری انٹرپرائز یعنی نئے کاروبار میں خرچ کر دیتی ہیں تا کہ مستقبل میں ریاست کے لیے آمدن کے نئے در کھل سکیں۔ مثال کے طور پر ایک نئی بندرگاہ کی تعمیر سے فیکٹریوں کے لیے اپنی مصنوعات کو برآمد کرنے میں آسانی پیدا ہو سکتی ہے۔ فیکٹریاں جتنی زیادہ برآمدات کرنے کے قابل ہوں گی، وہ اتنا ہی زیادہ منافع کمائیں گی۔ زیادہ منافع کا مطلب ہے کہ زیادہ ٹیکس ادا کریں گی اور یوں حکومت کی آمدن بڑھے گی۔ بعض حکومتیں، تعلیم پر دل کھول کر خرچ کرتی ہیں تا کہ ملک میں زیادہ سے زیادہ پڑھے لکھے لوگ ہوں۔ لوگ پڑھ لکھ لیں گے تو وہ بہتر سے بہتر صنعتوں کا حصہ بن سکیں گے۔ بہتر اور ہائی ٹیک صنعتوں سے آمدن بھی زیادہ ہوتی ہے اور ان کے ٹیکس بھی زیادہ ہوتے ہیں۔ ایک بندرگاہ یا سڑک کے مقابلے میں پڑھے لکھے لوگوں کی ہائی ٹیک صنعتوں میں ٹیکس کی صورت زیادہ آمدن حاصل ہونے کا امکان زیادہ ہوتا ہے۔ تاہم، حکومتوں کی یہ سرمایہ کاری طویل اور قلیل مدت پالیسیوں کی صورت پر منحصر ہوتی ہے۔

سرمایہ داری کی ابتداء اس نظریے کی صورت ہوئی تھی جو کسی بھی معیشت کی کارگزاری کا پتہ دیتی تھی۔ یہ بیک وقت روایتی اور بیانی ہوتی ہے۔ مراد یہ ہے کہ ایک طرف زر اور پیسے کے استعمال اور مصرف سے متعلق کار اور بار کی روایت بھی چل پڑتی ہے اور دوسری جانب یہ بیانیہ بھی عام ہو جاتا ہے کہ آمدن اور منافع کو دوبارہ سرمایہ کی شکل دے دینے سے معاشی ترقی اور نمو بھی حاصل ہوتی ہے۔ لیکن، حقیقت یہ ہے کہ وقت کے ساتھ سرمایہ داری بتدریج ایک معاشی سے سوچ سے کہیں بڑھ کر سامنے آئی ہے۔ اب یہ اخلاقیات کا بھی احاطہ کرتی ہے۔ یہ تعلیمات کا ایسا مجموعہ بن چکی ہے جو لوگوں کے طرزِ عمل، بچوں کی تعلیم و تربیت۔۔۔ حتیٰ کہ انسانی سوچ کا بھی تعین کرتی ہے۔ اس کا اہم ترین اور مقدم کلیہ یہ ہے کہ دراصل معاشی ترقی اور نمو ہی سب کچھ ہے بلکہ سب سے برتر ہے یا کہیے کہ برتری کا مظہر ہے کیونکہ کسی بھی معاشرے میں انصاف، آزادی اور یہاں تک کہ خوشی اور آسودگی کا معاشی حالت کے ساتھ براہ راست تعلق ہے۔ آپ کسی سرمایہ دار کے ساتھ زمبابوے اور افغانستان جیسے ملکوں میں انصاف، سیاسی اور شخصی آزادی وغیرہ کے بول بالے پر بحث کر کے تو دیکھیں۔۔۔ آپ کو فوراً ہی ایک لیکچر سننے کو ملے گا کہ کیسے معاشی آسودگی کے نتیجے میں ایک خوشحال اور فروغ پاتی ہوئی مڈل کلاس جنم لیتی ہے اور کیسے ایک آسودہ مڈل کلاس مستحکم جمہوری اداروں کے لیے ضروری ہے۔ آپ کو فوراً ہی مشورہ ملے گا کہ اس مقصد کے لیے افغان قبائلیوں کو آزاد تجارت، کاروبار، کفایت شعاری اور خود انحصاری سکھانے کی کتنی اشد ضرورت ہے۔

اس نئے دھرم کا جدید سائنس کی ترقی پر بھی فیصلہ کن اثر رسوخ رہا ہے۔ عام طور پر حکومتیں یا نجی کاروباری ادارے سائنسی تحقیق پر کھل کر خرچ کرتے ہیں۔ جب کوئی سرمایہ دار حکومت یا نجی کاروباری ادارہ کسی مخصوص سائنسی تحقیق کے پراجیکٹ پر سرمایہ کاری کا فیصلہ کرتا ہے تو عام طور پر سب سے پہلا سوال یہی اٹھتا ہے کہ، ' کیا اس تحقیق کی مدد سے پیداوار اور آمدن میں اضافہ ممکن ہے؟' یا' کیا اس تحقیق کی مدد سے معاشی ترقی اور نمو ہو پائے گی؟' اگر کوئی سائنسی تحقیق کا منصوبہ ان سوالات کے جواب نہ تراش سکے، اس کے لیے عموماً فنڈ حاصل کرنا تقریباً ناممکن ہوتا ہے۔ جدید سائنس، اپنی تاریخ میں سے کسی صورت سرمایہ داری کو خارج نہیں کر سکتی۔

اسی طرح، اگر سائنس کو سرمایہ داری کی تاریخ سے منہا کر دیا جائے تو یہ بلکل بے معنی ہو جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام کا جو معاشی نمو اور ترقی کا جو تصور ہے۔۔۔ اس کا انسانوں کا کائنات کی ہر شے سے متعلق علم کے ساتھ براہ راست تعلق ہے۔ مثال کے طور پر، بھیڑیوں کے جتھوں پر مشتمل سماج سے زیادہ احمق کوئی نہیں ہو گا جو یہ سوچ پال کر بیٹھے ہوں کہ ان کا شکار۔۔۔ یعنی بھیڑوں اور بکریوں کے ریوڑ کسی لامتناہی سلسلے کی صورت ہمیشہ بڑھتے ہی رہیں گے۔ تاہم، بھیڑیوں کے برعکس انسانوں کے یہاں جدید دور میں اسی سوچ نے خوب پرورش پائی ہے اور یہی نہیں بلکہ جدید انسانی شکار۔۔۔ یعنی انسانی معیشت خوب بڑھ چڑھ کر بڑھتی بھی رہی ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ سائنسدان ہر کچھ عرصے بعد کسی نت نئی دریافت یا مصنوعہ کے ساتھ سامنے آتے رہے ہیں۔ مثلاً امریکہ کا براعظم دریافت ہوا، احتراقی انجن، بجلی، ٹیلی فون، مال مویشی کی نت نئی اقسام اور پتہ نہیں کیا کیا۔۔۔ جدید دور میں کتنی دریافتیں اور ایجادات ہوئی ہیں؟ ایجادات کا کوئی شمار اور دریافتوں کی کوئی حد نہیں ہے۔ یعنی، ایسا لگتا ہے کہ جیسے یہ ایک لامتناہی سلسلہ ہو۔۔۔ یہی احساس معیشت کی نمو کی شکل میں ڈھل گیا۔ بینک اور حکومتیں پیسہ ضرور چھاپتی ہیں لیکن اس پیسے کو حرکت میں لانے والے بلاشبہ سائنسدان ہیں۔

پچھلے کچھ عرصے سے بینک اور حکومتیں دیوانگی کی حد تک اندھا دھند پیسہ چھاپتی چلی جا رہی ہیں۔ اس جنون کو دیکھ کر ہر شخص اس خوف میں مبتلا ہے کہ اس کے نتیجے میں جنم لینے والا معاشی بحران بالآخر معاشی نمو اور ترقی کو روک لگا دے گا۔ معیشت منجمد ہو جائے گی۔ دنیا بھر کی حکومتیں اور بینک دھڑا دھڑ کھربوں کی مالیت میں ڈالر، یورو، ین، پاؤنڈ، روپیہ وغیرہ بغیر کسی بنیاد کے صرف اس امید پر چھاپ کر اور کریڈٹ کی صورت نظام میں بھرتی جا رہی ہیں کہ سائنسدان، ٹیکنیشن اور انجنیئر بالآخر کوئی نہ کوئی، بہت ہی بڑی دریافت یا ایجاد اس بلبلے کے پھٹنے سے پہلے نکال لائیں گے۔ اس دنیا کی ہر شے کا دارومدار اب لیبارٹریوں پر ہے۔ بائیوٹیکنالوجی اور نینو ٹیکنالوجی جیسے جدید سائنسی شعبوں میں نئی دریافتوں کے نتیجے میں نت نئی صنعتیں پیدا ہو سکتی ہیں۔ یہ امید کی جاتی ہے کہ ان نئی صنعتوں سے اتنا منافع حاصل ہو سکتا ہے کہ جو ان کھربوں ڈالروں کی توجیہ بن جائے گا جو 2008ء سے دنیا بھر کی حکومتیں اور بینک چھاپتے ہی چلے آ رہے ہیں۔ اگر سائنسی لیبارٹریاں جلد ہی ان توقعات پر پورا نہیں اترتیں تو لکھ رکھیے، ہم ایک انتہائی مشکل دور کی طرف بڑھ رہے ہیں۔

کولمبس کو ایک سرمایہ کار کی تلاش ہے

سرمایہ داری نے نہ صرف جدید سائنس کی اٹھان میں فیصلہ کن کردار ادا کیا ہے بلکہ اس کی بدولت یورپی سامراجیت نے بھی خوب کھل کر کھیلا ہے۔ لیکن اس سرمایہ دارانہ، کریڈٹ سسٹم کا اصل خالق بھی یورپی سامراج ہی ہے۔ یہ درست ہے کہ کریڈٹ جدید یورپ کی ایجاد نہیں ہے بلکہ یہ تو ہر زرعی معاشرے میں ہمیشہ سے چلا آرہا تھا۔ یورپ کا اپنا حال تو یہ تھا کہ جدید دور کے اوائل میں یورپی سرمایہ دارانہ نظام کا ابتدائی دارومدار بھی ایشیاء کی معاشی ترقی اور حالات و واقعات کے ساتھ جڑا ہوا تھا۔ یہ یاد رکھنا انتہائی ضروری ہے کہ اٹھارہویں صدی کے اواخر تک ایشیاء اس دنیا کا صحیح معنوں میں معاشی گڑھ رہا ہے۔۔۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ یورپیوں کے ہاتھ میں چینیوں، مسلمانوں اور ہندوستانیوں کے مقابلے میں کہیں کم سرمایہ ہوا کرتا تھا۔

تاہم، یہ بھی یاد رہے کہ چین، ہندوستان اور اسلامی دنیا کے سماجی اور سیاسی نظام میں کریڈٹ کا کردار ثانوی تھا۔ استنبول، اصفہان، دہلی اور بیجنگ کی تجارتی منڈیوں میں تاجر اور بینکار سرمایہ دارانہ خطوط پر سوچتے ضرور تھے لیکن محلات میں بیٹھے بادشاہ، سلاطین اور قلعہ بند افواج کے دلیر جرنیل ان تاجروں اور بینکاروں۔۔۔ اور ان کی بے انتہا بیوپارانہ سوچ کو انتہائی بری نظر سے دیکھتے تھے۔ جدید دور کے اوائل دنوں میں تقریباً سبھی غیر یورپی سلطنتوں کی بنیاد عظیم فاتحین جیسے نورہاچی اور نادر شاہ وغیرہ یا چنگ اور عثمانیوں کی بیورکریٹ اور عسکری اشرافیہ وغیرہ نے رکھی تھی۔ وہ سلطنت کے معاملات، بالخصوص جنگوں پر اٹھنے والا خرچ بھاری ٹیکسوں اور لوٹ مار (ان دونوں میں فرق بھی نہیں تھا) وغیرہ سے پورا کرتے تھے اور کبھی بھی کریڈٹ سسٹم پر انحصار نہیں کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ، انھیں اپنی سلطنتوں میں تجارت وغیرہ سے بھی کوئی مطلب نہیں تھا اور انھوں نے کبھی بھی بینکاروں اور سرمایہ کاروں کے مفادات کا تحفظ تو چھوڑ۔۔۔ ان کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔

دوسری جانب یورپ میں عظیم بادشاہ اور جرنیل بتدریج تاجرانہ سوچ کی طرف مائل ہو گئے اور یوں دیکھتے ہی دیکھتے پوری حکمران اشرافیہ تاجروں اور بینکاروں پر مشتمل ہو گئی یا کہو۔۔۔ ڈھل گئی۔ دنیا پر یورپ کے غلبے کا قصہ کچھ یوں ہے کہ اس پر اٹھنے والا سارا خرچ، بھاری ٹیکسوں اور لوٹ مار نہیں بلکہ کریڈٹ سسٹم کی دین تھا۔ یہ سرمایہ داروں کا بھروسا۔۔۔ یعنی کریڈٹ ہی تھا۔ یہ اصل میں سرمایہ کاری کے نتیجے میں زیادہ سے زیادہ نفع حاصل کرنے کی دھن بلکہ ہوس تھی۔ فراک، کوٹ اور ٹوپ پہنے بینکاروں اور تاجروں نے وہ سلطنتیں کھڑی کیں جنھوں نے جاہ و جلال، رنگ برنگے ریشمی پیراہن اور تاباں زرہ بندیں زیب تن کرنے والے بادشاہوں اور عالی نسبوں کی سلطنتوں کو دھول چٹوا دی۔ ان زر طلب، تجارتی اور بیوپار پر یقین رکھنے والی سلطنتوں کمال صرف یہ تھا کہ وہ اپنی جنگیں اور فتوحات پر

اٹھنے والے خرچ کا انتظام کرنے میں شاطر تھے۔ آپ خود ہی بتائیے، کون ہے جو ٹیکس ادا کرنا چاہتا ہے؟ آپ خود سے پوچھیے، کون ہے جو سرمایہ کاری نہیں کرنا چاہتا؟

1484ء میں کرسٹوفر کولمبس نے پرتگال کے شاہی دربار میں رسائی حاصل کی اور ایک مجوزہ منصوبہ پیش کیا۔ اس مد‌ں صوبے کے تحت، پرتگالی بادشاہ کو ایک بحری مہم میں سرمایہ کاری کی دعوت دی جس کا مقصد مغرب کی جانب سے مشرقی ایشیاء کے لیے نئی تجارتی راہداری تلاش کرنا تھا۔ اب اس طرح کی مہم پر کافی زیادہ خرچ اٹھتا تھا اور گھاٹے کا امکان بھی بہت زیادہ تھا۔ بحری جہازوں کا بیڑہ تیار کرنے، رسدات کی خریداری، ملاحوں اور سپاہیوں کی بھرتیاں وغیرہ ملا کر اچھا خاصہ خرچ اٹھ جاتا اور اس سرمایہ کاری کے نتیجے میں کسی نفع کی کوئی ضمانت بھی نہیں تھی۔ چنانچہ، پرتگال کے بادشاہ نے کولمبس کا یہ منصوبہ اور تجویز رد کردی۔

جس طرح آج بھی نت نئے کاروبار شروع کرنے والے کار جو ہمت نہیں ہارتے، کولمبس بھی مایوس نہیں ہوا۔ اس نے اپنا یہ مجوزہ منصوبہ اٹلی، فرانس، انگلستان اور پھر دوبارہ پرتگال میں ہر اس سرمایہ کار کے سامنے پیش کیا جہاں اسے امکان نظر آیا لیکن یہ ساری محنت ضائع ہی گئی کیونکہ کوئی اس منصوبے پر سرمایہ خرچ کرنے پر تیار نہیں تھا۔ پھر وہ حال ہی میں متحد ہونے والے سپین کے شاہی جوڑے فرڈیننڈ اور ازابیلا کے دربار میں پہنچا۔ کولمبس نے چند انتہائی موثر ترغیب کاروں کو ہمراہ رکھا اور ملکہ ازابیلا کو اس بحری مہم پر سرمایہ لگانے پر قائل کر ہی لیا۔ اب ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس مہم کے نتیجے میں گویا ملکہ ازابیلا کی لاٹری نکل آئی تھی۔ کولمبس کی دریافت کا نتیجہ تھا کہ ہسپانویوں نے امریکہ فتح کیا اور وہاں سونے اور چاندی کی کانوں کے ساتھ ساتھ گنے اور تمباکو کی شجر کاریوں کا آغاز کیا۔ ان کانوں اور شجر کاریوں سے اتنی دولت حاصل ہوئی کہ ہسپانوی بادشاہوں، بینکاروں اور تاجر بیوپاریوں کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھی۔

سو برس بعد صورتحال یہ تھی کہ شہزادے، شہزادیاں، ہر طرح کے بینکار اور تاجر کولمبس کے قدم پر چلنے والے ہر شخص کو منہ مانگا 'کریڈٹ' دینے پر تیار تھے۔ امریکہ میں ہسپانوی شجر کاریوں اور کانوں سے حاصل ہونے والی آمدن کے سبب سرمایے کی بھی فراوانی تھی۔ اس سے بھی زیادہ اہم یہ تھا کہ اب شہزادوں اور بینکاروں کا بحری مہم جوئیوں پر بھروسا اور اعتماد قائم ہو چکا تھا اور وہ ہنسی خوشی اپنی دولت سے الگ ہونے کو تیار تھے۔

یہ سامراجی سرمایہ داری کا فسوں گر لیکن خطرے سے پر، مہم جو چکر تھا: کریڈٹ سے نئی دریافتوں پر سرمایہ لگتا تھا؛ دریافتوں سے نو آبادیاتی توسیع ہوتی تھی؛ نو آبادیات سے نفع ملتا تھا؛ نفع سے اعتماد اور بھروسا بڑھتا تھا؛ بھروسے سے کریڈٹ مزید بڑھتا تھا۔ نور حاجی اور نادر شاہ کی تو بس چند ہزار کلومیٹر کے اندر رخ فتح کے بعد ہی ہمت جواب دے گئی لیکن سرمایہ دار مہم جو پے در پے فتوحات کی مدد سے اپنی مالیاتی قوت اور حرکت میں اضافہ ہی کرتے چلے گئے جبکہ سامراجیت پھیلتی ہی چلی گئی۔

لیکن، یہ مہمات وغیرہ بہر حال قسمت کے کھیل کی طرح تھیں۔ اسی لیے کریڈٹ کی منڈیاں بہر طور محتاط رہیں۔ بہت سی مہمات خالی ہاتھ یورپ لوٹ جاتی تھیں اور انھیں کوئی بھی قابلِ ذکر کامیابی حاصل نہیں ہوتی تھی۔ انگریزوں نے قطب شمالی کی جانب سے ایشیاء کے لیے شمال مغربی بحری راستہ تلاش کرنے کی سر توڑ کوشش کی لیکن بیش بہا وسائل اور سرمایہ خرچ کرنے کے باوجود بھی کوئی کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ کئی بحری مہمات تو ایسی تھیں کہ مہم جو سرے سے لوٹ کر ہی نہیں پہنچ پائے۔ بحری جہاز برفانی تودوں سے ٹکرا جاتے، سمندری طوفانوں میں گھر جاتے اور زیادہ تر بحری قزاقوں کے ہاتھ چڑھ جاتے تھے۔ اسی لیے، زیادہ سے زیادہ سرمایہ کاروں کی توجہ حاصل کرنے اور گھاٹے کے امکان کو کم کرنے کی غرض سے یورپی محدود ذمہ داری کی حامل مشترکہ سرمای حصص کمپنیوں کی طرف متوجہ ہوئے۔ اب یہ ہوتا تھا کہ کوئی ایک سرمایہ دار، بجائے یہ کہ خطروں سے پر بحری مہمات پر اپنی ساری جمع پونجی لگایا کرتا۔۔۔ یہ مشترکہ حصص کی لمیٹڈ کمپنیاں بہت سے سرمایہ کاروں سے پیسہ جمع کر لیتی تھیں اور یوں ہر سرمایہ کار اپنی دولت اور سرمایے کا صرف کچھ حصہ جوکھم میں ڈال دیتا تھا۔ یوں گھاٹے کا امکان تو کم ہو ہی جاتا تھا لیکن اس کے ساتھ منافع اور آمدن پر بھی کوئی حد مقرر نہیں کی جاتی تھی۔ یوں، صرف ایک بحری مہم کی کامیابی سے حاصل ہونے والا منافع، حصص کمپنی کے ہر سرمایہ کار کو لکھ پتی بنا دیتا تھا۔

اس کے بعد سالہا سال کی مشق ہو چکی تو صرف چند دہائیوں میں مغربی یورپ کے طول و عرض میں ایسا نفیس مالیاتی نظام قائم ہو گیا جو فوری طور پر، انتہائی مختصر عرصے کے اندر رہی بے انتہا کریڈٹ جمع کر کے نجی کاروباریوں، اداروں اور حکومتوں کو فراہم کرنے کا اہل تھا۔ یہ نظام دنیا کے کسی بھی نظام سے بڑھ چڑھ کر اور نہایت موثر انداز میں مہمات، تحقیق اور فتوحات میں کھل کر سرمایہ کاری کر سکتا تھا۔ سپین اور ہالینڈ کے بیچ تعلقات میں تلخی کی وجہ بھی کریڈٹ کی یہی نو دریافت طاقت تھی۔ سولہویں صدی میں سپین یورپ کی سب سے طاقتور ریاست تھی اور عالمی سطح پر ایک وسیع سلطنت پر غالب تھی۔ اس کا مضبوط تسلط پورے یورپ، شمالی اور جنوبی امریکہ کے بڑے حصے، فلپائنی جزائر، افریقی اور ایشیائی ساحلی پٹیوں پر قائم تھا۔ ہر برس، امریکی اور ایشیائی خزانوں سے لدے ہوئے کئی بحری بیڑے سپین میں اشبیلیہ/سویل اور قادس کی بندرگاہوں پر لنگر انداز ہوتے تھے۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب ہالینڈ کی حیثیت ایک معمولی دلدلی دھسن سے زیادہ نہیں تھی جہاں ہر وقت تیز ہوائیں چلتی تھیں۔ یہاں کسی قسم کے قدرتی وسائل نہیں پائے جاتے تھے اور یہ سپین کے شہنشاہ کی فرمانروائی کے دور دراز کونے میں الگ تھلگ ایک ادنیٰ جاگیر تھی۔

ہالینڈ کے باسی پروٹیسٹنٹ تھے جبکہ سپین میں کیتھولک فرقے کی بادشاہی تھی۔ 1568ء میں ہالینڈ نے اپنے سپینی آقاؤں کے خلاف بغاوت کر دی۔ پہلے پہل تو ان ہالینڈیوں کی تحریک کو دیکھ کر یہی لگ رہا تھا کہ شاید یہ ارفع اور بلند ہیں لیکن ناقابل عمل نظریات کے پیچھے دوڑ رہے ہیں۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ہوا کے مخالف جدوجہد میں مصروف ہیں اور انھیں کبھی کامیابی نہیں ملے گی۔ لیکن اسی برس کے اندر

ہی صورتحال یہ ہو گئی کہ ہالینڈ نے نہ صرف سپین سے آزادی حاصل کر لی بلکہ ہسپانویوں اور ان کے اتحادی پرتگالیوں کو پیچھے دھکیل کر سمندروں میں تجارتی راہداریوں پر اپنا پورا تسلط قائم کر لیا۔ ہالینڈ کی عظیم عالمی سلطنت کی داغ بیل ڈالی اور یورپ کی سب سے دولتمند ریاست بھی بن گئے۔

ہالینڈ کی اس عظیم کامیابی کی اصل وجہ کریڈٹ ہی تھا۔ ہالینڈ کے باشندوں کو خشکی پر سپین کے خلاف جنگ وجدل میں کوئی دلچسپی نہیں تھی چنانچہ انھوں نے اس مقصد کے لیے بھاڑے پر فوج بھرتی کر کے شاہ سپین کے سامنے لاکھڑی کی جبکہ خود کہیں برتر اور بڑے بحری بیڑوں پر سوار، سمندری محاذ سنبھالنے کا فیصلہ کیا۔ اب یہ بھاڑے کی افواج اور دیوہیکل فوجی بحری بیڑوں پر اچھا خاصا خرچ اٹھتا تھا لیکن ہالینڈ کے لیے ان فوجی مہمات کو ممکن بنانا کبھی بھی مسئلہ نہیں رہا۔ وہ یوں کہ انھوں نے کریڈٹ کی طاقت پر کھڑے یورپ کے انتہائی مضبوط مالیاتی نظام کا خوب فائدہ اٹھایا اور یورپ کے طول وعرض میں اعتماد اور بھروسا قائم کر لیا۔ یہ وہ وقت تھا جب یورپیوں کا سپین کی سلطنت اور شاہ پر بھروسا اٹھتا جارہا تھا بلکہ کیسے ہسپانوی شہنشاہ زعم اور غرور میں خود اپنے پیر پر کلہاڑی مار رہا تھا۔ سرمایہ کاروں نے دل کھول کر ہالینڈی شہروں کو فوجیں اور بحری بیڑے تیار کرنے کے لیے سرمایہ فراہم کیا اور ہالینڈ نے ان فوجوں اور بحری بیڑوں کی مدد سے پوری دنیا کی تجارتی راہداریوں پر اپنی عملداری قائم کر لی۔ اس عملداری کے نتیجے میں خوب منافع حاصل ہوا جس سے ہالینڈ نے اپنے سارے قرضے سود سمیت اتار لیے اور یوں ہالینڈ پر سرمایہ کاروں کا اعتماد اور بھروسا پہلے سے بھی کہیں زیادہ مضبوط ہو گیا۔ ایک وقت ایسا آیا کہ ایمسٹرڈیم یورپ کی سب سے اہم بندرگاہ ہی نہیں تھی بلکہ اس کی مثال یورپی براعظم کے 'تجارتی اور مالیاتی مکہ' کی صورت بھی مشہور ہو گئی تھی۔

اب سوال یہ ہے کہ آخر ہالینڈ نے یورپ کے مالیاتی نظام کا بھروسا اور اعتماد کیسے حاصل کیا؟ سب سے پہلے تو انھوں نے اپنے قرضے وقت پر اور سود سمیت ادا کرنے میں بے انتہا کمال پسندی کا مظاہرہ کیا، یعنی اس پر کسی بھی قسم کا سمجھوتہ نہیں کیا اور اس کے ساتھ ساتھ سرمایہ کاروں کے لیے قرضوں کی فراہمی کو سہل بنایا اور حصص پر مبنی لمیٹڈ کمپنیوں کو خوب بڑھاوا دے کر گھاٹے کے امکان کو کم سے کم کر دیا۔ دوسرا کام یہ کیا کہ ہالینڈ میں نظامِ انصاف کو استعمال میں لا کر شخصی آزادی کو خوب بڑھاوا دیا اور نجی حقوق کے مکمل تحفظ کا پورا انتظام کر دیا۔ ہالینڈ کے حکام اچھی طرح جانتے تھے کہ سرمایہ ان آمریت پسند ریاستوں میں کبھی نہیں ٹکتا جہاں شہریوں کو آزادی میسر نہ ہو۔۔۔ انھیں نجی حقوق اور تحفظ حاصل نہ ہو۔ بجائے، سرمایہ ان ریاستوں میں جمع ہوتا ہے جہاں قانون کا بول بالا ہو اور نجی جائیدادوں کے حقوق حاصل ہوتے ہیں۔

اس نکتے کو سمجھنے کے لیے فرض کریں کہ آپ ایک جرمن سرمایہ کار خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ کے ابا نے ایک موقع تاڑا اور خاندانی کاروبار کو یورپ کے بڑے شہروں میں شاخیں کھول کر توسیع دینے کا فیصلہ کیا۔ وہ آپ کو اس مقصد کے لیے ایمسٹرڈیم جبکہ

آپ کے بھائی کو میڈرڈ بھجواتا ہے اور دونوں کو کچھ سرمایہ، کہیے۔۔۔ دس دس ہزار سونے کے سکے بھی مل جاتے ہیں۔ آپ کا چھوٹا بھائی اس سرمایے کو شاہ سپین کی اس مہم میں لگاتا ہے جس کے تحت وہ شاہ فرانس کے ساتھ جنگ چھیڑنے کا خواہاں ہے۔ آپ، اپنے حصے کا سرمایہ ہالینڈ کے ایک تاجر کی کمپنی میں لگاتے ہیں۔ ہالینڈ کا یہ بیوپاری اپنی کمپنی کا سرمایہ ایک بے آباد اور بنجر جزیرے کے جنوب میں واقع مین ہیٹن نامی اجاڑ جنگل میں زمین کی خریداری پر لگاتا ہے۔ اس کو یقین ہے کہ جب دریائے ہڈسن ایک بڑی تجارتی راہداری بن جائے گا تو اس اجاڑ جنگل میں زمین کی قیمت آسمان سے باتیں کرے گی۔ یہ دونوں طرح کی سرمایہ کاری۔۔۔ شاہ سپین اور ہالینڈ کے بیوپاری کو ایک سال کے اندر یہ قرضہ لوٹانا طے پایا ہے۔

پورا ایک سال گزر جاتا ہے۔ ہالینڈ کا بیوپاری تو مین ہیٹن میں زمین جیسی ہے، جہاں ہے کی بنیاد پر بیچ دیتا ہے اور اس سے حاصل ہونے والا اصل سرمایہ اور منافع میں سے آپ کو سود سمیت قرض وعدے کے مطابق لوٹا دیتا ہے۔ آپ کے ابا بھی کافی خوش ہو جاتے ہیں۔ لیکن میڈرڈ میں آپ کے چھوٹے بھائی کے پسینے چھوٹ رہے ہیں۔ ہوا یہ ہے کہ سپین کے شہنشاہ کو فرانس کے ساتھ جنگ میں تو برتری مل گئی تھی لیکن اس جنگ کا سیاسی نتیجہ یہ بھی نکلا ہے کہ سپین اور ترکوں کے بیچ ان بن ہو گئی ہے۔ اب شاہ سپین کو ترکوں کے ساتھ سینگ لڑانے کے لیے ہر طرح کا سرمایہ درکار ہے اور اس کے لیے قرض خواہوں کی ادائیگی سے زیادہ یہ نئی جنگ ضروری ہے۔ آپ کا بھائی، محل کے دروازے کھٹکھٹاتا ہے، خطوط پر خطوط لکھ کر یاددہانی کرواتا ہے اور میڈرڈ میں جتنے بھی معززین ہیں۔۔۔ ایک ایک کے پاس جا کر شہنشاہ سپین کے دربار میں رسائی کی کوشش کرتا ہے لیکن اس کی سرے سے کوئی شنوائی ہی نہیں ہوتی۔ اب صورتحال یہ ہے کہ آپ کے چھوٹے بھائی نے سود کی صورت منافع تو چھوڑو۔۔۔ الٹا اصل سرمایہ بھی گنوا دیا ہے۔ اس پر طرہ یہ ہے کہ آپ کے ابا الگ ناراض ہو گئے ہیں۔

یہ قصہ یہیں ختم نہیں ہوتا بلکہ حالات پہلے سے بھی بدتر ہوتے جاتے ہیں۔ شہنشاہ سپین خزانے کے حکام کو آپ کے بھائی کے پاس بھیجتا ہے اور دھمکی آمیز پیغام بھجواتا ہے کہ وہ غیر مشروط طور پر اتنی ہی مقدار میں مزید سرمایہ شاہ سپین کی اگلی مہم کے لیے فراہم کرے ورنہ بدترین نتائج کے لیے تیار رہے۔ آپ کے چھوٹے بھائی کے پاس تو پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے۔ چنانچہ، وہ اپنی گردن بچانے کے لیے ابا کو ایک خط لکھتا ہے اور انھیں قائل کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ اب کی بار شہنشاہ سپین اپنے وعدے پر پورا کھرا اترے گا۔ ابا نے بھی کئی بہاریں دیکھ رکھی ہیں، انھیں حقیقت کا پتہ ہے لیکن وہ اپنے چھوٹے بیٹے کو یوں ہسپانویوں کے ہاتھ برباد نہیں کر سکتے۔ وہ مجبور ہو کر بوجھل دل کے ساتھ دس ہزار سونے کے مزید سکے ارسال کر دیتے ہیں اور انھیں پہلے سے پتہ ہے کہ یہ سرمایہ بھی پہلے کی طرح ہسپانوی خزانے میں ڈوب چکا ہے۔ جبکہ دوسری جانب ایمسٹرڈیم میں کافی بہتری ہے۔ آپ ہالینڈ کے بیوپاریوں کو بڑھ چڑھ کر قرضے فراہم کر رہے ہیں اور وہ وعدے کے مطابق ایک کے بعد دوسرا قرضہ، اصل سرمایہ سود سمیت لوٹا رہے ہیں۔ لیکن آپ پر بھی قسمت کی

دیوی زیادہ دیر تک مہربان نہیں رہتی۔ آپ کے ایک انتہائی بھروسہ مند بیوپاری نے موقع تاڑ کر آپ کو بتایا ہے کہ جلد ہی لکڑی سے بنی کھڑاویں پیرس میں فیشن کا حصہ بن کر خوب مقبول ہو جائیں گی۔ وہ آپ سے اس کاروبار میں سرمایہ کاری کا خواہاں ہے۔ آپ اسے فرانس میں جوتوں اور کھڑاوں کی دکان کھولنے کے لیے قرضہ فراہم کر دیتے ہیں۔۔۔ پیرس کے بارے آپ کو کچھ پتہ نہیں ہے لیکن آپ اس بیوپاری اور اس کی کمپنی پر خوب بھروسا کرتے ہیں۔ بدقسمتی سے فرانس میں جوتوں کا یہ نیا فیشن نہیں چل پاتا اور آپ کا سرمایہ توڈوب ہی گیا ہے لیکن یہ بیوپاری بھی اب خود بری طرح پھنس چکا ہے اور وہ قرض لوٹانے سے انکاری ہے۔

آپ کے ابا غصے سے لال پیلے ہو جاتے ہیں۔ پہلے میڈرڈ اور اب ہالینڈ۔۔۔ وہ آپ دونوں کو وکیلوں سے رابطہ کر کے مقدمہ دائر کرنے کا حکم دے دیتے ہیں۔ آپ کا بھائی شہنشاہ سپین کے خلاف میڈرڈ میں جبکہ آپ ایمسٹرڈیم میں اس بیوپاری کے خلاف مقدمہ درج کروا دیتے ہیں۔ سپین میں عدالتیں شہنشاہ کی تابع ہیں۔ یہاں جج حضرات شہنشاہ کی من مرضی کے حساب سے، اسے خوش رکھنے یا اس کے خوف میں فیصلے کرتے ہیں۔ ہالینڈ میں معاملہ دوسرا ہے جہاں عدالتوں کا نظام حکومت کی بالکل الگ اور خود مختار شاخ ہے۔ یہ کسی بھی طور پر ہالینڈ کے شہزادوں اور باشندوں کے ماتحت نہیں ہیں۔ میڈرڈ کی عدالت تو آپ کے بھائی کی درخواست ردی کی ٹوکری میں پھینک دیتی ہے لیکن ایمسٹرڈیم میں آپ کی پوری شنوائی ہوتی ہے اور اس بیوپاری کے اثاثوں کو سب سے پہلے بحق سرکار ضبط کر لیا جاتا ہے اور پھر نیلامی کے نتیجے میں حاصل ہونے والی دولت سے آپ کی ایک ایک پائی لوٹا دی جاتی ہے۔ آپ کے ابا کو بھی سبق مل جاتا ہے۔ وہ سیکھ لیتے ہیں کہ بادشاہوں کی بجائے بیوپاریوں کے ساتھ کاروبار کرنا زیادہ مفید ہوتا ہے۔۔۔ یہی نہیں بلکہ سرمایہ کاری کے لیے ہالینڈ، میڈرڈ سے کہیں بہتر جگہ ہے۔

آپ کے بھائی کی مشکلات ابھی بھی کم نہیں ہوئیں۔ شہنشاہ سپین کو اپنی افواج کا پیٹ بھرنے کے لیے پیسہ درکار ہے۔ اس کو یقین ہے کہ آپ کے ابا کے پاس کافی دولت ہے۔ چنانچہ، وہ آپ کے بھائی کے خلاف غداری کا مقدمہ قائم کر کے قید کر لیتا ہے۔ عدالت فیصلہ سناتی ہے کہ اگر بیس ہزار سونے کے سکے ادا نہ کیے گئے تو آپ کے بھائی سڑ کر مرنے کے لیے تنگ و تاریک کوٹھڑی میں پھینک دیا جائے گا۔

آپ کے ابا کا پارہ تو خوب چڑھتا ہے لیکن اب بس بھی ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے پیارے بیٹے کی زندگی بچانے کے لیے یہ تاوان تو ادا کر دیتے ہیں لیکن اس کے ساتھ کبھی بھی دوبارہ سپین میں سرمایہ کاری نہ کرنے کا اٹل فیصلہ بھی کر لیتے ہیں۔ میڈرڈ میں خاندانی کاروبار کی یہ شاخ بند کر دی جاتی ہے اور آپ کے بھائی کو ہالینڈ کے شہر روٹرڈم میں شاخ کھول کر دے دی جاتی ہے۔ ہالینڈ میں دو شاخیں، برا خیال نہیں تھا بلکہ یہ بھی سننے میں آیا تھا کہ ہسپانوی سرمایہ دار بھی چوری چوری اپنی دولت سپین سے نکال کر ہالینڈ میں سمگل کر رہے ہیں۔ ان کو بھی پتہ

ہے کہ اگر وہ اپنا سرمایہ بچا کر منافع کمانا چاہتے ہیں تو جتنی جلد ممکن ہو، سپین سے نکال کر ایسی جگہ لگائیں جہاں قانون کی حکمرانی ہو اور نجی زندگی اور جائیداد کا تحفظ کیا جاتا ہو۔ اب ہالینڈ سے بہتر، کون سی جگہ ہو سکتی تھی؟

یوں شہنشاہ سپین نے سرمایہ داروں کا اعتماد کھو دیا جبکہ دوسری طرف ہالینڈ کے بیوپاری اور تاجران سرمایہ داروں کا بھروسا جیت رہے تھے۔ ہالینڈ کی سلطنت، ہالینڈ کی ریاست نہیں بلکہ ہالینڈ کے تاجروں اور بیوپاریوں نے کھڑی کی تھی۔ سپین کا شہنشاہ تو اپنے جنگی عزائم کو پورا کرنے کے لیے پہلے سرمایہ داروں کو دھمکاتا رہا اور پھر پہلے سے ناخوش مقامی آبادیوں پر بھاری ٹیکس بھی لاگو کر دیے۔ دوسری جانب ہالینڈ کے بیوپاری اور تاجر اپنے جنگی عزائم کو پہلے تو قرضوں کی مدد سے لیکن پھر بتدریج ان کمپنیوں کے حصص بیچ کر پورا کرنے لگے جو تجارت میں سہل کاری اور گھاٹے کے امکان کو کم کرنے کے مقصد کے لیے بنائی گئی تھیں۔ ان کمپنیوں کے خالص منافع سے حصہ داروں کو پوری پوری آمدن، ادا کر دی جاتی تھی۔ ایسے محتاط سرمایہ کار جو شہنشاہ سپین کو اپنی جمع پونجی دینے کے لیے کبھی تیار نہ ہوتے، وہ یقینی طور پر ہالینڈ کی حکومت کو بھی قرض دینے سے پہلے سو بار سوچتے تھے۔ لیکن یہ سرمایہ دار ہنسی خوشی ہالینڈ کی حصص پر مبنی جوائنٹ لمیٹڈ کمپنیوں میں سرمایہ لگا کر نئی سلطنت کی بنیاد رکھنے کے لیے ہر دم تیار تھے۔

اس وقت یہ رواج بھی پڑ گیا کہ اگر کوئی کمپنی منافع کما رہی ہوتی تو اکثر، اس کے سارے حصص پہلے سے ہی فروخت ہو چکے ہوتے تھے۔ چنانچہ، اگر آپ اس کمپنی میں سرمایہ کرنا چاہتے تو ان لوگوں سے یہ حصص خریدے جاسکتے تھے۔ یہ مالکان، کسی بھی منافع بخش کمپنی کے حصص اصل سے زائد قیمت پر فروخت کرنے کے لیے تیار ہو جاتے تھے۔ اگر، آپ نے کسی کمپنی کے حصص خرید لیے اور بعد میں پتہ چلا کہ کمپنی تو خسارے کا شکار ہے۔۔۔ آپ اس کمپنی کے حصص کو کم قیمت پر فروخت کر کے جان بھی چھڑا سکتے تھے۔ یوں، کمپنیوں کے حصص کے اس کاروبار سے بڑے یورپی شہروں میں باقاعدہ کمپنیوں کے حصص کا کاروبار کرنے کے مراکز، یعنی سٹاک ایکسچینج کی بنیاد بھی پڑ گئی۔

ہالینڈ کی سب سے معروف حصص پر مبنی لمیٹڈ کمپنی، 'ولندیزی ایسٹ انڈیا کمپنی' تھی، جسے 'ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی' یا وی او سی بھی کہا جاتا تھا۔ یہ کمپنی 1602ء میں قائم ہوئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہالینڈ، سپین کی حکمرانی کا طوق اتار کر پھینکنے کی جدوجہد کر رہا تھا اور ایمسٹرڈیم کے مضافات میں ہسپانوی توپ خانے گرجتے رہتے تھے۔ وی او سی نامی اس کمپنی نے حصص بیچ کر بحری بیڑے تیار کیے۔ ان بحری بیڑوں کو ایشیاء۔۔۔ بالخصوص چین، ہندوستان اور انڈونیشیاء سے تجارتی مال برداری کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ اس کمپنی نے کچھ سرمایہ عسکری سرگرمیوں کے لیے بھی مختص کر دیا، جن کا مقصد بحری قزاقوں اور کمپنی کے حریفوں سے نبٹنا تھا۔ آخر کار، ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی نے انڈونیشیا بھی فتح کیا۔

انڈونیشیاء، دنیامیں سمندری جزیروں کا سب سے بڑا سلسلہ ہے۔ یہاں ہزاروں کی تعدادمیں جزائر ہیں جن پر سترھویں صدی کے اوائل میں سینکڑوں بادشاہوں، قلمروؤں، سلطانوں اور قبائل کی حکمرانی ہوا کرتی تھی۔ جب 1603ء میں ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی کے بیوپاری پہلی بار انڈونیشیاء پہنچے تو ان کا مقصد خالصتاً کاروبار تھا۔ تاہم، کمپنی کے کاروباری مفادات کے تحفظ اور حصہ داروں کے لیے زیادہ سے زیادہ منافع یقینی بنانے کے لیے انھوں نے جلد ہی مقامی طاقتور مقتدر حلقوں کے خلاف کاروائیوں کا آغاز کر دیا جو تجارتی مال کی قیمتیں بڑھاتے چڑھاتے رہتے تھے۔ ایسی ہی کاروائیاں، انڈونیشیاء میں یورپی حریفوں کے خلاف بھی شروع کی گئیں۔ کمپنی نے اپنے تجارتی مال بردار بحری جہازوں کو توپوں سے لیس کر دیا۔ یہی نہیں بلکہ یورپی، جاپانی، ہندوستانی اور انڈونیشیائی سپاہیوں کو بھی بھاڑے پر بھرتی کیا اور قلعے تعمیر کیے۔ اس عسکری طاقت کو وہ محاصروں اور بھرپور لڑائیوں کے لیے بھی استعمال کرنے لگے۔ اس طرز کا کاروبار اور کارجوئی شاید سننے میں عجیب لگتی ہو لیکن جدید دور کے اوائل میں نجی کمپنیوں کے لیے سپاہیوں کی ہی نہیں بلکہ جرنیلوں اور ایڈمرلوں کی بھرتیاں، توپیں اور جنگی بحری جہازوں کے ساتھ ساتھ پوری پوری فوج پالنا نہایت عام بات تھی۔ بین الاقوامی برادری، نجی کمپنیوں کی ان سرگرمیوں کو عام فہم سمجھتے تھے اور جب یہ کمپنیاں پوری پوری سلطنتیں کھڑی کر رہی تھیں۔۔۔ کسی نے اعتراض نہیں کیا کیونکہ، یہ عام اور رائج دستور تھا۔

ایک کے بعد دوسرا جزیرہ فتح ہوتا گیا اور یوں جلد ہی انڈونیشیاء کا بڑا حصہ ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی کی نوآبادی یعنی کالونی بن گیا۔ ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی نے انڈونیشیاء پر قریباً دو سو سال تک حکمرانی کی۔ 1800ء میں ہالینڈ کی ریاست نے انڈونیشیاء کا انتظام سنبھال لیا اور یہ اگلے ڈیڑھ سو برس تک ہالینڈ کی قومی نوآبادی بن گئی۔ آج بعض لوگوں کو یہ خدشہ رہتا ہے کہ اکیسویں صدی میں کارپوریشنیں حد سے زیادہ طاقتور ہوتی جا رہی ہیں۔ ان کے یہ خدشات بالکل بجا ہیں کیونکہ جدید دور کی تاریخ کو دیکھ کر بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ اگر تجارت اور کاروبار کو کسی جانچ اور پڑتال کے بغیر جاری رہنے دیا جائے تو وہ اپنے مفادات کے تحفظ اور زیادہ سے زیادہ منافع کمانے کی حرص میں کس حد تک جا سکتے ہیں۔

ایک طرف تو ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی بحرہند پر راج کر رہی تھی تو دوسری جانب ڈچ ویسٹ انڈیز کمپنی یا ڈبلیو آئی سی بحراوقیانوس پر دندنا رہی تھی۔ دریائے ہڈسن پر تجارتی سرگرمیوں کو قابو میں رکھنے کے لیے ڈچ ویسٹ انڈیز کمپنی نے دریا کے منہ پر واقع ایک جزیرے پر آبادی شروع کی، اس کا نام نیوایمسٹرڈیم رکھا گیا۔ اس نوآبادی کو ہر دم مقامی ریڈ انڈینز سے خطرہ رہتا تھا جبکہ انگریز پے در پے اس پر حملے کرتے رہتے تھے۔ انگریزوں نے 1664ء میں اس نوآبادی پر بہر حال، قبضہ کر ہی لیا تھا۔ انگریزوں نے اس جگہ کا نام بدل کر نیویارک رکھ دیا۔ ڈچ ویسٹ انڈیز کمپنی نے جو دیوار اس نوآبادی کو ریڈ انڈینز اور انگریزوں سے محفوظ رکھنے کے لیے تعمیر کی تھی، انگریزوں نے اسے گرا کر یہاں دنیا کی مشہور و معروف 'وال سٹریٹ' بنادی۔

جب سترھویں صدی کا اختتام ہوا تو خاطر جمعی اور براعظموں پر پھیلی ہوئی جنگوں کی وجہ سے ہالینڈ کے ہاتھوں سے نہ صرف نیویارک نکل چکا تھا بلکہ وہ اب یورپ کا مالیاتی اور سامراجی مرکز بھی نہیں تھا۔ اس خلا کو پر کرنے کے لیے فرانس اور برطانیہ ایک دوسرے کے ساتھ دست بدست تھے۔ پہلے پہل تو یہ محسوس ہوا کہ غالباً فرانس بہتر اور مضبوط پوزیشن میں ہے۔ وہ یوں کہ فرانس رقبے میں برطانیہ سے کہیں بڑا تھا، امیر کبیر، گنجان آباد اور اس کے یہاں تجربہ کار اور کافی بڑی فوج بھی تھی۔ لیکن اس کے باوجود برطانیہ نے یورپ کے مالیاتی نظام کا بھروسا جیت لیا جبکہ فرانس خود کو ثابت ہی نہیں کر پایا۔ اس ضمن میں اہم موڑ اس وقت آیا جب 'مسیسیپی کا بلبلہ' نامی اٹھارہویں صدی کا سب سے بڑا مالیاتی بحران پیش آیا۔ اس بحران کے دوران فرانسیسی تاج کا رویہ اس قدر بھدا تھا کہ بعد اس کے، وہ کبھی بھی اعتماد اور بھروسے کے قابل نہ رہا۔ اس کہانی کا آغاز بھی سلطنت کھڑی کرنے والی ایک مشترکہ حصص کی لمیٹڈ کمپنی سے ہوتا ہے۔

1717ء میں فرانس کی مسیسیپی کمپنی نے وادی مسیسیپی کے نشیبی علاقوں میں ایک نئے شہر نیواورلینز نامی نوآبادیاتی شہر کی بنیاد رکھنے کا عمل شروع کیا۔ اس جاہ طلب منصوبے کے لیے سرمایہ حاصل کرنے کے لیے شہنشاہ لوئس پانزدھم کی اس چہیتی کمپنی نے پیرس کی سٹاک ایکسچینج پر حصص فروخت کیے۔ اس وقت اس کمپنی کا ڈائریکٹر جان لاء تھا جو فرانس کے مرکزی بینک کا گورنر بھی تعینات کیا گیا تھا۔ مزید برآں، جان لاء کو شہنشاہ فرانس اسے مالیات کا کنٹرولر بھی بنا رکھا تھا۔ اس زمانے میں مالیات کے کنٹرولر کی حیثیت جدید ریاستوں میں وزیر خزانہ جیسی ہوا کرتی تھی۔ بہرحال، 1717ء میں وادی مسیسیپی کے نشیبی علاقوں میں دلدلوں اور مگرمچھوں کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا لیکن فرانس کی مسیسیپی کمپنی نے اس علاقے کے بارے امارت، دھن دولت اور بے شمار مواقعوں کی خوب کہانیاں گھڑ لیں۔ فرانسیسی اشرافیہ، کاروباریوں اور شہری علاقوں کا بے حس متوسط طبقہ ان کہانیوں کے جال میں آ گیا اور مسیسیپی کمپنی کے حصص کی قیمتیں آسمان سے باتیں کرنے لگیں۔ پہلے پہل تو فی حصص کی قیمت 500 فرانسیسی لیور (کرنسی) مقرر ہوئی۔ یکم اگست 1719ء کو اس کمپنی کے فی حصص کی قیمت 2750 فرانسیسی لیور تک پہنچ چکی تھی۔ 30 اگست کو اس کی قیمت 4100 فرانسیسی لیور اور 4 ستمبر کو یہ حصص 5000 لیور میں بک رہا تھا۔ 2 دسمبر کو تو حد ہو گئی، مسیسیپی کمپنی کے فی حصص کی قیمت 10000 فرانسیسی لیور تک پہنچ گئی۔ فرانس کی گلیوں میں جنونی بشاشیت اور انبساط پھیلا ہوا تھا۔ ہر شخص یہی سوچ کر بیٹھا تھا کہ انھوں نے دولت اور دھن کمانے کا آسان طریقہ ڈھونڈ نکالا ہے اور اب مستقبل میں آسودگی کے سوا کچھ نہیں رکھا ہے۔

1660-39ء میں، مین ہیٹن جزیرے کی نکڑ پر نیوامسٹرڈیم کی نو آبادی، جس کی فصیلوں کو ڈھا کر اس پر مشہور وال سٹریٹ آباد کی گئی تھی۔

لیکن، چند دن بعد سنسنی پھیلنے لگی۔ بعض سٹے بازوں کو پہلی بار احساس ہوا کہ حصص کی قیمتیں انتہائی غیر حقیقی ہیں اور انہیں زیادہ دیر تک سہارا ناممکن نہیں ہے۔ انھوں نے سوچا کہ اس وقت چونکہ حصص کی قیمتیں بلندی پر ہیں تو انھیں یہ بیچ کر خاصا منافع حاصل ہو سکتا ہے۔ یوں، مسیسیپی کمپنی کے حصص بکنا شروع ہو گئے۔ اب جوں جوں منڈی میں اس کمپنی کے حصص کی رسد بڑھتی گئی، قیمتیں گرنے لگیں۔ جب دوسرے سرمایہ کاروں نے حصص کی قیمتوں کو یوں گرتے دیکھا تو انھوں نے بھی جلد از جلد جان چھڑانے کی ٹھان لی۔ کمپنی کے حصص کی قیمت مزید گر گئی اور گویا قیمتوں کی گراوٹ میں برفشار کی صورت پیدا ہو گئی۔ کمپنی کے حصص کی قیمتوں کو سہارا دینے کے لیے فرانس کے مرکزی بینک نے، گورنر جان لاء کی ہدایات پر مسیسیپی کمپنی کے سارے حصص خریدنا شروع کر دیے۔ اب ظاہر ہے، مرکزی بینک سارے حصص خریدنے کے قابل نہیں تھا۔ آخر کار، بینک کی ساری دولت خرچ ہو گئی اور دیوالیہ نکل آیا۔ جب مرکزی بینک کا یوں دیوالیہ نکلا تو فرانس کی مالیات کے کنٹرولر جان لاء کی ہدایت پر مزید فرانسیسی لیور چھاپ کر مزید حصص خریدنا شروع کر دیے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ فرانس کا پورا مالیاتی نظام اس بحرانی بلبلے میں گھر گیا اور اب یہ مالیاتی جادو گری بھی اس کو بچانے کے قابل نہیں تھی۔ اس ریاستی مداخلت کے باوجود بھی کمپنی کے حصص کی قیمت پہلے 10000 فرانسیسی لیور سے سیدھا گر کر 1000 فرانسیسی لیور تک پہنچی اور پھر سیدھا صفر پر پہنچ گئی۔ کمپنی اور اس کے حصص اپنی قدر، مول اور قیمت۔۔۔ سب کچھ کھو بیٹھی۔ اب فرانس کے مرکزی بینک اور شاہی خزانے کے پاس ایک پائی بھی نہیں تھی جبکہ بے کار اور بے مول حصص کا انبار لگا ہوا تھا۔ اس بحران کے

نتیجے میں بڑے بیوپاری اور سٹے باز تو بر وقت سودا کر کے بھرپور منافع کما کر نکلے لیکن چھوٹے سرمایہ کاروں کا گویا بھٹہ بیٹھ گیا۔ ان کی پوری زندگی کی جمع پونجی غرق ہو گئی اور کئی لوگ اس نقصان کی تاب نہ لا کر خودکشی پر مجبور ہو گئے۔

'مسیسیپی کا ببلہ' نامی یہ مالیاتی بحران غالباً تاریخ کا انتہائی قابل دید اور سب سے شاندار مالیاتی انہدام تھا۔ فرانس کا شاہی مالیاتی نظام اس دھچکے سے دوبارہ کبھی سنبھل نہیں پایا۔ مسیسیپی کمپنی نے سیاسی چھایاچھتر استعمال کر کے جس طرح حصص کی قیمتوں پر اثرانداز ہوئی اور نتیجتاً ایسا ہیجان پیدا کیا کہ اشرافیہ اور عوام کا فرانسیسی کے بینکاری نظام اور شہنشاہ فرانس کی مالیاتی دانش پر سے اعتبار بالکل اٹھ گیا۔ لوئس پنزدھم کے لیے اب کریڈٹ اکھٹا کرنا مشکل سے مشکل تر ہوتا گیا اور ساکھ کی یہ بربادی، بالآخر بیرونی دنیا میں فرانسیسی سلطنت، انگریزوں کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو گئی۔ چونکہ برطانوی سلطنت کو اب بھی آسان شرائط اور کم شرح سود پر قرضے با آسانی مل جاتے تھے لیکن فرانس کو قرضہ ملنا محال ہو چکا تھا اور سود کی ادائیگی بھی روز بروز مشکل تر ہو چکی تھی۔ آخرکار 1780ء میں اپنے دادا کی وفات کے بعد تخت پر براجمان ہونے والے لوئس شانزدھم کو احساس ہوا کہ فرانس کے سالانہ بجٹ کا نصف حصہ تو قرض اور سود کی ادائیگیوں میں نکل جاتا ہے اور فرانس تیزی کے ساتھ دیوالیہ پن کی طرف بڑھ رہا ہے۔ 1789ء میں بادل نخواستہ لوئس شانزدھم نے 'اسٹیٹ جنرل' یعنی فرانسیسی پارلیمان کا اجلاس ڈیڑھ سو برس بعد طلب کیا تاکہ اس بحران سے نکلنے کا حل تلاش کیا جا سکے۔ یہیں سے، فرانسیسی انقلاب کی ابتداء ہوتی ہے۔

اب جبکہ بیرون ملک فرانسیسی سلطنت لڑکھڑا رہی تھی تو اس صورتحال میں برطانوی راج نہایت تیزی سے پھیل رہا تھا۔ ہالینڈ کی سلطنت کی طرح برطانوی راج کی بنیاد بھی نجی اور محدود مشترکہ حصص کمپنیوں نے لندن سٹاک ایکسچینج میں کاروبار کے منافعوں پر رکھی تھی۔ شمالی امریکہ میں اولین انگریز نوآبادیوں کی بنیاد سترھویں صدی کے اوائل میں لندن کمپنی پلیماوت کمپنی، ڈارچسٹر کمپنی اور میساچوسٹس کمپنی وغیرہ کے کاروباری منافعوں پر رکھی گئی تھی۔

اسی طرح ہندوستانی برصغیر کو بھی برطانوی ریاست نے نہیں بلکہ برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی کے بھاڑے کی فوج نے فتح کیا تھا۔ برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی نے تو ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی کو بھی پیچھے چھوڑ دیا۔ لندن کی لیڈن ہال سٹریٹ میں واقع اس کمپنی کے ہیڈ کوارٹر نے قریباً سو سال تک عظیم برٹش سلطنت پر حکمرانی کی۔ اس کمپنی کو تقریباً 350000 فوجیوں پر مشتمل فوج بھی دستیاب تھی جو کہ برطانوی شاہی فوج سے کئی گنا بڑی تھی۔ 1858ء میں تاج برطانیہ نے کمپنی کی نجی فوج کے ساتھ ساتھ ہندوستانی نوآبادی کو بھی قومی تحویل میں لے لیا۔ نپولین نے انگریزوں کا مذاق اڑاتے ہوئے، انھیں دکانداروں کی قوم قرار دیا تھا۔ تاہم، انہی دکانداروں نے نپولین کو بھی شکست دی اور ان دکانداروں کی سلطنت دنیا کی ایسی فرمانروائی بن کر ابھری جو اس سے قبل دنیا میں نہیں دیکھی گئی۔۔۔ اس سلطنت کی سرحدوں پر سورج بھی غروب نہیں ہوتا تھا۔

سرمائے کے نام پر۔۔۔

جب 1800ء میں تاج ہالینڈ نے انڈونیشاء اور 1858ء میں تاج برطانیہ نے ہندوستان کو قومی تحویل میں لے لیا تو اس کے باوجود بھی سرمایہ داری نظام اور سامراجی نظام کا ادغام مکمل نہیں ہوا۔ اس کے برعکس، یہ ربط اور جوڑ انیسویں صدی میں پہلے سے بھی کہیں زیادہ مضبوط تر ہوتا چلا گیا۔ اب نوآبادیات قائم کرنے اور ان پر حکومت کے لیے مشترکہ حصص کی نجی کمپنیوں کی کوئی حاجت باقی نہیں رہی تھی بلکہ ان کمپنیوں کے بڑے کھاتے داروں اور کلیدی حکام نے لندن، ایمسٹرڈیم اور پیرس میں اقتدار کی غلام گردشوں کا رخ کر لیا اور سیاسی ڈوریاں کھینچنے میں ماہر ہو گئے۔ اب وہ بجائے خود اپنے ذاتی مفادات کا تحفظ کیا کرتے، انھوں نے اس مقصد کے لیے ریاست کا استعمال شروع کر دیا۔ اس امر کو مارکس اور اشتراکیت پر یقین رکھنے والے دوسرے مفکروں نے نہایت خوبی کے ساتھ کھول کر بیان کیا ہے اور مغربی حکومتوں پر بھرپور تنقید کر رکھی ہے کہ وہ رفتہ رفتہ سرمایہ داروں کی ٹریڈ یونین بن گئی ہیں۔

اس ضمن میں سب سے مشہور اور انگشت نما مثال برطانیہ اور چین کے بیچ 1840ء میں پہلی افیونی جنگ ہے۔ یہ جنگ، اصل میں سرمایہ داروں کی حکومتی سطح پر دباؤ اور گویا ریاستی رٹ کی بولی کے مترادف تھی۔ ہوا یوں کہ انیسویں صدی کے پہلے نصف میں برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی نے چند نامی گرامی انگریز کاروباری حلقوں کے ساتھ مل کر نشہ آور ادویات بالخصوص افیون کی چین میں برآمد سے بیش بہا منافع کمایا۔ ان برآمدات کے نتیجے میں چین کے لاکھوں افراد کو افیون کے نشے کی لت پڑ گئی اور یوں ملک معاشی اور سماجی طور پر کھوکھلا ہو گیا۔ 1830ء کی دہائی کے اواخر میں چینی حکومت نے نشہ آور ادویات کی نقل و حمل اور کاروبار پر سخت پابندیاں عائد کر دیں لیکن برطانوی تاجروں اور بیوپاریوں نے ان پابندیوں کو یکسر نظرانداز کر دیا۔ اس پر چینی حکام نے مفرد اشیاء کے کھیپ سے لدے ہوئے مال بار جہازوں کو بڑے پیمانے پر بحق سرکار ضبط کر کے تلفی شروع کر دی۔ نشہ آور ادویات کا کاروبار کرنے والے اس کمپنی اور بیوپاریوں کے ویسٹ منسٹر اور ڈاؤننگ سٹریٹ کے ساتھ قریبی تعلقات تھے۔ پارلیمان اور کابینہ کے کئی اراکین نشہ آور ادویات برآمد کرنے والی کمپنیوں میں بھاری حصص کے مالک تھے، چنانچہ انھوں نے حکومت پر اس چینی قدغن کا بھرپور جواب دینے کے لیے کاروائی پر زور دینا شروع کر دیا۔

1840ء میں برطانوی حکومت نے ان بھاری سرمایہ داروں کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے اور چین کے ساتھ 'آزادانہ تجارت' کے نام پر جنگ کا اعلان کر دیا۔ یہ ایک یک طرفہ جنگ ثابت ہوئی۔ حد سے زیادہ خود اعتماد چینی، برطانیہ کے نت نئے کرشماتی ہتھیاروں جیسے بھاپ سے چلنے والی کشتیوں، بھاری توپ خانے، راکٹوں اور تیز رفتار فائر کرنے والی رائفلوں کا مقابلہ کرنے کے ہرگز قابل نہ تھے۔ چنانچہ، صلح کے معاہدے میں چین نے برطانیہ سے تعلق رکھنے والے مفرد ادویات کے بیوپاریوں کی سرگرمیوں میں ٹانگ نہ اڑانے اور چینی پولیس کے

ہاتھوں ہونے والے نقصان کا پورا ازالہ کرنے کی حامی بھر لی۔ مزید برآں، برطانیہ نے ہانگ کانگ کا اقتدار بھی سنبھال لیا۔ انگریز اب ہانگ کانگ کو منشیات کی تجارت کے لیے محفوظ اڈے کے طور پر استعمال کر سکتے تھے۔ ہانگ کانگ 1997ء تک برطانوی قبضے میں رہا۔ انیسویں صدی کے اواخر تک چار کروڑ چینی، یعنی چین کی آبادی کا دس فیصد کو اب افیون کے نشے کی لت پڑ چکی تھی۔

اسی طرح مصر نے بھی سختی جھیل کر ہی برطانوی سرمایہ داروں کا لحاظ کرنا سیکھا تھا۔ وہ یوں کہ انیسویں صدی میں فرانسیسی اور برطانوی سرمایہ داروں نے مصر کے حکمرانوں کو بھاری قرضہ فراہم کیا تھا۔ اس میں اول تو سویز نہر کی تعمیر کا منصوبہ تھا جبکہ بعد ازاں کئی ایسے منصوبے بھی شامل تھے جو زیادہ کامیاب نہیں ہو پائے۔ مصریوں پر قرض کا بوجھ بہت بڑھ گیا تھا اور یوں یورپی قرض خواہ مصری معاملات میں زیادہ سے زیادہ دخل اندازی کرنے لگے۔ 1881ء میں مصری قوم پرستوں کی برداشت جواب دے گئی اور انھوں نے بغاوت کھڑی کر دی۔ ان قوم پرستوں نے سارے غیر ملکی قرضے سے یکطرفہ تنسیخ کا اعلان کر دیا۔ اس پر ملکہ وکٹوریہ بالکل بھی خوش نہیں تھیں۔ اس اعلان کے ایک سال بعد ہی ملکہ نے اپنی زمینی فوج اور نیوی کو نیل فتح کرنے بھیجا اور یوں مصر دوسری جنگ عظیم کے بعد تک برطانیہ استعماریت کے زیر سایہ رہا۔

سرمایہ داروں کے مفادات اس قدر مقدم رہے ہیں کہ شاید ہی کوئی ایسی جنگ ہو جو ان سے تعلق اور واسطہ نہ رکھتی ہو۔ بلکہ، حقیقت تو یہ ہے کہ جنگ بذات خود افیون کی طرح، ایک تجارتی جنس بن کر رہ گئی۔ 1821ء میں یونانیوں نے سلطنت عثمانیہ سے بغاوت کر دی تھی۔ یونانیوں کی اس سرکشی کی برطانیہ کے آزاد خیال اور رومانویت کے قائل حلقوں میں خوب پزیرائی ہوئی۔ یہاں تک کہ لارڈ بائرن نامی شاعر نے باقاعدہ یونان کا سفر اختیار کیا اور باغیوں کے شانہ بشانہ لڑائی بھی لڑی۔ اس بغاوت میں بھی لندن کے سرمایہ کاروں نے موقع تلاش کر لیا۔ انھوں نے باغیوں کے سربراہان کو لندن سٹاک ایکسچینج میں قابل تجارت 'یونانی مزاحمت کے بانڈ' جاری کرنے کی پیشکش کی۔ یونانی سرکشوں کے لیے آزادی حاصل کرنے پر ان بانڈوں کی بمعہ سود ادائیگی کا وعدہ کرنا تھا۔ نجی سرمایہ کاروں نے یہ بانڈ منافع کمانے یا یونانیوں کے ساتھ ہمدردی یا دونوں وجوہات کی بناء پر خرید لیے۔ لندن سٹاک ایکسچینج میں 'یونانی مزاحمت کے بانڈ' کی قیمت یونانی آزادی کی جنگ میں باغیوں کی لڑائیوں میں فتح اور شکست کے ساتھ بڑھتی اور گرتی رہی۔ رفتہ رفتہ ترکوں کا پلڑا بھاری ہوتا گیا۔ جب باغیوں کو صاف شکست کا سامنا ہو گیا تو یونانی بانڈ کے حاملین کو اپنا سرمایہ ڈوبتا ہوا نظر آنے لگا۔ ان سرمایہ کاروں کا مفاد، قومی مفاد تھا۔۔۔ چنانچہ تاج برطانیہ نے ایک بین الاقوامی بحری بیڑہ تیار کیا جس نے 1827ء میں سلطنت عثمانیہ کا سب سے بڑا بحری بیڑا نوارینو کی بحری لڑائی میں ڈبو دیا۔ صدیوں تک محکوم رہنے والا یونان بالآخر آزاد ہو گیا۔ لیکن یونانیوں کی یہ آزادی۔۔۔ اس نئی خودمختار ریاست پر بھاری قرضوں کا بوجھ بھی ساتھ لائی۔ اس نوزائیدہ ریاست کے لیے یہ قرضہ کسی بھی صورت ادا کرنا ممکن نہیں تھا۔ چنانچہ، یونانی معیشت اگلی کئی دہائیوں تک برطانوی قرض خواہوں کے پاس گروی ہو گئی۔

سرمایے اور سیاست کے بیچ گٹھ جوڑ مالیات کی تجارتی منڈیوں پر دور رس اثرات مرتب کرتے ہیں۔ کسی بھی معیشت میں کریڈٹ کی مقدار کا تعین صرف اور صرف معاشی عوامل جیسے تیل کے نئے کنوؤں کی دریافت یا کسی نئی مشین کی ایجاد پر منحصر نہیں ہوتی بلکہ سیاسی حالات و واقعات جیسے حکومت کی تبدیلی یا جرت آمیز خارجی پالیسیوں کا بھی خوب اثر ہوتا ہے۔ نوارینو کی بحری لڑائی کے بعد تو برطانوی سرمایہ دار پہلے سے بڑھ چڑھ کر گھاٹے کے خطرے سے پر خارجی سودوں میں پیسہ لگانے لگے۔ وہ پہلے ہی یہ دیکھ چکے تھے کہ اگر کسی خارجی قرض دار نے قرض کی ادائیگی میں ڈنڈی مارنے کی کوشش کی تو ملکہ عالیہ اپنی افواج کی مدد سے اس قرض دار کا قبلہ درست کرنے کی پوری اہلیت رکھتی ہیں اور بھلے کچھ بھی ہو، تاج برطانیہ ان کا سرمایہ ڈوبنے نہیں دے گا۔

یہی وجہ ہے کہ آج کسی بھی ملک کی کریڈٹ ریٹنگ اس کی معاشی خوشحالی کے لیے ملک کے قدرتی وسائل سے کہیں بڑھ کر اہم ہوتی ہے۔ کریڈٹ ریٹنگ سے مراد کسی بھی ملک کا قرضوں کی ادائیگی سے متعلق گمان یا احتمال ہوتا ہے۔ کسی بھی ملک کے لیے کریڈٹ ریٹنگ طے کرنے کے لیے خالصتاً معاشی حقائق ہی نہیں بلکہ سیاسی، سماجی اور یہاں تک کہ ثقافتی عوامل بھی زیر غور لائے جاتے ہیں۔ ایک ایسا ملک جو تیل کی دولت سے تو مالا مال ہو لیکن اگر اس مملکت کی حکومت آمرانہ، جنگ عام اور نظام انصاف بدعنوان ہو تو اس کی کریڈٹ ریٹنگ بیش بہا قدرتی وسائل کے باوجود بھی انتہائی کم ہو گی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ قدرتی وسائل سے مالا مال یہ ملک ہمیشہ ہی غریب رہے گا اور کبھی بھی اتنا سرمایہ اکٹھا کرنے کے قابل نہیں ہو گا کہ وہ اپنے قدرتی وسائل کو بھی معقول انداز میں استعمال میں لا سکے۔ لیکن کوئی ایسا ملک جس میں قطعاً کوئی قدرتی وسائل نہ ہوں لیکن وہاں امن کا دور دورہ، انصاف کا نظام غیر جانبدار اور حکومت آزاد ہو تو یقیناً اس کی کریڈٹ ریٹنگ خوب سے خوب تر ہو گی۔ ایسے ملکوں کو آسان شرائط اور انتہائی کم شرح سود پر اتنا زیادہ قرضہ مل سکتا ہے کہ وہ ملک میں بہترین تعلیمی نظام قائم کر کے ہائی ٹیک صنعتوں کو پروان چڑھا سکتے ہیں۔

آزاد تجارتی منڈیوں کا مسلک

سرمایہ داری اور سیاست ایک دوسرے پر کچھ اس حد تک اثر انداز ہوتے ہیں کہ ان کے بیچ تعلق کو معاشیات دان، سیاستدان اور یہاں تک کہ عام عوام بھی ہر وقت خوب زور و شور سے زیر بحث لاتی رہتی ہے۔ سرگرم سرمایہ داروں کی زوردار دلیل یہ ہے کہ سرمایہ کاری کو تو سیاست پر اثر انداز ہونے کی کھلی چھٹی مل جائے لیکن سیاسی عوامل کو کبھی بھی سرمایہ کاری پر اثر انداز ہونے کی اجازت نہیں ملنی چاہیے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ جب حکومتیں تجارتی منڈیوں میں دخل اندازی کرتی ہیں تو سیاسی مفادات کے پیش نظر انھیں سرمایہ کاری سے متعلق غیر دانشمندانہ فیصلے کرنے پڑتے ہیں۔۔۔ جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ معاشی ترقی اور نمو سست روی کا شکار ہو جاتی ہے۔ مثال کے طور پر جب کوئی حکومت صنعت کاروں پر بھاری ٹیکس لاگو کر کے حاصل ہونے والی آمدن کو بے روزگاری الاؤنس بنا کر بانٹنے

سے ووٹروں میں تو خوب حمایت حاصل کر لیتی ہے لیکن یہ ایک انتہائی غیر دانشمندانہ فیصلہ ہو گا۔ کاروباری حضرات کی دلیل یہ ہے کہ حکومت کو چاہیے کہ وہ اس سرمایے کو صنعت کاروں کے پاس ہی رہنے دے تو وہ اس پیسے کو استعمال میں لا کر نت نئی فیکٹریاں کھول سکتے ہیں، جس سے ان بیروزگاروں کے لیے باعزت روزگار کا بندوبست ہو سکتا ہے۔

اس لحاظ سے تو دانش مند معاشی پالیسی یہی ہو گی کہ سیاست کو معیشت سے دور رکھا جائے، شرح ٹیکس کم کیا جائے اور حکومتی ضابطوں کو کم سے کم حد میں رہتے ہوئے تجارتی منڈیوں کے اپنے اصولوں کو کھل کر اپنی راہ پر چلنے کا اختیار دیا جانا چاہیے۔ نجی سرمایہ کاروں کو جب یہ تسلی ہو کہ ان کی راہ میں سیاسی روڑے نہیں اٹکائے جائیں گے تو وہ اپنا سرمایہ کھل کر لگا پائیں گے۔ اس کے نتیجے میں خوب منافع حاصل ہو گا جو کہ معاشی ترقی اور نمو میں بھرپور کردار ادا کرے گا۔ اس معاشی نمو کا فائدہ ہر شخص۔۔۔ صنعت کاروں اور مزدوروں سبھی کو پہنچے گا۔ یہاں تک کہ خود حکومت کو بھی بغیر کسی تردد اور محنت کے خوب فائدہ حاصل ہو سکتا ہے۔ آزاد تجارتی منڈیوں کا یہ نظریہ۔۔۔ بلکہ کہیے عقیدہ آج کل سرمایہ دار ممالک میں بہت ہی عام ہے اور طرز سوچ کا مظہر ہے۔ آزاد تجارتی منڈیوں کے حامی جس زور و شور سے بیرون ملک فوجی مہمات پر تنقید کرتے ہیں، وہ اتنے ہی جوش و خروش سے اندرون ملک فلاح و بہبود کے منصوبوں پر بھی ناک بھنویں چڑھاتے ہیں۔ وہ حکومتوں کو ایک ہی مشورہ دیتے ہیں کہ بھئی، تم رہنے دو۔۔۔ تم کچھ بھی نہ کرو۔ تجارتی منڈیوں کو آزادی سے کام کرنے دو۔

لیکن بات یہ ہے کہ اپنی بھرپور شکل میں۔۔۔ آزادانہ تجارت اور آزاد منڈیوں پر یقین رکھنا سراسر سادہ لوحی ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی شخص سانتا کلاز کے وجود پر دل و جان سے یقین رکھتا ہو۔۔۔ یعنی یہ بچگانہ یقین ہے۔ سیاسی تعصب اور طرفداری سے پاک آزاد تجارتی منڈی نامی کوئی شے سرے سے وجود ہی نہیں رکھتی۔ آج سب سے اہم معاشی وسائل دراصل مستقبل میں بھروسے کی شکل میں پائے جاتے ہیں اور مستقبل میں بھروسے کے معاشی وسائل کو ہر دم دنیا بھر میں چوراچکوں اور نیم حکیموں سے خطرہ لاحق رہتا ہے۔ یہ تجارتی منڈیاں بذات خود دنیا کو فراڈ، چوری، تشدد اور دہشت سے چھٹکارا نہیں دلا سکتیں۔ یہ اصل میں سیاسی نظاموں کی ذمہ داری ہے کہ وہ دنیا بھر میں ایسے چوراچکوں، دہشت گردوں اور فراڈیوں کے خلاف قانونی اور معاشی پابندیاں عائد کر کے ایسی ایسی پولیس، جیلیں اور عدالتیں بنائے جو قانون کے رکھوالے ہوں۔ جب شہنشاہ اور صدور وغیرہ اپنا فرض پورا نہ کر کے تجارتی منڈیوں کو منظم کرنے میں ناکام ہوں گے تو اس سے بھروسے اور ساکھ کو نقصان پہنچے گا۔ بھروسا اور اعتماد کھو دیا تو کریڈٹ بتدریج سکڑتا جائے گا اور یوں معیشت سست روی اور کساد بازاری۔۔۔ یعنی مندی کا شکار ہو سکتی ہے۔ دنیا نے 1719ء کے مسیسیپی بلبلے نامی معاشی بحران سے بھی یہی سبق سیکھا ہے۔ جو یہ سبق بھول گئے تھے، انھیں 2007ء میں امریکہ میں رئیل اسٹیٹ کے بلبلے سے یہ سبق دوبارہ یاد کروا دیا گیا ہے۔

سرمایہ داروں کی جہنم

تجارتی منڈیوں کو آزادی سے جڑے خطرے کی ایک اور بنیادی وجہ بھی ہے۔ ایڈم سمتھ نے یہ سکھایا تھا کہ ایک موچی اپنی زائد آمدن کو مزید معاونین اور مدد گاروں کو بھرتی کرنے میں استعمال کرے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خود غرضانہ لالچ، سب کے لیے فائدہ مند ثابت ہو سکتی ہے کیونکہ منافع اور آمدن پیداوار کو بڑھانے اور نئے ملازمین کو بھرتی کر کے مزید منافع کمانے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔
لیکن اس وقت کیا ہو گا جب ایک لالچی موچی اپنا منافع بڑھانے کے لیے ملازمین کی تنخواہوں میں کٹوتی کرنا شروع کر دے؟ اس کا معیاری جواب تو یہ ملتا ہے کہ آزاد تجارتی منڈی، ملازمین کے تحفظ کی ضامن ہو گی۔ اگر ہمارا نامی گرامی موچی تنخواہ تو کم دے لیکن اس کے تقاضے بہت زیادہ ہوں تو بہترین ملازمین جلد ہی قدرتی طور پر اس کی نوکری چھوڑ کر حریفوں کی دکان پر بیٹھ جائیں گے جو اس سے بہتر حالات فراہم کرتے ہیں۔ اب اس جابر اور لالچی موچی کو اپنے کیے کی سزا مل جائے گی کیونکہ اس کے پاس بدترین ملازمین باقی رہ جائیں گے۔۔۔ یا اس کے سبھی ملازمین اور مدد گار ساتھ چھوڑ جائیں گے۔ اب اس کے لیے دو ہی صورتیں ہیں۔۔۔ یا تو اپنا قبلہ درست کرے ورنہ کاروبار سے ہاتھ دھولے۔ اس کی اپنی لالچ اس کو ملازمین کے ساتھ بہتر سلوک روا رکھنے پر چار و ناچار مجبور کرتی رہے گی۔
نظریاتی طور پر تو یہ ایک بلٹ پروف اصول ہے لیکن عملی طور پر گولیاں کسی کا لحاظ نہیں کرتیں اور ہر کسی کے آر پار ہو جاتی ہیں۔ شہنشاہوں، صدور اور پادریوں کی عملداری سے باہر مکمل طور پر آزاد تجارتی منڈیوں میں حریص سرمایہ دار نہایت آسانی کے ساتھ اجارہ داری قائم کر سکتے ہیں۔ وہ مزدوروں اور ملازمین کے خلاف گٹھ جوڑ بھی کر لیتے ہیں۔ اگر کسی ملک کی تمام جوتے کی فیکٹریوں کو کوئی ایک کارپوریشن کنٹرول کرتی ہو یا ملک کی تمام جوتا فیکٹریوں کے مالکان مل کر تنخواہوں میں کٹوتی کا فیصلہ کر لیں تو مزدوروں اور ملازمین کے لیے راستے بدل کر نئی جگہوں پر نوکری اختیار کر کے بہتری کی امید کے سبھی راستے مسدود ہو جاتے ہیں۔
اس سے بھی بدتر یہ ہو سکتا ہے کہ لالچی سرمایہ دار اپنے ملازمین کی آزادی اور نقل و حرکت پر بھاری قرضوں یا معاشی غلامی کی صورت قدغن لگا سکتے ہیں۔ قرون وسطیٰ کے اواخر میں عیسائیت پر یقین رکھنے والے یورپ میں غلامی کا تصور تقریباً معدوم ہو چکا تھا۔ لیکن جدید دور کے اوائل دنوں سے ہی یورپی سرمایہ دار ایک دفعہ پھر بحر اوقیانوس کی تجارتی راہداریوں پر بھرپور طریقے سے غلاموں کی منڈیاں چلا رہے تھے۔ اس قہر اور بدبختی کی اصل وجہ یورپ کے جابر بادشاہ یا نسل پرستانہ نظریات نہیں بلکہ ان تجارتی راہداریوں پر مادر پدر آزاد تجارتی قوتوں کا تسلط تھا۔
جب یورپیوں نے امریکہ فتح کر لیا تو انھوں نے یہاں سونے چاندی کی کانیں کھول دیں اور دوسری جانب گنے، تمباکو اور کپاس کی شجرکاریاں اگانے کا بندوبست کیا۔ یہ کانیں اور شجرکاریاں امریکی پیداوار اور برآمدات کا سب سے بڑا ذریعہ بن گئیں۔ اس ضمن میں

گنے کی شجر کاریاں تو بالخصوص اہم تھیں۔ قرونِ وسطیٰ کے دور میں یورپیوں کے لیے چینی تعیش اور تکلف کا سامان ہوا کرتی تھی۔ وہ مشرقِ وسطیٰ سے مہنگے داموں چینی درآمد کرتے تھے اور اس کا استعمال صرف لطیف کھانوں اور روغن مار ادویات میں مخفی جزو کے طور پر کیا جاتا تھا۔ جب امریکہ میں بڑے پیمانے پر گنے کی شجر کاریوں کا بندوبست ہو گیا تو چینی کی بھاری کھیپ یورپ کی منڈیوں میں پہنچنا شروع ہو گئیں۔ یورپ میں چینی کی قیمت گرتی چلی گئی اور یہاں لوگوں کو جیسے چینی کی لت پڑ گئی۔ میٹھے کی اس لت کو پورا کرنے کے لیے طرح طرح کے کاروباری سامنے آ گئے جو بڑی مقدار میں میٹھی گولیاں، مٹھائیاں، کیک، بسکٹ، چاکلیٹ، کینڈی اور میٹھے مشروبات جیسے کافی، چائے اور کوکو وغیرہ بنا کر بیچنا شروع ہو گئے۔ انگریزوں کے یہاں سالانہ اوسط پر چینی کا فی کس استعمال سترھویں صدی کے اوائل میں صفر سے بڑھ کر انیسویں صدی کے اوائل میں آٹھ کلو گرام تک پہنچ گیا۔

تاہم، گنے کی کاشت اور چینی نکالنے کا عمل انتہائی محنت اور جفاکشی کا متقاضی تھا۔ کوئی بھی شخص ملیریا کی بیماری سے پُر گنے کے کھیتوں میں تپتے سورج تلے دن بھر گرم علاقوں میں مزدوری کے لیے تیار نہیں ہوتا تھا۔ معاہدوں پر کام کرنے والے مزدور اس کام کی اتنی اجرت مانگتے تھے کہ یہ جنس اس قدر مہنگی ہو جاتی کہ بڑے پیمانے پر اس کا عوامی استعمال ممکن ہی نہ رہتا۔ چنانچہ، ان تجارتی عوامل کے آگے مجبور، منافع اور معاشی نمو کے حریص یورپی شجر کاریوں کے مالکان نے ایک دفعہ پھر غلاموں کی تجارت کی طرف رجوع کرنے کا فیصلہ کیا۔

سولھویں سے انیسویں صدی کے دوران، ایک محتاط اندازے کے مطابق امریکہ میں تقریباً ایک کروڑ افریقی غلاموں کو درآمد کیا گیا۔ ان میں سے ستر فیصد گنے کی شجر کاریوں پر مشقت کرنے کے لیے مختص تھے۔ ان کی مشقت اور مزدوری کے حالات انتہائی سخت اور ناگفتہ بہ تھے۔ زیادہ تر افریقی غلام انتہائی بدترین اور مختصر عمر پاتے تھے جبکہ لاکھوں کی تعداد میں افریقی سیاہ فام پکڑائی میں یا پھر افریقہ کے اندرون سے امریکہ کے ساحلوں تک پہنچنے کے دوران ہی ہلاکت کا شکار ہو جاتے تھے۔ یہ سب کیوں؟ صرف اس لیے کہ یورپی میٹھی چائے اور بسکٹ کا مزہ اٹھائیں اور چینی کے بیوپاری بھاری منافع کما سکیں؟ یہ سوچ کر ہی گھن آتی ہے۔

غلاموں کی یہ تجارت کسی ریاست اور حکومت کی عملداری میں نہیں آتی تھی۔ یہ خالصتاً ایک آزاد معاشی کاروبار تھا جو آزادانہ تجارت کے نظریے اور معیشت کے سرد اور انتہائی سفاک طلب اور رسد کے اصول پر قائم تھا۔ غلاموں کی تجارت کرنے والی نجی کمپنیاں ایمسٹرڈیم، لندن اور پیرس کی سٹاک ایکسچینوں پر حصص کی خرید و فروخت کرتی تھیں۔ یورپیوں کا متوسط طبقہ ان حصص کی خرید و فروخت میں سرمایہ لگا کر ہمیشہ ہی منافع کے پیچھے بھاگتے نظر آتے تھے۔ اسی پیسے کے بل بوتے پر یہ کمپنیاں بحری جہاز خریدتی تھیں، ملاحوں اور سپاہیوں کی بھرتی کی جاتی تھی، افریقہ میں غلام خریدے جاتے تھے اور امریکہ تک ترسیل ممکن ہوتی تھی۔ امریکہ پہنچ کر یہ غلام شجر کاریوں کے مالکان کو فروخت کر دیے جاتے تھے۔۔۔ اس رقم یا سودے سے شجر کاریوں کی مصنوعات جیسے چینی، کوکو، کافی، تمباکو، کپاس اور رم

وغیرہ کی خرید کی جاتی تھی۔ یہ مصنوعات انھی بحری جہازوں پر لاد کر واپس یورپ پہنچادیے جاتے تھے۔ یورپ میں چینی اور کپاس وغیرہ معقول قیمت پر فروخت کر کے یہ بحری جہاز ایک دفعہ پھر افریقہ کی طرف نیا چکر لگانے کے لیے روانہ ہو جاتے تھے۔ ان کمپنیوں کے حصص میں کھاتہ دار اس طرز کے انتظام سے بالکل مطمئن تھے۔ کوئی بھی جدید مالیاتی کنسلٹنٹ بتاسکتاہے کہ اٹھارہویں صدی میں غلاموں کی تجارت میں سرمایہ کاری سے حاصل ہونے والا سالانہ چھ فیصد کی شرح سے منافع کی حیثیت مالیات میں کیارہا کرتی ہوگی؟

یہ آزادانہ تجارت پر مبنی سرمایہ داری کی صرف ایک مثال ہے۔ آزادانہ تجارت کی سرمایہ داری کبھی بھی منافع کے جائز حصول اور منصفانہ تقسیم کی ضمانت نہیں دیتی۔ اس کے برعکس زیادہ سے زیادہ منافع کی خواہش اور پیداوار کی تمنالوگوں کو ہر اس شے کی معقولیت سے اندھا کر دیتی ہے جو ان کی راہ میں کھڑے ہونے کی جرات کرتے ہیں۔ جب نمو اور ترقی ہی برتر اور اعلیٰ مقصد بن جائے تو پھر کسی بھی طرح کی، ہر اخلاقی قدر اور اصول بے معنی ہو جاتے ہیں۔ یہ طرز باآسانی تباہی اور بربادی کی طرف لے جاسکتی ہے۔ بعض مذاہب جیسے عیسائیت اور نازیت وغیرہ نے صرف نفرت کی بناء پر دیسوں لاکھ لوگوں کے خون سے ہاتھ رنگے ہیں۔ سرمایہ داری نظام نے تو کروڑوں لوگوں کو لالچ اور بے اعتنائی کی بناء پر موت کے منہ میں دھکیل رکھا ہے۔ بحراوقیانوس کی تجارتی راہداریوں پر غلاموں کی تجارت افریقیوں کے خلاف نسل پرستانہ نفرت کا نتیجہ نہیں تھی۔ وہ عام لوگ جو اس کاروبار کے حصص خریدتے تھے، وہ بروکر جو حصص فروخت کرتے تھے اور وہ منیجر اور ملازمین جو اس سفاک کاروبار کا عملی طور پر حصہ رہے ہیں۔۔۔ ان میں سے کسی بھی شخص نے کبھی بھی افریقیوں کے بارے سوچنے کی زحمت نہیں کی۔ افریقی غلاموں کے بارے تو شجر کاریوں کے مالکان بھی سوچنا گوارا نہیں کرتے تھے۔ بہت سے مالکان تو اپنی شجر کاریوں سے دور دراز بسر رکھتے تھے اور انھیں صرف اور صرف ان شجر کاریوں کے کھاتوں میں منافع اور نقصان کی تفصیلات سے غرض رہا کرتی تھی۔

یہ یادرکھنا انتہائی ضروری ہے کہ بحراوقیانوس کے تجارتی راستوں پر غلاموں کی تجارت واحد لغزش نہیں ہے۔ پچھلے ابواب میں بنگال کے عظیم قحط بارے ذکر آیا تھا۔۔۔ اس کی حرکیات بھی یہی تھیں۔ برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی کو ایک کروڑ بنگالیوں کی زندگی سے زیادہ اپنے منافع اور آمدن کی فکر رہا کرتی تھی۔ ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوجی مہمات میں سرمایہ لگانے والے کون تھے؟ یہ ہالینڈ کے وہ باشندے تھے جو اپنے بچوں سے خوب پیار کرتے تھے، باقاعدگی سے خیرات دیتے تھے، نفیس موسیقی کے دلدادہ اور مہذب معاشرے میں فنون لطیفہ سے شغف رکھتے تھے۔ تاہم، انھیں جاوا، سماٹرا اور مالاکا کے باشندوں پر آفت اور مصیبت سے کوئی غرض نہیں تھی۔ اس طرح کے دوسرے بے شمار جرائم اور بد اطوار ہیں جو جدید معیشت کی نمو اور ترقی میں کلیدی کردار ادا کرتے آئے ہیں۔

انیسویں صدی میں بھی سرمایہ دارانہ نظام کی اخلاقی قدروں میں کوئی بہتری دیکھنے میں نہیں آئی۔ صنعتی انقلاب نے یورپ کے طول و عرض کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اب بھی سرمایہ داروں اور بینکاروں کی جیبیں تو خوب بھر گئیں لیکن اس انقلاب نے لاتعداد مزدوروں

اور کارکنوں کی زندگیوں کو بدحال غربت کے منہ میں دھکیل دیا۔ یورپی نوآبادیاتی خطوں میں تو حالات اس سے بھی کہیں زیادہ بدتر تھے۔ 1876ء میں بیلجیم کے شہنشاہ لیوپولڈ دوم نے ایک غیر سرکاری، خلق دوست تنظیم کی بنیاد رکھی جس کا مقصد وسطی افریقہ میں دریائے کانگو کے کنارے پر جاری غلاموں کی تجارت کے خلاف جدوجہد کرنا تھا۔ اس تنظیم کے ذمے یہ کام بھی لگایا گیا کہ وہ اس خطے کے باسیوں کی حالت زار بہتر کرنے کے لیے سہولیات کی فراہمی جیسے سڑکوں، سکولوں اور ہسپتالوں کی تعمیر کو یقینی بنائے۔ 1885ء میں یورپی طاقتیں اس تنظیم کو دریائے کانگو کے تئیس لاکھ مربع کلومیٹر طاس کا کنٹرول حوالے کرنے پر رضامند ہو گئیں۔ یہ خطہ رقبے کے لحاظ سے بیلجیم کے مقابلے میں پچھتر گنا بڑا تھا۔ اس خطے کا نام 'آزاد ریاست کانگو' رکھا گیا۔ تب اس خطے کے تقریباً دو یا تین کروڑ باسیوں کی رائے حاصل کرنے کا کسی کو خیال نہیں آیا۔

اس 'خلق دوست' تنظیم نے جلد ہی ایک تجارتی کارجوئی کی شکل اختیار کر لی جس کا مقصد صرف اور صرف نمو اور منافع کمانا تھا۔ سکولوں اور ہسپتالوں کی تعمیر کا ایجنڈا بھلا دیا گیا اور بجائے یہ کہ دریائے کانگو کا یہ طاس کانوں اور شجرکاریوں سے بھر گیا۔ ان شجرکاریوں اور کانوں کا انتظام بیلجیم کے حکام کے ہاتھ میں تھا جو مقامی آبادیوں پر خوب جبر کرتے تھے اور انتہائی بے رحمی سے استحصال کے مرتکب تھے۔ یہاں ربڑ کی صنعت تو بالخصوص بدنام تھی۔ دنیا بھر میں ربڑ انتہائی تیزی کے ساتھ ایسا صنعتی خام مال بن چکی تھی جس کی طلب بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ کانگو کی آمدن میں ربڑ کی برآمدات کا بڑا ہاتھ تھا۔ وہ افریقی دیہاتی جو ربڑ جمع کرتے تھے، ان سے آئے دن زیادہ سے زیادہ کوٹے کا تقاضا کیا جاتا تھا۔ وہ دیہاتی جو اس کوٹے پر پورا اترنے میں ناکام رہتے۔۔۔ ان کو اس 'کاہلی' پر سخت جسمانی سزائیں دی جاتی تھیں۔ ان کے بازو کاٹ دیے جاتے تھے اور بسا اوقات پورے کے پورے گاؤں کو اجتماعی طور پر ذبح کر دیا جاتا تھا۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق 1885ء سے لے کر 1908ء کے بیچ عرصے میں ترقی اور منافع کی اس دوڑ میں ساٹھ لاکھ افراد (تب کانگو کی بیس فیصد آبادی) اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ بعض اندازوں کے مطابق یہ تعداد تقریباً ایک کروڑ تک ہے۔

1908ء کے بعد اور 1945ء کے بعد تو بالخصوص سرمایہ دارانہ نظام کی لالچ کو لگام آئی ہے۔۔۔ جس کی بڑی وجہ اشتراکیت کا خوف تھا۔ لیکن اس کے باوجود ناانصافی اور ظلم آج بھی قابو سے باہر ہے۔ 2014ء کا معاشی کیک، 1500ء کے معاشی کیک سے ہر لحاظ میں بڑا ہے لیکن اس کی تقسیم اس قدر غیر یکساں ہے کہ آج بھی بہت سے افریقی دہقان اور انڈونیشیائی مزدور دن بھر کی مشقت کے بعد شام کو گھر لوٹتے ہیں تو انھیں اپنا پیٹ بھرنے کے لیے 500 برس قبل بسر رکھنے والے آباؤ اجداد کے مقابلے میں انتہائی کم خوراک میسر آتی ہے۔ جیسے زرعی انقلاب، ویسے ہی جدید معیشت کی ترقی اور نمو بھی غالباً ایک بہت بڑا افراڈ بن کر نکلے گا۔ بنی نوع انسان اور عالمی معیشت غالباً نمو پاتی رہے گی لیکن بہت سے افراد کا یہ ہے کہ ان کے حصے میں بھوک اور خواہشات کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔

اس تنقید کے جواب میں سرمایہ دارانہ نظام کے جواب دو ہیں۔ پہلا یہ کہ سرمایہ داری نظام نے ایک ایسی دنیا تخلیق کر لی ہے جس کو چلانے کا گر صرف اور صرف سرمایہ کار ہی جانتے ہیں۔ اس دنیا کو مختلف طریقے سے منظم کرنے کا جو دوسرا لیکن واحد سنجیدہ طریقہ دریافت ہوا تھا، وہ اشتراکیت ہے۔ اشتراکیت تو سرمایہ داری نظام کے مقابلے میں ہر لحاظ سے اتنا بد تر ثابت ہوا ہے کہ کسی ذی شعور انسان کے لیے اس کو دوبارہ لاگو کرنے کی ہمت اور نہ ہی خواہش پیدا ہوئی ہے۔ 8500 قبل مسیح میں زرعی انقلاب برپا ہونے پر لوگ ٹسوے تو بہا سکتے تھے لیکن اس وقت تک زراعت کو ترک کرنے میں بہت دیر ہو چکی تھی۔ اسی طرح، آج سرمایہ داری کو بھلے ناپسند کیا جاتا ہو لیکن ہم اس کے بغیر بسر کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتے۔

سرمایہ داری نظام پر تنقید کا دوسرا جواب یہ ہوتا ہے کہ بھئی، ہمیں صرف صبر اور انتظار کرنے کی ضرورت ہے۔ سرمایہ دار جس 'جنت' کا وعدہ کرتے ہیں۔۔۔ وہ بس قریب ہی ہے۔ یہ درست ہے کہ غلاموں کی تجارت، نو آبادیوں میں جبر اور مزدور طبقے کے استحصال جیسی غلطیاں ضرور سرزد ہوئی ہیں لیکن ہم نے ان غلطیوں سے سبق بھی تو سیکھا ہے۔ اگر ہم تھوڑا سا مزید انتظار کر لیں اور اس معاشی کیک کو کچھ مزید بڑا ہو لینے دیں تو جلد ہی ہر کسی کو اس کیک کا بہتر اور حق پر مبنی ٹکڑا میسر آ ہی جائے گا۔ اس مال غنیمت کی تقسیم مساوات پر تو شاید مبنی نہ ہو لیکن اتنی ضرور ہو گی جو ہر مرد، عورت، بچے۔۔۔ بلکہ کانگو کے باسیوں کو مطمئن کرنے کے لیے بھی کافی ہو گی۔

تاہم، اس امر میں کوئی شک نہیں ہے کہ بہتری کی چند صورتیں ضرور ابھر کر سامنے آئی ہیں۔ کم از کم خالصتاً مادی اصولوں کے تحت تو یہ درست ہے۔ ان میں چند جیسے دنیا بھر میں غربت میں کمی، سہولیات کی فراہمی، اوسط عمر، بچوں کی شرح اموات میں کمی اور غذائی قلت میں کمی وغیرہ کے اشاریے صحت مند رجحان کی طرف نگاہ کرتے ہی ہیں۔ مثال کے طور پر 2014ء میں اوسط انسانی معیار زندگی، ہر لحاظ سے 1914ء کے مقابلے میں کہیں بہتر ہے۔۔۔ حالانکہ انسانی آبادی میں ان سو برسوں کے دوران تقابلی لحاظ سے بے انتہا اضافہ ہو چکا ہے۔

اس کے باوجود، کیا یہ معاشی کیک بے انتہا انداز میں بڑھنے کی صلاحیت رکھتا ہے؟ یہ ایک کیک ہے۔ کیک بنانے کے لیے خام مال اور توانائی وغیرہ کی ضرورت ہوتی ہی ہے۔ تقدیر اور انجام کے پیغامبر متنبہ کرتے رہتے ہیں کہ جلد یا بدیر۔۔۔ انسانوں میں خردمند آدمی کی نوع اس کرہ ارض پر دستیاب خام مال اور توانائی کے وسائل کو معاشی کیک تیار کرتے کرتے بالضرور ہی سب کا سب خرچ کر دیں گے۔ جب مزید خام مال اور توانائی دستیاب نہ ہو گی تو پھر کیا ہو گا؟

صنعت کا پہیہ

مستقبل پر اعتماد اور بھروسے کے ساتھ ساتھ سرمایہ کاروں کی منافع اور آمدن کو پیداواری کاموں میں خرچ کرنے کی دین ہے کہ جدید معیشت نموپاتی ہے۔ لیکن معاشی ترقی کے لیے صرف یہی کافی نہیں ہے بلکہ اس کے لیے توانائی اور خام مال کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ توانائی اور خام مال محدود ہے۔ جب اور اگر یہ دونوں چیزیں ختم ہوجائیں گی تو کہا یہ جاتا ہے کہ پورا نظام دھڑام سے گر جائے گا۔

لیکن ماضی کا ریکارڈ یہ بتاتا ہے کہ توانائی اور خام مال کی رسدی قیود صرف فرضیاتی نظریے کی حد تک ہی پائی جاتی ہیں۔ پچھلی چند صدیوں کے دوران انسانوں کے یہاں توانائی اور خام مال کے استعمال میں بے انتہا اضافہ ہوا ہے اور اس ضرورت کو بدیہی انداز میں گویا جواب کے طور پر پورا کیا جاتا رہا ہے۔ جہاں یہ، وہیں اس عرصے کے دوران انسانوں کو استفادہ حاصل کرنے کے لیے دستیاب وسائل کی مقدار میں درحقیقت کمی کی بجائے بے پناہ اضافہ ہوا ہے۔ جب بھی کبھی توانائی یا خام مال کی قلت کے سبب معاشی ترقی اور نمو میں سست روی کا خدشہ پیدا ہوا ہے، سائنسی اور فنی تحقیق کے لیے پہلے سے بڑھ کر سرمایہ فراہم کیا جاتا رہا ہے۔ اس سرمایہ کاری کا نتیجہ ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی نے کبھی مایوس نہیں کیا اور آئے دن نت نئے، پہلے سے کہیں بڑھ کر وسائل سے بھرپور استفادہ حاصل کرنے کے لیے موثر اور کارگزار طریقے نکالے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی تحقیق کا نتیجہ ہے کہ توانائی اور خام مال کی کئی کئی نئی قسمیں اور شکلیں بھی نکلتی آئی ہیں۔

اس ضمن میں گاڑیوں کی صنعت کی مثال لے لیں۔ پچھلے تین سو برسوں کے دوران انسانوں نے اربوں کی تعداد میں گاڑیاں تیار کی ہیں۔ ان گاڑیوں میں ٹھیلے، ریڑھے، ٹرینیں، کاریں، ٹرک، بسیں، چھکڑے، ہوائی جہاز اور خلائی جہاز بھی شامل ہیں۔ اب یہ سب دیکھ کر خیال آتا ہے کہ شاید اس قدر عظیم اور غیر معمولی دھوڑ دھوپ کے بعد توانائی کے وسائل اور گاڑیاں بنانے کے لیے درکار خام مال کی مقدار ختم ہو کر رہ گئی ہوگی اور آج ہم گویا بس ان دونوں اجزاء کے بچے کھچے زرائعوں پر بمشکل گزارہ کرتے ہوں گے۔ نہیں؟

حقیقت اس کے برعکس ہے۔ وہ یوں کہ 1700ء میں عالمی سطح پر گاڑیوں کی صنعت کا انحصار بے پناہ حد تک صرف لکڑی اور لوہے کے ذخیروں پر رہا کرتا تھا لیکن آج اس صنعت کو کثرت کے ساتھ نئے دریافت شدہ خام مال جیسے پلاسٹک، ربڑ، المونیم اور ٹائٹینیم وغیرہ کے ذخائر دستیاب ہیں۔ ان میں سے کسی شے بارے ہمارے آباؤ اجداد سرے سے کوئی علم نہیں رکھتے تھے۔ 1700ء میں ترکھان اور لوہار ریڑھے اور ٹھیلے ہاتھ سے بناتے تھے لیکن آج یہی کام ٹویوٹا اور بوئنگ وغیرہ جیسی کمپنیوں کی فیکٹریوں میں پٹرولیم اور نیوکلئیر بجلی گھروں سے پیدا ہونے والی توانائی سے چلنے والی مشینیں سرانجام دیتی ہیں۔ یہ صرف گاڑیوں کی نہیں بلکہ تقریباً ہر طرح کی دوسری سبھی صنعتوں میں برپا ہونے والا انقلاب ہے۔ ہم اس غیر معمولی اور بے انتہا پیش رفت کو، صنعتی انقلاب کہتے ہیں۔

صنعتی انقلاب سے قبل کی ہزاری میں انسان پہلے سے ہی توانائی کے وسائل کی کئی اقسام کو استعمال میں لانے کا گر جانتے تھے۔ وہ لکڑی جلا کر لوہے کو پگھلانے، گھروں کو گرم رکھنے اور بھٹیوں کو بھڑکانے کا کام لیتے تھے۔ ہوا کی طاقت کو استعمال کر کے بادبانی کشتیوں پر ہزاروں میل کا سفر طے کرتے تھے اور پن چکیوں سے دریاؤں کے بہاؤ کی طاقت کو استعمال میں لاتے تھے۔ لیکن ان سارے طریقوں کی اپنی معذوریاں اور مسائل رہا کرتے تھے۔ درخت ہر جگہ نہیں ہوتے تھے، ہوا ہمیشہ اور بالخصوص جب ضرورت ہوتی تو نہیں چلتی تھی جبکہ دریاؤں کے بہاؤ کی قوت اسی وقت کار آمد ہوتی تھی جب آپ کی بسر دریا کے کنارے پر ہوتی تھی۔

اس سے بھی بڑا مسئلہ یہ تھا لوگ ایک قسم کی توانائی کو کسی دوسری قسم میں ڈھالنے کا فن نہیں جانتے تھے۔ وہ ہوا اور پہانی کے بہاؤ کی طاقت کو بادبانی کشتیاں چلانے اور چکیوں کو غلہ پسوانے کے لیے تو استعمال کر سکتے تھے لیکن اس کی مدد سے پانی گرم کرنے اور لوہا پگھلانے سے قاصر تھے۔ اسی طرح وہ لکڑیاں جلا کر پیدا ہونے والی حرارت کی توانائی سے چکیوں کو نہیں چلا سکتے تھے۔ اس زمانے میں صرف انسان کے پاس صرف ایک ہی ایسی مشین تھی جو طرح طرح کی توانائیوں کو ایک یا دوسری شکل میں ڈھال کر استعمال کر سکتی تھی۔ یہ نامیاتی اجسام تھے۔ مثال کے طور پر، انہضام کے قدرتی نظام کی دد سے انسانوں اور دوسرے جانوروں کے اجسام نامیاتی ایندھن یعنی خوراک اور پانی کو توانائی میں بدل کر عضویاتی حرکت کے لیے استعمال کرتے تھے۔ مرد، عورتیں اور حیوانات غلہ اور گوشت استعمال کر کے حراروں کو جلاتے تھے اور اس توانائی کو ریڑھوں کو دھکیلنے اور ہل چلانے کے لیے استعمال کرتے تھے۔

اب چونکہ توانائی کو ایک یا دوسری صورت ڈھالنے کی اہلیت رکھنے والے دستیاب آلات صرف انسانی اور دوسرے حیوانی اجسام ہی تھے تو اسی لیے تقریباً تمام تر انسانی سرگرمیوں کا دارومدار زور بازو پر رہا کرتا تھا۔ انسانی ہاتھ اور پٹھے ریڑھے اور گھر تعمیر کرتے تھے، بیلوں کی عضویاتی طاقت سے ہل چلائے جاتے تھے اور گھوڑوں کی جسمانی طاقت کو مال ڈھونے کے کام میں لایا جاتا تھا۔ اس زور بازو پر مشتمل نامیاتی مشینوں کو ایندھن فراہم کرنے کا با اعتماد ذریعہ ایک ہی تھا۔ یہ نباتات تھیں۔ نباتات اپنی توانائی سورج سے حاصل کرتے تھے۔ یہ ضیائی تالیف یا فوٹو سینتھیسز کا عمل ہوتا ہے جس کے تحت پودوں شمسی توانائی کو نامیاتی عناصر اور مرکب کی شکل میں جمع کر لیتے ہیں۔ یوں، تاریخ میں انسان نے جتنی بھی سرگرمیاں جاری رکھی ہیں ان کے لیے درکار توانائی کی ضروریات اس شمسی توانائی سے پوری کی گئی ہیں جو پودے تالیفی عمل سے جمع کرتے تھے اور انسان اس نامیاتی ایندھن کو استعمال کر کے عضویاتی توانائی اور قوت میں بدل دیتے تھے۔

یوں انسانی تاریخ پر دو چکر ہمیشہ سے ہی اثر انداز چلے آرہے ہیں۔ پہلا چکر نباتات کی نشوونما کا ہے جبکہ دوسرا شمسی توانائی کے بدلتے ہوئے چکر یعنی دن اور رات، گرمی اور سردی کے موسم وغیرہ ہیں۔ جب سورج کی روشنی کم ہو جاتی اور گندم کی کھیتیاں ہری ہوتیں تو انسانوں دستیاب توانائی کی مقدار بھی کم تر ہو جاتی۔ جب کھلیان خالی ہوتے تو ٹیکس جمع کرنے والے حکام کو بھی فراغت مل جاتی۔ ٹیکس جمع نہ

ہوتا تو سپاہی بھی لڑنے سے قاصر رہتے اور یوں بادشاہوں کے لیے امن برقرار رکھنے کے لیے معاہدے طے کرنا لازم ہو جاتا۔ لیکن جب سورج پوری تمازت سے چمکتا تو کھیتوں میں گندم کی فصلیں لہلانے لگتیں اور کھلیان غلے سے بھر جاتے۔ ٹیکس جمع کرنے والے حکام بھاگ بھاگ کر ہنسی خوشی اور دھمکا کر ٹیکس وصول کرتے اور خزانے میں جمع کرواتے جاتے۔ خزانہ بھر جاتا تو سپاہیوں کو بھی اٹکل آجاتی اور وہ شہنشاہِ وقت کے حکم کا انتظار کرتے، اپنی تلواریں چمکاتے پھرتے۔ بادشاہ اپنے وزراء سے مشورہ کرتے اور اگلی عسکری مہم شروع ہو جاتی۔ ہر انسان کا ایندھن شمسی توانائی تھا جو گندم، آلوؤں اور چاول کی شکل میں جمع ہو کر دستیاب رہتا تھا۔

باورچی خانے میں چھپا راز

انسانی تاریخ میں ایک کے بعد دوسری ہزاری چڑھتی رہی۔ ہر روز، دن اور رات۔۔۔ توانائی کی پیداوار سے متعلق تاریخ میں سب سے اہم ایجاد آنکھوں کے سامنے رہی لیکن کسی کو اس کا سرے سے خیال ہی نہیں آیا۔ جب کوئی خاتون خانہ یا باورچی چولہے پر چائے کے لیے کیتلی اور آلو ابالنے کے لیے دیگچی میں پانی چڑھاتی تو یہ جھٹ سے نکل آتی تھی۔ جیسے ہی پانی میں ابال آتا، کیتلی کی موری پھس پھس کرتی اور دیگچی کے اوپر ڈھکن لرزنے لگتا۔ حرارت، حرکت میں بدل جاتی۔ دیگچیوں پر اچھلتے ڈھکن اور کیتلیوں کی پھس پھس سے ہر کوئی تنگ رہتا، بالخصوص جب کوئی دیگچی کو چولہے پر چڑھا کر بھول جاتا تو اس صورت میں تو پانی ہوا میں اڑ جاتا تھا اور شور بھی زیادہ مچتا تھا۔ تاریخ بھر میں کسی کو اس اڑتے ہوئے پانی، اچھلتے ڈھکنوں اور کیتلیوں کی موری سے نکلتی پھس پھس کی اصل طاقت کے امکان کا کبھی خیال ہی نہیں آیا۔

حرارت کو حرکت میں بدلنے کی جزوی کامیابی نویں صدی میں اس وقت ملی تھی جب چین میں بارود ایجاد ہوا تھا۔ پہلے پہل تو بارود کو صرف گولے ہوا میں اچھالنے کے لیے استعمال کرنے کا ہی طریق تھا اور اس بارے اتنی ہی سمجھ عام تھی کہ اسے زیادہ تر آتشیں بم بنانے کے لیے ہی استعمال کیا جاتا تھا۔ لیکن پھر بالآخر غالباً کسی آتشیں بم اور پٹاخے بنانے والے ہی کسی شخص کو یہ خیال آیا ہو گا کہ بارود کو صرف ہوا میں اچھالنے اور آگ بھڑکانے کے لیے ہی نہیں بلکہ اسے ہوا میں اچھالی جانے والی شے کو زبردست طاقت کے ساتھ زمین کے متوازی، گولے کو موسل سے حرکت کرنے کے لیے بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔ یعنی، گولوں کے پیچھے نصب موسلی دستے کو بارود سلگا کر ٹھونکا جائے تو یہ زبردست طاقت سے سامنے کی جانب بھی حرکت کر سکتے ہیں۔ چنانچہ، اسی بنیاد پر نالی دار دستی بندوقیں اور بھاری بھرکم توپ خانے ایجاد ہو کر منظرِ عام پر آنے لگے۔ بارود کی ایجاد اور موثر بندوقوں اور توپ خانے کی ایجاد کے بیچ تب تک چھ سو برس کا زمانہ گزر چکا تھا۔

اس کے باوجود، حرارت کو حرکت میں بدلنے کا خیال اتنا وجدانی تھا کہ بعد اس کے اگلے تین سو برس تک کسی پر سرے سے نزول ہی نہیں ہوا کہ ایسی مشین بھی ایجاد کی جا سکتی ہے جو اشیاء کو حرکت دینے کے لیے حرارت کی توانائی استعمال میں لا سکتی ہے۔ اس نئی ٹیکنالوجی کا جنم برطانیہ میں کوئلے کی کانوں میں ہوا تھا۔ جیسے جیسے برطانوی آبادی میں اضافہ ہوا، جنگلوں کو کاٹ کر ترقی کرتی ہوئی معیشت کے ایندھن کے لیے استعمال کیا جانے لگا جبکہ گھروں اور کھیتوں کے لیے جگہ بنتی چلی گئی۔ ایک وقت ایسا آیا کہ ایندھن کے لیے استعمال کی جانے والی لکڑی کی شدید قلت پیدا ہونا شروع ہو گئی۔ اس قلت پر قابو پانے کے لیے کوئلے کا استعمال عام ہونے لگا۔ اب زیادہ تر کوئلے کی کانیں سیم زدہ علاقوں میں پائی جاتی تھی اور کان کنوں کے لیے بے حد نشیبی سطحوں سے کوئلہ نکالنا بہت مشکل تھا۔ یہ ایسا مسئلہ تھا جس کا حل تلاش کرنا ضروری ہو چکا تھا۔ یوں 1700ء کے آس پاس، برطانوی کوئلے کی کانوں میں سے ایک شور سنائی دینے لگا۔ صنعتی انقلاب کا نقیب، یہ شور پہلے پہل تو بہت ہی خفیف سا تھا لیکن پھر یہ ہر گزرتی دہائی کے ساتھ بلند سے بلند ہوتا گیا اور یہاں تک کہ کانوں کو بہرہ کر دینے والے کرخت شور میں بدل گیا اور پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ یہ شور بھاپ سے چلنے والے انجن کا شور تھا۔

بھاپ سے چلنے والے انجنوں کی کئی اقسام ہوتی ہیں لیکن اصول ایک ہی ہوتا ہے۔ کسی بھی قسم کا ایندھن جیسے لکڑی، کوئلہ وغیرہ جلا کر حرارت پیدا کی جائے۔ اس حرارت سے پانی کو ابالا جائے تو بھاپ پیدا ہوتی ہے۔ جوں جوں بھاپ بڑھتی جاتی ہے، وہ پسٹن کو دھکیلتی ہے۔ پسٹن حرکت کرتا ہے اور یوں ہر وہ شے جو پسٹن کے ساتھ جڑی ہو۔۔۔ حرکت کرنے لگتی ہے۔ یوں، حرارت۔۔۔ حرکت میں بدل جاتی ہے۔ اٹھارہویں صدی میں برطانوی کوئلے کی کانوں میں اس پسٹن کو ایک پمپ کے ساتھ جوڑا جاتا تھا جو کانوں کے گہرے اور نشیبی حصوں کی تہہ میں جمع شدہ پانی کو کھینچ کر نکالنے کے کام آتا تھا۔ اولین انجن انتہائی درجے کے بے صلاحیت اور مجہول ہوا کرتے تھے۔ ان انجنوں کو چلانے کے لیے بڑی مقدار میں کوئلہ جلانا پڑتا تھا پھر کہیں جا کر پانی کی معمولی سی مقدار پمپ کے ذریعے باہر نکل پاتی تھی۔ لیکن چونکہ کوئلے کی ان کانوں میں ایندھن کی فراہمی کوئی مسئلہ نہیں تھا تو کسی کو اس مجہولیت سے کوئی غرض نہیں تھی۔

اس کے بعد آنے والی دہائیوں میں برطانیہ کے کاروباریوں نے سائنسی تحقیق کے ذریعے بھاپ سے چلنے والے انجن کی کارکردگی بڑھانے کے لیے خوب سرمایہ کاری کی۔ اس کو کوئلے کی کانوں سے نکال کر کھڈیوں اور سیلونوں کے ساتھ جوڑ دیا۔ اس سے ٹیکسٹائل کی پیداوار میں انقلاب آ گیا اور اب پہلے سے کہیں بڑھ کر سستے کپڑے کی پیداوار ممکن ہو گئی۔ یہ ایسے ہی تھا کہ جیسے آنکھ جھپکتے ہی، برطانیہ پوری دنیا کی ورکشاپ بن گیا۔ بھاپ سے چلنے والے انجن کو کوئلے کی کانوں سے باہر نکال کر کھڈیوں سے جوڑا گیا تو اس عمل

سے ایک نفسیاتی رکاوٹ بھی دور ہو گئی۔ یعنی، یہ سوچا جانے لگا کہ اگر کوئلہ جلا کر پمپ سے پانی اور کھڈیوں پر کپڑا بنا جا سکتا ہے تو پھر اسی طریقے کو استعمال میں لا کر دوسری چیزوں کو بھی تو حرکت دی جا سکتی ہے؟ یعنی۔۔۔ ریڑھیوں اور ویگنوں کو بھی تو چلایا جا سکتا ہے؟
1825ء میں ایک برطانوی انجنیئر نے بھاپ سے چلنے والے انجن کو کوئلے سے بھری ہوئی ریڑھی کے ڈبوں کو ساتھ ساتھ جوڑ دیا۔ اس انجن نے ان ریڑھی ڈبوں کو لوہے کی ریل پر تقریباً بیس کلومیٹر تک کھینچ کر قریبی بندرگاہ تک پہنچا دیا۔ یہ تاریخ کی پہلی بھاپ سے چلنے والی ریل گاڑی تھی۔ ظاہر ہے، اگر بھاپ سے کوئلے کی نقل و حرکت ممکن تھی تو پھر دوسرے خام مال کو بھی تو لایا، لے جایا جا سکتا تھا؟ پھر، صرف خام مال ہی کیوں۔۔۔ انسانوں کے لیے یوں ہی سفر بھی تو ممکن تھا؟ 15 ستمبر 1830ء کو تاریخ میں پہلی کمرشل ریلوے لائن لیورپول سے مانچسٹر تک کھول دی گئی۔ یہ ریل گاڑی بھی بھاپ کی طاقت سے اسی طرح چلتی تھی جس طرح پانی کھینچنے اور کھڈیوں کی لوموں کو حرکت دی جاتی تھی۔ صرف بیس برس بعد ہی، برطانیہ کے طول و عرض میں ہزاروں کلومیٹر طویل ریل کی پٹڑی بچھ چکی تھی۔
بعد اس کے تو لوگ جنون کی حد تک اس خیال سے چمٹ کر رہ گئے کہ مشینوں اور انجنوں کو توانائی کی ایک قسم کو دوسری میں بدلنے کی صلاحیت ہے۔ یہ تصور عام ہو گیا کہ اگر درست مشین ایجاد کر لی جائے تو دنیا میں کہیں بھی، کسی بھی قسم کی توانائی کو کسی بھی طرح کی ضرورت پوری کرنے کے لیے استعمال کیا جا سکتا تھا۔ مثال کے طور پر جب طبیعیات دانوں کو یہ پتہ چل گیا کہ ایٹم کے اندر توانائی کا بے پناہ ذخیرہ ہوتا ہے تو انھوں نے فوراً ہی اس توانائی کو نکال کر بجلی بنانے، آبدوزیں چلانے اور شہروں کے شہر برباد کرنے کی تدبیریں سوچنا شروع کر دیا۔ چین کے کیمیا گروں نے بارود دریافت کیا تو ترکوں کے ہاتھ اس بارود کے قسطنطنیہ کی فصیلوں پر گولوں کی صورت بمباری تک چھ سو برس کا عرصہ لگ گیا۔ لیکن جب آئن سٹائن نے یہ دریافت کر لیا کہ کسی بھی کمیت کو توانائی میں بدلا جا سکتا ہے تو اس وقت سے لے کر ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم گرانے اور پوری دنیا میں ایٹمی بجلی گھروں کا جال بچھنے میں صرف چالیس برس کا عرصہ لگا۔
اسی طرح، تاریخ میں ایک دوسری انتہائی اہم دریافت آتش گیر انجن کی تھی۔ اس دریافت نے صرف ایک آدھ نسل کے اندر ہی انسانی نقل و حمل میں انقلاب برپا کر دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے معدنی تیل یعنی مائع پٹرولیم اس دنیا کی نئی سیاسی طاقت بن گئی۔ انسان کو گاڑھے پٹرولیم بارے ہزاروں برس سے جانکاری تھی۔ یہ چھتوں کو ٹپکنے اور پہیوں کو چپڑنے وغیرہ کے کام آتا تھا۔ لیکن صرف سو برس پہلے تک کسی کو یہ خیال نہیں آیا کہ اس کو کئی دوسرے مقاصد کے لیے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ غالباً تب تیل کے بدلے خون بہانے کا تصور ماضی کے لوگوں کے لیے مضحکہ خیز رہا کرتا ہو گا۔ اراضیوں، علاقوں، سونے، مرچ مسالے اور غلاموں کے لیے تو جنگ لڑی جا سکتی تھی لیکن تیل پر کوئی کیوں جدل کرے؟

اسی طرح بجلی کا قصہ تو اور بھی زیادہ تعجب خیز ہے۔ دو سو برس قبل معیشت میں بجلی کا کوئی کردار نہیں تھا اور یہ صرف اور صرف غیر واضح سائنسی تجربات اور جادو گروں کے سستے کرتبوں کے لیے استعمال ہوا کرتی تھی۔ یہ تو صرف چند ایجادات کا نتیجہ ہے کہ بجلی کا جن چراغ میں اتر کر روشن ہو گیا۔ آج ہم انگلی کے ایک اشارے سے کتابیں چھاپ لیتے ہیں، سلے کپڑوں کے ڈھیر لگا دیتے ہیں، سبزیوں کو تازہ رکھتے ہیں اور آئس کریم ٹھنڈی ہی رہتی ہے، رات کا کھانا چٹکی میں تیار ہو جاتا ہے اور قاتلوں کو فٹ سے موت بھی مل جاتی ہے۔ یہ ہماری سوچ کو جمع بھی کرتی ہے اور ہماری مسکراہٹوں کو ہمیشہ کے لیے محفوظ بھی کر سکتی ہے، ہماری راتیں اسی کی بدولت جاگتی ہیں اور ہم ٹی وی پر ان گنت ڈرامے اور پروگرام بھی دیکھ سکتے ہیں۔ ہم انسانوں میں صرف چند ہی ایسے ہوں گے جو یہ سمجھ سکتے ہیں کہ بجلی یہ سارے کام کیسے کرتی ہے لیکن ہم میں شاید کوئی بھی ایسا نہیں ہو گا جو آج بجلی کے بغیر زندگی کا تصور بھی کر سکتا ہو۔

توانائی کا سمندر

صنعتی انقلاب کے قلب میں اصل انقلاب توانائی کے تغیر سے جڑا ہے۔ اس انقلاب کی بدولت ہمیں بار بار یہی باور ہوا ہے کہ ہمیں دستیاب توانائی کی مقدار بے انتہا ہے۔ اس کی کوئی حد نہیں ہے۔ یا صحیح معنوں میں کہا جائے کہ اگر ہمیں اس کی دستیابی میں کوئی حد اور قیود محسوس بھی ہوتی ہے تو اس کی وجہ توانائی کے وسائل نہیں بلکہ خود ہماری لاعلمی ہے۔ ہر چند دہائیوں کے بعد ہم توانائی کا کوئی نہ کوئی منبع نکال ہی لاتے ہیں اور یوں ہمیں دستیاب توانائی کا ذخیرہ بڑھتا ہی جاتا ہے۔
آخر لوگ توانائی کے ختم ہونے کے خوف سے ہر وقت پریشان کیوں رہتے ہیں؟ وہ ایسی کسی آفت کی پیشگوئی کیوں کرتے رہے ہیں جس کی وجہ سے معدنی تیل کے ذخائر ختم ہو جائیں گے؟ حالانکہ، تمام تر حقائق یہی بتاتے ہیں کہ اس دنیا کو توانائی کی کوئی کمی نہیں ہے۔ اگر کسی شے کی کمی ہے تو وہ اس ضروری علم کی ہے جو اس توانائی کو استعمال میں لا کر ضروریات کو پورا کر سکے۔ جتنی توانائی معدنی تیل اور پٹرولیم مصنوعات میں جمع ہے، وہ شمسی توانائی کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے جو سورج ہر روز ہمیں بالکل مفت فراہم کرتا ہے۔ وہ بھی یوں ہے کہ سورج کی اصل توانائی کا صرف مہین سا حصہ ہی ہم تک پہنچتا ہے لیکن پھر بھی اس کی ہر سال تقریباً چالیس لاکھ ایگزا جاؤل مقدار ہم تک پہنچتی ہے۔ (جاؤل توانائی کی اکائی ہے۔ ایک جاؤل سے مراد اتنی توانائی ہے جو ایک اوسط سیب کو زمین کی سطح سے ایک گز اوپر اٹھانے کے قابل ہوتی ہے۔ ایک ایگزا جاؤل ایک ارب ارب جاؤلز کے برابر ہوتا ہے)۔ کرہ ارض پر پائے جانے والے سارے نباتات مل کر بھی شمسی تالیف کے عمل سے اس توانائی میں سے صرف 3000 ایگزا جاؤل استعمال کرتے ہیں۔ آج کی تاریخ میں دنیا کی تمام تر انسانی اور صنعتی سرگرمیوں کے لیے ہر سال صرف 500 ایگزا جاؤل درکار ہوتے ہیں۔ یہ توانائی کی صرف اتنی سی مقدار ہے جو سورج سے زمین تک صرف نوے منٹ میں پہنچتی ہے۔ یاد رہے، یہ صرف شمسی توانائی کا قصہ ہے۔ اس کے علاوہ بھی ہمارے ارد

گرد توانائی کے بے پناہ ذخائر بکھرے ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر ایٹمی توانائی، کشش ثقل کی تجاذبی توانائی وغیرہ۔۔۔ کشش ثقل کی تجاذبی توانائی کی واضح مثال تو ہر ماہ قمری کشش کی بدولت سمندری لہروں اور کا نشیب و فراز بھی ہے۔

صنعتی انقلاب سے قبل توانائی کی منڈی میں انسانوں کا سارا دارومدار ایک ہی مصنوعہ یعنی نباتات پر رہا کرتا تھا۔ لوگوں کے پاس توانائی کا ایسا ذخیرہ تھا جو ہر سال 3000 ایگزا جاؤل توانائی فراہم کر سکتی تھی اور اگر ماحول ساز گار ہو تا یعنی نباتات کو نشوونما کا موقع مل جاتا تو یہ ذخیرہ اس سے کہیں زیادہ ہو سکتا تھا۔ اس کے باوجود، نباتات سے حاصل ہونے والی توانائی کو اکھیڑ اور نچوڑ کر نکالنے کی بھی ایک حد تھی۔ صنعتی انقلاب برپا ہوا تو ہمیں پہلی بار یہ احساس ہوا کہ اصل میں ہم توانائی کے ایک بے پایاں سمندر کے ساتھ بسر رکھتے ہیں۔ اس سمندر کی وسعت اتنی زیادہ ہے کہ اربوں بلکہ کھربوں۔۔۔ بلکہ اربوں ارب ایگزا جاؤل توانائی بس یونہی پڑی ہے اور اس سے حاصل ہونے والی قوت کا کوئی اندازہ ہی نہیں ہے۔ ہمیں صرف یہ کرنا ہے کہ اس توانائی سے استفادہ حاصل کرنے کے لیے بہتر سے بہتر پمپ ایجاد کرتے رہیں۔

جب ہم نے توانائی کو قابو کر کے موثر انداز میں ایک یا دوسری صورت بدلنے کا گر سیکھ لیا تو اس سے وہ دوسرا مسئلہ بھی حل ہو گیا جو معاشی ترقی اور نمو کو سست روی کا شکار کر سکتا تھا۔ اگر خام مال کی کمی پیش آجائے تو معاشی نمو ٹھہر جائے گی۔ جب انسانوں نے سستی توانائی کے بے پناہ ذخائر کو قابو میں کر لیا تو خام مال کے ان ذخائر سے بھی نہایت آسانی سے استفادہ حاصل کیا جا سکتا تھا جو اس سے قبل ناقابل رسائی تھے۔ مثال کے طور پر، یہ توانائی پر دسترس ہی ہے جس کی بدولت ہم سربیا کے اجاڑ اور انتہائی دشوار علاقوں سے لوہے کی کان کنی کے قابل ہیں۔ یہی نہیں بلکہ توانائی کی بدولت ہم خام مال کے بے پناہ ذخائر کو دنیا میں جہاں بھی چاہتے، پہنچانے کے قابل ہو گئے۔ مثال کے طور پر برطانیہ کی ٹیکسٹائل ملوں تک آسٹریلیا کی اون نہایت آسانی سے پہنچ جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ سائنسی تحقیق نے ایسا کرشمہ دکھایا کہ خام مال کی بالکل نئی اقسام جیسے پلاسٹک وغیرہ ایجاد ہو گئیں اور اس سے قبل خام مال کے نامعلوم ذخائر جیسے سیلیکون اور ایلومنیم وغیرہ بھی دسترس میں آگئے۔

کیمیادانوں نے ایلومنیم 1820ء میں دریافت کی تھی لیکن اس دھات کو اس کی فلز سے الگ کرنا انتہائی مشکل اور مہنگا کام تھا۔ کئی دہائیوں تک تو ایلومنیم کی قیمت سونے سے بھی زیادہ رہی تھی۔ 1860ء میں فرانس کے شہنشاہ نپولین سوئم نے باقاعدہ حکم جاری کر کے ایلومنیم سے بنی کٹلری تیار کروائی تھی جو اس کے انتہائی معزز مہمانوں کے استعمال کے لیے مختص تھی۔ جبکہ سونے سے بنے چھری اور کانٹے دوسرے مہمانوں کے استعمال میں لائے جاتے تھے۔ لیکن انیسویں صدی کے اواخر میں کیمیادانوں نے ایک ایسا طریقہ ایجاد کر لیا جس سے ایلومنیم کو انتہائی سستے طریقے سے فلز سے الگ کر کے جمع کیا جا سکتا تھا۔ آج، ایلومنیم کی سالانہ پیداوار تقریباً تین کروڑ ٹن

ہے۔ اگر آج نپولین سوئم کو یہ پتہ چل جائے کہ اس کی رعایا کی اولاد ہر روز سستے ایلومنیم کے ورق میں سینڈوچ اور برگر لپیٹ کر کھاتے ہیں اور یہی نہیں بلکہ اسے ہر کھانے کے بعد تلف بھی کر دیتے ہیں تو اس کی حیرانگی دیکھنے لائق ہوتی۔

دو ہزار برس پہلے جب عراقی تمدن میں لوگوں کو جلد کی خشکی کا سامنا ہوتا تو وہ ہاتھوں پر قدرے مہنگا زیتون کا تیل ملتے تھے۔ آج، وہ ہاتھوں پر ملنے کے لیے خوشبودار کریم کی ٹیوب کھول لیتے ہیں۔ مندرجہ ذیل ایک ایسی ہی معمولی خوشبودار کریم کے اجزاء کی فہرست ہے جو میں نے آج ہی ایک قریبی سٹور سے سستے داموں خریدی ہے:

'ڈی آئیونائزڈ پانی، شحمی تیزاب، گلیسرین، روغنی تیزاب، پروپلین گلائکول، آئیسوپروپائل جائلفل تیزاب کائمک، پناکس جنسنگ نامی جڑی بوٹی، خوشبو، سیٹائل الکوحل، ٹرائی ایتھائل امائن، ڈائی میٹی کون، سرخ گوندنی، شمالی عندالدب جھاڑی کا نچوڑ، گودے دار بیری کے پتے کا نچوڑ، میگنیشیم آسکوربائل فاسفیٹ، امڈازولیڈائل یوریا، میتھائل پیرابن، کافور، پروپائل پیرابن، ہائیڈرو آکسی آئسو ہیکسی 3 سائیکلو ہیگزین کاربوکسی ڈی ہائیڈ، ہاڈروکسی سٹرونیلائل، بیوٹائل فینائل میتھائل پروپینول، سٹرونینولول، لیمونین، گیرینول اور مہین مقدار میں دوسرے اجزاء'

ان میں سے تقریباً سارے اجزاء پچھلی دو صدیوں کے دوران ایجاد یا دریافت کیے گئے ہیں۔

پہلی جنگ عظیم کے دوران جرمنی پر سخت ناکہ بندی کر دی گئی تو وہاں خام مال بالخصوص شورے کی سخت قلت پیدا ہو گئے۔ شورا، بارود اور دوسرا آتش گیر مادہ بنانے کے لیے انتہائی اہم جز ہوتا ہے۔ شورے کے سب سے اہم اور وسیع ذخائر چلی اور ہندوستان میں پائے جاتے ہیں لیکن جرمنی میں اس کا کوئی ذخیرہ نہیں ہے۔ یہ درست ہے کہ شورے کی جگہ ایمونیا استعمال کیا جا سکتا ہے لیکن وہ انتہائی مہنگا ہوتا ہے۔ جرمنوں کی خوش قسمتی یہ تھی کہ ان کے ایک شہری۔۔۔ فرٹز ہاربر نامی یہودی کیمیادان نے 1908ء میں ایک ایسا کیمیائی عمل ایجاد کیا تھا جس کی بدولت ایمونیا بغیر کسی تردد اور انتہائی سستے میں ہوا سے پیدا کیا جا سکتا تھا۔ جب جنگ چھڑی تو جرمنوں نے ہاربر کی دریافت کا بھرپور استعمال کیا اور اس کیمیائی عمل کی مدد سے صنعتی پیمانے پر ہوا کی مدد سے آتش گیر مادے کی پیداوار شروع کر دی۔ بعض محققین کو یقین ہے کہ اگر ہاربر کی دریافت نہ ہوتی تو جرمنی نومبر 1918ء سے کافی پہلے ہی ہتھیار پھینکنے پر مجبور ہو جاتا۔ اس دریافت پر فرٹز ہاربر (ہاربر نے اسی جنگ کے دوران لڑائی میں زہریلی گیس کے استعمال کا طریقہ بھی ایجاد کیا تھا) کو 1918ء میں نوبل انعام سے نوازا گیا تھا۔ اسے یہ نوبل انعام امن کی کوششوں کے لیے نہیں بلکہ کیمیاء کے شعبے میں گراں قدر خدمات پر عطا ہوا تھا۔

زندگی، کنوئیر بیلٹ پر

صنعتی انقلاب نے سستی اور وافر توانائی کے ساتھ ساتھ خام مال کے سستے اور فراواں ذخائر کا زبردست اور بے نظیر اتصال پیدا کر دیا۔ اس کا نتیجہ بے تحاشہ پیداوار کی صورت بر آمد ہوا۔ اس پیداوار کا سب سے پہلا اور سب سے زیادہ اثر زراعت کے شعبے میں نظر آیا۔ جب ہم صنعتی انقلاب کے بارے سوچتے ہیں تو ہمارے دماغ میں یکدم ہی دھواں چھوڑتی ہوئی فیکٹریوں کی چمنیوں اور کوئلے کی کان میں پسینے سے شرابور، تک سیاہ اور گندے مندے مزدوروں کی تصویر آتی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ صنعتی انقلاب۔۔۔ زرعی انقلاب کی اگلی قسط تھی۔

پچھلے دو سو برسوں کے دوران صنعتی پیداوار کے نت نئے سبھی طریقے زراعت کو سہارا دینے کا سبب بن گئے۔ ایسی مشینیں مثال کے طور پر ٹریکٹر وغیرہ ایجاد ہوئے جنھوں نے زراعت میں انسانی اور حیوانی قوت کی جگہ لے لی۔ ان مشینوں سے ایسے ایسے کام لیے جانے لگے جو اس سے قبل ناممکن سمجھے جاتے تھے۔ کیمیائی کھادوں، صنعتی کرم کش دواؤں اور دوسری ہارمونی اور باقی ادویات کی مہربانی سے پالتو جانوروں اور کھیتیوں کی پیداوار کئی کئی گنا بڑھ گئی۔ ریفریجریٹروں، بحری جہازوں اور ہوائی جہازوں کی بدولت فصل کو کئی کئی مہینوں تک جمع کر کے رکھنا اور دنیا کے کسی بھی حصے میں سستے اور نہایت سریع طریقوں سے پہنچانا عین ممکن ہو گیا۔ یہ صنعتی پیداوار کا کرشمہ ہے کہ یورپی باشندے اپنے گھروں میں بیٹھے ارجنٹائن کے تازہ بیف سٹیک اور جاپان کی سُوشی کے مزے اٹھا سکتے ہیں۔

یہاں تک کہ نباتات اور جانوروں کو بھی میکانیات کے حوالے کر کے ایک مشین جیسا ہی بنا دیا گیا۔ جہاں ایک طرف خردمند آدمی کی نوع انسانی، انسان پرست مذاہب اور نظریات کی بدولت مقدس رتبے پر براجمان ہو چکی ہے تو وہیں دوسری جانب اس نے فارمی جانوروں کو ایسے جاندار سمجھنا ہی ترک کر دیا ہے، جو درد اور کرب محسوس کر سکتے ہیں۔ بجائے، اب ان فارمی جانوروں کو ایک مشین کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ آج ان جانوروں کو وسیع پیمانے پر بڑی مقدار میں فیکٹری نما فارمی تعمیرات میں، صنعتی ضروریات کے عین مطابق جسمانی اشکال میں یوں پالا جاتا ہے کہ طرح طرح کی مصنوعات با آسانی اور وافر مقدار میں پیدا کی جا سکیں۔ یہ جانور اپنی پوری زندگی ایک دیوہیکل پیداواری سلسلے میں کسی گراری کی طرح گزارتے ہیں اور ان کے وجود کی طوالت اور زندگی کے معیار کا تعین تجارتی کارپوریشنوں کے نفع اور نقصان کی بنیاد پر کیا جاتا ہے۔ اگرچہ یہ صنعت ان جانوروں کو زندہ رکھنے کے لیے بھرپور صحت اور خوراک کا بھرپور انتظام کرتی ہے لیکن اس صنعت کو جانوروں کی سماجی اور نفسیاتی ضروریات میں کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ ہاں، اگر یہ عوامل ان جانوروں کی پیداواری صلاحیت پر براہ راست اور واقعی اثر انداز ہوں تو ان ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی جاتی۔

انڈے دینے والی مرغیوں کی مثال لیں۔ ان مرغیوں کی پیداواری صلاحیت کے ساتھ سلوک اور برتاؤ کی ضروریات اور میلان کی پیچیدہ دنیا جڑی ہوتی ہے۔ سبھی پرندوں کی طرح مرغیاں بھی انڈے دینے سے قبل اپنے ارد گرد ماحول کا بھرپور جائزہ لیتی ہیں، دانے چن کر کھاتی ہیں اور ادھر ادھر ٹھونگیں مارتی ہیں۔ ان کے یہاں سماجی سلسلے بھی ہوتے ہیں اور یہ مخصوص جگہ پر گھونسلہ سا بنا کر خود کو سہار لیں تو پھر ہی کہیں جا کر انڈے دیتی ہیں۔ لیکن انڈے کی صنعت میں ان مرغیوں کو چھوٹے چھوٹے ڈربوں میں بند کر دیا جاتا ہے اور کبھی کبھار تو ایک ہی پنجرے میں چار اور چھ چھ مرغیاں بھی بند کر دی جاتی ہیں۔ ہر مرغی کو صرف ایک یا ڈیڑھ مربع فٹ سے زیادہ جگہ نہیں ملتی۔ ان مرغیوں کو انڈے دینے کی ضرورت کے عین مطابق، تول کر معیاری خوراک کھلائی جاتی ہے جو کافی تو ہوتی ہے لیکن انھیں اپنے ماحول سے آشنائی بنا کر گھونسلہ بنانے کی اجازت نہیں ہوتی۔ اب ظاہر ہے، یہ پنجرہ اتنا چھوٹا ہوتا ہے کہ مرغیوں کے لیے پر پھیلانا تو دور۔۔۔ سیدھا کھڑا ہونا بھی ممکن نہیں ہوتا۔

اسی طرح خنزیر بھی ہیں۔ خنزیر ذہین اور متجسس ممالیہ جانور ہیں۔۔۔ غالباً ان خصوصیات میں خنزیروں سے بہتر صرف بن مانس ہوتے ہیں۔ لیکن صنعتی فارموں میں پالے جانے والے خنزیروں کی زندگی ان کے لیے عذاب سے کم نہیں ہوتی۔ ان ذہین اور سمجھ بوجھ رکھنے والے متجسس جانوروں کو چھوٹے چھوٹے کریٹوں میں بند کر کے کچھ یوں ٹھونس کر رکھا جاتا ہے کہ ان کے لیے حرکت کرنا بھی ممکن نہیں رہتا۔ وہ تو ادھر ادھر مڑ بھی نہیں سکتے۔۔۔ گھومنا پھرنا اور یہاں وہاں منہ مارنا تو بہت دور کی بات ہے۔ سورنیوں کو بچے جننے کے بعد دن اور رات۔۔۔ تقریباً چار ہفتوں تک انھی کریٹوں میں بند رکھا جاتا ہے۔ پھر چھوٹے خنزیروں کو الگ کر پل پوس کر موٹا فربہ ہونے کے لیے جبکہ خود سورنی کو ایک دفعہ پھر حمل سے ٹھہرا دیا جاتا ہے۔

اسی طرح دودھ دینے والی گائیں بھی اپنی زندگی کے مختص کردہ پیداواری برس محدود احاطے کے اندر بند ہو کر وہیں اپنے گوبر اور موتر میں کھڑے، بیٹھے یا سو کر گزارتی ہیں۔ انھیں چند مشینوں کی مدد سے تول کر خوراک، ہارمون اور ادویات کھلائی جاتی ہیں جب کہ دوسری مشینیں ہر چند گھنٹوں کے بعد دودھ دوہنے کے لیے پہنچ جاتی ہیں۔ اس میکانیات کے بیچ گائے کی مثال اس مشینی پرزے کی طرح ہوتی ہے جو منہ سے خام مال استعمال کر کے تھن میں سے کالآمد تجارتی مال پیدا کر لیتا ہے۔ پیچیدہ جذباتی کیفیات کی حامل ان جاندار مخلوقات کے ساتھ اس طرح کے مشینی سلوک کی وجہ سے انھیں نہ صرف جسمانی بیکل بلکہ سماجی دباؤ اور نفسیاتی جھنجھلاہٹ کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے۔

40–ایک کمرشل ہیچری میں کنوئیر بیلٹ پر چوزوں کا منظر۔ نر اور بے کار مادہ چوزوں کو کنوئیر بیلٹ سے اٹھالیا جاتا ہے اور گیس چیمبر میں ڈال کر ہلاک کر دیا جاتا ہے۔ انھیں کچل دیا جاتا ہے یا پھر کچرے میں پھینک دیا جاتا ہے۔ لاکھوں کی تعداد میں چوزے یوں ہی بیلٹ پر ہی ہلاک کر دیے جاتے ہیں۔

جس طرح بحر اوقیانوس کی تجارتی راہداری پر غلاموں کی تجارت افریقیوں کے خلاف نفرت کا شاخسانہ نہیں تھی، اسی طرح ان جدید صنعتوں کی بنیاد بھی جانوروں کے ساتھ کسی کینے یا بغض کا نتیجہ نہیں ہے۔ یہ یاد رہے کہ ایسا صرف بے اعتنائی اور بے حسی کی وجہ سے ہے۔ آج دنیا کا ہر وہ شخص جو دودھ، انڈے اور گوشت کھاتا ہے۔۔۔ وہ غالباً کبھی بھی ٹھہر کر ان خوراکوں کو پیدا کرنے والی مرغیوں، گائیوں اور خنزیروں کی حالت زار بارے نہیں سوچتا۔ لیکن وہ چند معدودے جو اس بارے سوچتے بھی ہیں تو خود کو یہ تسلی دے کر چپ ہو جاتے ہیں کہ ان جانوروں کی مثال مشینوں جیسی ہی ہے۔ یہ جانور حسیات اور جذبات سے عاری ہوتے ہیں اور انھیں تکلیف اور کرب سے کوئی لینا دینا نہیں ہے۔ اصل ستم ظریفی تو یہ ہے کہ جن سائنسی شعبوں نے پولٹری، دودھ اور گوشت کی صنعتوں میں جانوروں اور مرغیوں کو پیداواری مشینیں بنا کر رکھ دیا ہے۔۔۔ انھی شعبوں نے حالیہ برسوں میں یہ بھی بلا شک و شبہ ثابت کیا ہے کہ ممالیہ جانوروں اور پرندوں میں پیچیدہ حسیاتی اور جذباتی روپ بھی پایا جاتا ہے۔ یہ نہ صرف جسمانی درد محسوس کرتے ہیں بلکہ انھیں جذباتی دباؤ اور کرب کا بھی پورا پورا احساس ہوتا ہے۔

ارتقائی نفسیات کا یہ ماننا ہے کہ فارمی جانوروں کی سماجی اور جذباتی ضروریات کا تعلق اس زمانے سے ہے جب یہ جانور جنگلوں اور بیابانوں میں بسر رکھتے تھے۔ جانوروں کے یہ خدوخال بقاء اور افزائش نسل کے لیے لازم ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک جنگلی گائے کے لیے دوسری گائیوں اور بیلوں کے ساتھ قریبی تعلق قائم کرنے کے لیے سماجی اور جذباتی عوامل ضروری ہوتے ہوں گے۔۔۔ اگر وہ ان

عوامل کو نظر انداز کر دے تو اس کے لیے گائیوں کے ریوڑ میں بقاء اور افزایش کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا۔ ان سماجی اور جذباتی خصوصیات کو اچھی طرح سیکھنے کے لیے قدرت نے ارتقاء کے ذریعے بچھڑوں (ہر ممالیہ جانور کے بچوں کی طرح) میں کھیل کود کی بے انتہا خواہش نصب کر دی ہے۔ ممالیہ جانوروں میں کھیل کود سے مراد سماجی رویے سیکھنے کا عمل ہوتا ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر قدرت نے ارتقاء کے ذریعے ممالیہ جانوروں کی اپنی ماں کے ساتھ انتہائی قریبی نسبت اور جوڑ کی خواہش بھی پیدا کی ہے۔ ماں کا دودھ اور دیکھ بھال، لگاؤ اور نسبت بچھڑوں اور ہر ممالیہ جانور کی بقاء کے لیے لازمی ہوتا ہے۔

لیکن اگر کوئی دہقان کسی بچھیا کو اپنی ماں سے الگ کر کے، ایک بند احاطے میں ڈال کر اسے پوری پوری خوراک، پانی اور بیماریوں سے بچاؤ کے لیے ادویات بھی دے کر پرورش کرے۔ پھر جب یہ بچھیا اپنی عمر کو پہنچ جائے تو وہ کسی بیل کے نطفے کو مصنوعی طور پر استعمال میں لا کر اس کا حمل بھی ٹھہرا دے، تو پھر کیا ہو گا؟ معروضی نکتہ نظر سے تو اس بچھیا کو بقاء اور افزایش نسل کے لیے مامتا، کھیل کود اور نسبت قائم کرنے وغیرہ جیسی چیزوں کی تو سرے سے حاجت ہی نہیں رہتی۔ لیکن اگر اس معاملے کو موضوعی اور نفسی نکتہ نظر سے دیکھا جائے تو اس بچھیا کو ساری ضروریات پوری ہونے کے باوجود بھی مامتا اور دوسرے بچھڑوں کے ساتھ کھیل کود اور نسبت کی بہر حال ضرورت رہتی ہی ہے۔ اگر اس بچھیا کی یہ خواہشات پوری نہیں ہوتیں تو ظاہر ہے، اسے سخت تکلیف اور کرب کا سامنا رہے گا۔ ارتقائی نفسیات ہمیں یہی سکھاتی ہے کہ: جنگل میں ارتقاء کے نتیجے میں پیدا ہونے والی ضرورت نفسی اور فاعلیٰ طور پر بدستور برقرار رہتی ہے۔۔۔ بھلے، اس کی ضرورت بقاء اور افزایش نسل کے تناظر میں ختم ہی کیوں نہ ہو جائے۔ یہ باقی رہتی ہے۔ صنعتی زراعت کے ساتھ المیہ یہ ہے کہ وہ جانوروں کی معروضی ضروریات کا تو پورا پورا خیال رکھتی ہے لیکن جب نفسی یا فاعلیٰ ضروریات کی بات آتی ہے تو وہ ان سے یکسر منہ موڑ لیتی ہے۔

اس نظریے کی حقیقت غالباً 1950ء سے ہمیں پوری طرح معلوم ہے۔ تب ہوا یہ تھا کہ ہیری ہارلو نامی امریکی نفسیات دان نے بندروں کی بڑھوتری اور نشوونما پر ایک عملی تجربے پر مبنی تحقیق کی تھی۔ ہارلو نے شیر خوار بندروں کو پیدائش کے چند گھنٹے بعد ہی ماؤں سے الگ کر دیا۔ پھر، ان شیر خوار بندروں کو پنجروں میں الگ کر کے کٹھ پتلی ماؤں کے ساتھ پرورش پانے کے لیے چھوڑ دیا۔ ہر پنجرے میں ہارلو نے دو کٹھ پتلی مائیں نصب کیں۔ ان میں سے ایک کٹھ پتلی دھاتی تاروں سے بنا کر اس میں دودھ کی بوتل فٹ کر دی گئی تھی تا کہ شیر خوار بندر اس کو چوس کر خوراک حاصل کر سکیں۔ جبکہ دوسری کٹھ پتلی ماں کو لکڑی سے بنایا گیا تھا جس کے ارد گرد نرم کپڑا لپیٹ دیا گیا تھا۔ یہ دوسری کٹھ پتلی ماں بندر کے جسم کی طرح نظر اور محسوس ہوتی تھی۔ تاہم یہ کٹھ پتلی، شیر خوار بندر کو کسی قسم کی غذا یا پرورش دینے کے قابل نہیں تھی۔ اب خیال یہ تھا کہ شاید شیر خوار بچے اس دھاتی کٹھ پتلی ماں کے ساتھ چمٹے رہیں گے جو انھیں خوراک اور جسمانی پرورش دینے کے قابل تھی جبکہ دوسری کپڑے میں لپٹی لکڑی کی کٹھ پتلی سے ان شیر خواروں کو کوئی غرض نہ ہو گی۔

تاہم، ہارلو کو یہ دیکھ کر خاصی حیرانگی ہوئی کہ شیر خوار بندروں نے کپڑے میں لپٹی کٹھ پتلی ماں کو واضح طور پر فوقیت دی اور زیادہ سے زیادہ وقت اسی کے ساتھ گزارنے لگے۔ جب ان دونوں کٹھ پتلی ماؤں کو ایک ساتھ رکھا جاتا تھا تو پھر بھی شیر خوار بندر کپڑے کی کٹھ پتلی کے ساتھ چمٹے رہتے۔ یہی نہیں بلکہ وہ دھاتی کٹھ پتلی میں فٹ دودھ کی بوتل سے دودھ تو اچک لیتے تھے لیکن اس دوران بھی وہ کپڑے کی کٹھ پتلی سے چمٹے رہتے۔ ہارلو کو شبہ ہوا کہ شاید شیر خوار بندر سردی لگنے کی وجہ سے ایسا رویہ اختیار کرتے ہیں۔ چنانچہ، اس نے دھاتی کٹھ پتلی میں ایک بلب بھی فٹ کر دیا جس سے حرارت نکلتی تھی۔ چند انتہائی چھوٹے بندروں کے سوا شیر خوار بندروں کی تقریباً تعداد اس انتظام کے باوجود بھی کپڑے کی کٹھ پتلی کے ساتھ چمٹے رہے۔

41–ہارلو کا ایک یتیم بندر، جو دودھ تو دھاتی ماں پر نصب فیڈر سے پیتا ہے لیکن وہ بہر حال کپڑے کے پتلے سے چمٹا رہتا ہے۔

اسی تحقیق کے اگلے مرحلے میں ہارلو کے یتیم بندر جب بلوغت کی سطح پر پہنچے تو پتہ چلا کہ وہ اپنی ساری مادی ضروریات پوری ہونے کے باوجود اضطراب کا شکار، ذہنی طور پر مختل تھے۔ یہ تجرباتی بندر کبھی بھی بندروں کے سماج میں دوبارہ فٹ نہیں ہو سکے اور انھیں دوسرے بندروں کے ساتھ ربط اور تعلق قائم کرنے میں شدید مشکل کا سامنا ہوتا تھا۔ یہی نہیں بلکہ یہ بندر سخت جارح، غصہ ناک اور بے چینی کا شکار رہتے تھے۔ اس تحقیق سے حاصل ہونے والا نتیجہ بالکل واضح تھا کہ: بندروں کے لیے مادی ضروریات سے زیادہ نفسیاتی ضروریات اور خواہشات کا پورا ہونا لازم ہوتا ہے۔ اگر ان کی یہ ضروریات اور خواہشات پوری نہیں ہوتیں تو بلاشبہ انھیں سخت تکلیف اور کرب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ہارلو کے شیر خوار بندر کپڑے کی کٹھ پتلی کے ساتھ اس لیے وقت گزارنے اور چمٹے رہنے کو ترجیح دیتے تھے کیونکہ انھیں صرف دودھ کی نہیں بلکہ جذباتی تعلق کی بھی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ اس تحقیق کے بعد کی دہائیوں میں لاتعداد تجربات اور تحقیق کے نتیجے میں یہی ثابت ہوا کہ یہ امر صرف بندروں ہی نہیں بلکہ دوسرے ممالیہ جانوروں اور پرندوں میں بھی یوں ہی اٹل ہے۔ آج، لاکھوں اور

کروڑوں کی تعداد میں فارمی جانوروں کو ہارلو کے بندروں کی طرح کے ہی حالات کا سامنا ہے۔ دہقان اور اس زرعی صنعتوں سے جڑے لوگ بچھڑوں، میمنوں اور جانوروں کے ہر طرح کے بچوں کو اپنی ماؤں سے الگ کر کے علیحدگی میں، تنہائی کا شکار کر کے پالتے ہیں۔

آج مجموعی طور پر اربوں کی تعداد میں فارمی جانور ایک میکانیکی اسمبلی لائن پر زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ان میں سے ہر سال قریباً 50 ارب جانوروں کو ذبح بھی کیا جاتا ہے۔ ان صنعتی مال مویشیوں کے طور طریقوں کے نتیجہ میں زرعی پیداوار اور انسانی خوراک کے ذخیروں میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے۔ نباتاتی فصلوں کی میکانیکی کاشت کے ساتھ ساتھ صنعتی درجے کی افزائش مویشی ہی ہے جس کی بنیاد پر آج سارے کا سارا جدید انسانی سماجی اور معاشی نظام کھڑا ہے۔ زراعت کی صنعت کاری سے قبل کھیتوں اور فارموں پر خوراک کی پیداوار کا زیادہ تر حصہ دہقانوں اور پالتو جانوروں کو کھلا کر 'ضائع' ہو جاتا تھا۔ اس زمانے میں خوراک کی پیداوار کا صرف کچھ معمولی حصہ ہی فن کاروں، عالموں، پادریوں اور بیوروکریٹوں کو کھلانے کے کام آتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس زمانے میں انسانی سماج اور آبادی کا تقریباً نوے فیصد حصہ دہقانوں پر مشتمل ہوا کرتا تھا اور تہذیب یافتہ، پڑھے لکھے اور تمدن کے علمبردار عالی نسب بس کچھ ہی لوگ ہوا کرتے تھے۔ جب سے زراعت کی صنعت کاری ہوئی ہے، دہقانوں کی تعداد گھٹتی چلی گئی ہے۔ محدود تعداد میں بھی یہ دہقان اتنی زیادہ خوراک پیدا کرنے کے قابل ہیں کہ وہ کثیر تعداد میں کلرکوں اور فیکٹریوں کے مزدوروں کا پیٹ بھر سکتے ہیں۔ آج ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں صرف دو فیصد آبادی کا ذریعہ معاش زراعت کے ساتھ جڑا ہے۔ لیکن یہ دو فیصد زراعت پیشہ دہقان بھی اتنی خوراک پیدا کر لیتے ہیں جو امریکہ کی پوری تیس کروڑ کے لگ آبادی کو ہی نہیں کھلاتے بلکہ زائد پیداوار کو باقی دنیا میں برآمد بھی کرتے ہیں۔ یہاں، اس امر کی طرف بھی توجہ دلانا مقصود ہے کہ زراعت کی صنعت کاری کے بغیر شہروں میں صنعتی انقلاب برپا ہونا ممکن ہی نہیں تھا۔ اگر زراعت جیسی تھی، ویسی ہی چلی آتی تو پھر فیکٹریوں اور دفتروں کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے مزدوروں اور کارکنوں کے ہاتھ اور دماغ ڈھونڈے سے بھی نہ ملتے اور آج بھی دنیا کی تقریباً آبادی دہقان بنی، کھیتوں اور کھلیانوں میں مشقت کر رہی ہوتی۔

جب کھیتوں اور کھلیانوں سے چھوٹ کر اربوں انسانوں کو فیکٹریوں اور دفتروں میں کھپنے کا موقع ملا تو پھر کیا ہوا؟ پھر یہ ہوا کہ دنیا میں جیسے مصنوعات کا ایک عظیم اور غیر معمولی برفشار چھوٹ گیا ہو۔ آج انسان تاریخ میں سب سے زیادہ سٹیل پیدا کرتا ہے۔ اتنا کپڑا بنتا ہے جس کی پوری تاریخ میں کوئی نظیر نہیں ہے۔ اسی طرح اتنی زیادہ تعمیرات ہو رہی ہیں کہ بیان مشکل ہے۔ مزید بر آں، انسان آئے روز دماغ کو شل کر دینے کی حد تک اتنی زیادہ اور کثیر مصنوعات پیدا کر رہا ہے جو اس سے قبل تاریخ میں کبھی وجود ہی نہیں رکھتی تھیں۔ بجلی کے بلب، موبائل فون، کیمرے، ڈش واشر، استریاں، پلگ۔۔۔ اب کس کس شے کی فہرست بنائی جائے؟ بلکہ مصنوعات تو چھوڑو، صنعتوں کی فہرست بنانا بھی مشکل ہے۔ اپنے ارد گرد نظر دوڑائیں۔۔۔ آپ جس کمرے میں بیٹھے ہیں، صرف اس میں موجود مصنوعات

اور ان سے جڑی صنعتوں کی فہرست بنالیں تو آپ کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں گی۔ بہر حال، ان مصنوعات کی دین ہے کہ انسانی تاریخ میں پہلی بار۔۔۔ رسد، طلب سے کہیں آگے، بہت ہی آگے نکل چکی ہے۔ اب، جب رسد طلب سے کہیں زیادہ بڑھ گئی تو پھر ایک نئے مسئلے نے جنم لیا کہ: ان ساری مصنوعات کو کون خریدے گا؟

شاپنگ کادور

جدید سرمایہ دارانہ معیشت کی بقاء کے لیے لازم ہے کہ پیداوار میں مسلسل اضافہ ہوتا رہے۔ اس کی مثال ایک شارک کی طرح ہے جس کے لیے تیرتے رہنالازم ہے ورنہ وہ گھٹ کر مر جائے گی۔ تاہم، صرف پیداوار کافی نہیں ہوتی۔ صرف پیداوار ہی نہیں بلکہ کوئی نہ کوئی ان مصنوعات کو خریدا بھی تو کرے ورنہ صنعت کار اور سرمایہ کار۔۔۔ دونوں ہی غرق ہو جائیں گے۔ اس تباہی سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ لوگوں کو ہر اس شے کی خریداری پر مائل رکھا جائے جو صنعت کاری کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے۔ یہاں پہنچ کر انسانی اخلاقیات کی ایک نئی قسم جنم لیتی ہے۔ اس قسم کو صارفیت یا کنزیومرازم کے نام سے جانا جاتا ہے۔

تاریخ بھر میں زیادہ تر لوگ قلت اور کمیابی کی حالت میں بسر کرتے آئے ہیں۔ اسی لیے، کفایت شعاری انسان کا شعار بن گیا ہے۔ عقائد اور نظریات میں کٹرپن، سادہ مزاجی، نظم و ضبط، کفایت شعاری اور برداشت وغیرہ جیسی خصلتوں کو انسانی اخلاقیات میں برتر مقام حاصل ہے۔ ہم سبھی جانتے ہیں کہ اخلاقیات کا تقاضا یہ ہے کہ ایک اچھا انسان وہ ہے، جو عیش عشرت کو منہ نہ لگائے، خوراک ضائع نہ کرے اور نت نئے جوڑے پہننے کی بجائے پھٹے کپڑوں میں پیوند لگا کر گزارہ کیا کرے وغیرہ وغیرہ۔۔۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ یہ صرف تھڑے ہوئے بادشاہ اور نودولتیے لوگ ہی ہوتے ہیں جو ان اقدار سے منہ موڑ کر محفلوں اور عوامی سطح پر نمود کرتے ہیں اور دھن دولت کی فراوانی کی نمائش کرتے نہیں تھکتے۔

صارفیت یا کنزیومرازم کی بناء پر اخلاقی قدریں نت نئی مصنوعات اور خدمات کے زیادہ سے زیادہ استعمال کو مثبت شے گردانتی ہیں۔ یہ لوگوں کو اپنے ساتھ بہتر سلوک۔۔۔ بلکہ کیسے خراب کرنے کی حد تک لاڈ و پیار کرنے حتیٰ کہ رفتہ رفتہ اسراف کی زیادتی کی وجہ سے خود کو ختم کرنے سے دریغ نہ کرنے پر بھی قائل کرتی ہے۔ اس نئی اخلاقی قدر کا تقاضا ہے کہ کفایت شعاری اور بخل ایک بیماری ہے، جس کا علاج ضروری ہوتا ہے۔ آپ کو اس صارفی قدر کا مشاہدہ کرنے کے لیے کہیں دور دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ کسی بھی اناج سے بنی مصنوعہ کے ڈبے کی پشت پر پڑھ لیں۔ مثلاً میرے پسندیدہ جو سے بنے سیریل کے ڈبے کی پشت پر کمپنی کی جانب سے لکھا ہوا ہے:

'بعض اوقات آپ کو لطف اور لذت کی ضرورت ہوتی ہے۔ بعض اوقات آپ کو معمول سے زیادہ توانائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ بعض اوقات آپ کو اپنے وزن کی فکر رہتی ہے لیکن بعض اوقات آپ کو اس فکر سے آزاد ہو کر جینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ فکر سے آزاد ہونے کا وقت۔۔۔ابھی ہے۔ ہم آپ کو مزیدار اور توانائی سے بھرپور سیریل فراہم کرتے ہیں تاکہ آپ لذت اور صحت، دونوں کا یکساں فائدہ اٹھائیں۔۔۔اپنی زندگی کو بھرپور طریقے سے جی پائیں!'

اسی ڈبے پر کمپنی کی ایک دوسری 'ہیلتھ ٹریٹ' نامی سیریل مصنوعہ کا باتصویر اشتہار بھی چھاپا گیا ہے۔ لکھا ہے:

'ہیلتھ ٹریٹ میں آپ کو ملتے ہیں۔۔۔طرح طرح کے اناج، پھلوں کے ذائقے اور گریوں کی غذائی طاقت بھی! ہیلتھ ٹریٹ آپ کو ناشتے میں ایسا تجربہ فراہم کرتا ہے جس میں ذائقہ بھی ہے، مسرت بھی اور صحت بھی۔۔۔سب کچھ ایک ساتھ! صرف ناشتے میں ہی کیوں؟ اگر دن میں کسی بھی وقت آپ کے من کو مزیدار اور صحت مند خوراک کی طلب ہو تو ہیلتھ ٹریٹ ہے ناں! ایک صحت مند لائف سٹائل کے لیے، بہترین انتخاب۔۔۔مزیدار ذائقے اور صحت ایک ساتھ!'

اگر جدید تاریخ سے قبل کسی بھی زمانے میں یہ عبارت یوں پڑھنے کو ملتی تو یقیناً زیادہ تر لوگ اس سے سخت گھن محسوس کرتے۔ ان کے نزدیک یہ خود غرضی، انحطاط، زوال اور اخلاقی طور پر بدعنوانی۔۔۔فاسد خیال ہوتا۔ صارفیت نے مقبول نفسیات کے ساتھ مل کر خوب محنت کی ہے اور لوگوں کو قائل کیا ہے کہ دراصل شوق، لطف اندوزی اور عادت سے مجبور، کھل کر خرچ کرنا بہترین اور قابل جزا شے ہوتی ہے جبکہ کفایت شعاری اور خواہ مخواہ کی بچت خود پر جبر کرنے کے مترادف ہے۔ وہ ایک مشہور کمپنی کی انتہائی مقبول پکار، 'جسٹ ڈو اٹ!' تو آپ کو یاد ہی ہوگی؟

صارفیت کی یہ جد وجہد کافی کامیاب رہی ہے۔ آج ہم سب ہی بہت اچھے اور بہترین صارف ہیں۔ ہم بے شمار ایسی مصنوعات خریدتے ہیں جن کی ہمیں قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ اکثریت تو ایسی چیزوں کی ہوتی ہے جن کے بارے کل تک ہمیں پتہ ہی نہیں تھا کہ یہ بھی کوئی شے ہوتی ہے۔ صنعت کار دیدہ و دانستہ ایسی قلیل مدتی اشیاء بناتے ہیں اور پھر نت نئی لیکن انتہائی غیر ضروری ایجادات شامل کر کے مکمل طور پر ایسی تسلی بخش مصنوعات بنا کر پیش کرتے ہیں کہ لوگ ان کو صرف اس لیے خریدتے ہیں تاکہ وہ نت نئے رجحانات کا حصہ رہیں۔ شاپنگ یا خریداری ہمارا پسندیدہ مشغلہ اور وقت گزاری کا سامان بن چکی ہے۔ اب تو یہ حال ہے کہ عام استعمال کی اشیائے صرف خاندان کے لوگوں، میاں بیوی اور دوستوں کے بیچ بہتر تعلق داری کے لیے لازمی ثالث اور جز بن چکی ہیں۔ مذہبی تہوار، جیسے کرسمس اور عیدین وغیرہ بھی شاپنگ اور خریداری کا میلہ بن چکے ہیں۔ مذہب تو رہا ایک طرف، قومی دن بھی اس سے بچ نہیں

پائے۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ میں 'میموریل ڈے' پر بھی خصوصی سیل لگتی ہے۔ اگرچہ یہ دن قوم کی خدمت میں جان دینے والے فوجیوں کی یاد میں منایا جاتا ہے لیکن لوگ اس دن خوب شاپنگ کرنے نکلتے ہیں۔۔۔ غالباً وہ یہ ثابت کرنے نکلتے ہیں کہ قومی ہیروؤں کی آزادی کے لیے جان کی قربانی بالکل بھی رائیگاں نہیں گئی۔

صارفیت کی یہ نئی اخلاقیات کھابوں کے بازار میں تو بالکل صریح اور واضح نظر آتی ہے۔ زرعی معاشروں میں روایتی طور پر زندگی بھوک اور فاقوں کے دہشت ناک سایے میں پلتی تھی۔ جب کہ آج کی آسودہ دنیا میں موٹاپا صحت کا بڑا مسئلہ بن کر سامنے آیا ہے۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ آج دنیا بھر میں موٹاپے کی شرح امیروں (جو نامیاتی سلاد اور فروٹ وغیرہ زیادہ کھاتے ہیں) کے مقابلے میں متوسط اور غریبوں (جو برگر اور پیزے وغیرہ مل جائے تو ندیدوں کی طرح ٹوٹ پڑتے ہیں) کے یہاں زیادہ پائی گئی ہے۔ ہر سال امریکی شہریوں کی آبادی غذا اور خوراک پر اتنا پیسہ خرچ کرتی ہے جو باقی دنیا کے سبھی غریبوں کو پیٹ بھرنے کے لیے کافی ہو سکتی ہے۔ موٹاپا، صارفیت کی دوہری جیت ہوتی ہے۔ لوگ پہلے تو بہت زیادہ کھا کر معیشت کو خوب فائدہ پہنچاتے ہیں اور پھر موٹاپے کو دور کرنے کے لیے طرح طرح کی پرہیزی غذائیں اور ادویات وغیرہ بھی استعمال کرتے ہیں جس سے معاشی ترقی اور نمو کی رفتار دوگنی ہو جاتی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ آخر ہم صارفیت کے اخلاقی اصولوں کو کسی کاروباری شخص کے سرمایہ دارانہ اخلاقی اصولوں کے ساتھ کیسے برابر کر سکتے ہیں؟ سرمایہ داری کا اصول تو یہ ہے کہ منافع کسی طور ضائع نہیں ہونا چاہیے اور بجائے یہ کہ پیداواری سلسلے میں دوبارہ استعمال ہونا ضروری ہے۔ لیکن، صارفیت کا اصول یہ ہے کہ جو کماتے ہو، اسے بھرپور طریقے سے صرف کرو۔ یہ دونوں اصول ایک دوسرے کے متضاد ہیں۔ تو ان میں توازن کیسے قائم ہوتا ہے؟ تو وہ یوں ہے کہ جیسے گزشتہ ادوار میں چلا آتا تھا، ویسے ہی اشرافیہ اور عام عوام میں فرق آج بھی پایا جاتا ہے۔ قرونِ وسطیٰ کے یورپ میں اشرافیہ اور امراء جی بھر کر پر تعیش تکلفات پر فضول اسراف کیا کرتے تھے جبکہ دہقان اور عام آدمی کی گزر بسر کفایت سے ہوا کرتی تھی اور یہ ایک ایک پائی سنبھال کر بسر رکھتے تھے۔ آج، یہ معاملہ الٹ ہو چکا ہے۔ آج ہم دیکھتے ہی ہیں کہ امراء اور اشرافیہ اپنے اثاثوں اور سرمایے کو خوب سنبھال کر رکھتے ہیں لیکن متوسط اور غریب طبقہ دل کھول کر اپنی بساط سے بڑھ کر ایسی اشیاء جیسے کاروں اور ٹی وی اور موبائل کے نت نئے ماڈلوں پر فضول خرچ کرتے ہیں جن کی انھیں قطعاً ضرورت نہیں ہوتی۔

اصل میں بات یہ ہے کہ سرمایہ داری اور صارفیت کے اصول۔۔۔ ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔ یہ دو مقدس احکامات کا ادغام اور وحدت ہے۔ امراء کے لیے مقدس فرمان یہ ہے کہ، 'سرمایہ کاری کرو!' جبکہ باقی سب کے لیے مقدس فرمان ہے کہ، 'خریداری کرو!' یہ سرمایہ داری اور صارفیت پر مبنی خلق ایک دوسری طرح بھی انقلابی خاصیت رکھتا ہے۔ وہ یوں کہ گزشتہ ادوار کے سبھی اخلاقی معیار کے نظاموں میں لوگوں کو انتہائی سختی کا سامنا رہا کرتا تھا۔ مثال کے طور پر لوگوں سے توقع رکھی جاتی تھی کہ اگر وہ برداشت اور دردمندی کا

مظاہرہ کر کے اپنی نفسانی خواہشات اور غصے، خود غرضانہ خواہشات اور مفادات پر روک لگائیں گے تو انھیں اس کے بدلے میں جنت ملے گی۔ زیادہ تر لوگوں کے لیے ان اخلاقی معیارات پر پورا اترنا انتہائی مشکل بلکہ زیادہ تر ناممکن رہتا تھا۔ اخلاقیات کی تاریخ ان بے مثال تصورات کی ایسی افسوسناک داستان ہے جن پر کبھی کوئی پورا نہیں اتر سکتا تھا۔ عیسائیوں کی اکثریت کبھی بھی یسوع مسیح کے نقش قدم پر نہیں چل پائی، بدھ مت کے ماننے والے جی جان کی بازی لگادیتے ہیں لیکن وہ کبھی بھی بدھا جیسی روشن خیالی نہیں پا سکتے۔۔۔ اسی طرح جتنے بھی آج اور تاریخ میں جتنے بھی کنفیوشس کے ماننے والے گزرے ہیں، ان کو دیکھ دیکھ کر کنفیوشس کا خون کھولتا رہتا۔

اس کے برعکس آج تقریباً سبھی لوگ اس نئی سرمایہ داری اور صارفیت پر مبنی اخلاقیات کے تصورات اور قدروں پر صحیح صحیح اور پورا اترتے ہیں۔ اخلاقیات کے یہ نئے اصول بھی جنت کا وعدہ کرتے ہیں لیکن شرط یہ ہوتی ہے کہ امیر ہمیشہ ہی لالچی رہے اور اپنا سارا وقت پیسے سے پیسہ جوڑنے میں لگایا کرے جبکہ عوام کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی خواہشات، طلب، جوع اور ہوائے نفس کو کھلی چھٹی دے کر زیادہ سے زیادہ خریداری کیا کریں۔۔۔ جتنا ممکن ہو، دل کھول کر اسراف کیا کریں۔ یہ تاریخ کا پہلا مذہب ہے جس کے پیروکار اصل میں وہ سب کچھ کرتے ہیں جس کا انھیں حکم دیا جاتا ہے۔ لیکن، سوال یہ ہے کہ اس مذہب کے پیروکاروں کو ان احکامات کی پیروی کرنے پر واقعی جنت ملتی بھی ہے؟ کیوں نہیں۔۔۔ آپ نے کسی امیر کبیر سرمایہ دار کی دولت کے تخمینے کی خبر تو سن ہی رکھی ہو گی؟ یا آپ نے جو پچھلے چھ ماہ کی تنخواہ میں سے بچت کر کر جو ساٹھ انچ کی دیوہیکل فور کے ٹی وی خریدی ہے۔۔۔ اس پر ہر روز شام کو طرح طرح کے ایچ ڈی پروگرام دیکھ کر لطف نہیں آتا؟ امیر کبیر سرمایہ دار کو اپنا بینک بیلنس اور آپ کو رنگین ٹی وی دیکھ کر جنت کا احساس نہیں ہوتا؟

انقلاب مسلسل

جب صنعتی انقلاب نے توانائی کو ایک صورت سے دوسری میں ڈھالنے اور مصنوعات کی پیداوار کے نت نئے راستے نکال لیے تو انسان کو اپنے ارد گرد کے ماحولیاتی نظام سے تقریباً آزاد کر دیا۔ آدمی نے جنگلوں کو کاٹ، دلدلوں کو سکھا، دریاؤں کو روک، میدانوں کو سیراب، دسیوں ہزار طویل ریل کی پٹڑیاں اور پکی سڑکیں بچھا اور اونچی اونچی فلک بوس عمارتیں تعمیر کر کے بڑے بڑے شہر آباد کر لیے۔ جیسے جیسے یہ دنیا آدمی کی ضرورت کے عین مطابق ڈھلتی گئی، دوسری انواع کی پوری پوری جاتیاں اور مسکن معدوم ہوتے گئے۔ ہمارا یہ کرہ جو کبھی ہری اور نیلی مرمری بلور ہوا کرتا تھا، اب آہستہ آہستہ کنکریٹ کا جنگل اور پلاسٹک کا شاپنگ سنٹر بنتا جارہا ہے۔

آج کرہ ارض کے سات براعظموں پر تقریباً سات ارب لوگ بسر رکھتے ہیں۔ اگر آپ ان سات ارب لوگوں کو جمع کر کے کسی بہت بڑے ترازو میں ڈال کر وزن کریں تو مجموعی طور پر ان کا تول تقریباً 30 کروڑ ٹن ہو گا۔ اگر آپ سارے پالتو، فارمی جانوروں۔۔۔

گائیوں، خنزیروں، بھیڑ بکریوں اور مرغیوں وغیرہ کو جمع کر کے اسی بڑے ترازو میں ڈال کر وزن کریں تو ان کا مجموعی طور پر تول تقریباً 70 کروڑ ٹن ہو گا۔ اس کے برعکس اگر باقی بچ رہنے والے جنگلی جانوروں ۔۔۔ خار پشتوں اور پینگوینوں سے لے کر ہاتھیوں اور وہیل مچھلیوں تک سب کو جمع کر وزن کریں تو مجموعی وزن 10 کروڑ ٹن سے بھی کم نکلے گا۔ ہمارے بچوں کی کتابیں، تصویر کشی اور ٹی وی کی سکرینیں زرافوں، بھیڑیوں اور بن مانسوں سے بھری ہوئی ہیں لیکن حقیقی دنیامیں ان کی تعداد کم، بہت ہی کم رہ گئی ہے۔ پوری دنیا میں ڈیڑھ ارب گائیوں کے مقابلے میں صرف اسی ہزار زرافے بچے ہیں۔ اسی طرح، چالیس کروڑ پالتو کتوں کے مقابلے میں صرف دو لاکھ بھیڑیے اور سات ارب انسانوں کے مقابلے میں صرف ڈھائی لاکھ بن مانس باقی ہیں۔ انسانوں نے صحیح معنوں میں اس دنیا پر قبضہ کر رکھا ہے۔

ماحولیاتی تباہی اور وسائل کی کمی ۔۔۔ ایک ہی شے نہیں ہوتی۔ جیسا کہ ہم نے پچھلے باب میں دیکھا، انسانوں کو دستیاب وسائل کی مقدار ہر روز بڑھتی ہی جا رہی ہے اور یہ رجحان آگے بھی ایسے ہی چلتے رہنے کا پورا امکان ہے۔ شاید، یہی وجہ ہے کہ وسائل کی کمی سے متعلق پیشگوئیاں غلط ہیں کیونکہ ہم وسائل کی کمی اور ماحولیاتی تباہی کے بیچ فرق ہی نہیں کرتے۔ وسائل کی کمی کے خدشات کے برعکس ماحولیاتی تباہی حقیقی اور واقعی معنوں میں موجود ہے۔ مستقبل میں یہ عین ممکن ہے کہ اگر آدمی وسائل کے کسی نئے ذخیرے کو دریافت کر لیتا ہے تو وہ اس کو حاصل کرنے کی غرض سے پینگوئنوں کی ساری آبادی کو معدومیت میں دھکیل کر اور ان کے قدرتی مسکن کا کونا کونا چھان کر تباہ و برباد کر دیں گے۔ یوں دستیاب وسائل کی مقدار تو مزید وافر ہو جائے گی لیکن ماحول تباہ و برباد ہو جائے گا۔ ہیں وسائل کی کوئی کمی نہیں ہے ۔۔۔ تاہم ماحولیات کا حال بہت ہی خراب ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ ماحولیات کے ساتھ یہ چھیڑ چھاڑ خود آدمی کو بھی معدومیت کے دہانے تک پہنچا سکتی ہے۔ گلوبل وارمنگ یعنی عالمی حدت، سمندروں کی سطح میں بتدریج اضافہ اور آلودگی کا جن ۔۔۔ یہ سارے عوامل مل کر آہستہ آہستہ اس کرہ ارض کو خود ہمارے لیے بھی ناقابل رہائش بناتے جا رہے ہیں۔ مستقبل میں یہ عین ممکن ہے کہ انسانی قوت اور انسان کی ہی شروع کردہ قدرتی آفات ایک دوسرے کے ساتھ ہر دم نبرد آزما رہا کریں۔ جیسے جیسے انسان اپنی روز بروز بڑھتی ہوئی قوت کو استعمال میں لا کر فطرت کی طاقتوں کا مقابلہ کر کے ماحولیاتی نظام کو اپنی ضروریات اور ترنگ کو پورا کرنے کے لیے تسخیر کر رہے ہیں ۔۔۔ اس کی وجہ سے اب زیادہ سے زیادہ غیر متوقع اور خطرناک ضمنی نتائج بر آمد ہونے کے قوی امکانات ہیں۔ ان نتائج کو قابو کرنے کے لیے غالباً انسان کو پہلے سے بڑھ کر ماحولیاتی نظام کو قابو میں لانا پڑے گا اور شدید ہنر مندی کا مظاہرہ ہو گا۔ جس کا نتیجہ، مزید افراتفری اور تباہی کی صورت ہی نکلے گا۔

کئی لوگ، اس عمل کو 'فطرت کی تباہی' قرار دیتے ہیں لیکن اصل میں یہ تباہی نہیں بلکہ تبدیلی کا عمل ہے۔ فطرت کو تباہ نہیں کیا جا سکتا۔ ساڑھے چھ کروڑ سال پہلے غالباً ایک شہاب ثاقب زمین سے ٹکرایا تھا تو ڈائنوسارز کی ساری آبادی معدوم ہو گئی لیکن اس وقوعے کے نتیجے

میں ممالیہ جانوروں کے لیے راہیں کھل گئی تھیں۔ آج، بنی نوع انسان دنیا کی بہت سی دوسری انواع کو معدومیت کی طرف دھکیل رہا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ بالآخر خود اپنی ہستی کو بھی مٹا دے گا۔ لیکن، اس کے باوجود کئی ایسی نامیات ہیں جو کافی پھل پھول رہی ہیں۔ مثال کے طور پر چوہوں اور لال بیگوں کی گویا آج کل چاندی ہے۔۔۔ ان کی انواع عروج پر ہیں۔ غالباً جب اس دنیا سے ایٹمی جنگ کے نتیجے میں برپا ہونے والی تباہی کی دھول بیٹھ جائے گی تو یہ محکم اور ڈٹ کر رہنے والی مخلوقات نیچے سے صحیح سلامت بر آمد ہوں گی اور پوری دنیا میں اپنا ڈی این اے پھیلانے کو تیار ہی نہیں بلکہ پوری طرح اہل بھی ہوں گی۔ ان کے لیے حالات اور ماحول کافی ساز گار ہو گا۔ غالباً آج سے ساڑھ چھ کروڑ سال بعد دنیا بھر میں ذہین اور فطین چوہوں کا راج ہو گا اور وہ جب پیچھے مڑ کر دیکھیں گے تو اس تباہی و بربادی کے لیے انسان کے شکر گزار ہوں گے جس کو برپا کرنے کے ہم آج بھی پوری طرح اہل ہیں۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے آج ہم یعنی ممالیہ جانور پیچھے مڑ کر دیکھتے ہیں اور اس شہابیے کے لیے شکر گزاری محسوس کرتے ہیں جس نے ڈائنوساروں کو نیست و نابود کر دیا تھا۔ انواع برباد ہو جاتی ہیں۔۔۔ مراد یہ ہے کہ فطرت یا قدرت کبھی تباہ نہیں ہوتی۔۔۔ ماحول بدل جاتا ہے۔ جیسے، آج ہمارے یہاں بھی ماحولیاتی تبدیلیاں آہستہ آہستہ زور پکڑتی جا رہی ہیں۔

لیکن اس کے باوجود، ہماری اپنی معدومیت کی افواہیں ابھی قبل از وقت اور نورسیدہ ہی قرار دی جانی چاہیے۔ جب سے صنعتی انقلاب برپا ہوا ہے، انسانوں کی آبادی اتنی تیزی سے بڑھنا شروع ہوئی ہے کہ آدمی دنگ رہ جاتا ہے۔ 1700ء میں یہ دنیا تقریباً ستر کروڑ آدمیوں کا گھر تھی۔ 1800ء میں یہاں تقریباً پچانوے کروڑ آدمی بستے تھے۔ 1900ء میں یہ تعداد تقریباً دوگنی ہو کر ایک ارب ساٹھ کروڑ تک پہنچ گئی۔ 2000ء میں ہماری تعداد چھ ارب تھی اور آج صرف بیس برس میں ایک ارب مزید اضافے کے ساتھ دنیا کی آبادی سات ارب ہے۔ ایک اندازے کے مطابق 2050ء تک دنیا کی آبادی تقریباً دس ارب تک پہنچ جائے گی۔

جدید دور

جیسے جیسے آدمی قدرت کی دشوار گزاریوں کو پار کرتا گیا، ویسے ویسے جدید صنعت اور حکومتوں کا محکوم اور غلام ہوتا چلا گیا ہے۔ صنعتی انقلاب نے سماجی تجربات اور عمرانی اصولوں کے تجربات اور اس سے بھی کہیں زیادہ طویل انسانی ذہنیت اور روزمرہ زندگی میں تبدیلیوں کے سلسلوں کا راستہ کھول دیا۔ اس امر کی کئی مثالیں ہیں لیکن ایک انتہائی واضح مثال یہ ہے کہ روایتی زراعت کی فطری روانی کی جگہ صنعتی ہم آہنگی اور من و عن شیڈول نے لے لی ہے۔

روایتی زراعت کا انحصار قدرتی اوقات اور نامیاتی نشو و نما کے سلسلے اور چکر پر رہا کرتا تھا۔ اسی لیے تقریباً سبھی معاشرے ہمیشہ وقت کے پیمانے کو بالکل ٹھیک ٹھیک اور من و عن ناپنے سے قاصر رہا کرتے تھے بلکہ کہیے، انھیں اس میں کوئی دلچسپی ہی نہیں تھی۔ ان

معاشروں کی دنیا کا کاروبار گھڑیوں اور ٹائم ٹیبلوں کے بغیر ہی چلتا تھا اور یہ صرف سورج کی حرکات اور فصلوں کی نامیاتی نشوونما کے سلسلوں پر ہی تکیہ رکھتے تھے۔ تب کام کاج کے باقاعدہ دن نہیں ہوتے تھے اور روٹین ایک موسم سے دوسرے موسم کے بیچ جھولتی تھی۔ لوگوں کو علم ہوتا تھا کہ سورج کہاں کھڑا ہے، وہ بارشوں کے موسم اور تیار فصل کاٹنے کے دنوں کی بے چینی سے راہ دیکھتے تھے لیکن انھیں گھنٹوں کے گزرنے کا کچھ پتہ نہیں چلتا تھا اور برس کی تو سرے سے پرواہ ہی نہیں ہوتی تھی۔ اگر قرونِ وسطیٰ کے دور میں کوئی مسافر، راہ کے ساتھ ساتھ وقت کا بھولا کسی گاؤں کے کسی شخص سے برس کی بابت پوچھ لیتا تو یقیناً وہ دیہاتی اس مسافر کا منہ اور انجان کپڑوں کو ہی حیرت سے دیکھتا رہ جاتا۔

قرونِ وسطیٰ دور کے دہقانوں اور موچیوں کے برعکس جدید صنعت سورج اور موسم کی بالکل پرواہ نہیں کرتی۔ اسے بارشوں کے موسم اور کڑاکے کی گرمی سے کچھ لینا دینا نہیں صنعتیں تو ٹھیک پیمائش اور یکسانی پر یقین رکھتی ہیں۔ مثال کے طور پر قرونِ وسطیٰ دور میں ایک موچی، سول سے لے کر بکل تک۔۔۔ پورا جوتا خود ہی بناتا تھا۔ اگر کوئی ایک موچی اپنے کام میں پیچھے رہ جاتا تو کسی دوسرے موچی کی صحت پر کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ تاہم، آج جوتوں کی جدید فیکٹری میں اسمبلی لائن پر ہر مزدور اپنے حصے کا کام کرتے ہوئے مشین پر جوتے کا کوئی ایک حصہ بناتا ہے جو فوراً ہی اگلی مشین کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ اب اگر مشین نمبر پانچ پر کام کرنے والا مزدور سویا رہے تو اس سے آگے کی ساری مشینوں پر کام کرنے والے مزدوروں کا کام رک جائے گا۔ فیکٹریوں میں اس طرح کی گزند سے بچنے کے لیے ہر شخص کے لیے راست ٹائم ٹیبل کی پابندی کرنا لازم ہے۔ فیکٹری کا ہر مزدور اپنے کام پر ٹھیک ٹھیک وقت پر پہنچ جاتا ہے۔ سب ایک ساتھ ایک ہی وقت میں بھلے بھوک نہ بھی ہو تو دوپہر کا کھانا اکٹھے کھاتے ہیں۔ ہر شخص صرف اسی وقت کام سے چھٹی پر جاتا ہے جب سیٹی بجا کر شفٹ بدلنے کا اعلان نہ کر دیا جائے۔۔۔ کوئی بھی شخص اپنی مرضی سے، اپنے وقت پر، صرف اپنا کام مکمل کر کے نہیں جاسکتا۔

42-چارلی چپلن، 1936ء میں دکھائی گئی فلم 'جدید دور' کے ایک منظر میں، جہاں وہ ایک عام مزدور ہیں جو صنعتی اسمبلی لائن کی گراریوں میں پھنسے نظر آرہے ہیں

صنعتی انقلاب نے انسان کی تقریباً ساری کی ساری سرگرمیوں کے لیے ٹائم ٹیبل (نظام الاوقات) اور اسمبلی لائن (پیداواری سلسلے) کو ضروری سانچہ بنادیا۔ جب فیکٹریوں نے وقت کی پابندی کو انسانی رویوں کے لیے لازم بنالیا تو سکولوں اور مدرسوں نے بھی چوکس اور مقرر ٹائم ٹیبل اپنالیا۔ پھر ہسپتال، سرکاری دفاتر اور کریانے کی دکانیں بھی وقت کی پابندی کرنے لگیں۔ یہی نہیں بلکہ ایسی ایسی جگہیں جہاں اسمبلی لائن اور مشینوں کا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔۔۔ وہاں بھی ٹائم ٹیبل غالب آگیا۔ مثلاً اگر کسی فیکٹری کی شفٹ شام پانچ بجے ختم ہوتی تھی تو ارد گرد مقامی شراب خانوں کے لیے لازم ہو گیا کہ ٹھیک پانچ بج کر دو منٹ پر کھل جائیں۔

ٹائم ٹیبل کے نظام کو پھیلانے میں بڑا ہاتھ عوامی نقل و حمل کے نظام کا بھی تھا۔ اگر سویرے کی شفٹ میں مزدوروں کے لیے ٹھیک آٹھ بجے فیکٹری پہنچنا لازم ہوتا تو بسوں اور ٹرینوں کے لیے بھی ٹھیک سات بج کر پچپن منٹ پر فیکٹری کے دروازے پر انھیں اتارنا ضروری ہوتا تھا۔ مزدوروں کی چند منٹ کی دیر سے پیداوار میں فرق آتا اور یوں بعض اوقات غالباً آئے دن ان دیر سے آنے والوں کو اپنی نوکریوں سے ہاتھ بھی دھونا پڑ سکتا تھا۔ 1784ء میں سواریوں اور باربرداری کی ایک کمپنی نے برطانیہ میں اپنی کیرج سروس شروع کی۔ اس کمپنی کے جاری کردہ ٹائم ٹیبل میں روانگی کا وقت تو درج تھا لیکن آمد کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ وہ اس لیے کہ اس زمانے میں برطانیہ

کے ہر شہر اور قصبے کا اپنا مقامی وقت ہوا کرتا تھا۔ یہ مقامی وقت، لندن کے معیاری وقت سے تقریباً آدھے گھنٹے تک مختلف رہا کرتا تھا۔ جب لندن میں بارہ بجتے تو غالباً لیورپول میں بارہ بج کر بیس اور کنٹربری میں گیارہ بج کر پچاس منٹ ہوتے تھے۔ اب چونکہ اس وقت ٹیلی فون، ریڈیو، ٹیلی ویژن اور نہ ہی تیز رفتار ریلیں ہوتی تھیں تو کسی کو پتہ ہی نہ چلتا۔۔۔ بلکہ کہیے، کسی کو پرواہ ہی نہیں تھی۔

لیورپول اور مانچسٹر کے بیچ پہلی کمرشل ریل سروس کا آغاز 1830ء میں ہوا۔ اس کے دس سال بعد، پہلی بار ریل گاڑیوں کا ٹائم ٹیبل جاری کیا گیا۔ اب چونکہ ریل پرانی کیرج سروس سے خاصی تیز رفتار تھی۔۔۔ تو اسی لیے مقامی وقت میں اس طرز کے فرق سے خاصی زحمت ہوتی تھی۔ 1847ء میں برطانیہ کی سبھی ریل کمپنیوں نے سر جوڑے اور فیصلہ کیا کہ سبھی ریلوں کے ٹائم ٹیبل یا نظام الاوقات کو حتمی طور پر 'گرینچ کے معیاری وقت' کے حساب سے جاری کریں گے اور لیورپول، مانچسٹر یا گلاسگو وغیرہ کے مقامی اوقات کو چھوڑ دیا جائے گا۔ ریل کی کمپنیوں کے اس فیصلے پر ایک کے بعد کئی کئی دوسرے اداروں نے بھی عمل کرنا شروع کر دیا۔ بالآخر 1880ء میں برطانوی حکومت نے غیر معمولی قدم اٹھاتے ہوئے پارلیمان میں قانون منظور کیا جس کے تحت برطانیہ کے طول و عرض میں 'گرینچ کے معیاری وقت' کی پابندی کرنا لازم قرار دے دیا گیا۔ تاریخ میں پہلی بار، کسی ملک نے اپنی پوری آبادی کو مقامی سطح پر سورج کے طلوع اور غروب کے مطابق بسر رکھنے کی بجائے ایک مصنوعی لیکن معیاری گھڑی کے مطابق گزر بسر رکھنا لازمی بنا دیا۔

اس معتدل پیمانے پر شروعات نے بالآخر عالمی سطح پر نظام الاوقات کے رجحان کی بنیاد رکھ دی جبکہ سیکنڈ اور لمحوں کی حد تک مربوطی آتی گئی۔ پہلے ریڈیو اور پھر ٹیلی ویژن۔۔۔ جب ابلاغ کے یہ ذرائع کا آغاز ہوا تو یہ بھی ٹائم ٹیبل کے پابند تھے اور نظام الاوقات کے صحیح معنوں میں نافذ کنندہ اور مبلغ بن گئے۔ ریڈیو سٹیشن نشریات کے آغاز میں سب سے پہلے وقت کے سگنل نشر کرتے تھے۔۔۔ پاں پاں کی آوازوں سے سیکنڈوں کے سگنل نشر کیے جاتے اور دور دراز کے علاقوں اور سمندروں میں بحری جہاز بھی اپنی گھڑیاں اس وقت کے ساتھ ملا لیتے۔ بعد ازاں ریڈیو سٹیشنوں پر ہر گھنٹے بعد خبریں نشر کرنے کی روایت کا بھی آغاز ہو گیا۔ آج بھی، خبروں کے ہر بلیٹن میں دنیا کی اہم ترین خبروں سے بھی اہم، سب سے پہلے معیاری وقت کا اعلان نشر کرنا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران پورے یورپ میں، بشمول نازیوں کے زیر تسلط علاقوں میں بھی بی بی سی کے خبرناموں اور اہم نشریات کا آغاز لندن کے 'بگ بین' کے ہر گھنٹے بعد بجتے ناقوس، یعنی آزادی کی افسوئی آواز سے کیا جاتا تھا۔ جرمن طبیعیات دان نہایت چالاک تھے۔ انھوں نے بگ بین کی نشر کی جانے والی ناقوسی گھنٹیوں کی آواز میں معمولی فرق سے بھی لندن کے موسم کا بالکل صحیح صحیح اندازہ لگانا شروع کر دیا۔ یہ معلومات نازی جرمنی کی فضائیہ کے لیے انتہائی کار آمد تھی۔ جب برطانیہ کی خفیہ ایجنسیوں کو یہ خبر ملی تو انھوں نے مشہور گھڑیال کی ناقوسی گھنٹیوں کی آواز کو براہ راست نشر کرنے کی بجائے، اس کی ریکارڈنگ چلانی شروع کر دی۔

نظام الاوقات کے اس جال کو صحیح معنوں میں نافذ کرنے کے لیے سستی لیکن بالکل درست وقت بتانے والی دستی گھڑیاں عام ہو گئیں۔ قدیم آشوری، ساسانی یا انکا شہروں میں غالباً زیادہ سے زیادہ صرف چند ہی شمسی گھڑیاں رہا کرتی ہوں گی۔ قرونِ وسطیٰ دور کے یورپ میں ہر شہر میں غالباً صرف ایک ہی بہت بڑا گھڑیال رہا کرتا ہو گا جو شہر کے وسط میں کسی بڑے مینارے پر نصب رہا کرتا ہو گا۔ یہ گھنٹہ گھر، علانیہ طور پر غلط وقت بتاتے تھے لیکن اب چونکہ شہر میں کوئی دوسرا گھڑیال تو ہوتا نہیں تھا تو کسی کو نہ تو فرق پڑتا تھا اور نہ ہی درست وقت کی زیادہ ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ آج، دنیا بھر میں کسی بھی آسودہ اور دولتمند گھرانے میں اتنی گھڑیاں پائی جاتی ہیں کہ غالباً اتنی گھڑیاں تو قرونِ وسطیٰ دور کے کسی پورے ملک میں بھی نہ ہوتی ہوں گی۔ آپ اپنے ہاتھ پر بندھی گھڑی دیکھ، موبائل فون پر، بستر کے ساتھ تپائی پر رکھے ٹائم پیس پر، سامنے دیوار پر لگی گھڑی پر، باورچی خانے میں ٹنگی وال کلاک پر، مائیکروویواوون پر، ٹی وی اور ڈی وی ڈی پر یا کمپیوٹر کی سکرین کے کونے پر۔۔۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ وقت نہ دیکھنا چاہیے تو باقاعدہ ہوشمندی سے نظریں چرانی پڑتی ہیں۔

آج کوئی بھی شخص دن میں درجنوں بار گھڑی پر وقت دیکھتا ہے کیونکہ ہمارا تقریباً ہر کام وقت کا پابند ہے۔ صبح سات بجے الارم بج جاتا ہے۔ ٹوسٹر ٹھیک دو منٹ کے بعد گھنٹی بجا کر ڈبل روٹی کو جبکہ کافی میکر تین منٹ لگاتا ہے۔ ہمارے دانتوں کے الیکٹرک برش تین منٹ بعد گھنٹی بجا کر ہمیں روک دیتا ہے۔ پھر ہم سات بج کر چالیس منٹ کی ٹرین پکڑ کر کام پر پہنچتے ہیں۔ ورزش کرتے ہوئے مشینیں ٹھیک آدھے گھنٹے بعد رک کر ہمیں اطلاع دیتی ہیں۔ ٹی وی پر ہمارا پسندیدہ شو ٹھیک سات بجے شروع ہو جاتا ہے اور بیچ بیچ میں، ٹھیک دس منٹ بعد ڈیڑھ منٹ کا وقفہ ہوتا ہے۔ اس وقفے میں، اشتہار چلتے ہیں۔ ان اشتہاروں کی قیمت، ہر سیکنڈ کے حساب سے طے ہوتی ہے۔ جب ہم اس وقت کی دوڑ سے سخت جھنجھلا جاتے ہیں تو پھر نفسیات کے ماہر کے پاس پہنچ جاتے ہیں۔ یہ ماہر بھی معیاری طور پر ہر ہفتے ٹھیک پینتالیس منٹ کی کونسلنگ پر مبنی 'تھیراپی' کرتا ہے۔

صنعتی انقلاب نے انسانی معاشرے میں درجنوں مختلف طریقوں سے اتھل پتھل۔۔۔ کایا پلٹ کر رکھ دی ہے۔ وقت کی پابندی تو ان میں سے صرف ایک ہے۔ کئی دوسری مثالوں میں شہر کاری، دہقانیت کا خاتمہ، مزدور پیشہ طبقے کی اٹھان، عام شخص کا اختیار، جمہوریت کا راج، نوجوانوں کی ثقافت اور پدرشاہی میں بتدریج ٹوٹ پھوٹ وغیرہ شامل ہیں۔

تاہم، انسانی سماج کے یوں تہ وبالا ہونے کے عمل میں ایک شے ایسی ہے جس کے سامنے باقی ہر طرح کی تبدیلی ہیچ ہے۔ یہ انسانیت کو پیش آنے والی تاریخ میں کسی بھی انقلاب سے کہیں زیادہ تخریت کی نشانی بنی ہے۔ یہ خاندان اور مقامی تعلق واسطے کا خاتمہ اور اس کی جگہ لینے والی ریاست اور منڈی/بازار کا تصور ہے۔ ہمیں یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ انسان لاکھوں سال سے چھوٹے کنبوں، گروہوں اور حلقوں میں اپنے تعلق داری میں بسر رکھتا تھا جس میں اکثریت قرابت داروں کی ہوتی تھی۔ شعور، آگاہی اور پھر زرعی انقلاب نے بھی اس طور میں کوئی بگاڑ۔۔۔ کوئی تبدیلی نہیں لائی۔ انسان بدستور خاندانوں اور جڑ کر گروہوں اور سماج میں بسر کرتے ہوئے قبیلے، شہر، بادشاہتیں

اور سلطنتیں بھی بناتے آئے ہیں لیکن خاندان اور برادریاں، تعلق داری ہمیشہ ہی انسانی معاشروں کی بنیادی اکائی رہے ہیں۔ صنعتی انقلاب نے صرف دو سو سال کے مختصر عرصے میں ان اکائیوں کو توڑ کر مہین کر دیا ہے۔ خاندان اور سماج کے زیادہ تر روایتی کام اور فرائض۔۔۔ ریاست اور منڈیوں کے سپرد کر دیے ہیں۔

خاندان اور سماجی برادری کی موت

صنعتی انقلاب سے قبل، تقریباً سارے انسانوں کی روزمرہ زندگی تین قدیم چوکھٹوں میں بسر ہوتی تھی: اول مربوط گھرانہ، دوم بڑا خاندان اور سوئم مقامی تعلق داری پر مبنی برادری۔۔۔ زیادہ تر لوگ زرائع معاش کے لیے خاندان میں ہی جیسے خاندانی زراعت اور خاندانی کاروبار وغیرہ میں ہی کھپ جاتے تھے۔ اگر اپنا خاندانی کاروبار یا اراضیاں نہ ہوتیں تو وہ اڑوس پڑوس کے کسی خاندانی کاروبار اور اراضیوں پر محنت کر کے معاش کما لیتے تھے۔ خاندان صرف یہی نہیں بلکہ فلاح و بہبود، صحت، تعلیم کا نظام بھی ہوتا تھا اور یہی پنشن فنڈ، انشورنس کمپنی، ریڈیو، ٹی وی، اخبار، بینک بلکہ یہ تو پولیس کا کام بھی کرتا تھا۔
اگر کوئی شخص بیمار پڑ جاتا تو خاندان والے اس کی دیکھ بھال کر لیتے تھے۔ پورا خاندان بڑے بوڑھوں کی خدمت کرتا تھا اور اس کے بچے ہی دراصل پینشن فنڈ ہوتے تھے۔ کوئی شخص مر جاتا تو خاندان اس کے یتیموں اور بیوہ کو سنبھال لیتا تھا۔ اگر کوئی شخص گھر تعمیر کرنا چاہتا تو خاندان میں سے ہی اسے کافی قرضہ وغیرہ مل جاتا تھا۔ نیا کاروبار شروع کرنا ہے تو خاندان کے لوگ پیسہ جوڑ کر دے دیتے تھے۔ اگر کسی کا بیاہ ہے تو یہ خاندان ہی تھا جو اس کے لیے رشتہ تلاش کرتا، اس کا جوڑ بنتا اور خوب ہلے گلے سے بیاہ بھی کرواتا تھا۔ کسی پڑوسی سے جھگڑا ہو جاتا تو پورا خاندان اس پڑوسی کو سبق سکھانے میدان میں کود پڑتا تھا۔ تاہم، اگر کسی شخص کی بیماری بہت ہی سخت، علاج مہنگا ہوتا۔۔۔ کاروبار میں بڑھ کر سرمایہ درکار ہوتا یا اڑوس پڑوس کی معمولی تو تو میں میں بڑھ کر تشدد کا رخ پکڑ لیتی تو پھر۔۔۔ برادری آن کر بیٹھ جاتی تھی۔

برادریاں مقامی روایات اور خیر خواہی پر مبنی معیشت کی بنیاد پر مدد فراہم کرتی تھی۔ برادریوں کی معیشت میں، آزاد معشیت کی سرد مہری پر مبنی طلب و رسد کے اصول نہیں چلتے بلکہ اس سے بہت مختلف ہوتے ہیں۔ کسی قدیم، قرون وسطیٰ دور کی مانند برادری نظام میں جب کسی پڑوسی کو ضرورت پڑتی تھی۔۔۔ میں اس کا گھروندہ تعمیر کرنے میں مدد کر دیتا تھا یا اس کے مال مویشی کی رکھوالی بھی کر لیتا تھا۔ اس کام کے عوض مجھے اپنے پڑوسی سے کسی قسم کی ادائیگی کی توقع نہیں ہوتی تھی۔ لیکن جب مجھے کسی شے کی ضرورت پڑ جاتی تو میرا پڑوسی۔۔۔ ہنسی خوشی، خیر خواہی اور پاس لحاظ کرتے ہوئے میرا احسان اتار دیتا تھا۔ یہ صرف ہم پڑوسیوں کی آپس میں مہربانی اور عنایت نہیں تھی بلکہ اگر ہمارے گاؤں کا نواب یا راجہ اپنے لیے حویلی کھڑی کرنا چاہتا تو ہم سارے دیہاتی مل جل کر اس کا یہ کام کسی معاوضے

کے بغیر ہنسی خوشی کر لیتے تھے۔ اس کے بدلے، ہمیں یہ توقع رہتی تھی کہ وہ ہمیں رہزنوں اور بدمعاش، لچے لفنگوں کے شر سے محفوظ رکھے گا۔ دیہاتی زندگی میں لین دین تو بہت ہوتا ہے لیکن ادائیگیوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے، گاؤں قصبات میں بازار تو ہوتے ہی ہیں لیکن ان کا کردار نہایت محدود رہا کرتا تھا۔ آپ بازار سے کمیاب مسالے، کپڑا، اوزار وغیرہ خریدنے کے علاوہ طبیبوں اور وکیلوں، منشیوں کی خدمات ہی حاصل کرتے تھے۔ دیہاتوں میں بازار سے خریدی جانے والی مصنوعات اور خدمات زیادہ سے زیادہ کل معیشت کی دس فیصد ہی رہا کرتی تھیں۔ انسانی ضروریات کا تقریباً حصہ خاندان اور برادری ہی پورا کر لیتی تھیں۔

پھر ایسی بادشاہتیں اور سلطنتیں بھی ہوا کرتی تھیں جو جنگوں کے جوکھم اٹھانے، سڑکوں اور محلات کی تعمیرات جیسے اہم کام بھی سرانجام دیتی تھیں۔ ان مقاصد پورا کرنے کے لیے بادشاہ ٹیکس کی شرح بڑھادیتے تھے جبکہ کبھی کبھار سپاہیوں اور مزدوروں کی جبری بھرتیاں بھی کی جاتی تھیں۔ تاہم، چند موقعوں کو الگ رکھیں تو یہ بادشاہتیں اور سلطنتیں بھی خاندانوں اور برادریوں کے روزمرہ امور میں دخل اندازی نہیں کرتی تھیں۔ اگر کوئی ایسا کرنا بھی چاہتا تھا تو ایسے بادشاہ کو سخت مشکل کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ روایتی زرعی معیشتوں میں اضافی پیداوار اتنی ہی ہوتی تھی جس سے سرکاری حکام، پولیس، سماجی کارکنوں، اساتذہ اور ڈاکٹروں وغیرہ کا ہی پیٹ بھرا جاسکتا تھا۔ اسی وجہ سے بادشاہ کبھی بھی بڑے پیمانے پر عوامی فلاح و بہبود، صحت یا تعلیم کے نظام قائم کرنے سے قاصر رہتے تھے۔ وہ ان معاملات کو حل کرنے کا کام بخوشی خاندانوں اور برادریوں کے حوالے کر کے بے غم رہتے تھے۔ تاہم، اگر کسی نادر موقع جیسے چین میں چنگ سلطنت کے دوران دیکھنے میں آیا۔۔۔ اگر شہنشاہ دہقانوں کی روزمرہ زندگی میں دخل انداز ہونے کی کوشش کرتے بھی آئے ہیں تو انھوں نے اس مقصد کے لیے خاندانوں اور برادریوں کے سربراہان کو سرکاری نمائندہ تعینات کیا تھا۔

زیادہ تر تو اصل مسئلہ نقل و حرکت اور ذرائع ابلاغ میں دقت ہوتی تھی۔ دور دراز علاقوں میں پائے جانے والی برادریوں تک پہنچ پانا اس قدر مشکل تھا کہ زیادہ بادشاہتیں، بنیادی سطح پر بھی اپنی رٹ قائم کرنے میں ناکام رہتی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ ان بادشاہتوں نے ٹیکس کی وصولی اور تشدد کی روک تھام وغیرہ کے کام بھی برادریوں کے حوالے کر رکھے تھے۔ مثال کے طور پر سلطنت عثمانیہ میں خاندانی دشمنیوں اور قبائلی جھگڑوں کو ایک طاقتور سامراجی پولیس پال کر روکنے کی بجائے، کھلی چھٹی دے رکھی تھی۔۔۔ بلکہ یہ قبائل اور برادریوں کی صوابدید پر چھوڑ رکھا تھا۔ مثلاً، اگر اس دور میں میرا کوئی چچازاد کسی کو قتل کر دیتا تو اس کے بدلے مقتول کا بھائی میرا گلا کاٹ کر اس زیادتی کا بدلہ لے سکتا تھا۔ استنبول میں سلطان وقت یا صوبائی سطح پر کسی پاشا کو اس سے کوئی مطلب نہیں تھا بلکہ جب تک تشدد قابو کی حد میں رہتا تو انھیں سرے سے کوئی فکر نہیں ہوتی تھی۔

چین کی منگ سلطنت (1368ء–1644ء) میں رعایا کو 'باوجئیا نظام' کے تحت منظم کیا گیا تھا۔ دس خاندانوں کو ایک گروہ میں مجمع کر کے 'جئیا' تشکیل دیا جاتا تھا جبکہ دس جئیا مل کر ایک 'باو' بناتے تھے۔ جب کسی 'باو' سے تعلق رکھنے والا کوئی فرد جرم کرتا تھا تو

اس باو کے باقی افراد بھی اس جرم کی سزا کے حقدار ٹھہرتے تھے۔۔ بالخصوص اس باو کے بڑے بزرگوں کو خصوصی سزا دی جاتی تھی۔ اسی طرح ٹیکس کا اطلاق بھی باو پر ہوتا تھا۔ ہر خاندان، جنیا اور پورے باو کی مالی حالت کا اندازہ لگانے اور اسی حساب سے ٹیکس لاگو کرنے اور وصولی کی زمہ داری ریاستی حکام نہیں بلکہ ہر باو کے سربراہ کی ہوتی تھی۔ شہنشاہ وقت کے نکتہ نظر سے اس نظام کی کئی خوبیاں تھیں۔ سلطنت کو ہزاروں کی تعداد میں محکمہ مال کے افسران، ٹیکس کلکٹر اور اہلکار بھرتی کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی بلکہ یہ سارا کام برادریوں کے سربراہان کے حوالے تھا جو اپنی برادری کے ہر خاندان کی مالی حالت سے اچھی طرح واقف تھے۔ علاوہ ازیں، برادریوں کے یہ سربراہان بھائی بندی اور تعلق داری کے زریعے ہر خاندان سے باآسانی ٹیکس وصول کر لیتے تھے۔۔۔ جو سلطنت کے لیے الگ سردردی ہو سکتی تھی۔

تقریباً سبھی بادشاہتیں اور سلطنتیں صرف رعایا کی حفاظت کرنے والی 'بدمعاش' نہیں تھیں بلکہ حقیقت میں ان کی حقیقت کچھ بڑھ کر تھی۔ بادشاہ وقت کی مثال ایک ایسے غنڈے کی سی تھی جو رعایا سے ٹیکس کی شکل میں تاوان وصول کرتا تھا اور اس کے بدلے عوام کو ان کے اڑوس پڑوس میں جرائم پیشہ غنڈوں سے بچا کر رکھتا تھا اور وہ جو اس کے تحفظ میں ہوتے۔۔۔ کوئی انھیں ہاتھ بھی نہیں لگا سکتا تھا۔ اس کے علاوہ، بادشاہ کا کوئی کام اور نہ ہی کوئی عمل دخل تھا۔

یہ تو سلطنتوں کا حال تھا لیکن خاندان اور برادریوں کو سینے سے لگا کر زندگی بسر کرنا بھی کافی مشکل تھا۔ خاندان اور برادریاں اپنے یہاں افراد کو سخت جبر کا نشانہ بناتے تھے۔ ان خاندانوں اور برادریوں کا سلوک بالکل ایسے ہی رہا کرتا تھا جیسے آج جدید ریاستیں اور آزاد منڈی، بازار عوام کے ساتھ سنگدلی کاروا رکھتے ہیں۔ ان خاندانوں اور برادریوں کی حرکیات بھی اتنی ہی سفاک۔۔۔ تشدد سے پر اور ہمہ وقت دباؤ سے پر ہوتی تھیں جتنی آج جدید ریاستوں اور آزاد منڈیوں کی ہوتی ہے۔ لیکن بات یہ ہے کہ لوگوں کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ مثلاً 1750ء میں اگر کسی شخص کا خاندان یا برادری اس سے قطع تعلق کر لیتا تو اس کی مثال مردوں کی سی ہو جاتی تھی۔ اس کا کوئی کام کاروبار، پیشہ نہیں رہتا تھا۔ وہ ان پڑھ اور مشکل یا بیماری کی صورت۔۔۔ اس کا کوئی پرسان حال نہ رہتا۔ اسے کوئی شخص قرض نہ دیتا اور کسی مشکل میں پڑ جاتا تو اس کی مدد کو کوئی نہ ہوتا۔ تب ریاستی پولیس، سماجی بہبود کے شعبے اور نہ ہی لازمی تعلیم کا کوئی طریقہ کار تھا۔ چنانچہ، ایسے شخص کی بقاء کا صرف ایک ہی طریقہ تھا کہ وہ جلد از جلد اپنے لیے کوئی خاندان یا برادری ڈھونڈ لیتا۔ اس زمانے میں گھروں سے بھاگ جانے والے لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے زیادہ سے زیادہ کسی خاندان میں نوکر بننے کے سوا کوئی چارہ نہ ہوتا تھا۔ کسی خاندان کا نوکر بن جانا تو پھر بھی اچھا تھا ورنہ ایسے لڑکے شاہی فوج میں بھرتی ہو کر جبکہ لڑکیاں کسی قحبہ خانے میں پہنچ کر ختم ہو جاتے تھے۔

تاہم، یہ صورتحال پچھلے دو سو برسوں میں نہایت ڈرامائی انداز میں بدل چکی ہے۔ صنعتی انقلاب نے تجارتی منڈیوں کو بے پناہ نئی طاقت بخشی ہے اور ریاستوں کو اطلاعات، ابلاغ اور نقل و حرکت کے نت نئے، تیز ترین طریقے فراہم کیے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ ریاستوں کے

پاس اب کلرکوں، اساتذہ، پولیس اور سماجی کارکنوں کی پوری فوج بھی دستیاب ہوتی ہے۔ شروعات میں تو ریاست اور تجارتی منڈیوں کو روایتی خاندانی اور برادری نظام کے ہاتھوں سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔۔۔ کیونکہ یہ نظام بیرونی مداخلت کا حامی نہیں تھا اور سخت قدامت پرست واقع ہوا تھا۔ خاندانوں کے بزرگ اور برادریوں کے سربراہان کسی صورت بھی نوجوان نسل کو قوم پرست تعلیمی نظام، افواج میں بھرتی کرنے اور شہروں میں بسنے والے بے جڑ مزدور طبقہ بنانے پر راضی نہیں تھے۔

لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا۔۔۔ ریاستیں اور آزاد تجارتی منڈیاں روز بروز بڑھتی ہوئی طاقت کی مدد سے خاندانوں اور برادریوں کے روایتی بندھنوں کو کمزور کرنے میں کامیاب ہونے لگیں۔ اب ریاستیں خاندانی دشمنیوں اور تنازعات سے نبٹنے کے لیے پولیس کا استعمال کرنے لگیں اور پنچائیتوں میں فیصلے کی بجائے عدالتوں کو آباد کر دیا گیا۔ ریاستی قوانین، مقامی روایات اور رسوم پر برتر قرار دے دی گئیں۔ دوسری جانب آزاد منڈیوں نے طویل مدت سے رائج مقامی روایات کو ہاکروں کی مدد سے ختم کر دیا اور دیہی معیشت کی جگہ نت نئے فیشن پر مبنی، ہر دم بدلتی رہنے والی تجارتی سرگرمیوں کو متعارف کروا دیا۔ لیکن یہ پھر بھی کافی نہیں تھا۔ خاندان اور برادریوں کی طاقت کو توڑنے کے لیے ریاستی اور منڈی کی سطح پر پورا ایک نیا ستون کھڑا کرنا پڑا۔

ہوا یوں کہ ریاست اور تجارتی منڈیوں نے لوگوں کو ایک ایسی پیشکش کی جس کو مسترد کرنا ممکن ہی نہیں تھا۔ ریاستوں اور تجارتی منڈیوں نے لوگوں کو سبق دیا کہ، 'انفرادی سطح پر سوچو۔۔۔ فرد بن جاؤ!'۔ اس سے مراد یہ تھی: 'جس سے چاہو شادی بیاہ رچاؤ اور اس کے لیے اپنے والدین اور بڑے بزرگوں سے اجازت لینے کی بھی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ تم جو پیشہ اختیار کرنا چاہتے ہو۔۔۔ بے شک اختیار کرو اور برادری وغیرہ کی پرواہ نہ کرو۔ جہاں تم چاہتے ہو، وہیں بسر رکھو اور اگر تمھیں اس کے لیے اپنے خاندان سے دور رہنے کی بھی ضرورت پڑتی ہے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ تم اپنے خاندان اور برادری کے محتاج نہیں ہو بلکہ ہم۔۔۔ یعنی ریاستیں اور تجارتی منڈیاں تمھارا پورا پورا خیال رکھنے کی ذمہ داری اٹھائیں گے۔ تمھیں بنیادی حقوق حاصل ہیں جس کے تحت خوراک، چھت، تعلیم، صحت، بہبود اور معاش ریاست اور تجارتی منڈی کی ذمہ داری ہے۔ ہم تمھیں پنشن بھی دیں گے، انشورنس بھی کروائیں گے اور تمھیں تحفظ بھی ملے گا!'

آج دنیا بھر میں رومان پسند ادب میں عام طور پر ایک فرد کو کچھ یوں پیش کیا جاتا ہے جو ریاست اور تجارتی منڈی سے نبرد آزما رہتا ہے۔ یہ حقیقت سے بہت ہی دور ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ریاست اور منڈی گویا ایک فرد کے ماں اور باپ ہوتے ہیں اور فرد کی بقاء، انھی دونوں کی دین ہے۔ منڈی ہمیں کام، انشورنس اور پنشن دیتی ہے۔ اگر ہم کوئی مخصوص پیشہ اختیار کرنا چاہتے ہیں تو حکومتی تعلیمی ادارے ہمیں پڑھنے کا خوب موقع دیتے ہیں۔ اگر ہم کوئی کاروبار شروع کرنا چاہتے ہیں تو منڈی میں کئی کئی بینک آسان شرائط پر قرضے فراہم کرنے کو تیار رہتے ہیں۔ اگر ہم گھر تعمیر کرنا چاہیں تو کئی کئی ٹھیکیدار دوڑے آتے ہیں اور بینک ہمیں رہن پر رقم بھی دے دیتے ہیں۔ بعض دفعہ تو

ریاستیں ہی اس کام کا ذمہ اٹھالیتی ہیں اور خصوصی ادارے تشکیل دیے جاتے ہیں۔ اگر تشدد کا سامنا ہو تو پولیس ہمیں تحفظ دیتی ہے۔ اگر ہم چند دن کے لیے بیمار پڑ جائیں تو ہیلتھ انشورنس کی کمپنیاں ہمارا پورا خیال رکھتی ہیں۔ اسی طرح اگر چند ماہ تک مالی طور پر کمزور پڑ جائیں تو سماجی تحفظ کا شعبہ ہماری مدد کو آن پہنچتا ہے۔ اگر ہمیں ہر دم مدد اور خدمت کی ضرورت ہو تو ہمیں منڈی میں نرسوں کی خدمات مل جاتی ہیں۔ یہ نرسیں ہمیں جانتی اور نہ ہی پہچانتی ہیں لیکن یہ ہمارا اس طرح خیال رکھتی ہیں کہ اتنا ہمارے بچے بھی نہ رکھیں۔ اگر ہمارے پاس ذرائع ہوں تو ہم بڑھاپے میں بہترین طور پر بسر رکھ سکتے ہیں۔۔۔ بازار میں کیا ہے جو نہیں ملتا؟ ٹیکس کے حکام بھی ہمیں فرد کی نظر سے دیکھتے ہیں اور ہم سے اپنے پڑوسی کے ٹیکس کا تقاضا نہیں کرتے۔ عدالتیں بھی ہمیں ایک الگ فرد سمجھتی ہیں اور ہمیں اپنے چچازاد کے کسی جرم کی سزا نہیں ملتی۔

آج صرف بالغ مرد ہی نہیں بلکہ عورتوں اور بچوں کو بھی الگ اور آزاد فرد سمجھا جاتا ہے۔ اس سے قبل عورتیں تاریخ بھر میں اپنے خاندان یا کسی برادری کی ملکیت تصور کی جاتی تھیں۔ آج جدید ریاستیں عورتوں کو آزاد اور خود مختار فرد کی نظر سے دیکھتی ہیں جنھیں اپنے خاندان اور برادری سے مکمل طور پر آزاد اور خود مختار رہتے ہوئے معاشی اور قانونی حقوق حاصل ہیں۔ عورتیں بھی اپنا ذاتی بینک اکاؤنٹ کھول سکتی ہیں، اپنی مرضی سے شادی کر سکتی ہیں اور یہاں تک کہ طلاق بھی حاصل کر سکتی ہیں اور اپنی مرضی سے۔۔۔ اپنے بل بوتے پر بسر بھی رکھ سکتی ہیں۔

لیکن اس شخصی آزادی کی بھاری قیمت بھی ادا کرنی پڑتی ہے۔ وہ یوں کہ آج ہم میں سے اکثریت مضبوط خاندانوں اور برادریوں سے چھٹنے کا سخت افسوس اور غم کرتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ ہم انفرادی سطح پر اکثر ہی معاشرے سے منقطع، کٹا ہوا محسوس کرتے ہیں اور یہ تو بہت ہی عام ہے کہ ہمیں ریاستی اور منڈی کی طاقت سے ڈر بھی محسوس ہوتا ہی ہے کہ وہ ہماری زندگیوں پر نہ صرف قابو رکھتے ہیں بلکہ ہماری ذاتی زندگیوں میں مدخل ہونے کے درپے بھی رہتے ہیں۔ ریاستوں اور منڈیوں میں بھی کٹ کر علیحدہ، انجانے لوگ بیٹھے ہیں جو شہریوں کی زندگیوں میں اتنی آسانی سے دخل انداز ہو سکتے ہیں کہ جتنا مضبوط خاندانوں اور برادریوں کے لیے بھی ممکن نہ تھا۔ آج جب، کسی ایک ہی عمارت کے دو اپارٹمنٹوں میں بسنے والے پڑوسی آپس میں جمعدار کی تنخواہ پر راضی نہیں ہو سکتے تو بتائیے، وہ ریاست کا سامنا کیسے کریں گے؟ ہم ان سے ویسی ہی مزاحمت کی توقع کیسے کریں، جیسی وہ کبھی اپنے خاندان اور برادری کے سامنے با آسانی کر لیا کرتے تھے؟

ریاستوں، منڈیوں اور افراد کے بیچ جو سودا طے پایا ہے، وہ نہایت ہی پریشان کن اور مخدوش ہے۔ ریاست اور منڈی آپس میں باہمی فرائض اور حقوق پر راضی نہیں ہوتے جبکہ افراد کو ہمیشہ یہ ان دونوں سے شکایت رہتی ہے۔ افراد کے نزدیک ان دونوں کے تقاضے تو بہت زیادہ ہیں لیکن سہولت نہ ہونے کے برابر ہے۔ زیادہ تر تو یہ ہوتا ہے کہ منڈیاں افراد کا خوب استحصال کرتی ہیں جبکہ ریاستیں شہریوں

کی حفاظت کرنے کی بجائے سپاہیوں، پولیس اور بیوروکریٹوں کی فوجیں بھرتی کر کے ان دق پہنچاتی رہتی ہیں۔ لیکن، حیران کن طور پر یہ سودا۔۔۔ اگرچہ ناقص انداز میں ہی سہی لیکن بہر حال قائم رہتا ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ اس سے پیچھے ہٹنے کا مطلب یہ ہے کہ لاتعداد انسانی نسلوں کے سماجی سلسلے سے انکار ہے۔ لاکھوں برس تک ارتقاء نے ہمیں خوب بینچ کر سماجی برادریوں میں بسر رکھنے کا اہل بنایا ہے۔ اب، صرف دو سو سال کے مختصر عرصے میں ہم اس سماج سے کٹ کر، ایک دوسرے سے لاتعلق فرداً فرداً بٹ چکے ہیں لیکن پھر بھی ہمیں کسی نہ کسی صورت سماجی سلسلے کی ضرورت پڑتی ہی ہے۔ ثقافت کی بے مثال طاقت کی اس سے بہتر تائید کوئی دوسری نہیں ہو سکتی۔

آج جدید منظر نامے سے مربوط گھرانوں کا تصور مکمل طور پر ختم نہیں ہوا۔ جب ریاستوں اور منڈیوں نے خاندان سے معاشی اور سیاسی کردار اچک لیا تو بہر حال ایک نہایت اہم، یعنی جذباتی کردار پھر بھی خاندان کے پاس ہی رہنے دیا۔ آج جدید دور میں بھی ہر شخص کی انس اور لگاؤ سے جڑی ضرورتیں خاندان ہی پورا کرتے ہیں۔۔۔ ریاستیں اور منڈیاں، یہ جذباتی لگاؤ فراہم کرنے سے قاصر ہیں۔ لیکن یہاں بھی خاندان کو روز بروز بڑھتی ہوئی مداخلت کا سامنا ہے۔ وہ یوں کہ آج منڈیاں ہی لوگوں کے رویوں۔۔۔ بالخصوص رومانوی اور ازدواجی زندگیوں میں طرزِ عمل، طور طریقوں اور ترجیحات کو طے کرنے میں بڑھ چڑھ کر کردار ادا کر رہی ہیں۔ اگر اس سے قبل روایتی طور پر خاندان ہی افراد کے بیچ تعلق قائم کرنے کا کردار ادا کرتے تھے تو آج یہ منڈیاں ہیں جو ہمارے لیے رومانوی اور ازدواجی ترجیحات کا فیصلہ کرواتی ہیں اور پھر ہمیں ان ترجیحات اور تعلق کو قائم کرنے میں پوری پوری مدد بھی فراہم کرتی ہیں۔ ظاہر ہے، منڈیاں۔۔۔ اس کام کا بھاری معاوضہ بھی وصول کرتی ہیں۔ ماضی میں دلہا اور دلہن کی ملاقات کسی خاندان کے ڈرائنگ روم میں ہوتی تھی جبکہ جہیز اور حق مہر کا پیسہ ایک خاندان سے دوسرے کو منتقل ہوتا تھا۔ آج، یہ ملاقاتیں کیفوں اور ریستوانوں میں ہوتی ہیں جبکہ پیسہ ان محبت کرنے والوں سے ویٹرسوں کو منتقل ہوتا ہے۔ اس سے بھی زیادہ پیسہ فیشن ڈیزائنروں، جم کے منیجروں، ڈائٹیشنوں، بیوٹی پارلروں اور پلاسٹک سرجنوں کے اکاؤنٹ میں جاتا ہے۔ منڈی میں چلنے والے یہ سارے کاروبار افراد کو منڈی کے ہی طے کردہ حسن اور زیبائش کے معیارات کے عین مطابق تیار کر کے، منڈی کی مرضی کے کیفوں اور ریستوانوں۔۔۔ شادی ہالوں میں لوگ محبت اور انس، لگاؤ کا اظہار کرتے ہیں۔ پھر جب میل ہو جاتا ہے۔۔۔ شادی بیاہ ہو جائے تو پھر منڈی کا طے کردہ، زندگی گزارنے کا ایک نیا چکر شروع ہو جاتا ہے۔
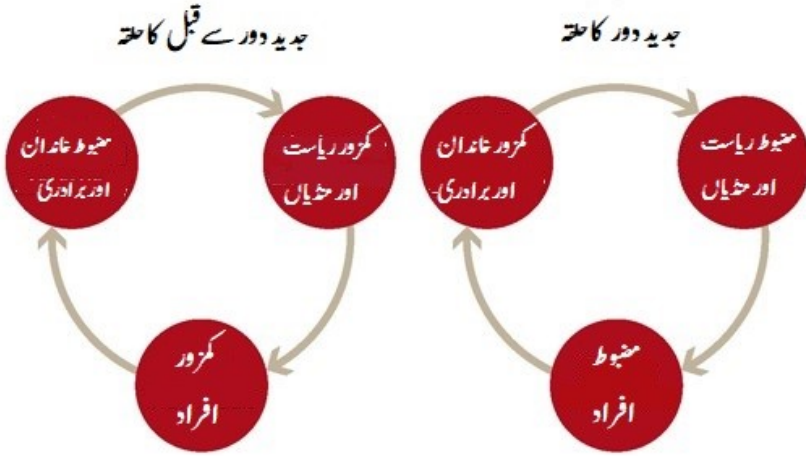
ریاست بھی گھرانوں اور خاندانوں کے بیچ تعلقات پر انتہائی گہری نظر رکھتی ہے بالخصوص والدین اور بچوں کے درمیان تعلق پر تو اس کی خصوصی توجہ رہتی ہے۔ آج والدین پر لازم ہے کہ وہ اپنے بچوں کو ریاستی طرز اور طریقے پر تعلیم کے نظام میں شامل کروائیں۔ وہ والدین جو اپنے بچوں پر تشدد یا دشنام کے مرتکب ہوتے ہیں، ریاست ان سے خوب نبٹتی ہے۔ اگر ضرورت پڑے تو مضبوط ریاستیں ان بچوں کو اپنے والدین سے الگ کر کے رضاعی خاندانوں میں پلنے کے لیے بھی بھیج سکتی ہیں۔ یہ تو ماضی قریب کا ہی قصہ ہے کہ والدین کا اپنے بچوں کے ساتھ ناروا سلوک پر ریاستی مداخلت کو انتہائی مضحکہ خیز اور ناقابل عمل شے سمجھا جاتا تھا۔ دنیا کے تقریباً ہر معاشرے میں والدین کی بالادستی اور مقتدری کو مقدس سمجھا جاتا آیا ہے۔ اپنے والدین کی اطاعت کو کسی بھی فرد کے لیے انتہائی برتر قدر سمجھا جاتا رہا ہے۔ یہ اطاعت اس قدر مقدس اور برتر سمجھی جاتی رہی ہے کہ والدین اپنے بچوں کے ساتھ جو چاہیں، کر سکتے تھے۔۔۔ یہاں تک کہ اگر چاہتے تو شیر خواری میں بھی بچوں کو قتل کر سکتے تھے، زندہ دفن کرنے میں کوئی عار نہیں سمجھی جاتی تھی۔ وہ اپنے بچوں کو غلام بنا کر بیچ بھی دیتے تھے اور بیٹیوں کو تو اپنی عمر سے دوگنے مردوں کے ساتھ بیاہنے، سودوں میں تبادلہ کرنے کا رواج تو آج بھی دنیا میں کہیں نہ کہیں پایا ہی جاتا ہے۔ آج تاریخ میں پہلی بار والدین کا یہ اقتدار سخت خطرے سے دوچار ہے اور پیچھے ہٹنے پر مجبور ہے۔ نوجوانوں کو بڑوں کی بے ادبی کی کھلی چھٹی ملتی ہے جبکہ ان بچوں کی زندگی میں کسی بھی قسم کی کوتاہی اور خرابی کا سراسر زمہ دار والدین کو ہی ٹھہرایا جاتا ہے۔ آج ماں اور باپ کو عدالتوں میں اس طرح گھسیٹا جاتا ہے جیسے کبھی اسٹالن پرستوں کو نمائشی عدالتوں میں خواہ مخواہ، بوجوہ رسوا کیا جاتا تھا۔

تصوراتی برادریاں

جدید انسانی معاشروں میں جیسے مربوط گھرانے، ویسے ہی برادریاں بھی مکمل طور پر جذباتی لگاؤ کو الگ کیے بغیر ختم نہیں ہو پائیں۔ آج منڈیاں اور ریاستیں وہ ساری مادی ضرورتیں پوری کرتی ہی ہیں جو کبھی برادریوں کا ذمہ ہوا کرتا تھا لیکن ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ قبائلی تعلق اور بندھن کو بھی یقینی بنائیں۔

ریاستیں اور منڈیاں یہ کام 'تصوراتی برادریوں' کی مدد سے پورا کرتی ہیں جس میں لاکھوں کی تعداد میں اجنبی شامل ہوتے ہیں۔ یہ تصوراتی برادریاں خصوصی طور پر قومی اور تجارتی ضروریات کو مدنظر رکھ کر تشکیل دی جاتی ہیں۔ ایک تصوراتی برادری، ایسی برادری ہوتی ہے جس میں لوگ ایک دوسرے کو نہیں جانتے لیکن ان کا خیال یہ ہوتا ہے کہ وہ واقعی ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ ایسی برادریاں انوکھی اور نرالی تخلیق نہیں ہیں۔ قدیم چین میں دسیوں لاکھ لوگ خود کو ایک بہت بڑے خاندان کا فرد سمجھتے تھے جبکہ شہنشاہ وقت اس خاندان کا سربراہ، باپ سمجھا جاتا تھا۔ عہد وسطیٰ میں لاکھوں کی تعداد میں متقی مسلمان ایک دوسرے کو بہن اور بھائی سمجھ کر ایک بڑی برادری اور خاندان، یعنی 'امہ' کا حصہ سمجھتے تھے۔ تاہم، تاریخ بھر میں اس طرح کی تصوراتی برادریوں کا کردار، ان واقعی اور قریبی برادریوں کے مقابلے میں ثانوی رہا کرتا تھا جس میں چند درجن لوگ ہی شامل ہوتے تھے اور ان کے بیچ بے تکلفی اور قلبی تعلق ہوتا تھا۔ یہ قریبی اور واقعی برادریاں، لوگوں کی جذباتی ضروریات کو پورا کرتی تھیں اور ان کے بقاء اور بہبود کے لیے انتہائی لازم تھیں۔ پچھلی دو صدیوں میں یہ قریبی اور قلبی برادریاں مٹتی جارہی ہیں اور ان کی جگہ تصوراتی برادریاں اس خلا کو پر کر رہی ہیں۔

ان تصوراتی برادریوں کی اٹھان میں دو نہایت اہم مثالیں قومیں اور صارفین کے قبیلے ہیں۔ قوم، ریاستوں کی تخلیق کردہ جبکہ صارفین کے قبیلے یا گروہ منڈی کی پیدا کردہ تصوراتی برادری ہوتی ہیں۔ یہ دونوں ہی تصوراتی برادریاں ہیں کیونکہ کسی منڈی کے سبھی صارفین یا کسی ریاستی قوم کے سبھی افراد کے لیے اس طرح ایک دوسرے کو جاننا اور پہچاننا ممکن نہیں ہوتا جس طرح ماضی میں گاؤں قصبات کی برادریوں کے لیے ممکن تھا۔ مثلاً ایک جرمن شہری کے لیے باقی کے آٹھ کروڑ جرمنوں کو قلبی طور پر جاننا یا کسی ایک صارف کے لیے اسی مصنوعہ کے باقی پچاس کروڑ یورپ کی منڈی میں صارفین کو جاننا ممکن نہیں ہے۔ (دلچسپ امر یہ ہے کہ یورپی یونین، یونین بننے سے قبل یورپی برادری کہلائی جاتی تھی!)

صارفیت اور قوم پرستی لاکھوں اجنبیوں کو ایک ہی برادری میں ڈھالنے کے لیے سردھڑ کی بازی لگادیتی ہے۔ ہمیں باربار اور بہتیری بار باور کرایا جاتا ہے کہ ہم ایک ہی لوگ ہیں، ہمارا ماضی ایک ہے، ہمارے مفادات مشترک ہیں اور ہمارا مستقبل بھی ایک ہے۔ یہ جھوٹ نہیں بلکہ یہ ایک تخیل اور تصور ہے۔ جس طرح پیسہ، لمیٹڈ کمپنی یا انسانی حقوق وغیرہ ہیں۔۔۔ ویسے ہی اقوام اور صارفیت بھی بین الموضوعی حقیقتیں

ہیں۔ یہ بھی صرف ہمارے اجتماعی تخیل میں پائی جاتی ہیں لیکن بے پناہ قوت کی حامل ہوتی ہیں۔ جب تک دسیوں لاکھ جرمن، جرمن قوم کے وجود پر یقین رکھتے ہوئے، جرمنی کی قومی علامتوں اور یادگاروں پر جوش محسوس کریں گے، جرمنی کی قومی حکایات سنائیں گے اور جرمن قوم کی سربلندی کے لیے پیسہ، وقت اور جان کی قربانی دیتے رہیں گے۔۔۔ اس وقت تک جرمنی اس دنیا کی ایک انتہائی مضبوط طاقت بن کر باقی رہے گی۔

ہر قوم اپنے تصوراتی کردار کو چھپانے کی ہر ممکن کوشش کرتی ہے۔ تقریباً سبھی اقوام اپنے وجود کو فطری اور لازوال قرار دیتی ہیں جس میں مادرِ وطن کی مٹی اور اس قوم کے جری افراد کا خون شامل ہوتا ہے۔ تاہم، یہ انتہائی مبالغہ آرائی پر مبنی بڑھا چڑھا کر پیش کیے جانے والے دعویٰ ہے۔ اقوام کا اصل وجود ماضی بعید میں ہوا کرتا تھا لیکن اس وقت بھی ان کی اہمیت آج کے مقابلے میں کہیں کم رہا کرتی تھی کیونکہ ماضی کے اس گزشتہ دور میں ریاستوں کا کردار بہت ہی معمولی بلکہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ مثال کے طور پر قرونِ وسطیٰ دور کے نیر مبرگ کا ایک باشندہ، جرمن قوم کے ساتھ ضرور کچھ نہ کچھ نمک حلالی دکھاتا ہی ہوگا لیکن اس کی کل وفاداری بہر حال، اپنے خاندان اور برادری کے ساتھ رہتی ہوگی کیونکہ اس کا خاندان اور برادری ہی اس کی ضروریات کو پوری کیا کرتا تھا۔ مزید برآں یہ کہ قدیم اقوام کو بھلے جو بھی اہمیت حاصل رہی ہو۔۔۔ ان میں سے بس اکاد کا ہی باقی بچی تھیں۔ آج دنیا بھر میں پائی جانے والی تقریباً سبھی اقوام نے صنعتی انقلاب برپا ہونے کے بعد وجود حاصل کیا ہے۔

اس ضمن میں مشرقِ وسطیٰ کی مثال سب سے واضح اور بہترین ہے۔ شامی، لبنانی، اردنی اور عراقی اقوام کہاں سے آئی ہیں؟ یہ ساری اقوام اصل میں اس حادثاتی اور شدنی سرحد کا شاخسانہ ہیں جو فرانسیسی اور انگریز سفارتکاروں نے مقامی تاریخ، جغرافیے اور معیشت کی پرواہ کیے بغیر الل ٹپ طریقے سے نقشے پر ڈال دی تھیں۔ 1918ء میں ان سفارتکاروں نے بیٹھے بٹھائے فیصلہ کر لیا کہ کردستان، بغداد اور بصرہ کے لوگ اب عراقی ہیں۔ دوسری جانب فرانسیسیوں نے یہ فیصلہ کیا اس خطے کی آبادی میں سے کون شامی اور کون کون لبنانی ہوگا۔ صدام حسین اور حافظ الاسد اپنی پوری زندگی اسی مصنوعی انگریزی اور فرانسیسی قومی شعور کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتے رہے لیکن ان کی عراقی اور شامی اقوام کی ابدیت اور لازوال ہونے بارے زوردار تقریریں اور خطبے کھوکھلے ہوا کرتے تھے۔

لیکن یہ یاد رہے کہ اقوام، ہوا میں نہیں بنتیں۔ اگرچہ عراقی اور شامی اقوام حادثاتی سرحدوں کا شاخسانہ ضرور تھا لیکن ان کو بعد از سفارت واقعی اقوام میں ڈھالنے والوں نے تاریخ، جغرافیے اور ثقافت کے حقیقی خام مال کو استعمال کیا تھا۔ ان میں سے بعض حقائق تو صدیوں بلکہ ہزاروں سال پرانے تھے۔ صدام حسین نے خلافت عباسیہ اور بابل کی سلطنت کے ورثے کو ملا کر عراقی قوم کا تصور اجاگر کیا تھا۔ یہاں تک کہ، عراقی افواج میں ایک ڈویژن کا نام 'حمورابی ڈویژن' بھی رکھا گیا تھا۔ لیکن، ان تاریخی حقائق کو استعمال میں لانے کا یہ

مطلب بھی نہیں ہے کہ عراقی قوم ایک قدیم وجود بن گئی۔ بات یہ ہے کہ اگر میں باورچی خانے میں پچھلے دو ماہ سے پڑے میدے، گھی اور چینی کو استعمال میں لا کر کیک بنالوں تو اس کا یہ ہرگز مطلب نہیں ہے کہ یہ کیک بھی دو ماہ پرانا ہے۔

حالیہ دہائیوں میں 'صارفین پر مبنی قبائل' کی اٹھان سے 'قومی برادریوں' کا رنگ پھیکا پڑ گیا ہے۔ صارفین کے قبائل سے مراد وہ صارفین ہیں جو ایک دوسرے کو نہیں جانتے لیکن بہرحال ایک ہی طرح کے کی اشیاء اور مصنوعات کے استعمال اور طریق خرچ پر یقین رکھتے ہیں۔ ان کی دلچسپیاں ایک سی ہوتی ہیں اور یوں وہ صارفین کے ایک ہی قبیلے کی طرح محسوس کرتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ وہ خود کو ایسا قرار بھی دیتے ہیں۔ یہ سننے میں نہایت عجیب محسوس ہوتا ہے لیکن ہمارے ارد گرد اس کی کئی کئی مثالیں بکھری پڑی ہیں۔ مثال کے طور پر 'میڈونا' کو پسند کرنے والوں کا اپنا الگ 'فرقہ' ہے۔ اس فرقے کے لوگ خود کو اپنی صارفیت سے ثابت کرتے ہیں۔ وہ میڈونا کے میوزیکل کنسرٹوں کے ٹکٹ، نئے البم، پوسٹر، شرٹیں، رنگ ٹون خریدتے ہیں اور خود کو یوں ہی متعارف بھی کرواتے ہیں۔ مانچسٹر یونائیڈ ڈ کو پسند کرنے والے، سبزی خور اور ماحولیات کے تحفظ پر یقین رکھنے والے۔۔۔ ایسی ہی مثالیں ہیں۔ ان کی تعریف بھی اسی طرز پر ممکن ہے جو وہ استعمال کرتے ہیں۔ صارفیت، ان کی شناخت میں کلیدی پتھر ہوتا ہے۔ ایک جرمن سبزی خور، یقیناً کسی فرنچ گوشت خور کی بجائے، سبزی خور کے ساتھ ہی بیاہ کرنے کو ترجیح دے گا۔

حرکت کی ہمیشگی

پچھلی دو صدیوں میں برپا ہونے والے انقلاب اس قدر اساسی اور سریع رہے ہیں کہ انھوں نے سماجی نظام کی بنیادی خصوصیات کو بھی سرے سے بدل کر رکھ دیا ہے۔ روایتی طور پر ایک سماجی نظام انتہائی سخت اور بے لوچ سمجھا جاتا تھا۔ 'نظام' کے لفظ سے ہی استحکام اور تسلسل کا احساس ہوتا تھا۔ سریع سماجی انقلاب، کبھی بھی عام نہیں رہے بلکہ سماجی بدلاؤ ہمیشہ سے ہی بے شمار چھوٹے چھوٹے قدموں کے مجموعے سے تعبیر کیا جاتا رہا ہے۔ انسان ہمیشہ سے یہ سمجھتے آئے ہیں کہ سماجی ڈھانچہ اٹل اور لازوال ہوتا ہے۔ سماجی نظام میں خاندان اور برادریوں کا مقام بھلے بدلتا رہتا ہو لیکن اس نظام کی بنیادی ہئیت بدلنے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ لوگ خود کو نظام کی حالت کے ساتھ ڈھالنے کی کوشش کرتے تھے اور علی الاعلان کہا کرتے تھے کہ، 'یہ ہمیشہ سے ایسا ہی ہوتا آیا ہے اور یہ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا رہے گا!'۔

پچھلی دو صدیوں میں بدلاؤ کی رفتار اس قدر تیز رہی تھی کہ اب سماجی نظام نے بھی نت نئی حرکیات اور ورق پذیری کی فطرت اختیار کر لی ہے۔ اب صورتحال یہ ہے کہ سماجی نظام ہر وقت مسلسل بہاؤ کی شکل میں وجود رکھتا ہے۔ جب ہم جدید دور کے انقلاب کی بابت سوچتے ہیں تو ہمارے ذہن میں 1789ء (فرانسیسی انقلاب)، 1848ء (آزاد خیالی انقلاب) یا پھر 1917ء (روسی انقلاب) ہی آتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ آج ہر دن، ہر سال انقلابی ثابت ہوتا ہے۔ آج تیس سال کا کوئی بھی جواں سال شخص، عدم یقینی کے

شکار نوخیز بچوں کو پوری ایمانداری سے بتاتا ہے کہ،'جب میں کمسن تھا تو یہ دنیا بالکل مختلف ہوا کرتی تھی۔۔۔'مثال کے طور پر انٹرنیٹ 1990ء کے اواخر میں عام ہونا شروع ہوا تھا۔ یہ بمشکل بیس سال پرانی بات ہے۔ آج ہم انٹرنیٹ کے بغیر دنیا کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔

چنانچہ، آج جدید معاشرے کی خصوصیات کو بیان کرنا گویا گرگٹ کا رنگ بتلانے کی کوشش کے مترادف ہو گا۔ تاہم، اس کی ایک خصوصیت ایسی ہے، جو بالکل یقینی ہے اور وہ لگاتار اور مسلسل تبدیلی کی خاصیت ہے۔ لوگ اس خصوصیت کے اس قدر عادی ہو چکے ہیں کہ آج ہم سب سے ہی سماجی نظام کو ایک لچک دار شے سمجھ کر اس میں روز ہی نت نئے تجربے کرتے ہیں اور اس کو بہتر سے بہتر بنانے کی دھن میں لگے رہتے ہیں۔ جدید دور سے قبل کے حکمرانوں کا سب سے بڑا وعدہ ہی یہ ہوتا تھا کہ روایتی سماجی نظام کا تحفظ کیا کریں گے یا اپنی رعایا کو کسی قدیم، بھولے بسرے لیکن سنہری دور کی طرف لے کر جائیں گے۔ پچھلی دو صدیوں کے دوران سیاست کا وعدہ یہ رہا ہے کہ روایت کو توڑ، پرانی دنیا کو ختم کر کے بہتر سے بہتر جہاں بنایا جائے گا۔ یہاں تک کہ سخت گیر اور قدامت پرست سیاسی جماعتیں بھی کبھی یہ وعدہ نہیں کرتیں کہ ان کے یہاں حالات، جوں کے توں رہیں گے۔ آج ہر سیاستدان سماجی، تعلیمی اور معاشی سدھار اور اصلاح کا وعدہ کرتا ہے اور ان میں سے اکثر ان وعدوں پر پورا بھی اترتے ہیں۔

جس طرح ارضیات دان یہ توقع رکھتے ہیں کہ ساختمائی حرکات کے نتیجے میں زلزلے اور آتش فشاں پھٹ سکتے ہیں، بالکل ویسے ہی ہم یہ توقع رکھ سکتے ہیں کہ شدید سماجی 'حرکات' کے نتیجے میں 'تشدد کے خونی آتش فشاں' پھوٹ سکتے ہیں۔ انیسویں اور بیسویں صدی کی سیاسی تاریخ پر نظر دوڑائیں تو ہمیں تباہ کن جنگوں، زبردست تباہیوں اور انقلاب کا پورا ایک سلسلہ نظر آتا ہے۔ جس طرح ایک بچہ بارش کے پانی میں یہاں سے وہاں، ایک کھڈ سے دوسرے میں نئے بوٹ پہن کر چھلانگیں لگاتا پھرتا ہے اور کیچڑ کے چھینٹے اڑتے ہیں۔۔۔ بعینہ ویسے ہی پچھلی دو صدیوں کی تاریخ میں انسان ایک کھڈ سے دوسرے میں خونی چھینٹے اڑاتا پھرتا نظر آتا ہے۔ پہلی جنگ عظیم سے دوسری جنگ عظیم اور پھر سرد جنگ۔۔۔ آرمینیاء میں قتل عام سے لے کر یہودیوں کی انبوہ میں نسل کشی اور پھر روانڈا میں عداً نسلی قتل عام۔۔۔ روبس پئیر سے لے کر لینن اور ہٹلر۔۔۔ پورا ایک سلسلہ ہے۔

یہ سب سچ ہے لیکن یاد رہے، تباہی اور آفتوں کی یہ جانی پہچانی، طویل فہرست پھر بھی گمراہ کن ہو سکتی ہے۔ مراد یہ ہے کہ ہم خوں ریز کھڈوں پر تو خوب نظر رکھتے ہیں لیکن اس خشک جگہ کو بھول جاتے ہیں جو ان خونی حالات و واقعات کے بیچ واقع ہے۔ یہ سچ ہے کہ جدید دور کے اس حصے میں تشدد اور ہولناکی کی ان سنی مثالیں قائم ہوئیں لیکن وہیں امن اور آسودگی کی بھی انتہا دیکھی گئی ہے۔ چارلس ڈکنز نے فرانسیسی انقلاب کے بارے لکھا تھا کہ، 'یہ بہترین وقت تھا اور یہ بدترین زمانہ بھی تھا!'۔ یہ صرف فرانسیسی انقلاب ہی نہیں بلکہ اس زمانے کے ہر دور کے بارے پیشگوئی کی درستی قرار پائے گا۔

یہ پیشگوئی ان سات دہائیوں کے بارے تو بالخصوص درست ہے جو دوسری جنگ عظیم کے بعد آئی تھیں۔ اس عرصے کے دوران انسانیت نے پہلی دفعہ اپنی نوع کے فنا اور ہلاکت کا امکان اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اس عرصے کے دوران کئی کئی خون ریز جنگیں اور انبوہ میں قتل عام دیکھنے میں آئے۔ لیکن اس کے باوجود، یہ ستر سال انسانی تاریخ کے سب سے پر امن دور رہا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس کے اشاریے بہت واضح بھی ہیں۔ یہ بے شک انتہائی حیران کن امر ہے لیکن اس کی وجہ یہ تھی کہ ان دہائیوں کے دوران ماضی کے کسی دور کے مقابلے میں انتہائی تیزی کے ساتھ معاشی، سماجی اور سیاسی تبدیلیاں دیکھنے میں آئی ہیں۔ یہ وہ سات دہائیاں ہیں جس کے دوران تاریخی ارض کی ساختمائی پلیٹیں دیوانہ وار ہلتی تو رہی ہیں لیکن آتش فشاں پھر بھی زیادہ تر پھٹ نہیں پائے۔ یہ اس نئے سماجی نظام کی لوچداری ہے۔ یہ اس نظام کی وہ لچک ہے جس کے تحت آج کا جدید سماج بڑی سے بڑی اور یہاں تک کہ کسی بھی طرح کی اساسی ساختی تبدیلی کو کسی پر تشدد تصادم میں گرے بغیر سہارنے کے قابل ہے۔

ہمارے زمانے میں امن

ہم میں سے زیادہ تر لوگوں کو اس امر کی قدر ہی نہیں ہے کہ ہم تاریخ کے کس قدر پر امن دور میں بسر رکھتے ہیں۔ ہم میں سے کوئی بھی ہزار سال پہلے زندہ نہیں تھا، اسی لیے ہم نہایت آسانی سے بھول جاتے ہیں کہ اس زمانے میں دنیا کس قدر پر تشدد ہوا کرتی تھی۔ اب چونکہ جنگیں بہت کم اور نایاب ہو چکی ہیں تو اسی لیے ان پر توجہ اور دھیان بھی خوب ملتا ہے۔ آج دنیا بھر میں لوگ افغانستان اور عراق میں جاری جنگ کے بارے تو بہت زیادہ سوچتے ہیں لیکن وہ کبھی یہ نہیں سوچتے کہ آج مثال کے طور پر برازیل اور ہندوستان میں کس قدر امن ہے۔

اس سے بھی زیادہ اہم یہ ہے کہ آج ہم پوری کی پوری آبادی کی بجائے انفرادی سطح پر لوگوں کو درپیش مسائل اور مصیبتوں کے ساتھ با آسانی نسبت جوڑ لیتے ہیں۔ تاہم، اگر تاریخ کے کلاں عوامل کو سمجھنا مقصود ہو تو اس کے لیے ہمیں انفرادی سطح پر لوگوں کے حالات و واقعات کی بجائے کلاں سطح پر شماریات کو قریب سے دیکھنا پڑے گا۔ مثلاً، 2000ء میں جنگوں کے نتیجے میں ہلاک ہونے والے افراد کی تعداد تین لاکھ دس ہزار جبکہ جرائم کا شکار ہو کر مرنے والوں کی تعداد پانچ لاکھ بیس ہزار تھی۔ ان میں سے ہر فرد کی موت ایک پوری دنیا کی تباہی، ایک خاندان کی بربادی اور دوستوں رشتہ داروں کے لیے زندگی بھر کا دکھ ہے۔ لیکن، بڑے اور کلاں پیمانے پر دیکھا جائے تو یہ آٹھ لاکھ تیس ہزار اموات ان پانچ کروڑ ساٹھ لاکھ اموات کا صرف ڈیڑھ فیصد ہے جو 2000ء میں واقع ہوئیں۔ اس برس، بارہ لاکھ ساٹھ ہزار لوگ کار کے حادثات (کل اموات کا سوا دو فیصد) اور سوا آٹھ لاکھ لوگوں نے خودکشی (کل اموات کا تقریباً ڈیڑھ فیصد) کی تھی۔

2002ء میں تو یہ شماریات اور بھی حیران کن ہیں۔ اس برس مرنے والے پانچ کروڑ ستر لاکھ لوگوں میں صرف ایک لاکھ بہتر ہزار جنگ کا شکار ہوئے اور پانچ لاکھ انہتر ہزار پر تشدد جرم کا نشانہ بنے۔ یعنی کل سات لاکھ اکتالیس ہزار انسانی تشدد کی بھینٹ چڑھے۔ اس کے مقابلے میں آٹھ لاکھ تہتر ہزار لوگوں نے خودکشی کی۔ پتہ یہ چلا کہ گیارہ ستمبر کے حملوں کے ایک برس بعد، جب دنیا بھر میں دہشت گردی اور جنگ کا شور تھا۔۔۔ پوری دنیا میں ایک اوسط انسان کے لیے کسی دہشت گرد، فوجی یا جرائم پیشوں کے ہاتھوں مرنے کی بجائے خود اپنی جان لے لینے کا امکان زیادہ تھا۔

آج دنیا کے تقریباً حصوں میں لوگ رات کو گھوڑے بیچ کر سوتے ہیں اور انھیں یہ ڈر نہیں ہوتا کہ اڑوس پڑوس کا کوئی قبیلہ رات کی تاریکی میں دھاوا بول کر ان کے پورے گاؤں کو بے رحمی سے قتل کر دے گا۔ آج برطانیہ کی آسودہ عوام دن ہو یا رات۔۔۔ ہر روز نوٹنگھم سے لندن سفر کرتے ہیں اور بغیر کسی ڈر اور خوف کے شئیروو ڈ کے جنگلات کو پار کر لیتے ہیں۔ انھیں راستے میں کسی غنڈے، ڈاکو اور میری گرین راہزنوں کا ڈر نہیں ہوتا جو ان سے سب کچھ چھین کر غریبوں میں بانٹ دے گا یا انھیں قتل کر کے سب کچھ اپنے پاس رکھ لے گا۔ آج طالب علموں کو اساتذہ سے سونٹیاں نہیں کھانی پڑتیں، بچوں کو ہر دم یہ ڈر نہیں ہوتا کہ اگر ان کے والدین اپنا روزمرہ خرچ پورا نہ کر پائے تو انھیں غلامی میں بیچ دیں گے۔ عورتوں کو اچھی طرح پتہ ہے کہ قانون کے تحت، ان پر شوہروں کے ہاتھ تشدد اور گھر میں بند رکھنا ممنوع ہے۔ آج، دنیا بھر میں۔۔۔ ہر نئے دن کے ساتھ لوگوں کی یہ توقعات نہ صرف پوری ہوتی ہیں بلکہ حالات میں بہتری بھی دیکھنے میں آتی ہے۔ جہاں بہتری نہ ہو، وہاں زور و شور سے تحریک چل جاتی ہے۔

تشدد میں اس کمی کی سب سے بڑی وجہ ریاستوں کی اٹھان ہے۔ تاریخ بھر میں زیادہ تر تشدد کی وجہ خاندانوں اور برادریوں کے بیچ چپقلش رہا کرتی تھی۔ آج بھی، اگر شماریات پر نظر دوڑائیں تو پتہ چلتا ہے کہ مقامی سطح پر پائے جانے والا تشدد اور جرائم کی شرح بین الاقوامی سطح پر جنگوں کے نتیجے میں تشدد سے کہیں زیادہ ہے۔ جیسا کہ ہم نے دیکھا کہ اوائل دور کے دہقان معاشروں میں چونکہ سیاسی نظام اور ترتیب نہیں ہوتی تھی تو اسی لیے جیسے ہی سیاسی معاملات برادری کی حد سے باہر نکلتے تھے تو بے پناہ تشدد کا باعث بن جاتے تھے۔ جیسے جیسے بادشاہتیں اور سلطنتیں مضبوط ہوتی گئیں، اسی شرح سے برادریوں کو لگام ڈل گئی اور تشدد میں خاطر خواہ کمی ہوئی۔ قرون وسطیٰ دور کی عدم ارتکازی بادشاہتوں میں اوسطاً ہر لاکھ افراد میں سے بیس سے چالیس افراد ہر سال تشدد کے نتیجے میں قتل ہوتے تھے۔ حالیہ دہائیوں میں۔۔۔ جبکہ ریاستیں اور منڈیاں مضبوط تر ہوئی ہیں اور برادریوں کا اثر و رسوخ کم تر ہوا ہے تو اس کے نتیجے میں تشدد کی شرح میں مزید کمی دیکھنے میں آئی ہے۔ آج عالمی سطح پر دیکھا جائے تو ہر سال ایک لاکھ افراد میں اوسطاً صرف نو لوگ تشدد کے نتیجے میں ہلاک ہوتے ہیں اور ان میں سے زیادہ تر ہلاکتیں کمزور ریاستوں جیسے صومالیہ اور کولمبیا وغیرہ میں دیکھنے میں آتی ہیں۔ یورپ کی ارتکازی ریاستوں میں آج یہ شرح ایک لاکھ افراد میں اوسطاً صرف ایک ہلاکت ہے۔

یقیناً دنیا میں ایسی مثالیں بھی ہیں جہاں ریاستیں اپنے اختیارات کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے، اپنے ہی شہریوں کو ہلاک کر دیتی ہیں اور عام طور پر اس طرح کی مثالیں اکثر ہی ہماری یادداشت میں خوف بن کر بیٹھ جاتی ہیں۔ بیسویں صدی کے دوران دسیوں لاکھ لوگوں کو ان کی اپنی ریاستیں، جابر اور ظالم افواج کی مدد سے ہلاک کر دیتی تھیں۔ پھر بھی، اگر بڑے پیمانے پر دیکھا جائے تو آج ریاستی عدالتیں اور پولیس وغیرہ نے دنیا بھر میں تحفظ اور سلامتی کو خاصا بڑھا دیا ہے۔ یہاں تک کہ آج دنیا کی جابر ترین آمریتوں میں بھی ایک اوسط جدید فرد کا کسی دوسرے فرد کے ہاتھوں ہلاک ہونے کا امکان گزشتہ کسی بھی دور، بالخصوص جدید دور سے قبل کے معاشروں کے مقابلے میں تو بالکل کم بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ 1964ء کا واقعہ ہے، برازیل میں فوجی آمریت قائم ہوئی۔ یہ فوجی راج 1985ء تک جاری رہا۔ ان بیس برسوں کے دوران فوجی آمریت نے کئی ہزار برازیلی شہریوں کو تشدد کا نشانہ بنا کر ہلاک کیا۔ ان کے علاوں دسیوں ہزار پابند سلاسل ہوئے اور جسمانی اذیت کا نشانہ بنے۔ لیکن ان بدترین برسوں کے دوران بھی ریو ڈی جنیرو میں ایک اوسط برازیلی شہری کا کسی دوسرے برازیلی شہری کے ہاتھوں مرنے کا امکان اوسط واورونی، آرویتی اور یانومامو لوگوں سے کہیں کم تھا۔ واورونی، آرویتی اور یانومامو ایمیزان جنگلوں کے وسط میں بسنے والے مقامی لوگوں کی آبادیاں ہیں اور ان کے یہاں فوج، پولیس اور جیلوں کا کوئی تصور نہیں ہے۔ ان قدیم مقامی انسانی آبادیوں پر ہوئی کئی کئی بشریات کی تحقیق سے یہی پتہ چلا ہے کہ ان کے یہاں ایک چوتھائی سے لے کر آدھے مرد جائیداد، عورتوں اور غیرت کے نام پر پر تشدد تنازعات کے نتیجے میں طبعی عمر سے قبل جوانی میں ہی ہلاک کر دیے جاتے ہیں۔

سامراج کی ریٹائرمنٹ

غالباً یہ بحث طلب ہے کہ کیا ریاستوں کے بیچ 1945ء کے بعد تشدد میں اضافہ ہوا یا کمی آئی ہے؟ اس امر میں تو کوئی شک و شبہ نہیں ہے کہ بین الاقوامی سطح پر تشدد میں اتنی کمی آئی ہے کہ آج یہ شرح تاریخ کی کم ترین سطح پر ہے۔ غالباً اس کی سب سے چیدہ مثال یورپ کی سامراجی سلطنتوں کا خاتمہ ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ سلطنتوں نے ہمیشہ ہی بغاوتوں اور غدر کو آہنی ہاتھوں سے کچلا ہے اور جب بھی کسی سلطنت پر برا دن آیا۔۔۔ چھوٹی سی چھوٹی سلطنت نے بھی اپنے بچاؤ کی کوشش میں خون کی ندیاں بہائی ہیں۔ پھر جب سلطنت کے انہدام کا وقت آن پہنچتا تو پھر نراج اور جانشینی کے قضیے اٹھ کھڑے ہوتے اور ایک دفعہ پھر خون پانی سے بھی سستا ہو جاتا تھا۔ 1945ء کے بعد سے تقریباً سبھی سلطنتوں نے پرامن طریقے سے سبکدوشی اور ریٹائرمنٹ اختیار کی ہے۔ اس طرح ان کے انہدام کا عمل قدرے سریع، پرسکون اور منظم رہا ہے۔
1945ء میں کرہ ارض کے چوتھائی حصے پر برطانوی راج تھا۔ تیس سال بعد، انگریزوں کی حکمرانی سکڑ کر چند جزیروں تک محدود ہو کر رہ گئی۔ اس عرصے کے بیچ کی دہائیوں میں برطانیہ نے اپنی تقریباً ساری نوآبادیوں سے پرامن اور منظم طریقے سے پسپائی اختیار کر لی۔ اگرچہ

مالایا اور کینیا جیسی چند جگہوں پر انگریزوں نے اسلحے کے زور پر زبردستی حاکمیت برقرار رکھنے کی کوشش کی لیکن زیادہ تر علاقوں میں سلطنت کے خاتمے کو قہر اور برہم مزاجی کی بجائے رنجوری سے قبول کر لیا۔ انھوں نے طاقت کو برقرار رکھنے پر توجہ نہیں دی بلکہ جس قدر ممکن ہو سکتا تھا، اسے لوٹانے کی ترتیب پر زور دیا۔ اس لحاظ سے مہاتما گاندھی سے منسوب عدم تشدد کی توصیف اور تعریف دراصل انگریز راج کی مرہون منت تھی۔ کئی برسوں کی ترش اور اکثر پرتشدد جدوجہد کے بعد جب انگریز راج کے خاتمے کا وقت آیا تو ہندوستانیوں کو انگریزوں کے ساتھ دہلی اور کلکتہ کی گلیوں میں اختیار کی لڑائی نہیں لڑنی پڑی۔ خود مختار ریاستوں نے راتوں رات سلطنت کی جگہ سنبھال لی اور تب سے لے کر آج تک نسبتاً مستحکم سرحدوں کے اندر برصغیر کی آبادی کا بڑا حصہ امن اور آسودگی میں بسر کرتا آیا ہے۔ یہ بھی درست ہے کہ دسیوں ہزار لوگوں کو اسقاط سے خوفزدہ انگریز سلطنت کے ہاتھوں تباہی اور بربادی کا سامنا ضرور کرنا پڑا لیکن وہیں یہ حقیقت بھی صاف ہے کہ برصغیر کے کئی حصوں میں جب انگریزوں نے اقتدار چھوڑ کر ہاتھ کھینچ لیا تو یکدم ہی نسلی اور گروہی تنازعات پھوٹ پڑے اور لاکھوں افراد چند ہفتوں کے اندر ہی قتل کر دیے گئے۔ اس کے باوجود، اگر طویل مدت پر مبنی تاریخی اوسط سے تقابل کیا جائے تو انگریزوں کی پسپائی، بلاشبہ امن اور تنظیم کی عمدہ مثال ہے۔ انگریزوں کی نسبت فرانسیسی سلطنت خاصی خودسر اور ہٹیلی واقع ہوئی تھی۔ فرانسیسی سلطنت کے انہدام کے عمل میں ویت نام اور الجیریا میں خون کی ندیاں بہہ گئیں اور دسیوں ہزار لوگ اپنی جان سے گئے۔ اس کے باوجود بھی فرانسیسی اپنے تسلط سے نسبتاً پرامن انداز میں دستبردار ہوئے اور اپنے پیچھے منظم اور خود مختار ریاستیں چھوڑ گئے۔ انھوں نے بھی اپنے زیر تسلط کسی خطے کو افراتفری اور کلی انتشار میں نہیں چھوڑا۔

1989ء میں سوویت یونین کا خاتمہ تو بلقان، کاکیشیاء اور وسطی ایشیاء میں نسلی فسادات کے باوجود سب سے زیادہ پرامن قرار دیا جا سکتا ہے۔ تاریخ میں اس سے قبل کبھی بھی اتنی بڑی سلطنت اتنی تیزی اور نہایت خاموشی سے ختم نہیں ہوئی۔ 1989ء کی سوویت یونین کو افغانستان کے سوا کہیں شکست نہیں ہوئی، اس سلطنت پر کسی بیرونی حملے کا بھی کوئی خطرہ نہیں تھا، کوئی بغاوت بھی نہیں تھی اور نہ ہی سول نافرمانی کی بہت بڑی، واقعی تحریک چل رہی تھی۔ سوویت یونین کے پاس لاکھوں کی تعداد میں فوجی، دسیوں ہزار ٹینک، جہاز اور اتنے ایٹمی ہتھیار تھے کہ وہ پوری انسانیت کو کئی کئی بار مٹانے کی پوری اہلیت رکھتی تھی۔ سرخ افواج اور وارسا معاہدے کے تحت دوسری افواج ابھی بھی سوویت یونین کی وفادار تھیں۔ اگر آخری وقت پر میخائیل گورباچوف حکم دے دیتے تو سرخ افواج سوویت عوام کو سر اٹھانے سے قبل ہی چھیل کر رکھ دیتیں۔

لیکن اس کے باوجود سوویت اشرافیہ اور رومانیہ اور سربیا کے علاوہ ساری مشرقی یورپ کے کمیونسٹ حکام نے دستیاب فوجی طاقت کو ذرہ بھر بھی استعمال نہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ جب اشتراکیت کے حامیوں کو پتہ چل گیا کہ یہ نظریہ دیوالیہ ہو چکا ہے تو انھوں نے اختیار چھوڑ، ناکامی کا اعتراف کر، اپنے سوٹ کیس باندھ کر واپس گھر کی راہ لی۔ گورباچوف اور قریبی ساتھیوں نے کوئی پس و پیش کیے بغیر ہی

دوسری جنگ عظیم کی سوویت فتوحات کے ساتھ ساتھ اس سے بھی پرانے بلقان، یوکرین، کاکس اور وسطی ایشیاء کے مفتوحہ علاقوں کا انتظام بھی چھوڑ دیا۔ آج یہ سوچ کر ہی خون جم جاتا ہے کہ اگر گورباچوف بھی سربیائی حکام یا الجیریا میں فرانسیسیوں کی طرح ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کر لیتے تو پھر کیا ہوتا؟

سرد جنگ اور ایٹمی معانقہ

سامراجی سلطنتوں کے خاتمے سے جو آزاد اور خود مختار ریاستیں وجود میں آئیں، انھیں جنگوں میں غیر معمولی طور پر کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ چند ایک موقعوں کو چھوڑ کر، 1945ء کے بعد سے ریاستیں دوسری ریاستوں پر حملہ کر کے انھیں ہڑپ نہیں کیا کرتیں، حالانکہ قدیم زمانے سے ہی سیاسی تاریخ کے لیے فتوحات گویا واحد منصب رہا ہے۔ بلکہ عظیم سلطنتیں اسی طرح وجود میں آتی رہی ہیں اور زیادہ تر حکمرانوں اور انسانی آبادیوں کے لیے یہی طریق رہا ہے۔ لیکن آج کی دنیا میں کہیں بھی رومیوں، منگولوں اور عثمانیوں کی طرح فتوحات اور غلبہ حاصل کرنے کے لیے جنونی مہمات کی کوئی صورت نہیں ہے۔ 1945ء سے لے کر آج تک اقوام متحدہ کا تسلیم شدہ کوئی بھی آزاد ملک نہ تو فتح کیا گیا اور نہ ہی اسے دنیا کے نقشے سے مٹا دیا گیا ہے۔ یہ درست ہے کہ عالمی سطح پر محدود پیمانے کی جنگیں برپا ہوتی رہتی ہیں اور ان جنگوں میں لاکھوں لوگ مرتے بھی ہیں لیکن یہ طے ہے کہ اب جنگیں، دنیا کی روایت اور رسم نہیں رہیں۔

زیادہ تر لوگوں کا ماننا ہے کہ عالمی جنگوں کے عدم وجود کی بڑی وجہ مغربی یورپ میں امیر کبیر جمہوریتوں کی یکتائی کی بدولت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یورپ میں امن اس وقت پہنچا، جب دنیا کے باقی حصوں میں یہ پہلے ہی قائم ہو چکا تھا۔ عالمی سطح پر آخری سنجیدہ جنگیں جنوبی امریکہ کے ممالک پیرو اور ایکواڈور کے بیچ 1941ء، بولیویا اور پیراگوئے کے بیچ 1932ء سے 1935ء تک لڑی گئی تھیں۔ اس سے قبل جنوبی امریکہ میں اس طرز کی سنجیدہ جنگ صرف 1879ء سے 1984ء تک ایک طرف چلی اور دوسری طرف بولیویا اور پیرو کے اتحاد کے بیچ لڑی گئی تھی۔

ہم عرب دنیا کو بمشکل ہی پر امن خطہ سمجھتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ جب سے عرب ممالک نے آزادی حاصل کی ہے۔۔۔ تب سے لے کر آج تک صرف ایک ہی دفعہ 1990ء میں عراق نے کویت پر حملہ کر کے عالمی سطح کی جنگ چھیڑی تھی۔ یہ درست ہے کہ سرحدوں پر نوک جھونک (مثلاً 1970ء میں شام اور اردن کے بیچ) چلتی رہتی ہے اور اسی طرح ایک دوسرے کے ممالک میں فوجی مہمات (مثلاً شام کی لبنان میں) بھی شروع ہوتی رہتی ہیں۔۔۔ علاوہ ازیں کئی خانہ جنگیاں (جیسے الجیریا، یمن، لیبیا وغیرہ) بھی دیکھنے میں آتی ہیں جبکہ حکومتی تختوں کا الٹنا اور بغاوتیں وغیرہ تو بہت عام ہیں لیکن اس کے باوجود خلیجی جنگ کے سوا آج تک عرب ریاستوں میں باقاعدہ اور بھرپور عالمی نوعیت کی جنگ دیکھنے میں نہیں آئی۔ اگر اس نکتہ نظر کو پوری اسلامی دنیا میں وسعت دے کر دیکھنے کی کوشش

کریں تو ایران اور عراق کی صرف ایک جنگ کے سوا کوئی دوسری مثال نہیں ملتی۔ ہم نے آج تک ترکی اور ایران، پاکستان اور افغانستان یا انڈونیشیاء اور ملائیشیاء کے بیچ جنگ دیکھی اور نہ ہی سنی ہے۔

افریقہ میں معاملات زیادہ اچھے اور امید افزاء نہیں ہیں لیکن وہاں بھی زیادہ تر تنازعات خانہ جنگی اور حکومتی تختے الٹنے تک محدود رہتے ہیں۔ زیادہ تر افریقی ریاستوں نے 1960ء اور 1970ء کی دہائی میں آزادی حاصل کی تھی لیکن تب سے صرف چند ایک نے ہی دوسرے مما لک پر فتح اور غلبے کی غرض سے حملے کر رکھے ہیں۔

تاہم، اس سے قبل بھی قدرے امن کے ادوار ضرور گزرے ہیں۔ مثال کے طور پر 1871ء سے لے کر 1914ء تک کے عرصے میں یورپ خاصا پر امن تھا لیکن پھر بعد اس دور کے جو نتائج نکلے تھے، وہ ہم جانتے ہیں کہ کس قدر بھیانک ثابت ہوئے تھے۔ لیکن اب کی بار، یہ تجربہ مختلف رہا ہے۔ یورپ کو پہلی دفعہ احساس ہوا کہ جنگ کے عدم موجود کا ہر گز مطلب حقیقی امن نہیں ہوتا۔ حقیقی امن تو دراصل جنگ کی غیر معقولیت کو اچھی طرح سمجھ پانا ہوتا ہے۔ دنیا میں کبھی بھی حقیقی امن قائم نہیں ہو پایا۔ 1871ء سے لے کر 1914ء تک ایک یورپی جنگ بظاہر معقول اور ظاہر دار ہی نظر آتی رہی ہے۔۔۔ گویا، یہ جنگ ہو نا طے تھی۔ یہی وجہ تھی کہ افواج، سیاستدانوں اور عام عوام۔۔۔ یورپ کے ہر شخص کے دل و دماغ پر جنگ چھائی رہتی تھی اور سوچ اور دھیان اسی طرف لگا رہتا تھا۔ یہ حقیقت تاریخ کے ہر پر امن دور کے بارے بھی کہی جا سکتی ہے جب امن کے بیچ بھی جنگ کا دھڑ کا لگا رہتا تھا اور ہر دم جنگ کی تیاری جاری رہتی تھی۔ تاریخ بھر میں عالمی سیاست کا ایک ہی کلیہ تھا اور وہ یہ تھا: 'دو قریبی مملکتوں کے بیچ ایسی صورت کی معقولیت اور بیش بینی ہر دم موجود ہی رہتی ہے کہ وہ کسی نہ کسی وجہ سے ایک دوسرے کے خلاف کم از کم ایک سال کے اندر اندر تنازعے کا موجب بن سکتی ہے'۔ جنگل کا یہ قانون تاریخ بھر میں، انیسویں صدی کے یورپ، قرون وسطیٰ دور کے یورپ، قدیم چین اور کلاسیکی یونان میں بھی پایا جاتا تھا۔ اگر 450 قبل مسیح میں اسپارٹا اور ایتھنز کے بیچ امن قائم تھا تو اس وقت بھی ایسا بیش بین منظر نامہ پھر بھی موجود ہی تھا کہ اگلے ہی برس، 449 قبل مسیح میں یہ دونوں شہر ایک دوسرے کے ساتھ جنگ میں بر سر پیکار ہوں گے۔

آج انسانیت نے جنگل کے اس قانون کو توڑ کر رکھ دیا ہے۔ آج دنیا میں زیادہ تر جگہوں پر جنگ کا عدم وجود نہیں بلکہ حقیقی معنوں میں امن نظر آتا ہے۔ آج دنیا کی زیادہ تر مملکتوں کے بیچ یہ تصور عام نہیں ہے کہ وہ اگلے ہی برس ایک دوسرے کے ساتھ بڑے پیمانے پر جنگ میں مصروف ہوں گی۔ مثال کے طور پر، جرمنی اور فرانس کے بیچ اگلے برس جنگ کی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟ یا چین اور جاپان ایک برس کے اندر ایک دوسرے کا گریبان کیوں پکڑیں گے؟ یا برازیل اور ارجنٹائن کیوں لڑیں گے؟ ان کے بیچ چھوٹے موٹے سرحدی تنازعے تو پیدا ہو سکتے ہیں لیکن صحیح معنوں میں بربادی، اس برس برازیل اور ارجنٹائن کے بیچ پرانی طرز کی بھرپور جنگ، یعنی ارجنٹائن کی مسلح افواج ریو ڈی جینرو کو تہہ تیغ کرتی ہوئیں جبکہ برازیلی بمبار طیارے بیونس آئرس کو صفحہ ہستی سے مٹانے کی کوشش کرتے

ہوئے نظر نہیں آئیں گے۔ اس طرح کی جنگیں چند ریاستوں کے بیچ۔۔۔ جیسے اسرائیل اور شام، ایتھوپیا اور اریٹریا۔۔۔ یا پھر امریکہ اور ایران کے بیچ چھوٹنے کا قوی امکان موجود ہے لیکن یہ صرف چند مثالیں ہیں اور دنیا میں رائج عمومی ریت کی ترجمانی نہیں کرتیں۔
یہ عین ممکن ہے کہ دنیا میں یہ صورتحال مستقبل میں بالکل بدل کر رہ جائے بلکہ اس ضمن میں دیدبینی سے دیکھا جائے تو آج کی دنیا ناقابل یقین حد تک سیدھی سادی اور سادہ لوح نظر آتی ہے۔ پھر بھی، تاریخی نکتہ نظر سے دیکھیں تو ہماری یہ سادہ لوحی اور بھولا پن دل آویز اور بہت ہی مسحور کن ہے۔ آپ خود ہی بتائیں، اس دنیا میں آخری دفعہ امن اتنا عام کب ہوا تھا کہ اس کے بیچ جنگ کا تصور ہی محال نظر آتا ہو؟

43- کیلیفورنیا میں سونے کی کان (1849ء)

محققین نے اس خوش کن بالیدگی کی وضاحت ڈھونڈنے کے لیے اتنے زیادہ مقالے اور کتابیں لکھ رکھی ہیں کہ انھیں پڑھنے کے لیے پوری زندگی کم پڑ جائے گی۔۔۔ اس ضمن میں ان محققین نے کئی عوامل کو بیان کیا ہے۔ ان میں سب سے اول اور سب سے اہم یہ ہے کہ جنگ کی قیمت ڈرامائی حد تک بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ اگر سچ کہا جائے تو تاریخ میں دیے گئے سارے کے سارے امن کے نوبل انعام جمع کر کے ایٹم بم کے خالق رابرٹ اوپنہائمر اور ان کے ساتھیوں کو دیا جانا چاہیے۔ ایٹمی ہتھیاروں نے دنیا کی بڑی طاقتوں کے بیچ جنگ کو باہمی خودکشی بنا کر رکھ دیا ہے اور آج دنیا میں کوئی بھی ملک اور قوم دنیا پر اسلحے اور ہتھیاروں کے زور پر تسلط اور غلبہ حاصل کرنے کے بارے سوچ بھی نہیں سکتا۔

دوم یہ ہے کہ جیسے جیسے جنگ کی قیمت بڑھی ہے، اس سے حاصل ہونے والا نفع بھی اسی ڈرامائی انداز میں بہت کم ہو گیا ہے۔ تاریخ بھر میں اڑوس پڑوس کی مملکتیں اور ریاستیں دشمن کی سرزمین پر قبضہ کر کے خوب دھن دولت جمع کر سکتی تھیں۔ اس دھن دولت میں عام طور کھیت، کھلیان، مال، مویشی، غلام اور سونا وغیرہ شامل ہوتا تھا۔۔۔ یعنی اس طرز کی دھن دولت کو لوٹ کر جمع رکھنا ممکن ہوتا تھا۔ لیکن آج دھن دولت سے مراد انسانی سرمایہ، فنی علم اور بینکوں جیسے پیچیدہ سماجی و معاشی ساخت اور ادارے ہوتے ہیں۔ یہ دھن دولت کی ایسی شکل ہے جسے لوٹ کر اپنے دیس میں جمع کرنا تقریباً نا ممکن ہے۔

کیلیفورنیا کی مثال لے لیں۔ پہلے پہل کیلیفورنیا میں پائی جانے والی دھن اور دولت سونے کی کانوں کی شکل میں ہوا کرتی تھی لیکن آج اس کی اصل دولت سیلیکون اور جعلی ہاتھی دانت۔۔۔ یعنی سیلیکون ویلی اور ہالی ووڈ کی باغی پہاڑیاں ہیں۔ اگر آج چینی افواج کیلیفورنیا پر دس لاکھ فوجیوں کی طاقت سے سان فرانسسکو کے ساحلوں پر دھاوا بول کر پوری ریاست میں گھس جائیں تو کیا ہو گا؟ انھیں اس حملے سے زیادہ کچھ حاصل نہیں ہو پائے گا۔ سیلیکون ویلی میں سیلیکون کی کوئی کانیں نہیں ہیں۔ کیلیفورنیا کی اصل دولت تو گوگل کے انجنئیروں اور ہالی ووڈ کے لکھاریوں، ڈائریکٹروں اور سپیشل افیکٹ پیدا کرنے والے تدوین کاروں کے دماغوں میں پائی جاتی ہے۔ یہ سارے دماغ چینی حملے سے بہت پہلے ہی، پہلی فلائٹ پکڑ کر بنگلور یا ممبئی میں جا کر گوشہ نشین ہو جائیں گے اور وہاں اپنا رنگ کمپیوٹر سٹی اور بالی ووڈ میں دکھانا شروع کر دیں گے۔ یہ محض اتفاق کی بات نہیں ہے کہ آج بھرپور اور عالمی سطح کی جنگیں۔۔۔ جیسے عراق کا کویت پر حملہ وغیرہ ان خطوں میں پائی جاتی ہیں جہاں دھن اور دولت پرانی طرز پر مادی صورت میں پائی جاتی ہے۔ عراقی حملے کی صورت میں کویتی شیخ تو فرار ہو جائیں گے لیکن ان کے تیل کے کنوئیں کویت میں ہی ہوں گے جس پر عراقی خوب مزے سے قبضہ کر کے دولت حاصل کر لیں گے۔

44– کیلیفورنیا میں سیلیکون ویلی کا منظر۔ 1849ء میں کیلیفورنیا کی ریاست میں سونے کی کانیں ہوا کرتی تھیں لیکن آج اس ریاست کی تقریباً آمدن سیلیکون سے آتی ہے۔ 1849ء میں دھن اور دولت کیلیفورنیا میں پایا جاتا تھا لیکن آج سیلیکون ویلی کا اصل اثاثہ وہاں موجود ذہین دماغوں میں جمع ہے۔

جب ایک طرف جنگ منافع بخش نہیں رہی تو وہیں دوسری طرف امن ہمیشہ سے بڑھ کر سودمند ثابت ہوا ہے۔ روایتی زرعی معیشتوں میں طویل فاصلوں کی تجارت اور بیرونی سرمایہ کاری کو ثانوی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ اس کے نتیجے میں امن کے نتیجے میں حاصل ہونے والا منافع محدود رہتا ہے اور اس کے علاوہ جنگی تیاریوں پر اٹھنے والا خرچ علیحدہ ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر 1400ء میں انگلستان اور فرانس کے بیچ امن قائم رہتا تو فرانسیسی شہریوں کو بھاری جنگی ٹیکس ادا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی اور وہ انگریزوں کے پے در پے تباہ کن حملوں کی بربادیوں سے بھی بچ جاتے۔۔۔ اس کا مطلب لیکن یہ تھا کہ فرانس اور انگلستان، دونوں مملکتوں کی جیب خالی ہی رہتی۔ آج کی جدید سرمایہ دار معیشتوں میں بیرونی تجارت اور سرمایہ کاری باقی ہر شے سے زیادہ اہم ہوتی ہے۔ اگر کسی دیس میں امن ہو تو وہاں خوب اور غیر معمولی پیمانے پر سرمایہ اور آمدن آتی رہتی ہے۔ آج صورتحال یہ ہے کہ جب تک چین اور امریکہ کے بیچ امن قائم رہتا ہے تو چین، امریکہ پر مصنوعات فروخت کر کے آسودہ حال رہ سکتا ہے۔ اس امن کے نتیجے میں چین، اسی آمدن کو وال سٹریٹ میں خرچ کر کے مزید منافع کما سکتا ہے جبکہ امریکہ کے لیے سرمایہ کاری کرنے کے لیے بیجنگ کی تجارتی منڈیاں کھلی رہیں گی۔

سوئم یہ ہے کہ عالمی سیاسی طرز میں بڑی تبدیلی دیکھنے میں آئی ہے۔ تاریخ کی سبھی اشرافیہ۔۔۔ مثال کے طور پر ہان سرداروں، وائکنگ جنگجوؤں اور ازٹیک پجاریوں کے نزدیک جنگ ایک مثبت، نیکی کا کام اور خوب شے تھی۔ دوسروں کے نزدیک جنگ ایک برائی کی مانند

تو تھی لیکن ناگزیر شے تھی۔۔۔جسے وہ اپنے مفاد پانے کے لیے استعمال کر سکتے تھے۔ ہمارا زمانہ، تاریخ کا پہلا دور ہے جب دنیا پر امن پسند اشرافیہ کا تسلط ہے۔ آج دنیا کے تقریباً سیاستدان، سرمایہ دار، کاروباری صنعت کار، دانشور اور فن کار دل کی سچائی سے جنگ کو نہ صرف بدی کا کام بلکہ قطعی طور پر قابل احتراز معاملہ سمجھتے ہیں۔ قدیم زمانوں میں بھی صلح جو اور امن پسند عیسائی پائے جاتے تھے لیکن اگر شاذ و نادر، کبھی وہ طاقت کے زینے طے کر کے اقتدار کی مسند پر براجمان ہو بھی جاتے تھے تو انھیں 'ایک گال پر تھپڑ کے جواب میں دوسرا گال پیش کرنے کی طرز' یاد ہی نہیں رہتی تھی۔

ان چاروں عوامل کے بیچ ایک مثبت تعلق اور تعامل کا حلقہ بنتا ہے۔ ایٹمی جنگ کے نتیجے میں ممکنہ طور پر پیدا ہونے والی مکمل تباہی کے خوف سے صلح جوئی کو فروغ ملتا ہے۔ جب صلح جوئی عام ہوتی ہے تو جنگ کا امکان کم ہو جاتا ہے اور تجارت بڑھتی ہے۔ جب تجارت بڑھتی ہے تو ایک طرف امن سے نفع حاصل ہوتا ہے اور دوسری جانب جنگ کا ممکنہ خرچ گھٹتا چلا جاتا ہے۔ یعنی، سود پر بھی سود حاصل ہوتا ہے۔ جوں جوں ان چاروں عوامل کا یہ تعلق اور تعامل گہرا ہوتا جاتا ہے، اس کے نتیجے میں جنگ کی راہ میں ایک نئی رکاوٹ جنم لیتی ہے۔ یہ رکاوٹ ان سارے عوامل سے بڑھ کر اہم ثابت ہوتی ہے۔ جیسے جیسے بین الاقوامی سطح پر اقوام کے بیچ تعلقات اور ربط کا جال گہرا ہوتا جاتا ہے، اس کے نتیجے میں زیادہ تر ممالک کی خود مختاری ختم ہوتی جاتی ہے۔ اس سے یہ مکان پیدا ہوا جاتا ہے کہ کوئی بھی ملک صرف اپنے بل بوتے پر جہاں چاہے، جنگ نہیں چھیڑ سکتا۔ آج دنیا میں زیادہ تر ممالک صرف اس وجہ سے دوسرے ممالک کے ساتھ جنگ نہیں چھیڑ پاتے کیونکہ اب وہ پہلے کی طرح آزاد اور خود مختار نہیں رہے۔ اگرچہ اسرائیل، میکسیکو، اٹلی یا تھائی لینڈ اور دوسرے سارے ممالک کے شہری اپنے تئیں قومی آزادی اور خود مختاری کا سراب پالے بیٹھے ہیں لیکن ان کی حکومتیں کسی بھی صورت آزاد نہیں ہیں۔ وہ آزادی اور خود مختاری سے معاشی اور نہ ہی خارجہ پالیسیاں بنا سکتی ہیں اور یہ تو طے ہے کہ وہ کسی بھی صورت صرف اپنے بل بوتے پر بھرپور جنگ چھیڑنے کے قابل نہیں ہیں۔ جس طرح پہلے ایک باب (گیارھویں باب) میں وضاحت کی گئی تھی کہ ہم دنیا میں ایک عالمگیر سلطنت کو کھڑا ہوتا ہوا دیکھ رہے ہیں۔ گزشتہ سبھی سلطنتوں کی طرح، یہ عالمگیر سلطنت بھی اپنی سرحدوں کے اندر اور ارد گرد امن کو یقینی بنانے کی دھن میں رہتی ہے۔ اب چونکہ اس عالمی سلطنت کی سرحدیں پورے کرہ ارض پر پھیلی ہیں تو یہ پوری دنیا میں امن کو یقینی بنانے کی کوشش میں رہے گی۔

لیکن، سوال یہ ہے کہ کیا ہم اس جدید دور کو پہلی جنگ عظیم، ہیروشیما و ناگاساکی پر ایٹمی دھماکے اور ہٹلر و سٹالن کے جنون کی وجہ سے خون ریز، قتل عام، جنگ اور جبر سے تعبیر کریں؟ یا پھر ہم اس دور کو امن اور آسودگی سے تعبیر کریں جس کے دوران جنوبی امریکہ میں خندقیں نہیں کھودی گئیں، نیویارک و ماسکو میں ایٹم بم نہیں پھٹا اور مہاتما گاندھی و مارٹن لوتھر کنگ جیسی پر سکون صورتیں پیدا ہوئیں؟

اس اہم سوال کا جواب ہے کہ یہ سب وقت کا کھیل ہے۔ ہوشمندی کا تقاضا تو اس حقیقت کو سمجھنا ہے کہ ماضی سے متعلق ہر چند برسوں کے دوران پیدا ہونے والے حالات و واقعات کے سبب ہمارا نکتہ نظر سنور یا بگڑ سکتا ہے۔ اگر یہ باب 1942ء یا 1962ء میں لکھا گیا ہوتا تو غالباً اس میں آزردگی اور افسردگی ہی لکھی گئی ہوتی۔ اب چونکہ یہ باب 2014ء میں لکھا گیا ہے تو اس میں جدید تاریخ بارے زندہ دلی اور خوش طبعی کا رجحان صاف نظر آرہا ہے۔

ہم اگر امید پرستوں اور قنوطیوں۔۔۔ دونوں کو ہی راضی کرنا چاہیں تو بجا طور پر کہہ سکتے ہیں ہم جنت اور جہنم کے بیچ کسی جگہ پر بس رہے ہیں۔ ہم بے چینی سے کبھی ایک دروازے اور پھر اضطراب میں دوڑتے ہوئے دوسرے کی ڈیوڑھی میں جا گھستے ہیں۔ تاریخ نے ابھی تک یہ فیصلہ نہیں کیا کہ آخر یہ اونٹ کس کل بیٹھے گا، ہم جنت میں پہنچیں گے یا جہنم میں سڑیں گے؟ حقیقت یہ ہے کہ ایک اتفاقات کی ایک معمولی سی لڑی بھی ہمیں جنت یا پھر جہنم میں دھکیلنے کو کافی ہوگی۔

وہ ہنسی خوشی رہنے لگے۔۔۔

پچھلے پانچ سو برسوں کے دوران پے در پے کئی حیرت انگیز انقلاب برپا ہوئے ہیں۔ آج کرہ ارض ماحولیاتی اور تاریخی لحاظ سے یکجا ہو چکی ہے۔ معیشت نے نمایاں طور پر خوب ترقی کی ہے اور آج انسان کے پاس مجموعی طور پر اتنی دولت جمع ہے کہ جتنی کبھی الف لیلوی داستانوں میں ہوا کرتی تھی۔ سائنس اور صنعتی انقلاب نے انسانیت کو مافوق الفطرت طاقت اور عملی طور پر بے پناہ توانائی فراہم کر دی ہے۔ انسان کا سماجی نظام، سیاست، روزمرہ زندگی اور نفسیات۔۔۔ ہر شے کی کایاپلٹ چکی ہے۔

لیکن، کیا ہم خوش ہیں؟ کیا، پچھلے پانچ سو برسوں میں جمع کی گئی دولت سے انسانیت کو اطمینان اور دلجمعی مل گئی؟ کیا توانائی کے لامتناہی وسائل سے ہمارے لیے لازوال مسرت اور فرحت کا بھی انتظام ہو گیا ہے؟ اگر آج ہم پیچھے مڑ کر دیکھیں تو ستر ہزار سال پہلے جب شعور اور آگاہی کا انقلاب برپا ہوا تھا۔۔۔ کیا تب سے آج، کیا یہ دنیا ایک بہتر جگہ بن چکی ہے؟ نیل آرمسٹرانگ نے چاند پر قدم رکھا تھا، اس قدم کا نشان آج بھی بے ہوا چاند پر ثبت ہے۔۔۔ کیا نیل آرمسٹرانگ اس بے نامی تاختی عورت سے زیادہ خوش ہے جس نے اپنے ہاتھ کی چھاپ تیس ہزار سال پہلے شووہ کے غار میں ثبت کی تھی؟ اگر نہیں تو پھر زراعت، شہر کاری، تحریر، نظام سکہ، سلطنتوں، سائنس اور صنعت میں اس ترقی کا مقصد کیا ہے؟

تاریخ دان، یہ سوال کبھی نہیں پوچھتے۔ وہ کبھی نہیں پوچھتے کہ کیا اوروک اور بابل کے شہری اپنے تاختی آباء و اجداد سے زیادہ خوش تھے؟ کیا اسلام کی وجہ سے مصریوں کی زندگی میں آسودگی آئی؟ کیا افریقہ میں یورپی سلطنتوں کے خاتمے سے لاکھوں، کروڑوں انسانوں کی خوشی میں اضافہ ہوا؟ یہ وہ اہم سوالات ہیں جو تاریخ میں ٹٹولے ہی جانے چاہیے۔ آج ہم دیکھتے ہی ہیں کہ دنیا بھر میں پائے جانے والے

سبھی ہم عصر نظریات اور سیاسی منصوبے، منشور انسانی سکھ اور آسودگی کے کھوکھلے تصورات پر مبنی دعووں پر کھڑے ہیں۔ قوم پرستوں کا ماننا ہے کہ سیاسی خودمختاری ہی دراصل ہماری راحت کا سرچشمہ ہے۔ اشتراکیت پر یقین رکھنے والوں کا کہنا ہے کہ مزدور پیشہ طبقے کی آمریت میں ہر شخص خوش اور نہال رہ سکتا ہے۔ سرمایہ داروں کا خیال یہ ہے کہ صرف اور صرف آزاد تجارتی منڈیاں ہی معاشی نمو اور مادی فراوانی کی مدد سے ہر حال میں انسانی آسودگی کا باعث ہو سکتی ہیں اور ہمیں خود انحصاری اور کارجوئیاں ہی پار لگا سکتی ہیں۔

اگر کوئی سنجیدہ تحقیق ان ساری مفروضوں کو رد کر دے تو پھر کیا ہو گا؟ اگر معاشی ترقی اور خود انحصاری لوگوں کو خوشحال نہیں بنا سکتی تو پھر سرمایہ داری کس کام کی ہے؟ اگر ہمیں یہ پتہ چلے کہ عظیم سلطنت کی رعایا عمومی طور پر خود مختار قومی ریاستوں کے آزاد شہریوں سے زیادہ خوشحال ہوتے ہیں تو پھر کیا ہو گا؟ فرض کریں، الجیریا کے شہریوں کو آج یہ پتہ چلے کہ اگر وہ فرانسیسی تسلط تلے ہی رہتے تو زیادہ خوشحال ہو سکتے تھے، تو پھر؟ اس امر سے نو آبادیات کے خاتمے اور قومی خود ارادیت کی اٹھان بارے کیا کہا جائے گا؟

یہ سب کے سب فرضی امکانات ہیں کیونکہ آج تک تاریخ دانوں کی حد تک۔۔۔ کبھی کسی نے یہ سوالات اٹھائے ہی نہیں ہیں۔ تو جب سوال نہیں اٹھائے گئے تو ان کا جواب کہاں سے آتا؟ تاریخ دانوں نے تاریخ سے متعلق ایسی کون سے شے ہے جس کے بارے تحقیق نہیں کی؟ سیاست، سماج، معیشت، صنف، امراض، جنسیات، خوراک، پیراہن۔۔۔ الغرض ہر شے بارے پتہ لگایا ہے لیکن کبھی انسانی خوشی، راحت اور آسودگی کے بارے کچھ بھی جاننے کی کبھی کوشش نہیں کی۔

یہ ضرور ہے کہ بعض نے آسودگی اور خوشحالی کی طویل مدتی تاریخ پر تحقیق کی اور تقریباً ہر محقق اور عام آدمی کی اپنی کوئی نہ کوئی مبہم ہی سہی لیکن رائے اور خیال ہوتا ہی ہے۔ ایک عام نکتہ نظر کے مطابق یہ تو طے ہے کہ تاریخ بھر میں انسانی صلاحیتوں اور قابلیت میں ہمیشہ بہتری ہی آئی ہے۔ اب چونکہ انسان اپنی اس قابلیت کو بدحالی اور مصیبتوں کو دور کرنے اور تمناؤں کو پورا کرنے کے لیے استعمال کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یقیناً آج ہم اپنے قرون وسطیٰ دور کے اجداد سے زیادہ خوشحال ہیں۔ قرون وسطیٰ دور کے لوگ، یقیناً تاختیوں سے زیادہ آسودہ رہے ہوں گے؟

لیکن مسئلہ یہ ہے کہ ترقی کی بنیاد پر قائم یہ روایت کسی طور بھی مسلم نہیں ہے۔ جیسا کہ ہم نے دیکھ رکھا ہے کہ نت نئے استعداد، رویے اور ہنرمندی لازمی طور پر بہتر زندگی کی ضمانت نہیں دیتے۔ جب آدمی نے زرعی انقلاب برپا ہونے کے بعد کاشت کا ہنر سیکھا تو اس سے مجموعی طور پر نوع انسانی کی استعداد تو بڑھ گئی لیکن انفرادی سطح پر ہر شخص کی زندگی عذاب ہو گئی تھی۔ دہقانوں کو اپنے تاختی آباء کی نسبت زیادہ کڑی محنت کرنی پڑتی تھی اور غذائیت سے عاری خوراک پر گزارہ کرنا پڑتا تھا۔۔۔ یہی نہیں بلکہ اب انھیں طرح طرح کی بیماریوں اور جبر کا بھی سامنا تھا۔ اسی طرح، جب یورپی سلطنتیں پھیل کر پوری دنیا پر غالب ہو گئیں تو اس سے ترقیاتی تصورات کے عام ہونے، نت نئے فنون، ٹیکنالوجی، زرعی طریقوں اور تجارت میں آسانی کی بدولت مجموعی طور پر انسانی طاقت اور اہلیت میں تو اضافہ ہو گیا لیکن یہ

لاکھوں افریقی، مقامی امریکیوں اور ابرآجین آسٹریلیائی باشندوں کے لیے ہر گز بھی اچھی خبر نہیں تھی۔ یہ طے ہے کہ انسان کا جھکاؤ اور فطری رجحان ہمیشہ سے طاقت کے بجا استعمال کی جانب رہا ہے، تو اس لحاظ سے یہ سوچنا بھی سادہ لوحی ہی ہے کہ آدمی کو جس قدر بڑھ کر استعداد اور طاقت ملتی گئی ہے۔۔۔اس سے خوشحالی اور آسودگی میں بھی اضافہ ہوتا گیا ہو گا۔

اس نکتہ نظر کے مخالفین کلی طور پر الگ اور مختلف رائے رکھتے ہیں۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ انسانی لیاقت اور خوشحالی کے بیچ متضاد نسبت پائی جاتی ہے۔ وہ یہ تو مانتے ہی ہیں کہ طاقت سے بدعنوانی اور بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔۔۔ جیسے جیسے انسان کے ہاتھ میں طاقت بڑھتی گئی ہے، اس سے ایک ایسی سرد اور بے حس، میکانیکی دنیا پیدا ہو گئی ہے جو ہماری اصل ضروریات کے لیے ہر گز بھی موزوں نہیں ہے۔ ارتقاء نے ہمارے دماغ اور جسم کو ایک تاختی کی زندگی گزارنے کے لیے ڈھال رکھا ہے۔۔۔ جبکہ پہلے زراعت اور پھر صنعت کی طرف نقل مکانی نے ہمیں غیر فطری زندگیاں گزارنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اس طرز کی زندگی سے ہم قطعی طور پر اپنی رغبت اور جبلت کا پوری طرح اظہار کرنے سے قاصر ہیں اور یوں ہماری گہری ترین خواہشات، آرزوئیں اور دلی تمنائیں ہمیشہ ہی نامکمل رہ جاتی ہیں۔ آج محفوظ شہروں کی آسودہ مڈل کلاس زندگی کسی طور بھی تاختی گروہوں میں شامل ہو کر میمتھ ہاتھیوں کے شکار سے جڑی خوشی، لطف اور ولولے کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہر نئی ایجاد اور ہمارے اور آدم کی جنت کے بیچ فاصلوں کو بڑھاتی ہی چلی جا رہی ہے۔

تاہم، ہر ایجاد کے پیچھے چھپی تاریکی دیکھنے کا رومان بھی اتنا ہٹ دھرم ہے جتنا کہ ترقی کے اٹل پن پر اصرار ہوتا ہے۔ شاید ہم اپنے اندر کے تاختی سے دور ہو چکے ہیں لیکن یہ کوئی اتنی بھی بری شے نہیں ہے۔ مثال کے طور پر پچھلے دو سو برسوں کے دوران جدید علم طب کی بدولت بچوں میں شرح اموات 33 فیصد سے گھٹ کر صرف 5 فیصد رہ گئی ہے۔ کیا کوئی اس حقیقت سے انکار کر سکتا ہے کہ ان بچوں کی زندگی کی بدولت والدین کو کس قدر خوشی اور مسرت ملی ہے؟ اگر یہ بچے زندہ نہ بچ پاتے تو اس دکھ اور الم کا کوئی اندازہ لگا سکتا ہے جو ان بچوں کے والدین اور ان کے خاندانوں کو سہارنا پڑتا؟

خیر، ایک باریک فرق کے ساتھ ایسا نکتہ نظر بھی ہے جو اس بحث میں درمیانی راستہ اختیار کرتا ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ جب تک سائنسی انقلاب برپا نہیں ہوا تھا۔۔۔ تب تک انسانی قوت اور آسودگی کے بیچ کوئی نسبت نہیں تھی۔ قرون وسطیٰ دور کے دہقان یقینی طور پر اپنے تاختی اسلاف کے مقابلے میں کئی گنا دکھی اور خستہ حال تھے۔ لیکن پچھلی چند صدیوں کے دوران انسان نے اپنی قابلیت اور سکت کو نہایت دانشمندی سے استعمال کرنا سیکھ لیا ہے۔ جدید طب کی شاندار کامیابیاں اس کی صرف ایک مثال ہیں۔ اس کے علاوہ دوسری کئی ایسی غیر معمولی اور نہایت اعلیٰ کامیابیاں ہیں۔۔۔جیسے تشدد میں ناقابل یقین حد تک کمی، عالمی سطح کی جنگوں کا تقریباً عدم وجود اور بڑے پیمانے پر قحط اور بھوک مری کے خاتمے سے کون انکار کر سکتا ہے؟

لیکن پھر بھی، یہ بھی حد سے زیادہ اختصار اور توضیح پر مبنی دلیل قرار پائے گی۔ وہ اس لیے کہ سب سے اول، اس دلیل کا امید پرستانہ اندازہ نہایت قلیل عرصے پر مبنی ہے۔ انسانوں کی اکثریت کے لیے جدید طب کا پھل 1850ء سے قبل دسترس میں نہیں تھا اور بچوں کی شرح اموات میں غیر معمولی کمی تو بیسویں صدی میں شروع ہونے والا معاملہ ہے۔ بڑے پیمانے پر قحط اور فاقہ کشی انسانیت کو بیسویں صدی کے وسط تک ادھیڑتی رہی ہے۔ بلکہ، 1958ء سے لے کے 1961ء تک کے تین سالہ عرصے کے دوران قحط سالی کے نتیجے میں اشتراکیت پر یقین رکھنے والے چینی علاقوں میں ایک سے لے کر تقریباً پانچ کروڑ لوگ فاقوں سے مر گئے تھے۔ عالمی سطح کی تباہ کن جنگوں کا امکان تو 1945ء کے بعد ہی کم ہوا ہے اور اس کی وجہ بھی یہ ہے کہ دنیا بھر میں اب ایٹمی ہتھیاروں کا زبردست خوف پایا جاتا ہے۔ یہ درست ہے کہ پچھلی چند دہائیاں یقینی طور پر انسانیت کے لیے سنہری دور کی حیثیت رکھتی ہیں لیکن صرف ان چند دہائیوں کی بنیاد پر یہ بتا پانا ناممکن ہے کہ آیا یہ انسانی تاریخ میں بنیادی اور ہمیشگی تبدیلی کا مظہر ہے یا پھر خوش قسمتی کا مختصر اور عارضی دور ہے؟ جب ہم جدیدیت پر رائے قائم کرتے ہیں تو اکیسویں صدی کے کسی مڈل کلاس مغربی باشندے کے نقطہ نظر سے اس معاملے کو دیکھنا کافی دلکش ہو سکتا ہے۔ لیکن ہمیں انیسویں صدی کے کسی ویلش کوئلے کے کان کن، چین کے کسی افیونی اور تسمانیہ کے آبروجین کا نقطہ نظر بھی تو خاطر میں لانا چاہیے۔ آخری تسمانی عورت جو حقیقی دنیا کی حقیقی انسان تھی۔۔۔ ہمیں یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ وہ ریچل گرین نامی 'فرینڈز' ڈرامہ سیریز کی افسانوی کردار عورت سے کسی طور بھی کم اہم نہیں ہے۔ ہم ریچل گرین کے ساتھ اپنی جدید دنیا کو خوب جوڑتے ہیں لیکن اس تسمانی عورت کی دکھ بھری زندگی کو یکسر بھلا دیتے ہیں۔

دوم یہ ہے کہ پچھلے پچاس سے ستر برسوں کے دور نے غالباً مستقبل کی تباہیوں کا بیج بو دیا ہے۔ پچھلی چند دہائیوں میں ہم نے کرہ ارض کے ماحولیاتی توازن کو ان گنت طریقوں سے بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔ اب تحقیق سے ثابت ہے کہ اس بگاڑ کا نتیجہ نہایت بھیانک ثابت ہو گا۔ اس امر کے بیش بہا ثبوت موجود ہیں کہ ہم اس قدر اسراف اور استعمال پر مائل ہو چکے ہیں کہ اب ہم نے بتدریج انسانی آسودگی اور خوشحالی کی بنیادوں کو تباہ کرنا شروع کر دیا ہے۔

سوئم یہ ہے کہ ہم جدید خردمند آدمی نامی اپنی نوع انسانی کو صرف اسی صورت بے پناہ کامیابیوں پر مبارکباد پیش کیا کریں جب ہم دوسری تمام نباتاتی اور حیوانی انواع اور اقسام کو درپیش تباہی سے نظریں چرا لیں۔ آج ہمیں جتنی بھی مادی دھن دولت تک رسائی حاصل ہے۔۔۔ اور ہم بیماریوں سے بچ کر جیتے ہیں اور قحط سالی ہمیں مزید پریشان نہیں کرتی تو یہ ساری دین۔۔۔ لیبارٹریوں میں بند بندروں، دودھ دینے والی صنعتی گائیوں اور کنوئیر بیلٹ پر پلتی ہوئی مرغیوں کی ہے۔ ہم نے پچھلے دو سو برسوں کے دوران اربوں کی تعداد میں ان جانوروں کو صنعتی استحصال کا نشانہ بناتے ہوئے اس قدر جبر اور ظلم کا نشانہ بنایا ہے کہ اس کی مثال اس سیارہ زمین کی یادداشت میں کبھی نہیں رہی ہو گی۔ اگر ہم جانوروں کے حقوق کے تحفظ پر سرگرم عمل لوگوں اور اداروں کی کہی باتوں کا صرف دس فیصد بھی سچ مان لیں تو

جدید صنعتی زراعت۔۔۔ تاریخ کا سب سے گھناؤنا جرم قرار دیا جائے گا۔ جب ہم عالمی سطح پر خوشحالی اور آسودگی کا اندازہ لگاتے ہیں تو صرف اپر کلاس کی آسودگی کو سامنے رکھنا بالکل غلط ہو گا۔۔۔ یورپیوں اور امریکیوں کو یا پھر صرف مردوں کو دستیاب اختیار اور خوشحالی پر تکیہ کر لینا، کسی طور بھی درست پیمانہ نہیں ہے۔ بلکہ۔۔۔ یہ تو تاریخ کا ایسا معاملہ ہے کہ اس میں صرف مرد یا عورتوں۔۔۔ ایک یا دوسری نسل۔۔۔ خردمند آدمی کی نوع ہی نہیں بلکہ صرف بنی نوع انسانوں کی خوشی کا پیمانہ بنانا بھی درست نہیں ہو گا۔ یہ ہمیشہ اور بے انتہاء غلط ہی رہے گا۔

خوشی کی گنتی اور آسودگی کا شمار

ابھی تک ہم نے خوشی اور مسرت پر جتنی بھی بحث کی ہے، اس سے تو یہی لگتا ہے کہ گویا یہ زیادہ تر مادی عوامل جیسے صحت، غذا اور دھن دولت وغیرہ کا ماحاصل ہے۔ ہم یہ کہتے پھرتے ہیں کہ اگر لوگ امیر اور تندرست ہوں تو لازمی طور پر خوشحال بھی ہوں گے۔ لیکن کیا یہ واقعی اتنا ہی واضح ہے؟ فلسفی، پجاری اور شاعر ہزاروں سال تک خوشی کی فطرت پر بحث کرتے آئے ہیں اور زیادہ تر کا خیال یہ ہے ہماری خوشی، مسرت اور آسودگی میں جتنا ہاتھ مادی اشیاء اور کیفیات کا ہے، کم از کم اتنا ہی حصہ سماجی، اخلاقی اور روحانی عوامل کا بھی ہے۔ یہ عین ممکن ہے کہ جدید اور آسودہ معاشروں میں لوگ مادی طور پر تو بے شک خوشحال ہوں لیکن وہ تنہائی، علیحدگی اور بے معنی پن کے ہاتھوں سخت کرب اور دکھ میں مبتلا رہتے ہیں۔ اور غالباً ہمارے نسبتاً کم کھاتے پیتے اور خوشحال آباؤاجداد اپنی خوشی، مسرت اور آسودگی کے بڑے حصے کو مادی اشیاء کی بجائے برادری، مذہب اور فطرت کے ساتھ تعلق وغیرہ سے سینچا کرتے تھے۔
حالیہ دہائیوں میں حیاتیات اور نفسیات دانوں نے انسانوں کی خوشی سے متعلق عوامل کو سائنسی بنیادوں پر مطالعہ کرنے کا چیلنج قبول کیا ہے۔ کیا یہ دھن دولت ہے؟ خاندان؟ جینیات یا پھر غالباً راست بازی اور جوہر صفتی؟ لوگوں کی خوشی اور مسرت کی وجہ کیا ہے؟ اس ضمن میں سائنسی طریقے کے مطابق۔۔۔ سب سے پہلا قدم یہ طے کرنا ہے کہ آخر ہم ماپنا کیا چاہتے ہیں؟ عمومی طور پر 'خوشی اور مسرت' سے مراد 'نفسی اور انفرادی' یا 'ذہنی اور اندرونی' تندرستی یا اطمینان ہے۔ اس لحاظ سے خوشی یا مسرت وہ شے ہے جو میں اپنے اندر محسوس کرتا ہوں۔ اس سے مراد فوری طور پر 'سرور یا راحت' اور دائمی طور پر 'طرز زندگی میں طمانیت یا دلجمعی' کا احساس ہے۔ اگر یہ ایسی شے ہے جو میرے اندر محسوس ہوتی ہے تو پھر ہم اس کو بیرونی طور پر کیسے ماپ سکتے ہیں؟ غالباً ہم یہ کر سکتے ہیں کہ لوگوں سے پوچھ لیں کہ آخر وہ کیسا محسوس کرتے ہیں؟ چنانچہ وہ حیاتیات اور نفسیات دان جو خوشی کی گنتی اور آسودگی کا شمار کرنے نکلے ہیں۔۔۔ وہ لوگوں کو ان کے احساسات سے متعلق سوالنامے بھرنے کو دیتے ہیں اور پھر جوابات کی پڑتال کر کے نتیجہ اخذ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ایک مثالی موضوعی یا انفرادی سوالنامہ لوگوں سے انٹرویو کرتا ہے کہ صفر سے لے کر دس تک کے پیمانے پر، وہ مختلف عبارات سے کس قدر متفق ہیں۔ مثلاً، 'میں جیسا/جیسی ہوں، اس سے خوش ہوں'، 'میں یہ محسوس کرتا/کرتی ہوں کہ زندگی بسر کرنے کے لائق ہے'، 'میں مستقبل سے متعلق کافی پر امید ہوں' یا پھر 'زندگی گلزار ہے۔۔۔' وغیرہ وغیرہ۔ محققین ان سوالات کے جوابات کو جمع کر لیتے ہیں اور پھر انفرادی سطح پر لوگوں کی نفسانی تندرستی یا خوشحالی کا اندازہ لگا لیتے ہیں۔

اس طرح کے سوالناموں کو استعمال کرنے کا مقصد خوشی یا مسرت جیسی اندرونی یا موضوعی شے کو کئی معروضی یا بیرونی عوامل کے ساتھ جوڑ کر تعلق پیدا کرنا ہوتا ہے۔ مثلاً ایک تحقیق میں سالانہ ایک لاکھ ڈالر کمانے والے ایک ہزار لوگوں کی خوشی اور مسرت کو سالانہ پچاس ہزار ڈالر کمانے والے ایک ہزار لوگوں کی خوشی اور مسرت کے ساتھ تقابل کرنا مقصد ہو سکتا ہے۔ بالفرض اگر پہلی تحقیق سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اوسطاً اس گروہ کے ہر فرد کی نفسانی خوشی کی سطح 8.7 جبکہ دوسری تحقیق میں اوسطاً ہر فرد کی نفسانی خوشی کی سطح 7.3 ہے۔۔۔ تو کوئی بھی محقق نہایت آسانی کے ساتھ یہ نتیجہ اخذ کر سکتا ہے کہ دولت اور خوشی یا آسودگی کے بیچ ایک مثبت تعلق یا ربط پایا جاتا ہے۔ سادہ الفاظ میں کہا جائے تو اس تحقیق کا نتیجہ یہ ہوگا کہ، 'دولت، خوشی کی ضامن ہے'۔ یہی طریقہ استعمال کر کے ہم یہ پتہ چلا سکتے ہیں کہ آیا جمہوری مملکتوں میں رہنے والے لوگ زیادہ خوش وخرم ہوتے ہیں یا آمریت تلے بسنے والے؟ شادی شدہ اور غیر شادی شدہ لوگوں میں زیادہ خوش و خرم کون ہوتا ہے؟ وغیرہ وغیرہ

اس طرح کے سائنسی طریقوں سے تاریخ دانوں کو بھی میدان میسر آجاتا ہے۔۔۔ تاریخ دان بھی ماضی کے ہر دور میں دولت، سیاسی آزادی اور شرح طلاق وغیرہ جیسے معاملات کی جانچ، پڑتال اور تقابل وغیرہ کر سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر اگر یہ پتہ چلتا ہے کہ لوگ آمریت کی بجائے جمہوریت میں جبکہ غیر شادی شدہ کے مقابلے میں شادی شدہ زیادہ خوش و خرم رہتے ہیں تو کوئی بھی تاریخ دان نہایت آسانی سے یہ نتیجہ اخذ کر سکتا ہے کہ پچھلی چند دہائیوں کے دوران دنیا میں جمہوری طرز حکومت کی اٹھان کے سبب انسان اب پہلے سے زیادہ خوش و خرم ہیں جبکہ طلاق کی شرح میں اضافہ بے شک، انسانوں کے یہاں معکوس رجحان کی نشاندہی کرتا ہے۔

یہ طرز فکر، ظاہر ہے بے عیب نہیں ہے۔ اس میں نقائص بھی ہیں لیکن ان نقائص پر انگلی اٹھانے سے پہلے بہتر ہے کہ ہم نتائج پر نظر ڈال لیں۔

ایک دلچسپ نتیجہ یہ پتہ چلا ہے کہ دھن، دولت یا پیسہ واقعی خوشی لاتا ہے۔ لیکن ایسا صرف ایک حد تک ہوتا ہے اور اس حد کے بعد پیسے کی اہمیت کم ہو جاتی ہے۔ وہ لوگ جو معاشی سیڑھی کے نچلے زینوں پر ہوتے ہیں، ان کے لیے دولت اور دھن خوشی اور مسرت کا باعث ہوتا ہے۔ فرض کریں، اگر آپ ایک ایسی امریکی عورت ہیں جو تن تنہا اپنے بچوں کا پیٹ لوگوں کے گھر، کاروبار میں صفائی ستھرائی کر کے سالانہ 12000 امریکی ڈالر کما کر پالتی ہیں اور آپ اچانک 50000 امریکی ڈالر کی لاٹری جیت لیں تو غالباً بالضرور ہی دیرپا اور معنی خیز

انداز میں انفرادی سطح پر خوشی اور آسودگی پالیں گی۔ آپ اپنے بچوں کا پیٹ، مزید قرضوں میں ڈوبے بغیر ہی پالنے کے قابل ہو جائیں گی۔ لیکن، اگر آپ ایک ایگزیکٹو ہیں جو سالانہ 250000 امریکی ڈالر کماتی ہے اور ایک دن آپ کی 100000 امریکی ڈالر کی خطیر لاٹری نکل آتی ہے یا آپ کی کمپنی۔۔۔ تنخواہ دگنی کر دیتی ہے تو پھر کیا ہو گا؟ آپ کی یہ خوشی اور مسرت۔۔۔چند ہفتوں سے زیادہ برقرار نہیں رہے گی۔ عملی مشاہدات سے پتہ چلا ہے کہ آپ یقینی طور پر اس خوشی کو پائیدار اور دیرپا انداز میں برقرار رکھنے کے اہل نہیں ہوں گے کیونکہ اس خوشی کا آپ کی حالیہ زندگی میں زیادہ کچھ معنی نہیں ہیں۔ شاید، آپ اس پیسے سے نئی مہنگی کار خرید لیں، کسی عالیشان گھر میں منتقل ہو جائیں، مہنگی شراب پینا شروع کر دیں۔۔۔ لیکن جلد ہی آپ کو یہ سب اپنی زندگی میں روٹین اور معمول ہی محسوس ہو گا۔

ایک دوسری دلچسپ دریافت یہ ہے کہ بیماری کے نتیجے میں خوش خرمی میں کمی، کم معیادی ہوتی ہے۔ یہ صرف اس وقت طویل مدتی غم اور دکھ میں بدلتی ہے جب کسی شخص کی حالت بگڑتی ہی چلی جائے یا پھر اس بیماری میں مسلسل اور کمزوری کا باعث بننے والا درد اور بے چینی کا عمل دخل زیادہ ہو۔ وہ لوگ جنھیں دائمی بیماریوں جیسے ذیابیطس کی تشخیص ہو جائے۔۔۔ عام طور پر صرف کچھ وقت کے لیے ہی پریشانی اور دل شکستگی کا شکار ہوتے ہیں۔ اگر ان کی یہ بیماری یوں ہی، اسی سطح پر برقرار رہے تو وہ جلد ہی اس نئی کیفیت کے ساتھ مطابقت پیدا کر کے صحت مند لوگوں کی طرح ہی خوش و خرم رہنا شروع کر دیتے ہیں۔ فرض کریں، لوسی اور لیوک۔۔۔ مڈل کلاس سے تعلق رکھنے والے جڑواں بہن بھائی ہیں۔ یہ دونوں، ایک نفسانی یا انفرادی خوشی یا آسودگی سے متعلق ایک سائنسی تحقیق میں حصہ لینے پر رضامند ہو جاتے ہیں۔ نفسیات کی لیبارٹری سے واپسی پر، لوسی کی گاڑی ایک بس سے ٹکرا جاتی ہے۔ لوسی کی کئی ہڈیاں ٹوٹ جاتی ہیں اور وہ ایک ٹانگ سے مکمل طور پر معذور ہو جاتی ہے۔ جب ریسکیو 911 کے لوگ اس کو تقریباً بے ہوشی کی حالت میں اپنی تباہ شدہ گاڑی سے نکالنے کی کوشش کر رہے ہوتے ہیں تو اسی وقت فون کی گھنٹی بجتی ہے اور دوسری طرف لیوک کی خوشی اور جوش و خروش سے بھری آواز آتی ہے کہ۔۔۔ اس کی ایک کروڑ امریکی ڈالر کی لاٹری نکل آئی ہے۔ اس واقعہ کے دو برس بعد، لوسی مستقل معذوری سے دوچار ہے جبکہ لیوک خاصا دولت مند ہے۔ لیکن، نفسیاتی لیبارٹری میں امکان غالب یہی ہے کہ ان دونوں کے جوابات وہی ہوں گے جو دو سال قبل، اس تقدیر کے لکھے دن کی صبح رہے تھے۔

خاندان اور برادری ہماری خوشی اور آسودگی پر دولت اور پیسے کی نسبت زیادہ اثر انداز ہوتے ہیں۔ تحقیق سے ثابت ہے کہ وہ لوگ جو مضبوط اور مربوط خاندانوں یا سہارا دینے والی برادریوں کا حصہ ہوتے ہیں۔۔۔ ان لوگوں کی نسبت کافی زیادہ خوش اور آسودہ محسوس کرتے ہیں جن لوگوں کے خاندان گڑبڑ کا شکار ہوں یا وہ کبھی کسی برادری کا حصہ نہ رہے ہوں یا کبھی حصہ بننا ہی نہ چاہتے ہوں۔ اس ضمن میں شادی کی اہمیت خصوصی طور پر بڑھ کر پائی گئی ہے۔ کئی کئی بار دہرائی گئی سائنسی تحقیق نے ثابت کیا ہے کہ خوش و خرم ازدواجی زندگی کا انفرادی سطح پر خوشی اور آسودگی کے ساتھ جبکہ دوسری جانب بدحال ازدواجی زندگی کا مصیبت اور کرب کے ساتھ انتہائی گہرا تعلق

ہے۔ اس امر کا معاشی اور حتیٰ کہ جسمانی کیفیت یا حالت کے ساتھ سرے سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ کسی نادار اور مفلس شخص کو اگر محبت کرنے والی بیوی، مخلص خاندان اور پر تپاک برادری میسر ہو تو وہ یقینی طور پر اس شخص سے زیادہ خوش اور آسودہ محسوس کرے گا جو ارب پتی ضرور لیکن بالکل تنہا ہے۔ لیکن اس طرز کی خوشحالی اور آسودگی کے لیے لازم ہے کہ وہ شخص بہت زیادہ غریب نہیں ہے اور اس کی ناداری کی وجہ کوئی بہت ہی تکلیف دہ، روز بروز بگڑتی ہوئی بیماری نہیں ہے۔

ان نتائج سے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ غالباً پچھلے دو سو برسوں کے دوران مادی حالت اور کیفیات میں بے پناہ بہتری کا سارے کا سارا پھل۔۔۔ خاندان اور برادریوں کے انحطاط کے سبب گل سڑ گیا ہے۔ اگر ایسا ہی ہے تو پھر، آج ہم میں سے ہر شخص اتنا ہی خوش و خرم اور آسودہ ہے جتنا کوئی بھی شخص 1800ء میں رہا کرتا تھا۔ بلکہ، وہ شخصی آزادی۔۔۔ جس کی ہم دن رات اہمیت اور قدر بیان کرتے نہیں تھکتے، اصل میں ہماری جڑیں کاٹ رہی ہے۔ وہ یوں کہ آج ہم اپنا جیون ساتھی، دوست اور پڑوسیوں کا انتخاب تو کر سکتے ہیں لیکن وہ بھی تو ہمیں چھوڑ کر جانے میں آزاد ہیں۔ انفرادی سطح پر لوگوں کو اپنی زندگی کی راہ متعین کرنے کی جو غیر معمولی طاقت مل گئی ہے۔۔۔ اس کے نتیجے میں سپردگی اور وابستگی ناپید ہوتی چلی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب ہم روز بروز ایسی دنیا کی طرف بڑھ رہے ہیں جس میں ادھڑے ہوئے خاندان اور برادریاں ہیں جبکہ تنہائی کا دور دورہ ہے۔

ان سائنسی مطالعات میں اخذ شدہ نتائج میں سب سے اہم یہ ہے کہ خوشی اور آسودگی۔۔۔ کسی طور بھی معروضی یا مادی کیفیات جیسے دولت، صحت اور حتیٰ کہ خاندان اور برادری پر بھی انحصار نہیں کرتی۔ بجائے، اس کا سارا انحصار معروضی حالات اور ہماری انفرادی توقعات کے بیچ تعلق پر رہتا ہے۔ اگر آپ ایک بیل گاڑی کی توقع رکھتے ہیں اور آپ کو بیل گاڑی مل بھی جاتی ہے تو آپ یقیناً آسودگی اور طمانیت محسوس کریں گے۔ اگر آپ ایک بالکل نئی فیراری کار کی توقع رکھتے ہیں لیکن آپ کو سیکنڈ ہینڈ ہونڈا سٹی ملتی ہے تو یقیناً آپ محرومی کا شکار محسوس کریں گے۔ یہی وجہ ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ہی لوگوں کی خوشی اور آسودگی پر لاٹری جیتنے کا وہی اثر ہوتا ہے جو مضمحل کرنے والے کار کے حادثے کا ہو سکتا ہے۔ جب حالات بہتر ہوتے جاتے ہیں تو اس کے ساتھ ساتھ توقعات کا غبارہ بھی پھولتا جاتا ہے اور نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ڈرامائی حد تک معروضی حالات میں بہتری بھی ہماری خوشی میں کوئی کردار ادا نہیں کرتی۔۔۔ بلکہ ہمیں بیزاری اور عدم اطمینان کا شکار ہو سکتے ہیں۔ جب حالات بگڑتے ہیں تو ہماری توقعات بھی کم ہوتی جاتی ہیں اور اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ شدید ترین بیماری میں بھی ہم اتنی ہی خوش خرمی یا آسودگی محسوس کر سکتے ہیں جتنی کہ پہلے ہوا کرتی تھی۔

اب آپ غالباً یہ کہیں گے کہ یہ جاننے کے لیے ہمیں نفسیات دانوں اور ان کے احمقانہ سوالناموں کی سرے سے ضرورت ہی نہیں تھی۔ نبی، پیغامبر، شاعر اور فلسفیوں نے تو یہ 'حقیقت' ہزاروں سال پہلے ہی جان لی تھی کہ جتنا میسر ہو، اسی پر تکیہ کر کے شکر ادا کرنا۔۔۔ اپنی نفسانی خواہشات کے پیچھے بھاگتے رہنے اور جمع کرنے کی دھن میں لگے رہنے سے ہزار بلکہ لاکھ کروڑ درجے بہتر ہوتا ہے۔ آپ کا مدعا

بالکل درست ہے لیکن پھر بھی۔۔۔ جدید تحقیق سے بھی اگر یہ ثابت ہو جائے تو بہت ہی بہتر ہے۔ ہمیں اپنی تشفی کے لیے بہت سے اعداد، گنتی اور شمار۔۔۔ صاف ستھرے گراف اور چارٹ کی شکل میں مل جاتا ہے اور ہم اسی نتیجے پر پہنچتے ہیں جس پر کبھی قدیم زمانے کے لوگ بھی پہنچ چکے تھے۔ جدید اور قدیم، ہم آہنگ ہو جائے تو اس میں کوئی مضائقہ ہے؟

انسانی توقعات کی کلیدی اہمیت کے خوشی اور آسودگی کی تاریخ کی سمجھ بوجھ پر بہت ہی گہرے اور دور رس مضمرات ہوتے ہیں۔ اگر خوشی اور آسودگی کا سارا دارومدار صرف معروضی حالات جیسے دولت، صحت اور سماجی تعلقات پر ہوتا تو غالباً اسے تاریخ کے جھروکوں میں تلاش کر کے سمجھنا بہت ہی آسان ہو جاتا۔ جب ہمیں سائنسی بنیادوں پر یہ نتیجہ ثابت شدہ حالت میں مل جاتا ہے کہ دراصل خوشی کا تعلق تو انفرادی توقعات کے ساتھ زیادہ جڑا ہے تو پھر تاریخ دانوں کا کام اچھا خاصا مشکل ہو جاتا ہے۔ آج ہم جدید انسانوں کے پاس نیند آور اور درد کشا گولیوں کا بڑا خزانہ تو موجود ہے لیکن درد سے چھٹکارے اور مسرت کی چاہ سے متعلق ہماری توقعات بھی اتنی ہی زیادہ بڑھ چکی ہیں۔۔۔ بلکہ یہ توقعات اتنی زیادہ ہو چکی ہیں کہ ہم اتنے دکھ، درد اور کرب میں مبتلا ہو چکے ہیں کہ شاید ہمارے آباؤ اجداد کبھی اتنا کچھ سہنا تو دور، اس شدت بارے سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔

اس طرز فکر کو قبول کر پانا نہایت مشکل ہے۔ آج مسئلہ یہ ہے کہ استدلال یا فکری مغالطے ہماری نفسیات کی جڑوں میں بیٹھ چکے ہیں۔ جب ہم آج یا ماضی میں بھی لوگوں کی طمانیت اور آسودگی کی سطح کا اندازہ لگانے یا تصور کرنے کی کوشش کرتے ہیں فوراً ہی ان کی جگہ پر کھڑے ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی طرح سوچنے، سمجھنے، محسوس کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ ہمارا فکری مغالطہ ہے اور اسی کے سبب ہم یہ جاننے میں کبھی کامیاب نہیں ہو پاتے کیونکہ اس طرح کی فکری کوشش ہماری توقعات کو دوسروں کے مادی حالات پر چسپاں کر دیتی ہے۔ آج کے جدید اور آسودہ معاشروں میں ہر روز صبح اٹھ کر نہا دھو۔۔۔ اجلے صاف کپڑے پہننا حسب معمول رواج ہے۔ قرون وسطیٰ دور میں دہقان کئی کئی مہینوں تک نہانے کا سوچتے بھی نہیں تھے اور غالباً کپڑے بدلنے کا سرے سے کوئی رواج ہی نہیں تھا۔ اب اس طور گندگی اور غلاظت۔۔۔ یوں بدبو اور بساند میں بسر رکھنے کا سوچ کر ہی ہمیں گھن آجاتی ہے۔ ہمیں گھن آتی ہے لیکن قرون وسطیٰ دور کے دہقانوں کے لیے یہ حسب معمول، عام بات تھی۔ انھیں ان دھلی قمیص پہننے اور اس کی بساند اور بدبو کی عادت تھی۔ اب ایسا بھی نہیں تھا کہ وہ اسی بدبو اور بساند میں بسر رکھنا چاہتے تھے، ان کی مادی حالت یہ تھی کہ وہ ایسا نہیں کر سکتے تھے۔ ان کو وہی میسر تھا جس کی انھیں خواہش تھی۔ تو جہاں تک لباس اور پیراہن کی بات ہے، وہ اسی سے مطمئن تھے جو انھیں میسر تھا۔

اگر آپ اس پر غور کریں تو یہ ہرگز بھی حیران کن نہیں ہے۔ ہمارے بن مانس عمزاد بھی تو ہیں۔۔۔ وہ تو کبھی نہاتے ہی نہیں ہیں اور سرے سے کپڑے پہنتے ہی نہیں ہیں۔ ہمیں یہ سوچ کر تو کبھی گھن نہیں آئی کہ ہمارے پالتو کتے اور بلیاں کبھی نہیں نہاتیں اور ہر روز کوٹ استری کر کے نہیں پہنتیں۔ ہم اس حقیقت کے باوجود ان سے خوب پیار کرتے ہیں، انھیں سہلاتے ہیں اور ان کو چومتے چاٹتے

اور خود سے لپٹائے رکھتے ہیں۔ آسودہ معاشروں میں، چھوٹے بچے بھی نہانے سے نفرت کرتے ہیں اور والدین کو یہ رسم و رواج سکھانے، تمیز سکھانے اور تربیت دینے میں سالہاسال لگ جاتے ہیں۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ سارا معاملہ، ہماری توقعات کا ہے۔

اگر خوشی کا تعین توقعات کی بنیاد پر ہوتا ہے تو ہمارے معاشرے کے دو ستون۔۔۔ ذرائع ابلاغ عامہ اور نشر و اشاعت، تشہیر کی صنعت غالباً نادانستگی میں عالمی سطح اور بڑے پیمانے پر طمانیت اور ذہنی سکون کے ذخائر کو انتہائی تیزی کے ساتھ ختم کرتے جا رہے ہیں۔ اگر آپ آج سے پانچ ہزار سال قبل کسی چھوٹے سے گاؤں میں اٹھارہ سالہ نوجوان ہوتے تو غالباً۔۔۔ آپ اس گاؤں کے سب سے وجیہا اور خوبرو مرد قرار دیے جاتے کیونکہ اس گاؤں میں صرف پچاس دوسرے مرد ہوتے اور ان میں سے بھی زیادہ تر ادھیڑ عمر، بوڑھے، داغ دار یا چہرے پر جھریاں ہوتیں یا پھر ان میں کئی ابھی تک نوعمر لڑکے ہوتے۔ لیکن اگر آپ آج کی دنیا میں ایک نوجوان ہیں تو امکان یہی ہے کہ آپ خود کو ناکافی اور ادھورا ہی محسوس کریں گے۔ اگر آپ کے سکول میں باقی لڑکے بھلے بدصورت اور بھدے ہوں لیکن آپ خود کو ان کے ساتھ پیمانے پر نہیں جانچیں گے بلکہ فلمی ستاروں، کھلاڑیوں اور ان سپرماڈلوں کے ساتھ خود کا مقابلہ کریں گے جنھیں آپ ہر روز، دن میں کئی کئی بار ٹی وی، فیس بک اور سڑکوں پر بڑے بڑے بل بورڈوں پر بنا ٹھنا دیکھتے ہی ہیں۔

تو یہ عین ممکن ہے کہ تیسری دنیا کے مما لک میں عدم اطمینان اور بدحالی کی وجہ صرف غربت، بیماری، بدعنوانی اور سیاسی جبر ہی نہیں ہے بلکہ ترقی یافتہ اور پہلی دنیا کے معیارات سے پردہ دری اور نمود و نمائش بھی ہے۔ مصر کی مثال لیں۔ کسی بھی مصری باشندے کا رمسیس ثانی فرعون اور قلوپطرہ کے دور میں بھوک، طاعون اور تشدد کے ہاتھوں ہلاکت کا امکان حسنی مبارک کے دور حکومت کے مقابلے میں یقینی طور پر بہت ہی زیادہ رہا کرتا ہو گا۔۔۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ حسنی مبارک کے دور میں مصریوں کی مادی حیثیت، تاریخ میں سب سے بہتر قرار دی جاتی ہے۔ اگر تاریخی تناظر میں دیکھا جائے تو پھر مصریوں کو اس خوشحالی پر 2011ء میں مصر کی گلیوں میں جشن منا کر، شکرانے کے نوافل ادا کرنے چاہیے تھے۔ بجائے، 2011ء میں مصری قوم حسنی مبارک کا تختہ الٹنے کو اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ کیوں؟ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ مصری اپنا تقابل فرعون اور قلوپطرہ کے زیر تسلط اجداد رعایا کے ساتھ نہیں بلکہ اپنے ہم عصر، اوبامہ کے امریکہ میں بسنے والے کروڑوں آزاد اور آسودہ امریکیوں کے ساتھ کرتے تھے۔

اگر یہ معاملہ ہے تو پھر اس لحاظ سے تو اگر انسان کو ہمیشگی اور حیات جاودانی بھی مل جائے تو وہ پھر بھی غیر مطمئن اور ناخوش ہی رہے گا۔ فرض کریں، اگر سائنس دنیا کی ساری بیماریوں کا علاج ڈھونڈ لیتی ہے۔۔۔ عمر رسیدگی اور بڑھاپے کو بھی زیر کر لیا جاتا اور ایسی ایسی روح افزاء علاج اور طریقے دریافت ہو جاتے ہیں لوگ ہمیشہ کے لیے جوان اور تندرست رہ پاتے ہوں تو پھر کیا ہو گا؟ غالب امکان یہی ہے کہ دنیا بھر کے انسانوں میں فوری طور پر غم، غصے اور بے چینی کی غیر معمولی وبا پھوٹ پڑے گی۔ لیکن کیوں؟

اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ لوگ یعنی انسانوں کی اکثریت اس نئی کرشماتی علاج کو حاصل کرنے کی استطاعت نہیں رکھتی ہوگی، وہ شدید غصے اور طیش کا شکار ہو جائیں گے۔ تاریخ بھر میں غریب اور محکوم انسانوں کے لیے تسلی اور اطمینان کی ایک بڑی صورت موت کی شکل میں موجود رہتی تھی۔ ان کے نزدیک موت ایسی شے ہے جو کسی کا لحاظ نہیں کرتی اور اس کی نظر میں سب برابر ہیں۔ موت، بالآخر امیر یا غریب۔۔۔ہر کسی کو آن لیتی ہے۔ تو یوں دنیا کی اکثریت یہ سوچ کر ہرگز بھی اطمینان اور آسودگی محسوس نہیں کر پائے گی کہ انھیں تو مرنا ہی پڑے گا لیکن امیر اور رئیس لوگ ہمیشہ ہی جوان اور حسین، تندرست رہیں گے۔

45–پہلے زمانوں میں حسن اور خوبصورتی کا معیار وہی لوگ ہوتے تھے جو آپ کے ارد گرد بسر رکھتے تھے۔ آج میڈیا اور فیشن کی صنعت نے ہیں حسن کے انتہائی غیر حقیقی معیار سے روشناس کروا دیا ہے۔ آج فیشن اور میڈیا کے لوگ سیارے پر سب سے خوبرو اور حسین لوگوں کو تلاش کرتے ہیں اور ہر دم ان کو ہماری آنکھوں کے سامنے پریڈ کرواتے ہیں۔ اگر آج ہم اپنی شکل و صورت سے زیادہ خوش نہیں ہیں تو یہ ہرگز حیرت کی بات نہیں ہے۔

لیکن انسانوں کی وہ ننھی اقلیت جو اس طرح کے علاج معالجے کو حاصل کرنے مالی استطاعت رکھتے بھی ہوں، وہ بھی اس حوالے سے زیادہ بشاشت اور راحت محسوس نہیں کریں گے۔ بلکہ انھیں اس حوالے سے فکر اور اندیشے لاحق ہو جائیں گے۔ یہ ضرور ہے کہ اس نئے علاج اور معالجے سے انھیں طویل عمری اور ہمیشہ جوانی مل جائے گی لیکن وہ مردوں کو تو زندہ نہیں کر سکتے۔ ذرا سوچیے، یہ کس قدر ہولناک خیال ہے کہ میں اور میرا شریک زندگی ہمیشہ زندہ تو رہ سکتے ہیں لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم کبھی کسی ٹریفک حادثے یا

دہشت گردانہ حملے، جرم کا نشانہ نہ بنیں۔ تو یوں، جاودانی حیات کے مالک لوگ رفتہ رفتہ اتنے فکرمند ہو جائیں گے کہ وہ زندگی میں معمولی سا خطرہ اور جوکھم اٹھانے کو بھی تیار نہیں ہوں گے۔ ان کی زندگی میں اپنی بیوی، بچوں یا قریبی دوستوں کو کھودینے کا دکھ اور الم۔۔۔ ناقابل برداشت ہو گا۔

کیمیائی خوشی

سماجیات کے شعبے میں تحقیق کرنے والے سائنسدان ذہنی صحت اور اطمینان کو جانچنے کے لیے سوالنامے تقسیم کرتے ہیں اور پھر اس کے نتائج کو سماجی اور معاشی عوامل جیسے دولت اور سیاسی آزادی وغیرہ کے ساتھ جوڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حیاتیات دان بھی یہی سوالنامے استعمال کرتے ہیں لیکن وہ جوابات کو حیاتی کیمیائی اور جینیاتی عوامل کے ساتھ جوڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حیاتیات دانوں کی دریافتیں چونکا دینے والی ہیں۔

حیاتیات دانوں کا ماننا ہے کہ ہماری دماغی اور جذباتی دنیا پر حیاتی کیمیائی یا بائیوکیمیکل میکانیوں کا راج ہوتا ہے جو لاکھوں سال کی ارتقاء کے بعد تشکیل پایا ہے۔ باقی ساری دماغی حالتوں کی طرح ہماری ذہنی صحت مندی اور اطمینان کا تعین بھی بیرونی متغیروں جیسے تنخواہ، سماجی تعلقات اور سیاسی حقوق وغیرہ نہیں کرتے۔ بجائے اس کا تعین ہمارے پیچیدہ اعصابی نظام کی نسوں، عصبوں، عصبی معانقوں اور کئی دوسرے حیاتی کیمیائی مواد جیسے سیروٹونین، ڈوپامین اور آکسیٹوسین وغیرہ کرتے ہیں۔

کوئی بھی شخص لاٹری جیتنے، گھر خریدنے، تنخواہ بڑھنے، ترقی ملنے اور سچی محبت حاصل کرنے سے خوش نہیں ہوتا۔ لوگوں کو خوش کرنے والی صرف اور صرف ایک چیز ہے۔ یہ ان کے جسموں میں ابھرنے والے خوش کن احساسات ہوتے ہیں۔ اگر کسی شخص کی لاٹری نکل آئے یا اسے سچی محبت مل جائے تو وہ خوشی سے اچھل پڑتا ہے۔۔۔ اس کا یہ ردعمل پیسے اور محبوب کی وجہ سے نہیں ہوتا۔ اس کا یہ ردعمل دراصل قسم قسم کے ہارمونوں کی دین ہوتا ہے جو اس کی رگوں میں دوڑتے پھرتے ہیں اور ان برقیاتی اشاروں کا ہوتا ہے جو اس کے دماغ کے مختلف حصوں میں چمک کاریاں مچاتے ہیں۔

اس زمین پر جنت بنانے کے انسانی خواب کی بدقسمتی یہ ہے کہ ہمارے جسم کا اندرونی حیاتی کیمیائی نظام کی تشکیل کچھ اس طرح رکھی گئی ہے کہ خوشی کا احساس قدرے ساکن، یا کہیے ایک ہی سطح پر قائم رہتے ہیں۔ خوشی اور طمانیت، فطری انتخاب کی شے نہیں ہے۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ اگر دو پریشان حال اور متفکر والدین اپنی اگلی نسل کو تشویش اور پریشانی ہی موروثوں میں منتقل کریں گے یا کوئی آسودہ اور خوشحال جوڑا، اپنے بچوں میں طمانیت اور خوشی ہی منتقل کریں گے۔ یہ جینیاتی شے نہیں ہے بلکہ کیمیائی عمل ہے۔ ارتقاء کے عمل میں خوشحالی یا طمانیت اور بدحالی یا تکلیف کا صرف اتنا ہی کردار ہے کہ اس کی بنیاد پر بقاء اور افزائش نسل کی حوصلہ افزائی یا پھر حوصلہ شکنی ہوتی ہے۔ غالباً

اسی لیے یہ ہر گز حیران کن نہیں ہے کہ ارتقاء کے عمل نے ہمیں نہ تو بہت ہی زیادہ دکھی اور نہ ہی بہت زیادہ خوش بنایا ہے بلکہ ایک میانہ رو سطح پر برقرار رکھا ہے۔ یہ ایسی شے ہے کہ ہم چند لمحوں کے لیے خوش کن احساسات کا خوب مزہ لے سکتے ہیں لیکن یہ احساسات ہمیشہ باقی نہیں رہتے۔ جلد یا بدیر، یہ خوش کن احساسات کم ہوتے جاتے ہیں اور پھر ناخوشگوار احساسات آن دھمکتے ہیں۔ وہ بھی تادیر باقی نہیں رہتے اور یوں یہ رقص جاری رہتا ہے۔

مثال کے طور پر ارتقاء نے ہر اس نر کے لیے خوش کن احساسات کا انعام رکھا ہوا ہے جو زرخیز مادہ کے ساتھ جنسی تعلق پیدا کر کے اپنے موروثے افزائش نسل کے لیے منتقل کرنے پر تیار ہو۔ اگر جنسی تعلقات کے ساتھ لذت اور سرور کی کیفیت نہ جڑی ہوتی تو غالباً صرف چند ایک سوا، کوئی نر جنسی عمل میں کوئی دلچسپی نہ دکھاتا۔ جہاں یہ، وہیں ارتقاء نے جنسی عمل کے ساتھ جڑے لذت اور سرور کے اس احساس کو کچھ اس طرح تشکیل دیا ہے کہ یہ جلد از جلد تھم کر بیٹھ بھی جائے، یعنی یکدم ختم بھی ہو جائے۔ وہ اس لیے کہ اگر شہوانی ہیجان ہمیشہ باقی رہتا۔۔۔ مسلسل چلتا رہتا تو پھر، خوشی کے مارے نر اسی کام میں لگے رہتے اور بھوک سے مر جاتے کیونکہ انھیں خوراک میں کوئی دلچسپی ہی نہ رہتی۔۔۔ یہی نہیں بلکہ اگر شہوانیت کا جوش اور ہیجان۔۔۔ یعنی لذت ہمیشہ طاری رہتی تو یقیناً سارے نر زرخیز ماداؤں کے پیچھے جانا ہی چھوڑ دیتے۔

بعض محققین انسانی جسم کی حیاتی کیمیاء یعنی بائیو کیمسٹری کو ایک ائیر کنڈیشنگ سسٹم کی طرح سمجھتے ہیں۔ ائیر کنڈیشنگ سسٹم کا کام درجہ حرارت کو شدید گرمی یا شدید سردی میں بھی ایک مخصوص سطح پر برقرار رکھنا ہوتا ہے۔ مخصوص حالات و واقعات کے نتیجے میں درجہ حرارت پر عارضی طور پر کوئی نہ کوئی اثر ضرور پڑتا ہے لیکن ائیر کنڈیشنگ سسٹم ہمیشہ اس درجہ حرارت کو واپس اس مخصوص سطح پر واپس لے آتا ہے۔

بعض ائیر کنڈیشنگ سسٹم، پچیس درجے اور دوسرے ستائیس درجے سیلسیس کی سطح پر مقرر کیے گئے ہوتے ہیں۔ انسانی خوشی کے اس کنڈیشنگ سسٹم کی مثال بھی کچھ ایسی ہی ہے اور خوشی کی سطح، ہر آدمی میں مختلف سطح پر معین ہوتی ہے۔ ایک سے دس تک کے پیمانے پر، بعض لوگ ایک ایسے زندہ دل اور شادمان حیاتی کیمیائی نظام کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں جس میں ان کا مزاج چھ سے لے کر دس کے بیچ جھولتا رہتا ہے اور زیادہ تر آٹھ کے درجے پر برقرار رہتا ہے۔ یہ ایسے زندہ دل اور خوش مزاج لوگ ہوتے ہیں جو ہر حال۔۔۔ بھلے وہ بڑے شہر میں تن تنہا بسر رکھتے ہوں، سٹاک ایکسچینج میں اپنی دولت سے ہاتھ دھو بیٹھنے یا پھر ذیابیطس کی تشخیص ہونے کے باوجود خوش و خرم رہتے ہیں۔ کئی لوگوں کی بدقسمتی یہ ہوتی ہے کہ وہ ایسی دلگیر اور ملول حیاتی کیمیاء کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں کہ ان کا مزاج دو اور چھ کے درجوں میں جھولتا رہتا ہے اور زیادہ تر پانچ کی سطح پر برقرار رہتا ہے۔ ایسا غمگین اور اندہ گیں شخص مربوط گھرانے، بیوی بچوں اور برادری کے باوجود بھی دلگیر ہی رہے گا۔ اسے لاکھوں کی لاٹری مل جائے، ایتھلیٹ جیسی صحت ہو۔۔۔ اس کی اداسی پر کوئی اثر نہیں پڑے

گا۔ یہ درست ہے کہ اگر ہمارے اس اداس اور دلگیر دوست کی سویرے پانچ کروڑ کی لاٹری نکل آئے، ساتھ ہی دوپہر میں اسے ایڈز اور کینسر کا علاج مل جائے یا پھر شام تک وہ اسرائیلیوں اور فلسطینیوں کے بیچ امن بھی قائم کر لے اور رات گئے اپنی سچی محبت کی بانہوں میں پہنچ جائے۔۔۔ تب بھی اسے خوشی کی انتہا تو مل جائے گی لیکن اس کے لیے شادمانی کی یہ انتہاء کسی صورت بھی چھ درجوں سے اوپر نہیں ہوگی۔ بھلے کچھ بھی ہو رہے، اس کا دماغ شگفتگی اور مسرت انگیزی کا حامل ہی نہیں ہوتا۔

ایک لمحے کے لیے اپنے دوستوں اور پیاروں کے بارے سوچیں۔ آپ یقیناً ایسے لوگوں کو جانتے ہوں گے جو چاہے کچھ بھی ہو جائے وہ ہر وقت ہی قدرے مسرور رہتے ہیں۔ پھر ایسے بھی ہیں، جنھیں دنیا کی ہر نعمت مل بھی جائے تو پھر بھی وہ ہر وقت ناک بھوں چڑھائے رکھتے ہیں۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اگر ہم اپنا کام دھندہ، پیشہ بدل لیں۔۔۔ شادی رچالیں یا وہ ناول مکمل کر لیں۔۔۔ نئی گاڑی خرید لیں یا قرضہ اتار لیں تو ہم اس دنیا کے سب سے خوش و خرم انسان بن سکتے ہیں۔ نت نئی کاریں خریدنے اور دنیا کے بہترین ناول لکھنے۔۔۔ سچی محبت پالینے اور اپنا من پسند پیشہ اختیار کر لینے سے ہماری حیاتی کیمیاء بدل نہیں جاتی۔ یہ درست ہے کہ دنیا کی ساری مادی مسرتیں عارضی طور پر ہمارے اس حیاتی کیمیائی نظام کو جھنجھوڑ ضرور دیتی ہیں لیکن یہ نظام۔۔۔ ایک یا دوسری صورت، جلد یا بدیر واپس اپنی متعین کردہ سطح پر آن کر دوبارہ ٹک جاتا ہے۔

تو پھر سوال یہ ہے کہ اس حیاتی کیمیائی نظام کے معاملے کو ان نفسیاتی اور عمرانی تحقیق کے نتائج کے ساتھ کیسے جوڑا جائے؟ جیسے یہ کہ شادی شدہ افراد، غیر شادی شدہ افراد کے مقابلے میں زیادہ خوش و خرم ہوتے ہیں۔۔۔ ہم اس نتیجے کو حیاتی کیمیاء کے مثال خوشی کے کنڈیشنگ سسٹم کے ساتھ کیسے منسوب کر سکتے ہیں؟ اس کے لیے، سب سے پہلے تو ہمارے لیے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ یہ دریافتیں یا نتائج نسبتی یا ان کے بیچ تعلق باہمی پایا جاتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ بعض محققین نے جو نتائج اخذ کیے ہیں، ان کی وجوہات کا رخ الٹ بھی ہو سکتا ہے لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ نتیجہ فسخ ہو گیا ہے۔ مثال کے طور پر، سائنسی تحقیق کے مطابق یہ بالکل درست ہے کہ شادی شدہ افراد، غیر شادی شدہ یا طلاق یافتہ لوگوں کی نسبت زیادہ خوش و خرم ہوتے ہیں۔ لیکن اس کا لازمی طور پر یہ مطلب نہیں ہے کہ شادی یا ازدواجی تعلق، خوشی کو جنم دیتا ہے۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ خوشی کی وجہ سے شادی یا ازدواجی تعلق قائم ہوتا ہے؟ یا اگر زیادہ فصاحت سے کہیں تو سیروٹونین، ڈوپامین اور آکسیٹوسین نامی ہارمون۔۔۔ کسی بھی شادی یا ازدواجی تعلق کو قائم کرنے اور اسے برقرار رکھنے کی وجہ ہوتے ہیں۔ اب حیاتی کیمیاء ہمیں یہ بتاتی ہے کہ وہ لوگ جو خوش کن حیاتی کیمیاء کے نظام کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں وہ عموماً زیادہ خوش اور مطمئن رہتے ہیں۔ اس طرح کے لوگ زیادہ دلکش اور جاذب جیون ساتھی ثابت ہو سکتے ہیں اور اس کے نتیجے میں ان کی شادی، بیاہ یا ازدواجی تعلق قائم کرنے اور اسے برقرار رکھنے کا امکان بھی زیادہ ہوتا ہے۔ اس طرح کے لوگوں کے لیے طلاق یافتگی کا امکان بھی کم ہوتا ہے کیونکہ کسی بیزار اور درماندہ جیون ساتھی کی بجائے ایک خوش کن اور قناعت پسند شخص کے ساتھ بسر رکھنا زیادہ آسان ہوتا ہے۔ لہذاء، یہ

درست ہے کہ اوسطاً شادی شدہ افراد، غیر شادی شدہ لوگوں کے مقابلے میں زیادہ خوش وخرم رہتے ہیں۔۔۔لیکن، اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ایک ایسی غیر شادی عورت، جو اپنے حیاتی کیمیاء کی وجہ سے ملال اور افسردہ رہتی ہے۔۔۔اگر شادی بیاہ کرکے اپنے شوہر کے ساتھ بسر کرلے تو وہ لازمی طور خوش وخرم ہو جائے گی۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔

مزید یہ کہ زیادہ تر حیاتیات دان کٹر اور انتہاپسند نہیں ہوتے۔ ان کا یہ ماننا ضرور ہے کہ خوشی اور مسرت کا 'بڑی حد تک' تعین حیاتی کیمیاء کی وجہ سے ہوتا ہے لیکن وہ یہ بھی مانتے ہیں کہ سماجی اور نفسیاتی عوامل کی بھی اپنی جگہ ہے۔ ہمارے دماغی ایئر کنڈیشنگ سسٹم میں اتنی لچک ضرور پائی جاتی ہے جو پہلے سے متعین کردہ حدود کے اندر رہ کر حالات و واقعات کے ساتھ بھی مطابقت پیدا کر ہی لیتا ہے۔ لیکن، وہیں جذبات اور احساسات کی اوپری اور نچلی، دونوں ہی حدود کو پار کر لینا تقریباً ناممکن ہوتا ہے۔ شادی اور طلاق۔۔۔ جذبات اور احساسات کی انھی دونوں حدوں کے بیچ کہیں نہ کہیں اثر ڈالتی ہیں۔ ایک ایسا شخص جو حیاتی کیمیاء کی رو سے خوشی اور طمانیت کے ایک سے دس درجوں میں، پانچ کی سطح پر پیدا ہو۔۔۔ وہ کبھی بھی خوشی سے ناچنے اور خوب زندہ دلی کا اہل تو نہیں ہوتا لیکن ایک آسودہ ازدواجی زندگی کی بدولت وہ کبھی کبھار ساتویں درجے پر پہنچ ہی سکتا ہے یا پھر تیسرے درجے سے زیادہ تر دور رہتا ہے۔ لیکن یہ کبھی بھی نہیں ہو سکتا کہ وہ ہمیشہ ہی ساتویں درجے پر ٹکا رہے۔

اگر ہم خوشی اور طمانیت کی جانب اس حیاتیاتی طرز نظر کو مان لیں تو پھر تاریخ کی اہمیت نہایت کم ہو جاتی ہے۔ وہ یوں کہ تاریخ کے تقریباً سارے کے سارے حالات و واقعات کا ہماری حیاتی کیمیاء پر کوئی اثر اور نہ ہی اس کے ساتھ تعلق ہے۔ تاریخ ان بیرونی محرکات پر تو ضرور اثر انداز ہو سکتی ہے جن کی بنیاد پر سیروٹونین وغیرہ جیسے ہارمون خارج ہوتے ہیں لیکن یہ محرکات ہمارے اجسام میں سیروٹونین کی سطح کو کسی طور پر بھی کنٹرول کرنے کے اہل نہیں ہوتے اور یوں، بیرونی حالات و واقعات اور اس کے محرکات کبھی بھی لوگوں کو تادیر خوشی یا پھر غم دینے کے قابل نہیں ہوتے۔

قرون وسطیٰ دور کے کسی فرانسیسی دہقان کا آج کے جدید پیرس میں کسی بینکار کے ساتھ تقابل کریں۔ وہ دہقان بغیر کسی ہیٹر کے، ایک جھونپڑے میں بسر رکھتا تھا جو سوروں کے باڑے کا منظر پیش کرتا تھا۔ لیکن، اس بینکار کی بسر ایک شاندار گھر میں ہے جس کا بر آمدہ اور چھجا بھی ہے اور اس میں طرح طرح کی نت نئی ٹیکنالوجی بھی دستیاب ہے۔ یہی نہیں، اس کے گھر کی بالکونی سے شانزے لیزے کا نظارہ بھی ملتا ہے۔ ہم فی البدیہہ فوراً ہی یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس دہقان کے مقابلے میں یقیناً بینکار زیادہ خوش وخرم ہونا چاہیے؟ تاہم۔۔۔ بات یہ ہے کہ مٹی کے گھروندے، شانزے لیزے کی پکی سڑکیں، جدید کوٹھیاں اور خنزیروں کے باڑے۔۔۔ ہمارے مزاج کا واقعی تعین نہیں کرتے۔ ہمارے مزاج اور کیفیت کا تعین سیروٹونین نامی ہارمون کرتا ہے۔ جب قرون وسطیٰ دور کے دہقان نے اپنا مٹی کا ذاتی گھروندہ مکمل کیا ہو گا تو یقیناً اس کے دماغ کی نسوں اور عصبوں سے سیروٹونین خارج ہوا گا جس کی سطح الف رہی ہو گی۔ 2014ء میں اس

بینکار نے جب بینک کو اپنے حیرت انگیز گھر کی آخری قسط بھی ادا کر دی ہو گی تو اس کے دماغ کی نسوں اور عصبوں نے بھی اتنی ہی مقدار میں سیروٹونین خارج کی ہو گی اور اس کی سطح بھی الف ہی تھی۔ تو ہمارے دماغ کو اس امر سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ جدید گھر، کسی مٹی کے گھروندے سے زیادہ آرام دے اور آسودہ ہوتا ہے۔ یہاں صرف اور صرف یہ اہم ہے کہ ہمارے جسم میں سیروٹونین کی سطح اس وقت الف ہے۔ نتیجتاً، یہ کسی طور بھی ممکن نہیں ہے کہ آج یہ پیرس میں بسر رکھنے والا جدید بینکار اپنے قرون وسطیٰ دور کے دہقان نکڑ نکڑ دادے سے ایک یا کئی درجے زیادہ خوش و خرم ہے۔

یہ امر صرف ہماری ذاتی زندگیوں ہی نہیں بلکہ مجموعی حالات و واقعات پر کے لیے بھی بالکل صادق بیٹھتا ہے۔ مثال کے طور پر فرانسیسی انقلاب کی مثال لے لیں۔ اس عظیم واقعے کے دوران انقلابی شہنشاہ وقت کو ہٹانے، دہقانوں میں زمینیں تقسیم کرنے، انسانی حقوق کا اعلان کرنے، عالی نسبوں کے رتبے کو روندنے اور پورے یورپ کے خلاف جنگ شروع کرنے میں مصروف تھے۔ لیکن اتنے بڑے پیمانے پر وقوع پذیر ہونے والے حالات و واقعات نے بھی فرانسیسیوں کی حیاتی کیمیاء کو ذرہ برابر بھی نہیں بدلا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انقلاب کی وجہ سے ہر طرح کی سیاسی، سماجی، نظریاتی اور معاشی اتھل پتھل کے باوجود فرانسیسیوں کی خوش خرمی پر سرے سے کچھ اثر نہیں پڑا یا اگر کوئی اثر رہا بھی تھا تو وہ نہایت معمولی تھا۔ وہ لوگ جو اپنی جینیات کی وجہ سے خوش کن حیاتی کیمیاء کے حامل تھے۔۔۔ وہ انقلاب سے پہلے اور بعد میں بھی اتنے ہی زندہ دل اور خوش تھے۔ وہ جن کی حیاتی کیمیاء درماندہ تھی، ان کو نپولین اور روبس پئیر سے بھی اتنا ہی شکوہ رہا۔۔۔ جتنا کبھی شہنشاہ لوئی شانزدھم اور ملکہ میری انطونیا سے رہا کرتا تھا۔

اگر ایسا ہی تو پھر فرانسیسی انقلاب برپا کرنے کا کیا فائدہ ہوا؟ اگر فرانسیسیوں کو اس سے خوشی اور طمانیت حاصل نہیں ہوئی تو پھر اس قتل و غارت، خوں ریزی اور جنگ و جدل کا مقصد کیا تھا؟ اگر حیاتیات دانوں کو موقع ملتا تو وہ کبھی بھی باستیل کے قلعے پر دھاوا نہ بولتے۔ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ شاید یہ سیاسی انقلاب یا وہ سماجی اصلاح کی تحریک انھیں خوشی اور مسرت دلائے گی لیکن ان کی حیاتی کیمیاء۔۔۔ ان کے ساتھ بار بار ہاتھ کر جاتی ہے۔

تاریخ میں صرف ایک موقع ایسا ہے جس کی واقعی اہمیت ہے۔ آج جبکہ ہم بالآخر یہ جان چکے ہیں کہ خوشی کی کنجی ہمارے حیاتی کیمیائی نظام کے ہاتھوں میں ہے تو ہم اپنا وقت سیاسی اور سماجی اصلاحات لانے، انقلاب برپا کرنے اور نظریات کا پرچار کرنے میں ضائع نہ کریں بلکہ صرف اس ایک شے پر توجہ مرکوز کر لیں جو ہمیں واقعی خوشی عطا کر سکتی ہے: ہم اپنی حیاتی کیمیاء پر اثر انداز ہونے کی بھرپور کوشش کریں۔ اگر ہم اربوں ڈالر اپنے دماغ کی حیاتی کیمیاء کو سمجھنے میں صرف کر کے معقول اور موزوں علاج دریافت کر لیں تو ہم لوگوں کو اتنی خوشی فراہم کر سکتے ہیں جتنی اس سے قبل انھوں نے کبھی نہیں دیکھی ہو گی۔۔۔ اور اس کے لیے انقلاب برپا کرنے کی بھی حاجت

جاتی رہے گی۔ مثال کے طور پر 'پروزیک' نامی دوائی حکومتیں نہیں گراتی بلکہ سیروٹونین کی سطح بڑھا دیتی ہے اور لوگوں کو ڈپریشن سے نکلنے میں مدد ملتی ہے۔

حیاتیات کی اس دلیل کو 1970ء کی دہائی میں مقبول ہونے والی 'عصر جدید' نامی تحریک کے نعرے سے بہتر کوئی بیان نہیں کر سکتا۔ 'عصر جدید' کا نعرہ ہے: 'خوشی، اندر سے پھوٹتی ہے!'۔ پیسہ، دھن، دولت، سماجی رتبہ، پلاسٹک سرجری، خوبصورت گھر، طاقتور عہدے وغیرہ جیسی چیزیں کبھی بھی خوشی کا باعث نہیں ہو سکتیں۔ دیرپا اور پائیدار خوشی تو صرف سیروٹونین، ڈوپامین اور آکسیٹوسین سے ہی ملتی ہے۔

1932ء میں آلڈوس ہکسلے کا لکھا ایک ناول شایع ہوا تھا۔۔۔ جب کساد عظیم پورے زوروں پر تھا۔ اس ناول کے مطابق خوشی ہی سب سے عظیم قدر ہے جبکہ سیاست کی بنیاد پولیس اور ووٹ کے ذریعے رائے دہی نہیں بلکہ سکون آور ادویات پر رکھی جانی چاہیے۔ ہر روز، ہر شخص صبح اٹھ کر 'سوما' نامی سکون آور دوا کی خوراک استعمال کرتا ہے جس سے لوگوں کی پیداواری صلاحیت اور کارکردگی تو متاثر نہیں ہوتی لیکن انھیں بھرپور خوشی ملتی ہے۔ آگے چل کر، اس ناول میں ایک عالمی ریاست کا تصور پیش کیا گیا ہے جس کی حکومت پورے کرہ ارض پر ہے۔ اس عالمی ریاست کو جنگوں، انقلابوں، ہڑتالوں اور تحریکوں وغیرہ سے کوئی خطرہ نہیں ہے کیونکہ سارے لوگ اپنے جیسے بھی حالات اور کیفیات ہوں، ان سے مکمل طور پر مطمئن ہیں۔ ہکسلے کا مستقبل سے متعلق یہ تصور۔۔۔ جارج اوورویل کے ناول 'نائنٹین ایٹی فور!' سے بھی کہیں زیادہ پریشان کن ہے۔ زیادہ تر قارئین کو ہکسلے کی دنیا نہایت بھیانک اور وحشت خیز محسوس ہوتی ہے لیکن کوئی بھی یہ بتانے سے قاصر ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ جب ہر شخص، ہر وقت خوش و خرم رہ سکتا ہو تو پھر اس میں خرابی کیا ہے؟

زندگی کے معنی

ہکسلے کی بدحواس کر دینے والی دنیا اس حیاتیاتی مفروضے پر قائم ہے جس کے تحت خوشی اور سرور کو ہمسر اور ہم پایہ سمجھا جاتا ہے۔ خوش ہونے سے مراد زیادہ اور نہ ہی کم بلکہ خوشگوار جسمانی احساس ہی ہوتا ہے۔ اب چونکہ ہماری حیاتی کیمیاء ان احساسات کے حجم اور دورانیے کو حد میں رکھتی ہے تو لوگوں کو خوشی کا دیرپا اور زیادہ سے زیادہ احساس دلانے کا طریقہ یہی ہے کہ حیاتی کیمیائی نظام پر خوب اثر انداز ہوا جائے۔

لیکن خوشی کی اس تعریف اور توضیح پر بعض محققین خوب اعتراض کرتے ہیں۔ معاشیات کے میدان میں نوبل انعام یافتہ ڈینئیل کانمن نے ایک انتہائی مقبول سائنسی تحقیق میں لوگوں سے ان کے کسی بھی عام دن کے معمولات سے متعلق سوالات پوچھے تھے۔ اس نے لوگوں سے استفسار کیا کہ کسی بھی عام، کام کے دن میں ان کے معمولات کیا ہوتے ہیں اور کہا گیا تھا کہ قسط در قسط، وہ پورا تجزیہ کر کے بتائیں کہ دن میں کس کس لمحے سے خوب لطف اٹھاتے ہیں یا پھر وہ کونسا وقت ہوتا ہے جسے وہ سخت ناپسند کرتے ہیں؟ اس تحقیق سے

لوگوں کی روزمرہ زندگیوں کا ظاہری تضاد کھل کر سامنے آیا۔ مثال کے طور پر ایک بچے کی پرورش دوران کی جانے والی محنت بلکہ مشقت اور بیگار کی مثال لیں۔ کا نمن کو پتہ یہ چلا کہ اس محنت اور مشقت کے دوران پر لطف اور ناپسندیدہ لمحات کا شمار کیا جائے تو اس لحاظ سے ایک بچے کی پرورش انتہائی ناخوشگوار معاملہ ہے۔ اس کام میں نیپیاں بدلنی، برتن دھونے اور بچوں کی خواہ مخواہ کی ضد جھیلنی پڑتی ہے۔ ظاہر ہے، کوئی بھی شخص یہ کام نہیں کرنا چاہے گا۔ لیکن اس کے باوجود تقریباً سارے والدین نے اعتراف کیا کہ ان کے بچے، ان کی زندگی میں خوشی اور مسرت کا سب سے بڑا ذریعہ ہیں۔ کیا اس کا مطلب یہ ہوا کہ لوگوں کو خود اپنی بھلائی کا علم ہی نہیں ہے؟ یہ ایک رخ ہے۔ اس تحقیق سے حاصل ہونے والے نتائج سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ خوشی کا تعلق خوشگوار اور ناگوار لمحات کی زیادتی یا کمی سے نہیں ہوتا۔ بجائے، خوشی سے مراد تو یہ ہے کہ ہم اپنی زندگی کو اپنی پوری کلیت میں کس قدر پر مقصد، اہم اور کار آمد سمجھتے ہیں؟ یعنی، خوشی کے ساتھ انتہائی اہم شعوری اور اخلاقی اجزاء جڑے ہوتے ہیں۔ یہ ہماری اقدار ہیں جن سے واقعی فرق پڑتا ہے۔ کیا ہم خود کو 'ایک بچے کی آمریت میں خستہ حال غلام' یا پھر 'ایک نئی زندگی کی پرورش کرنے والا مشفق' سمجھتے ہیں؟ جیسے فریڈرک نطشے نے کہا تھا، 'اگر آپ کے پاس زندگی گزارنے کی وجہ ہو تو آپ بھلے کچھ بھی ہو، اس کو جھیلنے کے اہل ہو جاتے ہیں!' ایک بامقصد اور بامعنی زندگی بے پناہ مشکلات اور صعوبت کے باوجود انتہائی اطمینان بخش اور آسودہ ہو سکتی ہے جبکہ بے معنی زندگی، بھلے جتنی بھی آرام دہ کیوں نہ ہو۔۔۔ ہولناک آزمائش سے کم نہیں ہوتی۔

اگرچہ سبھی تہذیبوں اور سارے زمانوں میں سارے انسانوں کو خوشی اور غم کا احساس تو ایک سا ہی رہا ہے لیکن دکھ اور سکھ کے تجربات کی نسبتیں ہر لحاظ اور طرحوں سے مختلف رہی ہیں۔ اگر ایسا ہی ہے تو پھر خوشی کی تاریخ حیاتیات دانوں کی سوچ اور سمجھ سے کہیں زیادہ ہنگامہ خیز رہی ہو گی۔ یہ ایک ایسا نتیجہ ہے جو لازمی طور پر جدیدیت کا طرفدار نہیں ہے۔ اگر زندگی کو لمحہ بہ لمحہ جانچیں تو غالباً قرون وسطیٰ دور کے انسانوں کی زندگی بلاشبہ سخت اور درشت رہی تھی۔ تاہم، اگر وہ موت کے بعد ابدی زندگی میں لازوال خوشی اور فرحت کے وعدے پر یقین رکھتے تھے تو ان کے لیے آج کے لادین اور سیکولر لوگوں کے مقابلے میں سخت مشکل زندگی بھی کہیں بڑھ کر بامعنی اور بامقصد رہا کرتی تھی۔ لادین اور سیکولر لوگوں کے لیے تو اس زندگی کے آخر میں مکمل اور بے معنی فراموشی کے سوا کچھ نہیں رکھا۔ تو اس لحاظ سے اگر عہد وسطیٰ میں ذہنی سکون اور خوشی کے سوالنامے میں سوال پوچھا جاتا کہ، ' کیا آپ کلی طور پر اپنی زندگی سے مطمئن ہیں؟' تو اس دور کے لوگ بڑھ چڑھ کر جواب دیا کرتے۔

تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے قرون وسطیٰ دور کے آباء و اجداد اس لیے خوش تھے کیونکہ انھوں نے بعد از موت ابدی خوشی کے توہم اور عقیدے کی صورت زندگی کے معنی دریافت کر لیے تھے؟ یہ بالکل درست ہے۔ جب تک کوئی ان کے اس خیال میں مخل نہیں ہوتا تو کیوں نہ خوش رہیں؟ جہاں تک ہم خالصتاً سائنسی نکتہ نظر سے جانتے ہیں۔۔۔ انسانی زندگی کا قطعی طور پر کوئی مطلب، سرے

سے کوئی معنی نہیں ہیں۔ انسان ایک اندھے ارتقائی عمل کا نتیجہ ہے جو بغیر کسی مقصد اور مطمع نظر ہمہ وقت جاری رہتے ہیں۔ ہمارے اعمال اور افعال کسی مقدس کائناتی خاکے کا حصہ نہیں ہیں اور اگر ہماری یہ کرہ ارض کل کسی بھی وجہ سے پھٹ جائے تو کائنات جیسی آج، ویسے ہی کل بھی یوں ہی چلتی رہے گی۔ جہاں تک ہم بتا سکتے ہیں، انسانی انفرادیت اور فاعلی کی غیر موجودگی سے کسی کو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ لہذا، انسان اپنی زندگی کے بھلے جو معنی اور مقصد نکال لیں، اس کو کسی بھی شے سے منسوب کر لیں۔۔۔ یہ ایک واہمے اور مغالطے سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ قرون وسطیٰ دور کے لوگ باقی کی دنیاوی چیزوں میں بھی جو معنی تلاش کرتے رہتے تھے۔۔۔ وہ بھی اسی خود فریبی میں مبتلا تھے جس میں آج کا جدید انسان۔۔۔ قومیت، انسانیت اور سرمایہ داری وغیرہ جیسے تصورات کی صورت بہکاوے میں رہتا ہے۔ آج اگر کوئی سائنسدان یہ کہتا ہے کہ اس کی زندگی خاصی بامقصد ہے کیونکہ وہ انسانی علم اور مشاہدے میں اضافہ کرتا ہے، اسی طرح کوئی سپاہی بھلے کہتا پھرتا ہو کہ اس کی زندگی کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنی جان اور خون کا آخری قطرہ بھی مادر وطن پر قربان کرنے کو تیار ہے یا پھر ایک سرمایہ کار کو اپنی زندگی کا مطلب ایک نئی کمپنی کھڑی کرنے میں نظر آتا ہے تو۔۔۔ یہ سب بالکل اسی مغالطے اور فریب میں مبتلا ہیں جس میں قرون وسطیٰ دور کے لوگ رہا کرتے تھے۔ بس یہ ہے کہ اس زمانے میں لوگوں کو اپنی زندگیوں کا مقصد اور معنی مقدس کتب پڑھنے، صلیبی جنگوں میں حصہ لینے اور نت نئے چرچ اور محلات۔۔۔ اہرام وغیرہ کھڑے کرنے میں نظر آتا تھا۔

تو غالباً ہر شخص کے لیے خوشی سے مراد یہ ہے کہ وہ انفرادی طور پر زندگی کے معنی سے متعلق واہموں کو رائج الوقت اجتماعی مغالطوں کے ساتھ ہم آہنگ کر لیا کرے۔ جب میں اپنا ذاتی بیانیہ۔۔۔ اپنے ارد گرد کے لوگوں کے بیانیوں کے ساتھ ہم آہنگ کر لیتا ہوں تو میں خود کو قائل کر سکتا ہوں کہ غالباً، میری زندگی بامعنی اور بامقصد ہے۔ مجھے اس ایقان سے ایسی توثیق ملتی ہے جو میرے لیے خوشی کا باعث بن جاتی ہے۔

سچ پوچھیں تو یہ ایک انتہائی بددل کر دینے والا انجام ہے۔ کیا واقعی ایسا ہے؟ کیا ہماری خوشی کا سارا دارومدار خود فریبی پر ہوتا ہے؟

خود کو جانو

ایک طرف اگر خوشی کی اساس ہمارے جسم میں خوش کن محسوسات سے جڑی ہے تو پھر زیادہ سے زیادہ خوش رہنے کے لیے ہمیں اپنے حیاتی کیمیائی نظام کی مرمت کرنے کی ضرورت ہے۔ دوسری جانب اگر خوشی کا تعلق ہماری زندگی کی مقصدیت اور معنی سے جڑا ہے تو پھر ہمیں خوش رہنے کے لیے خود کو زیادہ سے زیادہ اور نہایت موثر طریقے سے فریب اور مغالطوں میں مبتلا کرنے کی ضرورت ہے۔ کیا کوئی تیسرا متبادل بھی ہے؟

اوپر بیان کردہ دونوں ہی نقطہ نظر کا قیاس ایک ہی ہے۔ وہ یہ کہ خوشی انفرادی اور ذہنی احساس (سرور یا پھر مقصدیت کا احساس) ہوتی ہے۔ مزید بر آں یہ کہ اگر ہم لوگوں کی خوشی اور مسرت کو جانچنا چاہیں تو اس کے لیے ہمیں ان کے محسوسات بارے پوچھنا پڑتا ہے۔ ہم میں سے بہت سے لوگوں کے لیے منطقی طور پر یہ درست بھی ہے کیونکہ ہمارے عہد کا مقتدر مذہب، آزاد خیالی یا لبرل ازم ہے۔ آزاد خیالی کا تصور انفرادیت کو مقدس سمجھتا ہے اور افراد کے ذاتی احساسات کو ترجیح دیتا ہے۔ اس تصور کے نزدیک جذبات اور احساسات ہی بالادست اور مقتدر ہوتے ہیں۔ اچھا کیا ہے اور برا کیا ہے؟ خوبصورت کیا ہے اور بدصورت کیا ہے؟ کیا ہونا چاہیے اور کیا نہیں ہونا چاہیے؟ ان ساری چیزوں کا تعین ہم میں سے ہر ایک کے انفرادی محسوسات پر کیا جاتا ہے۔

آج کی روشن خیال، جمہوری سیاست کی بنیاد ہی اس تصور پر رکھی گئی ہے کہ ووٹر سب سے بہتر جاننے والے ہیں اور ہمیں کسی کرتے دھرتے، آمرانہ مزاج کے کسی ایسے شخص کی ضرورت نہیں ہے جو ہمیں، ہماری بھلائی کا پتہ دیا کرے۔ آزاد تجارت اور معیشت کی بنیاد اس تصور پر رکھی گئی ہے کہ گاہک، خوب جانتا ہے اور ہمیشہ درست ہوتا ہے۔ آزاد رو فنون کا کھلم کھلا اقرار یہی ہے کہ حسن تو دیکھنے والے کی آنکھ میں ہوتا ہے۔ لبرل سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں طالبعلموں کو سکھایا جاتا ہے کہ وہ اپنے بارے خود سوچیں، وہ اپنی مرضی کے مالک ہیں۔ ٹی وی، اخبارات پر چلنے والے اشتہارات ہمیں، 'کچھ بھی، کر گزرو!' اور 'جسٹ ڈو اٹ!' پر اکساتے پھرتے ہیں۔ ایکشن فلمیں، سٹیج ڈرامے، سوپ آپرا، ناول اور پاپ گانے ہمیں ہر وقت یہی ذہن نشین کراتے رہتے ہیں کہ 'اپنے دل کی سنو!'، 'خود اپنی سنو!' اور 'اپنے اندر کی آواز پر توجہ دو!' وغیرہ وغیرہ۔۔۔ ژاک روسو نے اسی نقطہ نظر کو کلاسیکی انداز میں خوب سمیٹا تھا کہ، "میں جس شے کو خوب محسوس کرتا ہوں۔۔۔ وہ خوب ہے۔ جو شے مجھے ناگوار لگتی ہو۔۔۔ وہ بلاشبہ ناگوار ہے!"۔

وہ لوگ جو شیر خواری سے ہی اس طرح کے نعروں اور اشتہاروں پر پلتے آئے ہوں، ان کے نزدیک تو ظاہر ہے۔۔۔ خوشی ایک انفرادی احساس کا نام ہی ہے اور ہر فرد اپنے بارے میں خوب جانتا ہے کہ آیا وہ دکھی ہے یا سکھی ہے۔ یہ آزاد خیالی کا سے منسوب، یکتا اور منفرد تصور ہے۔ تاریخ بھر میں تقریباً سبھی مذاہب اور نظریات میں مبینہ طور پر یہی مانا جاتا رہا ہے کہ اچھائی، حسن اور دوسرے سبھی معاملات کو طے کرنے کے واقعی اور معروضی پیمانے ہوتے ہیں۔ یہ سارے عقائد اور نظریات ہمیشہ ہی انفرادی سطح پر کسی بھی شخص کے محسوسات اور ترجیحات کو شک کی نگاہ سے دیکھا کرتے تھے بلکہ قابل اعتراض سمجھتے تھے۔ یونان کے قدیم شہر ڈیلفی کی باقیات میں 'اپولو کا مندر' بھی ہے۔ مندر کے داخلی راستے پر، زائرین کا استقبال اس کندہ کی ہوئی عبارت سے ہوتا تھا: 'خود کو جانو!'۔ مراد یہ کہ ایک اوسط آدمی، نادان ہوتا ہے۔ وہ اپنے حقیقی خود سے لاعلم ہوتا ہے اور اسی لیے وہ حقیقی خوشی سے بھی امکانی طور پر لاعلم ہی رہتا ہے۔ غالباً، فرائڈ اس سے کلی طور پر متفق رہا ہو گا۔

صرف فرائڈ ہی نہیں بلکہ عیسائیت کے عالم دین بھی اس سے متفق تھے۔ سینٹ پال اور سینٹ آگسٹین بہت اچھی طرح جانتے تھے کہ اگر آپ لوگوں سے حقیقی خوشی کی بابت پوچھیں تو اکثریت عبادت کی بجائے جماع کو ترجیح دے گی۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ جماع کرنا، خوشی کی کنجی ہے؟ سینٹ پال اور سینٹ آگسٹین کے نزدیک، یہ ایسا نہیں ہے۔ ان کے حساب سے تو اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ انسان فطری طور پر گناہ گار اور عاصی واقع ہوا ہے اور لوگ۔۔۔ نہایت آسانی کے ساتھ شیطان کے بہکاوے میں آجاتے ہیں۔ عیسائی نقطہ نظر سے تو لوگوں کی اکثریت کا حال وہی ہے جو ہیروئین کے عادی نشئیوں کا ہوتا ہے۔ وہ یوں کہ فرض کریں، کوئی نفسیات دان ایک ایسی تحقیق کرتا ہے جس کا مقصد نشئیوں میں خوشی کا مطالعہ کرنا ہے۔ وہ ایک سوالنامہ بنا کر نشئیوں میں رائے شماری کرواتا ہے اور اسے پتہ چلتا ہے کہ نشئیوں۔۔۔ بلکہ ہر نشئی کے نزدیک خوشی صرف اور صرف اس وقت حاصل ہوتی ہے جب وہ نشے میں دھت ہو جاتے ہیں۔ تو کیا اس نفسیات دان کو ایک مقالہ شائع کرنا چاہیے جس میں ثابت کیا گیا ہو کہ خوشی کی اصل کنجی، نشہ آور اشیاء۔۔۔ بالخصوص ہیروئین ہوتی ہے؟

جذبات اور احساسات پر بھروسا نہ کرنے کا تصور صرف عیسائیت تک محدود نہیں ہے۔ کم از کم، جہاں تک جذبات اور احساسات کی قدر وقیمت کی بات آتی ہے تو غالباً ڈارون اور ڈاکنز بھی خود کو سینٹ پال اور سینٹ آگسٹین کا ہم خیال ہی پائیں گے۔ 'خود غرض موروثوں کے نظریے' کا بھی یہی ماننا ہے کہ باقی سب نامیات کی طرح انسان کو بھی فطری انتخاب یہ موقع فراہم کرتا ہے کہ وہ، ایسے ساری چیزوں، عوامل اور اعمال اختیار کرلیں جو ان کے موروثوں کی افزائش میں مدد دیتی ہوں۔۔۔ بھلے، یہ انفرادی طور پر ان کے لیے مضر ہی کیوں نہ ہوں۔ چنانچہ، یہی وجہ ہے کہ زیادہ تر نر اپنی پوری زندگی پرسکون راحت اور مسرت میں بسر کرنے کی بجائے سخت محنت، مشقت، اضطراب، ہمسری، خود کو ثابت کرنے اور لڑتے لڑتے گزار دیتے ہیں کیونکہ ان کا جینیاتی مادہ، اپنے خود غرضانہ مقاصد کے لیے انھیں ہمیشہ دوڑائے رکھتا ہے۔ شیطان کی ہی طرح، ڈی این اے بھی کم بود اور عارضی لطف اور سرور کو استعمال کرکے لوگوں کو اکسا تا رہتا ہے اور یوں انھیں اپنے تسلط میں۔۔۔ قابو میں رکھتا ہے۔

زیادہ تر مذہبی عقائد اور دوسرے فلسفوں نے اسی لیے خوشی سے متعلق آزاد خیالی کی نسبت بلکل مختلف طرز نظر اختیار کیے رکھی ہے۔ اس ضمن میں بدھ مت کی تعلیمات تو بالخصوص دلچسپ ہیں۔ بدھ مت ایسا دین ہے جس نے دکھ اور سکھ، خوشی اور غمی کے سوال کو غالباً کسی بھی دوسرے انسانی مذہب کے مقابلے میں زیادہ توجہ دی ہے بلکہ اسے ساری تعلیمات کا محور بنایا ہے۔ پچیس سو سال سے بدھ مت کے پیروکار خوشی کی ماہیت اور وجوہات کا انتہائی منظم انداز میں مطالعہ کرتے آئے ہیں، جس کی وجہ سے آج سائنسی طبقے کی بدھ مت کے فلسفے اور مراقبے کی مشق وغیرہ میں دلچسپی بڑھ رہی ہے۔

بدھ مت اور حیاتیاتی طرزِ فکر کے بیچ خوشی کی بنیادی فراست سے متعلق بلا کی مطابقت پائی جاتی ہے۔ بدھ مت اور حیاتیات، دونوں کے نزدیک خوشی بیرونی دنیا کے حالات و واقعات کی وجہ سے نہیں بلکہ ہر شخص کے جسم میں جاری عملیوں کا نتیجہ ہوتی ہے۔ تاہم، اگرچہ بدھ مت اور حیاتیات فکری طور پر اس یکساں طرز پر چلنا تو شروع کرتے ہیں لیکن آگے پہنچ کر بدھ مت بالکل مختلف نتیجے پر پہنچ جاتا ہے۔

بدھ مت کے مطابق، زیادہ تر لوگ خوشی یا سکھ کو دلکش اور خوش طبع جبکہ غم یا دکھ کو ناگوار محسوسات کی شکل میں جانتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ لوگ اپنے جذبات اور احساسات کو بے انتہاء اہمیت دینے لگتے ہیں اور ہر وقت زیادہ سے زیادہ لطف، سرور، خوشی یا سکھ کے حصول اور غم یا دکھ سے بچنے کی سعی میں جت جاتے ہیں بلکہ کہیے، غرق ہو جاتے ہیں۔ ہم اپنی پوری زندگی جو کچھ بھی کرتے ہیں۔۔۔ ٹانگ کھجانے سے لے کر کرسی میں بے کلی سے چلبلانے اور جنگ عظیم برپا کرنے تک۔۔۔ ہم صرف اور صرف زیادہ سے زیادہ مسرور کیفیات کے حصول کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔

بدھ مت کے مطابق، مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے جذبات اور احساسات عارضی ہوتے ہیں۔ ان کی مثال کم بود ارتعاش یا تھرتھراہٹ جیسی ہوتی ہے جو ہر لمحے بدلتی رہتی ہے۔۔۔ جیسے سمندر کی لہریں ہوتی ہیں، یعنی یہ آتے اور جاتے رہتے ہیں۔ اگر صرف پانچ منٹ پہلے میں شادمان اور بامقصد محسوس کر رہا تھا تو ابھی وہ احساس غائب ہو گیا ہے۔ اب میں بیٹھے بٹھائے، اچانک ہی شدید اداس ہو چکا ہوں اور مجھے اپنی زندگی بیکار لگتی ہے۔ تو اگر میں ان خوش کن محسوسات کو حاصل کرنا چاہوں تو میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے کہ میں مسلسل ان خوشگوار احساسات کے پیچھے پیچھے اور ناگوار احساسات سے دور بھاگتا رہوں۔ بالفرض، میں اس میں کامیاب بھی ہو گیا تو مجھے فوراً ہی یہ عمل دوبارہ صفر سے شروع کرنا پڑے گا کیونکہ یہ محسوسات عارضی ہوتے ہیں۔ ابھی مجھے اس قدر مشقت اور دوڑ دھوپ کا کوئی دیرپا صلہ بھی نہیں ملتا اور میں ایک دفعہ پھر اس دوڑ میں لگ جاتا ہوں۔

لیکن سوال یہ ہے کہ آخر ان بے ثبات اور عارضی نعمتیں اور انعام حاصل کرنے سے متعلق اہم کیا ہے؟ آخر ایسی چیز حاصل کرنے کے پیچھے کیوں بھاگا جائے جو ہاتھ آتے ہی اگلے لمحے۔۔۔ پھسل جاتی ہے؟ بدھ مت کے مطابق، انسانی دکھ یا اذیت کی بنیادی وجہ نہ درد، نہ اداسی اور نہ ہی بے معنویت کا احساس ہے۔ بجائے، انسانی دکھ یا اذیت کی اصل وجہ تو ان عارضی اور بے ثبات محسوسات کے پیچھے کبھی نہ ختم ہونے والی لاحاصل دوڑ ہے۔ یہ چوہے کی ایسی دوڑ ہے جو ہمیں ہر وقت اضطراب، بے چینی اور عدم اطمینان کی کیفیت میں، عذاب کی صورت مبتلا رکھتی ہے۔ یہ اسی لاحاصل اور بے نوک دوڑ کا شاخسانہ ہے کہ ہمارا دماغ بھی کبھی مطمئن نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ جب ہم خوشی یا سکھ کی کیفیت میں ہوتے ہیں تو اس وقت بھی ہمیں چین نہیں آتا۔۔۔ کیونکہ ہمارے دل و دماغ پر یہ خوف طاری رہتا ہے کہ جلد یا بدیر۔۔۔ یہ احساس، یہ کیفیت ختم ہو جائے گا۔ اس سے ہمارے اندر اس احساس کو زیادہ سے زیادہ دیر تک قائم رکھنے بلکہ اس کو

بڑھاتے رہنے کا شوق پیدا ہوتا ہے۔ خوشی کی بے ثباتی کا وہ خوف اور خوشی کو بڑھاوا دینے کا یہ شوق۔۔۔یہ سکھ میں بھی ہمارے لیے دکھ بن جاتے ہیں۔

لوگ دکھ اور اس اذیت سے اس وقت آزاد نہیں ہوتے جب انہیں مسلسل ایک یا دوسرا لطف، سرور ملتا رہے بلکہ لوگ اس وقت مصیبت سے چھٹکارا پاتے ہیں جب وہ اپنے جذبات اور احساسات کی غیر مستقل اور ناپائیدار فطرت کو سمجھ لیتے ہیں اور ان کی جوع، یعنی شدید خواہش اور طلب کو ترک کر دیتے ہیں۔ بدھ مت میں مراقبے کے عمل اور عبادت کا بھی یہی مقصد ہوتا ہے۔ مراقبے میں، آپ سے اپنے جسم اور دماغ کا انتہائی سختی کے ساتھ غور کرنے کی توقع کی جاتی ہے تا کہ ایک تواتر کے ساتھ اپنے دماغ میں تمام تر احساسات اور خیالات کے اٹھنے اور گزرتے رہنے کا مشاہدہ کیا جا سکے۔ اس مشاہدے کے نتیجے میں انسان پر یہ حقیقت کھل جاتی ہے کہ ان محسوسات اور خیالات کا پیچھا کرنا کس قدر بے معنی اور لاحاصل کام ہے۔ جب انسان اس دوڑ، ان محسوسات کا پیچھا کرنا چھوڑ دیتا ہے تو دماغ صاف، پرسکون اور مطمئن ہو جاتا ہے۔ سرور، لطف، غصہ، بوریت، شہوت۔۔۔الغرض ہر طرح کے جذبات اور محسوسات مسلسل اٹھتے ہیں اور آتے جاتے رہتے ہیں۔۔۔ لیکن جب ایک دفعہ مخصوص جذبات اور احساسات کی خواہش اور طلب بند کر دیتے ہیں تو آپ انھیں، ان کی اصل یعنی عارضی شکل میں قبول کر لیتے ہیں۔ یوں، آپ مستقبل اور ماضی کے اگر، مگر۔۔۔یہ اور وہ سے نکل کر حال کے لمحے، یعنی حقیقت میں جینا شروع کر دیتے ہیں۔

اس کے نتیجے میں حاصل ہونے والی طمانیت اور سکون اس قدر گہرا ہوتا ہے کہ جو لوگ جو ساری عمر خوشگوار محسوسات کے پیچھے مضطرب بھاگ دوڑ میں جیتے آئے ہیں، اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی شخص دہائیوں تک سمندر کے ساحل پر کھڑا۔۔۔صرف مخصوص 'عمدہ' لہروں کو یوں اپنے پاس یوں سمونے کی کوشش کرے کہ وہ لوٹ کر نہ جا سکیں اور ساتھ ہی ساتھ 'قلاش' لہروں کو اپنے نزدیک آنے سے روکنے میں جتا رہے۔ ہر روز، صبح سے شام۔۔۔ اس شخص کا یہی مشغلہ ہو اور وہ اس ساحل پر کھڑا۔۔۔ اس لاحاصل مشق میں خود کو تھکا کر رکھ دے۔ آخر کار، ایک دن وہ وہیں ساحل پر نرم ریت پر بیٹھ جاتا ہے اور لہروں کو اپنی مرضی سے آنے اور جانے دیتا ہے۔ ان کی ترتیب میں مخل ہونے کی کوشش نہیں کرتا اور کسی لہر کو بھی سمونے یا اسے دور ہٹانے کی سرے سے کوئی سعی نہیں کرتا۔ بس لہروں کو دیکھتا ہے اور سمندر کے شور سے محظوظ ہوتا ہے۔ یہ کس قدر پرسکون، طمانیت کا لمحہ ہو گا؟

لیکن یہ طریق جدید آزاد خیال دنیا کے لیے اس قدر بیگانہ ہے کہ جب مغرب میں 'عصر جدید' جیسی تحاریک بھی بدھ مت کی فراست سے روشناس ہوئیں تو اس کی ساری اصطلاحات کو بھی لبرل لغویات سے موسوم کر دیا اور اپنے سر پر سوار کر لیا۔ 'عصر جدید' تحریک کے لوگوں کی اکثر دلیل یہ ہوتی ہے: 'خوشی کا انحصار بیرونی حالات و واقعات پر نہیں ہوتا۔ اس کا انحصار تو اس امر پر ہے کہ ہم اپنے اندر کیا محسوس کرتے ہیں۔ لوگوں کو چاہیے کہ وہ بیرونی کامیابیوں جیسے دولت اور رتبے وغیرہ کا پیچھا کرنا چھوڑ دیں اور اپنی اندرونی احساسات کے

ساتھ ناطہ جوڑلیں'۔ یاپھر اختصار کے ساتھ یہی کہہ دیتے ہیں کہ: 'جی۔۔۔ خوشی تو اندر سے پھوٹتی ہے' وغیرہ وغیرہ۔ حیاتیات دان بھی من و عن یہی کہتے ہیں لیکن گوتم بدھ نے جو اخذ کیا تھا، یہ اس سے کمی بیشی کے ساتھ الٹ ہے۔

گوتم بدھ کے افکار اور جدید حیاتیات و 'عصر جدید' جیسی تحاریک کی سوچ میں یہ اتفاق پایا جاتا ہے کہ خوشی، بیرونی حالات و واقعات سے آزاد ہوتی ہے۔ لیکن گوتم بدھ کے یہاں سب سے اہم اور کہیں عمیق فہم و فراست یہ ہے کہ سچی خوشی، بیرون ہی نہیں بلکہ اندرون کے حالات و واقعات سے بھی آزاد ہوتی ہے۔ اس امر میں تو کوئی شک نہیں ہے کہ جتنی زیادہ اہمیت ہم اپنے جذبات اور احساسات کو دیتے ہیں، ہیں ان کی خواہش اور طلب بھی اتنی ہی زیادہ بڑھ کر ہوتی ہے اور نتیجتاً ہم اتنے ہی زیادہ کرب اور دکھ میں مبتلا ہوتے ہیں۔ گوتم بدھ کی سفارش یہ ہے کہ ہم نہ صرف بیرونی کامیابیوں بلکہ اپنے اندرونی جذبات اور احساسات کا پیچھا کرنا بھی چھوڑ دیں۔

اس سارے معاملے کو سمیٹیں تو پتہ یہ چلتا ہے کہ انفرادی یا نفسی خوشی کے سوالنامے ہماری خوشی کا تعین، ہمارے اندرونی احساسات جبکہ ہماری خوشی کی تلاش کو مخصوص جذباتی کیفیات کی جستجو کے ساتھ جوڑ کر شناخت کرتے ہیں۔ اس کے برعکس، تقریباً سارے روایتی فلسفوں اور مذہبی عقائد (مثلاً بدھ مت) کے نزدیک خوشی کی کنجی یہ ہے کہ آدمی اپنے بارے میں سچ اور حقیقت کو جان لے۔ وہ یہ سمجھ لے کہ وہ حقیقت میں کون اور کیا ہے؟ زیادہ تر لوگ اپنے آپ کو احساسات، افکار، پسند اور ناپسند کی مدد سے شناخت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جب انھیں غصے کا احساس ہوتا ہے تو وہ سوچتے ہیں، 'مجھے غصہ آرہا ہے۔ یہ میرا غصہ ہے!' اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ اپنی پوری زندگی اس طرح کے احساسات کو روکنے، ان سے بچنے کی کوشش میں جبکہ اس کے متبادل متضاد احساسات کے پیچھے دوڑتے گزار دیتے ہیں۔ وہ یہ کبھی سمجھ ہی نہیں پاتے کہ یہ ان کے 'ذاتی' احساسات نہیں ہیں۔۔۔ اور مخصوص احساسات کا تعاقب یا ان سے دور رہنے کی لاحاصل جد وجہد انھیں دکھ، کرب اور اذیت کے جال میں پھنسا کر رکھ دیتی ہے۔

اگر یہ ایسا ہی ہے تو پھر خوشی اور سکھ کی تاریخ سے متعلق ہماری ساری سمجھ بوجھ گمراہ اور بہکائی ہوئی ہے۔ غالباً یہ سرے سے اہم ہی نہیں ہے کہ آیا لوگوں کی توقعات پوری ہوتی ہیں یا اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ کیا لوگ خوش کن احساسات کا لطف اٹھا پاتے ہیں یا نہیں؟ سب سے اہم سوال تو یہ ہے کہ کیا لوگ اپنے بارے سچ سے آگاہ ہیں؟ ہمارے پاس کیا ثبوت ہے کہ آج کے جدید لوگ، اس سچائی سے قدیم تاختیوں یا قرونِ وسطیٰ دور کے دہقانوں کے مقابلے میں کس قدر بہتر آگاہ ہیں؟

محققین نے خوشی اور سکھ کی تاریخ کا مطالعہ بس کچھ عرصہ۔۔۔ چند برس پہلے شروع کیا ہے اور ہم ابھی تک ابتدائی مفروضے قائم کرنے اور ان مفروضوں کو رد یا ثابت کرنے کے طریقے ہی ڈھونڈ رہے ہیں۔ چنانچہ، اس ضمن میں ابھی نتائج اخذ کرنا اور اس بحث پر تالا لگانا ممکن ہی نہیں ہے۔ جو ابھی پوری طرح شروع ہی نہیں ہوئی۔ اس وقت زیادہ اہم یہ ہے کہ ہم فی الوقت خوشی اور سکھ سے متعلق جتنی زیادہ طرحوں اور طرز نظروں کو جمع کر سکتے ہوں، کر لیں اور پھر درست سوالات کی جانکاری حاصل کر لیں۔

تاریخ کی زیادہ تر کتب عظیم مفکروں کے تصورات، جنگجوؤں کی دلیری، اولیاء کی رحم دلی اور فن کاروں کی تخلیقی صلاحیتوں کے قصوں سے بھری ہوئی ہیں۔ ان کتب میں سماجی تراتیب کی بُنائی و سلجھاؤ، عظیم سلطنتوں کے عروج و زوال اور سائنس و ٹیکنالوجی کی دریافتوں بارے تو بہت کچھ مل جاتا ہے لیکن یہ تصنیفات کسی طور بھی یہ نہیں بتاتیں کہ یہ ساری چیزوں نے انفرادی سطح پر آدمی کے دکھ اور سکھ پر کیسے اور کس حد تک اثر انداز ہوئی ہیں؟ یہ تاریخ سے متعلق ہماری سمجھ بوجھ میں سب سے بڑا خلا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ اب ہم اس خلا کو پر کرنا شروع کر دیں۔

آدمی کا انجام

اس تصنیف کا آغاز تاریخ کو طبیعیات سے کیمیاء اور پھر حیاتیات کے اگلے مرحلے کی طرح پیش کرنے سے ہوا تھا۔ آدمی انھی ساری طبیعیاتی قوتوں، کیمیائی تعاملوں اور فطری انتخاب کے عواملوں کا پابند ہے جو باقی ساری نامیات پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ فطری انتخاب کے عوامل نے آدمی کو کھل کر کھیلنے کے لیے اتنا بڑا میدان فراہم کیا ہے جو کسی بھی دوسرے زندہ وجود کو میسر نہیں آیا۔ تاہم، یہ میدان وسیع و عریض ضرور ہے لیکن اس کی بہر طور حدود بھی ہیں۔ ان حدود کے مضمرات یہی پیش آتے رہے ہیں کہ آدمی جس قدر بھی کھل کر کھیلے، وہ جس قدر کوشش کر لے یا جتنی بھی کامیابیاں سمیٹ لے۔۔۔ بہر حال حیاتیات کی طے کردہ حدود کا پابند ہے اور اس سے کبھی آزاد نہیں ہو پایا۔

لیکن، اکیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ ہی یہ طے ہو گیا ہے کہ معاملہ دوسرا ہے۔ اب آہستہ آہستہ، یہ حدود بھی بے معنی ہوتی جا رہی ہیں۔ آدمی، ان حدود سے گزرتا جا رہا ہے۔ اب اس نے قدرتی اصولوں کو بھی توڑنا شروع کر دیا ہے اور اس کی جگہ ذہانت کی تدابیر اور خاکوں نے لینے کا آغاز کر دیا ہے۔

قریباً چار ارب سال تک، اس کرہ ارض پر پائے جانے والی ہر نامیاتی قسم نے فطری انتخاب کی چھتری تلے ارتقاء حاصل کی ہے۔ ان میں سے کوئی ایک بھی ایسی نامیاتی قسم نہیں تھی جس کا خاکہ کسی ذہین خالق نے بنایا ہو۔ مثال کے طور پر زرافے کی لمبی گردن۔۔۔ کسی اعلیٰ ذہانت کی حامل ہستی کی دین نہیں ہے بلکہ یہ قدیم زمانے میں زرافوں کے بیچ خوراک کے حصول کی دوڑ کا نتیجہ ہے۔ وہ قدیم زرافے جن کی گردنیں لمبی رہا کرتی تھیں، انھیں اونچے درختوں۔۔۔ یعنی زیادہ خوراک تک رسائی رہا کرتی تھی اور نتیجتاً، وہ باقی زرافوں، بالخصوص چھوٹی گردن والے پست قد زرافوں سے کہیں بڑھ کر افزائش کر پاتے تھے۔ آج تک کسی نے، زرافوں نے تو ہرگز یہ نہیں کہا کہ، 'لمبی گردن کا فائدہ یہ ہے کہ زرافے درخت کی چوٹی پر سے پتے چر سکتے ہیں۔۔۔ کیوں نہ ہم، زرافوں کی گردن اور ٹانگیں لمبی کر دیں؟'

ڈارون کے نظریے کی خوبصورتی یہ ہے کہ اسے زرافوں کی لمبی گردنوں اور ٹانگوں کی وضاحت پیش کرنے کے لیے کسی عاقل اور فہیم موجد، کسی برتر ہستی کا تصور پالنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔

اربوں سال تک تو ذہانت کی مدد سے خاکے اور نمونے تیار کرنے کی تو کوئی صورت ہی نہیں تھی کیونکہ ایسی ذہانت کا وجود ہی نہیں تھا کہ جو چیزوں کے خاکے اور نمونے تیار کر سکے۔ تاریخی تناظر میں دیکھا جائے تو زمانہ قریب تک، دنیا میں جاندار صرف اور صرف یک خلوی جرثومے ہی رہا کرتے تھے۔ یہ یک خلوی جرثومے لاجواب مہارت اور کارنمایاں کے مالک ہوتے ہیں۔ وہ یوں کہ کسی ایک نوع سے تعلق رکھنے والے جرثومے، کسی دوسری بالکل مختلف قسم کے جرثومے کے جینیاتی مادہ اپنے یک خلوی جسم میں شامل کرنے کا اہل ہوتے ہیں اور یوں ان میں نت نئی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔۔۔ جیسے مثال کے طور پر بیکٹیریا وغیرہ اینٹی بائیوٹک ادویات کے خلاف مزاحمت ایسے ہی پیدا کرتے ہیں۔ لیکن، اس کے باوجود۔۔۔ جہاں تک ہمیں علم ہے جرثوموں میں شعور اور آگاہی نہیں ہوتی۔ زندگی میں کوئی مقصد اور نہ ہی مستقبل کی منصوبہ بندی وغیرہ کی صلاحیت ہوتی ہے۔

لیکن، ایک مرحلے تک پہنچ کر نامیاتی اجسام جیسے زرافے، ڈالفن، بن مانس اور نینڈر تھل انسان وغیرہ نے ارتقاء کی مدد سے آگے کی منصوبہ بندی کے حوالے سے شعور پا ہی لیا۔ لیکن اس شعور کے حصول کے باوجود بھی اگر کوئی نینڈر تھل انسان ایسے موٹے تازے اور انتہائی سست پرندوں (جنھیں وہ جب بھی بھوک لگتی۔۔۔ پکڑ کر کھا سکتا تھا) بارے سوچ و چار۔۔۔ تصور پالتا بھی تھا تو اس کے پاس اتنی سمجھ اور طریقہ بھی نہیں تھا کہ وہ اس خیال کو عملی جامہ پہنا سکتا۔ اسے اس تصور کے باوجود بھی ہمیشہ انھی پرندوں کا شکار کرنا پڑتا تھا جنھیں ارتقاء نے فطری انتخاب کے بعد بنا لیا تھا۔

قدرت کی اس قدیم حکمرانی میں پہلی دراڑ قریباً دس ہزار سال پہلے زرعی انقلاب کے اوائل دور میں پیدا ہوئی۔ خردمند آدمی۔۔۔ بھی نینڈر تھل انسانوں کی طرح خوراک کے لیے موٹے تازے لیکن انتہائی سست پرندوں کا تصور پالتا تھا لیکن اس کی اہلیت یہ تھی کہ اس نے ایسا طریقہ ڈھونڈ نکالا جس سے اس خیال کو عملی جامہ پہنایا جا سکتا تھا۔ وہ یوں کہ اس نے سمجھ بلکہ بوجھ لیا کہ اگر وہ مرغیوں میں سب سے موٹی مرغی کا جنسی ملاپ سب سے سست مرغے کے ساتھ کروائے اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی مرغیاں اور مرغے آپس میں ملاپ کریں تو یہ طے ہے کہ مرغوں کی اگلی نسلیں موٹی اور سست ہی پیدا ہوتی رہیں گی۔ موٹی اور سست مرغیوں کی یہ وہ قسم تھی جس سے قدرت ناآشناء تھی۔ اس قسم کی مرغیاں، عقل اور ذہانت کا خاکہ تھیں۔ اس نسل کی مرغیاں کسی خدا نے نہیں بلکہ انسان نے اپنی ذکاوت سے پیدا کر لی تھیں۔

لیکن ظاہر ہے، کسی بھی عظیم اور برتر ہستی کے مقابلے میں خردمند آدمی کی تدبیری صلاحیت اور ہنر کی بہرحال اپنی ایک حد برقرار رہی۔ وہ یوں کہ خردمند آدمی انتخابی تولید کے عمل کو استعمال کر کے گویا چکر چلا لیتا تھا۔۔۔ یعنی فطری انتخاب کے عمل کو تیز کر کے

مرغیوں کی اپنے فائدے کی بہتر قسمیں اور نسلیں پیدا کر لیتا تھا۔ لیکن، بہر حال وہ یہ قدرت نہیں رکھتا تھا کہ جنگلی مرغی کے جینیاتی مادے میں بالکل نئی یا انوکھی خصوصیات متعارف کروا سکتا ہو۔ ایک لحاظ سے کہا جائے تو خردمند آدمی اور مرغیوں کے بیچ ہم زیستی کا تعلق تھا۔ یعنی، آدمی، مرغیوں پر انحصار کرتا تھا یا کہیے۔۔۔ یہ دو نامیوں کے بیچ تعلق تھا جس کی اپنی نوعیت ہوتی ہے۔ اس ہم زیستی تعلق میں باقی کے ایسے تعلقات کی نسبت امتیاز صرف اتنا ہی تھا کہ آدمی اپنی عقل کو استعمال میں لا کر مرغیوں پر غیر معمولی انتخابی دباؤ ڈال کر ان میں سے موٹی تازی اور سست مرغیوں کو افزائش میں سہولت فراہم کر دیتا تھا۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے شہد کی مکھیاں، پھولوں کو زیرگی (پولینیشن) میں مدد دیتی ہیں اور یوں ہم ایک ہی قسم کے رنگ برنگے پھولوں کو پنپتا دیکھتے ہیں۔ جیسے شہد کی مکھیاں لاکھوں سال سے، ویسے ہی آدمی بھی صرف پچھلے دس ہزار سال سے ہم زیستی کا چکر چلاتا آیا ہے۔

آج چار ارب سال پرانی، قدرتی انتخاب کی قدیم حکمرانی کو بالکل مختلف قسم کے چیلنج کا سامنا ہے۔ دنیا بھر کی لیبارٹریوں میں سائنسدان ہر روز جانداروں پر کل سازی کر رہے ہیں۔ وہ آئے روز قدرتی انتخاب کے اصولوں کو بلا خوف و خطر۔۔۔ انتہائی بربیت کے ساتھ توڑتے ہیں اور نامیوں کی اصل خصوصیات کو بھی بے لگام کر رہے ہیں۔ برازیل سے تعلق رکھنے والا ایک حیاتی فن کار ہے۔ اس کا نام ہے ایڈورڈو کاک۔۔۔ ایڈورڈو نے 2000ء میں فن کی دنیا میں ایک نئی صنف تخلیق کی اور پہلی بار ہرے رنگ کے فلوری خرگوش پیدا کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے ایک فرانسیسی لیبارٹری سے رابطہ کیا اور انھیں اپنی مرضی کے مطابق، تخصیص شدہ فروزاں خرگوش کی کل سازی کا کام حوالے کیا۔ فرانسیسی سائنسدانوں نے اپنی فیس کھری کرنے کے بعد سب سے پہلے ایک سفید رنگ کے عام خرگوش کا جنین۔۔۔ یعنی رحم میں پلتا ہوا بچہ لیا اور اس کے ڈی این اے (جینیاتی مادے) میں ہری فروزاں جیلی فش کا موروثہ ڈال دیا۔ پھر اس جنین کو خرگوش کے رحم جیسا ماحول فراہم کیا اور لیجیے۔۔۔ ایک عدد ہرے رنگ کا فلوری خرگوش، آپ جناب کی خدمت میں پیش کر دیا گیا۔ ایڈورڈ نے اس خرگوش کا نام البا رکھا تھا۔

البا کے وجود کی وضاحت قدرتی انتخاب کے اصولوں کے مطابق پیش کرنا ناممکن ہے۔ یہ ایک ایسی مادہ خرگوش ہے جو ہر لحاظ سے ایک ہوشمند طراحی۔۔۔ یعنی ذہانت کے خاکے کا نتیجہ ہے۔ یہی نہیں بلکہ البا مستقبل کی پیش بینی بھی کرتی ہے۔ اگر البا کی صورت پیدا ہونے والے امکانات پوری طرح حقیقت کا روپ دھار لیں اور اگر تب تک انسان نے خود کو اپنے ہاتھوں تباہی سے دوچار نہ کر لیا تو سائنسی انقلاب، ایک تاریخی واقعہ نہیں رہے گا بلکہ یہ کہیں بڑھ کر کوئی شے بن جائے گا۔ اس کا اندازہ اس امر سے لگائیے کہ اگر ایسا ہو گیا تو یہ کرہ ارض پر حیات کے ظہور۔۔۔ یعنی خود حیاتیاتی انقلاب کے مقابلے کی شے ہو گا۔ چار ارب سال تک فطری انتخاب کے بعد البا ایک نئے لامحدود دور کی صبح، آغاز ہے۔ اس دور میں زندگی پر قدرت کا نہیں بلکہ عقل اور ذہانت کا اختیار اور راج ہو گا۔ اگر ایسا ہو جاتا ہے تو یقیناً اس وقت تک کی ساری انسانی تاریخ اور سمجھ بوجھ کو مجتمع کر کے حیاتیاتی کھیل کو اس جگہ پہنچانے میں نو آموزی اور مشق ہی قرار دیا جانا چاہیے۔

مراد یہ ہے کہ ہم عام طور پر ہم عقل اور ذہانت کو انسانوں سے منسوب کر کے پچھلے صرف چند ہزار سالوں پر نظر رکھتے ہیں جبکہ جب ذہانت کا صحیح معنوں میں راج، اگر ممکن ہو گیا تو پھر ہمیں اس سارے عمل کو مجموعی شکل میں، اربوں سال کے کائناتی عمل اور اس کے پیرائے میں دیکھنے کی ضرورت ہو گی۔ قدرت سے ذہانت کی حکمرانی کا یہ سفر۔۔۔ کائناتی تاریخ میں، ایک ہی سنگ میل بن جائے گا۔

دنیا بھر کے حیاتیات دان اس وقت ذہانت کی بڑائی پر مبنی تحریک اور اس کے حامیوں کے ساتھ متھا لڑا رہے ہیں۔ ذہانت کے حامی سکولوں میں ڈارون کے ارتقائی نظریے کی تعلیم کی مخالف کرتے ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ حیاتیاتی پیچیدگیوں کو دیکھ کر یہ گمان پیدا ہوتا ہے۔۔۔ بلکہ قدرتی انتخاب سے غیر مرئی خالق کا وجود ثابت ہوتا ہے جو ہر حیاتیاتی تفصیل سے پہلے ہی واقف، بلکہ اس کا کارنامہ ہے۔ حیاتیات دان قدرتی انتخاب وغیرہ کو دیکھیں تو ماضی کے بارے بالکل درست ہیں لیکن بات یہ ہے کہ مستقبل کا معاملہ دوسرا ہے۔ اس امر کا پورا پورا امکان پایا جاتا ہے کہ مستقبل سے متعلق۔۔۔ ذہانت کا پلڑا بھاری ہے اور قدرتی انتخاب کے مقابلے میں اسی کا راج رہے گا۔

آج یہ سطریں تحریر میں لاتے وقت۔۔۔ یعنی، آج عاقلی منصوبے کے لیے قدرتی انتخاب کی جگہ حاصل کرنے کے صرف تین طریقے ہیں: اول حیاتیاتی، دوم سائبورگ (سائبورگ وہ اجسام ہیں ہے جس میں نامیاتی اور غیر نامیاتی دونوں حصے ہوتے ہیں) اور سوئم غیر نامیاتی حیات کی کل سازی (انجنیئرنگ) کی جائے۔

انسان اور چوہا

حیاتیاتی کل سازی یا انجنیئرنگ سے مراد یہ ہے کہ حیاتیاتی سطح پر انسان مدخل ہو کر رہا ہے۔۔۔ مثال کے طور پر جینیاتی مادے میں اپنی مرضی کے موروثے متعارف کروانا، حیاتیاتی کل سازی ہے۔ اس کا مقصد کسی بھی نامیاتی جسم کی شکل، اہلیت، ضرورت یا خواہشات میں ترمیم ہوتی ہے تا کہ پہلے سے ہی موجود کسی خیال کو عملی جامہ پہنایا جا سکے۔ یعنی، اس ترمیم کی ضرورت اور طلب سے متعلق رجحان پہلے سے ہی موجود ہو۔ جیسے، ایڈورڈ کاک کی جمالیاتی رغبت اس کی ایک مثال ہے۔

اس لحاظ سے دیکھا جائے تو حیاتیاتی کل سازی میں کوئی نئی بات نہیں ہے۔ لوگ حیاتیاتی کل سازی کو ہزاروں سال سے خود اپنے آپ اور دوسرے نامیاتی اجسام (حیوانات اور نباتات) کو نئی شکل دیتے ہی آئے ہیں۔ اس کی ایک سادہ سی مثال آختہ کاری یعنی نر میں خصیوں اور مادہ میں بیضہ دان ختم کرنے کی ہے۔ انسان غالباً پچھلے دس ہزار سال سے بیلوں کو خصی کرتا آیا ہے۔ بیل کو خصی کر دینے سے اس کی جارحیت کم ہو جاتی ہے اور یوں معمولی تربیت کے بعد ہل اور رہٹ وغیرہ چلانے کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ بعض انسانی معاشروں میں بھی آختہ کاری کا رواج موجود رہا ہے۔ غنائی گلو کاری کے لیے نوعمر لڑکوں کے خصیے کاٹ دیے جاتے تھے تا کہ ان میں

زنانہ اور مردانہ دونوں طرح کی ایسی خصوصیات پیدا ہو جائیں کہ وہ پنچم کا سر اور تال بھی لگا سکیں۔ پھر یہ غنائی گلوکار ساری عمر سلطانوں کے حرم کی زینت بن کر رہا کرتے تھے۔

لیکن حالیہ دور میں چونکہ نامیاتی اجسام اور ان کی کارکردگی سے متعلق ہمارے علم اور سمجھ بوجھ میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے تو اب ہم خلوی اور نیوکلیائی سطح پر بھی حیاتی جینیات کا علم رکھتے ہیں۔ اس لیے ہمارے لیے حیاتیاتی کل سازی میں ناقابل یقین حد تک نئی اور جدید راہیں کھل چکی ہیں۔ مثال کے طور پر آج ہم صرف کسی نوعمر لڑکے کو خصی ہی نہیں کر سکتے بلکہ جراحی اور ہارمونی علاج کی مدد سے اس کی جنس بھی بدل سکتے ہیں۔ لیکن، ہم اس کل سازی سے صرف یہی نہیں کر سکتے۔۔۔ اس معاملے میں اصل حیرانگی اس وقت ہوئی تھی جب 1996ء میں ٹی وی اور اخبارات میں ایک تصویر شائع ہوئی۔ اسے دیکھ کر عجب اکراہ اور سراسیگی کا احساس ہوتا ہے۔ آپ بھی یہ تصویر دیکھیے:

46 ایک ایسا چوہا، جس کی پشت پر سائنسدانوں نے گائے کی بھربھری ہڈی کے خلیوں کی مدد سے ایک 'کان' اگا دیا ہے۔ یہ جرمنی کے غار سے ملنے والے 'شیر نما آدمی' کی مورت کی جیتی جاگتی لیکن انتہائی عجیب وغریب اور ڈراؤنی شکل ہی ہے۔ تیس ہزار سال پہلے ہی آدمی دو مختلف انواع کو یکجا کرنے کا تصور رکھتے تھے۔ آج وہ حقیقت میں ایسے دم ساز پیدا کرنے کا اہل ہو چکا ہے۔

یہ کسی فوٹوشاپ کا نتیجہ نہیں ہے۔ یہ ایک اصل اور جیتے جی چوہے کی ان چھوئی تصویر ہے۔ اس چوہے کی پشت پر سائنسدانوں نے ایک بیل کی کرکری ہڈیوں کے خلیوں کو 'بو' کر 'جا' رکھا ہے۔ یہی نہیں بلکہ سائنسدان ان خلیوں اور بافتوں کی نشوونما کو پوری طرح کنٹرول کرنے میں بھی کامیاب رہے اور یوں اس کی شکل کچھ ایسی بنائی گئی کہ یہ دیکھنے پر انسانی کان نظر آتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ جلد ہی سائنسدان ایسا عمل تیار کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے کہ جس کی مدد سے مصنوعی کان بنا کر انسانوں میں 'نصب' کرنا بھی ممکن ہو جائے گا۔

جینیاتی کل سازی کی مدد سے تو اس سے بھی کہیں بڑے بڑے عجوبے سامنے آسکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جینیاتی تجربات پر اکثر و بیشتر ہی اخلاقی، سیاسی اور نظریاتی سوالوں کی شکل میں اعتراضات اٹھتے ہی رہتے ہیں۔ یہ اعتراض صرف متقی خدا پرستوں کی جانب سے ہی نہیں اٹھتے۔۔۔ جن کے خیال میں انسان کو خدا کی قدرت میں دخل اندازی نہیں کرنی چاہیے بلکہ کئی مستند لادین ملحدین کو بھی اس تصور سے ہی سخت حیرت ہوتی ہے کہ سائنسدان قدرت کے کام سنبھالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جانوروں کے حقوق کے حامی جینیاتی کل سازی کے تجربات کے نتیجے میں جانوروں کو پیش آنے والی مصیبتوں پر نالاں رہتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ انھیں یہ اعتراض بھی رہتا ہے کہ جینیاتی کل سازی کی وجہ سے فارمی جانوروں کی زندگیاں، مزید مشکل ہو جائیں گی۔ اب تو وہ بالکل ہی حیاتیاتی مشینیں بن کر رہ جائیں گی۔ انسانی حقوق کے علمبرداروں کو یہ ڈر ہے کہ جینیاتی کل سازی کے نتیجے میں ایسے فوق الفطرت بشر تخلیق ہو جائیں گے جو باقی سارے انسانوں کو اپنا دست بستہ غلام بنالیں گے۔ انسانی اقدار کے انحطاط پر نوحہ گر حلقے، جینیاتی کل سازی کے تناظر میں کل کلاں حیاتی آمریتوں کی ایسے ایسے تصور پیش کرتے ہیں کہ سن کر ہی خوف آتا ہے۔ ان کے مطابق، اس طرح ہم بے خوف و خطر سپاہی اور انتہائی اطاعت شعار غلام بنانے میں کامیاب ہو سکتے ہیں جو انسانوں کی سرے سے پرواہ نہیں کریں گے۔ آج مجموعی طور پر یہ احساس حاوی نظر آتا ہے کہ غالباً انسان ایک ساتھ کئی کئی مواقعوں کے راستے بہت ہی تیزی کے ساتھ کھولتا جا رہا ہے۔ یہ سب اس قدر تیزی سے وقوع پذیر ہو رہا ہے کہ ہم جینیات میں تو ہر طرح کی تبدیلی کرنے کے اہل ہو جائیں گے لیکن اس کے مضمرات اور دانشمندی سے استعمال کا ہمیں شاید موقع نہیں مل پائے گا اور انجانے میں کچھ بہت، ہم بہت ہی بھیانک غلطی کے مرتکب ہو سکتے ہیں۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج ہم جینیاتی کل سازی کی وجہ سے زبردست امکانات میں سے بہت ہی معمولی، نہ ہونے کے برابر فوائد کا استعمال کر رہے ہیں۔ آج جینیاتی کل سازی کی مدد سے صرف انہی نامیات پر یہ علم آزمایا جا رہا ہے جن پر سیاسی اور اخلاقی اعتراضات بہت کم ہوتے ہیں یعنی نباتات، کھمبیاں، بیکٹریا اور حشرات وغیرہ۔۔۔ مثال کے طور پر ای کولائی نامی بیکٹریا ایسا ہے جو انسانی انتڑیوں میں ہم زیستی کی شکل میں رہتا ہے۔ جب یہ ای کولائی بیکٹریا، جلاب کے ساتھ ماحول میں پھیلتا ہے تو پیچشوں کی وباء پھیل جاتی ہے۔ بہر حال، سائنسدانوں نے اس بیکٹریا کو جینیاتی کل سازی کی مدد سے حیاتی ایندھن (بائیوفیول) بنانے کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا ہے۔ اسی طرح انھی ای کولائی بیکٹیریا اور کھمبیوں کی بعض اقسام کو جینیاتی کل سازی کی مدد سے انسولین بنانے میں بھی استعمال کیا جاتا ہے، جس کی وجہ سے ذیابیطس کا علاج بہت سستا ہو چکا ہے۔ نباتات میں بھی کل سازی کی چیدہ مثالیں ملتی ہیں۔ مثال کے طور پر قطب شمالی میں پائی جانے والی ایک مچھلی کے موروثے کو جب آلوؤں کے جینیاتی مادے میں شامل کر کے نئی قسم بنائی گئی تو۔۔۔ حیرت انگیز طور پر، کہر اور پالا آلوؤں کی اس قسم کے پودوں کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا تھا۔

چند ایک ممالیہ جانور ایسے ہیں جن پر جینیاتی کل سازی کی گئی ہے۔ مثال کے طور پر، ہر سال دودھ کی صنعت کو گائیوں کے حوانے میں ورم اور سوزش کی وجہ سے اربوں ڈالر کا نقصان ہوتا ہے۔ یہ ایسی بیماری ہے جو گائیوں کے تھنوں کو سوزش کی وجہ سے ناکارہ کر دیتی ہے اور یوں دودھ کی پیداوار پر اثر پڑتا ہی ہے، یہ قیمتی گائیوں کو بھی ناکارہ کر دیتی ہے۔ آج کل سائنسدان جینیاتی طور پر ترمیم کردہ ایسی گائیوں پر تجربات کر رہے ہیں جن کے دودھ میں لائسوسٹفن نامی حیاتی کیمیائی مادہ شامل ہو گا۔ یہ کیمیائی مادہ، ان بیکٹیریا یا جرثوموں کے خلاف انتہائی موثر ہوتا ہے جو گائیوں کے حوانوں میں ورم اور سوزش کا باعث بنتے ہیں۔ یعنی، گائیوں میں اس بیماری کا امکان، جڑ سے ختم ہو سکتا ہے۔
اسی طرح، حالیہ برسوں کے دوران لحم خنزیر کی صنعت میں بھی سخت گراوٹ دیکھنے میں آئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اب لوگوں کی اکثریت خنزیر کے گوشت میں بے پناہ غیر صحت بخش چکنائیوں کی وجہ سے اس کی خریداری کم کر رہے ہیں۔ اس صنعت سے منسلک سرمایہ داروں کو یقین ہے کہ سائنسدان جینیاتی کل سازی کی مدد سے اس مسئلے کا حل نکال لائیں گے۔ سائنسدان بھی تیار بیٹھے تھے، انھوں نے فوراً ہی ایسے جینیاتی ترمیم شدہ خنزیروں پر تجربات شروع کر دیے جن کے جینیاتی مادے میں ایک کیڑے کا مخصوص موروثہ شامل کر دیا جاتا ہے۔ اس موروثے کو خوب بڑھاوا دیا گیا تو نتیجہ یہ نکلا کہ جینیاتی طور پر ترمیم شدہ ان خنزیروں کے لحم میں امیگا 6 نامی غیر صحت بخش چکنائی یعنی روغنی تیزاب۔۔۔ صحت مند چکنائی یعنی امیگا 3 میں بدل گیا۔
جینیاتی کل سازی کی مدد سے جلد ہی ایسے خنزیر پیدا کرنا بچوں کا کھیل بن جائے گا، جن کے لحم میں صرف صحت بخش چکنائیاں ہی پائی جاتی ہوں گی۔ آج جینیات کے شعبے میں تحقیق اور ترقی کی صورتحال یہ ہے کہ جینیات دان کامیابی کے ساتھ جینیاتی کل سازی کی مدد سے کیڑوں اور حشرات کی لاتعداد اقسام کی عمروں میں چھ چھ گنا تک طوالت کا تجربہ کامیابی سے مکمل کر چکے ہیں۔ چوہوں میں ان تجربات کی کامیابی کی شرح نسبتاً کم ہے کیونکہ ان میں طوالت عمر کے ساتھ ساتھ یادداشت اور سیکھنے کی استعداد سے متعلق جینیاتی امور بھی شامل ہوتے ہیں۔ ان امور پر بھی۔۔۔ یعنی پیچیدہ جینیاتی امور پر بھی تجربات کامیابی سے جاری ہیں۔
ویسے تو جینیاتی کل سازی میں طرح طرح سے تحقیق اور ترقی جاری ہے لیکن کچھ عرصہ قبل ایک نہایت دلچسپ تحقیق سامنے آئی تھی۔ ہوا یوں ہے کہ کترنے والے جانوروں یعنی چوہوں میں ایک قسم ہوتی ہے۔ یہ جسامت میں نہایت چھوٹی ہوتی ہے اور اس کی زیادہ تر اقسام مخلوط ہوتی ہیں۔۔۔ یعنی بے روک ٹوک جنسی اختلاط کرتی ہیں۔ لیکن، چوہوں کی ان اقسام میں ایک مخصوص قسم ہے جس میں نر اور مادہ دیرپا اور یک زوجگی کا تعلق قائم کرنے کی اہل ہوتی ہیں۔ جینیات دانوں کا دعویٰ ہے کہ وہ چوہوں کی اس قسم کے جینیاتی مادے میں سے ایسے موروثے الگ کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں جو ان کے یہاں یک زوجگی کی اہلیت کا سبب بنتے ہیں۔ جب ان موروثوں کو دوسرے چوہوں میں بھی متعارف کروایا گیا تو وہ بھی وفادار اور انتہائی محبت کرنے والے، یک زوجگی پر مائل شوہر بن گئے تھے۔ اس تحقیق میں دلچسپی کا سامان یہ سوال ہے کہ آپ خود ہی بتائیے، ہم جینیاتی کل سازی کی مدد سے صرف کترنے والے جانوروں جیسے چوہوں (اور

انسانوں) میں انفرادی صلاحیتی ترامیم کرنے سے کتنے دور ہیں؟ یہی نہیں بلکہ یہ بھی جینیاتی کل سازی کی مدد سے ہم ان کی انواع کے سماجی ڈھانچوں، تراتیب اور ساختوں میں بے پناہ تبدیلیاں لانے کے کس قدر اہل ہو سکتے ہیں؟

نینڈرتھل انسان کی واپسی

لیکن جینیات دان صرف زندہ انواع کی نسب میں کایا پلٹ نہیں چاہتے بلکہ وہ تو معدوم ہو جانے والی مخلوقات کو بھی دوبارہ زندہ کرنے کے خواہاں ہیں۔ ان کی یہ خواہش صرف 'جراسک پارک' میں ڈائنوساروں کی احیاء نہیں ہے۔ حال ہی میں روسی، جاپانی اور کوریائی سائنسدانوں کی ایک ٹیم نے سائبیریا کے برفیلے میدانوں میں سے دریافت ہونے والے ایک میمتھ ہاتھی کے جینیاتی مادے کا بالکل ٹھیک ٹھیک مکمل نقشہ تیار کیا ہے۔ اب ان کا ارادہ یہ ہے کہ وہ کسی ہتھنی کے زرخیز بیضوی خلیے میں عام ہاتھی کے ڈین این اے کی جگہ میمتھ ہاتھی کا ڈی این اے ڈال دیں اور پھر اس بیضے کو کسی ہتھنی کے رحم میں نصب کر دیں۔ بائیس مہینے بعد، ان کو توقع ہے کہ ایک میمتھ ہاتھی پیدا ہو کر 5000 سال بعد دوبارہ زندہ ہو جائے گا۔

لیکن صرف میمتھ ہی کیوں پیدا کریں؟ ہارورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر جارج چرچ نے حال ہی میں نینڈرتھل انسانوں کے جینیاتی مادے کے نقشے کو کامیابی سے مرتب کرنے کی کامیابی کے ساتھ ہی یہ اعلان کیا تھا کہ ہم نینڈرتھل ڈی این اے کو خردمند آدمی کے بیضے میں ڈال کر، تقریباً تیس ہزار سال بعد ایک نینڈرتھل انسان کا بچہ پیدا کر کے دوبارہ زندہ کر سکتے ہیں۔ پروفیسر جارج چرچ کا دعویٰ ہے کہ وہ یہ کام تین کروڑ ڈالر کی معمولی رقم کے عوض کر کے دکھا سکتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اب تک کئی عورتوں نے اس نینڈرتھل بچے کی رضاعی ماں بننے پر آمادگی اور خواہش کا اظہار بھی کر دیا ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ آخر ہمیں نینڈرتھل انسانوں کی اب ضرورت ہی کیا ہے؟ اس ضمن میں بعض یہ دلیل دیتے ہیں کہ اس طرح ہم زندہ نینڈرتھلوں پر علمی مشاہدات اور تحقیق کر سکتے ہیں اور ہمیں خردمند آدمی کی اصلیت اور یکتائی سے متعلق ہر دم کے نکتہ چیں سوالات کا جواب بھی مل جائے گا۔ ایک نینڈرتھل اور خردمند آدمی کے دماغ میں تقابل کر کے ہم یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ ان دونوں کی ساخت میں فرق کیا ہے۔۔۔ اس سے ہمیں غالباً ان حیاتیاتی تبدیلیوں کا بھی علم ہو جائے گا جو ہمارے شعور اور آگاہی۔۔۔ یعنی ذہانت اور عقل کا باعث ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس کی ایک اخلاقی وجہ بھی ہے۔۔۔ وہ یوں کہ اگر خردمند آدمی نے نینڈرتھلوں کو معدوم کیا تھا تو پھر یہ ہماری اخلاقی ذمہ داری ہے کہ ہم ہی انھیں دوبارہ زندہ بھی کریں۔ ویسے بھی، نینڈرتھل انسانوں کی وجہ سے ہمیں بھی کچھ نہ کچھ فائدہ ہو ہی سکتا ہے۔ صنعت کار تو بالخصوص خوش ہوں گے کیونکہ وہ ایک نینڈرتھل کی خدمات حاصل کر کے، ان سے دو خردمند آدمیوں جتنی مشقت لے سکتے ہیں۔

اس لحاظ سے تو پھر صرف نینڈرتھل انسانوں پر ہی کیوں تکیہ کریں؟ بھئی۔۔۔خدا کے ڈرائنگ بورڈ تک رسائی حاصل کرو اور بہتر خرد مند آدمی بنالاؤ۔خرد مند آدمی کی صلاحیتوں،ضروریات اور خواہشات کی جینیاتی اساس ہوتی ہے۔اور ویسے بھی،خرد مند آدمی کا جینیاتی نقشہ، جنگلی چوہوں سے بہت زیادہ پیچیدہ نہیں ہے۔ جنگلی چوہوں کے جینیاتی نقشے میں قریباًڈھائی ارب نیوکلیوباز(نیوکلیوبیس)جبکہ خرد مند آدمی کے جینیاتی نقشے میں ان کی تعداد قریباًدو ارب نوے کروڑ ہوتی ہے،یعنی چوہوں کے مقابلے میں یہ صرف چودہ فیصد زیادہ بڑا ہے۔اگر زیادہ نہیں تو صرف چند دہائیوں کے اندر اندر ہی جینیاتی کل سازی اور حیاتیاتی کل سازی وغیرہ کی مدد سے نہ صرف یہ کہ ہمارے عضویاتی و مدافعاتی نظام اور طوالت عمر میں بڑی تبدیلیاں آسکتی ہیں بلکہ ہم اپنی ذہنی اور جذباتی سکت کو بھی بڑے پیمانے پر بہتر بنا سکتے ہیں۔اگر جینیاتی کل سازی کی مدد سے ایک ذہین چوہا پیدا کیا جاسکتا ہے تو پھر ہمیشہ سے بڑھ کر ذہین اور فطین انسان بنانا کتنا مشکل ہو گا؟اگر ہم چوہوں کو یک زوجگی پر مائل کر سکتے ہیں تو پھر انسانوں کو اپنے جیون ساتھیوں کے ساتھ کلی طور پر باندھنے میں کیا حرج ہے؟

شعور اور آگاہی کے انقلاب نے خرد مند آدمی کو ایک ادنیٰ بن مانس سے دنیا کا حکمران بنادیا تھا۔اس انقلاب کو عضویاتی نظام بلکہ یہاں تک کہ ہمارے دماغ کی بیرونی شکل اور حجم میں بھی کوئی قابل ذکر تبدیلی لانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی۔یہ سارا معاملہ صرف اور صرف ہمارے دماغ کی اندرونی ساخت میں بس چند معمولی تبدیلیوں کی وجہ سے ممکن ہوا تھا۔تو پھر کیا خیال ہے،دماغ کی اندرونی ساخت میں چند،معمولی سی کچھ اور تبدیلی میں کیا حرج ہو گا؟ کیا یہ شعور اور آگاہی کا ایک نیا۔۔۔دوسرا انقلاب برپا کرنے کے لیے کافی نہیں ہو گا؟ہم اس طرح مکمل طور پر شعور اور علم کا ایک نیا باب کھول سکتے ہیں اور خرد مند آدمی کی کایا پلٹ کر بالکل نئی شے بنا سکتے ہیں۔

یہ درست ہے کہ فی الوقت ہمارے پاس اس کی پوری صلاحیت نہیں ہے لیکن تکنیکی لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ کام کر دکھانے میں کوئی اتنی بڑی رکاوٹ بھی حائل نہیں ہے اور ہم بلاشبہ طور پر مافوق الفطرت انسان پیدا کرنے کے قابل بن سکتے ہیں۔اس کام کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ وہ اخلاقی اور سیاسی اعتراضات ہیں جس کی وجہ سے انسانوں پر اس طرح کی تحقیق کھڈے لائن لگی ہوئی ہے۔یہ اخلاقی اور سیاسی اعتراض بھلے جتنے بھی مضبوط ہوں۔۔۔ان کا طویل مدت میں ٹک پانا نظر نہیں آتا۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اس طرز کی تحقیق سے بہت کچھ حاصل کیا جاسکتا ہے۔انسانوں کی عمریں لازوال حد تک طویل ہو سکتی ہیں،لاعلاج مرضوں کی شفا مل سکتی ہے اور سب سے بڑھ کر ہماری عقلی،علمی اور جذباتی صلاحیتوں میں بے پناہ اضافہ پیدا کیا جاسکتا ہے۔

مثال کے طور پر اگر ہم الزائمر نامی بیماری کا علاج دریافت کرنے کے ساتھ ساتھ صحت مند انسانوں کی ڈرامائی حد تک یادداشت میں اضافہ کرنے کے قابل ہو جائیں تو کیا ہو گا؟ کیا اس طرح کی تحقیق میں روڑے اٹکانے والے زیادہ دیر تک ٹک پائیں گے؟ جب علاج دریافت ہو جائے گا تو کیا کوئی بھی قانونی ادارہ الزائمر بیماری کے شکار مریضوں کو یہ علاج حاصل کرنے اور صحت مند لوگوں کو اپنی یادداشت بڑھانے کی اہلیت حاصل کرنے سے روک پائے گا؟

آج ہم صاف صاف یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ آیا حیاتی کل سازی کی مدد سے ہم نینڈرتھلوں کو دوبارہ زندہ کر پائیں گے یا نہیں لیکن یہ ضرور ہے کہ حیاتی کل سازی کی مدد سے جلد ہی خردمند آدمی کے دور پر پردہ ضرور پڑنے والا ہے۔ اپنے جینیاتی مادے اور موروثوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ سے ہم فنا تو نہیں ہوں گے لیکن اس عمل سے ہم خردمند آدمی کی ہئیت میں اتنے مدخل ضرور ہوں گے کہ آخر کار۔۔۔ ہم جو خردمند آدمی ہیں، وہ خردمند آدمی نہیں رہیں گے۔

برق حیاتی زندگی

ایک ٹیکنالوجی ایسی بھی ہے جو حیاتی اصولوں کو سرے سے بدل کر رکھ سکتی ہے۔ یہ سائبورگ کل سازی ہے۔ سائبورگ ایسی مخلوق ہوتی ہے جس کے جسم میں نامیاتی اور غیر نامیاتی عضو یا حصے ہوتے ہیں، مثال کے طور پر ایک انسان جس کے برق حیاتی ہاتھ ہوں۔ ایک لحاظ سے آج کل ہم سب ہی برق حیاتی ہیں کیونکہ ہم اپنے قدرتی حواس اور جسمانی افعال کو بڑھانے یا کمی کو پورا کرنے کے لیے ایک یا کسی دوسرے آلے جیسے نظر کی عینکوں، پیس میکر، جوڑوں اور اعصاب کی قائمیات۔۔۔ یہاں تک کہ کمپیوٹروں اور موبائلوں کا بھی استعمال کرتے ہیں۔ کمپیوٹر اور موبائل ہمارے دماغ کو معلومات جمع کرنے اور پروسیسنگ کا بوجھ کم کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ ہم ایسی غیر نامیاتی اختراعات اور آلات ایجاد کر رہے ہیں جو ہماری اہلیت کو بڑھا رہے ہیں، ہماری خواہشات کو پورا کرتے ہیں۔۔۔ ہماری شخصیت کا حصہ بنتے جا رہے ہیں اور ہماری شناخت کا تعین کر رہیں۔ یہ ایسی اختراعات اور آلات ہیں جنھیں ہم خود سے الگ نہیں کر پائیں گے اور یہ ہمارے وجود کا حصہ بنتے جا رہے ہیں۔ بلاشبہ طور پر ہم صحیح معنوں میں سائبورگ بننے کے دہانے پر کھڑے ہیں۔

امریکہ میں عسکری تحقیق کا ایک ادارہ ہے، جسے 'ڈارپا' کہا جاتا ہے۔ ڈارپا یا 'ڈیفنس ایڈوانسڈ ریسرچ پراجیکٹ ایجنسی' میں حشرات کو استعمال کر کے سائبورگ بنانے پر کام ہو رہا ہے۔ ان نرالی ایجادات کے پیچھے خیال یہ ہے کہ مکھیوں اور لال بیگوں وغیرہ کے اجسام میں برقی آلات جیسے برقی قاشیں، برقی شناسندے اور پروسیسر وغیرہ نصب کر دیے جائیں تو انسان خود یا خود کار کمپیوٹر وغیرہ ان برق حیاتی حشرات کو دور سے ہی کنٹرول کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔ ان سائبورگ حشرات کو جاسوسی اور معلومات کی ترسیل کے لیے استعمال میں لایا جا سکتا ہے۔ ذرا تصور کریں، یہ سائبورگ مکھیاں وغیرہ دشمن کے ہیڈ کوارٹر میں کسی دیوار کے ساتھ چپک کر بیٹھی کان لگا کر خفیہ باتیں سنتی ہوں۔۔۔۔ اور اگر کسی مکڑے کے ہاتھ نہ چڑھیں تو یقیناً دشمن کی ساری گفتگو، منصوبے اور راز ترسیل کر سکتی ہیں۔ 2006ء میں امریکی نیوی نے سائبورگ شارک مچھلیاں بنانے میں دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے اعلان کیا، ' نیول انڈرسی وارفیئر سنٹر نے ایک ایسے برق حیات ماہی منصوبے کا آغاز کیا ہے جس کا مقصد طفیلی جانوروں کے رویوں اور کردار کو اعصابی نظام میں برقی تنصیبات اور نقوش کو کنٹرول کرنا ہے'۔ اس منصوبے میں شامل محققین اور آشکارگروں کو توقع ہے کہ وہ شارک مچھلیوں کی مقناطیسی لہروں کی

قدرتی صلاحیت کو استعمال میں لاتے ہوئے، زیر سمندر آبدوزوں اور بارودی سرنگوں کا سراغ لگانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ شارک مچھلیوں میں قدرتی طور پر مقناطیسی میدان اور قوت کا پتہ لگانے کی صلاحیت، انسان کے ایجاد کردہ سراغ رساں آلات سے کہیں زیادہ۔۔۔بلکہ بہت زیادہ ہوتی ہے۔

خردمند آدمی بھی آہستہ آہستہ سائبورگ میں ڈھلتا جا رہا ہے۔ آج کل قوت سماعت میں اضافے کے جدید آلات کو بعض اوقات 'برق حیاتی کان' بھی کہا جاتا ہے۔ ایسے آلات کا ایک حصہ انسانی کان کے اندرونی حصے میں نصب کر دیا جاتا ہے جبکہ کان کے باہری حصے میں مائیکروفون کی مدد سے جمع کی جانے والی آوازیں، برقی تنصیب میں جذب ہو جاتی ہیں۔ بعد اس کے، اس تنصیب کا کام یہ ہے کہ وہ آوازوں کو فلٹر کر کے، ان میں سے مختلف اور بالخصوص انسانی آوازوں کو برقی رو میں بدل کر مرکزی سامعاتی عصبوں کے حوالے کر دیتا ہے، جو اسے دماغ میں پہنچا دیتے ہیں۔ یوں، بہرے پن کا شکار افراد، ایک دفعہ پھر کان کے پردوں کے بغیر بھی قوت سماعت حاصل کر لیتے ہیں۔

جرمن حکومت کی ایک کمپنی ہے جس کا نام 'ریٹینا امپلانٹ' ہے۔ یہ کمپنی پردہ بصارت کی مصنوعی عضوبندی کے ایسے طریقے ایجاد کر رہی ہے کہ جس کی مدد سے نابینا افراد کو جزوی طور پر قوت بصارت حاصل ہو جاتی ہے۔ اس کل سازی میں ہوتا یوں ہے کہ مریض کی آنکھ کے اندرونی حصے میں ایک نہایت چھوٹی سی مائیکروچپ فٹ کر دی جاتی ہے۔ آنکھ میں داخل ہونے والی روشنی جب ضیائی خلیوں تک پہنچتی ہے تو یہ مائیکروچپ اس روشنی اور ضیائی خلیوں کے ردعمل کو برقی توانائی میں بدل دیتی ہے۔ اس برقی توانائی سے رو پیدا ہوتی ہے جو پردہ بصارت کے سالم یا کارآمد عصبی خلیوں کو اکسا دیتی ہے۔ یوں، یہ عصبی قوت محرکہ دماغ کے خلیوں میں تحریک پیدا کرتی ہے جو اس برقی تحریک کو جھلک اور بصارت میں بدل دیتے ہیں اور یوں نابینا افراد بھی جزوی طور پر بینائی کے قابل ہو جاتے ہیں۔ اس ٹیکنالوجی میں ابھی تک تحقیق جاری ہے اور حالیہ کامیابیوں میں مریض اپنے ارد گرد ماحول سے آشنائی، تحریر کو پڑھنے اور چہروں کی شناخت کرنے کے قابل ہو چکے ہیں۔

امریکہ میں ایک بجلی کا کاریگر ہے، اس کا نام جیسی سوئیلن ہے۔ اس شخص کے دونوں بازو کندھوں تک 2001ء میں ایک حادثے کے نتیجے میں ضائع ہو گئے تھے۔ آج، وہ شکاگو کے ادارہ برائے بحالی معذوروں کی تحقیق کا نتیجہ ہے کہ برق حیاتی بازوؤں کا مالک ہے۔ ان برق حیاتی بازوؤں کی نمایاں خوبی اور خصوصیت یہ ہے کہ جیسی سوئیلن ان بازوؤں کو صرف اور صرف اپنی سوچ اور خیال سے ہی حرکت کروا اور چلا سکتا ہے۔ وہ یوں کہ سوئیلن کے دماغ میں پیدا ہونے والے عصبی اشارے مائیکرو کمپیوٹروں کی مدد سے برقی کمانڈ میں بدل جاتے ہیں۔ یہ برقی احکام، آگے چل کر توانائی میں بدلتی ہیں اور اس توانائی کی مدد سے اس کے بازو، عین اسی طرح حرکت کرتے ہیں جیسا وہ سوچتا ہے۔ جب سوئیلین اپنے بازو کو اوپر اٹھانا چاہے تو وہ بالکل کسی عام صحت مند شخص کی طرح غیر شعوری طور پر ایسا کرنے

کے قابل ہے۔ فی الوقت، یہ برق حیاتی بازو نامیاتی بازوؤں کی نسبت نہایت محدود پیمانے پر حرکات کی اہلیت رکھتے ہیں لیکن کم از کم ان کی مدد سے جیسی سوئیلین روز مرہ کام کرنے کے قابل ہوچکا ہے۔ اس ٹیکنالوجی پر مزید تحقیق جاری ہے۔ حال ہی میں، کلاڈیا مچل نامی ایک مریضہ کے جسم میں بھی ایسا ہی برق حیاتی بازو نصب کیا گیا ہے۔ کلاڈیا مچل امریکی فوجی ہے جس کا بازو موٹر سائیکل کے حادثے میں ضائع ہو گیا تھا۔ سائنسدانوں کو یقین ہے کہ جتنی تیزی سے یہ تحقیق آگے بڑھ رہی ہے، جلد ہی برق حیاتی بازو نہ صرف یہ کہ دماغ کے اشارے سے حرکت کرنے کے اہل تو ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ بازو سے واپس دماغ کو بھی برقی رو کی شکل میں عصبی اشاروں کی ترسیل ممکن ہو جائے گی۔ اس کامیابی کے نتیجے میں عضوبریدہ لوگوں میں چھونے کی صلاحیت بھی لوٹائی جا سکے گی۔

47۔جیسی سیلوین اور کلاڈیا مچل برق حیاتی ہاتھوں سے مصافحہ کر رہے ہیں۔ ان کے برق حیاتی بازوؤں کی اصل خوبی یہ ہے کہ وہ ان مصنوعی اعضاء کو اپنی دماغ کی سوچ سے ہی چلانے پر قادر ہیں۔

یہ برق حیاتی بازو فی الوقت تو ہمارے اصل عضویاتی بازوؤں ادنیٰ بدل نظر آتے ہیں لیکن بے تحاشہ امکانات کے حامل ہیں۔ مثال کے طور پر ہمارے اصل نامیاتی بازوؤں کی نسبت برق حیاتی بازوؤں کو بڑھ کر طاقت ور بنایا جاسکتا ہے۔ یہ اتنے طاقتور ہو سکتے ہیں کہ ان کے سامنے دنیا کا کوئی بھی باکسنگ چیمپیئن مریل ہی نظر آئے گا۔ مزید بر آں یہ کہ برق حیاتی بازوؤں کو ہر چند سال بعد تبدیل بھی کرنا بھی ممکن ہے، یعنی نت نئے ماڈل بھی متعارف ہوسکتے ہیں اور یہ بھی ممکن ہو سکتا ہے کہ یہ جسم سے الگ ہو کر، کچھ فاصلے تک بھی کارآمد بنائے جاسکتے ہیں۔

شمالی کیرولائنا کی ڈیوک یونیورسٹی میں سائنسدانوں نے حال ہی میں سرخ بندروں کی مدد سے اس طرح کے امکانات کا عملی مظاہرہ بھی کیا ہے۔ سائنسدانوں نے سرخ بندروں کے دماغ میں الیکٹروڈ یعنی برقیرے فٹ کر دیے تھے۔ یہ برقیرے دماغی اشاروں کو جمع کر

کے بیرونی آلات کو منتقل کرتے ہیں۔ ان بندروں کو صرف اور صرف سوچ کی مدد سے جسم سے الگ، دور پڑے ہوئے برق حیاتی بازوؤں اور ٹانگوں کو حرکت دینے کی تربیت دی گئی۔ ان میں سے ایک، اروا نامی بندر نے یہ بھی سیکھ لیا کہ وہ دماغی سوچ کی مدد سے بیک وقت اپنے دونوں نامیاتی بازوؤں کے ساتھ ساتھ جسم سے علیحدہ پڑے ہوئے برق حیاتی بازو کو بھی حرکت دینے کے قابل ہو گیا ہے۔ کسی ہندو دیوی کی طرح، اب اروا کے بھی تین بازو ہیں۔ اس کے یہ بازو مختلف کمروں بلکہ مختلف شہروں میں بھی ہوں، وہ انھیں حرکت دینے کے قابل ہے۔ وہ نارتھ کیرولائنا کی لیبارٹری میں موجود رہتے ہوئے، ایک ہاتھ سے اپنی کمر، دوسرے سے سر اور تیسرے ہاتھ سے نیویارک میں کیلا بھی چرا سکتی ہے۔ (اگرچہ، اتنے فاصلے سے یہ چرایا ہوا کیلا کھا پانا ابھی صرف ایک خواب ہی ہے)۔ اسی طرح آئیڈویا نامی ایک دوسری بندریا نے 2008ء میں کافی شہرت حاصل کی تھی۔ آئیڈویا نے امریکہ میں نارتھ کیرولائنا کی لیبارٹری میں اپنی کرسی پر بیٹھے بٹھائے، صرف سوچ اور خیال کے بل بوتے پر جاپان کے شہر ٹوکیو میں دو برق حیاتی ٹانگوں کو حرکت دینے کا مظاہرہ کیا تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ دونوں برق حیاتی ٹانگوں کا وزن بندریا کے اپنے وزن سے تقریباً بیس گنا زیادہ تھا۔

تالہ بند سنڈروم ایسی بیماری ہے جس میں مبتلا ہونے والا شخص اپنے جسم کے کسی ایک حصے یا پورے جسم کو ہی حرکت دینے سے محروم ہو جاتا ہے لیکن اس کی ادراک اور احساس کی صلاحیتیں بہر حال برقرار رہتی ہیں۔ اس بیماری میں مبتلا ہونے والے مریض اب تک باقی دنیا کے ساتھ صرف اور صرف آنکھ کے اشارے اور پپوٹوں کی حرکت سے ہی ربط کرنے کے قابل تھے۔ تاہم، اب چند مریضوں کے دماغ میں برقیرے فٹ کیے گئے ہیں جن کا کام دماغی اشاروں کو جمع کر کے بیرونی آلات کو منتقل کرنا ہے۔ اب یہ کوشش جاری ہے کہ ان دماغی اشاروں کو صرف حرکات ہی نہیں بلکہ الفاظ میں بھی سمجھنے کے قابل بنایا جا سکے۔ اگر یہ تجربات کامیاب ہو گئے تو تالہ بند سنڈروم کے شکار مریض بیرونی دنیا کے ساتھ باقاعدہ بات چیت کرنے کے قابل ہو سکیں گے۔۔۔ اس ٹیکنالوجی کے ساتھ جڑی دلچسپ بات یہ ہے کہ مستقبل میں غالباً ہم اس کی مدد سے لوگوں کے دماغ پڑھنے کے قابل بھی ہو سکتے ہیں۔

تاہم، یہ سارے اور اس طرح کے کئی دوسرے سائنسی منصوبے فی الوقت تجربات اور ترقی کے عمل سے گزر رہے ہیں۔ ان میں سب سے انقلابی کوشش تو وہ ہے کہ جس میں دماغ اور کمپیوٹر کو جوڑنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اگر یہ کوشش کامیاب ہو جاتی ہے تو کمپیوٹر انسانی دماغ میں پیدا ہونے والی برقی اشاروں کو پڑھنے کے قابل ہو جائیں گے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ کمپیوٹر کے برقی اشاروں کو انسانی دماغ بھی باآسانی پڑھ اور سمجھ سکے گا۔ اب سوچیں، اگر اس طرح کی اتصالی نظاموں کی مدد سے انسانی دماغ کو انٹرنیٹ سے منسلک کر دیا یا پھر کئی انسانی دماغوں کو ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ دیا جائے تو کیا ہو گا؟ جیسے کمپیوٹروں کا انٹرنیٹ ہوتا ہے، اسی طرح ہم انسانی دماغوں پر مشتمل ایک جال بچھا سکتے ہیں۔ ذرا تصور کیجیے، اس وقت انسانی یادداشت، انسانی شعور اور انسانی شناخت کا کیا حال ہو گا جب ہر شخص کے دماغ کو اجتماعی انسانی یادداشت کے ذخیرے تک رسائی حاصل ہو جائے گی؟ ایسی صورتحال میں، مثال کے طور پر ایک

سائبورگ، کسی دوسرے سائبورگ بلکہ کسی بھی سائبورگ کی یادداشتوں تک کچھ یوں رسائی حاصل کر پائے گا کہ جیسے وہ اس کی اپنی ہوں۔ اسے ان یادداشتوں بارے سننا نہیں پڑے گا، کسی آپ بیتی کو پڑھنے کی حاجت نہیں ہوگی اور اس بارے تخیل کے گھوڑے نہیں دوڑانے پڑیں گے۔۔۔ بلکہ بیٹھے بٹھائے، اس سائبورگ کی پوری یادداشت اور زندگی کے تجربات کو خود محسوس کر سکے گا یا کر سکے گی۔ خودی، ذات، صنفی شناخت کے تصورات کا کیا بنے گا جب ہمارے ذہن، مجتمع ہو جائیں گے؟ آپ اپنے آپ کو کیسے پہچانیں گے۔۔۔ اپنے خوابوں کا پیچھا کیسے کریں گے جب یہ تصورات اور خواب صرف آپ کے دماغ میں نہیں بلکہ تخیل کے کسی مجموعی ذخیرے کا حصہ ہوں گے؟

ایسا سائبورگ۔۔۔ ظاہر ہے، نہ تو انسان اور نا ہی کوئی نامیاتی جسم ہو گا۔ یہ بالکل مختلف شے ہو گی۔ یہ اساسی طور پر ایک بالکل مختلف قسم کی مخلوق ہو گی جس کا فی الوقت ہم تصور بھی نہیں کر سکتے اور اس کے فسلفیانہ، نفسیاتی اور سیاسی مضمرات کا احاطہ بھی نہیں کر سکتے۔

ایک دوسری زندگی

زندگی کی ہئیت اور فطری اصولوں کو کوک بدلنے کا تیسرا طریقہ یہ ہے کہ مکمل طور پر غیر نامیاتی مخلوق کی کل سازی کی جائے۔ اس کی سب سے عام مثال، کمپیوٹر پروگرام اور کمپیوٹر وائرس ہیں جو آزادی اور خود مختاری کے ساتھ ارتقاء اختیار کر سکتے ہیں۔۔۔ اپنی ہئیت اور اثر بدل سکتے ہیں۔

آج کمپیوٹر سائنس کی دنیا میں جینیاتی پروگرامنگ کا شعبہ انتہائی دلچسپی اور اہمیت اختیار کر تا جا رہا ہے۔ یہ جینیاتی ارتقاء کے عوامل اور طریقوں کی ہم سری کرنے کا اہل ہو چکا ہے۔ زیادہ تر پروگرامر، ایسے پروگرام بنانے کے خواب دیکھتے ہی ہیں جو اپنے خالق سے الگ، آزاد اور خود مختار رہتے ہوئے بتدریج ارتقاء اور نشوونما پا سکیں۔ اس لحاظ سے پروگرامر کی مثال حرکیات یا عمل کے مرکزی وسیلے کی طرح ہو گی جو ایک قضیہ تو شروع کر دیتا ہے لیکن اس کی تخلیق بعد اس کے اس رخ پر ارتقائی نمو پاتی ہے جس کے بارے نہ تو اس کے خالق اور نہ ہی کسی دوسرے انسان نے تصور کر رکھا ہو۔ یعنی، یہ پروگرام انسانی سوچ اور تصور سے آزاد ہوتے ہیں۔

اس طرح کے پروگرام کے ابتدائی نمونے پہلے سے ہی موجود ہیں۔ انھیں ہم کمپیوٹر وائرس کے نام سے جانتے ہیں۔ کمپیوٹر وائرس جب انٹرنیٹ پر پھیلتے ہیں تو یہ خود بخود ہی لاکھوں اور کروڑوں کی تعداد میں اپنی نقلیں اپنے بل بوتے پر تیار کرتے ہیں جب کہ ان کے پیچ اور خود کار اینٹی وائرس سافٹ وئیروں کے بیچ چھپن چھپائی جاری رہتی ہے۔ یہ وائرس، اپنے بل بوتے پر ہی کسی برقی ماحول میں کئی دوسری اقسام کے وائرسوں کے ساتھ مقابلہ بھی کرتے ہیں۔ ایک دن یہ ہو کہ جب یہ وائرس یوں ہی خود کی نقلیں تیار کر تا ہو۔۔۔ اور اچانک کوئی غلطی وقوع پذیر ہو جائے تو اس کے نتیجے میں وائرس میں کمپیوٹری ترمیم آجاتی ہے۔ یہ ترمیم کسی انسانی پروگرامر کی دی ہوئی

اس خاصیت کا نتیجہ بھی ہو سکتی ہے جو اسے کبھی کبھار، خود میں ترمیم کی اجازت کی شکل میں حاصل ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وائرس کی ہئیت میں یہ ترمیم بالکل اتفاقی غلطی ہو۔۔۔ اور اس کے نتیجے میں عام طور پر وائرس، اینٹی وائرس سافٹ وئیر کو دے پاتے ہیں۔ عام طور پر اس طرح ہوتا ہی رہتا ہے۔ کمپیوٹر وائرس میں اس طرح کے تغیر پیدا ہوتے ہیں کہ وہ اینٹی وائرس سافٹ وئیروں سے بچ نکلتے ہیں لیکن کمپیوٹروں میں پھر بھی پھیلتے ہیں اور پھر انٹرنیٹ پر چڑھ جائیں تو لاکھوں، کروڑوں کمپیوٹر متاثر ہوتے ہیں۔ اسی لیے تو ہمیں ہر آئے دن اپنے کمپیوٹروں میں اینٹی وائرس سافٹ وئیروں کے نت نئے ورژن نصب کرنا پڑتے ہیں۔ اب چونکہ ایسا ہوتا رہتا ہے۔۔۔ تو ایسے وائرس خود بخود ہی نہ صرف یہ کہ اپنی بقاء بلکہ افزائش کے بھی قابل ہو جاتے ہیں۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جاتا ہے۔۔۔ تغیر کے نتیجے میں کمپیوٹر کی دنیا، یعنی کمپیوٹروں کی برقیات اور انٹرنیٹ پر ایسے ایسے نئے قسم کے کمپیوٹر وائرس بھی جنم لے سکتے ہیں جنھیں کبھی کسی انسان نے تخلیق ہی نہیں کیا تھا۔ اور یوں، غیر نامیاتی ارتقاء چل پڑے گی۔۔۔ یا کیا خبر، اب بھی چلتی ہی ہے۔

تو کیا یہ کمپیوٹر وائرس جاندار مخلوق ہیں؟ اس کے جواب کا انحصار اس امر پر ہے کہ آپ 'جاندار مخلوق' کسے کہتے ہیں؟ یہ کمپیوٹر وائرس ایسی شے ہیں جو بلاشبہ طور پر ایک نئی قسم کے ارتقائی عمل کا نتیجہ ہیں جو نامیاتی ارتقاء کے اصولوں اور حدود سے بالکل مختلف اور مکمل طور پر آزاد ہیں۔

اب ایک اور طرح کی صورتحال کا تصور کریں۔۔۔ فرض کریں، آپ اپنے دماغ کی ساری معلومات کو ایک پورٹیبل ہارڈ ڈسک میں منتقل کر کے اسے اپنے کمپیوٹر پر چلانے کے قابل ہوں۔ تو اب کیا آپ کا کمپیوٹر بالکل آپ کی طرح۔۔۔ یعنی ایک آدمی کی طرح سوچنے اور محسوس کرنے کے قابل ہو جائے گا؟ اگر، ایسا ہی ہے تو پھر کیا یہ کمپیوٹر آپ ہیں یا کوئی اور مخلوق ہے؟ اب سوچیں، اگر کمپیوٹر پروگرامر ایسا ہی بالکل نیا لیکن ایک ڈیجیٹل ذہن تخلیق کر لیتا ہے۔۔۔ جس میں سارے کا سارا کمپیوٹر کوڈ بھرا ہو۔۔۔ یہی نہیں، اس ذہن میں خودی کا احساس، شعور اور یادداشت کی خوبی بھی پائی جاتی ہو؟ اگر آپ اس ڈیجیٹل ذہن کو کمپیوٹر پر چلا بھی سکتے ہوں تو کیا آپ اس کو ایک شخص کا رتبہ دیں گے؟ اچھا۔۔۔ اگر آپ اس ڈیجیٹل ذہن کو کمپیوٹر سے حذف کر دیں تو کیا آپ پر قتل کا مقدمہ درج ہو گا؟

ہمیں اس طرح کے سوالات کے جوابات بہت جلد ملنے والے ہیں۔ 2005ء میں ایک منصوبہ شروع کیا گیا تھا جسے 'انسانی دماغ کا منصوبہ' کہا جاتا ہے۔ اس کے تحت، کمپیوٹر کے اندر برقی حلقوں اور سرکٹ کی مدد سے دماغی عصبوں کے جال کی نقالی کرتے ہوئے پورا انسانی ذہن یا دماغ دوبارہ سے تخلیق کرنے کا منصوبہ بنایا گیا تھا۔ اس منصوبے کے سربراہ کا دعویٰ کیا تھا کہ اگر ہمیں بھرپور فنڈ اور صرف دس یا بیس سال کا عرصہ مل جائے تو ہم بلاشبہ طور پر ایک کمپیوٹر کے اندر مصنوعی انسانی دماغ ڈال کر فعال کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے جو بالکل ایک انسان کی طرح پیش آنے اور بات چیت کرنے کے قابل ہو گا۔ اگر یہ منصوبہ کامیاب ہو جاتا ہے تو پھر اس کا

مطلب یہ ہے کہ زندگی چار ارب سال تک نامیاتی آمیزوں اور مرکبات کی چھوٹی سی دنیا میں پسائی کے بعد۔۔۔اچانک ہی ساری حدود توڑ کر پہلی بار غیر نامیاتی جہاں کی وسعت میں پلنے اور نشو ونما حاصل کرنے کے قابل ہو جائے گی۔ وہ ایسی ایسی شکل اختیار کرنے کی اہل ہو گی جو کہ ہمارے تصورات اور خیال سے بھی بہت آگے کی دنیا ہے۔ بہت سے محققین کا یہ بھی ماننا ہے کہ ہمارے دماغ۔۔۔ آج کے ڈیجیٹل کمپیوٹروں کی طرح نہیں ہیں بلکہ یہ اینالوگ ہیں یعنی یہ ریاضیاتی اعداد سے براہ راست کام نہیں لیتا۔ اگر یہ ڈیجیٹل نہیں ہے توپھر اس کا مطلب یہ ہے کہ آج کے کمپیوٹر، ان دماغوں کا بھیس اختیار کرنے اور نقل تیار کرنے کے قابل نہیں ہو سکتے، یعنی ہمیں اس مقصد کے لیے بالکل الگ قسم کے کمپیوٹروں کی ضرورت ہو گی۔ لیکن، اس طرح کے مصنوعی دماغ کے امکان کو بغیر کوشش کیے ہی رد کر دینا۔۔۔ بیوقوفی ہی ہو گی۔ 2013ء میں، 'انسانی دماغ کے منصوبے' کو یورپی یونین کی جانب سے ایک ارب یورو کا فنڈ مل گیا تھا۔

ندرت اور یکتائی

آج، ہمارا حال یہ ہے کہ ہم ان سارے مواقع اور امکانات کا تی بھر حصہ ہی حقیقت میں ڈھال پائے ہیں۔ اس کے باوجود، 2014ء کی یہ دنیا، ایسی دنیا ہے جس میں ہماری انسانی تہذیب اور تمدن حیاتیات کی بندشوں اور بیڑیوں سے خود کو آزاد ہوتی ہوئی محسوس کر سکتی ہے۔ ہم اپنے ارد گرد کی بیرونی دنیا ہی نہیں بلکہ اپنے جسم اور دماغ کی اندرونی دنیا میں بھی جس تیزی سے کل سازی کرنے کی صلاحیت میں روز بروز اضافہ کرتے جا رہے ہیں۔۔۔یہ حیرت انگیز ہے۔ آج اتنے بڑے اور وسیع تر پیمانے پر سرگرمی اور حرکت جاری ہے کہ ہر نئے دن کے ساتھ ہمارا کامیابیوں سے متعلق اطمینان اور آسودہ خاطری بھی بے چینی کا شکار ہوتی جا رہی ہے۔ آج ہم ایسی دنیا میں بسر رکھتے ہیں جہاں ہر روز، وکلاء کو پرائیویسی اور شناخت کے معاملات پر نئے سرے سے غور کرنا پڑتا ہے، ریاستوں اور حکومتوں کو آئے دن انسانی صحت اور مساوات کے نئے پیمانے ایجاد کرنے پڑ رہے ہیں، کھیلوں کی انجمنوں اور تعلیمی اداروں کو مسلسل ایمانداری اور کامیابی کا تعین کرنا پڑتا ہے، ہم ایسی دنیا میں بسر رکھتے ہیں جہاں پنشن فنڈ اور روزگار کے میدان میں یہ بحث چل رہی ہے کہ ساٹھ سال کی عمر۔۔۔ تیس کے برابر ہو چکی ہے۔ ان ساری تراتیب اور ساختوں کو حیاتی کل سازی، سائبورگ ٹیکنالوجی اور غیر نامیاتی زندگی کی پہیلیوں کے ساتھ نباہ کرنا پڑ رہا ہے۔

پہلی دفعہ ایک انسان کا جینیاتی نقشہ تیار کرنے پر پندرہ سال اور تین ارب امریکی ڈالر کا سرمایہ لگ گیا تھا۔ آج کوئی بھی شخص اپنا ذاتی جینیاتی نقشہ صرف چند ہفتوں اور چند سو امریکی ڈالروں کے عوض تیار کروا سکتا ہے۔ ذاتی طب اور معالجے کا دور شروع ہو چکا ہے۔۔۔یعنی اب ہم اپنے جینیاتی نقشے کے عین مطابق، اپنے ڈی این اے کی خصوصیات کو مد نظر رکھتے ہوئے، اپنے علاج اور معالجے کا رخ اختیار کر

سکتے ہیں۔ ہمارے ذاتی معالجین جلد ہی ہمیں بالکل صحیح صحیح یہ بتانے کے قابل ہو جائیں گے کہ مثلاً ہمیں جگر کے کینسر کا خطرہ تو بہت زیادہ ہے لیکن ہمیں دل کی بیماری کی چنداں فکر نہیں کرنی چاہیے۔ پھر، وہ ہمیں ایک ایسی دوائی کے بارے بھی بالکل ٹھیک یہ بتا سکتے ہیں کہ وہ 92فیصد دوسرے لوگوں کے لیے تو بالکل فائدہ مند ہے لیکن ذاتی طور پر میرے لیے بالکل بیکار ہو گی۔۔۔ تو بجائے، مجھے وہ نہیں بلکہ یہ والی دوائی استعمال کرنا چاہیے جو کہ ڈی این اے کے حساب سے میرے لیے تو بالکل فٹ بیٹھتی ہے لیکن شاید باقی لوگوں کے لیے زہر ہو۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ تقریباً کامل معالجے کا دور، تقریباً آن پہنچا ہے۔

تاہم، اس طبی علم میں بہتری کے نتیجے میں ایک بالکل نئی طرز کا اخلاقی پینڈ ورا باکس بھی کھلنے کا پورا امکان ہے۔ اخلاقیات کے فلسفی اور قانونی ماہرین پہلے ہی ڈی این اے کے ساتھ جڑے پرائیویسی کے معاملات پر سر پکڑ کر بیٹھے ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر کیا انشورنس کمپنیاں، ہماری انشورنس پالیسی جاری کرنے سے پہلے ہم سے ڈی این اے کے نقشے طلب کریں گی؟ تو اگر انھیں ان نقشوں کے جائزے سے کسی جینیاتی بیماری یا کسی موزی مرض کے امکان کا پہلے سے علم ہو جائے تو کیا وہ ہمیں اپنے پر ئمیم میں شامل کرنا گوارا کریں گی؟ مستقبل میں کیا، ہم کسی جگہ نوکری کی درخواست میں اپنے تعلیمی اور تجربے کے کوائف کے ساتھ ساتھ ڈی این اے کے سکین بھی ارسال کیا کریں گے۔۔۔ جس سے ہمارے اگلے ممکنہ آجر کو ہمارے رویوں اور نفسیاتی طرزوں کا علم بھی ہو سکے؟ کیا مستقبل میں یہ آجر اور کمپنیاں۔۔۔ ریاستی ادارے صرف ان امیدواروں کو ہی انٹرویو کے لیے بلائیں گے جو ان کے خیال اور ضرورت کے مطابق بہتر ڈی این اے کے مالک ہیں؟ ایسی صورتحال میں کیا ہم ایسے آجروں اور اداروں۔۔۔ انشورنس کمپنیوں پر 'جینیاتی تفریق اور امتیاز' کے مقدمے قائم کر سکیں گے؟ اچھا، کیا مستقبل میں وہ کمپنیاں جو کسی نئی مخلوق کی تخلیق کریں یا پھر کسی عضو کی سب سے پہلے تخلیق کرنے کے قابل ہو جائیں گی۔۔۔ کیا وہ اس ڈی این اے نقشے کی سند اور حق ایجاد بھی حاصل کر لیں گے؟ ان کے پاس اس کے کاپی رائٹس ہوں گے؟ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ۔۔۔ آپ ایک مرغے کے مالک تو ہو سکتے ہیں لیکن کیا آپ پوری ایک نوع اور قسم کے مالک بھی ہو سکتے ہیں؟

گلگامش پراجیکٹ اور انسان کا ملکوتی طاقت حاصل کرنے کے اہلیت کا معاملہ بے پناہ اخلاقی، سماجی اور سیاسی مضمرات کے خدشات کی وجہ سے سخت مخمصے کا شکار ہو جاتا ہے۔ انسانی حقوق کا آفاقی منشور، مملکتی طبی نظام، قومی صحت کے بیمہ منصوبے اور دنیا بھر کی اقوام کے آئین اور منشور وغیرہ انسانی معاشرے میں ہر شہری کو معقول طبی سہولیات اور علاج معالجہ فراہم کر کے بہتر صحت اور تندرستی پر کام کرنے کا وعدہ کرتے ہیں۔ یہ وعدے اور عملی منصوبے اس وقت تک تو بالکل درست ہیں جب طب کے شعبے کا کام صرف بیماریوں کا تدارک اور بیماروں کو علاج کی فراہمی تک محدود رہے۔ لیکن اگر طب کا شعبہ انسانی اہلیتوں کو بڑھانے اور اس کا تعین کرنے کا کام

شروع کر دے تو پھر کیا ہو گا؟ کیا طب کا شعبہ اور یہ سارے منصوبے اور منشور، تمام شہریوں کو برابری کی سطح پر اہلیت بڑھانے کا موقع فراہم کرے گا یا جیسے آج، ویسے ہی تب بھی انسانوں میں ایک نئی ملکوتی اشرافیہ جنم لے لے گی؟

ہماری یہ جدید دنیا تاریخ میں پہلی بار سب انسانوں کے بیچ بنیادی مساوات اور برابری کا تصور اور عملی طور پر اس کے اطلاق پر فخر محسوس کرتی ہے لیکن یہ عین ممکن ہے کہ آگے چل کر ہماری یہی جدید دنیا تاریخ میں سب سے بڑھ کر غیر مساوی اور غیر منصفانہ معاشروں کو جنم دے دے۔ تاریخ گواہ ہے کہ اپر کلاس نے ہمیشہ ہی خود کو باقی سبھی نچلے انسانی طبقات سے کہیں زیادہ ذہین، ہوشیار، مضبوط اور عمومی طور پر بہتر سمجھنے کا دعویٰ کیا ہے۔ وہ اس ضمن میں ہمیشہ ہی خود فریبی کا شکار چلے آئے ہیں۔ کسی غریب دہقان کے یہاں پیدا ہونے والا بچہ کسی ولی عہد شہزادے جتنا ہی ذہین اور مضبوط ہو سکتا تھا۔۔۔ لیکن طبی شعبے کی مہربانی سے اگر امراء کو ذہانت، ہوشیاری، طاقت وغیرہ میں اگر فوقیت مل جاتی ہے تو یوں تاریخ سے چلی آرہی خود فریبی۔۔۔ بالآخر معروضی حقیقت بن جائے گی۔

یہ سائنس فکشن نہیں ہے۔ سائنس فکشن کے زیادہ تر پلاٹ میں ایک ایسی دنیا دکھائی جاتی ہے جس میں ہم جیسے ہی ایسے آدمیوں کی بسر رہتی ہے جن کے ہاتھ میں اعلیٰ ٹیکنالوجی اور وہ ملکوتی طاقتوں کے مالک ہوتے ہیں۔ وہ روشنی کی رفتار سے اڑنے والے خلائی جہازوں اور لیزر سے چلنے والی بندوقیں اٹھائے پھرتے ہیں۔ سائنس فکشن کے خاکوں میں پائے جانے والے اخلاقی اور سیاسی تضادات اور الجھاؤ تو ہماری آج کی اسی دنیا سے مستعار لیے جاتے ہیں لیکن یہ مستقبل کے منظر نامے میں ممکنہ طور پر پائے جانے والی سماجی اور جذباتی دبدھاؤں سے پیدا ہونے والے تناؤ اور کشیدگی کا بمشکل ہی پیش کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ بلکہ یہ تو اس دور کے سماجی اور اخلاقی تضادات کو سرے سے دکھا ہی نہیں پاتے۔ تاہم، مستقبل کی ہر ٹیکنالوجی کا اصل مصرف یہی نظر آتا ہے کہ وہ خردمند آدمی کی نوع کو بدل کر رکھ دے۔۔۔ اس سے مراد صرف ہماری جسمانی ہیئت، ہتھیار اور گاڑیاں وغیرہ ہی نہیں بلکہ ہمارے جذبات، احساسات اور خواہشات بھی بدل کر رہ جائیں گی۔ ایک تیز رفتار خلائی جہاز کا مقابلہ ایک ایسے جوان جہاں سائبورگ سے کیسے کیا جا سکتا ہے جو اپنی نسل بڑھانا تو دور۔۔۔ اس کی تو سرے سے کوئی جنسیت ہی نہیں ہے۔ وہ براہ راست دوسری مخلوقات کے ساتھ اپنی سوچ اور تخیل بانٹتا ہے اور کی سوچنے، سمجھنے اور توجہ مرکوز رکھنے کی اہلیت ہمارے مقابلے میں ہزاروں گنا بڑھ کر ہے۔ وہ کبھی غصہ نہیں ہوتا اور اسے اداسی بھی نہیں گھیرتی۔۔۔ لیکن اس کی بہر حال ایسی خواہشات اور جذبات ضرور ہیں جن کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔۔۔ وہ مشین ہے لیکن مشین نہیں ہے۔۔۔ اب آپ ہی بتائیے، ایسی کسی مخلوق کی خواہشات اور جذبات کس نوعیت کے ہوں گے؟

سائنس فکشن میں ایسے کسی مستقبل کا کبھی ذکر دیکھنے میں نہیں آتا کیونکہ تعریف کی رو سے اس طرح کے مستقبل کا بالکل صحیح صحیح صراحت کے ساتھ ساتھ بیان، ہمارے لیے فی الوقت بعید از قیاس ہے۔ ہمارے لیے کسی سائبورگ کی زندگی پر مبنی فلم بنانا ایسا ہی ہے جیسے آپ نینڈرتھل انسانوں کے لیے شیکسپیئر کا ڈرامہ ہیملٹ پیش کرنے کی کوشش کریں۔ آپ اپنے لیے تو 'ہیملٹ' بنا کر اس سے

محظوظ ہو سکتے ہیں لیکن نینڈر تھلوں کے لیے یہ ڈرامہ۔۔۔ ناقابل فہم، ان کی سمجھ سے بالاتر ہو گا۔ یہ تو طے ہے کہ مستقبل کی دنیا پر راج کرنے والے غالباً ہم سے اتنے ہی مختلف ہوں گے۔۔۔ جتنے ہم کبھی نینڈر تھل انسانوں کے مقابلے میں ہیں۔ ہم اور نینڈر تھل۔۔۔ بہر حال انسان تھے۔ آنے والے دور کی وہ مخلوق، انسان نہیں بلکہ خدا نما ہو گی۔
طبیعیات دان 'بگ بینگ' کو وحدانیت۔۔۔ یعنی ندرت اور یکتائی سے تعبیر کرتے ہیں۔ یعنی، یہ وہ نقطہ ہے جب فطرت کے کسی بھی موجود اصول اور قانون کا کوئی وجود نہیں تھا۔ کسی بھی شے کا وجود نہیں تھا، وقت کا بھی نہیں۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ تب زمان و مکان بھی نہیں تھا۔ اس لحاظ سے یہ کہنا ہی بے معنی ہے کہ 'بگ بینگ' سے قبل کوئی شے وجود رکھتی ہو گی۔ کائنات میں بگ بینگ کی طرح، ہم انسان بھی اپنی دنیا میں بتدریج ایک 'وحدانیت' یعنی ایسے ہی ایک نادر اور یکتا نقطے کی طرف بڑھ رہے ہیں جب ہماری اس دنیا کو معنی بخشنے والا ہر تصور بے معنی اور غیر متعلق ہو جائے گا۔ میں اور آپ کا تصور، مرد اور عورت کا تصور، محبت اور نفرت کا تصور۔۔۔ الغرض ہر تصور بے محل ہو جائے گا۔ اس ندرت اور یکتائی کی دوسری جانب جو کچھ بھی ہو گا۔۔۔ ہمارے لیے بے معنی ہو گا۔

فرینکسٹائن کی پیشگوئی

1818ء میں میری شیلی کا شہرہ آفاق ناول فرینکسٹائن شائع ہوا تھا۔ یہ ایک ایسے سائنسدان کی کہانی ہے جو ایک مصنوعی مخلوق تخلیق کرتا ہے جو بالآخر ہتھے سے اکھڑ کر تباہی پھیلا دیتا ہے۔ پچھلی دو صدیوں میں یہی کہانی بار بار۔۔۔ اور طرح طرح سے لاتعداد انداز میں دہرائی گئی ہے۔ یہ ہماری نئی سائنسی اساطیر اور داستانوں کا مرکزی ستون بن چکا ہے۔ پہلی نظر میں تو سطحی طور پر فرینکسٹائن کی کہانی ایک انتباہ ہے۔ یہ ہمیں متنبہ کرتی ہے کہ اگر ہم نے خدا کا کردار ادا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے زندگی کی کل سازی کی تو ہمیں سخت سزا اور اذیت ہی ملے گی۔ لیکن، اس کہانی کے کہیں گہرے معنی ہیں۔
فرینکسٹائن کی فرضی داستان خردمند آدمی کو اس حقیقت سے روشناس کرانے کی کوشش کرتی ہے کہ ہم آخری وقت کو نہایت تیزی سے سر پر آن پہنچا ہوا دیکھ رہے ہیں۔ اگر کوئی ایٹمی یا ماحولیاتی تباہی برپا نہ ہوئی تو۔۔۔ ہماری داستان فرینکسٹائن کی ہی کہانی ہے۔ ٹیکنالوجی میں اس تیز ترین ترقی اور جدت کا نتیجہ بالآخر یہی نکلے گا کہ ایک بالکل مختلف مخلوق خردمند آدمی کی جگہ لے لے گی۔ اس مخلوق کی نہ صرف مادی ہئیت بلکہ شعوری اور جذباتی دنیا بھی بالکل الگ ہو گی۔ یہی وہ امر ہے جو خردمند آدمی کی اکثریت کے لیے بدحواسی کا باعث ہے۔ ہم یہ تصور تو پال کر خوش ہوتے ہی ہیں کہ مستقبل میں ہم ایسے ہی ہوں گے جو ایک سیارے سے دوسرے پر تیز ترین خلائی جہازوں پر سفر کیا کریں گے لیکن ہم کسی طور بھی یہ تصور کرنا پسند نہیں کرتے کہ ہم ایسی مخلوق، ہم ایسے جذبات اور شناخت رکھنے والے

خرد مند آدمی، عین ممکن ہے مستقبل کے زمانوں میں باقی ہی نہ رہیں اور ہماری جگہ ایسی بیگانی مخلوق لے لے گی جس کی صلاحیتوں کے سامنے۔۔۔ہم بونے ہوں گے۔

ہمیں اپنی فرضی داستانوں میں یہ دیکھ اور پڑھ کر خوب سکون مل جاتا ہے کہ ڈاکٹر فرینکسٹائن نے ایک انتہائی ہیبت ناک بلا کو تخلیق کر لیا تھا لیکن پھر ہم خود کو بچانے کے لیے اس عفریت کو تباہ کرنے میں بھی کامیاب ہو جاتے ہیں۔ ہم اپنی سائنس فکشن کی ہر کہانی کو ایسے بیان کرتے ہیں جس سے ثابت ہو کہ دراصل ہم ہی اشرف المخلوقات۔۔۔ سب سے برتر اور بہتر مخلوق ہیں۔ ہمیں یہ سوچ کر عجب خوشی ملتی ہے کہ ماضی میں بھی۔۔۔ اور مستقبل میں آگے چل کر بھی کبھی کوئی ایسی شے وجود نہیں رکھ سکتی جو ہم سے بہتر یا برتر ہو۔ ہمیں بہتر بنانے کی کوئی بھی کوشش کا ناکام ہو جانا اٹل ہے کیونکہ انسانی جسم کو تو بہتر بنا کر بدلا جا سکتا ہے لیکن۔۔۔ انسانی روح اور آتما کو کوئی ہاتھ بھی نہیں لگا سکتا۔

ہمیں یہ حقیقت نگلنے میں شاید نہایت مشکل ہو گی کہ سائنسدان جسم ہی نہیں بلکہ اب روح بھی تخلیق کر پائیں گے اور وہ مستقبل کے ڈاکٹر فرینکسٹائن ایسی برتر اور اعلیٰ 'مخلوق پیدا کر سکیں گے جو ہم سے کئی کئی گنا بہتر ہو گی۔ وہ مخلوق نہایت حقارت سے ہماری طرف ویسے ہی دیکھا کرے گی جیسے ہم میں سے اکثریت نینڈرتھل انسانوں کو دیکھتی آئی ہے۔

ہم یقین سے یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ آج کے ڈاکٹر فرینکسٹائن اس پیشگوئی کو پورا کر پائیں گے یا نہیں۔۔۔ اور مستقبل کا یہ ہے کہ وہ نامعلوم ہے۔ پچھلے صفحات میں جتنی بھی پیش بینیوں کا ذکر آیا ہے۔۔۔ اگر یہ مستقبل میں پوری طرح حقیقت کا روپ دھار لیں تو بہت ہی حیران کن بات ہو گی۔ تاریخ ہمیں یہ سبق دیتی ہے کہ ہر وہ شے جو بس ہماری آنکھوں کے سامنے وقوع پذیر ہوتی ہوئی بھلے دکھائی دے رہی ہو۔۔۔ ایسا بھی ممکن ہے کہ وہ نامعلوم وجوہات اور رکاوٹوں کی وجہ سے کبھی حقیقت کا روپ نہ ڈھال سکے۔ ہم تاریخ میں پہلے ہی دیکھ چکے ہیں کہ کس کس طرح کے بے تصور منظر نامے تھے جو عین ممکن تھے لیکن کبھی واقع ہی نہ ہو سکے۔ 1940ء کی دہائی میں جب ایٹمی دور کا آغاز ہوا تو اس کے ساتھ ہی 2000ء کی ایٹمی دنیا کی پیشگوئیاں بھی سامنے آ گئیں۔ جب اپولو 11 اور سپٹنک کا مشن چاند پر اترا تو لوگوں کی اکثریت یہ تصور کرنے لگی کہ بیسویں صدی کے آخر تک لوگ مریخ اور پلوٹو میں کالونیاں بنا کر بسر کر رہے ہوں گے۔ اسی طرح۔۔۔ ہر واقعہ کے ساتھ پیشگوئیاں ہوتی رہی ہیں اور ان میں سے بس کچھ ہی ایسی ہیں جو حقیقت میں ڈھل پائی ہیں۔ لیکن بعض ایسی حقیقتیں بھی ہیں جن کا کبھی کسی نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ مثال کے طور پر انٹرنیٹ کا تصور، اس کے وجود سے قبل کبھی رہا ہی نہیں ہے۔

تو کہنا یہ ہے کہ ہمیں ابھی سے ڈیجیٹل مخلوقات کے ہاتھوں نقصان اور اس کی تلافی کی مد میں انشورنس کروانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یہ اوپر بیان کردہ جتنے بھی خوش کن یا بدترین حالات بیان کیے گئے ہیں۔۔۔ ان کا مقصد صرف اور صرف ہمارے تخیل اور تصور

کوشش دینے کا ہے۔ ہمیں جس شے پر سنجیدگی سے غور وفکر کرنے کی ضرورت ہے۔۔۔ وہ مستقبل کے حالات و واقعات نہیں ہیں بلکہ یہ امر ہے کہ تاریخ کے اگلے حصے میں صرف اور صرف ٹیکنالوجی اور تنظیمی تبدیلی نہیں بلکہ یہ انسانی شناخت اور شعور میں بھی اساسی کایاپلٹ دیکھنے میں آئے گی۔ یہ تبدیلیاں اس قدر اساسی ہوں گی کہ یہ 'انسان' نامی اصطلاح پر بھی سوال اٹھادیں گی۔ تو پھر، ہمارے پاس کتنا وقت بچا ہے؟ یہ کسی کو پتہ نہیں ہے۔ جیسا کہ پہلے بھی ذکر آیا ہے۔۔۔ بعض لوگوں کا ماننا ہے کہ 2050ء تک چند ایک انسان۔۔۔ ملکوتی شکل اختیار کرہی لیں گے۔ وہ جو اس ضمن میں قدرے کم بنیاد پرست واقع ہوئے ہیں۔۔۔ ان کے نزدیک ایسا اگلی صدی کے دوران یا پھر اگلے ایک ہزار سال کے اندر ہی ممکن ہے۔ لیکن جب ہم خردمند آدمی کی ستر ہزار سالہ تاریخ پر نظر دوڑاتے ہیں تو یہی خیال آتا ہے کہ۔۔۔ چند سو یا ایک آدھ ہزار سال کیا شے ہے؟

اگر خردمند آدمی کی تاریخ پر واقعی پردہ گرنے والا ہے تو ہم، خردمند آدمی کی ان آخری نسلوں میں سے ایک ہیں جنھوں نے ایک آخری سوال کا جواب تلاشنے کی کوشش کی تھی۔ وہ سوال یہ ہے: ہم کیا بننا چاہتے ہیں اور ہمارا مقصد کیا ہے؟ یہ ایسا سوال ہے جسے۔۔۔ انسانی افزونی اور بیشی کا سوال قرار دیا جاتا ہے۔ یہ ایسا سوال ہے جو ہمیشہ سے ہی سیاستدانوں، فلسفیوں، عالموں اور عام عوام میں مقبول رہا ہے اور ہر نسل کے ساتھ۔۔۔ پچھلی نسل کا جواب، اگلی کے مقابلے میں پست اور ٹھگنا ہی نظر آیا ہے۔ ویسے بھی، آج کے مذاہب، نظریات، اقوام اور طبقات کے بیچ جتنی بھی بحث، مکالمے اور جنگ جاری ہے۔۔۔ وہ خردمند آدمی کے ساتھ ہی ختم ہو جائیں گے۔ اگر ہمارے بعد آنے والے، واقعی ایک مختلف سطح کے شعور (غالباً ان کے پاس شعور سے بھی آگے کی کوئی شے ہو، جسے ہم سمجھ ہی نہیں سکتے؟) پر عمل پیرا ہوئے تو غالباً عیسائیت اور اسلام کے تصورات اور عقائد ان کے لیے کسی بھی طرح سے دلچسپی کا سامان نہیں ہوں گے۔۔۔ انھیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا کہ آیا ان کا سماج اشتراکیت پر یقین رکھتا ہے یا سرمایہ داری نظام پر؟ کیا ان کی صنفیں مرد اور عورت میں بٹی ہوئی ہیں یا نہیں؟ یہ سب کچھ بے معنی ہوگا۔

لیکن، اس کے باوجود تاریخ کی عظیم بحث کم از کم ان خداناؤں کی پہلی نسل کے لیے پھر بھی اہم رہے گی۔۔۔ جن کو ان کے خالق، یعنی انسان نے اپنے تہذیبی اور تمدنی تصورات کو خاطر میں لاتے ہوئے تخلیق کیا تھا۔ کیا ان خداناؤں کی شبیہ سرمایہ دارانہ نظام میں، اسلامی شعائر کے عین مطابق۔۔۔ نسوانیت کے حامیوں نے تخلیق کی تھی؟ یا پھر کسی دوسری صورت ہوئی تھی؟ یا کوئی تیسرا تہذیبی مرکب تھا؟ یہ ایسی شے ہے۔۔۔ جو ان خداناؤں کی مختلف نسلوں کو مختلف رخ میں روانہ کر سکتی ہے۔ یہ ایسے ہی، جیسے ہم خردمند آدمی کی کئی کئی تہذیبیں پروان چڑھ گئی تھیں۔

ویسے، زیادہ تر لوگ اس طور سوچنا پسند نہیں کرتے۔ یہاں تک کہ حیاتی اخلاقیات کے شعبے کی ترجیح بھی ایک دوسرے سوال کا جواب تلاشنا ہے۔ وہ سوال یہ ہے: 'ہمیں کس کس شے کی ممانعت ہے؟'۔ کیا زندہ انسانوں پر جینیاتی تجربے کرنا اخلاقی طور پر ہمارے لیے قابل قبول

ہے؟ کیا ہم ضائع شدہ حمل کے جنین کو جینیاتی تجربات کے لیے استعمال کر سکتے ہیں؟ کیا 'اسٹیم سیل' پر تحقیق جائز ہے؟ کیا ایک بھیڑ کا کلون بنانا اخلاقی طور پر کوئی اچھی بات ہے؟ بن مانسوں کا کلون بنانا مناسب ہے؟ انسانوں کے کلون بنانا کس قدر غلط ہے؟ یہ سب اہم سوالات ہیں۔۔۔ لیکن، یہ سوچنا سراسر سادہ لوحی ہے کہ ہم صرف اخلاقیات کی بنیاد پر اس تیز رفتار سائنسی تحقیق کی گاڑی پر بریک لگا دیں گے اور ان سارے سائنسی منصوبوں کو فی الفور بند کر دیں گے جو خردمند آدمی کی نوع کو فرازی دلانے کی دھن میں ایک بالکل مختلف مخلوق پیدا کر سکتے ہیں۔ آپ سائنسدانوں سے خود پوچھ کر دیکھ لیں کہ وہ جینیات کا مطالعہ کیوں کرتے ہیں؟ یا وہ ایک دماغ کو کسی کمپیوٹر کے ساتھ جوڑنے پر کیوں تلے ہیں؟ یا پھر ایک کمپیوٹر کے اندر انسانی دماغ فٹ کرنے کا مقصد کیا ہے؟ تو۔۔۔ دس میں سے نو سائنسدان آپ کو ایک ہی معیاری جواب دیں گے کہ، 'جی۔۔۔ ہمارے مطالعے اور تحقیق کا مقصد انسانی بیماریوں کا علاج تلاش کرنا اور انسانی زندگیوں کو بچانے کی کوشش ہے۔' اگرچہ ہم سب یہ اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ ایک کمپیوٹر کے اندر انسانی دماغ فٹ کرنے کے مضمرات صرف اور صرف نفسیاتی بیماریوں کے علاج سے کہیں آگے۔۔۔ اور بہت ہی زیادہ بڑھ کر ہیں لیکن ہم پھر بھی سائنسدانوں کے اس گھسے پٹے، معیاری جوابات سے مطمئن ہو جاتے ہیں اور کوئی بھی ان سے مزید کرید، سوال نہیں کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ گلگامش پراجیکٹ، سائنس کا طرہ امتیاز بن کر رہے گا۔ اس سے سائنس کی ہر شے کی تائید ہو جائے گی جو وہ آج تک کرتی آئی ہے اور کرتی رہے گی۔ ہمارے سارے ڈاکٹر فرینکسٹائن گلگامش کے کندھوں پر سوار، اسی کے بچے ہیں۔ اب جیسے کبھی گلگامش کو اس کے ارادوں سے ٹالنا ممکن نہیں تھا، آپ اس کے بچوں۔۔۔ ان ڈاکٹر فرنکسٹائنوں کو کیونکر روکیں گے؟

ہاں، ہم یہ ضرور کر سکتے ہیں کہ اس رخ اور سمت پر اثر انداز ہونے کی کوشش کریں جو یہ سائنسدان اختیار کرتے ہیں۔ چونکہ ہم جلد ہی اپنی خواہشات کی کل سازی کرنے کے قابل ہو ہی جائیں گے تو غالباً ہمارا منہ چڑانے والا سوال یہ نہیں ہو گا کہ، 'ہم کیا بننا چاہتے ہیں؟' بلکہ۔۔۔ ہمارے سامنے اصل سوال یہ ہو گا کہ، 'ہم کس خواہش کی خواہش رکھتے ہیں؟'۔ اب اگر آپ کو اس سوال نے ڈرا کر سخت خوف میں مبتلا نہیں کر دیا تو۔۔۔ آپ نے اس پر ابھی غور ہی نہیں کیا!

پس نوشت: ایک جانور جو خدا بن بیٹھا

ستر ہزار سال پہلے، خرد مند آدمی ایک ادنیٰ اور معمولی جانور تھا جو اپنے کام سے کام رکھتے ہوئے۔۔۔ افریقہ کے ایک کونے میں پڑا ہوا تھا۔ پھر ہزاروں سال کا عرصہ لگا کر اس نے اپنی کایا پلٹی اور کرہ پر ایسا غالب آیا کہ ارض کے ماحولیاتی نظام پر آفت بن کر ٹوٹ پڑا۔ آج، یہ ادنیٰ جانور، خدا بننے کے قریب ہے۔۔۔ اس کے پاس اب لازوال جوانی ہی نہیں بلکہ تخلیق اور تخریب کی خدائی طاقت بھی ہوا کرے گی۔

بد قسمتی سے، کرہ ارض پر خرد مند آدمی نے اپنے تسلط کے دوران اب تک کچھ ایسی شے پیدا نہیں کی جس پر ہم فخر کر سکیں۔ ہم نے اپنے گرد و نواح پر دسترس حاصل کر لی ہے، ہم خوراک کی زیادہ سے زیادہ پیداوار حاصل کرنے کے قابل ہو چکے ہیں، ہم نے شہر تعمیر کیے، سلطنتیں کھڑی کیں اور وسیع ترین تجارتی جال بھی بچھا لیے۔ لیکن کیا ہم نے اس دنیا میں دکھ، الم، کرب اور مصیبت میں کچھ کمی پیدا کی؟ ہم بار بار اس امر پر زور دے چکے ہیں کہ اجتماعی طور پر انسانی طاقت اور کامیابیوں کا ہرگز مطلب یہ نہیں ہے کہ انفرادی سطح پر آدمی کی حالت بہتر ہوئی ہو۔۔۔ یہی نہیں بلکہ اس اجتماعی طاقت کے نتیجے میں صرف فرد ہی نہیں بلکہ دوسرے جانور بھی سخت مصیبت اور کرب کا شکار ہو چکے ہیں۔

جہاں تک انسانی حالت کی بات ہے تو بلاشبہ طور پر پچھلی چند دہائیوں میں کافی بہتری آئی ہے۔ قحط سالی، فاقہ کشی، وبائی امراض اور جنگ و جدل میں کمی آئی ہے۔ لیکن دوسری انواع و اقسام۔۔۔ نباتات اور حیوانات کی حالت نہایت تیزی سے بگڑتی ہی چلی گئی ہے۔۔۔ بلکہ ماضی کے مقابلے میں اس کی رفتار بہت ہی تیز ہو چکی ہے۔ یہی نہیں بلکہ انسانی حالات میں بہتری کے آثار بھی اس قدر مہین اور تازہ ہیں کہ ہم اس کے بارے بھی یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتے۔

مزید بر آں یہ ہے کہ آج بھلے انسان حیران کن کرتب بازی کے قابل ہو چکا ہے لیکن ہمیں آج بھی اپنی منزل مقصود کا کچھ اندازہ نہیں ہے اور ایسا لگتا ہے کہ ہم پہلے سے کہیں بڑھ کر عدم اطمینان اور ناخوش ہو چکے ہیں۔ ہم نے ڈونگی کشتیوں سے بادبانوں سے چلنے والی کشتیاں، پھر بھاپ سے چلنے والے بحری جہازوں اور ٹرینوں سے لے کر خلائی جہاز تک بھی ایجاد کر لیے ہیں لیکن کسی کو کچھ خبر نہیں ہے کہ ہم آخر کہاں جانے کا ارادہ رکھتے ہیں؟ ہم آج بے پناہ طاقت کے حامل ہیں لیکن ہمیں علم ہی نہیں ہے کہ آخر اس بے انتہا طاقت کا کرنا کیا ہے؟ اس سے بھی بد تر یہ ہے کہ آج انسان، ہمیشہ سے بڑھ کر غیر ذمہ داری کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ ہم طبیعیات کے اصولوں کی کچھ سمجھ بوجھ رکھنے کی وجہ سے۔۔۔ اپنے تئیں خدا بن بیٹھے ہیں۔ ایسا خدا جو کسی کو جوابدہ نہیں ہے اور نتیجتاً اپنے ہم سر نامیات (نباتات اور

حیوانات) پر قہر بن کر ٹوٹ چکے ہیں اور اپنے گردو نواح میں ماحولیاتی نظام کر برباد کر کے رکھ دیا ہے۔ ہیں اپنے آرام اور آسودگی کے سوا کسی شے سے کوئی مطلب نہیں ہے۔۔۔ ہم اسی کی دھن میں لگے رہتے ہیں لیکن پھر بھی ہمیں کبھی چین نہیں آتا۔

آپ ہی بتائیے، ایک انتہائی غیر ذمہ دار اور بے چین، عدم اطمینانی کے شکار خدا سے بڑھ کر خطرناک کون ہو گا؟ پھر خدا بھی ایسا۔۔۔ جسے یہ پتہ ہی نہیں کہ وہ آخر چاہتا کیا ہے؟

-ختم شد-

9781716994982